ماہنامہ

شگوفہ

سالنامہ

حیدرآباد

GOLCONDA
10 CIGARETTES
THE HYDERABAD DECCAN
CIGARETTE FACTORY PVT LTD
1-7-140, MUSHEFRABAD, HYDERABAD INDIA
STATUTORY WARNING
CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سالنامہ جنوری ۱۹۹۸ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی:

حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدہ)
محمود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمن سلیم (ریاض)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس مشاورت:

نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
حمایت اللہ

مجلس ادارت:

مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

کتابت:
محمود سلیم، محمد عبدالرؤف۔

طباعت:
دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔

قیمت فی پرچہ: ۱۵ روپے
زرسالانہ: ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔۱

فون (آفس) 595716
فون (رہائش) 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چورن (منظومات)

اُردو سوسائٹی آسٹریلیا کے زیرِ اہتمام ہند پاک مشاعرہ بہ اعزاز خواہ مخواہ، مشاعرہ کے بعد لئے گئے گروپ فوٹو

دائیں سے بائیں: محترمہ فریدہ لاکھانی ایڈیٹر 'فروغِ اُردو'، ڈاکٹر بدر قادری، اشرف شاد، مسز محمود علی اور غوث خواہ مخواہ

دائیں سے بائیں: محترمہ یاسمین شاد، اشرف شاد، خواہ مخواہ، آسٹریلیا میں شگوفہ کے نمائندہ خصوصی جناب مسعود حسینی اور ایک مہمان

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھّے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

مرزا اسد اللہ خاں غالب
(1797 - 1869)

عظیم شاعر

کو ان کی دوسوویں یوم پیدائش کی تقریبات کے موقع پر

خراجِ عقیدت

davp 97/637

I DON'T LIKE ALL THESE FELLOWS. I JOINED THEM BECAUSE I LIKE THIS GENTLEMAN...
..I LIKE ALL THOSE GENTLEMEN. I DIDN'T JOIN THEM BECAUSE I DON'T LIKE THAT FELLOW!

ALLIANCES

Surendra
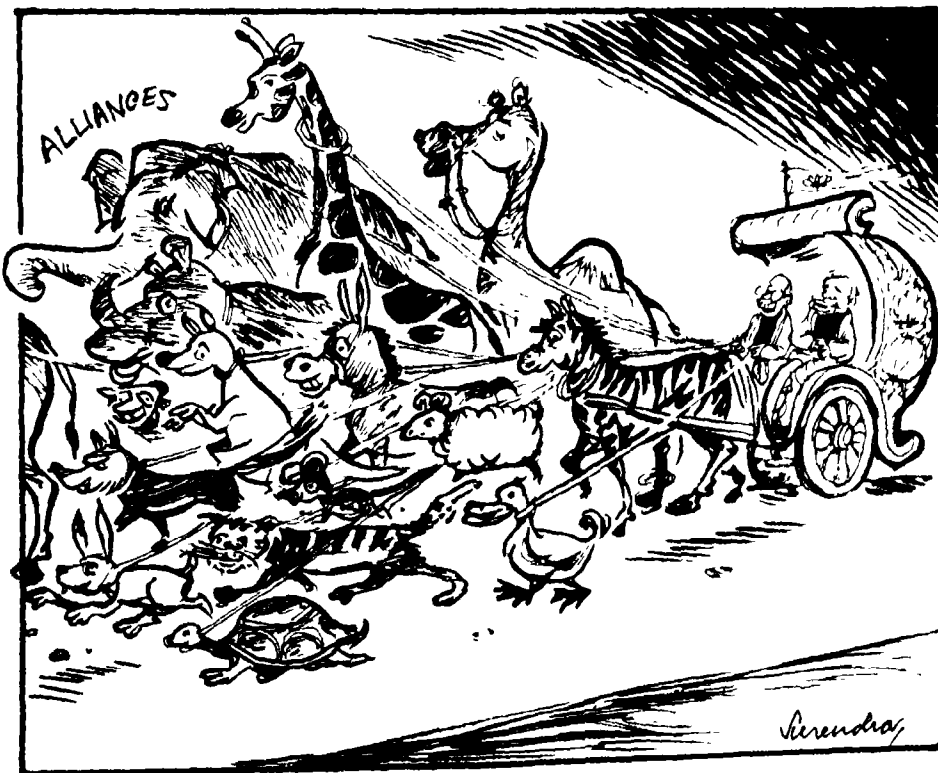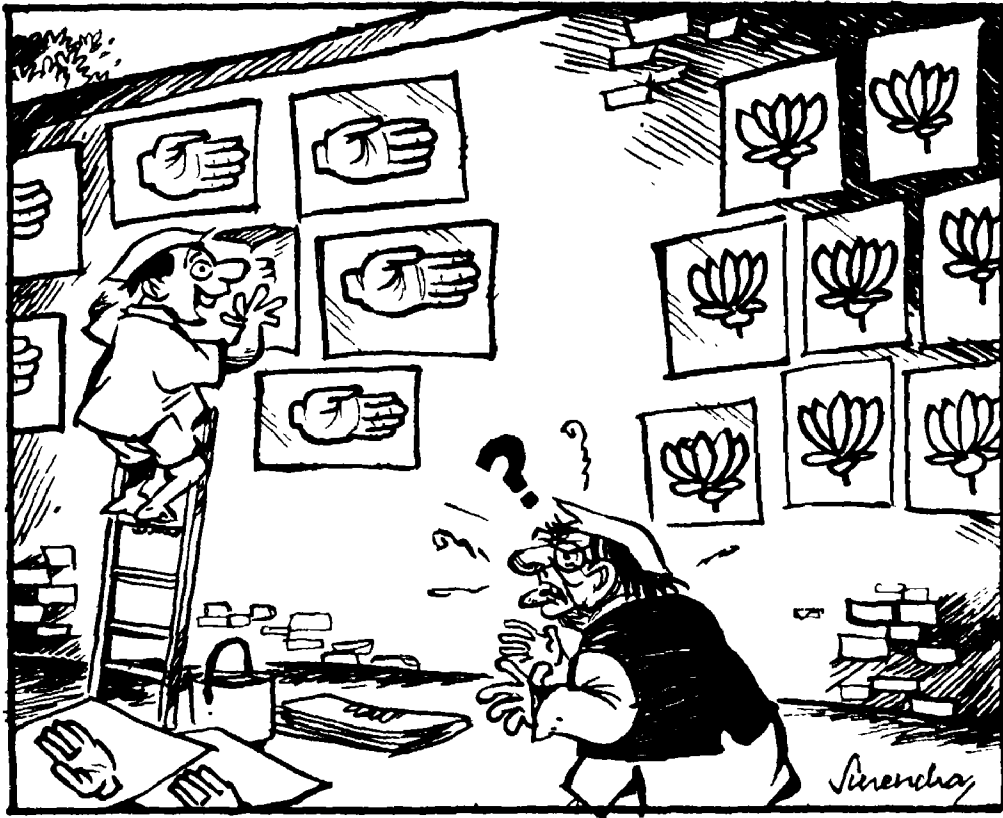
1
MAMATA'S GROSS ROOT CONGRESS
2
3
4
Subhani

بی جے پی کے پیچھے کیا ہے
بچھو کے پیچھے جو ہے
بی جے پی کے پیچھے وہ ہے
UF
TDP
آپ نے بچالیا
کشتی بھنور میں تھی
سونیا

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفرنامہ	۵۰روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۳۰روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۴۰روپے
آئی ایم ساری	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	"	۱۰۰روپے
بہ فرض محال	خواہ مخواہ	"	۷۵روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	"	۵۰روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	"	۶۵روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسن	سفرنامہ	۴۵روپے
درگت	ٹی ین راز	کلام	۷۰روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	کلام	۵۰روپے
الف تماشہ	نریندر لوتھر	کلام	۳۰روپے

شگوفہ کی خصوصی اشاعتیں

مجتبیٰ حسین نمبر	۵۵روپے
ہندوستانی مزاح نمبر	۵۵روپے
شگوفہ ۲۵ سالہ شعری انتخاب	۳۰روپے

نوٹ :- ڈاک خرچ علیحدہ ہوگا

ضمیر جعفری

ضمیریات

[شگوفہ کے لیے شکاگو میں "زندہ دلان حیدرآباد" کی "ادبی رضیہ سلطانہ"
محترمہ غوثیہ سلطانہ کی وساطت سے۔ ض]

تیسری دنیا

جہاں کا تین چوتھائی جہاں ہے تیسری دنیا
تمدن کا چمن، حکمت کی ماں ہے تیسری دنیا
بجا تقدیس اور تجدیدِ مشرق کا یہ سب چرچا
مگر اقوامِ عالم میں کہاں ہے تیسری دنیا

بلاوا

اس زمانے سے بہت اُمید تو رکھتا نہیں
یہ نہیں کہتا مکمل عاشقی کرنے کو آ
ہاں مگر تھوڑی سی تو دلبستگی کرنے کو آ
دوستی ممکن نہیں تو "لانڈری" کرنے کو آ

معراج وفا

یہ ہماری وفا کی ہے معراج
یار کے پاؤں کے "سلیپر" ہیں
ان کے کوچے میں یوں کھڑے تھے ہم
جیسے "ہاکی" کے "گول کیپر" ہیں

ہمّت

کام جو ہوگا۔ ہوگا ہمّت سے
کیا ملا نالہ و بُکا کر کے
ایک غنچہ نہ گلستاں میں کھلا
لاکھ چیخے صبا صبا کر کے

امریکہ

مل گئی بھی شہریت امریکہ کی تو کیا ہوا
پھر بھی ہم لاہور کے ہیں پھر بھی کلبرگے کے ہیں
ڈاکٹر بھی ہو گئے، انجینئر بھی ہو گئے
گندمی رنگت ہے تو پھر دوسرے درجے کے ہیں

جواز

چھوٹی اور بڑی چیزیں، زینتِ زندگانی ہیں
گھر میں دیگچوں کے ساتھ دیگچی بھی ہوتی ہے
احمق آدمی اگر وزیر بن گیا تو کیا
عالی شان بنگلوں میں چھپکلی بھی ہوتی ہے

★

سید ضمیر جعفری

غزل

شیخ کو یہ اُلجھن ہے زیادہ
دُنیا میں اِنجن ہے زیادہ

عشق میں جب سے ہوئی ملاوٹ
آگ ہے کم ایندھن ہے زیادہ

کم ہوا جب سے مردانہ پن
زن بھی اب "نازن" ہے زیادہ

نئے تمدّن کی جیونتا!
سالن سے برتن ہے زیادہ

آرائش کا اِتنا ملبہ!
چہرہ کم درشن ہے زیادہ

جلسے، دھرنے، ریزولیشن!
دل ساکت دھڑکن ہے زیادہ

دُنیا کی حالت کیا کہیے!
اَمن عنقا 'یو۔این' ہے زیادہ

جنگ میں جسے شکست ہوئی تھی
آج وہی جرمن ہے زیادہ

سلمیٰ اپنی "شرماں ماری"
"گوری" کچھ پُرفن ہے زیادہ

یہی رہا دستورِ زمانہ
رام ہے کم راون ہے زیادہ

کپڑے کیا شفاف دُھلے ہیں
دھوبی میں دھوبن ہے زیادہ

یہ تو ضمیرؔ نہیں کچھ اچھا
ان سے 'کم گفتن' ہے زیادہ

؎ U.N.O

سید حسین چکر
(امریکہ)

غزل

یہ اگر معلوم ہے "فیمس" ستمگر کون ہے
مجھ سے پھر کیا پوچھتے ہو میرا دلبر کون ہے

وہ یہاں تک بے تکلف ہیں مرے احباب سے
یہ سمجھنا ہے بہت مشکل کہ شوہر کون ہے

اس کے مرنے کی دعا مانگوں اگر معلوم ہو
ان کی "ویٹنگ لسٹ" میں اب نمبر اوپر کون ہے

آپ کے بچے تو بس پہچانتے ہیں "مام" کو
یہ خبر اُن کو نہیں کچھ ان کا "فادر" کون ہے

سر سے پاؤں تک وہ ننگی ہو گئیں پھر بھی تو
ناز نخروں میں بھی اب ان کے برابر کون ہے

شاعری کرتا ہے وہ سب کو ہنسانے کے لیے
شاعروں میں آج کل چکر سے بہتر کون ہے

طالب خوندمیری

کھانسی

جسے کہتے ہیں کھانسی جان پہ بھاری بھی ہوتی ہے
کہ یہ کام و دہن میں مثلِ چنگاری بھی ہوتی ہے
اگرچہ یہ بہت منحوس بیماری بھی ہوتی ہے
مگر اس میں کبھی تھوڑی اداکاری بھی ہوتی ہے

حسینوں سے کبھی عشاق ایسا چانس لیتے ہیں
توجہ کے لیے اُن کی ذرا سا کھانس لیتے ہیں

سُنا ہے ہم نے، ہوتی ہے کئی اقسام کی کھانسی
غرض مندوں کو لاحق ہے خود اپنے کام کی کھانسی
بہانہ باز لوگوں کو فقط ہے نام کی کھانسی
نہ ہے قسمت کسی کو ہے بڑے آرام کی کھانسی

انہی اقسام میں کھنکار بھی ہے اور ٹھسکا بھی
کبھی لوگوں کو ہو جاتا ہے ان دونوں کا چسکا بھی

یہ ٹھسکا شومیٔ قسمت سے جس کا بھی مقدر ہے
گلا اس کا بھی طبلے کی طرح تھاپوں کی زد پر ہے
کسی کی رائے میں ٹھسکا کئی روگوں سے بدتر ہے
جہاں تک ہم سمجھتے ہیں یہ کھانسی کا مذکر ہے

مگر کم بخت ہچکی اصل میں اس کی بھی نانی ہے
یہ جس کو لگ گئی، وہ کچھ دنوں میں آنجہانی ہے

کسی کے کھانسنے پر مُنہ سے ایسی بھی صدا آئے
کہ جیسے ایک کُتا دوسرے کُتے پہ غرّائے
یا مٹی کے کسی خالی گھڑے کو کوئی لڑھکائے
یا پھر آٹو کوئی اسٹارٹ ہو کر بند ہو جائے

یہ وہ کھانسی ہے جو سارے محلّے کو جگاتی ہے
اچانک اس کا حملہ ہو تو چوروں کو بھگاتی ہے

کوئی کھانسی گلوکاروں کی تانوں میں مچلتی ہے
کہ یہ اُن کے گلوں میں لڑکھڑاتی ہے سنبھلتی ہے
وہ جب جب کھانستے ہیں اک انوکھی لے نکلتی ہے
کبھی لگتا ہے موسیقی نئی کروٹ بدلتی ہے
یہ کھانسی صرف بیماری نہیں بلکہ ہُنر بھی ہے
کہ اس کا پوپ میوزک پر بہت گہرا اثر بھی ہے

یہ بیماری اگرچہ جانی پہچانی بھی ہوتی ہے
مگر اس کے مریضوں کو پریشانی بھی ہوتی ہے
یہ کھانسی خود کو پھیلانے میں لاثانی بھی ہوتی ہے
کہ یہ بیوی سے شوہر کو بہ آسانی بھی ہوتی ہے
ذرا کم فاصلے سے جب بھی گہری سانس لیتا ہے
تو بیگم کی محبّت میں میاں بھی کھانس لیتا ہے

ہمارے دیس میں گندی "سیاست" کی بھی کھانسی ہے
تعصّب کی، ہوس کی، بغض و نفرت کی بھی کھانسی ہے
کئی مطلب پرستوں کو قیادت کی بھی کھانسی ہے
یہاں ووٹوں کی، کرسی کی، وزارت کی بھی کھانسی ہے
یہ کھانسی لیڈروں میں جوشِ خدمت کی کمی سے ہے
وطن کے بھیپھڑوں کا یہ مرض آدھی صدی سے ہے

○

نظم 'چار سو سالہ' سے چند شعر

ہم اپنے شہر کی ہر حال میں تعریف کرتے ہیں
کہ اس میں ہے شرافت کی نشانی چار سو سالہ
ہمیشہ جاں چھڑکتے ہیں ہم اپنے میہمانوں پر
ہماری ہے یہ خوشبو میزبانی چار سو سالہ
قلی کا دور ہو یا آصفی یا دورِ جمہوری
محبت کی یہاں ہے حکمرانی چار سو سالہ
مگر اس شہر کو اب خاص ٹانک کی ضرورت ہے
نظر آتی ہے اس میں ناتوانی چار سو سالہ
ہیں لاکھوں گھاؤ جو اس شہر کی سڑکوں کے چہروں پر
ہے اُن پر وقت کی یہ مہربانی چار سو سالہ
بڑھی ہیں قیمتیں اس شہر میں بس چند برسوں سے
مگر لگتی ہے چیزوں کی گرانی چار سو سالہ
قلی کو بھی یقیناً شہر کی حالت پہ دکھ ہوتا
اگر ملتی انھیں بھی زندگانی چار سو سالہ

مجتبیٰ حسین

نئے سال کیلئے کچھ مشورے

پچھلے ہفتہ دوردرشن والوں نے ہم سے خواہش کی تھی کہ ہم نئے سال کے موقع پر قوم کو کچھ ضروری مشورے دیں۔ دوردرشن والے بڑے مردم شناس لوگ ہیں۔ بخوبی جانتے ہیں کہ یہی ایک چیز تو ہمارے پاس ہے جو ہم قوم کو دے سکتے ہیں اور دوسری طرف ہم بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قوم کو آپ کتنا ہی اچھا مشورہ کیوں نہ دیں وہ اس پر عمل نہیں کرے گی۔ چنانچہ کچھ مشورے ہم اپنے قارئین کو بھی دینا چاہتے ہیں۔

دوستو! نئے سال کے آتے میں ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی ہے اور ایک گھنٹہ کا وقت بہت ہوتا ہے۔ اس ایک گھنٹہ میں پرانا سال آخری ہچکی لے گا اور اس ایک گھنٹہ میں آپ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی چھین سکتے ہیں بھاگتے بھوت کی لنگوٹی چھین لینا ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ آج ہم نے پلٹ کر دیکھا تو احساس ہوا کہ ہماری زندگی میں پورے تریسٹھ ۶۳ نئے سال آئے ہیں۔ لگ بھگ پورے دو مہینوں تک ہم نئے سال کا دن ہی مناتے رہے۔ اتنا وقت یوں کم کس نے برباد کیا ہوگا۔ جو آدمی اس دنیا میں زیادہ وقت برباد کرتا ہے اسے اور کچھ نہیں تو لوگوں کو مشورے دینے کا حق ہی مل جاتا ہے۔ اسی اختیار کی روشنی میں چند مشورے ملاحظہ فرمایئے:

دوستو! ملک میں پولیوشن کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ آلودگی کس وجہ سے بڑھتی ہے اس بارے میں تو آپ سیاسی قائدین سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔

لیکن آدمی کو آلودگی کا نقصان کس وجہ سے ہوتا ہے اس کی طرف آج تک کسی نے دھیان نہیں دیا بھیا! آدمی کو آلودگی سے اس لیے نقصان پہنچتا ہے کہ وہ سانس لیتا ہے، ساری خرابی کی جڑ یہی ہے۔ آدمی سانس لینے میں احتیاط کرے تو اسے آلودگی سے اتنا نقصان نہیں پہنچے گا وہ جتنی زیادہ سانسیں لے گا اتنی ہی آلودگی اس کے اندر جائے گی۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ آنے والے سال میں آپ دیکھ بھال کر سانس لیں۔ بلاوجہ فالتو جگہوں پر جاکر سانس لینے کا خطرہ نہ مول لیں۔ جہاں زیادہ آلودگی ہو وہاں اپنی سانس روک لیں اور جہاں آلودگی کم ہو وہاں جاکر پھر سے سانس لینا شروع کردیں۔ اتنی آسان سی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے آدمی بھلے ہی ٹھیک نہ رہے اس کے پھیپھڑے تو ٹھیک رہیں گے۔ اگر کوئی صاحب ہمارے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے سانس لینا ہی بند کردیں تو آلودگی سے سدا کیلئے محفوظ ہوجائیں گے۔

اگر یقین نہ آئے تو ہمارے مشورے پر عمل کر کے دیکھ لیجیے۔ جب کہ لودگی نہیں بڑھی تھی تب بھی اردو کے شاعر نے مشورہ دیا تھا۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام : آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

فلمی اداکاروں کو ہمارا مشورہ ہے کہ پچھلے سال کی طرح وہ اس سال بھی اپنی عمر کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ نیا سال تو ان سے پوچھے بغیر یونہی چلا آتا ہے جب پچھلے دس برسوں میں ان کی عمریں انیس بیس سال سے آگے نہیں بڑھیں اور اب جب کہ ان کی ماؤں اور خود ان کی عمروں میں بھی چار یا پانچ برس کا ہی فرق رہ گیا ہے تو بھلا اب وہ اپنی عمر کیوں بڑھائیں، بس اتنا خیال رہے کہ ماں کی عمر بیٹی سے کم نہ ہونے پائے۔ سچ پوچھئے تو فلمی اداکاروں کو دیکھ کر ہی ہماری ڈھارس بندھی ہے کہ وقت کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

میونسپل کارپوریشن والوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ آنے والے سال میں بھی ہمیشہ کی طرح مکھیوں اور مچھروں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں پہونچائیں۔ شہریوں کو سہولتیں پہونچانے کی بات اب پرانی ہوگئی۔ یوں بھی اب شہریوں کو مکھیوں اور مچھروں کے ساتھ رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ جس رات دس بارہ مچھر ہمیں کاٹ نہیں لیتے اس وقت تک ہمیں نیند نہیں آتی بلکہ کچھ کمزور مچھروں کے بارے میں تو یہاں تک دیکھا کہ ہمیں کاٹ لینے کے بعد ان کی صحت خراب ہوجاتی ہے۔ ہم جیسے شہری اب اتنے زہریلے ہو گئے ہیں کہ ہمیں کاٹنے کے بعد کچھ مچھروں کو ڈینگو بخار بھی آنے لگا ہے۔ میونسپل کارپوریشن والے یہ بھی نوٹ کرلیں کہ آنے والے سال میں ڈینگو بخار کی بیماری بھی ضروری پھیلنی چاہیئے کیوں کہ یہ بیماری اب ایک سالانہ روایت بن چکی ہے اور ہماری تہذیب میں روایتوں کو باقی رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

میونسپل کارپوریشن والے لگے ہاتھوں ایک اور مشورہ نوٹ کرلیں۔ ہمارے گھر کے سامنے والی سڑک پر بجلی والوں ٹیلی فون والوں اور پی ڈبلیو ڈی والوں نے بڑی محنت کے ساتھ آپس میں مل کر کھدائی کا جو کام کیا ہے اس کو جوں کا توں رہنے دیں۔ کھدائی کی وجہ سے اس سڑک پر جگہ جگہ جو گڑھے بن گئے ہیں انہیں پار کرنے کے لیے ہمیں لانگ جمپ لگانی پڑتی ہے۔ اس سڑک کی وجہ سے اسکول میں لانگ جمپ کے مقابلوں میں ہمارے بچوں کی فرسٹ پوزیشن آتی ہے۔ ہم تو خیر لانگ جمپ کے مقابلوں میں حصہ نہیں لیتے لیکن اس سڑک پر روزانہ دس پندرہ منٹ تک چلنے کی وجہ سے ہماری صحت ٹھیک رہنے لگی ہے۔ پہلے تو صرف محلے کی عورتیں ہی اپنا وزن کم کرنے کے لیے اس سڑک پر "اچھل قدمی" کیا کرتی تھیں لیکن اب دوسرے محلوں کی عورتیں بھی اس سڑک پر ا چھلنے کے لیے آنے لگی ہیں۔ اب یہ سڑک نہیں بلکہ جمناسٹک کلب بن گئی ہے۔ نئے سال میں اگر کسی نے اس سڑک کی مرمت کی تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔

پچھلے سال ہمارے علاقہ میں بجلی بار بار بند ہوتی رہی ہے۔ شروع شروع میں تو تکلیف ہوئی لیکن اب اندھیرے میں رہنے کے کئی فائدے ہم پر روشن ہو گئے ہیں۔ اسی لیے نئے سال میں بھی بجلی کے بار بار بند ہونے کی سہولت عوام کو ملنی چاہیئے۔ بلکہ بجلی ہمیشہ کے لیے ہی بند ہوجائے تو کیا کہنے۔ ہم اپنے گھر میں اپنی ناخلف اولاد کی شکلیں دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئے ہیں۔ بجلی بند ہوتی ہے تو ہمیں ان کی شکلیں نہیں دکھائی دیتیں۔ بڑا سکون ملتا ہے۔ پھر اندھیرے میں رہنے کا ایک فائدہ ہمیں یہ ہو رہا ہے کہ ہماری "روشنی طبع" بہت تیز ہوگئی ہے۔ جیسے ہی بجلی بند ہوتی ہے ہم اپنی "روشنی طبع" کی مدد سے بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ حد ہوگئی کہ اس کی مدد سے ہم ٹیلی ویژن بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اور سب سے اچھی

ات یہ ہے کہ بیچ میں کبھی "رکاوٹ کے لیے معذرت ہے" والی عبارت بھی نہیں آتی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ بجلی بند ہوجانے کے بعد ہم نے اپنے سن کی روشنی کی مدد سے اپنے ٹیلی ویژن سیٹ پر فلم "شعلے" بھی دیکھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ فلم ہم نے پندرہ مرتبہ دیکھی تھی اور اب یہ ہمیں زبانی یاد ہوگئی ہے۔ جب بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اس فلم کو دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہماری کیا مجال کہ ہم اس ملک کے رہنماؤں کو کوئی مشورہ دے سکیں۔ پھر بھی سیاسی رہنماؤں سے ہماری ایک گزارش یہ ہے کہ آنے والے سال میں وہ پارٹیاں تو بدلیں لیکن سال بھر میں بارہ سے زیادہ پارٹیاں نہ بدلیں۔ ہر پارٹی میں وہ کم از کم ایک ماہ تو رہ لیں۔ جس طرح اہم رہنماؤں کے دوروں کے پروگرام پہلے سے طے ہوجاتے ہیں کہ فلاں مہینہ میں فلاں تاریخ کو فلاں بیرونی ملک جائیں اور فلاں مہینہ میں واپس ہوجائیں گے اسی طرح اہم رہنما پارٹیاں بدلنے کا ایک نظام الاوقات پہلے سے طے کرلیں تاکہ ان کے چاہنے والوں کو پتہ چل سکے کہ کس مہینہ میں وہ کونسی پارٹی میں رہیں گے۔ ایک زمانہ تھا جب ملک میں دو چار ہی پارٹیاں ہوا کرتی تھیں جس کی وجہ سے لیڈروں کو مجبوراً ان میں زیادہ دنوں تک رہنا پڑتا تھا لیکن اب ملک میں جمہوریت نے ترقی کرلی ہے۔ اب تو سال کی ۳۶۵ پارٹیاں بھی آپ کو مل جائیں گی لیکن روز روز پارٹی بدلنا اچھا نہیں ہوتا۔ لباس بدلنے اور پارٹی بدلنے میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ رہنماؤں سے ہماری ایک اور گزارش ہے کہ وہ جس پارٹی میں بھی جائیں جانے سے پہلے اپنی جیب میں اس پارٹی سے نکلنے کا استعفیٰ ضرور رکھ کر لے جائیں ان دنوں ٹائپسٹ لوگ رہنماؤں کے استعفیٰ ٹائپ کرنے میں اتنے مصروف ہوگئے ہیں کہ بعض اوقات ٹائپسٹ کے نہ ملنے کی وجہ سے رہنماؤں کو مجبوراً زیادہ دیر تک کسی پارٹی میں رہنا پڑتا ہے۔

گوالوں کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ آنے والے سال میں بھی دودھ میں پانی ملاتے رہیں البتہ ایک گزارش یہ ضرور کرنی ہے کہ سرکاری نل سے جو پانی وہ لیتے ہیں اسے اچھی طرح ابال کر دودھ میں ملایا کریں۔ ہم بھی سرکاری نل کے پانی کو ابال کر پیتے ہیں خام پانی پینے سے ہماری صحت خراب ہوجاتی ہے۔ پانی کو ابالنے میں جو بھی خرچہ آتا ہے وہ ہم سے لے لیں۔ پانی کو ابال لیں تو دودھ میں کیڑے مکوڑے شامل نہیں ہوں گے۔ ایک بار تو ایک مینڈک بھی دودھ میں سے نکل آیا تھا۔ مشورے تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ ان پر عمل نہ کرنے لگ جائیں۔ □□

مصطفیٰ شہاب
(لندن)

بیگم کی نظر میں کسی گنتی میں نہیں ہے
برکت ذری اوپر کی کمائی میں نہیں ہے

خودسر بھی ہے، بیباک بھی، آزاد منش بھی
کیا بات ہے لڑکے کی جو لڑکی میں نہیں ہے

اس نے جو سیاست سے گرائی مری پگڑی
دیکھا کہ مرا سر مری پگڑی میں نہیں ہے

گڈمڈ یوں سمندر میں سمندر ہوئے، اپنے
پانی کا مزہ اب کسی مچھلی میں نہیں ہے

نقشہ جو پڑھا غور سے بمبئی ہے نہ مدراس
دلّی بھی سنا اب تو دہلی میں نہیں ہے

حیرت ہے شہاب تو نہ ادھر ہے نہ اُدھر ہے
بینگن سا لڑھکنے کسی تھالی میں نہیں ہے

●

افتخار وصی
(بیتیا)

ملک میں فسادوں کی گل فشانیاں کب تک
قومی ٹھیکیداروں کی مہربانیاں کب تک

پڑھ کے بی اے، ایم اے جو مارے مارے پھرتے ہیں
اُن کے ناز اٹھائیں گی اُن کی بیویاں کب تک

وقت کی ہے پابندی پھر بھی مے فروشوں کی
حکمراں کے سائے میں دھینگا مستیاں کب تک

اپنی جیت کی خاطر بھولی بھالی جنتا کو
بے سبب لڑائیں گی قومی ہستیاں کب تک

اقتدار کی خاطر مرکزی اکھاڑے میں
رہنما دکھائیں گے ڈسکو کشتیاں کب تک

ملک میں گرانی ہے یہ غلط بیانی ہے
افتخار صاحب کی حق بیانیاں کب تک

●

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

نئے آدم سے لغزش ہو رہی ہے
وہی گندم کی خواہش ہو رہی ہے

زمیں تو پھر زمیں ہے آسماں پر
ہمارے ساتھ سازش ہو رہی ہے

انا کے نام پر ہم سے خدایا
خود اپنی ہی پرستش ہو رہی ہے

ہر اک بوسیدہ چھت کو آزمانے
ہر اک موسم میں بارش ہو رہی ہے

ہماری شاعری، ان کی سماعت
یہ کس پتھر پہ بارش ہو رہی ہے

تخاطب کا عجب انداز ہے یہ
کہ جیسے ہم پہ نالش ہو رہی ہے

دکھائی دے رہے ہیں دن میں تارے
ہمارے سر کی مالش ہو رہی ہے

نجانے کیا شگوفہ پھر کھلا ہے
زباں میں پھر سے خارش ہو رہی ہے

سنبھلنا ہاشمی پھر سے سنبھلنا
ادھر سے پھر نوازش ہو رہی ہے

یُوسف ناظِم

مُرغانِ چمن

عجیب بات ہے بلکہ ایک لحاظ سے مقامِ افسوس ہے کہ ہمارے ذہنوں میں مرغ کا بس یہی ایک امیج ہے کہ اس مخلوق کو صرف ہم لوگوں کی لذت کام و دہن کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس کے سوا اس کا کوئی اور مصرف ہے نہیں۔ یہ نہایت غیر ہمدردانہ نقطۂ نظر ہے۔ اس نظریے کی بنیادی کمزوری کہیئے یا نقص یہ ہے کہ ہم نے مُرغ کو ایک گھریلو پرندہ سمجھ لیا اور اس کی پیدائش کے دن ہی سے اس پر نظر رکھی کہ کب یہ چوزہ بڑا ہو، مرغِ مُسلّم کی حیثیت اختیار کرے اور ہمارے کام آئے۔ یہ تو خیر مُرغ ہے لیکن کسی بھی جان دار مخلوق کو صرف غذائی نقطۂ نظر سے دیکھنا اور اس پر بُری نظر ڈالنا انصاف نہیں ہے۔ مانا کہ انسان کی تخلیق کے مقاصد میں ایک مقصد خورد و نوش بھی ہے اور انسان جس طرح علم حاصل کرنے کی غرض سے چین وغیرہ جاتا ہے اسی طرح غذا حاصل کرنے کی خاطر دنیا کے ہر خطے میں چلا جاتا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہماری ساری سوچ اور توجہ زیستن برائے خوردن کے مقولے کی نذر ہو جائے اور ہماری سب سے پہلے اس پیش پا افتادہ مخلوق پر پڑے جو مرغ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہم سے ایک ادبی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ ہم نے مرغ کو ایک ڈربے کی حد تک یا بہت زیادہ وسیع القلبی دکھائی تو گھر کی چار دیواری کی حد تک محدود کر لیا ہے۔ مرغ صرف وہ پرندہ نہیں ہے جو صرف بانگ دیتا ہے یہ بانگ تو اس مرغ کے فرائض منصبی میں داخل ہے جو گھروں میں پالا اور پایا جاتا ہے اور اب تو آدمیوں کی طرح اس نے بھی اپنے کام میں غفلت برتنی شروع کر دی ہے لیکن اس مرغ کے علاوہ بھی کئی مرغ دنیا میں موجود ہیں اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو ہم سب بلا تفریق زبان و زمین مرغانِ چمن ہیں جو آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔ مرغانِ چمن ہم اس لیے ہیں کہ شاخ پر بیٹھے کوئی دم چہچہائے اُڑ گئے۔ ہو سکتا ہے کہ حالاتِ حاضرہ، مرغانِ چمن میں سے کچھ کو چہچہانے کا موقعہ ہی نہ دیں اور صرف وہ مرغ (مرغے نہیں) باواز بلند نغمہ سرائی کرتے رہیں جنھیں اپنی آواز سننے کا شوق ہے۔ ان کے فرائض منصبی کچھ نہیں ہوتے کیوں کہ یہ خود منصب دار ہوتے ہیں لیکن پیدائشی مرغانِ چمن، یعنی جو پرندے ہوتے ہیں کافی امن پسند مخلوق مانے گئے ہیں۔ یہ آپس میں نہیں لڑتے یعنی کبوتر، کبوتر سے اور باز، باز سے نبرد آزما نہیں ہوا کرتے۔ عقاب چھوٹے موٹے پرندوں پر جھپٹتا ضرور ہے لیکن یہ تو اونچی ذات والوں کا وطیرہ رہا ہے کسی کوّے کو آپ نے فاختہ یا مینا پر حملہ آور ہوتے نہیں دیکھا ہوگا حالانکہ یہ شخص، اپنی پوشش اور اپنی صورت شکل سے خاصا دہشت گرد نظر آتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا چھین کر ضرور فرار ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ عمل بچوں کی

تفہیم اور تربیت کے لیے ہوتا ہے کہ دیکھو ہاتھ آئی ہوئی روٹی کوئی کھلونا نہیں ہے کہ اس سے کھیلتے بیٹھے رہو۔ روٹی بڑی مشکل سے ہاتھ آتی ہے جونہی ملے اس سے استفادہ حاصل کرلو۔ دیر کروگے تو نتیجہ یہی ہوگا جو اب ہوا ہے اور تمہاری ماں تو تمہیں اب دوسری روٹی دینے والی نہیں ہے بلکہ خدشہ اس کا ہے کہ تمہیں آنسو بہانے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آجائے۔ بہرحال آئندہ روٹی کے معاملے میں ہمہ تن متوجہ رہنا۔ یہ روٹی ہے کتنے۔ ابھی سے حفاظت کرنا سیکھو گے تو زندگی میں کامیاب رہو گے ورنہ بھوکے ہی رہ جاؤ گے۔ آپ کہیں گے کوئی کوا اتنی لمبی تقریر نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ کوے کی تقریر کب ہے ہماری ہے اور سوچیا کبھی اور یہ تقریر ہم نے ایک ورکشاپ کے لیے تیار کی تھی کیوں کہ مشہور یہ ہے کہ تقریر کرنے کے لیے سب سے معقول جگہ ورکشاپ ہے جہاں تقریریں دل لگا کر سنی جاتی ہیں جلسوں میں تو صرف مقرر ہی اپنی تقریر سنتا ہے۔ باقی لوگ تو لنچ کے لیے آتے ہیں۔

مرغانِ چمن کے تعلق سے ہماری رائے یہ ہے کہ یہ بے زبان مقرر ہوا کرتے ہیں۔ کبوتروں کی غٹرغوں تو اچھی خاصی شعر گوئی ہے۔ گو کہ ان کا ذخیرۂ الفاظ یعنی وکیبلری بہت محدود ہے لیکن جتنی بھی ہے کافی ہے۔ ساقط البحر نہیں ہے۔ اس غٹرغوں میں ایک آہنگ ہے جو اکثر شاعروں کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ کوئل کی کوک سننے کے لیے تو لوگ شہر چھوڑ کر گاؤں جاتے ہیں اور وہیں کسی پیپل یا نیم کے درخت کے سایے میں کھٹیا بچھا کر دراز ہوجاتے ہیں کہ اب کوئی کوئل آئے گی اور کانوں میں رس گھول دے گی۔ ریل کے انجن کی کوک سنتے سنتے ان کے کان آلودگی کا شکار ہوچکے ہوتے ہیں۔ کوئل کی کوک میں پتہ نہیں اتنا سوز کہاں سے آگیا کہ اسے سن کر شاعر کہہ اٹھتا ہے ؎

مرغِ دل مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع ٭ اس قفس کے قیدیوں کو آب و دانہ ہے منع

قمریوں اور بلبلوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ مرغانِ چمن انڈین ڈومیسائل نہیں ہیں لیکن ہمارے تخیل یافتہ اور تصور زدہ شاعروں نے بہرحال اپنے اپنے دفتر سے انھیں لوکل شہری ہونے کا وثیقہ عطا کردیا۔ (دفتر کا مطلب آفس یا باکس آفس نہیں بلکہ وہ دفتر ہے جو صاحبِ دیوان شاعر مرتب کرتے ہیں)۔ جہاں تک ہمارا حافظہ کام کرتا ہے، ہمیں یاد آتا ہے کہ ایک شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا قمریوں نے موصوف کی طرزِ فغاں لوٹ لی تھی۔ (مشاعروں میں تو یہ ہوتا ہی ہے ایک شاعر کے گھر میں تو لوٹے ہوئے مشاعروں کا اتنا انبار جمع ہے کہ خود صاحبِ طرز شاعر کے رہنے کے لیے جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ شکر ہے کہ نثر نگاروں میں جلسے لوٹنے کی تحریک شروع نہیں ہوئی ہے۔ کچھ لوگ اپنی تشہیر کی خاطر کہیں کچھ لکھ دیتے یا بول دیتے ہیں لیکن یہ صرف اپنی دل کی تسلی کی خاطر ہوتا ہے واقعہ نگاری نہیں ہوتی)۔

مرغانِ چمن میں سچ پوچھیے تو ہمیں صرف وہی گھریلو مرغ پسند ہیں جو انسانوں کے دل کا حال جانتے ہیں اور دفورِ محبت میں مرغِ بسمل بن کر بعد میں تندوری مرغ کی شکل میں دسترخوان کی زینت بنتے ہیں۔ ویسے تندوری مرغ گھریلو ڈش ہے نہیں یہ ہوٹلوں ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح شیر خرما صرف گھروں میں زیب دیتا ہے یہ مرغ بھی اپنے مقام پر مسند نشین رہے تو اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور شیر خرمے کے معاملے میں تو صرف مقامِ ولادت نہیں تاریخِ ولادت بھی مقرر ہے۔ یہ عیدالفطر کے دن تخلیق کیا جاتا ہے۔ لوگ اس کے لیے ایک خاص نماز پڑھتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی پڑھتے ہیں جو کوئی دوسری نماز نہیں پڑھتے۔ شیر خرمے میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ شیر خرما دوسرے دنوں میں بھی مزا دیتا ہے لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ہارمونیم پر طبلہ بجا رہے ہوں۔ شیر خرمے کے ذائقے میں بہرحال کوئی فرق نہیں آتا لیکن یہ کسی صورت میں بھی ہوٹل کا ڈش نہیں ہے۔ اسے نہ صرف پکانے کے لیے بلکہ کھانے کے لیے بھی گھر ہونا چاہیے۔ شیر خرمے کی نفاست کے لیے

عورتوں کی نظامت ضروری ہے۔ مردوں کو اس ڈش کی تیاری میں دور سے بھی دخل نہیں دینا چاہیے۔ ہاں تندوری مرغ جتنے چاہیں کھالیں۔ اونچی ٹوپیاں پہن کر کھائیں تو تندوری مرغ زیادہ دلفریب دکھائی دیتا ہے ــــ یہ فریب وہ فریب نہیں ہے جس کے پچھلے ۵۰ سال سے ہم عادی ہو چکے ہیں یہ فریب دلفریب نہیں دلیس فریب ہوتا ہے جب کہ تندوری مرغ کی دلفریبی دلآویزی سے بھی آگے کی چیز ہوتی ہے۔

تندوری مرغ خالص ہندوستانی ڈش ہے اور اسے بڑی تمناؤں کے ساتھ باہر کے ملکوں میں برآمد کیا گیا ہے۔ یہ ڈش جہاں جہاں بھی پہنچی وہاں کے باشندے اس کے قائل ہو گئے۔ ایک ملک میں تو اس نے وہ ہنگامہ برپا کر دیا کہ تندوری مرغ کھا کھا کر وہاں کے لوگ اپنا ازم بھول گئے۔ ہم مرغانِ چمن کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ جہاں بھی گئے یا تو وہیں کے ہو گئے یا اندر ہی اندر تندوری مرغ کے توسط سے رموزِ سلطنت میں دخل دینے لگے۔ تندوری مرغ کسی بھی نظامِ مملکت کی شکست و ریخت کے لیے کافی ہیں۔ پچھلے زمانے میں بھی بادشاہوں نے خورد و نوش کے شوق ہی میں اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ (الزام کسی دوسرے شوق کے سر آیا) تندوری مرغ کو صرف ذائقے کے لیے کھانا چاہیے شکم پری کے لیے کچھ دیگر غذائی مصنوعات استعمال کی جائیں تو توازن برقرار رہتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ "تندوری مرغ کو دیکھ کر اہلِ طعام یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر اس پیارے مجموعہ کلام سے مستفید نہ ہو سکے تو پھر دسترخوان پر بیٹھنے کا کوئی جواز ہی نہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ مرغ محظوظ ہونے کے لیے ہے مستفید ہونے کے لیے کتنی ڈشیں پڑی ہوتی ہیں۔ آپ نے ادبی جلسوں میں بھی دیکھا ہوگا کہ جب مقررین کو تقریر کرنے کے لیے مائیکروفون پر بلایا جاتا ہے تو ان میں سے چند کے لیے کہا جاتا ہے کہ مظفر صاحب آپ کو اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے اور لطیف الدین صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موصوف اپنے ارشادات سے محظوظ فرمائیں گے۔ اس مثال سے آپ تندوری مرغ کی غذائی صلاحیتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ویسے مرغ کسی شکل میں پیش کیا جائے اپنا مقام بنا لیتا ہے۔ ایک اور نکتہ جو شاید آپ کے ذہن میں نہ آیا ہو (کھلے ذہن کی یہی خرابی ہوتی ہے) یہ ہے کہ تندوری مرغ اور تندوری روٹی میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے۔ یہ لفظ تندوری صرف 'سرنیم' ہے جو لاحقے کے طور پر نہیں سابقے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دونوں کا خاندان ایک ہے لیکن ان میں مراسم نہیں ہیں۔ "تندوری مرغ کے ساتھ مناسب یعنی اس کے شایانِ شان سلوک یہی ہے کہ اسے تنہا خدمتِ شکم کا موقعہ دیا جائے۔ اسی صورت میں اس کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ تندوری روٹی کی شکل یہ ہے کہ یہ کسی سیال ڈش کے ساتھ اپنے جوہر دکھاتی ہے اس کی شان الگ ہوتی ہے۔ اور ایک زمانہ تھا جب اس کی خاطر گھروں میں لوگ مختلف تعمیراتی کاموں کی تکمیل کراتے ہوئے صحن کے کسی کونے میں ایک تندور کی گنجائش بھی نکال لیتے تھے اور سال بھر میں تین یا کم سے کم دو مرتبہ یہ تندور ضرور روشن کیا جاتا تھا۔ بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور بڑے

اندیشۂ باطل!

"بھئی میں نے سوچا ہے مجھے اب شادی کر ہی لینی چاہیے"۔
اردو کے ایک نہایت نامور اور کہنہ مشق شاعر نے پریشان سا ہو کر کہا
"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ــــ کر لیجیے"۔
مجاز نے مشورہ دیا۔
"لیکن ـ بات یہ ہے کہ میں کسی بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔
"آپ کسی سے بھی شادی کر لیجیے ــــ"
مجاز نے نہایت سنجیدگی سے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔
"ــــ بیوہ تو وہ بے چاری ہو ہی جائے گی۔"

انھیں دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ہنر مند لوگوں کا ہنر بچشم خود دیکھ سکیں۔ بڑوں نے ہمیشہ چھوٹوں کو ہر اچھی چیز سے محروم رکھا ہے اور نام تحفظ کا دیا ہے۔ اس دنیا میں ناانصافی کو پھلنے پھولنے دینے کی تدابیر بکثرت ہیں جن پر آدمی وقفے وقفے سے عمل پیرا ہوتا رہتا ہے۔ خمیری روٹیاں بھی اسی تندور سے برآمد کی جاتی تھیں نان کا مولد بھی یہی تندور تھا اور ہمارا خیال ہے باقر خانی (جسے ہم ایک عرصے تک بیگم باقر خاں سمجھتے رہے) بھی تندور کی آگ پر چل کر باہر آیا کرتی تھی۔ اس تندور میں مرغ تیار نہیں کیا جاسکتا تھا اور یہی نکتہ بتاتا تھا کہ تندوری مرغ اور تندوری روٹی میں سلسلہ جنبانی نہیں ہو سکتی۔ تندوری مرغ، تنہا مصرعہ ہونے کے باوجود مکمل شعر ہے جب کہ تندوری روٹی صرف مصرعہ اول ہے اس کے لیے مصرع ثانی بہرحال درکار ہے۔ شعر گوئی کے ماہرین کا قول ہے کہ گو پہلا مصرعہ مطلب کو ظاہر کر دیتا ہے لیکن وہ معتبر دوسرے مصرع ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تندوری روٹی کے ساتھ قورما، قلیہ یا کم سے کم یخنی تو چاہیے ہی۔ مرغ کی ایک اور قسم ہوتی ہے یعنی مرغِ مسلّم۔ اسے کچے دھاگوں میں باندھ کر دسترخوان پر لایا جاتا ہے۔ یہ البتہ گھر کی ڈش ہے اور خواتین جس دن مرغ مسلّم تیار کرتی ہیں گھر کا کوئی دوسرا کام نہیں کرتیں وہ کہتی ہیں مرغ مسلّم کی تیاری تو پکوان بھی ہے سلائی بھی۔ ہم عموماً خواتین کے خیالات سے متفق نہیں ہوتے (دل ہی دل میں) لیکن چونکہ یہاں معاملہ مرغ مسلّم کا ہے ان کی رائے سے اختلاف کرنا کفرانِ نعمت ہوگا اس لیے جو وہ کہتی ہیں اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔ مرغ مسلّم تیار کرنے کے بعد اپنا حلیہ ٹھیک کر لیں یہی بہت ہے۔

عورتوں کو تندور سے دور اس لیے بھی رکھا جاتا ہے کہ کہیں ان کی گرم مزاجی کی وجہ سے تندور کی آگ بھڑک نہ اٹھے۔ اور بعض خواتین کی تو آواز ہی میں شعلہ سا لپکتا معلوم ہوتا ہے یہ تندور کے قریب جا کر کیا کریں گی تیاست کو دم تو لینے دیں ـــــ لیکن مردوں نے جنھیں آتش زنی کے مشاغل پر عبور حاصل ہو گیا ہے تندور کو بھی استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایک خاتون کو نذرِ آتش کرنے کے لیے انھوں نے تندور ہی استعمال کیا۔ پولس کے لیے یہ صحیح موقع تھا انکاؤنٹر منعقد کرنے کا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انکاؤنٹر کا صحیح ہونا قانوناً منع ہے ـــــ "مرغانِ چمن" کی داستان چمن میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ شاعر نے اسی لیے کہا ہے۔

ع مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع۔

اس واردات پر اظہارِ افسوس کرنے کے بعد لوگ تندوری مرغ ہی سے شوق فرماتے ہیں۔ یہ رفعِ تکلیف کا بہترین نسخہ ہے۔

شفیقہ فرحت
(بھوپال)

پگڑی

نئے سال کی آمد آمد ہے۔ موسم کی سردی اور حالات کی گرما گرمی حضورِ پُر نور کے آنے کی بشارت دے رہے ہیں وہ تشریف لائیں گے تو رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں گی ہر کلب، ہر ستارہ بے ستارہ ہوٹل میں، ہر چوراہے پہ ہر گلی کے نکڑ پہ اور ٹی۔ وی کے طفیل ہر جھگی جھونپڑی میں HAPPY NEW YEAR کے نعرے لگیں گے۔ ہر شخص ناچ دکھائے گا۔ ایسا کہ دیکھنے والا یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ خوشی کا ناچ ہے یا موت کا۔
گیت سنگیت کا بھی یہی رنگ ہوگا۔ اور صاحب جب دیکھنے دکھانے والے اچھلیں گے تو ٹوپ ٹوپیاں، پگڑیاں (مع اشتہاری زلفوں کے ـ!) بھی اچھلیں گی ـ! اچھلنے کی اونچائی تیزی تندی طاقت کیا ہوگی یہ تو اچھلنے اچھالنے والے ہی جانیں۔ بہرحال ایک بات تو طے ہے جو چیز جتنی تیزی سے اچھلتی ہے اتنی ہی طاقت سے گرتی بھی ہے ـ!

ویسے حضور ہم یہ عرض کردیں کہ ہمارا موضوعِ سخن نہ راجے مہاراجوں کی جھل بل والی ہیروں جواہرات سے سجی سنوری چمکتی دمکتی پگڑیاں ہے۔ نہ سرداروں کے رنگ برنگے صافے ہے (قومی ایکتا کے لہراتے جھنڈوں کی طرح ـ!) نہ ساکشارتا مشن کے چلنے کے باوجود ان پڑھ کے ان پڑھ رہ جانے والے دیہاتی کا پگڑ ہے جو اسے سردی گرمی اور موسم کے دیگر شدائد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر جو بات بے بات، ہر دوسرے لمحے کسی نہ کسی کے قدموں پہ پڑا نظر آتا ہے۔

ہمارا موضوعِ سخن تو قلی کا وہ چھوٹا سا پھٹا پرانا انگوچھا بھی نہیں جسے وہ بطور پگڑی سر پہ رکھ کے منوں بوجھ ہنسی خوشی اٹھا لیتا ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ اس دائرے میں خواتین کے ان جوڑوں کو بھی لے آئیں جو ذرا سی نظر فریبی سے پگڑ پگڑی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن رہنے دیجئے زلفوں میں الجھ گئے تو ہمارا ہی نکلنا مشکل ہے دوسروں کی بات کیا کریں ـ!
ہمیں تو لینے دینے والی پگڑیوں سے دلچسپی ہے۔ ویسے سنا ہے کہ آج کل پگڑی بھی سر کیولیشن میں نہیں رہی بلکہ سپاری لی دی جاتی ہے۔ عہدِ رفتہ میں پان کا بیڑا اٹھتا تھا فخر و سربلندی کے ساتھ۔ اب اتنی نازک چیز کو اٹھانے برتنے کی صلاحیت سلیقہ کہاں۔ سپاری ہی سہی۔ لیکن سپاری کا کردار اہلِ سیاست کی طرح شک شبہ میں ڈالنے والا ہے۔
خیر ہمارا تعلق سپاری سے بھی کب ہے۔ وہ تو برسبیلِ تذکرہ اس کا نام نامی زبان پہ آ گیا اور قلم پھسل پڑا ـ!

ہماری اطلاع ناقص کے مطابق پگڑی زمین، جائیداد محل، دو محلے بنگلے، فلیٹ اور جھگی جھونپڑی بلکہ فٹ پاتھ
بھی اصل مالک کو اپنے مالکانہ حقوق کو حاصل کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔
کہ سچا انسان ہمیشہ جسمانی اعتبار سے کمزور اور کم ہمت ہوتا ہے اور نیل پیلائی لاٹھی اور بے دھڑک بھڑک چلنے والی
مشین گنوں کے استعمال سے ناواقف۔ لہٰذا جتنی ہمت اور توفیق اس کے پاس ہوتی ہے۔ اسے وہ فریقِ ثانی کی
خدمت میں پیش کر کے اپنی بچی کچی جائیداد۔ ٹوٹا پھوٹا تباہ شدہ مکان حاصل کرتا ہے اور ایک آدھ سانس چین کی لے لیتا
ہے۔ کہ "اس کے بعد چراغوں میں روشنی کہاں"، یعنی سانسیں ہی کب باقی رہتی ہیں ——!

چند برس پہلے کی بات ہے۔ بات کیا۔ کہ بات سے وہ واردات بن گئی۔ خیر تو چند برس پہلے جب ہم
برسرِ روزگار تھے۔ اور شہر بھوپال کے پُرفضا مقامات پر بلند قامت عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس
زمانے تک "بھورن"، جانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ہم چھوٹے شہر والے بمبئی، دہلی کی اونچی عمارتوں کو نیچے
سے حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ بلند درجہ حاصل نہیں کر سکتے تو اونچے مکان میں ہی
رہ لیں۔ اور جناب دل ہی تو تھا۔ وہ بھی غالب زدہ ایک نہیں ہزاروں خواہشیں ——!

دوسری خواہش دلفریب قدرتی مناظر کا نظارہ۔ ہر پل ہر لمحہ۔ ظاہر و باطن کی آنکھ سے ——!
بھوپال اگر آپ نے نہیں دیکھا تو ہم ابھی آپ کو بلا ٹکٹ سیر کراتے ہیں۔ یہ تال تلیوں اور پہاڑ پہاڑیوں کا شہر ہے
وہ نشیب و فراز کہ عقل حیران۔ نظر پریشان۔ اور ایسا سبزہ زار کہ اصل پہ نقل کا گمان گزرے۔
ہم جس سرکاری فلیٹ میں رہتے تھے وہاں یہ نظارے بطور بونس حاصل تھے۔ سو ہم نے طے کر لیا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اس
سے کم پہ سمجھوتہ نہیں کریں گے۔

زبرِ زمین کی بات اور ہے۔ اس پہ اپنا اختیار کہاں۔
تو جب تعمیرات کی بنیادیں رکھی جانے لگیں تو سطح تالاب سے سب سے اونچی پہاڑی والے علاقے میں شہر
کی سب سے بلند عمارت یعنی آٹھ منزلہ بنائے جانے کا اعلان ہوا۔ آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی عرض کر دیں کہ ہمارے
شہر میں آج بھی اس منزل سے اوپر کوئی اٹھا نہیں ——! لہٰذا اس کی آٹھویں منزل کے اُس رخ والے فلیٹ کو ہم نے بک کر لیا
جس سے بھوپال دہرہ دون مسوری کی ڈپلیکیٹ کاپی لگتا ہے۔ اور جس کی ہر دو بالکونیوں سے چھوٹے بڑے تالاب
بیک وقت دکھائی دیتے ہیں۔

فلیٹ بک کرنے سے پہلے عوام و خواص نے بہت ورغلایا کہ زمین جائیداد کی باتیں بڑے لوگوں کو زیب دیتی ہیں۔ ہم جیسے
غریب غربا کے لیے خوابوں کے محل ہی مناسب ہیں۔ مگر وہ جو کہنے والے کہہ گئے ہیں کہ ایسے موقعوں پر عقل بھی تو ماری جاتی
ہے۔ اور عقل بھی ہمارے پاس ایسی کون سی ڈھیروں الغاروں تھی۔ ایک جلے اور ایک جلے میں اس کا صفایا ہو گیا ——!
اس کے بعد طرح طرح کے محاورے گوش گزار کروائے گئے کہ "بے وقوف مکان بناتے ہیں اور عقلمند اس میں رہتے ہیں"۔
اس محاورے کا توڑ ہم نے یہ پیش کیا کہ مکان انجینئر اور مزدور مل کے بنا رہے ہیں۔ ہمیں تو صرف رہنا ہے۔ قیام
عارضی ——!

داستان کی دوسری بلکہ تیسری چوتھی کڑی یہ کہ ہم پہ منکر و نکیر کی طرح سوالوں کی بوچھار کی جانے لگی۔ پہلا

"آٹھویں منزل کیوں"

عرض کیا "اس عمارت میں نویں منزل نہیں"۔

پھر ہمدردانِ صحت نے نحیف دل اور کمزور پھیپھڑوں کی یاد دلائی مختصر ہلکے پھلکے کاغذی جسامت کی طرف متوجہ کیا کہ غالباً ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی برداشت نہ کر سکیں"۔

ہم نے عرض کیا کہ یہ ہمارے اور ہوا کے آپسی تعلقات پر منحصر ہے۔ کبھی کبھی ہم بھی ہوا کا رُخ دیکھ لیتے ہیں اور پہچان بھی لیتے ہیں۔

غرض یہ کہ پچیس پچاس جگہ دستخط کرنے اور سرکاری خزانے سے قرض اُدھار کے بعد وہ فلیٹ ہمارا کہلانے لگا۔ مگر جب آدمی تنخواہ قرض میں چلی جائے تو ہمارے حال احوال کیا ہوں گے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے جسم وجان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے مکان کو کرایہ پہ دینا لازمی تھا۔

ہماری بچی کچی عقل پہ دوبارہ حملہ ہوا۔ مکان ہم نے اُس بزنس مین کو دے دیا جو عین ہمارے اس نئے گھر کے در کے سامنے رہتے تھے۔ کہ انہوں نے اور ان کی بیگم نے اور ان کی آدھی درجن دختران نے "تنگیٔ جا" کی داستان سنا کر خود کو بیحد ستم زدہ ثابت کر دیا تھا اور فرمایا ؎

"کیوں نہ دوزخ کو جنت سے ملا دیں یارب"

ہم تو ہمیشہ مظلومین کا ساتھ دیتے ہیں ۔۔۔! اس پہ سہارا لیا گیا غالب کے شعر کا ۔۔۔!

چند برس بخیر و عافیت گزر گئے۔ برائے نام کرایہ جو وہ دیتے تھے اس میں بھی ہماری غائب دماغی کی بناء پر ان سے گاہے گاہے بھول چوک ہو جاتی تھی۔

جب ہم باقاعدہ و باضابطہ رٹائر ہوئے اور حضور سرکار نے ہمیں سرکاری مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا۔ اور چند یا دو ماہیوں کے بعد پنشن روک دی تو ہم نے اپنے کرایہ دار سے عرض کیا کہ اب وہ نہیں ہم مظلوم ہیں۔ لہٰذا جلد از جلد ہمارا مکان ہمارے حوالے کیا جائے۔

اتنے طویل عرصے اس مکان میں رہنے بسنے کے بعد وہ بھول چکے تھے کہ اصل مالک کون ہے۔ خیر یاد تو ہمیں بھی غیر سرکاری نوٹس کے نہ آیا تھا ۔۔۔! انہوں نے ٹال مٹول آنا کانی شروع کی اور قبضہ دینے کے بجائے قبضہ لینے کی بات کی یعنی سستے داموں مکان خریدنے کی پیش کش کی جسے ہم نے تلخی اور سختی سے رد کر دیا۔ بعد اس کے ہمیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ آج کی سرکاری عدالت شہنشاہ جہانگیر کی درباری عدالت تو ہے نہیں کہ زنجیر کھینچی اور انصاف کا تیر کمان آپ کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا۔

فریق ثانی ٹھہرے بزنس مین۔ کچہری عدالت ان کی تفریح گاہ۔ ہم ٹھہرے معلم سو ہمارے لیے عذاب جان۔ ہم تو دو چار پیشیوں میں ہی نیم جان ہو گئے۔ پھر الف لیلوی داستانوں کے ایسے ایسے بھیانک حلئے قصے سنے مثلاً یہ کہ مکان کی حسرت لیے مالکِ مکان جہانِ فانی سے ہی گزر گئے۔ کرایہ دار نے بس اتنا احسان کیا کہ جنازہ ان کے مکان سے اُٹھانے کی اجازت دے دی ۔۔۔!

وکیل ہم نے نامی گرامی کیا یعنی بار ایسوسی ایشن کے صدر۔ ویسے ہی کیس ان کے شایانِ شان نہ تھا پھر ہماری

بے دماغی اور کاغذات اور رسیدوں وغیرہ کے سلسلے کی بے سرو سامانی دیکھ کر ان کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہوگئی اور وہ غیر شعوری طور پر فریقِ ثانی سے جا ملے اور انہیں ہماری تمام کوتاہیوں سے بوقتِ ضرورت آگاہ کرتے رہے۔

اسی دوران اسی شہرت یافتہ بلڈنگ میں اُسی مخصوص رخ وزاویہ والے چھٹی منزل کے فلیٹ پہ FOR SALE کی تختی لگ گئی۔ پتہ چلا کہ یہ بھی کرایہ دار اور مالک مکان کے عدالتی تعلقات کا نتیجہ تھا — ! ہر دو جانب کے وکلا کے ذریعہ یہ تجویز ہمارے سامنے رکھی گئی کہ ہم اپنے اصل فلیٹ کے بدلے اِسے شرفِ قبولیت بخش دیں تو OUT OF COURT معاملات طے ہوسکتے ہیں —

ورنہ —— !

یہ ' ورنہ ' ہمارے لیے پیغامِ مرگ سے کم نہ تھا۔

ہم نے کہا — " آٹھویں سے چھٹی منزل —؟ " بلندی کے بجائے پستی —؟ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے —؟ سمجھایا اہلِ دانش وبینش نے کہ ابھی آپ کھجور میں گوشۂ عافیت تو بنا سکتے ہیں۔ ورنہ آسمان سے سیدھے تحت الثریٰ میں ہی CRASH LANDING ہوگی۔ اور اس پر بھی غور فرمایئے کہ آپ کو کھجور سے تعلقات استوار کرنے کا موقع فراہم کیا جارہا ہے (محاورتاً ہی سہی — !)

خیر — جنگ ہند وچین کی طرح کا سمجھوتہ ہوگیا۔ پہلی قسط میں ہمیں چار سال کا کرایہ اور دو منزلیں بطور پگڑی کے پیش کرنی پڑیں۔ روتے ہنستے گاتے ماتم کرتے ہم سولہ اور سولہ بتیس سیڑھیاں نیچے اتر آئے۔ قیامِ امن واماں کے بعد جو بالکونی کا دروازہ کھولا تو ایک اور تیر جگر میں پیوست ہوا۔

آٹھویں منزل سے دو تالاب کبھی ہلکورے لیتے کبھی تختۂ نیلم دکھراج کی طرح چمکتے دمکتے نگاہوں کے دائرے میں، ہر وقت رہا کرتے تھے۔" اب جو دیکھا کچھ نہ تھا جز تالابِ خُرد "

ایک تالاب پورا کا پورا اس سرے سے اُس سرے تک غائب۔ یہ تو P.W.D کے قسم کا معاملہ ہوگیا۔ کہ فائیلوں میں تالاب کھودا بھی گیا اور فائیلوں ہی میں بھر بھی دیا گیا۔

جب اس صدمۂ جانکاہ سے جانبر ہوئے تو اس نتیجے پہ پہنچے کہ ایک تالاب ہوگیا پگڑی کی نذر !

آٹھویں منزل میں دو تالاب۔ چھٹی میں ہاتھ آیا صرف ایک — !

اِتنی بڑی، اِتنی زبردست، اِتنی قیمتی پگڑی ایک چھوٹے سے فلیٹ کے لیے —؟ □□

مسیح انجم
(حیدرآباد)

ملک کافور کا روٹ (ROUTE)

لنچ ٹائم کے لیے صرف چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اور صبح ہی سے دفتر کوہ قاف میں ملک کافور پر اظہار خیال ہو رہا تھا۔ مختلف سیکشنوں کے کلرکس اور چند ایک سپرنٹنڈنٹس اپنی اپنی سیٹ چھوڑ کر ایک ہال میں جمع ہو گئے تھے بمقصد یہی تھا کہ گپ بازی میں کسی نہ کسی طرح وقت کٹ جائے، اور لنچ ٹائم آ پہنچے۔ لیکن ابھی تک علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور کے روٹ (route) کا تعین نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کس روٹ (route) سے دکن کی طرف فوج کشی کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اور راستے میں کہاں کہاں پڑاؤ ڈالے تھے؟ آیا وہ پیدل ہی نکل پڑا تھا، یا گھوڑے پر سوار؟ اس کے توشے میں بریانی تھی، یا توشے دان خالی تھا! اور جب وہ وندھیاچل کے پہاڑ پار کر رہا تھا تو اس کی چوٹیاں خاموش کیوں کھڑی تھیں؟ مدافعت کیوں نہیں کی تھی؟ اور جب وہ بغیر اجازت اور بے کھٹکے ورنگل کی طرف بڑھ رہا تھا تو وہاں رعایا سو رہی تھی، یا شادیانے بجا رہی تھی؟ —— اس کنفیوژن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کلرک نے اپنے ساتھی کلرک سے پوچھا "ارے یار! یہ تو بتا کہ ملک کافور نے سامنے سے حملہ کیا تھا، یا پیچھے سے؟"

دوسرے کلرک نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "میں نے اتنی تاریخ نہیں پڑھی ہے۔ گمان غالب ہے کہ ملک کافور نے پیچھے سے حملہ کیا ہوگا تاکہ دشمن کی فوج کی نیند میں خلل نہ پڑے!"

اس پر تیسرے کلرک نے مداخلت کی "ابھی تو ملک کافور کے روٹ ہی کا تعین نہیں ہوا ہے، اور تم ہو کہ حملے کی بات کر رہے ہو!"

کلرک نے سمجھایا "حملہ چاہے پیچھے سے ہو، یا سامنے سے، بہر حال حملہ ہے۔ اور خون خرابہ ہو ہی جاتا ہے!"

دوسرے کلرک نے ٹوکا "پچھلے دو گھنٹے سے بحث ہو رہی ہے، اور ابھی تک ملک کافور کے روٹ کا تعین نہیں ہو پایا ہے تُف ایسی بحث پر۔ آج کا دن تو بس یوں ہی گیا سمجھو! اگر یہی حال رہا تو دیش کیسے ترقی کرے گا؟"

چوتھے کلرک نے انتہائی لاپرواہی سے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "ملک کافور کے روٹ کا تعین تو بعد میں ہوگا۔ پہلے بتاؤ کہ روٹ (route) مذکر ہے یا مونث ہے؟"

اس پر پہلے کلرک نے روٹ کا رشتہ محکمۂ پولیس سے جوڑتے ہوئے کہا "روٹ کا تعلق تو ٹریفک پولیس سے ہے۔ لہٰذا ہم "مذکر مونث" کی چکر میں کیوں پڑیں؟"

اس پر سپرنٹنڈنٹ نے فرمایا "بات تو معقول ہے۔ میں ابھی اس کیس کو ٹریفک پولیس کمشنر سے رجوع کیے دیتا ہوں کہ ان کا محکمہ ملک کافور کے روٹ کا سراغ لگائے!"

وقت گزاری کے لیے یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ریاست کے چیف منسٹر، اپنے ایجنڈے میں شامل "فائلس کلیرنس" پروگرام کے تحت، سرپرائز وزٹ کے لیے اپنے روٹ کا تعین کیے بغیر، گھر سے نکل پڑے کہ دیکھیں کہ دفتروں میں فائلوں کا کیا حال ہے؟ اور ایسی کتنی فائلیں پینڈنگ پڑی ہوئی ہیں جن سے عوام کی آرزوئیں اور آہیں لپٹی ہوئی ہیں۔ جب، وہ اچانک "دفتر کوہ قاف" میں داخل ہوئے، تو ملازمین خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں مصروف، ملک کافور کی دکن پر فوج کشی کے روٹ کے تعین میں مصروف تھے۔ عین اسی وقت چیف منسٹر کچھ اس انداز سے دفتر میں داخل ہوئے جس طرح امتحانات کے زمانے میں فلائنگ اسکواڈ امتحانی مراکز پر چھاپہ مارتا ہے۔ فلائنگ اسکواڈ کے چھاپہ مارتے وقت طلباء کو اتنی مہلت مل ہی جاتی ہے کہ وہ اپنی چھٹیوں کو باہر نہ پھینک سکیں تو کم از کم چیونگم کی طرح چبا چبا کر نگل جائیں۔ اب پہلے ہی فلائنگ اسکواڈ کا عملہ طلباء کے پیٹوں میں داخل ہو کر چھڑوتی لینے سے تو رہا! لیکن دفتر کوہ قاف کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ چیف منسٹر کی سرپرائز وزٹ میں ایسی زبردست سرپرائز شامل تھی کہ ملازمین کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ فائلوں کو ہٹا تے۔ یا نہیں تو کم از کم فائلوں پر جمی ہوئی گرد ہی جھاڑتے۔ چیف منسٹر دفتر میں کیا داخل ہوئے —— ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ہر شخص اپنی اپنی سیٹ کی طرف یوں لپکا جیسے میوزیکل چیرس پروگرام میں حصہ لینے والے افراد کرسی پر قبضہ جمانے کے لیے جھپٹتے ہیں۔ اس چھڑا جھپٹی اور افراتفری میں دو ایک کرسیاں اُلٹ گئیں۔ بلکہ ایک کرسی میں تو دو کلرک سما گئے۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ایک کلرک سپرنٹنڈنٹ کی کرسی پر جا بیٹھا کہ دیکھیں یہ کرسی کتنی آرام دہ ہوتی ہے۔ یہی نہیں —— جب ایک کلرک نے گھبراہٹ میں ایک پچپن سالہ لیڈی کلرک کی گود کا رُخ کیا، تو لیڈی کلرک نے اس کلرک کو پرے ڈھکیلتے ہوئے جھڑک کر کہا:

"یہاں کہاں بیٹھتا ہے؟ یہ گود تو میرے پوتے اور پوتیوں کے لیے وقف ہے!"

مختصر یہ کہ، ایک عجیب طرح کی افراتفری پھیل گئی تھی۔ اگر ملازمین کا بس چلتا تو فائلس کلیرنس کے بہانے ساری فائلیں چبا کر نگل جاتے۔ مگر وہ تو فائلیں تھیں، چیونگم نہیں۔ اور فائلیں بھی کیسی؟ —— نہایت ہی بھیانک حلتک لبسیلہ۔ اور گرد میں اٹی ہوئی —— جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ وہ برسوں سے اسی انتظار میں پڑی ہوئی تھیں کہ کوئی تو نجات دہندہ آئے، اور انھیں دفتریت کے آزار سے مُکتی پراپت ہو۔ بعض فائلوں کے انبار میں جھینگروں اور دوسرے حشرات الارض نے بود و باش اختیار کر لی تھی، اور اپنی نسل کو بڑھانے اور پروان چڑھانے میں مگن اور مصروف تھے۔ اتنے میں تھوڑی سی ہوا چلی تو فائلوں کے پنے پھڑپھڑائے، جیسے کہ ان میں جان پڑ گئی ہو۔ چیف منسٹر نے فائلوں پر نظریں دوڑائیں تو کلرکس بغلیں جھانکنے لگے کہ فائلوں کی یکسوئی کے بعد ان کی بالائی آمدنی کا سرچشمہ بند ہو جائے گا۔ چنانچہ —— چیف منسٹر نے وہیں کھڑے کھڑے ایک کلرک سے پوچھا "یہ فائلیں کب سے رکھی ہوئی ہیں؟ اور ان کا ذمہ دار کون ہے؟"

کلرک نے گھبراہٹ میں ہکلاتے ہوئے کہا "میں نہیں جانتا سر! میرا اپوائنٹمنٹ تو ح...ح... حال ہی میں ہوا ہے!"

تب چیف منسٹر نے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک گھاگ قسم کے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا "اچھا تو جناب، آپ ہی بتائیے کہ ان فائلوں کا ذمہ دار کون ہے؟" سپرنٹنڈنٹ سے کچھ بن نہ پڑا تو اپنی جان چھڑانے کے لیے بولا "مجھے بھی نہیں معلوم سر! اس سکشن سے میرا کوئی سمبندھ نہیں ہے!"

چیف منسٹر نے اُس سے وضاحت طلب کی "جب آپ کا کوئی سمبندھ نہیں، تو پھر آپ اپنی سیٹ چھوڑ کر اِدھر کیوں آئے تھے؟"
سپرنٹنڈنٹ کے منہ سے جھٹ نکل گیا "میں تو صرف ملک کا فور کا روٹ بتانے آیا تھا!"
یہ سنتے ہی چیف منسٹر کو ہنسی آگئی۔ لیکن انہوں نے اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "آپ تو اپنے روٹس اور روٹس نہیں جانتے۔ لیکن ملک کا فور کا روٹ بتانے آئے ہیں۔ کیا فائلوں کی یکسوئی کرنا روٹین میں شامل نہیں ہے؟"
سپرنٹنڈنٹ نے کہا "اگر آپ پیشگی اطلاع دے کر آتے تو یقیناً تمام فائلیں جھاڑ جھٹک کر آرڈر میں رکھ دی جاتیں لیکن چونکہ آپ سرپرائز وزٹ پر تشریف لائے ہیں، ہم بھی کچھ سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ گوارا کرلیجئے: جمہوریت میں تو اتنا برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں سر کہ فائل سسٹم کو ختم کردینا چاہئیے۔ یہ تو انگریزوں کی چھوڑی ہوئی نشانی ہے۔"
چیف منسٹر نے نارافگی سے کہا "اب تو آپ بھاشن بھی دینے لگے!"
سپرنٹنڈنگ نے کہا "کیا کریں سر! ہم نے اپنے لیڈروں سے یہی تو سیکھا ہے!"
چیف منسٹر نے پوچھا "اگر آپ اس وقت میری جگہ ہوتے تو بہ حیثیت چیف منسٹر کیا کرتے؟"
سپرنٹنڈنٹ نے خوش ہوتے ہوئے کہا "آپ کے منہ میں گھی شکر مگر یہیں آپ جوک (JOKE) تو نہیں کر رہے ہیں سر؟"
چیف منسٹر بولے "جوک تو زندہ دلان حیدرآباد کے صدر کیا کرتے ہیں۔ میں تو چیف منسٹر ہوں!"
سپرنٹنڈنٹ نے کہا "یہ تو صحیح ہے سر! لیکن کچھ بھی ہو، آپ کو تو پیشگی اطلاع دے کر آنا چاہئیے تھا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ اسٹاف میں لیڈیز بھی تو ہوتی ہیں۔ کچھ تو زنانے اور مردانے کا خیال کرنا چاہئیے۔"
اتنے میں چیف منسٹر کی نظریں بکھرے ہوئے پیپرس اور اسٹیشنری پر پڑیں تو سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا "اگر کوئی چوہا ان تمام چیزوں کو کتر گیا تو ....؟"
سپرنٹنڈنٹ بولا "دوسرے منگالیں گے سر!"
"اگر دوسرے بھی کوئی چوہا کتر گیا تو ....؟"
"تیسرے منگالیں گے سر!"
"اور اگر تیسرے بھی کتر گیا تو ....؟"
"چوتھے منگالیں گے سر!"
اس پر چیف منسٹر نے کڑرشٹ لہجے میں پوچھا "لیکن آپ اِتنی بار پیپرس اور اسٹیشنری کہاں سے لائیں گے؟"
سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا: "جہاں سے آپ چوہا لا رہے ہیں!"
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چیف منسٹر کی نظر مکڑیوں کے جالوں، جھینگروں اور کیڑے مکوڑوں پر پڑی جو فائلوں میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، گھس رہے تھے۔ چیف منسٹر سے یہ گندہ ماحول دیکھا نہ گیا۔ پوچھا "یہ کیڑے مکوڑوں کی پرورش کیوں کی جارہی ہے؟ ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ اور جراثیم کش ادویات کا چھڑکاؤ کیوں نہیں کیا گیا؟"
سپرنٹنڈنٹ نے دست بستہ عرض کی "سر! جراثیم کش ادوایات چھڑک کر کیڑوں کو مارنا پاپ ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں سر، ہمارا دیش اہمسا کا دیش ہے، ہنسا کا نہیں۔ اہمسا اور عدم تشدد کے اس دیش میں مار توڑ اور غنڈہ گردی کچھ اچھی نہیں لگتی۔ بے زبان کیڑوں کو مارنا بھی ایک قسم کی غنڈہ گردی ہے۔"

چیف منسٹر نے عذرِ لنگ کو بڑے صبر و ضبط سے سماعت فرمایا۔ اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ دفتروں کا عملہ اور ملازمین دن بہ دن باتونی بنتے جا رہے ہیں، اور اب یہ قوم سُدھرنے والی نہیں ہے۔ چنانچہ دفتر کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے انہوں نے وارننگ دی کہ "ایک ہفتہ بعد میں پھر سرِ موقع معائنہ کے لیے آؤں گا۔ تب تک ساری فائلوں کو ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔ ورنہ سارے عملے کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا"۔ جب چیف منسٹر دفتر کی سیڑھیاں اتر کر جانے لگے تو ای گھاگ سپرنٹنڈنٹ نے کلرکوں سے مخاطب ہو کر کانا پھوسی کے انداز میں کہا: دوستو، اب آئندہ الیکشن تک کی گیارنٹی ہے تب تک کوئی چیف منسٹر آئیگا اور نہ ہماری پوچھ ہوگی۔ جیسے جنم بھومی؟

فائلوں سے نمٹ کر، کلرکوں کو بھگتا کر، دھول میں اٹے لباس میں جب چیف منسٹر اپنی قیام گاہ کو پہنچے تو ان کے حلیے کو دیکھ کر ان کی دھرم پتنی نے انھیں پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن جب چیف منسٹر نے شادی کے موقع پر دی ہوئی اپنی سسرال کی انگوٹھی بطور شناختی کارڈ پیش کی تو ان کی دھرم پتنی کو یقین آیا۔ اور پھر کہا کہ "آپ بڑے لمبے ٹور اور اُجڑے مقامات سے فائلوں کا معائنہ کر کے آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے ساتھ جراثیم، بھوت، پریت اور ارواحِ خبیثہ بھی ہوں۔ لہٰذا آپ تھوڑی دیر باہر ہی ٹھہریے، میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں تاکہ آپ اچھی طرح اپنے ہاتھ پیر دھولیں!"
چیف منسٹر نے اپنی دھرم پتنی کو تسلی دیتے ہوئے کہا "تم اس کی فکر مت کرو۔ اب مجھے کوئی بلا گزند نہیں پہنچا سکتی کیوں کہ میں عوام کی آرزوؤں سے لپٹی اور سسکتی ڈھیر ساری فائلوں کی یکسوئی کر کے آ رہا ہوں۔ اب میرے اطراف بلائیں نہیں، بلکہ عوام کی دعائیں ہالہ بن کر حفاظت کر رہی ہیں۔"

فیاض احمد فیضی (بمبئی)

جنت کی حقیقت

ساری فلم انڈسٹری میں کہرام مچا ہوا ہے۔ فلموں کی شوٹنگ کئی ہفتوں سے بند ہے۔ بچوں کے والدین خوش ہیں کہ جن فلم والوں کے کارناموں کے سبب ان کے گھر میں دن رات قیامت برپا رہتی تھی خدا نے ان پر اپنا عذاب نازل ہی کر دیا اور اگر فلمیں بننا خدا کرے بند ہو گئیں تو اب ان کے بچے گھر کے اندر اور باہر نت نئے ناچ ناچنا اور چولی دامن کے رشتوں کے گیت گانا بند کر دیں گے۔ ادھر ہیرو پریشان ہیں کہ انہیں اب اگر نیا کام ملا بھی تو دھوتی کرتا پہن کر شوٹنگ میں حصہ لینا پڑے گا۔ ہیروئنیں حیران ہیں کہ اب وہ جسم کی نمائش کے بغیر اداکاری کیسے کریں گی۔ اب انہیں دراز ٹانگوں کی نمائش تو در کنار، دراز نقلی زلفوں کو بھی کیمرے کے سامنے لانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ جن کی سچ مچ لمبی زلفیں ہیں انہیں زلف ترشوانے کا حکم جاری ہو گیا ہے۔ پروڈیوسروں نے فلم کی حد تک نئی لڑکیوں سے منہ موڑ لیا ہے اور اب وہ ادھیڑ عمر کی ستی ساوتری نظر آنے والی پرانی ہیروئنوں سے دوبارہ رجوع ہو رہے ہیں اور پرانی ہیروئنیں جو چھوٹے موٹے رول کی تلاش میں در در بھٹکتی پھرتی تھیں اب انھوں نے نخرے دکھانے شروع کر دیے ہیں۔ نئے میوزک ڈائرکٹرز کو پتہ لگ گیا ہے کہ اب ان کے RAP کی دکان بند ہو جائے گی اس لیے انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مغربی دھنوں کو درآمد کرنے کا کاروبار بند کر دیں گے اور اب وہ ہر قسم کی ہندوستانی کلاسیکی چیزوں کا ایکسپورٹ شروع کر دیں گے تاکہ ہمارے ملک میں سوائے دھرم کے کوئی اچھی چیز نہ رہنے پائے۔ فلمی کہانی کاروں نے البتہ ہار نہیں مانی ہے اور وہ امریکی فلموں اور ناولوں سے کہانیاں چرانے کا خیال ترک کر کے دیو مالائی دھارمک اور کلاسیکی کہانیوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں جس کے نتیجے میں ایسی کتابوں کی مانگ اور قیمت دونوں بڑھ گئی ہے۔

لیکن سب سے زیادہ پریشان اور دکھی وہ پروڈیوسر ہیں جن کی فلمیں ریلیز کے قریب ہیں اور سنسر ہونے والی ہیں۔ پروڈیوسر چھن چھن والا پر کل ہی دل کا زبردست دورہ پڑا ہے اور وہ بمبئی کے سب سے مہنگے "بریچ کینڈی ہسپتال" کے ان ٹینسیو کیئر یونٹ میں قید ہیں جس کے باہر اب "کرٹی دیکھ ریکھ والا کمرہ" کا نیا بورڈ ہندی میں لگا دیا گیا ہے۔ یہ اسپتال عام طور پر غیر ملکی سیاحوں سے بھرا رہتا تھا مگر جب سے انہیں بمبئی میں ہر وقت کی جھلک نظر آنے لگی ہے انھوں نے عیش و آرام کے نئے مقامات دریافت کر لیے ہیں اور یہ شہر اور یہ اسپتال قدرے سونا سونا ہو گیا ہے اور اب متمو

عربی عمامے اور نوخیز برقعے خال خال ہی یہاں نظر آتے ہیں۔ لیکن نئی سنسر پالیسی کا اعلان ہوتے ہی اسپتال کے منتظمین کو اُمید بندھ چلی ہے کہ اب ان کا اسپتال فلم پروڈیوسروں سے بھر جائے گا۔ پروڈیوسر جھن جھن والا کی آنکھ کئی گھنٹوں کی بے ہوشی کے بعد کھلی اور انھوں نے پچاس سالہ نرس کو اپنے اُوپر جھکے پایا تو فوراً سمجھ گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ نقاہت بھری آواز میں پوچھا "یہ کون سا ہسپتال ہے؟"

نرس نے انہیں مسکرا کر دیکھا۔ اپنی جیب سے گائیڈ بک نکالی اور اس کے پہلے صفحہ پر نظر ڈال کر انتہائی ملائمت سے بولی "آو رنیہ مہودے! یہ پرلوک اسپتال ہے۔ آپ کرپیا شانت رہیں اور ورتالاپ نہ کریں۔"

جھن جھن والا کا دل پھر ایک بار زور سے دھڑکا۔ انہوں نے سوچا "اس عورت کو اگلی فلم میں میں اپنی ہیروئن بنا سکتا ہوں۔ نیا سنسر بورڈ اس بھارتیہ ناری کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ نئے سنسر بورڈ کا خیال آتے ہی کل شام کے واقعات ایک ایک کر کے انہیں یاد آنے لگے۔

کل شام جھن جھن والا کی اٹھائیسویں فلم "جنّت کی حقیقت" نئے سنسر بورڈ کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ پچھلی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ڈسٹری بیوٹرس نے منہ مانگے دام دے کر اس کی نمائش کے حقوق پہلے ہی خرید لیے تھے۔ مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی نئے سنسر بورڈ کے سارے ممبران سفید لباس میں ملبوس آ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی بڑی شخصیت کے کریا کرم میں شریک ہونے آئے ہیں۔ جھن جھن والا کے اسسٹنٹ نے انہیں ایک ایک فائل دی تھی جسے وہ اپنی گود میں رکھے اپنی اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلی صف میں لال جھکڑ جی، مرلی بھائی، نرسیان سیٹھ، پورس خان کے ساتھ تولارام سجا تھے۔ ان کے پڑوس کی ایک کرسی کاناجی کے لیے خالی تھی جو ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ اگلی قطار میں ملہار سنگھ اشوک سنہا، دنے گپتا اور بہاری بابو کے ساتھ فلم کا ڈائرکٹر اختر سہما ہوا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد پروڈیوسر جھن جھن والا کی سیٹ تھی جس پر اس وقت کانٹے اُگ آئے تھے۔ جیسے ہی کاناجی اپنے گرتے ہوئے آنچل کو سنبھالتی، بجلیاں گراتی منی تھیٹر میں داخل ہوئیں سارے سنسر بورڈ کا دھرم جیسے سنکٹ میں پڑ گیا۔ ہر شخص کے پرنام، نمسکار اور گرم نگاہوں کا جواب وہ اپنی قاتل مسکراہٹ کے ساتھ دیتی ہوئی جب بیٹھ گئیں تو جھن جھن والا نے ڈائرکٹر اختر کو آنکھ کا اشارہ کیا جسے پاتے ہی وہ اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور گویا ہوا "یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ . . . ."

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ لال جھکڑ جی غرائے "اختر بھائی! ہندوستان میں رہنا ہے تو شدھ ہندی بولنا سیکھیے۔" پھر وہ کاناجی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے "کیوں جی، آپ کے کیا وچار ہیں؟"

کاناجی نے کوئی جواب نہ دیا تو اختر بھائی نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ "شما چاہتا ہوں۔ یہ بڑی پرسنتا کی بات ہے کہ دھرم ادھیکاری پارٹی نے فلموں پر اپنا سنسر بورڈ بٹھا دیا ہے اور جسے سرکار نے بھی انومتی دے دی ہے۔ پارٹی نے فلم انڈسٹری کو یہ آدیش دیا ہے کہ وہ پھیلاؤں کو منورنجن کی گڑیا بنا کر پرستوت کرنا بند کر دیں اور انہیں کیول گرہ لکشمی کے رول کیں ہی درشائیں۔ فلموں میں سیکس تتھا ہنسا کا پرچار بھی روک دیا جائے پرنتو میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ" درخواست نہیں ونتی "مرلی بھائی نے پان کا بیڑہ منہ میں دباتے ہوئے لقمہ دیا۔

"ہاں جی، وہی ہے کہ ہماری یہ پہلی فلم ہے جو نیا سنسر بورڈ دیکھے گا اور یہ فلم دھرم ادھیکاری پارٹی کے آدیشوں کے ملنے سے پہلے ہی بنائی جا چکی ہے اس لیے آپ تھوڑا نرمی سے کام لیں۔ سنسر بورڈ کو نرم بنانے کے لیے ہم نے ہر سدسیہ کی فائل کے اندر ایک

لفافہ رکھ دیا ہے۔ کرپیا آپ سب اسے پہلے دیکھ لیں۔ دھنیہ واد"
لفافے کے اندر پانچ سو روپیوں کی گڈی رکھی دیکھ کر ہر ممبر کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ تولا رام نے ایک کر لال جھکڑ جی کی فائل میں جھانکا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ دونوں کو ملنے والی رقم یکساں ہے تو وہ اپنی سیاہ عینک ناک پر ٹھیک طرح سے جما کر بیٹھ گئے۔
ڈائرکٹر کے اشارے پر فلم شروع ہوئی۔ جیسے ہی فلم کا ٹائٹل "جنت کی حقیقت" اسکرین پر نظر آیا نریان سیٹھ چلائے "کٹ کٹ"۔ یہ نہیں چلے گا اسے بدل ڈالیے۔ اس کا نام ہوگا "نرگ کی واستوکتا" سارے ممبروں کے ساتھ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر نے بھی گردن ہلادی۔
فلم کی کہانی ایک آدرش وادی جرنلسٹ کی تھی۔ ظاہر ہے فلم کا ہیرو چاہے وہ صحافی کے رول ہی میں کیوں نہ ہو، بدعنوان تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہیرو ایک فرقہ پرست لیڈر کے خلاف مضامین لکھ کر اُسے اپنا دشمن بنا چکا ہے فلم کے پہلے ہی منظر میں اخبارات کی سرخیاں دکھائی گئیں جن میں لکھا تھا "شہر میں ہندو مسلم فساد بھڑک اٹھا" اسے دیکھتے ہی اشوک شرما نے "کٹ" کی صدا لگائی اور کہنے لگے "ہندو مسلم فساد کہنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے دنگا ہندوؤں نے شروع کیا۔ یہ اب نہیں چلیگا۔ آپ اسے مسلم ہندو دنگے کا نام دیجیے"۔
جب فرقہ پرست لیڈر کا چہرہ کلوز اپ میں دکھایا گیا تو پارٹی کے لیڈر تولا رام جی نے فائل پٹخ دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے نریان سیٹھ چراغ پا ہو کر چیخنے لگے "بھئی اس ویلن کی شکل تو ہمارے مسٹر تولا رام جی سے ملتی ہے۔ اسے کاٹ دیجیے اور اس کی جگہ کسی موٹے تازے، مونچھ والے آدمی کو رکھیے جو امریکن گا گلز پہنے ہوئے ہو"۔
اگلے منظر میں ہیرو کو ایک دکان سے مرغی لیتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دکان دار سیاسی لیڈر کے اشارے پر ہیرو پر مرغی چرانے کا جھوٹا الزام لگا کر اسے پولس کے حوالے کر دیتا ہے۔ لال جھکڑ نے مرغیوں پر اعتراض اٹھایا "جھن جھن والا تم نے فلم کو مانساہاری بنادیا ہے۔ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا اسے شدھ ہونا چاہیے۔ یہ مرغی والا سین کاٹ دو۔ اسے دیکھ کر ہماری نئی پیڑھی بگڑ جائے گی۔ اس کی جگہ کوئی سبزی کی دکان دکھاؤ"۔
یہ سن کر مرلی بھائی۔ لال جھکڑ جی کے کان میں پھس پھسائے "پرنتو کل تو آپ کاک ٹیل پارٹی میں چکن تندوری ..... لال جھکڑ جی نے مرلی بھائی کو اپنی سرخ سرخ آنکھیں دکھائیں تو وہ خاموش ہو گئے۔
ہر نئی فلم کی طرح اس فلم کی کہانی بھی پرانی تھی آدرش وادی جرنلسٹ کی بیوی اپنے دو بیٹوں کے ساتھ اپنے شوہر سے ملنے جیل کی طرف جارہی ہے۔ راستے میں بے انتہا ٹریفک اور لوگوں کا ہجوم ہے۔ سنسر بورڈ کے ممبروں نے سوچا اب اس عورت کا ایک بیٹا بچھڑ جائے گا اور بیچ راستے میں اس کا ایک بیٹا کھو جاتا ہے جسے بعد میں ایک مسلمان گود لے لیتا ہے۔ جیل پہنچنے پر پتہ چلتا ہے کہ فرقہ پرست لیڈر کے بھیجے ہوئے ایک اور مجرم نے جیل کے اندر جرنلسٹ کو قتل کر دیا ہے سنسر بورڈ کے ممبران نے سوچا شاید اب جرنلسٹ کا بیٹا بدلہ لینے کی قسم کھائے گا اور دوسرے ہی لمحے جرنلسٹ کا دوسرا بیٹا وہیں باپ کے قتل کا بدلہ لینے کی قسم کھا لیتا ہے۔
دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بیٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ مسلمان گھر میں پلنے والا لڑکا باپ کا ہم شکل نکلتا ہے تاکہ فلم کے آخر میں اسے پہچاننے میں کسی کو دقت نہ ہو۔ یہ لڑکا پولس افسر بن جاتا ہے مگر غلط تربیت کے سبب ایماندار رہ جاتا ہے اور پولس والوں کے طور طریق نہیں سیکھ پاتا ہے۔ اتنا دیکھ کر سبھی بورڈ ممبران نے سوچا کہیں ڈائرکٹر نے دوسرے بھائی

کہ بے ایمان اور ظالم شخص کا رول تو نہیں دے دیا ہے؟ ان کا خدشہ درست ثابت ہوا اور اگلے منظر میں دوسرا بھائی ایک بدعنوان اور بے ایمان صنعت کار اور بلڈر کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔

یہ سین دیکھتے ہی سارے ممبر ایک ساتھ چلائے "کٹ، کٹ، کٹ" آخر ہماری فلموں میں کب تک اس ملک کی اکثریت کا مذاق اڑایا جائے گا۔ پوری کہانی بدلنی پڑے گی۔ یہ فلم پاس نہیں ہو سکتی"، ملہار سنگھ نے مکا لہراتے ہوئے کہا ۔۔۔ ڈائرکٹر اختر بھائی گھاگ شخص تھا اور ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدلنے کے فن سے خوب واقف تھا۔ اس نے فلمی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے فوراً کہا "ایسا کرتے ہیں ہم پولیس آفیسر کو کرپٹ، ظالم اور بے ایمان کر دیتے ہیں اور لوگ پتی کو غریبوں کا ہمدرد بنا دیتے ہیں"؟

"یہ ٹھیک ہے!" لال بھکڑ نے فیصلہ سنا دیا: "ممبئی کی پولیس کتنی ایمان دار ہے یہ دنگوں کے بعد سبھی جان گئے ہیں اور یہی وہ لوگ پتی اور بلڈرز ہیں جو ہمیں الیکشن لڑنے کے لیے دان دیتے ہیں دھرم کو بچانے کے لیے روپیہ دیتے ہیں"۔

فلم اپنی رفتار سے چلتی رہی۔ نوجوان ہیرو، باپ کے قاتلوں کا پیچھا کرتے ہوئے کلب جا پہنچتا ہے جہاں کیبرے ڈانس ہو رہا ہے۔ کیبرے کی دھن پر تمام ممبروں کے ہاتھ پیر تھرکنے لگے۔ پھر نگاہیں بھی تھرکنے لگیں وہ زدیدہ نگاہوں سے وہ لوگ یکے بعد دیگرے کانتا جی کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ جیسے ہی ڈانس ختم ہوا کانتا جی نے اونچی آواز سے کہا "نان سنس یہ نہیں چلے گا۔ جھن جھن والا! تم اس کی جگہ پن گھٹ پہ گوپیوں کا نرتیہ کیوں نہیں فلماتے۔ اسے کاٹ دو"۔ جھن جھن والا نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

اگلا منظر ظاہر ہے ایک ریپ سین تھا جس میں غنڈے، پولیس والوں اور حکومت کے عہدے داروں کی موجودگی میں ایک گونگی عورت پر حملہ کر دیتے ہیں۔ جیسے ہی سین شروع ہوا کانتا جی چلائیں "بھئی اسے بند کرو۔ اس کی انومتی تو بالکل نہیں دی جا سکتی۔"

"یہ سین پہلے پوری طرح دیکھ تو لیں، پھر کوئی فیصلہ کریں" ونے گپتا پہلی مرتبہ بولے مگر ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ کانتا نے انہیں گھور کر دیکھا۔ انہیں یاد آیا کہ خود ونے اس طرح کے معاملات میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ سین پورا ہوتے ہی بہاری لال کہنے لگے "ہاں بھئی، یہ سین تو پورا کاٹنا پڑے گا"۔

"معاف کیجئے کانتا جی!" یونس خاں نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا "مجھے تو یہ منظر دیکھ کر ایسا لگا جیسے یہ گونگی لڑکی اقلیتوں کی علامت ہے"۔

"میں آپ سے سہمت بھی ہوں اور نہیں بھی ہوں"۔ مرلی بھائی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "جب میں یہ درشیہ دیکھ رہا تھا تو مجھے اور یاد آ رہا تھا۔ اختر بھائی، اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ درشیہ نہ کاٹا جائے تو اس سین کو

۔۔۔ تقابل: ۔۔۔

جگر مرادآبادی نے نہایت ہمدردانہ انداز میں شراب کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے اسرار الحق مجاز سے کہا۔
"مجاز! شراب واقعی خانہ خراب ہے۔ خم کے خم لنڈھانے کے بعد انجام کار مجھے توبہ ہی کرنی پڑی۔ میں تو دعا کرتا ہوں کہ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم بھی میری طرح توبہ کر سکو۔"
مجاز یہ سن کر نہایت معصومیت سے کہنے لگے
"جگر صاحب! آپ نے تو ایک بار توبہ کی، لیکن میں سینکڑوں بار توبہ کر چکا ہوں۔"

جھن جھن والا نے اس مرتبہ بھی ہاتھ جوڑ دیئے مگر اب ان کا سر چکرا رہا تھا۔ گھبرا کر انھوں نے بلڈ پریشر کی دو گولیاں جیب سے نکال کر بغیر پانی کے نگل لیں۔

تھوڑی ہی دیر میں کلائمکس کے مناظر شروع ہو گئے۔ ہیرو پولیس انسپکٹر اپنے مجرم بھائی کا پیچھا جیپ میں بیٹھ کر کر رہا ہے۔ اس کا دل بہلانے کے لیے ہیروئن اس کی بغل میں بیٹھی آئینے میں اپنا میک اپ ٹھیک کر رہی ہے۔ اس نے اپنا دوپٹہ ایک کندھے پر یوں رکھا ہوا ہے جیسے الگنی پر کپڑا سوکھ رہا ہے۔ بہاری بابو فوراً بول پڑے "بھئی یہ سیکس کا غلط استعمال ہے یہ سین کاٹ دیجئے"۔

"مگر سرکار!" ڈائرکٹر اختر بھائی نے دفاع کیا "شکنتلا میں بھی اس طرح کے مناظر ہیں جس میں جسم کی نمائش کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی کہانیوں میں ہر لڑکی دوپٹے کی جگہ اپنی زلفیں آگے رکھے ڈائیلاگ بولتی دکھائی دیتی ہے"۔

اشوک شرما چلائے "دھارمک فلموں میں من نہیں بھٹکتا ہے۔ آپ کی فلم تو کسی کا بھی دھرم نشٹ کر سکتی ہے۔ ہمارا بھی۔ کٹ"۔

اب ویلن بھائی نے اپنی موٹر کار کو میدان میں پارک کر دیا ہے اور وہاں پہلے سے منتظر ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گیا ہے۔ ہیرو اسے کئی آوازیں دیتا ہے، پستول تان کر گنگا جمنا اور مدر انڈیا جیسی فلموں کے پرانے ڈائیلاگ دہراتا ہے اور پھر اپنے بھائی پر فائر کر دیتا ہے۔ ویلن گولی کھا کر وہیں اوندھے منہ گر جاتا ہے اور فلم کے بقیہ تمام کردار اور پولیس والے مختلف سمتوں سے نمودار ہو گئے گروپ فوٹو کھنچواتے ہیں۔

لال بجھکڑ جی ہاتھ ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں "جھن جھن والا سیٹھ اور اختر بھائی! یہ پورا کلائمکس بدلنا پڑے گا ہیرو جیپ کی سواری نہیں کرے گا، وہ رتھ پر بیٹھے گا۔ ویلن ہیلی کاپٹر سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اڑن کھٹولا لے کر آیئے۔ ہیرو ویلن پر گولی نہیں چلائے گا۔ اگنی بان سے اسے گرائے گا وہ نہ ملے تو تیر کمان لایئے: بھالے بلم لایئے۔ مگر یہ نہیں چلے گا۔ ہمیں اپنی فلموں میں ہندوستانی سبھیتا کو بتانا ہے۔ سمجھے آپ؟"

فلم ختم ہو چکی تھی۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر اپنے ہاتھ میں فلم کے ٹکڑے لیے نمودار ہوا اور کہنے لگا "صاحب بارہ ہزار فٹ کی فلم میں سے سنسر بورڈ نے ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کاٹ دیئے۔ اب صرف یہ ٹکڑے بچے ہیں"۔

جھن جھن والا کو ایسا محسوس ہوا جیسے سنسر بورڈ کے ممبر نے اچانک اس پر بلم برچھی اور تیر کمانوں سے حملہ کر دیا ہو۔ درد کی شدت سے وہ بے حال ہو اٹھا۔

بمبئی کے بریچ کینڈی اسپتال کے انٹینسیو کیر یونٹ کی ادھیڑ عمر نرس نے جھن جھن والا کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ مانیٹر پر نظر ڈالی اور سوچنے لگی کہ اب کسی ڈاکٹر کو بلانا بے کار ہے!

▫▫

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ صفحہ کے ایک جانب صاف اور خوش خط لکھیں

آخر میں اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں۔

غزلیں

سگار لکھنوی
(ممبئی)

چھائی ساون کی گھٹا اور پپیہا نکلا!
آج بادل بھی مرے خون کا پیاسا نکلا

کب نبرد آزما عاشق کوئی ہم سا نکلا!
پھر نہ ٹھہرے جو عدو سامنے تگڑا نکلا

دوستوں میں نہ کوئی کام کا بندہ نکلا
کوئی شاعر کوئی میکش کوئی نیتا نکلا

اُن کے کتے بھی جھپٹتے تھے پولس والے بھی
کتنا مشکل تھا مرا بچ کے نکلنا، نکلا

دیجئے عطیہ جوانانِ وطن کو دن رات
لوٹنے کھانے کا اچھا یہ طریقہ نکلا

بند گوبھی کی طرح لگتا تھا جس بُت کا شباب
چہرہ دیکھا تو اناناس کا چھلکا نکلا

"شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"
ہجر کی شب کا یہی ایک نتیجہ نکلا

کیوں نہ فرہاد کی قسمت پہ ترس آئے ہمیں
آج بھی کھودا پہاڑ، آج بھی چوہا نکلا

آج پھر اُس نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
جس برہمن کا ہمیشہ کہا جھوٹا نکلا

شکریہ آپ کا، آپ آئے خلوصِ دل سے
رات کے بارہ بجے کوئی تو اپنا نکلا

وہ مرے شعلہ فشاں دل کی شعاعیں تھیں سگار
لوگ سمجھا کئے دم دار ستارہ نکلا

○

عشق اچھا نہ محبت کا خیال اچھا ہے
یعنی ہوجائے تو پھوکٹ میں وصال اچھا ہے

بند گوبھی کی طرح سو وہ مال اچھا ہے
ورنہ جو کچھ بھی ملے شامِ وصال اچھا ہے

آج کل ایک بھی لیڈر نہیں بھوکا پیاسا
سب کے ہاتھوں میں کمانے کا کمال اچھا ہے

دودھ پی پی کے یہ بھگوان بھی دیتے ہیں سبق
پینے والو! پیو دن رات یہ مال اچھا ہے

★

قطعات

نقّاد

ہر قید و بندِ شعر سے آزاد ہو گیا
اہلِ ادب کے واسطے جلّاد ہو گیا
شاعر نہ بن سکا تو وہ بے چارہ خیر سے
غالب کی ٹانگ توڑنے نقاد ہو گیا

اُف یہ بھرپور جوانی کہ الٰہی توبہ
آئینہ بھی ترے جلووں پہ مچل جائیگا!
تجھ کو دیکھے گا جو عاشق کا دلِ فولادی
پسلیاں توڑ کے سینے سے نکل جائیگا!

خامہ بگوش

سفرنامہ یا معذرت نامہ

جس طرح بعض لوگ ایک موزوں مصرع بھی لکھنے کی توفیق نہیں رکھتے مگر نثری نظموں کے دیوان کے دیوان لکھ ڈالتے ہیں، اسی طرح سفرنامہ عموماً وہ لوگ لکھتے ہیں جو سفر کے دوران آنکھیں بند رکھتے ہیں اور قلم کو فیلِ بے زنجیر کی طرح کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ آنکھیں بند رکھنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سفر کتنا ہی بے مزہ کیوں نہ ہو، سفرنامہ مزے دار بن جاتا ہے۔ آنکھیں بند ہوں تو آدمی خواب دیکھتا ہے، سفرنامے کو انھیں خوابوں سے سجایا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسودہ جب مطبوعہ صورت میں سامنے آتا ہے تو وہ سفرنامے کی بجائے سفر کی معذرت بن جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان کے کمزور کندھوں پر ایسے ہی سفرناموں، یعنی معذرت ناموں کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ شاعرِ طرح دار و خوش بیان جمیل یوسف نے بھی اردو زبان کے کمزور کندھوں پر اپنے حصے کا بوجھ لاد دیا ہے اور ایک عدد سفرنامہ تصنیف ہی نہیں کیا، زیورِ طبع سے آراستہ بھی کر دیا ہے۔ دنیائے ادب میں آراستگی کے لیے اب یہی زیور رہ گیا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب لکھنے والے اپنی تحریروں کو علم اور فنی بصیرت سے مزین کیا کرتے تھے۔ اب تو لے دے کے زیورِ طبع ہی عیب پوشی کے کام آتا ہے۔

ہم نے جمیل یوسف کو شاعرِ طرح دار و خوش بیان کہا ہے۔ ممکن ہے اس پر بعض لوگ اعتراض کریں کہ ہم نے بہت زیادہ تعریف کر دی ہے۔ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ جس کام کے کرنے میں گرہ سے کچھ نہ جاتا ہو، اس کے کر گزرنے میں کوئی حرج نہیں۔ واضح رہے کہ جب ہم کسی کی تعریف کرتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے نہیں کرتے کر کے بھول بھی جاتے ہیں، وجہ ظاہر ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ لیکن ہمارا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں ہے کہ اپنے دعوے کی دلیل میں جمیل یوسف کے چند خوبصورت شعر پیش نہ کر سکیں۔ سنیے اور سر دھنیے (اپنا نہ کہ شاعر یا سنانے والے کا):

دل میں حرص آئی نہیں لب پہ سوال آیا نہیں ؏ مجھ کو دنیا سے نمٹنے کا کمال آیا نہیں

اس کی سب شوخیِ رفتار تھی میری خاطر ؏ راہ میں پھر نہ کوئی پھول کھِلا میرے بعد

میں سوچتا ہوں سفر کا حساب کیا دوں گا ؏ کہ میرے پاس تو گردِ رہِ سفر بھی نہیں

ان سرابوں سے کوئی موجِ رواں بھی ابھرے ؏ خشک صحرا کے ورق پر کوئی دریا لکھ دے

بکھر گئے جو کئی خواب ٹوٹ کر میرے
اٹھی ہے پاؤں میرے عمر بھر رہے زخمی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے عمدہ شعر کہنے والے کو سفرنامہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہمارے خیال میں یہ ایک نامناسب سوال ہے۔ جس طرح ایک ہزار شعروں کے مجموعے سے پانچ شعر کام کے نکل سکتے ہیں، اسی طرح اگر ڈھائی سو صفحوں کے سفرنامے سے ڈھائی جملے بھی کام کے نکل آئیں تو سودا برا نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جمیل یوسف کے سفرنامے میں ڈھائی سے زیادہ جملے کام کے ہیں، خصوصاً وہ جملے جو سہوِ قلم کی وجہ سے رہ گئے ہوں گے۔ اچھا شعر کہنے والے پر سفرنامہ نہ لکھنے کی پابندی عائد کرنا، ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ اگر جمیل یوسف اچھے شعروں کے خالق نہ ہوتے تو انھیں سفر کرنے کا موقع ہی نہ ملتا، اور جب سفر کا موقع مل جائے تو سفرنامہ لکھنے کا موقع کھو دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جمیل یوسف کی شاعری کے قدردان زیادہ تر ڈنمارک ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ان قدردانوں نے انھیں وہاں کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ وہاں جاکر جمیل یوسف نے شاعری سنائی اور بعد ازاں سفرنامہ لکھ دیا، پھر اسے کتابی صورت میں محفوظ بھی کر دیا۔ جو کچھ لکھا جاتا ہے، اسے محفوظ کرنے کا آج کل یہی طریقہ مروج ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں محفوظ ہو کر بھی ضائع ہو جاتی ہیں، یعنی ہم تک پہنچ جاتی ہیں۔

اب جب کہ یہ سفرنامہ "جل پری کے دیس میں" کے نام سے شائع ہو کر ہم تک پہنچ ہی گیا ہے تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑے گا۔ لکھنا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں کہ زندگی اسی میں ضائع کی ہے، مگر کسی کتاب پر لکھنے میں مشکل یہ ہے کہ اسے پڑھنا بھی پڑتا ہے۔ دو ڈھائی سو صفحوں کی کتاب پڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ جنابِ مصنف کا بے حد شکریہ کہ انھوں نے اس مشکل کام کو ہمارے لیے خاصا آسان بنا دیا ہے، وہ یوں کہ سفرنامے میں انھوں نے کثرت سے شعر درج کیے ہیں زیادہ تر اپنے اور کم تر دوسروں کے۔ ہم نے شعروں کو چھوڑ کر صرف نثر پڑھنے تک اپنے آپ کو محدود رکھا تو ڈھائی سو صفحوں میں سے صرف سو صفحے خواندگی کے لائق نکلے۔ ہم نے یہ سو صفحے اتنی ہی دیر میں پڑھ لیے جتنی دیر میں مصنف نے لکھے ہوں گے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ یہ اردو میں ڈنمارک کا پہلا سفرنامہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ اردو کا آخری سفرنامہ بھی ہو تاکہ جو خوش گوار اثر اس کے پڑھنے سے ہمارے ذہن پر ہوا ہے، اسے کوئی اس سے بہتر سفرنامہ نہ زائل کر سکے۔ ہاں اگر یہ اثر خود بہ خود زائل ہو جائے تو یہ ہماری کوتاہی ہوگی کہ ہم زیادہ دیر تک کسی ایک رائے پر قائم نہیں رہتے۔ اپنی اس ممکنہ کوتاہی پر ہم پیشگی معذرت طلب کرتے ہیں جنابِ مصنف کو معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے سفرنامہ ہی کافی ہے۔

اس سفرنامے میں بے شمار خوبیاں ہیں جو دورانِ مطالعہ ہمارے سامنے آئیں۔ ہم ان خوبیوں کو ایک کاغذ پر نوٹ کرتے گئے۔ افسوس کہ اب جب کہ ہم کالم لکھنے بیٹھے ہیں تو وہ خوبیوں والا کاغذ کہیں گم ہو گیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کاغذ کے ساتھ سفرنامے کی خوبیاں بھی گم ہو گئیں۔ اب قارئینِ کرام کو خود ہی زحمت کرنی ہوگی کہ سفرنامہ پڑھ کر ان کی خوبیوں کا اندازہ کرنا ہوگا۔ آخر پرانے زمانے میں پانی پینے کے لیے کنواں کھودا ہی جاتا تھا تو یہ کام آج کیوں نہیں ہو سکتا؟ بہرحال بے شمار خوبیوں میں سے جو ایک، دو خوبیاں ہمیں یاد رہ گئی ہیں، انھیں ہم اپنے کالم میں محفوظ کیے دیتے ہیں۔

اس سفرنامے کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کی طباعت نہایت عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے

جنابِ مصنف اسے ڈنمارک ہی سے چھپوا کر ساتھ لائے ہوں۔ سفید کاغذ پر سیاہ حرف اس طرح چمکتے ہیں جیسے اندھیری رات میں جگنو۔ معاف کیجئے گا! یہ تشبیہ کچھ غلط بلکہ اُلٹ ہوگئی۔ سیاہ رات اور سفید کاغذ میں نیز جگنوؤں میں اور سیاہ حروف میں کوئی مناسبت نہیں ہے، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کتاب میں بعض الفاظ و تراکیب کے املا میں بھی اس قسم کی کاری گری سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً تقریباً ایک درجن مقامات پر "چاق و چوبند" کو "چاک و چوبند" لکھا گیا ہے۔ مصنف کی چاک گریبانی کی رعایت سے یہی املا درست ہے۔ چاک گریبانی کا قصہ یہ ہے کہ موصوف نے جہاں کہیں بھی ڈنمارک کی خواتین کا ذکر کیا ہے، گریبان کے ساتھ ساتھ اپنا سینہ بھی چاک چاک کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک جگہ یہ واقعہ لکھا ہے:

"شام کو مٹرگشت کرتے ہوئے ہم ایک جگہ سرِ راہ رک کر کوک اور سیون اَپ سے تازہ دم ہونے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک چھ فٹ لمبی لڑکی، بشرٹ، نیکر اور جوگرز پہنے ہلکے پھلکے ریس کے سائیکل پر سوار ہمارے قریب آکر رکی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اس نے کوک مانگا۔ اس سے پہلے کہ دکان دار کوک کا ٹن کھول کر اسے پکڑاتا، میں نے وہ ٹن دکان دار سے لے کر اس حسینہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے مجھے تھینک یو کہا اور کوک کا ڈبہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔۔۔۔ اور پھر اس کے ہونٹ ڈبے سے پیوست ہو گئے۔۔۔ میں تجریدی آرٹ کے اس زندہ اور متحرک شاہکار کو دیکھتا رہا جس طرح دبلی پتلی اس کی سائیکل تھی، اسی طرح دبلی پتلی وہ خود تھی۔ مجھے کبھی کوک کے اس ٹن پر رشک آتا تھا جو اس کے ہونٹوں سے پیوست تھا۔ کبھی اس سائیکل پر رشک آتا تھا جس پر وہ سوار تھی۔"

خدا کا شکر ہے کہ معاملہ رشک سے آگے نہیں بڑھا۔ اگر خدانخواستہ حسد کا جذبہ بیدار ہو جاتا تو جنابِ شاعر کوک کے ٹن اور سائیکل، دونوں کی ہجو لکھ دیتے۔

اپنی دنیا سنوارنے کے ساتھ ساتھ جنابِ مصنف نے غالب کی عاقبت خراب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جب موصوف ڈنمارک سے سویڈن گئے تو وہاں انھیں غالب بہت یاد آئے۔ سفرنامے میں پورا ایک باب "مرزا غالب سویڈن میں" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اسٹاک ہوم میں گھومتے ہوئے کئی جگہوں اور موقعوں پر شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ہو نہ ہو، غالب ضرور یہاں آیا تھا اور انھیں جگہوں اور موقعوں پر اس نے اپنے بعض مشہور شعر کہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسے ان اشعار کی تحریک یہیں سے ہوئی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کیوں کر ہوا کہ اس نے ایسے ایسے شعر کہے جو یہاں آئے بغیر کہے ہی نہیں جا سکتے دہلی میں غالب نے ایسے حسین و جمیل پری پیکر کہاں دیکھے ہوں گے جن پر صحیح معنوں میں پریوں کا گمان ہوتا۔"

اس کے بعد غالب کے متعدد ایسے شعر پیش کیے گئے ہیں جو سویڈن کی حسیناؤں کو دیکھ کر لکھے گئے تھے۔ ان شعروں کو اور ان کی تشریح پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غالب، جمیل یوسف کے ساتھ کھیلے ہوئے

ہیں بلکہ جمیل یوسف جیسے کھیل ہی کھیلتے رہے ہیں۔

شعروں اور ڈنمارک کی خواتین کے تذکروں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس سفرنامے میں بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ ڈنمارک میں مصنف کا زیادہ وقت اپنے ہم وطنوں کے درمیان سیخ کباب اور چکن تکے کھانے میں اور مشاعرے پڑھنے میں گزرا، لیکن جو تھوڑا بہت وقت سیر و سیاحت اور وہاں کے باشندوں سے ملنے جلنے میں صرف ہوا، اس کے بیان نے سفرنامے کو اچھا خاصا خبرنامہ بنا دیا ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ ڈنمارک کے ارباب اختیار نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہمارے ارباب اختیار کی طرح اقتدار کو عیاشی کا وسیلہ نہیں بناتے۔ وہاں ملکی دولت کا بے جا مصرف ناقابلِ معافی جرم ہے۔ کسی بھی وزیر کو محض اس بنا پر برطرف کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سرکاری خرچ پر کسی مہنگے ہوٹل میں قیام کیا۔ اس پر وہاں کے ایک اخبار نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

"جس ملک کا اتنا لمبا چوڑا سرکاری وفد اتنے مہنگے ہوٹل کے ایک پورے فلور کو اپنے قیام کے لیے بک کرا سکتا ہے، اس ملک کو بھلا بیرونی امداد کی کیا ضرورت ہے؟ تو وہ تو بے حد امیر ملک ہے۔ ایسے ملک کو تو ڈنمارک جیسے ملک کو امداد دینی چاہیے۔"

پاکستانی شاعر غیر ملکوں میں جا کر جس طرح در در کی گدائی کرتے ہیں، اس کی عبرت ناک تفصیلات بھی سفرنامے میں ملتی ہیں۔

جمیل یوسف لکھتے ہیں:

"ہمارے ملک کے اکثر ادبا و شعرا چاہے خود کسی کو ساری عمر اپنے گھر کا رستہ تک نہ دکھائیں مگر دوسروں کے ہاں مہمان بننے میں ہمیشہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک سینیر شاعر نے (جو نوجوان نسل کا مقبول ترین شاعر ہے اور اپنے آپ کو پاک و ہند کا نمبر ون شاعر سمجھتا ہے) تو کمال ہی کر دیا۔ اگست ۱۹۹۴ء میں لندن سے اقبال اختر کو پیغام بھجوایا کہ اگر میں کوپن ہیگن کی سیر کو آؤں تو آپ مجھے کتنے پیسے دیں گے۔ اقبال اختر نے بے ساختہ کہا کہ ان سے پوچھیں آپ کو بلا کون رہا ہے۔"

اسی طرح ایک پاکستانی ادیب کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے میزبان کے خرچ پر بادہ و ساغر کے شغل کو انتہا تک پہنچا دیا تو ایک ایسی چیز کی فرمائش کی جسے پورا کرنا میزبان کے لیے ممکن نہ تھا۔ حرفِ معذرت سن کر نشے میں دھت مہمان نے میزبان سے کہا، اچھا تو مجھے پیسے دے دیجیے، میں خود ڈھونڈ لاؤں گا۔"

اس قسم کے واقعات پڑھ کر اس سفرنامے کو اگر عبرت نامہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

سفرنامے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں پاکستان

مجبوری

مجازؔ اور فراقؔ کے درمیان کافی سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک دم فراقؔ کا لہجہ بدلا اور انھوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مجازؔ! تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیئے"؟

"آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہو گیا!"

مجازؔ نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے فوراً جواب دیا۔

ے نامور ادیب سید ضمیر جعفری کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ جمیل یوسف نے انھیں کی رفاقت میں ڈنمارک کا سفر کیا تھا۔ معفری صاحب جس محفل میں ہوں، اپنی شاعری اور خوبصورت فقروں کی وجہ سے جانِ محفل بن جاتے ہیں۔ زیرِ نظر سفر مے میں ان کے شعر اور فقرے مصنف کے شعروں اور فقروں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوں گے۔

سفرنامے کے بارے میں جعفری صاحب کی رائے یہ ہے:

"جمیل یوسف کے سفرنامے میں اگر کوئی خوبی نہ ہوتی تو بھی مجھے یہ سفرنامہ اردو کے تمام سفرناموں سے زیادہ پسند آتا، کیوں کہ اس کے ہر دوسرے صفحے پر میرا ذکر ہے اور اپنے ذکر کو بھلا کون پسند نہیں کرتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں میرے ذکر کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ہیں اس کتاب کا اسلوبِ بیان اتنا سحر طراز ہے کہ پہلے صفحے ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔"

ہم جعفری صاحب سے اختلاف کی جرأت تو نہیں کرسکتے، مگر یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ جب ڈنمارک میں کوئی "مطلوبہ چیز" گرفت میں نہ آئی تو پاکستان آکر قاری کو گرفت میں لے لیا۔ آہ! بے چارہ قاری۔ ▫▫
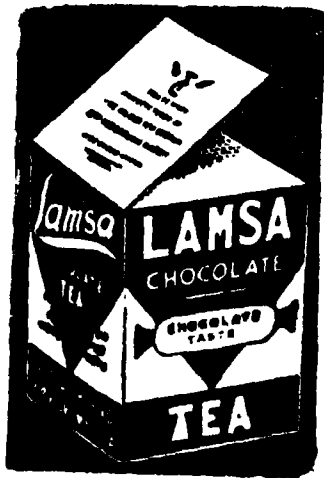
اقبال شانہ
تبوک (سعودی عرب)

ممبئی کی گجل

سمجھ میں کچھ نہیں آتا مجھے کیا بول رہلی ہے
وہ "سیر و ساعری"[1] جس دن سے اردو میں کرلی ہے

عجب چالو ہے وہ ناگن کے 'ماپھک' آج بل کھائے
یہ اس کی چال ایسی ہے یا وہ 'دارو' پیئے لی ہے

ادھر اِن سارے 'ایڈوں'[2] میں اپن ایچ[3] ہے سیانا کیا!
مگر اپنی جو 'ماشوکا'[4] ہے وہ بالکل پھریلی ہے

تجھے "گرآسکی"[5] کرنا ہے تو کرلے پر سے پیچھو
مرے آگے تو کھالی پیلی کیوں "بھنکس"[6] کرلی ہے

اپن کا نام "سیر و ساعری"[7] میں ٹاپ پر آیا ہے
مگر "پتلون" اپنی یارو پیچھے سے پھٹیلی ہے

مری "بے عجتی"[8] کی تو "کھرابی" ہوگئی "بھیٹرو"[9]
اِدھر ماسوک[10] بیٹھی ہے اُدھر جورو کھڑیلی ہے

بنا پیدل سے مجھ کو تو سے بارہ میں چلے گی کیا!
بڑا ہی بن "دھاسو"[11] پکچر آج رائل میں لگیلی ہے

تو چل سیدھی طرح شادی بنالیں گے اپن دونوں
یہ سائیکو پھالتو "عاشک"[12] کے چکر میں پڑیلی ہے

کھراب اپنا ہے شاید آج "لک"[13] اقبال شانہ جی
وہ جھاڑو ہاتھ میں لے کر دروجے[14] پر کھڑیلی ہے

غزل

دولت بلیک ہو تو اُسے وہائٹ مت کرو
جو رانگ ہوگیا ہے اُسے رائٹ مت کرو
بیٹھے بٹھائے ٹوٹ نہ جائے کہیں غریب
'اسکرو' بُری طرح سے کبھی ٹائٹ مت کرو
اپنوں کی طرح مجھ کو ڈنر پر بُلاؤ نا!
غیروں کی طرح چائے پہ اِنوائٹ مت کرو
جامے سے ہو نہ جاؤں میں باہر مرے حضور!
کافر اداؤں سے مجھے ایکسائٹ مت کرو
کمزوریوں کا راز نہ کھُل جائے دوستو!
بیگم کے ساتھ گھر میں کبھی فائٹ مت کرو
میک اپ تم اتنا تھوپ کے آؤ نہ بزم میں
صورت بلیک ہو تو اُسے وہائٹ مت کرو
شانہ مشاعرے سے بھلی اپنی نیند ہے
برباد شاعروں کی طرح نائٹ مت کرو

★

۱۔ شعر و شاعری ۲۔ دیوانوں ۳۔ ایک ہی
۴۔ معشوقہ ۵۔ عاشقی ۶۔ بکواس
۷۔ شعر و شاعری ۸۔ بے عزتی ۹۔ یارو
۱۰۔ معشوق ۱۱۔ زبردست ۱۲۔ عاشق
۱۳۔ LUCK ۱۴۔ دروازے۔

محمد برہان حسین
(حیدرآباد)

رمضان اور حیدرآباد کی راتیں

حیدرآبادی مسلمانوں کو علماء نے رمضان المبارک کے بارے میں ایسی تعلیم دی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف اس مہینہ میں گناہ کرنا منع ہے اور صرف اسی ایک مہینہ میں اچھے کام کرنا ضروری ہے۔

چنانچہ حیدرآبادی مسلمان اس مہینہ میں گناہوں سے بچتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کرانہ کے تاجر اپنے ترازو سے پاسنگ دور کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ دودھ والے دودھ میں پانی نہیں ملاتے۔ شرفو میاں کی بیگم نے رمضان کے اختتام پر دودھ والے کو دعا دی "بھئی ! سارا رمضان آپ نے بڑا اچھا دودھ دیا۔ دل سے دعا نکلی تھی" تو دودھ والے نے آہ بھر کر کہا کیا کریں آاں! مبارک مہینہ تھا نا! ۔ ۔ ۔ تھوڑا نقصان بھگتنا ہی پڑا۔"

بقول حمیدالدین عاقل صاحب رشوت خور کلرکس اور افسران فائیلیں اٹھا کر رکھ دیتے ہیں کہ رمضان کے بعد کارروائی کریں گے چونکہ رشوت حرام ہے۔ سُنا ہے تعمیرات کے کنٹراکٹرس کو بھی نقصان ہوتا ہے چونکہ وہ اس مہینے سمنٹ خالص استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے پڑوسی کمرشیل ٹیکس افسر رمضان میں خوب زکوٰۃ نکالتے تھے۔ اور کہتے تھے "ہم تو زکوٰۃ نکال کر اپنے مال کو پاک کر لیتے ہیں"۔ اِدھر مؤذن صاحب رمضان میں ان سے پیسے نہیں لیتے تھے کہ ان کا پیسہ حرام کا پیسہ تھا۔

یہی کمرشیل ٹیکس افسر رمضان کی شروعات سے دو دن قبل ایک امپورٹڈ سائرن لیے مسجد پہنچے اور مسجد کی کمیٹی کے صدر کے حوالے کیا اور کہا میں الکٹریشن کو بھیجدوں گا آپ موزوں جگہ لگوا دیجئے۔"

صدر صاحب سائرن لے کر دم بخود ہو گئے کیوں کہ انھیں علماء سے پوچھنا پڑے گا کہ رشوت کے پیسے سے خریدے ہوئے سائرن سے روزہ کھولنا جائز ہے یا نہیں۔ پیش امام صاحب نے بتایا "یہ جدید سائنس کی پیدا کردہ مسائل میں ان پر غور و خوض کی ضرورت ہے"۔

کمرشیل ٹیکس افسر نے معاملہ کو یہ کہہ کر صاف کر دیا "ارے جناب! میں خود شریعت سے واقف ہوں۔ اور اور میں ایک ذمہ دار مسلمان ہوں۔ یہ سائرن میں نے اپنی تنخواہ کی رقم سے خریدا ہے"۔

اس طرح مسجد پر سائرن لگ گیا۔ اور ایک کم علم مسلمان نے انھیں بتایا کہ جتنی دیر سائرن بجے گا ایسے

دنوں سائرن آپ کے نام سے جنت میں بجیں گے اور دنیا میں جہاں تک سائرن کی آواز جائے گی فرشتے آپ کے لیے رحمت کی دعا کریں گے وغیرہ۔

ان ہی دنوں کی بات ہے افغانستان میں روسی فوجیں داخل ہو چکی تھیں۔ اور روسی ہمبار بے حساب بم گرا رہے تھے۔ افغان پاکستان اور امریکہ کی مدد سے روسیوں کا زبردست مقابلہ کر رہے تھے۔

جاوید متمول اور تعلیم یافتہ خاندان کا لڑکا تھا جو اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ گھر میں ہوتا بازار میں ہوتا یا اسکول میں... اس کو تربیت دی گئی تھی کہ ہوائی حملہ کا سائرن بجتے ہی وہ فوراً کسی خندق میں کود جائے، میز کے نیچے گھس جائے یا پلنگ کے نیچے چلا جائے۔

برسوں تک یہ عمل دہرانے کے بعد جب وہ اسکول پاس کر چکا تو اس کے والدین نے اس کو علیگڈھ یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ ادھر جنگ روس۔ افغان جنگ سے بڑھ کر افغان۔ افغان خانہ جنگی میں بدل گئی۔ اور جاوید پی ایچ ڈی میں داخل ہو گیا اور اس کو حیدرآباد کے انڈین انسٹیٹیوٹ آف کیمیکل ٹکنالوجی میں ریسرچ کرنے بھیجا گیا اس کو ہاسٹل میں پہلی منزل پر کمرہ ملا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ نئی جگہ تھی جاوید دیر تک جاگتا رہا تھا۔ آخر اس نے سونے کے لیے چادر تانی۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ ہوائی حملہ کے سائرن سے ٹوٹ گئی وہ عادت کے مطابق پلنگ سے کود پڑا اور پلنگ کے نیچے گھس پڑا۔ چند منٹس بعد پھر سائرن بجا تو اس کو معلوم تھا کہ وہ سب ٹھیک ہے۔ یا "خطرہ ٹل گیا" کا سائرن تھا۔ وہ دوبارہ پلنگ پر آلیٹا۔

ابھی وہ پرسکون ہونے نہ پایا تھا کہ دوبارہ سائرن بجا اور وہ دوبارہ پلنگ کے نیچے پہنچ گیا وہ حیران تھا یا خدا! یہاں بمباری کرنے والا کون دشمن ملک ہو گا؟

پھر سائرن بجا اور وہ دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا اور یہ سلسلہ صبح پانچ بجے تک چلتا رہا۔ صبح اس نے اس کا ذکر لیبارٹری میں کیا اور یہ سن کر حیران ہو گیا کہ وہ سائرن۔ حیدرآباد میں ہر رمضان میں سحری ختم کرنے اور افطار کرنے کے لیے بجائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نارائن ریڈی نے کہا" پہلے نظام کے دور میں توپ داغی جاتی تھی اب سائرن بجائے جاتے ہیں۔

جاوید نے کہا یہ سائرن رات ایک بجے سے لے کر صبح پانچ بجے تک کیوں بجائے جاتے ہیں؟ جب کہ سحری کے خاتمہ کا وقت مقرر ہے اور شائع کر دیا جاتا ہے؟"

جواب ملا" بھئی اسلام میں مختلف نقاط نظر کے لوگ ہیں بعض مساجد کے لوگ مناسب سمجھتے ہیں کہ ایکدم فائنل وقت پر سائرن بغیر ابتدائی نوٹس کے بجانا غیر سہولت بخش ہو سکتا ہے اس لیے آدھا گھنٹہ قبل ایک سائرن ضروری ہوتا ہے۔ بعض مساجد کے لوگ پانچ منٹ پہلے بجانا پھر فائنل وقت پر بجانا مناسب سمجھتے ہیں جیسے کونٹ ڈاون ہوتا ہے" جاوید نے پوچھا" چلو ٹھیک ہے آدھا گھنٹہ.... مگر یہ ایک بجے کے سائرن؟

" اوہ! اِٹ اِز سو سمپل جاوید صاحب! وہ ایک تا چار بجے تک کے سائرن آپ کے یا ہمارے لیے نہیں ہوتے... وہ تو ہماری ماں بہنوں کے لیے ہوتے ہیں جو سحری کے کھانے پکاتی ہیں۔ ان خواتین کو ایک، دو یا کم از کم تین بجے جگا دینا ضروری ہوتا ہے....

ویسے کچھ مفکرانِ اسلام سحری دو بجے یا تین بجے کھا کر اور تہجد پڑھ کر فجر تک سو جانا ضروری سمجھتے ہیں
لوگ فجر کو قضا پڑھتے ہیں جاوید نے چونک کر کہا "قضا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ عمداً کیسے ہو سکتی ہے ۔ بھئی ! قضا تو قضا
ہے اپنے قابو سے باہر یہ تو جائز نہیں "
اب ملا "ان کا کہنا ہے کہ اللہ نے انسان کو بھی کچھ اختیارات دیئے ہیں اور وہ اس کا استعمال کرتے ہیں ۔

دوسری رات جاوید نے سحری کا سامان محفوظ رکھ لیا اور سونے کے لیے پلنگ پر لیٹا ۔ گیارہ بجے تھے کہ
سائرن بجا ۔ وہ لاحول پڑھ کر نکلا یہ دیکھنے کہ یہ کیا بات ہوگئی ۔ وہ آواز کی سمت چلتے ہوئے ایک مسجد تک پہنچا ۔ اور
دریافت کیا ۔ ـــــ جواب ملا "اس مسجد میں تراویح کے ختم پر سائرن بجایا جاتا ہے " وہ لوٹ رہا تھا کہ ساڑھے
گیارہ بجے راستہ کی ایک مسجد سے سائرن کی آواز آنے لگی وہ وہاں پہنچا معلوم ہوا کہ مؤذن صاحب کا شیر خوار بچہ
رونے لگا تھا تو ان کی بیوی نے بچے کو بہلانے کے لیے بجایا تھا ۔ دوسرے دن جاوید نے ساتھی مسلمان سے پوچھا
بھائی مسلمان ! یہ بتائیے جب رات بھر سائرن بجتے رہتے ہیں تو آپ لوگ یہ کیسے پہچانتے ہیں کہ سحری کا فائنل
سائرن کونسا ہوتا ہے ۔" وہ بولے اس کے لیے ہم کو "کامن سنس" اور اپنی گھڑیوں کا مجموعی استعمال کرنا ہوتا ہے "
جاوید نے کہا "واہ ! جب آپ گھڑیوں کا استعمال کرتے ہیں تو پھر یہ سائرنوں کی کیا ضرورت ہے "
بولے "یہی تو نکتہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ارے جاوید میاں ۔ اگر گھڑی نے غلط بتادیا یا ہماری ہی کچھ غلطی ہوگئی تو اس کا عذاب
یوں بھگتیں کیوں نہ مؤذن یا سائرن بجانے والے پر ڈال دیں ۔ ۔ ۔ آخر ہم سال میں یہی ایک مہینہ میں مسجد سے استفادہ
کرتے ہیں جبکہ سال بھر چندہ دیتے ہیں ۔
مسجد میں جو لوگ روز پانچ وقت نمازیں پڑھتے ہیں ان سے زیادہ چندہ ہم لوگ دیتے ہیں اور مسجد سے
استفادہ صرف ایک ماہ کرتے ہیں ۔ یہ بہت ناانصافی ہے صاحب "۔
اور آپ کیوں سائرنوں سے پریشان ہیں دو چار دن میں عادت ہو جائے گی پھر آپ کو ان ہی سائرنوں کی
آوازیں لوری معلوم ہوں گی اور آپ کو اس کے بغیر سونا مشکل ہو جائے گا ۔ ◻◻

ڈاکٹر محبوب راہی
(بارسی ٹاکلی)

ہم تیس مار خاں ہیں

ہم توپ خاں کے سالے، ہم تیس مار خاں ہیں
اونچے ہیں اور نہ ناٹے، دُبلے ہیں اور نہ موٹے
سب جانتے ہیں ہم کو، پہچانتے ہیں ہم کو
بگڑے نواب ہیں ہم، خانہ خراب ہیں ہم
خوشیاں منا رہے ہیں بربادیوں کی اپنی
راتوں کو ڈر کے مارے گھر سے نہیں نکلتے
پھرتے ہیں لے کے پھندے، کرتے ہیں کھوٹے دھندے
ماریں گے مکھیاں جو، ہوں گی وہ تیس پوری
لڑ جاتے ہیں ہوا سے، بھڑ جاتے ہیں خدا سے
سب پہ ہے دھونس ہماری، جس کو ہو جان پیاری
اسمگلنگ، سٹہ، گانجہ، شراب، جوا

خم دار مونچھ والے ہم تیس مار خاں ہیں
گورے ہیں اور نہ کالے ہم تیس مار خاں ہیں
سب کے ہیں دیکھے بھالے ہم تیس مار خاں ہیں
نازوں کے ہم ہیں پالے ہم تیس مار خاں ہیں
چھلکا رہے ہیں پیالے ہم تیس مار خاں ہیں
سڑکوں پہ دن اُجالے ہم تیس مار خاں ہیں
کھاتے ہیں تر نوالے ہم تیس مار خاں ہیں
جو چاہے آزمالے ہم تیس مار خاں ہیں
ہم ہیں بڑے جیالے ہم تیس مار خاں ہیں
ہم پر نہ ہاتھ ڈالے ہم تیس مار خاں ہیں
ہم ہیں چلانے والے ہم تیس مار خاں ہیں

پولیس کے سب سپاہی، ہمدم ہمارے راہی
سب ہیں ہمارے پالے ہم تیس مار خاں ہیں

پگڑیاں مت اچھال

ووٹوں کے ان دلال سالوں کی
شہ پہ اوروں کی سینہ تانتے ہیں
گالیاں دیجئے، ماریئے جوتے
وار جب کوئی ہم پہ کرتا ہے
کچھ دنوں سے ہوا جو پگڑی ہے
ان کے اوپر پڑے خدا نہ کرے
جی میں آتا ہے کاش ہو جاتی
شرق تا غرب مملکت کی حدود

بات اب مت نکال سالوں کی
ورنہ اتنی مجال سالوں کی
خوب موٹی ہے کھال سالوں کی
ہم بناتے ہیں ڈھال سالوں کی
زندگی ہے وبال سالوں کی
نیک نکلے عیال سالوں کی
جان ہم پر حلال سالوں کی
اور جنوب و شمال سالوں کی

طور شرفاء کے یہ نہیں راہی
پگڑیاں مت اچھال سالوں کی

محمد اسد اللہ
(ناگپور)

عید

یوں تو عید کے لفظی معنی خوشی کے ہیں لیکن جب زندگی ہی سے معنویت رخصت ہو جائے تو خوشی بھی محض لفظی بلکہ بعض اوقات لفاظی بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ملاقات کے وقت ادا کیا جانے والا یہ مروج فقرہ "آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی"۔ کہنے والے اور سننے والے دونوں کو اندر ہی اندر خالی برتن کی طرح ٹھن ٹھن بجتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع پر شاعر نے یہ محسوس کیا ہو۔

ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

قومی المیہ اور انفرادی غم، ایک دوسرے کے حساب میں لکھے جانے کے باوجود الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہمیں اپنے غم میں دبلے ہونے سے فرصت ملے تو قومی فریضہ بھی انجام دیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جسے غم کھانے کی عادت سی پڑ گئی ہو اس کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں غموں کی چھوٹی بڑی ڈشیں رکھی ہوئی ہیں۔ رب العالمین نے ایسے لوگوں کے کام و دہن کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ وہ حضرات جو غم کھانے میں خوش خوراک ہیں، قاضی شہر ہوں نہ ہوں ان کا دھان پان سا ہونا ضروری ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ صرف خوشیاں بانٹتے ہیں بلکہ خوش ہونے اور خوش کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ان ہی سے مخاطب ہو کر کسی نے کہا ہے، کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا،
ظاہر ہے یہ ڈبل روٹی والے کے انتظار میں سوکھتے نہیں ہیں۔

ہمارے دوست مسٹر "م" ان ہی لوگوں میں سے ہیں جو بلا مبالغہ خوشیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں دوسروں کی فتح کی خوشی میں ان کا بھی شیئر ہے۔ ایسے ہی ایک شیئر ہولڈر کا قول ہے کہ نہ دشمنوں کی ناکامی سے مجھے انتقامی خوشی حاصل ہوتی ہے اور نہ ان کی کامیابی میرے لیے مسرت افزا ہے۔ پھر آپ کی اس خوشی کا راز کیا ہے؟ ہم نے پوچھا۔ کہنے لگے۔ "یہ بھی ایک راز کی بات ہے، پہلے تو یہ سنو کہ کامیابیوں کی زیادہ تر خبریں آج کل باسی ہوا کرتی ہیں۔ ان میں وہ لذت ہی نہیں جو پہلے گھر کی مرغی کے انڈوں میں ہوا کرتی تھی۔ تم تو پیدا ہوئے تب سے پولٹری فارم کی مرغیوں کے انڈے کھا رہے ہو۔ گھریلو مرغیوں کے انڈوں کی حقیقی لذت تمہیں کیا معلوم اب یہی لے لو پڑوس کے شیخ جمن کے لڑکے کا نام میرٹ لسٹ میں موجود ہے اس خبر میں خاک خوشی ہے، بھئی امتیازی نمبرات تو بچوں کو نہیں مل جاتے۔ جب تک ممتحن اپنے اور پرائے میں امتیاز نہ کرے اور شیخ جمن بھی کسی طرح اسے اپنی امتیازی حیثیت یاد نہ دلا دے یہ ممکن نہیں۔ وہ لڑکا

جسے اپنے باپ کا نام تک صحیح طور پر لکھنا نہیں آتا۔ میرٹ حاصل کر کے اسے روشن کیسے کر سکتا ہے!" "مگر آپ نے خوشی کا راز نہیں بتایا؟"

"ارے کمبخت! خوشی تو دل سے پیدا کرتی ہے۔ اور دل تک جانے والا راستہ پیٹ سے ہو کر جاتا ہے ایسے مواقع پر مٹھائی اسی لیے تقسیم کی جاتی ہے کہ جو لوگ خبر سن کر خوش نہ ہوئے ہوں کم از کم مٹھائی کھا کر ہی شاداں ہو جائیں۔"

یہ تو رہا مسٹر "م" کا فلسفۂ خوشی۔

مجھے یاد ہے ہمارے بچپن میں عید کی خوشیاں سیویوں اور شیر خرمہ کی پیالیوں میں بھر بھر کر آیا کرتی تھیں، نئے نئے کپڑوں میں مہکا کرتیں، کسی کی پھولدار گول گول ٹوپی میں جھل جھل چمکتی تھیں، کبھی یہ خوشیاں عیدی کے سکوں میں کھنکھا یا اور اس دن لگے مینا بازار میں بکنے والی سیٹیوں اور باجوں سے ابھرتے ہوئے سات سروں میں گایا کرتی تھیں۔

پھر ہم ذرا بڑے ہوئے چنانچہ دودھ کے دانت گرتے ہی ہم ان معصوم سی خوشیوں سے محروم ہو گئے۔ جب قد و قامت نے کچھ اور پر پرزے نکالے تو زاویۂ نظر اور آس پاس بکھری ہوئی دنیا کے ساتھ ساتھ خوشیوں کے بہانے بھی بدل گئے میرا ایک بچپن کا ساتھی "ج" یہ کہا کرتا تھا کہ رشتہ داروں کے گھر جا کر شیر خرمہ کھانے ہی میں اسے عید کا اصل لطف آتا ہے یہ لطیف نکتہ بہت بعد میں ہماری سمجھ میں آیا کہ ان ہی عزیزوں میں سے کسی کے گھر اس کی بات پکی ہو چکی تھی گویا خوشی شیر خرمے کی پیالیوں سے نکل کر شربتِ دیدار سے بھرے اک جام میں آ گئی تھی پھر کچھ اور وقت گزر گیا۔

اب مسٹر "ج" عید پر بھی ان عزیزوں کے گھر نہیں جاتا۔ بات دراصل یہ تھی کہ لڑکی والے نکاح سے پہلے مسٹر "ج" کو برسرِ روزگار دیکھنا چاہتے تھے۔ اور وہ پڑھ لکھ کر نوکری کی تلاش میں مدتوں جوتیاں چٹخاتا رہا۔ ادھر کوئی کمار والا آیا اور لڑکی کو بیاہ کر لے گیا۔ آخر میاں مجنوں نے تھک ہار کر موٹر میکینک کا کام اپنا لیا۔ اب وہ وصالِ یار کی خوشی سے ہاتھ دھو چکا ہے اس کی قسمت کی سیاہی آئل بن کر ہر وقت اس کے ہاتھوں سے چپکی رہتی ہے۔ بعد میں کسی دن شادی بھی کر لی لیکن بقول "م" حقیقی خوشی والی "ڈش" اس کے حصے میں نہ آنی تھی نہ آئی۔

بات دراصل یہ ہے کہ دودھ کے دانت گرنے کے بعد خوشیوں کے الگ الگ رنگوں سے لطف اندوز ہونے کا کام ہم جاری رکھتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو زندگی کسی لیڈر کی نہ تھمنے والی تقریر کی طرح بیزار کن ہو کر رہ جائے۔

اب عید پر ہمارے بچے جب نئے نئے کپڑوں، عیدی کے پیسے اور شیر خرمے کی مزید ایک پیالی کا مطالبہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے اپنی اوریجنل بتیسی نکال کر رکھ دی ہے (حالانکہ یہ ممکن نہیں) اور اس کی جگہ بچوں کے دودھ کے دانت فٹ کر لئے ہیں اور ان دانتوں میں دبی کھجور یعنی "خوشی" دھیرے دھیرے لینا رس چھوڑتی جا رہی ہے اور اس کی شیرینی کا دریا رگوں میں پھیلتے پھیلتے دل کے ساحل پر شوخ لہروں کی طرح دستکیں دے رہا ہے ■■

ایس ایم معین قریشی
(کراچی)

میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا

اس سال یار لوگوں نے عید مل مل کر ہمیں ململ بنا دیا ہے۔ "ملاکھڑا" تو سندھ کا ایک مقبول کھیل ہے ہی لیکن لگتا ہے "معانقہ" بھی عنقریب اسپورٹس کی فہرست میں شامل کرلیا جائے گا۔ یہ ایک قومی کھیل ہوگا اس لیے کہ عیدین کے موقع پر پوری قوم اسے کھیلتی ہے اور مسلسل کئی دن تک کھیلتی رہتی ہے۔ پھر جب اسے اسپورٹ کا درجہ حاصل ہوجائے گا تو اس کے کلب بھی قائم ہوں گے جہاں معانقے کے پسلی توڑ داؤ پیچ اور مدمقابل کے "تابڑ توڑ" حملوں سے بچاؤ کی تعلیم دی جائے گی۔ ہم یہ چاہیں گے کہ ایسا جلد ہو تاکہ سب سے پہلے ہم کسی "معانقہ" کلب میں داخلہ لیں اس لیے کہ اپنی موجودہ زوال پذیر جسامت کے ساتھ تو ہم عید ملن کے وار سہنے کے قابل نہیں رہے۔

ایک تو نہ جانے یہ کیوں فرض کرلیا گیا ہے کہ عید معانقے میں جتنا سامنے والے پر تشدد کر دو گے اتنا ہی اس کے دل میں گھر کر دو گے گویا اس کی خستگی آپ کی وارفتگی کی دلیل ٹھہری اور اس رجحان میں تشویشناک اضافہ ہو رہا ہے اب اسے اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی کہ ہمارے ملنے والوں میں بڑے بڑے مشاق "عید معانقچی" شامل ہیں۔ اس میں مرزا صاحب جیسے بے مزہ بھی ہیں اور خان صاحب جیسے بے دھڑک بھی۔ عموماً نئے سال سے ایسی پر ہماری پہلی مڈبھیڑ مرزا صاحب سے ہوتی ہے سو اس سال بھی ہوئی۔ ہمارے نقطہ نظر سے وہ نہایت پسندیدہ جسامت کے مالک ہیں۔ یعنی ہم سے آدھے ہیں۔ ان کا عید ملنے کا انداز بڑا معصومانہ ہے محض واجبی طور پر کندھا سے کندھا چھو کر رسم ادا کردی اور بس! دراصل یہ سندھی اسٹائل کا معانقہ ہے۔ بہت پرامن اور باوقار۔ اس معانقے کے بعد دونوں پارٹیاں محبت سے مسکراتی ہیں یا نہ تو منمناتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کو کوستی ہیں جیسا کہ دوسرے انداز کے معانقوں میں ہوتا ہے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

مرزا صاحب کو خوشی خوشی بھگتا کر ہم گھر میں داخل ہوئے تو اچانک دہشت طاری ہوگئی۔ جی ہاں! بڑے سالے صاحب ڈرائنگ روم میں گھات لگائے بیٹھے تھے وہ ایک پیشہ ور باڈی بلڈر ہیں اور اپنی تن سازی کا مظاہرہ کرنے سال میں دو مرتبہ غریب خانہ کو رونق بخشتے ہیں جب وہ عید ملنے کے بہانے اپنی بہن کے بدلے چکاتے ہیں ہم نے انھیں دیکھا تو دم دبا کر بچ نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ پشت کی طرف سے حملہ آور ہوئے جونہی ہم ان کی دسترس میں آئے انھوں نے اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا

دو تین بار ضربِ شدید کا ارتکاب کیا۔ ہر بار ہمیں ادھ موا کر کے اور ہماری آہ و فغاں کو نظر انداز کر کے وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں گھورتے جیسے کہہ رہے ہوں اور کر دو گے بے زبانوں پر ظلم اور ہم اس خیال سے خاموش ہو گئے کہ ؎

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے

یہ "مجرمانہ" معانقے کی مثال تھی۔

ہمارا کچومر نکال کر انھوں نے ہمیں شیر خوار بچے کی طرح صوفے پر پٹخ دیا اور خود شیر خرمے پر ہاتھ صاف کرنے چلے گئے بدقت تمام چند سانسیں لی ہوں گی کہ دفتر کے ایک رفیقِ کار آ گئے۔ حسبِ روایت انھوں نے معانقے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو ہم نے ان پر واضح کیا کہ ہم ابھی پہلے حملے سے پوری طرح جانبر نہیں ہوئے ہیں لہٰذا وہ مصافحہ پر قناعت کر کے ثوابِ دارین حاصل کریں تاہم انھوں نے ہماری درخواست سرسری سماعت کے بعد یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ ؎

رسمِ دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

اس وقت ہمیں ان سے زیادہ غصہ اس شاعر پر آیا جس نے اپنے محبوب کو گلے لگانے کا یہ بہانہ تراشا اور ہزاروں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ہمارے ساتھی نے نہایت شائستگی کے ساتھ ہمیں سینے سے لگایا۔ چند سیکنڈ تک اسی طرح ساکت پوزیشن میں رہے۔ ہماری زبان سے ان کے لیے کلمۂ خیر نکلا لیکن پھر دفعتاً انھوں نے اپنے بازوؤں کی مدد سے ہمارے سینے کو دھونکنا شروع کر دیا اور کافی دیر تک دھونکتے رہے اس وقت تکلیف میں ہوش نہیں تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں مگر بعد میں احساس ہوا کہ موصوف فلم اسٹار نغمہ سے متاثر تھے جو ایک پنجابی فلم میں اپنے ہیرو کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ اسے "ظالمانہ معانقہ" کہنا چاہیے اور یہ ہمارے لیے مرے پر سو درے ثابت ہوا۔

ان سے بچ بچا کر ہم زیرِ زمین چلے گئے یعنی تہہ خانہ نشین ہو گئے خود کو تازہ ہوا سے محروم کر کے ہم نے گھر والوں کو سختی سے تاکید کر دی کہ دوستوں کو ہماری ہوا بھی نہ لگے۔ وہاں تمام دن سینے پر بام رگڑتے اور درد دفع کرنے والی گولیاں نگلتے گزرا۔ رات گئے اس خود ساختہ قیدِ تنہائی سے باہر آئے دوسرے دن صبح ناشتے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک پڑوسی سیٹھ صاحب تشریف لے آئے۔ سیٹھ صاحب کا تعلق خواجہ برادری سے ہے اور خاصے خوب تن و توش کے مالک ہیں مرزا صاحب کے بعد یہ دوسرے شخص تھے جن سے عید ملکر کچھ راحت نصیب ہوئی اور لوگ سینہ بہ سینہ عید ملتے ہیں، سیٹھ جی (مجبوراً) پیٹ بہ پیٹ ملتے ہیں، بڑے ہی شاہانہ انداز میں۔ مجال ہے جو گردن میں ذرا بھی خم آ جائے چنانچہ وہ اپنی جھولتی توند کو نمایاں کرتے ہوئے آگے بڑھے، اپنے دونوں ہاتھ ہمارے کندھوں پر رکھے اور پیٹ سے پیٹ کو چھو کر دو تین بار دائیں بائیں رگڑ دیا۔ تکلیف کے بجائے تھوڑی سی گدگدی ہوئی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ مزید کوئی کارروائی ہو گی کہ سیٹھ جی نے مصافحہ کر کے اجازت طلب کر لی۔ جی چاہا بڑھ کر ان کی بلائیں لے لیں لیکن وہ چشم زدن میں باہر تھے ان کا یہ "عاجلانہ معانقہ" ہمیں بہت بھلا لگا۔

دن اچھا خاصا گزر رہا تھا کہ دوپہر کے قریب چودھری صاحب آن دھمکے۔ وہ ہمارے بچپن کے دوست ہیں ڈیل ڈول اور قد کاٹھ میں ہم سے ڈبل ہیں اسی لیے ہم نے انہیں اپنی سلامتی کے لیے ہمیشہ خطرہ سمجھا ہے چودھری صاحب عید ملنے کے ارادے سے بڑھے تو ہم نے ان سے عرض کیا بھائی جی عید تو باسی ہو چکی ہے بولے "یار جب اپنے سے کسی کمزور کو دیکھتا ہوں تو پھر تازہ ہو جاتی ہے۔" اور اس سے پہلے کہ ہم کچھ مزید تاویل پیش کرتے ہم نے خود کو ان کے سینے سے چپٹا ہوا پایا۔ کسی قسم کی مزاحمت کی گنجائش نہ تھی لہٰذا ہم نے ذکر اذکار کا سہارا لیا۔ کچھ دیر یونہی چمٹائے رکھنے کے بعد انھوں نے پوری قوت کے

ـنہ لاکھڑے کے پہلوان کی طرح ہم کو زمین سے اوپر اُٹھالیا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے دنیا ہی سے اُٹھالیا گیا ہے اِدھر دہ
ن حال سے کہہ رہے تھے۔ ہ

بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے

مردہ بدست زندہ کے مصداق ان کے رحم وکرم پر تھے کہ دیکھئے واپس زمین پر ڈھیر کرتے ہیں یا کہیں اِدھر اُدھر پھینک
یتے ہیں تاہم انھوں نے بحفاظت ہمیں فرش پر لینڈ کر دیا۔ اس "جارحانہ" معانقے کے بعد دو چار لطیفے سنا کر چوہدری
ب رخصت ہوئے۔

شام کے لگ بھگ ایک اور ملنے والے خان صاحب تشریف لائے وہ سیمنٹ بجری کا ڈپو چلاتے ہیں اور شاید
کے زیرِ اثر ان کے جسم میں کرختگی پیدا ہوگئی ہے۔ جوں ہی انھوں نے ہمیں اپنے سینے سے لگایا یوں معلوم ہوا جیسے کسی
کے مجسمے سے جا ٹکرائے ہوں پھر ہر چوٹ پر پسلیاں چٹخ کر رہ جائیں اس "سنگدلانہ" معانقے کے بعد ہم باکسنگ کے گرے
ئے کھلاڑی کے مانند "کاؤنٹنگ" پر آ گئے۔ اب ہمارے پاس اپنے عزیز دوستوں کی محبت کے عذاب سے بچنے کا ایک ہی
تہ تھا کہ گھر کو خیرباد کہہ دیا جائے چنانچہ ہم پہلے عارضی طور پر ایک ہوٹل میں منتقل ہوئے اور پھر علاج کے لیے ایک کلینک میں
ں سے ان سطور کے ذریعہ قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم اگر معانقہ اسپورٹس میں شامل ہوگیا تو انشاء اللہ ہم خود
سال اس کے چیمپئن ہوں گے اور دوستوں کے لیے لقمۂ تر ثابت نہیں ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو احباب ابھی سے سن
اس دفعہ گھر چھوڑا ہے اگلے سال کے لیے ارادہ یہ ہے کہ۔

میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔!

مارک شیٹ

بازغ بہاری
(کلکتہ)

سُنی جو میں نے یہ خبر تو رُخ کیا مکاں کا
ہوا ہے اینول رزلٹ آؤٹ امتحان کا
قدم رکھا ہی گھر میں تو یہ دیکھ کر پھڑک اٹھا
ہے مارکشیٹ لاڈلے کا میز پر رکھا ہوا
لپک کے میں، بڑھا یوں شادمانی ونشاط سے
اٹھایا مارکشیٹ پھر دفورِ انبساط سے
رزلٹ غور سے جو دیکھا آٹھویں کلاس کا
ہوا بریک فیل دفعتاً مرے حواس کا
اُلٹ کے پھر پلٹ کے پھر جو پھر سے دیکھا مارک شیٹ
تو چڑھ گیا میرے دماغ پر میرے لہو کا ہیٹ
کمال ہے! یہ ہسٹری میں مارکس وہ بھی سکسٹین
ستم ذرا یہ دیکھئے کہ میتھ میں فقط یہ تین
یہ لینگویج پرشین کا حال! سو میں صرف ٹن
یہ جغرفی! خدا کی مار، سو میں محض الیون
کٹا دی میری ناک ہی تو اس حرام خور نے
ملا دی آبرو ہی خاک میں تو کام چور نے
میں پیچ وتاب کھا کے پھر اٹھا بڑے تپاک سے
دو چار ہاتھ لاڈلے کو جڑ دیئے تڑاک سے
لگا وہ تلملا کے رونے دفعتاً جو زور سے
تڑپ کے آئیں اہلیہ معاً کچن کی اور سے
تنک کے بولیں، خوب ہیں یہ حرکتیں کمال کی
عبث پٹائی کر رہے ہیں آپ میرے لال کی
رکھا تھا آپ نے چھپا کے جس کو ہر لحاظ سے
نہ بچ سکا وہ لاڈلے کی چشمِ احتفاظ سے
پڑا ہوا زمیں پہ وہ جو ٹاپ کا رزلٹ ہے
اُٹھا کے پھر سے دیکھئے وہ آپ کا رزلٹ ہے

مَوت

حاجی مسعود جھانپڑ
(ناگپور)

داؤں اپنا جب چلا دیتی ہے موت
اچھے اچھوں کو ہلا دیتی ہے موت
صرف اک کمزور کی کیا بات ہے
بارہ رُستم کے بجا دیتی ہے موت
آپ چاہیں کتنا بھی میک اپ کریں
رنگ چہرے کا اڑا دیتی ہے موت
ہو گیا ہے جو تکبّر کا مریض
عاجزی اس کو سکھا دیتی ہے موت
مال وزر پہ جو اکڑتا ہے اُسے
ناچ نگنی کا نچا دیتی ہے موت
زیست پر اپنی نہ جھانپڑ ناز کر
زیست کو جھانپڑ لگا دیتی ہے موت

رحیم اللہ بن توفیق
(حیدرآباد)

اخبار بینی

اخبار بینی ایک بہت ہی مفید اور باوقار مشغلہ ہے! اس سے قابلیت اور عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اخبار بینی سے جاہل نیم جاہل بن جاتا ہے اور نیم جاہل جاہل نہیں رہتا۔ اور قابل لوگوں کا تو کہنا ہی کیا سونے پہ سہاگہ مگر اس میں ایک برائی بھی ہے کہ آدمی باتونی بن جاتا ہے۔ کسی بھی محفل میں موقع ملتے ہی سیاست پر کچھ اور حالات حاضرہ پر تبصرہ شروع کردیتا ہے۔ جب ہم پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمیں وقتاً فوقتاً اخبار پڑھنے کی تاکید کی جاتی اور ایک دور کے رشتہ دار کی اکلوتی اولاد کی مثال دے کر شرمندہ کرتے ہوئے اخبار بینی کی ترغیب دی جاتی تھی ہم شرمندہ ہونے کے بجائے اس کان سے سن کر اس کان سے اڑادیتے۔ اس عمر میں سیاست سے کیا دلچسپی ہوتی۔ اس وقت تک سیاست اتنی دلچسپ اور اسکینڈل سے بھری ہوئی تھی نہ سڑکوں پہ آئی تھی۔ بلکہ یہ محلوں اور درباروں تک ہی محدود تھی۔ بے فکری کا دور دورہ تھا۔ غریب آدمی بھی پیٹ بھر کھاتا اور حضور نظام کو دعا دے کر چین کی بنسی بجاتا۔ اس کے لیے سیاست ایک بے معنی مشغلہ تھی۔ بہرحال، مانیے یا نہ مانیے اخبار بینی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب کسی انگوٹھا چھاپ لڑکے کی اسم نویسی آتی تو قابلیت کے خانے میں بتایا جاتا کہ خط لکھنے پڑھنے کے علاوہ اخبار بھی پڑھ لیتا ہے۔ اخبار بینی زائد قابلیت شمار ہوتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم اگرچہ عام تھی لیکن متوسط طبقہ اس سلسلہ میں سنجیدہ نہیں تھا۔ لڑکے والے امور خانہ داری سے واقفیت پر زیادہ زور دیتے اور تعلیم کے بارے میں صرف اتنا ہی پوچھا جاتا کہ لڑکی گھر اور دھوبی کا حساب کتاب لکھ سکتی ہے یا نہیں۔ لڑکے والوں کو مرعوب کرنے کے لیے خطوط نویسی اور اخبار پڑھنے کا ذکر اپنی طرف سے کردیا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیاں اپنے زمرہ کی لڑکیوں میں مختار مانی جاتی تھی۔ یہ تو معلوم ہوجاتا کہ لڑکی دنیا کے حالات سے باخبر ہے اور نری اللہ میاں کی گائے نہیں ہے۔ اخبار بین لڑکی عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

نظام کے دور میں اردو سرکاری زبان اور گھر کی لونڈی تھی اس لیے لوگ میم (انگریزی) پر عاشق تھے۔ ہمارے ایک بزرگ جب اپنی چھوٹی بہن کی ہونے والی سسرال سے واپس آئے تو ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں فرمانے لگے "جب میں گھر میں داخل ہوا تو لڑکا ٹانگ پر ٹانگ ڈالے انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا" محض اس ایک خوبی پر انھوں نے اپنی بہن کا اس پاکٹ سائز لڑکے سے شیک ہینڈ کرایا۔ وہ خود منشی فاضل تھے انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی حسرت

ہم ان کے ہاتھ میں ہمیشہ پرائمری کی انگلش کتابیں اور اسٹوڈنٹ ڈکشنری رہتی تھی۔ اپنی اس محرومی کے ازالہ کے لیے انھوں نے اپنے بچوں کو گرامر اسکول میں شریک کروادیا۔

انگریزی اخبار پڑھنا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی علامت ہے پہلے انگریزی سے واقفیت ہی قابلیت کی سند تھی لیکن آج کل اردو سے نابلد ہونا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی علامت ہے اردو کے بڑے بڑے دانشور جو اُردو کی تائید میں بڑھ چڑھ کر بولتے ہیں اسٹیج پر فخریہ انکساری سے بلاضرورت انکشاف کرتے ہیں کہ ان کے بچے اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے پھر درخواست کی جاتی ہے خدارا اپنے بچوں کو اردو پڑھایئے۔ مادری زبان میں تعلیم دلایئے اور ہماری طرح پچھتایئے مت۔

اخبار دو زمروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں ایک صوبائی دوسرے قومی صوبائی اخبارات تو اکثریت کی مادری زبان میں شائع ہوتے ہیں لیکن قومی اخبارات جنھیں انگریزی صحافت بھی کہا جاتا ہے، کسی متفقہ قومی زبان کی غیر موجودگی کے باعث "ادھاک قومی زبان" یعنی انگریزی میں شائع ہوتے ہیں۔

اخبار ہر صاحب استطاعت خریدتا ہے۔ کچھ لوگ اخبار محض اپنے وقار کے لیے خریدتے ہیں۔ یہ اخبار کو چھوتے تک نہیں بعض لوگ صرف سرخیاں دیکھتے ہیں وہ بھی ناشتے کی میز پر چند لوگ ایسے ہیں جو سارا اخبار چاٹ جاتے ہیں۔ وہ کموڈ پر بیٹھ کر آرام سے اخبار پڑھتے ہیں ایک پنتھ دو کاج بلکہ اخبار پڑھنے کے علاوہ سوچ بچار میں بھی مشغول ہوجاتے ہیں۔ مستقبل کے منصوبے بناتے ہیں۔ گھر میں اس سے پُرامن گوشہ انھیں کہیں نہیں ملتا۔ جہاں فرصت ہی فرصت ہے۔ وہاں "ایکانت" میں دماغی ورزش بھی ہوجاتی ہے اور چوری چھپے سگریٹ نوشی بھی۔ نہ کسی کے آنے کا ڈر نہ تانک جھانک کا خدشہ۔ غریب لوگ ہوٹل میں چائے پی کر اخبار پڑھ لیتے ہیں اس سے قاری اور ہوٹل والا دونوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ زیادہ غریب لوگ اخبار کے دفتر کے باہر دیوار پر چسپاں اخبار پڑھ کر اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ اخبار پڑھنے والوں کی ایک قسم وہ ہے جو پڑوس سے اخبار مانگ کر پڑھتی ہے ہمارے ایک پڑوسی گما ہے ما ہے ہم سے اخبار مانگ لیتے ہیں خصوصاً اتوار کا ایڈیشن۔ یا پھر جب کبھی ان کے مطلب کی خبر چھپتی ہے جب بھی وہ اخبار مانگنے آتے ہیں فوراً ادعا کرتے ہیں کہ ہمارے پاس اردو اخبار نہیں آتا۔ بچے انگریزی اخبار پڑھتے ہیں۔ بچے پانچ ہیں اور میں ایک اُردو پڑھنے والا۔ ایسے ہی ایک اور صاحب ہیں جو موقع بے موقع بتاتے ہیں کہ ہمارے پاس تو انگریزی اخبار آتا ہے۔ ہمارے لونڈے پڑھتے ہیں۔ مجبوراً مجھے بھی انگریزی اخبار پڑھنا پڑھتا ہے حالانکہ انھیں انگریزی کی اے۔ بی۔ سی تو کیا اردو کے الف بے کی بھی واقفیت نہیں ہے۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ بعض حضرات اخبار کو چھوتے تک نہیں۔ ایسے ہی ایک حضرت سے جب ہم نے کہا کہ آج کے اخبار میں ایک کام کا اشتہار آیا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا تو انھوں نے لاعلمی ظاہر کی اور بچے کو پکارا چنو ذرا اخبار لانا۔ بچے نے چند چباتے ہوئے کاغذ کے گولے لاکر رکھ دیئے۔ انھوں نے پوچھا یہ کیا ہے بچے نے کہا منے نے چبادیا۔ انھوں نے چیخ کر پوچھا کیوں منے کو دودھ نہیں دیا گیا ان کی بیوی نے وہیں سے بہ آواز بلند کہا ماشاءاللہ آج سے منے نے کھانا شروع کردیا ہے۔

اخبار میں ہر قسم کے ذوق کا مسالہ ہوتا ہے سیاسی خبروں سے لے کر تفریحات اور عجیب الخلقت مخلوق کو

پیدائش تک ایک بار ایک بڑی غیر معمولی خبر چھپی تھی کہ بچہ ماں کے پیٹ میں نماز اور قرآن پڑھ رہا ہے بلکہ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ اب اخبار اتنا معتبر ہوتا ہے کہ لوگ عقل کو چھٹی دے کر آنکھ بند کر کے جھٹ پٹ ایمان لے آتے ہیں۔

ہمیں یہ تو یاد نہیں کہ سب سے پہلا اخبار کب نکلا تھا لیکن جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ عام زندگی میں اخبار کی بڑی اہمیت ہے۔ اخبار کا الکٹرانک میڈیا سے زبردست مقابلہ چل رہا ہے۔ ریڈیو ایجاد ہوا تب بھی اخبار کی اہمیت اور مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی تھی اور اب ٹی وی کی ایجاد کے بعد بھی وہ ہنوز روز اول کی طرح مقبول ہے۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور اخبار ضرورت کے تحت ہی ایجاد ہوا ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی! ■

تابش خانزادہ
(کیلی فورنیا)

بیگم کی نظر میں

تیر ہیں، تلوار ہیں میرے میاں — ایک تیکھی دھار ہیں میرے میاں
ڈھنگ کی اک بات وہ کرتے نہیں — آدمی بے کار ہیں میرے میاں
کھانستی ہوں میں تو گر پڑتے ہیں وہ — ریت کی دیوار ہیں میرے میاں
پھر رہے ہیں یوں وہ جیسے تیس مار — گرچہ مکھی مار ہیں میرے میاں
حل کرے ہیں مسئلے لوگوں کے وہ — سب کے نمبردار ہیں میرے میاں
وہ لگاتے ہیں، بجھاتے ہیں کہیں — اک سلگتی نار ہیں میرے میاں
یوں تو لگتے ہیں وہ صحت مند سے — اصل میں بیمار ہیں میرے میاں
کاٹنے کو دوڑتے رہتے ہیں وہ — ہاں بڑے خونخوار ہیں میرے میاں
گھر سے باہر چور وہ مشہور ہیں — گھر میں تھانے دار ہیں میرے میاں
نوکری کرتی ہوں میں کھاتے ہیں وہ — یوں بڑے خوددار ہیں میرے میاں
آتی جاتی عورتوں پر ہے نظر — مجھ سے ہی بے زار ہیں میرے میاں
میرے دادا سے ہیں کچھ چھوٹے مگر — پر بڑی سرکار ہیں میرے میاں

کیا بتاؤں تجھ کو تابش کیا ہیں وہ
بس خدا کی مار ہیں میرے میاں

غزل

آہستہ سے بول بیگم مارے گی — کھل جائے گا پول بیگم مارے گی
لے کر دینی ہے ساڑی پھر بھاؤ کیا — مت کر مول اور تول بیگم مارے گی
جان کی مجھ کو بھیک ہی دیتی جا بابا — ہاتھ میں ہے کشکول بیگم مارے گی
اماں، باوا، بہن اور بھائی دور ہوئے — سارے رشتے گول بیگم مارے گی
خود کو یہ کچھ اور سمجھتی ہے گویا — اور مجھے بغلول بیگم مارے گی
کسرت بھی کرتی ہے گھی بھی پیتی ہے — پی کر اسپغول بیگم مارے گی
چین چلو، جاپان یا روس چلے جاؤ — جاؤ استنبول بیگم مارے گی
مان لو اس کی بات پہلے جھگڑے سے — مت کر ٹال مٹول بیگم مارے گی

★

ابد مُعِز (ریاض)

ہنسیے کہ ہنسنا ضروری ہے!

ڈارون سے نسبت رکھنے والے دانشوروں کا خیال ہے کہ انسان حیوان ظریف ہے۔ جانور ہنستا نہیں جب کہ انسان کو ہنسنا آتا ہے۔ اس ضمن میں جانوروں کے کیا تاثرات ہیں، اس پر اب تک کسی سائنسداں کی تحقیق نہیں آئی۔ عین ممکن ہے کوئی محقق اس پر کام کر رہا ہو اور مستقبل قریب میں اس نتیجہ کے ساتھ منظر عام پر آئے ور بھی ہنستے ہیں لیکن ان کی ہنسی انسانوں کی طرح عیاں نہیں ہے۔ ظرف کی بات ہے۔ فی الحال انسان خوش فہمی لا ہے کہ ہنستا وہی ہے اور یہ بھی کہ ہنسنے کے لیے ذہانت درکار ہے۔ عقل و فہم سے عاری اشخاص ہنس نہیں سکتے۔ کے بجائے سوال بلکہ سوالات کرتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ہمیں پچھلے دنوں ہوا۔ ایک محفل میں ہم نے لطیفہ سنایا۔ ایک ہ نے اپنے دوست سے سوال کیا "اگر میں ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچ جاؤں تو تم مجھے کیا دو گے"؟

دوست نے جواب دیا "دھکا"۔ سب ہنسنے لگے لیکن ایک صاحب ہنسنے والوں کو حیران اور پریشان تکتے رہے ھوں نے ہم سے پوچھا "آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں؟ پہلے مجھے بتائیے۔ کیا ہمالیہ کی چوٹی پر جانا آسان ہے؟ کیا ت بھی اس شخص کے ساتھ ہمالیہ کی چوٹی پر جائے گا؟ اور وہ دھکا کیوں دے گا؟ اگر وہ دھکا دینا چاہے گا تو ں اپنے دوست کے ساتھ کر سکتا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے۔ اس مرتبہ وہی ہنس رہے تھے اور ہم سب حیران اور ان انہیں گھور رہے تھے۔

لوگ چہروں کو جاذب نظر بنانے اور اپنی FACE VALUE بڑھانے کے لیے مختلف حربے آزماتے ہیں۔ ن میک اپ کرتی ہیں اور زیورات پہنتی ہیں تو مرد حضرات مونچھ اور ڈاڑھی کے مختلف انداز اپناتے ہیں۔ ہر کوئی چاہتا ہرہ اگر خوبصورت نہ بن سکے نہ سہی قبول صورت تو ہو۔ یقین جانیے چہرے پر سجانے کے لیے مسکراہٹ سے بڑھ ئی میک اپ نہیں اور ہنسی سے بڑھ کر کوئی زیور نہیں ہے۔ مسکراہٹ اور ہنسی سے انسان کی FACE VALUE ضافہ ہوتا ہے۔ ماحول خوشگوار اور فضا اپنائیت سے معطر ہوتی ہے۔ صرف مسکرانے کے انداز پر لوگ ایک دوسرے نے لگتے ہیں۔ کسی کی ہنسی دل پر بجلیاں گراتی ہے تو کسی کی ہنسی سے بہار آتی ہے۔ کوئی ہنسی ہرجائی تو کوئی ہنسی ہوتی ہے۔

ہنسی متعدی ہوتی ہے۔ کسی کو ہنستا ہوا دیکھ کر بغیر وجہ جانے ہم اس کی ہنسی میں شامل ہو جاتے ہیں ایک محفل میں

احباب بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک صاحب کچھ یاد آنے پر مسکرانے لگے۔ بازو والے نے ان سے سبب دریافت کیا تو "ایک مزے دار واقعہ یاد آیا" کہہ کر ہنسنے لگے۔ دوسروں نے ان میں دلچسپی لی تو انہوں نے "ہوا یوں" کہہ کر قہقہہ لگایا۔ پھر کیا تھا محفل میں خوشیاں بکھر گئیں۔ ان کے ساتھ چند لوگ مسکرانے لگے تو چند ہنسنے لگے۔ کچھ دیر بعد مسکرانا اور ہنسنا بند ہوا تو ہم نے پوچھا "جناب والا۔ اب وہ واقعہ سنا دیجئے جس کے لیے ہم پیشگی ہنس چکے ہیں؟"

موصوف اس واقعہ کو یاد کرنے لگے لیکن انہیں یاد نہ آیا۔ سر کھجاتے اور سوچتے ہوئے معذرت کی "معاف کرنا یاد نہیں آرہا ہے کون سا واقعہ تھا۔ شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ اس کے عوض غائب دماغی پر ایک لطیفہ سن لیجئے ایک صاحب شادی کرنا بھول گئے۔ کئی برس بعد جب انہیں شادی رچانے کا خیال آیا تو وہ خوبصورت آنکھوں والی اپنی پسندیدہ لڑکی کے گھر گئے وہاں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی موتیا بند (CATARACT) آپریشن کروانے اپنے شوہر کے ساتھ دواخانہ گئی ہے"

ہنسی کے ساتھ یہ کتنی اچھی روایت ہے کہ ہم خوشیاں بانٹتے ہیں ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

کون بہتے ہوئے اشکوں پہ نظر رکھتا ہے ۔۔۔ لوگ ہنستے ہوئے چہروں کو دعا دیتے ہیں

احباب کو خوش رکھنا انسانیت کی خدمت ہے۔ فقیر بابا کی صدا بھی یاد آتی ہے "کر بھلا تو ہو گا بھلا" ہر دم ہنسیں اور لوگوں میں مسرتیں تقسیم کریں۔ یہی مشورہ ہم نے اپنے ایک دوست کو دیا تھا۔ چند دن بعد انھوں نے رونی صورت بنا کر بتایا "میں ہنسنا اور ہنسانا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں ہر صبح میری نظر تازہ اخبار پر پڑ جاتی ہے"

ابھی تک یہ طے نہ ہو سکا ہے کہ خوشی مقدم ہے یا ہنسی۔ یہ بات ایسی ہی ہے جیسے انڈا پہلے کہ مرغی۔ بعض کے نزدیک ہنسنے کے لیے سچی خوشی درکار ہے اور آج کے دور میں خوشی تو درکنار زندگی کی طمانیت ہی حاصل نہیں ہے۔ ہر افسانہ کے ساتھ ہمیں خون کے آنسو رلانے کے لیے صف باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک فلسفی دوست کو ہم نے کبھی قہقہہ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے آخری بار جی کھول کر چھ سال کی عمر میں ہنسا تھا جب انہیں زندگی کا شعور حاصل نہ تھا۔ ہم نے انھیں ہنسانے کی کئی مرتبہ کوشش کی۔ ان سے مذاق کیا۔ ان کے سامنے اپنا مذاق اڑایا۔ منہ بنائے۔ لطیفے سنائے اور آخر میں گدگدیاں بھی کیں۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے الٹا ہم سے کہنے لگے "زندگی کی سنجیدگی کا تمہیں احساس نہیں ہے جب دیکھو ہی۔۔ ہی۔ ہی کرتے رہتے ہو۔"

ہم نے اپنے دوست کی خاطر متین بنتے ہوئے پوچھا "کیا آپ نے اپنی سنجیدگی سے زندگی کے مسائل حل کر لیے؟"

ہمارے دوست نے مزید سنجیدہ بلکہ رنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "نہیں"۔

"تو پھر بے رنگ اور پھیکی زندگی گزارنے کے بجائے اپنی ناکامیوں پر ہی ہنسیئے" یہ کہہ کر ہم ہنسنے لگے تو موصوف نے ہمیں ڈانٹا "چپ۔ مسخرہ کہیں کا۔"

خاموش ہونے کے بجائے ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی "جناب والا۔ زندگی کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر ہنسنے کا نام زندہ دلی ہے اور یہی انسان کی شان کج کلاہی ہے۔"

مزاح یا ہنسی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہم ہنسی ہنسی میں وہ حقیقت بیان کر جاتے ہیں یا اپنے ان جذبات کی عکاسی کر جاتے ہیں جنھیں اگر سنجیدگی سے کہیں تو قیامت آجائے۔ کسی خاتون کے سامنے اس کی صحیح عمر بتانا بہت نازک اور مشکل کام ہے۔ ہمارے ایک دوست ہنسی ہنسی میں یہ خطرناک سا کام کر گئے۔ انھوں نے بیگم سے کہا "آپ بالوں سے ۱۶

توں سے ۱۷ سال، اور جسم سے ۱۹ سال کی لگتی ہیں اور ان سب کو جمع کرلو تو آپ کی عمر نکل آئے گی۔"

ہنسی کے بہت فائدے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہمیں آنسو اور ناک پونچھنا نہیں پڑتا۔ رومال کی بت نہیں رہتی جب کہ ہم نے ہنسی سے پرہیز کرنے والوں کو چار رومال رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہماری دانست ہنسنے کے لیے صرف اتنا ہی فائدہ کافی ہے لیکن بعض لوگ عجیب ہوتے ہیں۔ بلا تحقیق کوئی بات قبول نہیں کرتے۔ ل کی کھال نکالنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ محققین، ہنسی سے ہونے والے فوائد پر باضابطہ تحقیق کر رہے ہیں —— پارک میں ہنسی اور مزاح پر کام کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم ہے جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر جوئل گڈمین ہیں۔ وہ بتلاتے ں کہ ہنسی ان ہارمون کو کم کرتی ہے جو ذہنی دباؤ یا STRESS کا باعث ہوتے ہیں۔ ہنسی قوت مدافعت بڑھاتی ہے درد برداشت کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔ دنیا کے دیگر مقامات پر بھی ہنسی پر تحقیق ہو رہی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہنسی انسان کی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔ گنیز بک آف ریکارڈس میں درج، حالیہ عرصہ میں سب سے طویل عمر پانے والی رنچ خاتون جینی کالمنٹ نے مسکراہٹ کو اپنی طویل زندگی کا راز بتایا تھا۔ بعض محققین نے ہنسی کو بلڈ پریشر کم کرنے ں معاون پایا ہے۔ بچوں کی ہنسی سیکھنے میں مدد دیتی ہے۔

ہنسی کے اتنے سارے فوائد دیکھ کر لوگ باضابطہ ہنسنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ مختلف مقامات پر "ہنسی کلب" بنائے ا رہے ہیں جہاں لوگ جمع ہو کر ہنستے اور ہنساتے ہیں۔ دورِ حاضر کا المیہ ہے کہ مصروف، تیز رفتار اور مسابقتی ندگی میں ہنسنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ کسی واقعہ پر سوچ کر محظوظ ہونے یا اس میں مزاح کا پہلو تلاش کر کے ہنسنے کے لیے ہم چند لمحوں کا جوکھم مول نہیں سکتے۔ زندگی کی دوڑ میں دوسروں کے آگے نکل جانے کا خوف مسلط رہتا ہے۔ ہمارے باواجداد نے کبھی نہ سوچا تھا ہوگا کہ زندگی اتنی تیز رفتار اور ظالم ہوجائے گی کہ ان کی اولاد کو ہنسنے اور خوش رہنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ ۱۹۹۷ء کے نوبل انعام یافتہ اطالوی ادیب ڈاریو فو نے کہا ہے کہ انسانیت کو انتہا پسندی سے بچانے کے لیے اچھے مزاح کی زیادہ ضرورت ہے جس مزاح کی کمی ہمارا تاریخ کا تباہ کن المیہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ قہقہہ انتہا پسندی کو دور کرتا ہے۔

مختلف امراض کے علاج میں ہنسی بطور دوا استعمال ہو رہی ہے ہنسی کے ذریعہ علاج کو ہاسیا یوگا، LAUGH MERRY MEDICINE اور THERAPY جیسے نام دیئے گئے ہیں۔ ممبئی شہر کے ایک پررونق پارک میں ڈاکٹر مدن کٹاریہ، اپنا مطب لگاتے ہیں۔ ہر صبح لوگ اوپن ایر کلینک میں جمع ہو کر لطیفے سناتے اور جی کھول کر ہنستے ہیں۔ ہنسی اور قہقہوں سے تازہ دم ہو کر زندگی کی مشکلوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ جب لطیفوں کا ذخیرہ ختم ہوگیا تو ڈاکٹر کٹاریہ نے ایسی ورزش دریافت کی جس کے دوران جسمانی حرکتوں سے خود بہ خود قہقہے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاسیا یوگا ذہنی دباؤ، اضطراب، پریشانی، افسردگی اور محرومی کا شرطیہ علاج بتایا گیا ہے۔

عرصہ دراز سے سنا ہوا کسی دانا کا قول کہ ہنسی بہترین علاج ہے اب سچ ثابت ہوتا نظر آرہا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے مہنگی اور گراں بار دواؤں اور تکلیف دہ انجکشن سے نجات ملے گی۔ ڈاکٹر علاج کے لیے لطیفے سنائیں گے۔ مایوس مریضوں کو مونالیزا کی مسکراتی تصویر دکھائی جائے گی نزلہ زکام میں مبتلا مریض چھینکے گا تو ڈاکٹر منہ بنائیں گے تاکہ وہ ہنس پڑے بخار کم کرنے کے لیے مریض کو گدگدانے کا مشورہ دیا جائے گا کھانسی کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر مزاحیہ غزل عرض کریں گے۔ بہ

بھی ممکن ہے کہ مریض دواخانوں کے بجائے مزاحیہ محفلوں کا رُخ کریں گے جہاں ڈاکٹر اور نرس جوکر بنے مریضوں کے سامنے کرتب بازی کر رہے ہوں گے.

لیکن صاحب مریضوں کی ایسی قسمت کہاں. ڈاکٹر حضرات مرض سے زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ہوتے ہیں. مریض کو ہنسانا تو دور اس بے چارے سے ہنس کر بات بھی نہیں کرتے. مریض کو ڈانٹتے ہیں یا ڈراتے ہیں. اکثر اوقات دونوں ساتھ ساتھ کرتے ہیں. معمولی سردی زکام کے تعلق سے کہیں گے "چار دن سے بیمار ہو اور اب آ رہے ہو. معلوم ہے تمہیں نمونیا ہو سکتا تھا اور نمونیا دل اور دماغ تک پہنچ کر تمہارا خاتمہ بالجبر کر سکتا ہے. اپنی زندگی سے یوں نہ کھیلو. اب پابندی اور احتیاط سے علاج کراؤ.

ڈاکٹر حضرات کی ڈانٹ اور پھٹکار کے سبب ہم کبھی مرض کا ہنسی خوشی علاج کروانے سے قاصر ہیں. روتے بسورتے ڈاکٹر سے رجوع ہوتے ہیں. مطب اور دواخانے کی فضا بوجھل اور مضمحل ہوتی ہے. خاموشی میں عجیب و غریب خیالات اور وسوسے پریشان کرتے ہیں گردن جھکائے سوچتے رہتے ہیں. مرض سے اگر بچ بھی جائیں تو کیا ڈاکٹر ہمیں بخش دیں گے اور کیا ہم یہاں سے بھلے چنگے واپس ہو سکیں گے.

مریضوں کی عیادت میں بھی غیر ضروری سنجیدگی اور متانت برتی جاتی ہے. مریض سے ہنس بول کر دل بہلانے کے بجائے سوال کرتے ہیں "کیا مرض ہے؟" عجیب بے تکا سوال ہے. مرض کا نام پوچھ کر کیا علاج کرنے کا ارادہ ہے. یہی کیا کم ہے کہ مریض ڈاکٹر کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے. مرض کا لمبا چوڑا اور مشکل نام سن کر دہرانے کی کوشش کریں گے اور ناکام ہو کر خاموشی سے ہاتھ باندھے کھڑے ہو جائیں گے اور وقفہ وقفہ سے ٹھنڈی آہیں بھرتے رہیں گے. موقع ملا تو مریض کے سینے اور اس کے بچوں کے سر پر ہاتھ بھی رکھیں گے. ایسے دردناک ماحول میں مریض مزید بیمار ہو جاتا ہے اور اسے ہر کوئی موت کا فرشتہ دکھائی دینے لگتا ہے.

یا

ایک دعوت میں اسرار الحق مجاز کی نقل و حرکت کو صاحبِ خانہ کا کمسن لیکن خاصا صحتمند بیٹا مسلسل کئی منٹوں تک ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کے بعد جب گنگنانے لگا تو کسی نے مجاز سے کہا.

"مجاز صاحب! یہ بچہ بڑا ہو کر یا تو شاعر بنے گا یا ——"

مجاز نے کمالِ متانت سے اسی سانس میں جملہ پورا کر دیا

"یا سردار جعفری"

مایوس کن لمحات میں جہاں دعا اور دوا کے علاوہ کوئی اور اُمید نظر نہیں آتی وہاں ہنسی اور مزاح کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں. مریضوں کو مرض کی جانب سے توجہ ہٹا کر مزاحیہ فلموں، ڈراموں، اسکٹس، مضامین، کارٹون، لطیفوں وغیرہ میں مشغول رکھا گیا تو پتہ چلا کہ ان مریضوں میں بیماری سے لڑنے، موت کا ہنستے ہوئے مقابلہ کرنے اور ڈاکٹر کا بل بھی ادا کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا.

یہ طے ہونے کے بعد کہ انسان کا ہنسنا ضروری اور مفید ہے، ہنسنے سے پہلے چند باتوں پر غور کر چاہیئے. یہ فیصلہ کرنا اہمیت کا حامل ہے کہ کس پر ہنسا جائے. سب سے اعلیٰ معیار کی ہنسی خود پر ہنسی جاتی ہے. اپنے اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو قبول کرتے اور دوسروں کی فقرہ بازی اور طعنہ کو برداشت کرنے

صلہ ملتا ہے دوسروں کے ردعمل کا احتمال نہیں رہتا۔ خود پر ہنسنے کا اعلیٰ ظرف نہ ہو تو ہنسنے والوں کا
بھ دیجئے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ دنیا ہنسنے والوں کا ساتھ دیتی ہے۔ تیسری قسم کی ہنسی
ی پر ہنسنا ہے۔ یہ بڑی اوچھی ہنسی ہوتی ہے۔ کسی پر ہنسنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ ہم
، چند نوجوان لڑکوں کو کان میں بالیاں پہنے، لانبے بال اور کم سے کم کپڑوں میں دیکھ کر بے ساختہ
قہقہہ لگایا تھا۔ فیشن کے متوالوں نے ہماری وہ درگت بنائی کہ اب جب بھی کسی پر ہم ہنسنا چاہتے ہیں تو
د دیتے ہیں۔

ہنسی کے تعلق سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ کتنا ہنسا جائے ہنسی خوشی کے اظہار کے طویل عمل
ایک حصہ ہے۔ اپنے آپ خوش ہونا، مسکرانا، ہنسنا اور قہقہہ لگانا، مختلف درجات ہیں۔ خوشی کے اظہار
ی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ہنسی سے علاج کرنے والے ماہرین جی کھول کر قہقہے مارنے کا مشورہ
یتے ہیں۔ اکثر لوگ بے ساختہ ہنس دیتے ہیں۔ بعض اشخاص بالخصوص خواتین ہنسنے اور قہقہہ مارنے اور
بے ساختہ ہنسنے سے پیدا ہونے والے چہرے کے بگاڑ سے ڈر کر صرف مسکرانے پر اکتفا کرتی ہیں یا پھر
پنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا کر ہنستی ہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست اس منظر کو بدلی میں چاند کا چھپ
اٹھکھیلیاں) کرنا قرار دیتے ہیں۔ چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناگزیر وجوہات کے سبب مسکرانے
ے تک پرہیز کرتے ہیں۔ مسکراہٹ اور ہنسی سے دور رہنے والوں سے ہمیں ہمدردی ہے۔ ■■

مُنہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

جس دن سے آ گئے ہیں وہ میرے پڑوس میں
لگتے ہیں نوجوانوں کے پھیرے پڑوس میں

ناگن کا تذکرہ جو کیا میں نے ایک دن
آ آ کے بس رہے ہیں سپیرے پڑوس میں

زلفیں ہیں زیبِ دوش ہر اک نوجوان کے
حالات ہو گئے ہیں گھنیرے پڑوس میں

معشوق پہ شباب کا آنا غضب ہوا
عشاق نے لگا لیئے ڈیرے پڑوس میں

وہ جانِ آفتاب لبِ بام آ گیا
دربار لگ گیا ہے سویرے پڑوس میں

باہر کے چور اُچکوں سے محفوظ ہو گئے
ہم نے بسا لیئے ہیں لٹیرے پڑوس میں

آتا نہیں ہے مال کہیں سے بھی آج کل
منحوس کون آ گیا میرے پڑوس میں

وہ طالبہ ہے استرا، قینچی ہے اُس کے پاس
کس کی مجال زلف بکھیرے پڑوس میں

مُنہ پھٹ چلو یہاں سے، شرافت اسی میں ہے
ہوتی ہے روز روز ہی رے رے پڑوس میں

غزل

بے حس الہ آبادی
(حیدرآباد)

مخمور نگاہوں کا تصدق ہے، کرم بھی
لیمن میں ملا کر وہ پلا دیتے ہیں رم بھی

سیندھی کا مزہ ایسا ملا، شہر کو چھوڑا
پینے کے لیئے جاتے ہیں ویزاگ کو ہم بھی

الفاظ کے نشتر بھی ہیں، راکٹ کے مماثل
سینے پہ چلاتے ہیں وہ اب تیرِ ستم بھی

اک نیم نگاہی سے کیا کرتے ہیں جادو
وہ خفیہ محبت کا تو بھرنے لگے دم بھی

تقریب میں، مہمانِ خصوصی جو نہی آئے
دیکھے گئے پیچھے تو طفیلی کے قدم بھی

پہچان نہ پائے، انہیں لڑکا ہے کہ لڑکی
بالوں کے نمونے سے رہے دھوکے میں ہم بھی

جس طرح حسیں خواب دکھاتے ہیں منسٹر
بھولیں گے کہاں ہم بھی انہیں سات جنم بھی

پوشاک رئیسوں کی تو صورت ہے دلکش
چپکے سے وہ رکھ دیتے ہیں آفس میں تو ہم بھی

جنتا یہ وہ ہم تھے مگر تھے تو منسٹر
بے حس وہ تو لے آئے ہیں اک جیب میں ہم بھی

علیم خان فلکی (جدہ)

فائدہ سوٹ کا

بھائی یوسف امتیاز کو کینیڈا سے نہ جانے کیا سوجھی کہ سوٹ پر تنقید کرنے لگے سوٹ پہننا تو ہندوستانیوں پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں کے بنیادی حقوق میں سے ایک ہے جیسے ہمارے اور بنیادی حقوق ہیں مثلاً سڑکوں پر بلاخوف وخطر تھوک دینا، پان کی پچکاریوں سے اچھی بھلی عمارتوں کی دیواروں کو اشتراکیت کے رنگ سے رنگ دینا۔ دیواروں پر نعرے لکھ کر اور پوسٹرز لگا کر انھیں وال اسٹریٹ جرنل میں تبدیل کردینا۔ تاخیر سے آکر قطار توڑنا، ٹرافک رلیس میں ہمیشہ گولڈ میڈل حاصل کرنے کی فکر کرنا قطع کلامی کرنا مشورے دینا وغیرہ وغیرہ۔ سوٹ وہ نعمتِ غیر مترقبہ ہے جسے حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت سے مواقع پیدا کرنے پڑتے ہیں جیسے شادی ولیمہ عقیقہ یا پھر مشاعرہ تہنیتی یا تعزیتی جلسہ وغیرہ۔

انگریزوں کو تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ہم نے ان کی تہذیب کو کس قدر حفاظت سے اٹھائے رکھا۔ وہ تو ایسے ناشکرے ہیں کہ ذرا درجہ حرارت بیس سے پچیس ہوا اور انھوں نے سوٹ اتار پھینکا۔ بڑھ کر کبھی تیس ہوجائے تو پھر دیکھئے خواتین کو ململ بھی بھاری معلوم ہوتا ہے۔ اتنے قیمتی اور پر وقار لباس کی یہ توہین ہے جب کہ ہم تینتالیس ڈگری ٹمپریچر کیوں نہ ہو ہم کسی دعوت کے وقار کو سوٹ اتار کر کم نہیں کرسکتے۔ ابھی پرسوں کی بات ہے (اپنا حیدرآبادی پرسوں) ہمارے سالے نے اپنے سالے کے ولیمے پر ہم کو مدعو کیا سخت گرمی کے باوجود ہم کو سالے کے سسرال والوں کے درمیان رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کرنا ہی تھا سالوں کی خاطر کیا نہیں کیا جاتا ۔

سالے سیکھے تو ساتھ دیتے ہیں ؎ سالے بلٹے تو ہاتھ دیتے ہیں!

اور پھر سوٹ پہننے کے مواقع بار بار کب آتے ہیں۔ ہم نے اپنی شادی والا اکلوتا سوٹ منتخب کیا۔ منتخب سے مراد سوٹ کے اطراف ملکنے والے چار یا پانچ شرٹس میں سے ایک شرٹ کا انتخاب کیا اور زیب تن کرکے پہنچے۔ لباس سے ہی تو آدمی کی وقعت بڑھ جاتی ہے ہر شخص ہمیں کو بار بار گھور کر دیکھتا تھا۔ اتنے مہمانوں میں مشکل سے دو چار ہی ایسے کھاتے پیتے گھرانے کے تعلیم یافتہ لوگ نظر آئے جو سوٹ پہنے ہوئے تھے باقی سارے بس ندیدے ہی لگے سیدھے سادھے شرٹ پتلونوں میں آکر بیٹھ گئے پھر یہ کہ شرٹ کا بٹن کھولے دستیوں کو مسلسل پنکھا بنائے ہوئے تھے۔ کرنٹ نہ ہونے کی وجہ سے سارے پنکھے بند تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کم از کم ایسے موقعوں پر سوٹ ہی نہ پہنیں خیر ہم نے گھورنے والوں کو نظر انداز کیا اور آگے جاکر صاحبانِ سوٹ کے برابر بیٹھ گئے۔ برابری والوں کے درمیان اٹھنے بیٹھنے سے سوٹ کی عزت اور قیمت

میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا کم بخت دُلہن والے دلہن کو بیوٹی پارلر سے لے کر شادی خانہ پہنچے ہی نہیں تھے۔ دولہا کا گرمی سے بُرا حال تھا سہرا اتار کر بازو رکھ دیا گیا شیروانی کے سامنے بٹن کھول دیئے گئے خود ہم پسینے میں اندر سے ڈوبے جا رہے تھے ہمارے سالے صاحب ہمارے صبر و ضبط پر ممنون ہوئے جا رہے تھے بار بار آکر متانت سے کہتے "بھائی جان گرمی بہت ہے آپ جیکٹ اتار دیجئے"۔ اتارنا تو ہم بھی چاہ رہے تھے لیکن عقد خوانی اور دُلہا کے ساتھ ویڈیو گرافی میں شریک ہونے سے پیشتر یہ مناسب نہ تھا۔ ہم دل ہی دل میں اپنے باس کو داد تحسین دے رہے تھے جو جب سے گزیٹیڈ افسر بنے ہیں پابندی سے ہر موسم میں سوٹ پہنتے ہیں بعض اوقات پورا پورا دن بجلی نہیں رہتی فین بند رہتے ہیں لیکن نہ وہ پسینے کی پروا کرتے ہیں نہ گرمی کی یہ ہوتا ہے وقار۔ ہم بھی چاہیں تو مستقل سوٹ پہن سکتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں لوگ ابھی اتنے اعلیٰ ظرف نہیں ہوئے ہیں کہ ایک ماتحت کلرک کو اپنی طرح سوٹ میں دیکھ کر خوش ہو جائیں انھیں خدشہ رہتا ہے کہ افسر اور ماتحت کا فرق ختم ہو جائے گا۔

سوٹ پہن کر آدمی بڑا مہذب بن جاتا ہے کھانسے گا یا چھینکے گا تو رومال احتیاط کے ساتھ مُنہ پر رکھ کر پھر اسی نفاست کے ساتھ رومال کو تہہ کر کے جیب میں واپس بھی رکھے گا۔ تھوکنے کی احتیاج ہو تو اس طرح احتیاط سے جھک کر تھوکیں گے کہ چھینٹے نہ اڑیں۔ جب سوٹ پہن کر اسکوٹر چلائیں گے تو اس قدر ڈسپلن کے ساتھ کہ جیسے کوئی حاملہ خاتون پیچھے بیٹھی ہو نہ کٹ ما ریں گے نہ پانی سڑک پر ہو تو تیز چلائیں گے اور نہ بغیر اشارہ کیئے دائیں یا بائیں موڑیں گے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ بجائے ہیلمٹ کے اسکوٹر سواروں کے لیے سوٹ پہننے کا لزوم عاید ہونا چاہیئے بلکہ تمام آٹو ڈرائیوروں اور بس ڈرائیوروں پر بھی یہ پابندی لگا دینی چاہیئے۔ اس طرح ٹرافک کے آدھے سے زیادہ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اگر کہیں کوئی ہلکا پُھلکا ایکسڈنٹ ہو بھی جائے تو ویسا منظر تو ہرگز نہ ہوگا کہ قصور اپنا بھی ہو تو فوری دوسرے کو ایک عدد گالی کے ساتھ کہا جائے گا "کِدر دیک کے چلارا" (کدھر دیکھ کر چلا رہے ہو) اور اس کے بعد تھوڑی گرما گرم بحث کے ابتدائی نصاب کو پورا کرنے کے بعد دھکم دھکا شروع ہو جاتا ہے اگر مقابل کا پلڑا برابر کا ہو تو گتھم گتھا ہو گئے اور اگر مقابل کا پلڑا بھاری نکلے تو کپڑے جھاڑتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اپنی اسکوٹر اٹھائے خاموشی سے نکل گئے۔

کینڈا اور انڈیا میں بڑا فرق ہے وہاں سوٹ پہننا ایسا ہی عام ہے جیسے بکری کا گھاس کھانا اگر ہر روز کے سوٹ پہننے سے کوئی اُکتا جائے یا اس کے پاس سوٹ میسّر نہ ہو اور سیدھے سادھے شرٹ پتلون میں نکل پڑے تب بھی دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ سوٹ پہنتا ہوگا آج ہی نہیں پہن سکا جب کہ انڈیا میں کوئی سوٹ پہن کر نکلے چاہے وہ روز پہننے والا کیوں نہ ہو، گلی کا ہر فرد یہی تصور کرے گا کہ روزانہ کے دھوتی یا کرتا پاجامہ پہننے والے نے آج سوٹ پہن رکھا ہے اس لیے بعض حضرات محلے والوں کو اس طرح کی بدگمانی سے بچانے کے لیے سوٹ پہننے کے مواقع نکالتے ہی رہتے ہیں۔ اس معاملے میں مصر شام ترکی والوں نے کافی ترقی کی ہے وہ تو جلوس جنازہ میں بھی سوٹ پہن کر شرکت کرتے ہیں جیسے دیکھ کر انگریز بھی عش عش کرتے ہوں گے ان کی جدّت پسندی کا یہ عالم ہے کہ جلوس جنازہ میں کالے رنگ کا سوٹ پہن کر شریک ہوتے ہیں اور دیگر موقعوں پر دوسرے رنگ کا تاکہ دیکھنے والوں کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ ان کے پاس ایک عدد ہی سوٹ ہے۔ ہمارے ہاں اب تھوڑی تھوڑی لباس شناسی پیدا ہو رہی ہے مشاعروں میں دو چار شاعر ان کے

جوڑے* کا سوٹ پہن کر آنے لگے ہیں جو شاعر نہیں ہیں انہوں نے بھی سوٹ سلوالیے ہیں تاکہ شاعروں یا کسی بھی قسم کے جلسوں میں کبھی مہمانِ خصوصی یا اناؤنسر کے طور پر مدعو کیے جائیں تو یہ سوٹ کام آسکے۔ سالگرہوں بسم اللہ کی پارٹیوں کے علاوہ اب گیارہویں اور روزہ رکھائی کی تقریب میں بھی لوگ سوٹ پہن کر آنے لگے ہیں تاکہ کوئی حسرت باقی نہ رہے۔

سوٹ کا سب سے بڑا فائدہ ہم کو قطاروں میں نظر آیا چاہے کوئی سینما کا کاؤنٹر ہو کہ بس یا ریل کا ریزرویشن کی دوکان کا ہو کہ شادی خانہ کا۔ اگر ان جگہوں پر ہر ایک کے لیے سوٹ لازم کر دیا جائے تو لوگ بیہودگی دیکھنے ترس جائیں۔ بھارت کے دیہ جوالوں سے قطاریں خالی ہو جائیں اور ایسا لگے کہ انگریزوں کی روحیں گشت کر رہی ہیں۔ لوگ شرافت اور بردباری سے گھبرا کر ایک دوسرے سے درخواست کریں گے کہ بھائی ذرا ہمیں دھکا دے کر قطار میں ہم سے پہلے جانے کی کوشش کرو بڑی مہربانی ہوگی۔ دوسرا مہذبانہ انداز میں کہے گا "معافی چاہتا ہوں میرے سوٹ کی استری خراب ہو جائے گی"۔ سینما کی قطاروں میں لوگ سوٹ سنبھالتے ہوئے اس طرح آگے بڑھیں گے جیسے لڑکیاں غرارے سنبھالتی ہیں کسی کو داد اگر کرتے ہوئے اچانک نمودار ہو کر لائین کی تحقیر کرتے ہوئے سیدھے کاؤنٹر پر ہاتھ بڑھاتے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس جائیں گی۔ لوگ کھانے کی میزوں پر اس طرح آگے بڑھیں گے جیسے انگریز میت کے پیچھے چل رہا ہو کتنا اچھا ہوگا اگر راشن کی دوکانوں اور پانی کے سرکاری نلوں پر بھی لوگ بجائے لنگی یا دھوتی کے سوٹ پہن کر آئیں بھلے ہی وہ پرانا ہو چکا ہو اس کی آستین تنگ ہو چکی ہو اور ترقی ہاضمہ سے پیٹ آگے نکل چکا ہو پھر بھی سوٹ پہن کر آدمی اس طرح مہذبانہ قطار میں لگے گا جیسے کوئی فزیو تھراپی کا مریض پہلی بار بیساکھیوں کے بغیر چلنے کی مشق کر رہا ہو۔ مٹی کا گھڑا لڑھکنے سے زیادہ سوٹ کی حفاظت کی فکر اور احتیاط انہیں اتنا تو مہذب و مودب کر دے گی کہ کمزور بوڑھے اور ضعیف بھی اپنی باری سے محروم نہیں رہیں گے۔

سوٹ کا ایک اور فائدہ جو ہم نے محسوس کیا وہ یہ ہے کہ لباس شخصیت میں جذب ہونے کے بجائے شخصیت لباس میں جذب ہونے لگتی ہے اور آدمی انگریزی بولنے لگتا ہے جس کو انگریزی نہیں بھی آتی وہ کم سے کم "او آئی سی" "او مائی گاڈ" "شٹ" "بلڈی ایڈیٹ" تو بولنے لگتا ہے ایک صاحب نے جو چھینکنے کے بعد الحمدللہ باآواز بلند اس طرح کہتے تھے گویا اذان کی تربیت کر رہے ہوں ایک دن سوٹ پہن لیا بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ سوٹ نے انہیں پہن لیا اتفاق سے انہیں چھینک آئی تو فرمانے لگے EXCUSE ME اس طرح سوٹ مولوی ملاؤں کی روش سے نکال کر ترقی یافتہ قوموں کی عادتیں نوازتا ہے جس سے انگریز بھی خوش ہوتے ہیں۔

سوٹ کے سیاسی فائدے تو بے شمار ہیں جب سے ہم نے شیروانی چھوڑ کر سوٹ پہننا شروع کیا ہے اب ہمیں کوئی نہ قدامت پسند کہتا ہے نہ بنیاد پرست نہ کٹر پنتھی کہتا ہے نہ ملا۔ اب تو ہم پورے سیکولر لگتے ہیں۔ یہی کیا کم فائدہ ہے کہ سوٹ میں نہ آدمی کے مذہب کا پتہ چلتا ہے نہ کلچر کا۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی کے درمیان جتنی دیواریں تھیں گر گئیں ہم سوٹ پہن کر جب بھی کرسمس یا نئے سال کی پارٹی میں جاتے ہیں نہ ہم سے کوئی جھجکتا ہے نہ بدکتا ہے ہمارے سامنے شراب پیتے ہوئے شرماتا ہے نہ ناچتے ہوئے گھبراتا ہے بلکہ کبھی کبھی کوئی منچلا تو پیشکش بھی کر دیتا ہے اب ہم کیا کہیں کہ ہم مسلمان ہیں شراب نہیں پیتے یہ کہہ کر دوسرے مسلمانوں کو بدنام کرنے سے بہتر ہم یہی کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ "شکریہ اب طبیعت ہو چلی ہے گی" تاکہ سوٹ کا بھی وقار بنا رہے اور ایسی پارٹیوں میں شرکت کا موقعہ بھی قائم رہے۔

بہنر

محمود شریف محمود
(حیدرآباد)

اب نہ دالان ہیں نہ آنگن ہیں — گھونسلوں جیسے اپنے مسکن ہیں
سجنیوں سے بٹور کر دولت — عیش کرتے ہمارے ساجن ہیں
ملک سے مفلسی مٹانے کو — ایک فقط لیڈروں کے بھاشن ہیں
دیکھئے کہہ رہی ہے اب چھلنی — سوپ رے سوپ تجھ میں روزن ہیں
دل بدلتی ہیں باتوں باتوں میں — لڑکیاں آج ایسی سرجن ہیں
ہیں جو بیگم خفا تو دستر پر — صرف خشکہ ہے اور بینگن ہیں

کچھ نہ محمود پوچھئے کیا ہیں
طنز کے شعر، تیر ہیں، گن ہیں

شجاع الدین عاطف (آسٹریلیا)

خدا کرے کہ ملاقات میں وہ مقام آئے — گدھے کا نام لوں اور گھوڑا بے لگام آئے
بہت افاقہ ہوا ان کو اس جگہ جاکر — پچاس کے جو گئے، سو کلو گرام آئے
ہے شہر میں یہی افواہ مشاعرے میں کل — ٹکٹ خرید کے سب شعرائے کرام آئے
دعا یہی ہے خدا سے مری کہ اگلے سال — مرے نصیب میں گٹھلی تو ان کے آم آئے
ہیں خوش نصیب وہ سب کاپی کرنے والے لوگ — کہ جن کے ہاتھ میں گمنام سے کلام آئے

یہ غالباً ہے محبت کی انتہا عاطف
ذرا سا میں کبھی چھینکوں اسے زکام آئے

فرید سحر (نظام آباد)

ان کو اپنے شعر سنانا اپنے بس کی بات نہیں — بھینس کے آگے بین بجانا اپنے بس کی بات نہیں
اچھے شعراء میں خود لکھتوں میں بھی اچھا شاعر ہوں — ان کے ان کے شعر سنانا اپنے بس کی بات نہیں
گھر کا پورا کام میں کرتوں یہ تو میری فطرت ہے — لیکن ان کی گالیاں کھانا اپنے بس کی بات نہیں
صد فیصد بھی آسکتا ہے اپنے بھی کالج کا رزلٹ — بچوں سے اب کاپی کرانا اپنے بس کی بات نہیں
جمعہ جمعہ مسجد جاتوں ایسے بھی کچھ لوکاں ہیں — گھر سے خدا کے جوتے چرانا اپنے بس کی بات نہیں
ملیالہ کا ہے تقاضہ اس کا گھوڑے جوڑے میں — نکمے کو داماد بنانا اپنے بس کی بات نہیں
میں چاہوں تو بن سکتا ہوں ایڈیٹر بھی کا ۔ وادا — کمزوروں پر ہاتھ اٹھانا اپنے بس کی بات نہیں
اردو میری مدر ٹنگ ہے اس پہ مجھ کو ناز ہے پر — بچوں کو اردو میں پڑھانا اپنے بس کی بات نہیں

آپ کہیں تو بن جاؤں گا میں بھی چیف منسٹر اب
سسرے کو کرسی سے ہٹانا اپنے بس کی بات نہیں

YAMAHA موٹرسیکل

یوسف اِمتیاز (ٹورانٹو، کینیڈا)

میرے ہمدم میرے دوست

جانور کو روایتی طور پر سماج اور سوسائٹی میں ایک غیر یقینی یا غیر متعین جگہ حاصل ہے۔ بعضوں کے لیے ایک بوجھ ہے کچھ کے لیے سب کچھ سرمایۂ حیات یا اثاثہ مغربی سوسائٹی میں جانوروں اور انسانوں میں ایک خاص ناطہ ہے جو اکثر بوڑھی بغیر اونچی ایڑی والی جوتی پہننے والی عورتوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے مشرق میں جانوروں سے محبت عام نہیں ہے۔ لوگوں کو اپنے اور گھر بھر بچوں کا پیٹ پالنے سے ہی فرصت نصیب نہیں ہوتی تو جانوروں کا پیٹ بھرنا دور کی بات ہے۔

اردو زبان میں فارسی کی کہاوت مشہور ہے۔ سگ باش برادرِ خورد مباش۔ کتّے رہو مگر چھوٹے بھائی نہ ہو۔ کتے کو واقعی کتا مارا جاتا ہے کتا مارنا۔ کتے کی زندگی۔ کتے کی غذا انگریزی میں GONE TO DOGS اور نہ جانے کیا کیا کہاوتیں ہیں۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ جانوروں کی زندگی بھی ایک نئی کروٹ لے رہی ہے۔ حقوق کی حفاظت کے لیے انجمنیں بن رہی ہیں، جلسے جلوس احتجاج ـــ وہ بھی اب تیسری دنیا سے نکل کر اونچی سوسائٹی میں سانس لینے بلکہ اونگھنے کے خواب دیکھ رہے ہیں پہلے زمانے کی طرح جانور اب بے وقوف گدھے نہیں رہے ہیں کہ گھر کے نہ گھاٹ کے بلکہ ذہین ہوشیار۔ الو بن گئے ہیں۔ لوگ پہلے سے زیادہ جانوروں کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ لوگوں کو کولسٹرال CHOLESTRAL اور خون کے دباؤ کی فکر زیادہ ضرور ہو گئی ہے مگر کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی یہ بیماریاں ان لوگوں پر کس طرح اور کتنی شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہیں جو پالتو جانوروں کے مالک ہیں۔ جانور ہمارے روزمرہ اظہارِ خیال کا ایک اہم جز بن چکے ہیں گوریلا کا جنگ میں ذکر ہوتا ہے گدھوں نے بھی اکثر سیاست والوں کی طرح قدر و منزلت پالی ہے گدھے اب گدھے نہیں رہے۔ سیاسی پارٹیوں کا انتخابی نشان ہیں یہ اور بات ہے کہ کم عقل اور بے وقوف ہیں بھیڑیوں کو انسانوں کے برابر لا کھڑا کر دیا گیا ہے اور چالاک کے کیا کہنے کہ وہ لومڑی کے برابر کھڑے ہیں یا تو خود FOX بن ہو جاتے ہیں یا دوسروں کو کر دیتے ہیں۔ حضرت انسان اور سیاست والوں نے گرگٹ سے رنگ بدلنا سیکھا اور سانپ سے کینچلی ہاتھیوں سے دکھانے کے دانت۔ سفید پوشی اور بگلا بھگتی جیسے نام ظاہر ہے بگلے نے سکھلائی

ب رہی طوطے کی رَٹ تو یہ امتحانات کامیاب کرنے اور جھوٹ بولنے کے لیے بڑا ہی کارآمد اور آزمودہ نسخہ ہے
بلی کی آنکھیں دیکھنے کو تو بند رہتی ہیں مگر ساری دنیا کی خبر رکھتی ہیں۔ موقعہ کی تاک ہے کہ کب شکار ہاتھ آئے اور ہڑپ کرجائے۔ بلی کی طرح کھسیانا ہونا اور کھمبا نوچنا بہتر ہے BEAVER کی طرح کام کرنے سے۔ جب حضرت گدھ نے مردار کھانے کی تربیت دی ہے تو باز کی طرح آزاد اونچی فضاؤں میں اڑنا اور بازو دل کے زور پر شکار کرنا کیا ضروری ہے۔ جانوروں کے حقوق کی مختلف انجمنیں خرگوشوں کی طرح ہر طرف پھیل گئی ہیں عورتیں ان میں پیش پیش ہیں۔

ایسا قانون کہ جانوروں سے محبت منع ہو کسی ملک میں نافذ نہیں مگر مغربی دنیا میں اکثر جگہ یہ قانون ہے کہ بعض کرائے کے اپارٹمنٹس میں جانوروں خصوصاً کتے بلیوں کو نہ رکھا جائے۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے اس خالہ بلی کی بدولت ٹورانٹو کے ایک اپارٹمنٹ سے بلی پالنے والے ایک جوڑے کو اپارٹمنٹ خالی کردینا پڑا تھا۔ بات سپریم کورٹ تک گئی اور فیصلہ بلی کے خلاف ہوا۔ پھر کیا کہنا کہ کرایہ داروں کی میٹنگ طلب کی گئی کھچا کھچ بھرے اس ہال میں ہمدردوں اور غمگساروں کے آگے اس جوڑے اور بلی سے بے لاگ محبت خلوص کا اظہار کیا گیا۔ بے رحم قانون پر تنقیدی تقریریں ہوئیں خالہ بلی کے لیے مزیدار مہنگے کھانے کے ڈبے فراہم کئے گئے۔ جوڑے کو TENNENT OF THE YEAR کے خطاب سے نوازا گیا۔ جوڑے نے بلی کو سنبھالے ہوئے ٹیلی وژن کی تیز چمکدار لائٹ اور کیمرے کے آگے انٹرویو دیئے جو بائی وزیر قانون بھی وضاحت کے لیے پریس کانفرنس کررہے تھے۔ دوسری طرف جوڑے نے جھینگوں سے بلی کی مدارات کی اور کھلی باچھوں کے ساتھ اعلان کیا کہ یہ اس کی مستحق ہے۔ جانور اب صرف پالتو جانور نہیں رہے بلکہ ہمدم ساتھی اور دوست بن گئے ہیں۔ لوگ جتنا تنہا اور علیحدہ ہوتے جاتے ہیں جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے اتنی زیادہ جانور کی اہمیت اور عزت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ جن کی آواز عمر کے ساتھ ایک عرصے سے بالکل کم غائب یا کمزور ہوگئی تھی اب جانوروں سے گھنٹوں باتیں کرنے لگے ہیں۔ کتے بلیوں کے ساتھ غیر مہذب برتاؤ اونچی آواز میں ہدایت دینا منع ہے جرم ہے بلی ہو یا کتا عجیب شئے ہیں جس سے بچے اور بوڑھے سب ہی محظوظ ہوتے ہیں۔ بچوں کی زبان اور مسائل صرف کتا یا بلی خوب سمجھتے ہیں اور گھنٹوں کھیلتے ہیں۔ اگر لیٹے ہوئے ہیں یا آرام کرسی پر بیٹھے ہیں اٹھنے میں کاہلی ہورہی ہے تو کتے بلی کی مختلف آوازوں کو سن کر اپنی جگہ سے فوراً اٹھیں گے۔ چلیئے ورزش کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ وہ دن گئے جب کسی محفل میں پالتو جانوروں کی باتیں کرنا اپنا مذاق خود اڑانا تھا مگر آج کل گھنٹوں اپنے کتے اور بلی کی حرکات پر بات کیجیئے لوگ نہ صرف غور سے سنیں گے بلکہ اس میں جی کھول کر حصہ بھی لیں گے۔ ہمت بندھانے کے لیے کتے اور بلی سے اچھی چیز کونسی ہے جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے وہ سواگت کے لیے سب سے پہلے موجود ہے تھکن دور ہوئی دو چار باتیں ہوئی۔ پیار سے سہلا بھی دیا۔ کتے کے مقابلے میں بلی DEMANDING نہیں ہے اس کو تفریح کروانے کے لیے کتے کی طرح سردی ہو یا گرمی برفباری ہو یا برسات گھر سے باہر لے جانا نہیں پڑتے۔ جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ عیاشی کے ساتھ ڈبوں کے لذیذ قیمتی کھانے کھا کر مست رہتے اور دن بھر اونگھتے ہیں۔

جیسے جیسے پالتو جانوروں مچھلیوں اور پرندوں سے محبت بڑھ رہی ہے اسی طرح ان کے [illegible] اور

را پیشہ THERAPIST بھی بڑھ رہے ہیں جو مالکان کو جانوروں کے بارے میں کورسس دیتے رہتے ہیں۔
ریچ کر رہے ہیں آئے دن مضامین اور کتابیں شائع کر رہے ہیں ٹورانٹو کے مشرقی حلقے میں جانوروں کا ایک قبرستان
ل برگ پٹ سیمٹری HAVELBERG PET CEMETRY ہے جہاں ہر سال دو سو جانوروں کی
ی رسومات کے ساتھ تجہیز و تدفین کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ کینیڈا سے لے کر یو ایس اے تک دراز ہے۔ مانٹریال سے
ی الطاپیل دور ایک اور قبرستان ہے۔ یہ کاروبار ۱۹۷۰ء کے ابتدائی مہینوں میں شروع ہوا تھا تب بہت سست
۔ اس قبرستان کے ساتھ ایک فیونرل پارلر FUNERAL PARLOR بھی ہے۔ اسٹار لائٹ پٹ کافن
ٹرڈ STAR LIGHT PET COFFIN REGD میں کفن دفن سے لے کر آخری سروس، قبروں کے
ے اور دیکھ بھال کا بھی انتظام ہے۔ پالتو جانور یا جانور ساتھی و دوست کے آخری سفر کی کہانی بہت دلچسپ ہے جب بھی
ور اس جہاں سے سدھارتا ہے تو مالکان اس پارلر کو فون کرتے ہیں تھوڑی دیر بعد ایک HEARSE یونیفارم
ملبوس ڈرائیور کے ساتھ گھر یا ہسپتال آتی ہے۔ شوفر لاش کو جانور کے ایک ڈبے میں رکھتا ہے اور فیونرل
ر لے جایا جاتا ہے۔ خاندان والے پارلر میں آتے ہیں اب تابوت کا انتخاب ہوتا۔ جو مختلف رنگ کے مخمل یا
سلک سے لپٹے ہوتے ہیں۔ لائننگ سلک کی ہوتی ہے۔ تابوت کا اندرونی حصہ سلک سے پٹا ہوا۔ دیواریں اور
ی گدوں سے لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ مکمل قیمت ۱۹۷۴ء میں چڑیا کے لیے سو ڈالر، کتے کے لیے ایک سو پچاس
ے لے کر تین سو ڈالر سائز کے لحاظ سے اور گھوڑے کے لیے سات سو ڈالر تھی۔ آج یہی قیمت آسمان سے باتیں
تی ہوگی اس کے معاوضے میں HEARSE تابوت، سروس قبر اور قبر کا کتبہ فراہم کیا جاتا ہے۔ کاسکٹ کے انتخاب
بعد خاندان والے پھولوں اور کتبے کا انتخاب کرتے ہیں پھر خاندان کو اس کمرے میں لے جایا جاتا ہے جہاں پارلر
ملازم سروس انجام دیتا ہے کھلے کاسکٹ اور ارکانِ
دان کے سامنے دعا کی جاتی ہے۔ ارکانِ خاندان
آخری دیدار کے بعد کاسکٹ کو بند کر دیا جاتا ہے
ں رونا دھونا اور ضبط غم سب ہی کچھ ہوتا ہے وہیں
اوقات مرنے والے کا پسندیدہ کھلونا جیسے ربر کی
یا پلاسٹک کا کھلونا بلی کے لیے گیند کاسکٹ میں
دی جاتی ہے پھر جلوس قبرستان جاتا ہے جہاں آخری
مات کے ساتھ پیارے دوست کو سپرد خاک کر دیا جاتا
۔ یہ رسومات تقریباً تیس منٹ میں طے پاتی ہیں۔
ت اور احترام کے ساتھ۔ یو ایس اے اور کینیڈا میں HEALTHCARE ماہرین اپنی ماہرانہ رائے دینے کے لیے
قت تیار ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو لوگوں کو رضاکارانہ طور پر کم از کم ہفتے میں ایک بار مریضوں کی دل بہلائی کے
ے پالتو جانوروں کو لانے کی ہمت افزائی اور ترغیب دیتے ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے یہ بھی اب مرض کے علاج کا ایک
حصہ بن گیا ہے۔ امریکہ، یورپ یا مغربی دنیا میں جانوروں کو وصیت میں شامل کرنے۔ جائداد چھوڑ جانے اور پیسہ ان

باکمال!

مخمور جالندھری سے کسی نے ایک پرانے استاد قسم کے شاعر کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "مخمور صاحب! انکی کیا بات ہے۔ ایک دفعہ کہہ رہے تھے یہ آزاد شاعری کیا بکواس ہے کسی آزاد نظم کو میرے سامنے لاؤ میں اسے پابند کر سکتا ہوں"۔ —— مخمور نے فی الفور جواب دیا:
"واہ یہ بھی کوئی قابلِ تعریف بات ہے میرے سامنے کوئی پابند نظم لاؤ میں اُسے آزاد نظم کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہوں۔"

کے نام کر دینے کے واقعات آئے دن سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں۔ پیسے کی فراوانی جانوروں سے پیار محبت نے ذیلی کاروبار کو فروغ دیا ہے جن میں بے بی سٹرز BABY SITTERS ہیر ڈریسنگ سیلون، ریسٹورانٹ وغیرہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بلیوں کے دوست ساؤتھ ایسٹ ایشیاء میں سفر کر رہے ہوں تو ملیشیا کی ریاست سراواک کی راجدھانی کوشنگ میں بلیوں کا میوزیم ضرور دیکھیں۔ یہاں آپ کو بلیوں کی پانچ ہزار سالہ تاریخ دیکھنے کو ملے گی مثلاً کیا آپ جانتے ہیں کہ قدیم مصر میں خاندانی بلی کی موت پر افراد خاندان اپنی بھنویں منڈوا دیتے تھے اور اس وقت تک سوگ منایا جاتا جب تک کہ بھنویں پھر سے نہ بڑھ جائیں۔ ہم نے یہ سنا ہے کہ قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ قرون وسطی کے یورپ میں بلی کو وچ کرافٹ WITCHCRAFT کے ساتھ وابستہ کیا جاتا تھا اور سترھویں صدی تک وہ پالتو جانوروں میں شامل نہیں تھی پتہ نہیں اس وقت کے چوہوں کا ذہنی مقام کیا تھا۔ بلی سلک کے کیڑوں کو چوہوں اور گھونس سے محفوظ رکھتی ہے اس لیے چین میں بلی کو باعزت مقام حاصل ہے اگر کسی نے بلی کو اپنا منہ صاف کرتے دیکھ لیا تو معلوم ہوا کہ کوئی ممتاز اجنبی ضرور آنے والا ہے پالتو جانوروں سے دوستی کا شوق چڑیا مچھلی بلی کتوں وغیرہ سے بڑھ کر EXOTIC ANIMAL تک آگیا ہے جس میں شیر، باب کیٹ BOBCAT سانپ بندر وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ دروازوں کے آگے ہاتھی جھولتے نظر نہیں آتے کاش لوگ یہ جانتے ہوتے کہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے اور اگر سفید ہوا تو پتہ نہیں اس کی قیمت کیا ہوگی۔ سانپ کی بل میں انگلی ڈالنے کو کوئی نہ کوئی ضرور تیار ہے شیر کے منہ میں سر ڈالنے کا تماشہ صرف سرکس میں دیکھا ہے مگر ادکلی میں سر بہت سوں نے ڈال رکھا ہے۔

ظفر کمالی (سیوان)

بھارت درشن

(۱)

یاروں نے جاپان کو دیکھا
پیرس انگلستان کو دیکھا
تجھ نے چین ایران کو دیکھا
ہم نے ہندستان کو دیکھا

(۲)

لمبی ہے یہ رام کہانی
سنیے ہوکر پانی پانی
لاکھ یہاں ہو کوئی گیانی
آخر مرجاتی ہے نانی

(۳)

تیرہ دن کے راج کو دیکھا
سر سے چھنتے تاج کو دیکھا
کوڑھ میں بڑھتے کھاج کو دیکھا
دھوکر پیتے لاج کو دیکھا

(۴)

راجا کی من مانی دیکھی
پرجا کی حیرانی دیکھی
دانا کی نادانی دیکھی
راون کی سلطانی دیکھی

(۵)

جیون یعنی جیل کو دیکھا
بن انجن کی ریل کو دیکھا
ایم۔ وائی کے میل کو دیکھا
بازی گر کے کھیل کو دیکھا

(۶)

رنگیلا دیکھا رنگیلی دیکھی
چھبیلا دیکھا چھبیلی دیکھی
نیتاؤں کی شیلی دیکھی
نیت لیکن میلی دیکھی

(۷)

ذات پات کی لعنت دیکھی
آئے دن کی آفت دیکھی
پبلک کی بھی شامت دیکھی
بنتے خوب حجامت دیکھی

(۸)

ٹاڈا کا قانون بھی دیکھا
ذہنوں کا طاعون بھی دیکھا
دو نمبر کا خون بھی دیکھا
کرتا اور پتلون بھی دیکھا

(۹)

غنڈے، غنڈہ گردی دیکھی
مردوں کی نامردی دیکھی
چہرہ چہرہ زردی دیکھی
گرمی میں بھی سردی دیکھی

(۱۰)

ہر جانب بے کاری دیکھی
جینے سے بے زاری دیکھی
مجبوری لاچاری دیکھی
پالیسی سرکاری دیکھی

(۱۱)
رنگے برنگے جھنڈے دیکھے
لاٹھی دیکھی ڈنڈے دیکھے
چلتے گندے انڈے دیکھے
پولیس کے ہتھکنڈے دیکھے

(۱۲)
پڑتے جاں کے لالے دیکھے
بہتے خونی نالے دیکھے
برچھی دیکھی بھالے دیکھے
آفت کے پرکالے دیکھے

(۱۳)
زور آور کے زور کو دیکھا
چور پکڑتے چور کو دیکھا
پٹتے ہر کمزور کو دیکھا
پتھراتے شہ زور کو دیکھا

(۱۴)
اک ایسا بھی منظر دیکھا
مسجد بنتے مندر دیکھا
باہر دیکھا اندر دیکھا
ہر پہلو میں خنجر دیکھا

(۱۵)
قریہ دیکھا بستی دیکھی
خر دیکھا خر مستی دیکھی!
مہنگائی کی مستی دیکھی
اونچے گھر کی پستی دیکھی

(۱۶)
چمچوں کے اقبال کو دیکھا
گلتے ان کی دال کو دیکھا
پھیلے ہر سو جال کو دیکھا
ہوتے استحصال کو دیکھا

(۱۷)
نقادوں کی گرمی دیکھی
تیور اور ہٹ دھرمی دیکھی
سختی دیکھی نرمی دیکھی
شرما کر بے شرمی دیکھی

(۱۸)
گھونٹ زہر کا پینا دیکھا
بینوں میں نابینا دیکھا
محنت اور پسینا دیکھا
مزدوروں کا جینا دیکھا

(۱۹)
بن تنخواہ کے ٹیچر دیکھے
بنتا بی بی کے شوہر دیکھے
مالک بنتے نوکر دیکھے
بھالو دیکھے بندر دیکھے

(۲۰)
فیشن کے دیوانے دیکھے
اپنوں سے بیگانے دیکھے
آبادی ویرانے دیکھے
مسجد اور میخانے دیکھے

(۲۱)
شادی میں ناشادی دیکھی
پیسے کی بربادی دیکھی
گھر گھر کی آبادی دیکھی
دو دن کی داماد دی دیکھی

(۲۲)
صورت گوری کالی دیکھی
عزت کی پامالی دیکھی
اسنو، پوڈر، لالی دیکھی
پت جھڑ میں ہریالی دیکھی

(۲۳)
جو شے دیکھی کھوٹی دیکھی
جھمکا دیکھا چوٹی دیکھی
بریانی اور بوٹی دیکھی
روکھی سوکھی روٹی دیکھی

(۲۴)
اسٹیشن کی چائے دیکھی
کیا ہوتی ہے ہائے دیکھی
ہوتی جم کر آئے[1] دیکھی
پانی دیتی گائے دیکھی

(۲۵)
اپنی قوم کو سوتے دیکھا
حق میں کانٹے بوتے دیکھا
حال یہ اُن کا ہوتے دیکھا
پھوٹی قسمت روتے دیکھا

(۲۶)
جس کو دیکھا قابل دیکھا
اپنے فن میں کامل دیکھا
عالم دیکھا جاہل دیکھا
ایک ہی صف میں شامل دیکھا

(۲۷)
جیسا دیکھا جیسا پایا
ہم نے ویسا ہی بتلایا!
سن اک صاحب نے فرمایا
اب کیا بیلیں گی یہ کایا

---
[1] آئے۔ آمدنی

قاضی مُشتاق احمد
پونہ (۴۱۱۰۰۷)

جب دِل ہی ٹوٹ گیا

(ستیش ایک سیدھا سادا نوجوان اسٹیج پر نہایت بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا ہے)

ستیش: (اپنے آپ سے) اب اس طرح زندہ رہنے کا کوئی مطلب نہیں۔ یہ دنیا ہمیشہ پیار کرنے والوں کی دشمن رہی ہے۔ اس لیے میں نے اور سریتا نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ زہر کی بوتل بھی تیار ہے۔ SUICIDE NOTE بھی تیار ہے (بوتل اُٹھا کر دیکھتا ہے اور میز پر رکھی ہوئی چٹھی پڑھتا ہے۔)

"میں ستیش نارائن دوبے اور سریتا کلکرنی بہ ہوش و حواس یہ چٹھی لکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ ہمارے گھر والے ہماری شادی کے خلاف ہیں اس لیے ہم دونوں نے ایک ساتھ مرجانے کا فیصلہ کرلیا ہے — ہماری موت کا کوئی ذمہ دار نہیں۔ نفرت کرنے والی اس دُنیا کو ہمارا آخری سلام۔"

(چٹھی میز پر رکھ دیتا ہے) میں تو دستخط کرچکا ہوں۔ سریتا آجائے گی تو وہ بھی دستخط کردے گی پھر ہم دونوں زہر پی کر خودکشی کریں گے۔ یہی ہمارے غموں کا علاج ہے۔ (دروازہ پر دستک)۔

ستیش: کون ہے؟ لوگ چین سے مرنے بھی نہیں دیتے (دروازہ کھولتا ہے) کون؟ گنڈو سوامی ....؟ (ایک مدراسی آدمی اندر آتا ہے)۔

گنڈو سوامی: سینٹ پرسینٹ گنڈو سوامی.....

ستیش: ساری سوامی! آج کوئی پروگرام نہیں... آج میں بہت سیریس موڈ میں ہوں۔

سوامی: سیریس موڈ کو اچھا موڈ بنانے کے واسطے تو ہم آیا۔ چلو.... دارو کا بوتل نکالو پھر دیکھو سیریس موڈ کیسا جالی موڈ بنتا۔

ستیش: کوئی بوتل وتل نہیں۔

سوامی: بوتل نئی.... (ٹیبل کی طرف اشارہ کرکے) وہ کیا جی؟ بوتل نہیں تو کیا؟

ستیش: وہ شراب کی نہیں زہر کی بوتل ہے۔ POISON.

سوامی: ہم کو ڈرتا جی! گنڈو سوامی کو سب سمجھا جی۔ ہم کو معلوم۔ اس بوتل کے اندر دارو۔

ستیش: نہیں گنڈو سوامی اس میں زہر ہے۔

سوامی: زہر؟ کائے کے واسطے؟

ستیش: اس لیے کہ میں خودکشی کرنے والا ہوں۔

سوامی: کیا کرنے والا؟

ستیش: خودکشی۔ آتم ہتیا۔ SUICIDE

سوامی: تم کرنے والا؟

ستیش : ہاں . . . . میں .
سوامی : کب کرنے والا ؟
ستیش : ابھی اسی وقت .
سوامی : یہ کیا آتم ہتیا کرنے کا ٹائیم ؟ ارے بابا!
آتم ہتیا کرنے کا بیٹر (BETTER) ٹائم
رات کا . . . ابھی تو شام ہوئی ہے . پن اپن ایک بولتا
ستیش ! ارے یہ دارو پینا بھی تو آتم ہتیا ہی ہے -
فرق صرف اتنا ہے کہ آدمی ایکدم نہیں مرتا انسٹالمنٹ
میں مرتا ہے . . اس لیے اپنا سُنو . . . دارو پی پی کر مرو .
ستیش : لیکن مجھے فوراً مرنا ہے .
سوامی : تو فوراً بوتل کھولو اور پینا شروع کردو .
ستیش : مجھے سرتیا کا انتظار ہے .
سوامی : ارے بابا! انتظار ہے نا ؟ تو بوتل کھولو
اور انتظار کرو .
ستیش : یہاں میری جان پر بنی ہے اور تم نے کیا بوتل
بوتل لگا رکھی ہے .
سوامی : اپنے کو تیری یہ بات پٹتی نہیں بابا! اپن کائے
کو آتم ہتیا کرنے کا ؟ اپن تو دوسروں کو آتم ہتیا
کرنے پر مجبور کرنے کا .
ستیش : وہ کیسے ؟
سوامی : دوست ، سے اُدھار لینے کا اور واپس نہیں
کرنے کا . باس کی بیوی کو فون کرنے کا کہ صاحب کا
اسٹینو کے ساتھ لفڑا ہے . . . . بار بار جھوٹ بولنے
کا تو ایک بار تو سچ لگے گا .
ستیش : لیکن اس سے کیا فائدہ ؟
سوامی : فائدہ سے لوٹنے کا سوچا نئی . بس ذرا
سی مزہ .
ستیش : تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی .
سوامی : پہلے آتے تھی اب نہیں آتی . وہ بولتے نا .

EVERY THING FAIR IN LOVE WAR
AND POLITICS تو اپن کا ایسا چ ہی ہے
اور شرم تو اپن کب کا بیچ کھایا . مالوم ہے ایک بار
ہماری پتنی ہم کو کتا بولا . مالوم کیا ہوا . ؟
ستیش : - تم نے بیوی کو ڈانٹا ہوگا .
سوامی : - بیوی کو ڈانٹے گا تو کیا وہ اپنا سُن لے گا ؟
ستیش : - پھر کیا کیا تم نے ؟
سوامی : - بیوی ہم کو کتا بولا ہم بولا بھوں بھوں .
ستیش : - یعنی تم نے اپنے آپ کو کتا مان لیا .
سوامی : - مان لینے سے کیا کوئی کتا بنتا ؟ ارے اپن
بیوی کو رسپانس (RESPONSE) دیا . وہ سامنے
دیکھی کہ اپنا "بھوں . . . بھوں" شروع .
ستیش : - پھر کیا ہوا ؟ آگے بکو .
سوامی : - پھر کیا ہوگا . بیوی نے معافی مانگا بولائی
کتیا میرا باپ کتا . تب اپن بھونکنا بند کیا . ایک بار
باس اپنے کو گدھا بولا ـــــ مالوم اپن کیا کیا ؟
ستیش : - گدھے کی طرح ڈھیچوں . . . . ڈھیچوں .
کیا ہوگا .
سوامی : - نو ـــ باس کے سامنے گدھے کا نہیں بلکہ
کا آواز نکالنے کا . مائیوں . . . مائیوں .
ستیش : - تم اس وقت جاؤ سوامی . . . . صبح میری
انت یاترا میں آجانا .
سوامی : - وہ تو آئے گا جی . . . پن اپن بولا . تیرے
کو کرنا ہے تو کر آتم ہتیا . اپن جب تک شراب
پی کر صبح کا انتظار کرے گا . نو بجے تیرا انت یاترا
11 بجے اپن کا آفس .
ستیش : - تو تجھے میرے مرنے کا ذرا بھی غم نہیں
سوامی : - نائی ـــ اپا مرنے سے پہلے غم کیا کر
جی . ابھی تم مر کر دکھاؤ اپن تیرے کو رو کر دکھائے .

ش ! ارے کاٹے کو مر گیا۔ اب اپن کو پھکٹ
ون پلائے گا؟
تی ہے) فون آیا ہے۔
۔ یہ کس کا آکاش وانی ؟
۔ پڑوسی کا۔ شاید سریتا کا فون ہے۔ بَیں ابھی
آیا۔
باہر چلا جاتا ہے۔ سوامی کمرے میں چکر کاٹتا ہوا
پاس آتا ہے)۔ سوامی (میز پر پڑی بوتل اٹھاتا
POISON .... یہ سالا ستیش اپنے کو چکر
کے واسطے جھوٹا لیبل لگایا۔ کاٹے کا POISON
تو سالا وسکی ہوگا۔ ستیش کے آنے سے پہلے
دینا ہوگا۔ تبی تو سالا پینے نہیں دیگا۔
ی بوتل اٹھا کر غٹ غٹ پی جاتا ہے اور چکرا کر
تا ہے)۔
آتا ہے ـــــ سوامی کو زمین پر لیٹا ہوا دیکھتا ہے)
ہر کی بوتل اس کے ہاتھ میں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے)
: ارے سوامی کے بچے ! یہ تو نے کیا کیا ؟
پوری بوتل خالی کردی۔ اب مَیں اور سریتا کیا
گے ؟ دوبارہ کیمسٹ کے پاس جاؤں گا تو وہ
ل ہے شک کرے گا۔ پہلے ہی زہر دینے کو ہچکچا
ا۔ (اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے)۔
ں سوامی کی لاش کو کہاں چھپاؤں ؟
ازے پر دستک ہوتی ہے۔ ستیش گھبرا کر سوامی
ر ڈھانپ دیتا ہے)۔
:۔ کون ہے بھائی ؟
:۔ مَیں ... ہری۔
:۔ اب یہ دوسرا شرابی آگیا۔ اس کو کیسے ٹھکانے
(ہری شراب کے نشہ میں اندر آتا ہے)۔
ـــ کیا .... پارٹی ختم ہوگئی ؟ گندو سوامی
بولا آج اس کا تیرے ساتھ بھر دارو پینے کا پروگرام ہے۔
ستیش :۔ وہ کیا ہے گندو سوامی کے پڑوس میں میت
ہوگئی وہ وہاں گیا ہے۔ تجھے بھی بلایا ہے۔
ہری :۔ میت میں ؟۔ : ۔ اور اپن کیوں جائے گا !
گندو سوامی کا پڑوسی کیا اپنا چچا ہے ؟ (اِدھر اُدھر
دیکھ کر) ارے یہ ادھر کون ہے ؟ (گندو سوامی کی
لاش کی طرف اشارہ کرتا ہے)۔
ستیش :۔ یہ تیری پرچھائی ہے۔
ہری :۔ لیکن یہ پرچھائی ایسی آڑی کیوں ؟ اپن تو کھڑا ہے۔
ستیش :۔ اسی لیے تیری پرچھائی یوں پڑری ہے۔
ہری :۔ لیکن ایسا کیوں ہورہا ہے؟
ستیش :۔ اس لیے کہ تو نے شراب پی ہے اس لیے
تجھے ہر چیز اُلٹی نظر آرہی ہے۔
ہری :۔ لیکن تُو تو مجھے سیدھا نظر آرہا ہے۔
ستیش :۔ ابے اُلو کے پٹھے ! مَیں سر کے بل کھڑا ہوں۔
ہری :۔ کیوں ؟
ستیش :۔ مَیں شرساسن کر رہا ہوں۔
ہری :۔ اور مَیں کیا کر رہا ہوں۔
ستیش :۔ تُو بکواس کر رہا ہے۔ جا جلدی تجھے گندو سوامی
نے بلایا ہے۔
ہری :۔ پڑوسی کی میت میں۔
ستیش :۔ نہیں۔ پڑوسی کے مرنے کی خوشی میں وہ
پارٹی دے رہا ہے۔ یہ وہی پڑوسی ہے جو صبح صبح گانے
کا ریاض کرتا تھا۔
ہری :۔ اچھا ہوا سالا مر گیا۔
ستیش :۔ جلدی جا ورنہ شراب ختم ہوجائے گی
ہری :۔ مَیں جاؤں گا کیسے ؟ مجھے تو ہر چیز اُلٹی نظر
آرہی ہے۔
ستیش :۔ تو ایسا کر الٹا چل کر جا سب سیدھا نظر آئیگا۔

ہری :۔ (اُلٹا چلتا ہے) لیکن تُو تو اب بھی سیدھا نظر آرہا ہے۔

ستیش :۔ اس لیے کہ میرا شرساسن ابھی ختم نہیں ہوا۔ تُو جا نا باپ (ہری اُلٹا چلتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)۔

(دروازہ پر دستک)

ستیش :۔ کون ؟

آواز :۔ میں . . . سریتا۔

(ستیش دوڑکر دروازہ کھولتا ہے۔ سریتا اندر آجاتی ہے)۔

سریتا :۔ (گنڈو سوامی کی لاش کی طرف اشارہ کرکے) یہ کون سو رہا ہے ؟

ستیش :۔ میرے باپ۔

سریتا :۔ تم تو کہتے تھے تمہارے باپ نہیں ہیں۔

ستیش :۔ ہاں بھئی ! یہ میرے بڑے باپ ہیں۔

سریتا :۔ یہ ایسے زمین پر کیوں سوئے ہیں۔

ستیش :۔ اُن کی مرضی ان کے بیٹے کا گھر ہے۔

سریتا :۔ اوکے . . . او . . کے ستیش ! میں تمہیں ایک خاص بات بتانے آئی ہوں۔

ستیش :۔ ہاں ہاں بولو ۔۔۔

سریتا :۔ میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ ۔۔۔ میرا مطلب ہے پلان POST PONE کر دیا ہے۔

ستیش :۔ لیکن کیوں ؟

سریتا :۔ تم کو نہیں معلوم ؟ مائیکل جائیکسن دوبارہ انڈیا آرہا ہے۔ میں اس کا شو دیکھے بغیر مر نہیں سکتی۔

ستیش :۔ اور تمہارے وہ تیس دو عاشق ؟

سریتا :۔ انھیں بھول جاؤ یار ! کیا تم مائیکل جائیکسن کے آنے تک اپنا خودکشی کرنے کا پلان POST PONE نہیں کر سکتے۔

ستیش :۔ لو۔

سریتا :۔ تو ایسا کرو تم اپنے پلان کے مطابق خود کر لو۔ میں بعد میں کر لوں گی ۔۔۔ او . . کے !

(گنڈو سوامی دھیرے دھیرے اُٹھ رہا ہے)

سریتا :۔ وہ تمہارا باپ ۔۔۔ آئی مین بڑا باپ ۔اُٹھ رہا ہے ۔۔۔ میں جاتی ہوں . . . بائی . . . مرنے سے پہلے فون ضرور کرنا۔ (باہر چلی جاتی ہے)

(ستیش گنڈو سوامی کو "بھوت . . . " کہہ کر چلاتا ہے اور بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے)۔

گنڈو سوامی (اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) سالا کونسا لوگ کا مال لایا تھا ؟ نشہ نہیں آیا نیلا آگیا۔ یہ کیا آج کل POISON کا TEMPORARY مرنے کا ملتا ہے

(اٹھ کر میز کے پاس آتا ہے اور میز پر رکھی ہوئی SUISIDE NOTE دیکھتا ہے)۔

گنڈو سوامی :۔ اس کا مطلب ہے ستیش نے آتم ہتیا . . . پن وہ سریتا کا لاش کدھر ہے ؟

(سریتا اندر آتی ہے)

سریتا :۔ ایکسیوزمی . . . میری کار کی چابی اندر رہ گئی لینے آئی ہوں۔

سوامی :۔ تم سریتا ؟

سریتا :۔ ہاں میں سریتا۔

سوامی :۔ تم آتم ہتیا نہیں کیا ؟

سریتا :۔ نہیں POST PONE کر دیا ہے

سوامی :۔ لیکن ستیش نے تو آتم ہتیا کر لیا۔

سریتا :۔ REALLY ؟ ۔ او ستیش ! تم ۔ آج کے دن ہی آتم ہتیا کیوں کی ؟

سوامی :۔ کیوں کیا آج کا دن آتم ہتیا کرنے کا شبھ نہیں ہے۔

سریتا :۔ ایسی بات نہیں ہے۔

سوامی :- پھر کیا بات ہے ؟

ریتا :- میرا سفید ڈریس لانڈری میں ہے ۔ میں اب ستیش کے FUNEREL میں کون سا ڈریس پہنوں گی ؟

سوامی :- کالا ڈریس چلے گا۔

ریتا :- REALLY کالا ڈریس تو ہے میرے پاس ۔ ابھی FUNEREL کو کتنا ٹائم ہے ؟

سوامی :- دو۔ تین گھنٹے تو لگ جائے گا ۔

ریتا :- میرا چھ کا شو تو گیا۔ (گے)

سوامی :- ۹ کا دیکھ لینا۔ تم بولے گا تو ہم ساتھ آ

ریتا :- نو بابا ـــ مجھے تو آج فلم دیکھنے کا پروگرام POST PONE کرنا پڑے گا۔

سوامی :- جیسا تم آتم ہتیا کا پروگرام POST PONE کیا ۔

ریتا :- EXACTLY

سوامی :- کیا تم ستیش سے پیار کرتی تھی ؟

ریتا :- ہاں ۔

سوامی :- اگر وہ زندہ ہوتا تو تم اس کے شادی کرتی ؟

ریتا :- ایک پرابلم ہے ۔ کنیا دان کون کرے گا ؟ میرے باپ تو اس شادی کے خلاف ہیں ۔

سوامی :- کنیا دان کا کیا ؟ ہم کردے گا ۔

(ستیش اٹھ کر کھڑا ہوجاتا ہے)

ریتا :- ارے تم تو مر گئے تھے۔

ستیش :- مرا نہیں بے ہوش ہوگیا تھا۔ لیکن گنڈو سوامی POISION پی کر کیسے زندہ رہ گیا۔

سوامی :- کیسا POISION ارے یہ تو وسکی کا تھا اس میں نیند کا دوا ۔

ستیش :- دیکھتا ہوں سالے کیمسٹ کو دوستی کر کے پیٹتا ہے۔

سوامی :- سریتا بے بی ! تم ایک کام کرو ستیش سے شادی کرلو ۔

سریتا :- ایک پرابلم ہے ۔ لگن لگانے کو پنڈت کہاں سے لائیں گے ۔

سوامی :- ارے یہ گنڈو سوامی کس دن کام آئے گا لگن لگانا تو اپنا خاندانی پیشہ ہے۔۔۔

(گنڈو سوامی منتر پڑھتا ہے)

پردہ دھیرے دھیرے نیچے آتا ہے۔ ■■

ٹی۔ین۔راز
(ہریانہ)

چھیڑ غالب سے ...

کیوں بھلا اسے مولوی مسجد میں لایا تو مجھے
لے ہی آیا ہے تو پھر سکھلا دے اب "یا ہو" مجھے

بن پیئے ہی میں چلا جاؤں گا ساقی بزم سے
ڈاٹ پر تھوڑی لگا کر جو سُنگھا دے تو مجھے

بچے میرے سب پلے ہیں بس اسی کی خیر سے
کس طرح چھوڑے گی رشوت کی بھلا اب خُو۔ مجھے

میرے پیارے دیش کو یہ لگ گئی کس کی نظر
کیوں نظر آتا ہے بھڈّ بیٹھتا ہر سُو مجھے

آج تک مجھ کو کسی نے بھی سیانا کب کہا
کیا پڑے گا فرق تم بھی جو کہو بُدّھو مجھے

عصمتوں پر داڑھیوں کے کالے سائے بڑھ گئے
شہر میں آیا نظر جب بھی کوئی سادھو مجھے

شرٹ پر میری چتر کاری بھی ان کا آرٹ ہے
پیک مُنہ میں تھی ابھی اور کہہ دیا تھا "تھو" مجھے

کیا تڑا تڑ سی ہوئی وہ اک ذرا سی چھیڑ پر
صرف چنّل ہی نہیں اُس نے لگائے مُکّو مجھے

بے تکا سا شور کو دم پھاند اٹھنا بیٹھنا
دیش کی سنسد نظر آنے لگی ہے "زُو" مجھے

بے حسوں کے شہر میں کس کو سناؤں داستاں
جتنے لیڈر ہیں نظر آتے ہیں سب اُلّو مجھے

ہنستا رہتا ہوں بنام اکبر و رنگین راز
ہر لمحہ ہی شاد رکھتی ہے بہت اُردو مجھے

○

قطعات

رفیع احمد (مالیگاؤں)

○

کروں فریاد کس تھانے میں جا کر
ستم ڈھاتا ہے کیا کیا وہ ستمگر
کروں جب فون پر میں دل کی باتیں
وہ کہہ دیتا ہے فوراً "رانگ نمبر"

○

سنہری شام ہو یا صبح روشن
تمہاری یاد کب آتی نہیں ہے
ٹہلتی ہے ~~وہ~~ ہر لمحہ یہیں کیوں؟
مرا دل کوئی "چوپاٹی" نہیں ہے

○

دَور ایسا بھی ایک گذرا ہے
دیکھتے تھے سینما ہم اکثر
لائے ٹی۔وی تو اب یہ حالت ہے
لے گئی بیوی ہم سے بھی نمبر

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس
(حیدرآباد)

ہوم ورک

ہوم ورک کے عنوان سے آپ کا ذہن گھر کے مختلف قابلِ اظہار اور ناقابلِ اظہار کاموں کی طرف جا سکتا ہے اس لیے ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ یہاں ہوم ورک سے مراد صرف بچوں کا ہوم ورک ہے۔ ہوم ورک اور وہ بھی بچوں کا یعنی کریلا اور وہ نیم چڑھا والی بات ہے۔ ہم جیسے کاہل الوجود انسان کے لیے جسے اپنے کام نمٹانا ہی کوہ گراں ہو، بچوں کو ان کا ہوم ورک کروانا ایسے ہی ہے جیسے کسی خسیس دولت مند کے لیے زکوٰۃ دینے کے علاوہ صدقات بھی نکالنا۔ بچوں کے ہوم ورک سے فرار کے پیچھے ہماری جہالت کارفرما نہیں ہے۔ خدا کے فضل سے اپنے مضمون میں ماسٹرس ڈگری رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود بلدیہ کے کلرک ہیں لیکن اس میں ہماری ڈگری کا کوئی قصور نہیں۔ ہمارے ملک کی خاص خاص نشانیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ یہاں یا تو قابلیت کے مطابق ملازمت نہیں ملتی یا ملازمت کے مطابق قابلیت نہیں ملتی۔ کہیں ہما کے آشیانہ پر کوا قابض ہے تو کہیں کوے کے آشیانے میں ہما گزارا کر رہا ہے۔ ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکے کہ یہ تقدیر کا کھیل ہے یا اقربا پروری کا کرشمہ۔ اب یہی دیکھیے ہمارے دوست مرزا دلاور علی ایم۔ اے۔ ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی ہیں اور اس پر مستزاد نصف درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور انٹرویو میں بھی سرِ فہرست رہتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آج تک کسی کالج میں ان کا تقرر نہیں ہو سکا کیوں کہ ہر مرتبہ کہیں کالج کے پرنسپل کا ہونے والا داماد اور کہیں کالج کے سکریٹری کا بہنوئی اور کہیں انتظامیہ کے کسی رکن کی سابقہ محبوبہ کی بھانجی یا بھانجہ ان کا حق اڑا لیتا ہے اور یہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ولی صرف تین ہیں۔ دھن۔ دھونس اور دھاندلی جن کی ولایت اور کرامات حکومت اور زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے دوست مرزا دلاور علی کو ان میں سے کسی ولی کی نسبت حاصل نہیں ہے اس لیے ہر جگہ ان کی کوشش بے نیل ثابت ہو رہی ہے۔ ایک دن ہم نے ان سے کہا کہ یار تمہاری ملازمت لگنا ہے کسی کالج کی قسمت میں نہیں ہے۔ صورت سے ماہرِ عملیات و نجوم معلوم ہوتے ہو یہی پیشہ اختیار کرلو دارے نیارے ہوجائیں گے۔ بولے ارمان کرو۔ لے، اپنے نیک مشورے اپنے پاس ہی رہنے دیں۔ لوگوں کو بیوقوف ہی بنانا ہو تو لیڈر بننے میں کیا قباحت ہے کم سے کم شیطانی چکروں میں تو جانا نہ پڑے گا۔ ہم نے کہا بھائی جہاں لیڈر ہو وہاں شیطان کی کیا ضرورت ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک انسان کو دن بھر دفتر میں قلم چلانے کے بعد شام کے اوقات میں دوست احباب کے ساتھ تفریح کرنے کا شریفانہ حق حاصل ہے۔ ہم بھی آخر انسان ہیں اور اپنے آپ کو شریف بھی گردانتے ہیں اس لیے شام کے تفریحی اوقات سے استفادہ کرنے کے لیے خود کو ہر طرح سے اہل اور مستحق سمجھتے ہیں لیکن بچوں کا ہوم ورک ہمارے اس حق کو اس طرح تباہ کرتا ہے جیسے لکڑی کو گھن یا رومانس کو غربت۔ گھر سے دفتر کے لیے نکلتے وقت ہم اقسام کے تفریحی منصوبے ذہن میں ہوتے ہیں جن کی خیالی لذت سے طبیعت مگن رہتی ہے لیکن بچوں کا ہوم ورک ایسا ٹکرا آتا ہے کہ سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ مثلاً آج ہی کی بات ہے سوچا تھا کہ دفتر سے نکل سیدھے اپنے دوست مرزا دلاور علی کے گھر جائیں گے اور انھیں ساتھ لے کر کسی نئی فلم کا پروگرام بنائیں گے۔ اس قسم کے خوش آئند خیالات کے ساتھ ہم گھر سے نکلنا چاہتے تھے کہ بیگم کی آواز آئی "سنیئے۔ آج دفتر سے سیدھے گھر آجائیے بچوں کو ہوم ورک کروانا ہے"۔ ہوم ورک کے نام سے ہماری جان نکل گئی۔ جھنجھلائے لہجے میں کہا "تم خود کیوں نہیں کرواتیں۔ میں تو پہلے ہی دفتر کے کام سے کافی تھک جاتا ہوں" بیگم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "کیسا کام اور کاہے کی تھکن! میں خوب جانتی ہوں کہ دفتر میں کلرک لوگ کتنا کام کرتے ہیں۔ کسی فائل پر چار حروف گھسیٹے اور بھاگ نکلے چائے پینے۔ دفتر کی کینٹین پارلیمنٹ ہال سے کم نہیں ہوتی۔ اِدھر اہلِ ضرورت منتظر کھڑے ہے اور اُدھر دفتر کا عملہ خوش گپیوں اور قومی و بین الاقوامی مسائل پر بحث میں محو ہے۔" بیگم کی تقریر شاید اور جاری رہتی لیکن ہم نے ہار مانتے ہوئے کہا "اچھا اے نیک بخت۔ اب چپ بھی کرو بندہ گھاٹ سے سیدھے گھر ہی آئے گا"۔

بچوں کے ہوم ورک کے بارے میں ہمارے ان ناموافقانہ بلکہ معاندانہ جذبات کی بہت ساری وجوہات کے من جملہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بچے جیسا کہ آپ جانتے ہیں اپنے ٹیچروں سے اندھی عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ سب کچھ مان سکتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ ان کے ٹیچر سے غلطی ہو سکتی ہے۔ بارہا کا تجربہ ہے کہ ہم نے ان کے کسی ٹیچر کی غلطی کی نشاندہی کی اور صاحبزادے نے فوری تردید کی کہ "ڈیڈی آپ غلط کہہ رہے ہمارے ٹیچر نے جو بتایا ہے وہی صحیح ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ بچے اپنے ٹیچر کے والہ و شیدا ہوتے ہیں۔ وہ ان کی توجہ حاصل کرنا اور ان کی نظروں میں نمایاں ہونا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ کسی گاؤں میں ایک مولوی صاحب کہیں جارہے تھے۔ اتفاق سے ان کے ایک ننھے شاگرد سامنے سے آرہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی برقعہ پوش امی جان بھی تھیں۔ بچے نے جوں ہی انھیں دیکھا اپنی ماں سے کہنے لگا "ماں۔ ماں مولوی صاحب جارہے ہیں"۔ بے چاری پردہ نشین خاتون نے بچے کی بات سنی ان سنی کردی۔ یہ دیکھ کر بچے نے ماں سے اُنگلی چھڑائی اور مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا "مولوی صاحب۔ مولوی صاحب وہ میری ماں جارہی ہے"۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ بچوں کے ہوم ورک کے بارے میں آپ ہمارے فرمودات سے صد فیصد اتفاق کریں جمہوریت کا دور ہے۔ آدمی کو چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو اختلاف رائے کا حق ضرور حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے دوست مرزا دلاور کو ہمارے خیالات سے سخت اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ انھیں بچوں کا ہوم ورک کروانے میں وہی لطف آتا ہے جو لین دین کا کاروبار کرنے والے مہاجنوں کو اپنے کھاتے درست کرنے میں آتا ہے۔ وہ شاید میٹرک میں تھے کہ محلے کے بچوں کو شوقیہ ٹیوشن پڑھانے لگے۔ اسی دوران انھوں نے شادی بھی کرلی حالانکہ ابھی ان کی عمر شادی کے لیے مقررہ سرکاری عمر سے کافی کم تھی۔ ہم نے اس جلد بازی کی وجہ پوچھی تو بولے کہ "محلے کے بچوں کو کب تک ہوم ورک کرواتا۔ اپنے بچوں کو ہوم ورک کروانے کا لطف ہی کچھ اور ہے" یہ مصرعہ غالب کے قافیے انداز میں گنگنا

وجہ نشاط ، غفلت ہے کس رد سیاہ کو ؛ بچوں کا ہوم ورک شب و روز چاہیئے

اگلے وقتوں میں کہا جاتا تھا "یک من علم را دہ من عقل باید" لیکن جنسِ عقل کی گرانی کے سبب آج کل اس
میں تھوڑی سی تبدیلی ہوگئی ہے۔ اب "یک من علم را دہ من کتب باید" کا دور ہے۔ صاحبزادے K.G میں ہیں
لت یہ ہے کہ اپنے وزن سے بھی زیادہ کتابیں اور نوٹ بکس بستے میں بھری ہیں یعنی بقول غالب ؎

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ بنے

والوں کا ایک خاص دوکان سے شریفانہ معاہدہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کے نسخوں پر کسی میڈیکل شاپ کا نام آپنے دیکھا
س میں رمز یہ ہوتا ہے کہ تجویز کردہ دوائیں اسی میڈیکل شاپ سے خریدی جائیں۔ لوگ تو اس سلسلے میں اور بھی بہت
ہتے ہیں لیکن ہمارا دل نہیں مانتا کیوں کہ ہم ڈاکٹری کو ایک معزز پیشہ سمجھتے ہیں۔ ذکرِ مکتب کا تھا درمیان میں مطلب
عرض کر رہا تھا کہ اسکول والے بچوں پر ڈھیر ساری کتابوں کا بوجھ لاد دیتے ہیں اور اس پر مرضی مرے صیاد کی یہ کہ یہ
ہیں۔ بیاضیں، پنسل، ربر غرض ساری چیزیں ایک مخصوص دوکان سے خریدی جائیں آپ دوسری دوکان پر جا بھی
سکتے کیوں کہ اس اسکول کی کتابوں کا سیٹ کہیں اور نہیں ملتا۔ اس سارے کاروبار میں دوکاندار اور اسکول والوں کی
دتی ہے لیکن والدین کی چندیا صاف ہو جاتی ہے۔ یہ خانگی مدارس کا معاملہ ہے۔ رہے سرکاری مدارس تو ان کا حال
رائے "ایصالِ ثواب" کی طرح ہے کہ ان کی کارکردگی اور اچھے بُرے کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ان کی اس سقیم حالت
بنظر خانگی مدارس تجارتی اداروں کی طرح جا بجا کھل گئے ہیں۔ فی زمانہ تعلیم ایک منفعت بخش کاروبار اور مدرسوں
م کمرشیل انڈسٹری کی طرح ہو گیا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا VIRTUE IS KNOWLEDGE یعنی علم خیر
علم کے خیر ہونے میں تو اب بھی شبہ نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کاروبارِ تعلیم کو کیا کہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے دوست
اور کا خیال ہے کہ تعلیم بھی کارِ خیر ہے کیوں کہ تجارت کارِ خیر ہے۔ ہمارے پاس ان کی اس دلیل کی کوئی کاٹ نہیں ہے۔
بچوں کے ہوم ورک کے بارے میں ہمارے پڑوسی مولانا محتاط بھی ہمارے خیالات سے متفق ہیں۔ مولانا محتاط کو تاریخ
سے خاص شغف ہے۔ گاہے بگاہے اپنی ادبی اور غیر ادبی تحقیقِ عمیق سے خاکسار کو بھی مستفید ہونے کا موقعہ
فرماتے رہتے ہیں۔ ایک دن رازدارانہ لہجے میں پوچھا "جانتے ہو فرہاد کی موت کس طرح ہوئی"؟ ہم نے کہا جس طرح
ڈائرکٹر نے چاہا۔ جھلا کر بولے "میں فلم کے نہیں اصلی فرہاد کی بات کر رہا ہوں"۔ اتفاق سے ہمیں غالب کا شعر یاد آ گیا
یا ہے

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں ؛ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

ہو بڑھیا نے فرہاد سے کیا کہا تھا"؟
شیریں کے لیے تم نے پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی۔ افسوس کہ وہ مرگئی"۔
ایک خاص تحقیقی شان سے گویا ہوئے "یہی تو غلط فہمی ہے جس میں سارے شاعر مبتلا ہیں"۔
نے عرض کیا کہ "مولانا! آپ ہی ارشاد فرمائیں کہ اصلیت کیا ہے"۔
بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ایک لفظ کو تول کر فرمانے لگے "جب فرہاد نے پہاڑ کا جگر چیر کر آپریشن جوئے شیر"
شاہ خسرو نے اپنے خاص پیام کے ساتھ ایک بڑھیا کو فرہاد کے پاس روانہ کیا۔ پیام یہ تھا کہ مابدولت شیریں
کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ فرہاد کو روزانہ شام کے وقت مابدولت کے صاحبزادگان

بلند اقبال کو ہوم ورک کرانا ہوگا۔ یہ سنتے ہی فرہاد نے جھٹ سے تیشہ اٹھا کھٹ سے اپنے سر پر مارا اور پٹ۔ مر گیا۔" ہم اپنے عزیز ہمسایہ مولانا محتاط کی اس تحقیق سے پورا پورا اتفاق کرتے ہیں اور اضافتاً یہ بھی کہنا چاہتے کہ قیس بھی لیلیٰ کے عشق میں مجنوں نہ بنا ہوگا بلکہ لیلیٰ کے بھائیوں اور بہنوں کے ہوم ورک نے اسے مجنوں بنا دیا ہو ورنہ وہ بھی آدمی تھا کام کا۔ مفروضہ تو ہم نے پیش کیا۔ اب یہ طب اور ادب کے محققین کا کام ہے کہ اسے پایہ تحق پہنچائیں۔ بچوں کے ہوم ورک اور اس کے دور رس اور دیرپا اثرات کے پیش نظر ہم ایسے کئی عنوانات تجویز کر سکتے ہ پر محقق اور ریسرچ اسکالرز داد تحقیق دے سکتے ہیں۔ جیسے اردو ادب پر بچوں کے ہوم ورک کے اثرات۔ ترقی پسند تح اور بچوں کا ہوم ورک۔ نثری نظم کے ارتقاء میں بچوں کے ہوم ورک کا حصہ۔ نظریہ وجودیت اور بچوں کا ہوم ورک۔ نذ کی ناول نگاری پر بچوں کے ہوم ورک کے اثرات۔ بچوں کا ہوم ورک اور ساختیات۔ وغیرہ۔ صلائے عام ہے نکتہ داں کے لیے۔ ہر چند کہ مقالہ نگار کو بچوں کے ہوم ورک کا عملی تجربہ رکھنا ضروری ہے تاہم اس شرط کو کالعدم متص جانا چاہیے کیوں کہ ہم دوہری سزا کے قائل نہیں۔

کھلاڑی

کسی مشاعرہ میں ایک نوجوان شاعر غزل پڑھ رہے تھے، جس کی زمین تھی:-

نظاروں سے کھیلا ؛ بہاروں سے کھیلا

غزل سننے کے بعد مجاز نے کہا۔

" ویل پلیڈ (Well played) مسٹر!"

تکلیف

حفیظ جالندھری سر کے بالوں کے سلسلہ میں "فارغ البال" ہیں۔ کسی خوش فکر دوست نے پوچھا۔

حفیظ صاحب! سر کے بال نہ ہونے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟

" تکلیف کیا ہوتی ہے ـــــ ؟" حفیظ نے جواب دیا۔

" ـــــ البتہ وضو کرتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ منہ کہاں تک دھونا ہے؟"

کسر نفسی

ایک انگریز خاتون جو خاصا ادبی ذوق بھی رکھتی تھیں کنہیا لال کپور سے متعارف ہوئیں تو ان کے نحیف و نزار جسم کو دیکھ کر کہنے لگیں۔

" کپور صاحب! آپ تو سوئی کی طرح پتلے ہیں"۔

کپور نے مسکراتے نہایت انکسار سے کہا۔

آپ کو غلط فہمی ہوئی محترمہ! بعض سوئیاں بھی موٹی ہوتی ہیں۔"

محمد باقر
(تبوک ص ب ۴۱۰)
سعودی عرب

"بیوی"

یہ بات ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہے ہیں کہ بیوی کا لفظ سنتے ہی اکثر و بیشتر لوگوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں جن میں ہم بھی شامل ہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جن کے کانوں سے یہ لفظ بیوی ٹکرایا کہ ان کی سٹی گم ہوگئی۔ کچھ لوگوں کے چہرے پر عجیب و غریب تغیرات رونما ہوتے ہیں گویا ہم نے ان کے منہ پر ان کے دشمن کی تعریف کردی ہو اور کچھ اصحاب کو ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ وہ خوف کے مارے اس موضوع پر بات کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے اور فوری دائیں بائیں دیکھنے لگتے ہیں۔ یوں تو ہم بیوی کو اپنا ہم پلہ سمجھتے ہیں کیوں کہ اس بات میں ہم اور ہمارے کنبے کے امن و امان کی مصلحت شامل ہے۔

بیوی اور وہ بھی اچھی بیوی کا ملنا کسی متضاد ایٹمی اجزاء کو بغیر تعامل کے یکجا کردینے کے مماثل ہے اچھی بیوی کے حصول کے لیے کئی پیچیدہ اور نازک مراحل سے صبر و تحمل کے ساتھ گزرنا پڑتا ہے۔ بیوی کا ساتھ ایک قیدِ بامشقت ہے اور اس کے لیے ہمارے معاشرے میں شادی کرنا ضروری ہے۔ شادی نکاح کا متبادل لفظ ہے اور نکاح میں کچھ معزز اصحاب کی موجودگی، بطور گواہ ضروری ہے تاکہ ان گواہوں کی ضروری اور غیر ضروری دعاؤں سے آپ کی زندگی کی بیل پھلے پھولے اور اگر گواہوں کی دعائیں منڈوے پر پہلے ہی سے چمیلی کی بیل کی موجودگی کا پتہ لگانے سے قاصر رہیں تو پھر سمجھ لیجئے اس چمیلی کے منڈوے تلے دو بدن کے پیار کی آگ میں جلنے کا واقعہ بہت جلد وقوع پذیر ہوگا۔ شادی کے گواہ کی ازدواجی زندگی جتنی کامیاب ہے اس کا اتنا ہی اثر آپ کی شادی پر ضرور ہوگا اور یہ سب آپ کی (دولہا کی) قسمت کی بات ہے ان تمام تر مراحل سے گزر کر دولہا کو اپنی دلہن یعنی مستقل کی بیوی ملتی ہے۔ جو بظاہر شرمائی اور کسمسائی اپنے دل میں پیار سے سامنا ہونے کے منظر کو سجائے سنوارے منتظر بیٹھی رہتی ہے۔ اب دولہا کو گھونگھٹ سے نمٹنا ہی پڑتا ہے۔ ان گھونگھٹ اٹھائی پر دولہا جو مخصوص کلمات ادا کرتا ہے اس سے اس کے پیشہ کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ایک سیول انجینئر کی شادی ہوئی گھونگھٹ اٹھاتے ہی انھوں نے کہا" اوہ مائی گاڈ! "یہاں تو فالتو میٹیریل اتنا لگا ہوا ہے کہ اصل کا پتہ ہی نہیں چلتا"۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی کہا" منہ کھولیے، زبان باہر کیجئے اور لمبی لمبی سانس لیجئے" اس کے بعد پرچی نکالی کچھ لکھا اور دروازہ کی طرف مڑ کر کہا" نکسٹ"۔ ایک ٹریفک جمعدار نے شادی کی رات گھونگھٹ اٹھتے ہی خوب جھلا

بتاؤ دے کر لوچھا لائسنس ہے"۔ ایک کنڈیکٹر کی شادی ہوئی اُس نے بیوی کا گھونگھٹ اُٹھاتے ہی کہا بہن جی
تھوڑا آگے ہو جائیں آگے بہت جگہ خالی ہے"۔

دلہن یعنی بیوی کے انتخاب کے لیے سرگرداں ایک نوجوان کا قصہ یاد آیا، ہوا یوں کہ ضرورت رشتہ کے ایک دفتر سے ایک نوجوان کو ٹیلیفون آیا منتظم دفتر نے کہا کہ بھائی صاحب بڑی تگ و دو کے بعد ہم نے آپ کے لیے جمیلہ نام کی ایک لڑکی کا انتخاب کر لیا ہے جو آپ کے لیے سب سے موزوں ترین ہے۔ نوجوان چونکا اور پوچھا کیا تم ڈرل ماسٹر کی لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہے ہو۔ منتظم نے بڑے ہی تپاک سے کہا کہ "آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا"۔ نوجوان نے کہا کہ کیا آپ پاگل تو نہیں۔ جمیلہ تو لنگڑی ہے۔ ٹھیک سے چل نہیں سکتی۔ منتظم بولا بھلا یہ کوئی پریشانی کی بات تھوڑی ہی ہے یہ تو عطیۂ خداوندی ہے شادی کے بعد جہاں چاہے جاؤ بیوی تمہارا پیچھا نہیں کر سکے گی۔

نوجوان دھاڑا اور کہا وہ تو ہکلاتی بھی ہے منتظم بولا یہ تو عطیہ خداوندی مزید ہے ایسی عورت جو ہکلاتی ہو اپنے شوہر سے بات کرنے میں پس و پیش کرتی ہے لہٰذا کم سے کم گفتگو کرے گی یا تم اسکی بات کے مکمل کرنے سے پہلے ہی اپنی مرضی سے وہ کام کر گذرو گے یقین کر لو شادی کی زندگی مجھے دعائیں دیتے ہوئے سکون سے زندگی گذار سکو گے۔ نوجوان نے کہا وہ اونچا بھی سنتی ہے منتظم نے کہا یہ تو دنیا کے ہر شوہر کی پہلی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی بیوی اونچا سُنے تاکہ وہ گھر میں حسب خواہش سہولت سے چیخ چلا کر کے دل کا غبار نکال سکے یہ تو آپ کے لیے وہ نعمت عظمیٰ ہے جو شاذ و نادر ہی کسی شوہر کو نصیب ہوتی ہے۔ آخر میں نوجوان نے کہا کہ بھئی وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑی ہے۔ منتظم بہت ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگا بڑے عجیب انسان ہو میں نے تمہارے لیے عطیات خداوندی سے مالا مال لڑکی کا انتخاب کیا اور تم ہو کہ ان چھوٹی موٹی خامیوں کو لیے اپنی ناتجربہ کاری کا پورا پورا ثبوت دے رہے ہو۔

بیوی کے حصول کے معاملے میں بعض اصحاب بہت ہی خوش نصیب ہوتے ہیں کہ انھیں اپنی زندگی میں یہ مواقع ایک سے زیادہ بار میسّر آتے ہیں۔ ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوا اُس نے بیوی کی قبر پر کتبہ کندہ کروا کر نصب کیا جس پر لکھا تھا "میری روشنی بجھ گئی"، چند سال بعد اس نے دوسری شادی رچانے کا فیصلہ کیا اور شادی سے ایک روز قبل اپنے قابل ترین دوست سے کتبہ نکال لینے کے بارے میں رائے طلب کی۔ دوست نے کہا کتبہ نکالنے کی قطعی ضرورت نہیں بس کتبے پر پرانے الفاظ کے نیچے یہ لکھ دو کہ اب میں نے دوسری موم بتی روشن کر لی ہے۔

ایک صاحب کی بیوی کم عمر اور خوبصورت بھی تھی کہ اُن کا اچانک انتقال ہو گیا جنازہ تیار کیا جا رہا تھا کہ اُسی وقت اُنکے ایک دوست نے موقع کو غنیمت جان کر محترمہ سے کہا کہ کیا میں آپ کے شوہر کی جگہ لے سکتا ہوں۔ محترمہ نے جواب دیا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ غسّال اور گورکن سے پوچھ لیں۔

ہم نے کئی اصحاب کو شادی سے پہلے اور شادی کے بعد والے اشتہاروں میں دلچسپی لیتے اور اُن مقامات کے چکّر کاٹتے دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ اس معاملے میں ہم نے ۶۰ تا ۷ سال کے نوجوان کو بھی نوشہ بننے کے دن دھاڑے خواب دیکھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے لیکن ان کے خواب آج تک خواب خرگوش ثابت ہو رہے ہیں۔

ہمارے قدیم محلے مراد نگر میں بھی بیوی کے لیے سرگرداں ایک صاحب موصوف موجود تھے جن کی عمر آج سے ۲۵ سال قبل ۵۸ سال تھی اُن کی کہانی کچھ اس طرح تھی کہ وہ دولہا تو بنے تھے اور قید با مشقت کی سزا بھی قبول کر چکے تھے

وسرے ہی دن سارا جہیز واپس ہوگیا ہمارے محلے کے منچلے اُنھیں "دُلہن وہی جو پیا من بھائے" اور دُلہن
ات کی" کے نام سے پکارتے تھے۔

ٹھ سالہ کنوارا امیر شخص ۲۲ سالہ حسینہ سے شادی کا خواہشمند تھا اس کے قریبی دوستوں میں فرانس کا ایک
اداکار بھی شامل تھا جو اب تک کئی شادیاں کرچکا تھا ایک دن کنوارے رئیس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اپنے
وست سے کہا میں اُس کو اپنانا چاہتا تھا لیکن وہ میری عمر پوچھ بیٹھی میں نے اپنی عمر ۵۰ سال بتلائی جس پر وہ چپ
شاید وہ کسی کم عمر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ دوست بولا۔ غلطی تمہاری تھی جو تم نے اپنی عمر کم بتلائی۔ اگر
سے کہتے کہ تمہاری عمر ستّر سال ہے اور تم دل کے مریض ہو تو وہ تمہیں فوراً گرجا گھر لیجاتی اور دوسی جوڑے کی
ری کا بھی انتظار نہ کرتی۔
□□

خوش قسمتی!

جوش نے مجاز سے پوچھا۔
"مجاز! کیا تمہارے والدین تمہاری رندانہ بدا عتدالیوں سے
پریشان نہیں ہوتے؟"
"لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے جوش صاحب ——!"
مجاز نے جواب دیا۔
"—— لیکن خوش قسمتی سے میرے والدین بے حد سعادت مند ہیں۔"

کوثر صدیقی
(بھوپال)

شملہ سمجھوتے کی عزت کیجئے
بیٹھئے باتوں کا شربت پیجئے

دھرم میں دہشت کو حل کر لیجئے
پھر سیاست میں ملا کر پیجئے

ہوں نہ گر اپنی خوشی سے وِتھ ڈرا
نوک پر خنجر کی اغوا کیجئے

بن گیا ہے اب الیکشن کاروبار
ووٹ ہرگز مفت میں مت دیجئے

بات کرنے آئے ہیں خنجر بکف
اب وہ جیسا حکم دیں بس کیجئے

عشق کرنے کا یہی انجام ہے
کھائیے غم اور بیڑی پیجئے

خواب کی لذت اٹھانا ہو اگر
لاٹری کا اک ٹکٹ لے لیجئے

کام چاہے باپ کا ہی کیوں نہ ہو
مفت میں ہرگز کبھی مت کیجئے

ڈاکٹر ہادی منزہ
(نرمل اے پی)

لے جائیں گے کدھر یہ کسی کو پتہ نہیں
لچے لفنگے قوم کے سردار ہو گئے

شائع کرا کے خود کے جریدہ میں اک غزل
ہم دیکھتے ہی دیکھتے، فن کار ہو گئے

دولت یہاں پہ جن کو وراثت میں مل گئی
وہ لوگ لذتوں کے خریدار ہو گئے

جو چاہے آپ لے لیں ملے گی سند یہاں
اس کے جو کاؤں کاؤں میں بازار ہو گئے

رتبہ شہید کا ہمیں معلوم جو ہوا
انگلی کٹانے ہم بھی تو تیار ہو گئے

ہم کو اٹھا کے کونے میں بچوں نے رکھ دیا
ہم جیسے باسی دیکھئے اخبار ہو گئے

توقیر ان کی آج منزہ بہت ہی ہے
اپنا ضمیر بیچ جو زردار ہو گئے

مرزا کھونچ
(بتیا، بہار)

کرسی کھسک گئی تو گئے دن بہار کے
سونا محال ہو گیا ٹانگیں پسار کے

سسرال سے میں جاؤں کہاں دل کو مار کے
ملتی ہے دال بھی یہاں گھی میں بگھار کے

بلبل سمجھ نہ جائے اسے اپنا گھونسلہ
گلشن میں یوں نہ آیئے زلفیں سنوار کے

پہلے تو انجمن کی صدارت چلی گئی
اب راستے بھی بند ہوئے ہیں اُدھار کے

ہر شخص اپنے جیسا نظر آئے گا تمہیں
دیکھو یہ ذات پات کا چشمہ اتار کے

لونڈے گلی کے آؤ بھگت کر رہے ہیں کھونچ
آیا ہوں جیل سے میں کئی دن گزار کے

ٹر اختر بستوی
(گورکھپور)

تکلّف بہتر ہے

آپ بھی شاید اس مشہور زمانہ خیال سے متفق ہوں کہ "تکلّف میں ہے تکلیف سراسر" کیوں کہ ممکن ہے آپ نے کبھی
ہیں تکلّف کیا ہو اور بھوکے رہ گئے ہوں یا کبھی ٹرین میں سفر کرتے وقت محض ذرا سا تکلّف برتنے کی آپ کو اتنی بڑی
ا ہو کہ پورا سفر کھڑے کھڑے ہی گزر گیا ہو۔ لیکن جہاں یہ بات اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی طرح سارے عالم میں تسلیم شدہ ہے
تکلّف میں تکلیف ہوتی ہے وہاں یہ حقیقت بھی چین کی سینہ زوری اور اسرائیل کی کینہ توزی کی طرح اظہر من الشمس
بعض اوقات بے تکلفی بھی حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہوا کرتی ہے۔ دونوں تکالیف میں فرق بس اتنا ہی ہے کہ
کے نقصانات کی بخشی ہوئی تکلیف وہ شخص خود ہی جھیلتا ہے جس سے یہ حماقت سرزد ہوئی ہو لیکن بے تکلفی کی عطا
تکلیف اس غریب کو برداشت کرنی پڑتی ہے جس کے ساتھ یہ عقلمندی فرمائی گئی ہو۔ ہر سماجی آدمی کی زندگی
مواقع ایسے ضرور آتے ہیں جب بے تکلفی اسے اتنی گراں گزرتی ہے کہ وہ تکلّف کو اس سے بہتر سمجھنے پر بالکل اسی طرح
ہو جاتا ہے جیسے کہ ایمانداری سے امتحان دینے والے کسی طالب علم کو فیل ہو جانے کے بعد اپنے اُن ساتھیوں کو دانشمند سمجھ لینا
ہے جو نقل کر کے پاس ہو گئے ہوں۔

بزمِ احباب میں بے تکلفی کو مستحسن ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ "اگر دوستوں
م میں بھی تکلفات کے پردے حائل رہیں تو وہ محفلِ احباب سے زیادہ محفلِ میلاد معلوم ہوتی ہے۔" مگر میرا تجربہ تو اس
میں یہ کہتا ہے کہ دوستوں کے درمیان بھی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی بے تکلفی بسا اوقات اتنی ہی اذیت ناک
ہے جتنی کہ عطر کی دکان میں بیڑی کے دھوئیں کی بدبو۔ مثال کے طور پر میں آپ کو اپنے ایک نہایت ہی بے تکلف دوست
ق صاحب کی ایک حرکت کا حال سناتا ہوں۔ موصوف کو فلش کھیلنے کا جنون کی حد تک شوق ہے اور وہ چھٹی کے دن لوگو
کے گھروں پر جا کر گرفتار کرتے ہیں اور انھیں اکٹھا کر کے زبردستی فلش کھلاتے ہیں۔ ایک اتوار کو صبح سات بجے کے قریب
سکون سے بیٹھا اپنا ایک نامکمل مضمون پورا کر رہا تھا کہ انھوں نے آواز دی۔ میرا مضمون چونکہ اس وقت اختتام پر
لیے اُن کا آنا ایسا ہی لگا جیسے کھانا کھاتے وقت آخری نوالے میں مکھی آگری ہو۔ باہر آکر دیکھا تو اُن کے ساتھ نسیم صاحب
ب اور راکیش صاحب کو بھی اپنا منتظر پایا۔ یہ لوگ فلش کے مشہور کھلاڑیوں میں تھے، اس لیے انھیں اپنے گھر پر دیکھ کر
متعجب ہوا کیوں کہ مجھے اس کھیل سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے اپنی حیرت کو دبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے

پوچھا "خیریت تو ہے فاروقی صاحب؟ اس وقت کیسے زحمت فرمائی؟" انھوں نے حسبِ عادت انتہائی بے تکلفانہ لہجے میں ارشاد فرمایا "اما، عجیب بداخلاق انسان ہو تم بھی۔ اس طرح کھڑے کھڑے پوچھ رہے ہو کیسے زحمت فرمائی۔ ارے ذرا باہر کا کمرہ کھلواؤ، پھر اطمینان سے بتائیں گے"۔ میں نے نوکر کو آواز دے کر کمرہ کھلوایا۔ انھوں نے نہایت آرام سے شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگی اور جیب سے تاش کی گڈی نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولے "بھئی تم جانتے ہو کہ میری بیگم کس قسم کی عورت واقع ہوئی ہیں۔ واللہ عجیب زندگی ہے میری بھی۔ اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی تفریح کے لیے دوسروں کے گھر تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ آج جب کہیں کوئی اڈا نہ ملا تو مجبوراً تمہارے یہاں آنا پڑا۔ حالانکہ اس معاملے میں تم بڑے ہی بدذوق ہو لیکن بس یہ سوچ کر چلا آیا کہ اگر کچھ دیر تمہارے کمرے میں بیٹھ کر ہم لوگ دل بہلالیں تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یار اعتراف، تم واقعی بہت خوش قسمت ہو جو اس مصیبت میں نہیں مبتلا ہوئے"۔ فاروقی صاحب تو اپنی دھن میں بکے جارہے تھے اور میری گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ ایسی ہورہی تھی جیسے کوئی دیوالیہ تاجر انکم ٹیکس والوں کے نرغے میں آگیا ہو۔ میری والدہ تاش کے کھیل کو انتہائی منحوس سمجھتی ہیں اور اکثر کہا کرتی ہیں کہ اس ناپاک چیز کا سایہ جس گھر پر پڑجائے وہ تباہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اب اگر انھیں خبر ہوگئی کہ تاش کے کھیل نے خود ان کے گھر میں بھی قدم رکھ دیا ہے، اور وہ بھی جوئے کی صورت میں، تو وہ کیا کچھ آفت نہ ڈھائیں گی۔ لیکن اس طرح کے بے تکلف دوستوں سے کوئی کہہ ہی کیا سکتا ہے۔ بہت ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہہ سکا "بھئی بیگم نہ سہی، گھر میں امی جان تو موجود ہیں"۔ لیکن فوراً ہی جواب ملا "اما، تم بھی عجیب بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اس عمر میں امی جان سے اتنا ڈرتے ہو!" اب آپ ہی بتائیے کہ اس کے بعد سوائے اجازت دینے کے، اور کیا چارۂ کار تھا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ انھیں فلش کھیلنے کی اجازت دی بلکہ شام تک چائے اور سگریٹ سے اُن کی تواضع بھی کی۔ وہ لوگ تو کھیل میں مشغول رہے اور میں مضمون کا خیال ترک کر کے صرف وقت گزاری کے لیے ایک کونے میں بیٹھا ناول پڑھتا رہا۔ شام کو اُن لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد جب میں اس طرح جھجکتا ہوا اندر گیا جیسے کوئی نومشق جھوٹا گواہ عدالت کے کمرہ میں جاتا ہے تو دیکھا کہ امی جان اپنی چارپائی پر بہت ہی غمگین اور اداس بیٹھی ہیں۔ کچھ دیر تک تو وہ بالکل ہی خاموش رہیں، پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں "افسوس میری قسمت میں یہ دن دیکھنا بھی لکھا تھا۔ ان کی (یعنی میرے والد کی) زندگی میں جس گھر میں ہر وقت خدا اور رسول کی باتیں ہوا کرتی تھیں آج اسی گھر میں جوا کھیلا جانے لگا"۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت عجیب تھی۔ امی جان کے ملال انگیز جملے نشتر کی طرح چبھ رہے تھے اور مجھے رہ رہ کر خود اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ جہنم میں گئی ایسی دوستی اور چولھے میں گئی ایسی بے تکلفی، کیوں نہ فاروقی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے گھر میں فلش نہیں کھیلا جاسکتا۔

ٹرین کے سفر میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کوئی رسالہ دیکھنا شروع کریں تو تھوڑی ہی دیر بعد بغل والے صاحب اُس کے کسی صفحے پر کوئی خوبصورت سی تصویر دیکھ کر فرماتے ہیں "بڑی عمدہ تصویر ہے جناب! ذرا دیکھوں تو کس کی ہے"۔ اور مجبوراً آپ رسالہ ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کچھ دیر تک وہ حضرت اس تصویر کا بغور معائنہ فرماتے ہیں پھر اس کے دوسرے صفحے پر کسی افسانے کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ یا اگر کسی اسٹیشن پر اخبار خریدیئے تو قبل اس کے کہ آپ اسے کھولیں، کوئی صاحب پوچھ بیٹھتے ہیں "آج کا اخبار ہے کیا؟" اور پھر نہایت ہی بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں "لائیے ذرا ایک ورق مجھے دے دیجئے"۔ ایسے موقعوں پر بے تکلفی حالانکہ بہت ہی ناگوار گزرتی ہے لیکن آپ صبر کرنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ خیر ٹرین میں تو اس طرح کی بے تکلفی یہ سوچ کر بھی برداشت کی جاسکتی ہے کہ تھوڑی ہی دیر کا معاملہ ہے، کیوں خواہ مخواہ کسی سے جنگ مول لی

لیکن اگر خدانخواستہ اپنے محلے میں بھی کچھ ایسے ہی بے تکلف لوگوں کی بے محابا بے تکلفی سے سابقہ پڑ جائے تو پھر قتل یا خودکشی میں سے ایک نہ ایک حادثے کے امکانات بہت ہی قوی ہو جاتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی لمحہ آیا تھا، لیکن میں چونکہ فطرتاً بڑا ہی بزدل واقع ہوا ہوں اس لیے نہ خودکشی کر سکا اور نہ قتل، صرف مکان ہی تبدیل کر کے اکتفا کر لیا۔ لیجیے آپ بھی اُس کی تفصیل سن لیجیے۔

ایک دن صبح اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار کا انتظار کر رہا تھا اور وقت گزارنے کے لیے ایک رسالہ دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر سائیکل کی گھنٹی سنائی دی۔ میں نے رسالہ بند کر کے میز پر رکھ دیا اور نوکر کو آواز دی کہ جا کر اخبار لے آئے۔ لیکن قبل اِس کے کہ نوکر باورچی خانے سے نکل کر دروازے تک پہنچے، مجھے اپنے پڑوسی نظیر صاحب کی آواز سنائی دی جو غالباً اخبار والے سے مخاطب تھے "اخاہ میاں آ گئے تم! لاؤ یہ اخبار مجھے دے دو۔ میں ابھی اندر بھجوادوں گا۔" لیکن اُس نے شاید اخبار انھیں دینے میں کچھ تامل کیا، کیوں کہ نظیر صاحب کی آواز پھر سنائی دی "ارے میں اسے خود تھوڑے ہی رکھ لوں گا، کہہ تو رہا ہوں کہ ابھی اندر بھجوادوں گا۔" مگر اس سے پہلے کہ اخبار والا کچھ فیصلہ کرے، میرے دوسرے پڑوسی وسیم صاحب کی آواز آئی "ارے، تم آج اتنی دیر تک کہاں رہ گئے تھے؟ کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں! ذرا اِدھر تو لانا اخبار۔" نظیر صاحب نے اپنا ایک اور حریف دیکھا تو جل کر بولے "واہ بھئی واہ! حلوائی کی دکان اور دادا جی کا فاتحہ! ارے اگر ایسا ہی شوق ہے اخبار بینی کا، تو خریدار بن جایئے نا!" وسیم صاحب بھلا چوٹ کھا کر برداشت کرنے والے کہاں تھے، فوراً ہی جوابی حملہ فرمایا "وہ تو ٹھیک ہے قبلہ، لیکن قاضی جی شہر کے اندیشے میں کیوں دُبلے ہو رہے ہیں۔ یہ اخبار آپ کا تو نہیں ہے۔ پھر آپ کون ہوتے ہیں مجھے ٹوکنے والے؟" یہ کہہ کر انھوں نے غالباً اخبار والے سے اخبار چھین لینا چاہا کیوں کہ نظیر صاحب کی گرجدار آواز سنائی دی "دیکھئے جناب! آپ زبردستی اخبار نہیں لے سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ شرافت کے جامے میں رہیے۔" وسیم صاحب کا لہجہ بھی قدرے تیز ہو گیا "ذرا زبان سنبھال کے بات کیجیے نظیر صاحب۔ اب آپ مجھے شرافت سکھائیں گے؟ میں کہتا ہوں چھوڑ دیجیے اخبار، ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔" پھر مجھے اپنے نوکر کی آواز سنائی دی "ارے جناب اخبار پھٹ جائے گا۔ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" چونکہ شور تبدریج بڑھتا ہی جا رہا تھا اس لیے مجبوراً مجھے بھی باہر نکلنا پڑا۔ وہاں پہنچ کر عجیب نقشہ دیکھا۔ اخبار کا ایک کونہ نظیر صاحب کے ہاتھ میں تھا، دوسرا وسیم صاحب کے ہاتھ میں اور تیسرا کونہ اخبار والے نے تھام رکھا تھا۔ نظیر صاحب اور وسیم صاحب دونوں غضب ناک لہجے میں ایک دوسرے کو صلواتیں سنا رہے تھے۔ میرا نوکر بے چارہ گھبرا گھبرا کر ان دونوں کو سمجھا رہا تھا کہ "دیکھئے اخبار کے ساتھ کھینچا تانی نہ کیجیے ورنہ پھٹ جائے گا۔" مجھے دیکھتے ہی اُن دونوں حضرات نے ایک ساتھ میرے اوپر یلغار کی "دیکھئے اختر صاحب! یہ حضرت کس قدر ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔" لیکن میرے فیصلے سے قبل ہی ان دونوں صاحبان نے اپنی اپنی قوت کا مظاہرہ بھی کر ڈالنا ضروری سمجھا، اور نتیجے کے طور پر دیکھتے ہی دیکھتے اخبار کے پُرزے پُرزے ہو گئے۔

اب ذرا انصاف سے کہیے کہ اگر آپ کا سابقہ بھی ایسے ہی کچھ بے تکلف پڑوسیوں یا محلے والوں سے پڑ جاتا تو کیا آپ بھی تکلف کی تکالیف کو بے تکلفی کی اذیتوں سے اسی طرح بہتر سمجھنے پر مجبور نہ ہوتے جیسے کہ کوئی مالی پھلوں کے کسی باغ میں شرارتی بچوں کی برپا کی ہوئی قیامت کے مقابلے میں بندروں کی ڈھائی ہوئی آفت کو گوارا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

●●

محبوب مانجھوم،

غزلیں

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

قائم مرا رہتا ارے رُتبہ کوئی دن اور
آتا نہ اِدھر خان کا بچہّ کوئی دن اور

اب جا کے بڑھاپے میں یہ احساس ہوا ہے
اے کاش کہ رہتا مرا ٹھسّہ کوئی دن اور

مہنگائی بڑھے خوب تو پھر بیچوں گا اس کو
بنیا ہوں دبائے رکھوں غلّہ کوئی دن اور

مل جاتی ہے مجھے مفت میں شہرت کی بلندی
لیڈر کا بنا رہتا جو چمچہ کوئی دن اور

تم ہاں میں مری ہاں ہی ملاتے رہو چمچو!
تم یونہی ہلاتے رہو چمچہ کوئی دن اور

دو دن ہی میں سب دے گئے دھوکا مرے احباب
اے کاش! نہ دیتے مجھے غچّہ کوئی دن اور

تعمیل بجا لاؤ مرے حکم کی ہر آن
تم بن کے رہو "سودا کا غنچہ" کوئی دن اور

جی بھر کے ابھی لوٹا کہاں غنڈوں نے سب کو
دنگا ابھی جاری رہے قبلہ کوئی دن اور

یہ کہہ کے گیا خان ہے دے کر مجھے دھمکی
پھر آئے گا "خنزیر کا بچہّ" کوئی دن اور

ہے لِسٹ میں یمدُوت کے لے سیٹھ ترا نام
بس دیکھ لے دنیا کا تماشہ کوئی دن اور

اِٹھلا کے کہا بیوی نے "اے شوہرِ خستہ"
تو پیس ابھی سِل پہ مصالحہ کوئی دن اور

جا چھوڑ دیا آج یہ محبوب رہے یاد
رکھ دوں گا بدل کر ترا حلیہ کوئی دن اور

☆

ہر کوئی اُلّو کا پٹھّا ہو، ضروری تو نہیں
خاندان سارا نکمّا ہو ضروری تو نہیں

جس کو دیکھو وہ کھٹارا ہو، ضروری تو نہیں
آوے کا آوا ہی بگڑا ہو ضروری تو نہیں

عشق کی راہ میں مجھ پر بھی پڑیں گے جوتے
میری قسمت ہی میں لکھا ہو ضروری تو نہیں

حادثہ میں بھی تو مر سکتی ہے اُس گھر کی بہو
ساس نے اس کو جلایا ہو ضروری تو نہیں

سینکڑوں ہوں گے جو واقف ہی نہ ہوں گے مجھ سے
ہر طرف میرا ہی چرچا ہو ضروری تو نہیں

خوب چرچا ہے مگر یار "حوالے" کا مزہ
ہر منسٹر نے ہی چکھا ہو ضروری تو نہیں

امن کی فاختہ ہر سال اُڑاتے ہیں جو لوگ
اُن کے یاں امن بھی ہوتا ہو ضروری تو نہیں

شعر کہنے کے لئے شرط ہے کیا پینا شراب
بن پئے شعر نہ ہوتا ہو ضروری تو نہیں

لوگ لکھوا کے بھی پڑھ دیتے ہیں محبوب غزل
آپ ہی نے اسے لکھا ہو ضروری تو نہیں

●

بُو آر کے (ایلچ پور)

ٹک کان دھر سُنو تم

جس طرح شعر گوئی کے معاملہ میں خُدائے سُخن میرؔ کا کوئی ثانی نہیں ہوا اسی طرح شعر فہمی کے میدان میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ آج ہم اپنی شعر فہمی کی روشنی میں ثابت کردیں گے کہ اس فن میں ہم طاق ہی نہیں روشندان بھی ہیں۔ ...اذیر اپنا لوہا منوانے کے لیے ہم نے کلام میرؔ سے استفادہ کیا ہے۔ میرؔ کا سونے سے پیلا اور چاندی سے اُجلا شعر جسے آج ...ی شعر فہمی کی کسوٹی پر رکھیں گے ذیل میں درج ہے۔ اس شعر میں ہچکیاں لے لے کر رونے ہوئے میرؔ کہتے ہیں۔ ؎

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا ؎ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

...من میں عرض ہے کہ اردو ادب کے سرمایۂ افتخار یعنی کلام میرؔ میں رونے دھونے کی گنجائش، صرف اسی ایک شعر میں ...ں بلکہ ہر دو چار شعروں کے بعد نکل آتی ہے۔ میرؔ کے اس قدر زار و قطار رونے کے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے ... اس شعر کو اپنے ساتھ لیے ہم دربدر بھٹکے۔ ہم نے اس سلسلہ میں میرؔ کے متعدد اسکالرس سے ہی رابطہ قائم نہیں کیا بلکہ ...قدرین میرؔ و ناقدین میرؔ سے بھی دریافت کیا۔ ... لیکن کہیں سے اور کسی سے بھی میرؔ کے رونے رُلانے کی معقول وجہ ...کم ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب اہل ادب ہی نامعقول دلیلیں میرؔ کے رونے کا صحیح جواز پیش نہ کرسکیں ... تب ...کام کی تحقیق ہم نے اپنے سر لے لی اور طے کیا کہ اب ہم خود ایک عالم کو میرؔ کے آنسوؤں سے روشناس کرائیں اور اہلِ ...ب و اربابِ نظر کے روبرو میرؔ کے غموں دکھوں اور مصیبتوں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیں گے۔ اپنے اس تحقیقی کام کی انجام ...ی کے لیے ہم نے بہ زعمِ شعر فہمی میرؔ کے رونے کی وجوہات کھوجنے ہم خود بیٹھ گئے۔ مذکورہ شعر کو ہم نے بجائے ازلی ...ہ نگاہ یا سماجی زاویۂ نظر سے دیکھنے کے خالص طبی نظریہ سے دیکھنا مناسب سمجھا۔ بعد ازاں میرؔ کے اس شعر میں زار و قطار ...نے کی جو معقول وجہ ہماری حکیمانہ فہم و فراست میں آئی ... وہ یہ تھی ... کہ میرؔ نہ تو غمِ جاناں کے شکار تھے نہ انھیں ...دوراں کے آزار تھے ... بلکہ اصل بات اور واحد وجہ ان کے پرشور رونے کی یہ تھی کہ مسلسل کئی دنوں سے وہ داڑھ ...درد میں کبھی مبتلا رہے ہوں گے ... تو یقیناً آپ ہماری شعر فہمی کی داد دیئے بغیر نہیں رہیں گے نیز ہماری طرح آپ ...داڑھ کے درد کو اس شعر کا ماخذ گردانیں گے۔ کیوں کہ یہ بات تو ایک عالم پہ عیاں ہے کہ تمام دردوں میں داڑھ کا درد ...جری اور ظالم درد ہے جو اچھے اچھوں کو دھاڑیں مار کر رونے پر مجبور کردیا کرتا ہے جس کے باعث گھر والے تو گھر والے ...پڑوس کے سونے والے بھی رونے دھونے کے شور شرابے میں تمام رات جاگ جاگ کر گزار دیا کرتے ہیں اور یہی

بلالیا"۔ دوسرے نے دستی سے آنکھ ناک نتھنے منہ پونچھتے ہوئے کہا کہ اگر شہزادی اس عرب مصری نژاد نوجوان سے شادی کر لیتی تو ہم سمجھتے کہ ہم نے دو سو سالہ انگریزوں کی غلامی کا بدلہ لے لیا۔ تیسرے نے اپنی سیکل کی تھیلی سے موز، بن اور اخبار نکالتے ہوئے کہا اب آزادی خیال کو رعنائی خیال کہنے کا کوئی سہارا نہیں رہا۔ ہم غریبوں کو ہیروں کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں جو لطف آتا تھا وہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ پانچویں نے اسے عظمت نسواں کا عنوان دیا۔ چھٹے نے جہیز، لین دین اور بیوہ کی باز آبادکاری سے جوڑ دیا۔ ساتویں نے آٹھویں کو روکتے ہوئے کہا کہ ان باتوں کو مغرب میں معیوب نہیں سمجھا جاتا جب ایسی ویسی باتوں پر خود چارلس اور شہزادی یا شاہ کی ساس کو اعتراض نہیں تو ہمیں اپنا خون جلانے سے کیا فائدہ۔ نویں نے چارلس کے عقد ثانی کی پیش گوئی کردی۔ اور اپنی نشاطگی کے تجربہ پر بھروسہ کرتے ہوئے چارلس زدہ نوبر برطانیہ پامیلا سلہا کے ساتھ رشتہ طے پانے کا یقین دلایا۔ اور سہرا لکھنے اور سنانے کی پیشگی دھمکی دے ڈالی۔

لوگوں کی یہ منہ زوریاں سن کر ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ کیوں غالب دنیا میں مرنا نہیں چاہتے تھے۔ غالب کا یہ حسن انتخاب ہی انہیں اردو شاعری میں منفرد بناتا ہے۔ ادھر ہم کوشش میں تھے کہ کسی خوشگوار موڑ پر حکایت غم ڈائینا کو ناتمام چھوڑ آئیں لیکن منہ زوروں کے گنبد نما خالی منہ اور اس میں گونجتی ہوئی میڈیا کی صدائے بازگشت نے ہمیں مجبور کردیا کہ سر بہ معہ ٹوپی اور آبرو سمیت پوری مشرقی روایات کو سمیٹتے ہوئے چپل چھوڑ کر بھاگ آگئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا کہنا بار خاطر ہوگا یا بھاگتا۔

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈنے
لڑکے پھرے ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

□□

تلافی

جب منٹو کے افسانہ "بُو" پر کچھ "بااخلاق" لوگ بدک اٹھے
اور معاملہ عدالت تک جا پہنچا تو ایک ادیب نے منٹو سے کہا۔
"لاہور کے کچھ سرکردہ بھنگیوں نے ارباب عدالت سے شکایت کی ہے
کہ آپ نے ایک افسانہ "بُو" لکھا ہے جس کی "بدبُو" دُور دُور تک پھیل گئی ہے ــــ"
منٹو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
کوئی بات نہیں۔ میں ایک افسانہ "فینائل" لکھ کر ان کی شکایت رفع کردوں گا۔"

پیٹر میکمنس
یزی سے ترجمہ : ڈاکٹر میر گوہر علیخاں

رہنما مشعلیں

چند دنوں پہلے کی بات ہے کہ امریکی سائنسدانوں نے غالباً اپنی جمہور کی رائے کے بوجھ کو دوسروں کے کندھوں پر ڈالنے کی غرض سے بڑے ہی ڈھٹائی سے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ اوزون OZONE کی پرت میں شگاف ڈالنے میں ہندوستان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ سنتے ہی برصغیر کے عوام کے چہرے لٹک گئے۔ اور وہ عجیب و غریب نظروں سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ان سائنسدانوں نے مزید کہا کہ ان شگافوں کے پیدا ہونے کا امریکی معیشت، تعیشاتی اشیاء کی طلب و رسد میں بے تحاشہ اضافہ، "ھل من مزید" کا نعرہ اور امریکی حکومت کے ان پر قابو نہ پاسکنے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی فضاء میں ضرورت سے زیادہ میتھین گیس METHANE GAS کا پایا جانا ہے۔ اور اس گیس کے اخراج کرنے کی ذمہ داری ہندوستان کے کروڑوں گائے، بیل اور بھینسوں پر ہے۔ یہ بات تو سچ ہے کہ یہ تمام ملین گائے، بھینس ہر دم، ہر لمحے دن کے چوبیسوں گھنٹے میتھین گیس کا اخراج کرتے ہی رہتے ہیں۔ مگر ان بے زبانوں کو اس بات کا ذمہ دار گردا ننا کہ ان کے فضلے کے اخراج سے دھرتی لمحہ بہ لمحہ گرم تر ہوتی جارہی ہے۔ اور کائنات میں پائی جانے والی اوزون کی مقدار میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ کہاں تک حق بہ جانب ہے ؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا ان بے شمار جانوروں کا آزادی اور بے لگامی سے ہندوستان کے شہروں، گلی کوچوں، اور مواضعات کے کھیت اور کھلیانوں میں گھومنا پھرنا اور مہاتما گاندھی کے گائے گھر کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ کرنا۔ اس دعویٰ کو تقویت نہیں دیتا ؟ دلی کے "وسنت کنج" کے علاقہ میں جب آپ کسی سمت سے بھی داخل ہوں تو آپ کو ان امریکیوں کے اس خیال کی تصدیق کرنی پڑے گی یا کم از کم آپ اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنے کے لیے آمادہ ہوجائیں گے۔ اس وسنت کنج کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے "مسدپور" MASAD PUR ۔ جو نیلسن منڈیلا روڈ کے آخری حصے سے جڑا ہے! اس گاؤں کے عین درمیان اس "خوشبو" سے بھرا ایک ڈائری فارم یا گائے گھر ہے۔ جو اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ اس ڈائری فارم کی ان گنت گائیں چراگاہ کو جاتی ہوئی جب سڑک کے بیچ سے گزرتی ہیں تو کئی منٹ تک راستہ سے گزرنے والی ہر قسم کی موٹر گاڑیوں کو رک جانا پڑتا ہے۔ اس عرصہ میں ان میں بیٹھے ہوئے مسافرین کے نتھنوں میں میتھین گیس کی بو آہستہ آہستہ رینگنے لگتی ہے! اگر راستہ کھلا ہوا ہو تب بھی ہوا کے جھونکوں پر سوار

اس گیس (میتھین) ہوا ان تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ لہٰذا اس سڑک سے گزرنے والوں کو ایک ہی دُھن رہتی ہے کہ وہ جلد از جلد تیزی سے اس راستے سے گزر جائیں۔ اس ہڑبونگ میں حادثات کا احتمال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ اکثر ڈرائیور OVER TAKE کی خواہش میں اپنی گاڑیوں کی رفتار بھی ضرورت سے زیادہ تیز کر دیتے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ کم بلندی پر پرواز کرنے والے ہوائی جہاز جو اندرا گاندھی ہوائی اڈہ پر اترا کرتے ہیں۔ وہ بھی اس "خوشبودار" علاقہ سے تنگ آچکے ہیں۔ اور ہزار ہا جتن کر رہے ہیں کہ یہاں سے نہ گزرنے کے لیے کس قسم کی علامات ایجاد کریں!

ایک دن موسم برسات میں میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے واپس گھر لوٹ رہا تھا۔ راستہ میں وسنت گنج پڑتا تھا ہم تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ تیز بارش ہونے لگی۔ برسات کی بوچھاریں اتنی تیز و تُند تھیں کہ موٹر کے سامنے کے آئینے میں لگے WIPERS ناکارہ ہو گئے۔ آگے دُھند سی چھا گئی۔ اور یہ جاننا مشکل ہو گیا تھا کہ ہم کس علاقہ سے گزر رہے ہیں ــــ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور اس کے ساتھ "خوشبو" بھی لایا۔ چند ثانیہ بھی نہ گزرے تھے کہ ہماری موٹر کے اگلے پہیئے ایک چھوٹے سے گڑھے میں دھنس گئے۔ اور گوبر سے بھرے ہوئے پانی کے موٹے موٹے چھینٹوں سے ہماری گاڑی کا آئینہ لت پت ہو گیا۔ تب میں نے جان لیا کہ ہم مسدپور سے گزر رہے ہیں۔

تو کیا مسدپور ڈائری فارم کو بند کرنے سے ہمارے سَروں پر جو اوزون کی پرت ہے۔ اس میں جو شگاف ہیں وہ بند ہو سکیں گے؟ اور کیا گرمی کی شدت میں کمی واقع ہو گی؟ نہیں! ایسی بات تو ممکن نہیں ہے۔ تو کیا پھر برطانوی سائنسدان HEATH ROBINSON کی ایک پیچیدہ ایجاد کی طرح ہمیں بھی کوئی ایسی چیز بنانی پڑے گی جو ان مویشیوں کے پچھلے حصے سے خارج ہونے والی گیس کا نکلنا قطعاً بند کر سکے۔ یا کوئی آلہ ایسا ایجاد کرنا پڑے گا کہ اگر اس کو ان جانوروں کے پچھلے حصے سے جوڑ دیا جائے تو پھر خارج ہونے والی میتھین گیس چھوٹے چھوٹے دیپوں کی طرح جل سکے۔ اور اگر ایسا کر بھی لیا جائے تو سوال یہ اُٹھے گا کہ کیا ان ۲۵ ملین میتھین گیس کی ننھی ننھی مشعلیں ہر جگہ گھومتی پھرتی کائنات کو ایک انوکھی قسم کی تپش سے آشنا کر دے گی؟ کچھ بھی ہو یہ لاکھوں مشعلیں اندرا گاندھی ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہوائی جہازوں کے لیے PILOT LIGHTS کا فریضہ انجام دیتی رہیں گی۔ ▪▪

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

پیکرانِ بے سخن

فائدے کا فائدہ

راج بھون پٹنہ میں سابق گورنر بہار، دیوکانت بروا، علامہ جمیل مظہری، فراق گورکھپوری، مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرے لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو جب خالص ادبی موضوع پر ہونے لگی تو جمیل مظہری نے فراق سے پوچھا "ادب کی افادیت کیا ہے"؟

فراق نے جواب دیا ـــ ایک بچہ گولی کھیل رہا تھا اس کے باپ نے اسے سمجھایا کہ گولی کھیلنا مناسب نہیں ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں، اس لیے مت کھیلو۔ بچہ گولی کھیلنے کے بجائے لٹو نچانے لگا۔ باپ نے اس کھیل سے بھی اسے منع کیا کہ لٹو نچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تب وہ پتنگ اڑانے لگا۔ لیکن باپ نے اس حرکت سے بھی اسے منع کیا کہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بچے نے جھنجھلا کر باپ سے پوچھا "آخر فائدے کا فائدہ کیا ہے؟ آپ ہی بتائیں؟"

فائدہ

اسی محفل میں فائدہ پر بات چلی تو فراق گورکھپوری نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک آدمی نے کسی بنیئے سے پوچھا کہ 'مرنے کے بعد جنت میں جانا پسند کروگے یا جہنم میں؟' بنیئے نے کہا "فائدہ جہاں زیادہ ہو"

دو چار جوتے بھی پڑے

فراق گورکھپوری، رام موہن رائے سیمنری، پٹنہ میں شرکت کے لیے آئے تھے مشاعرہ میں قریب دس ہزار کا مجمع تھا۔ فراق کو کافی داد مل رہی تھی اس لیے وہ پڑھے ہی جا رہے تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور کھڑے کھڑے وہ تھک گئے تو پڑھتے پڑھتے مائک کے پاس ہی وہ بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھنے کے بے ساختہ انداز پر سامعین کی ہنسی چھوٹ گئی۔ فراق نے برجستہ کہا ؎

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے!
دو چار جوتے بھی پڑے پھر بھی مناظر بیٹھ گئے

پہلو بہ پہلو

آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں کلام حیدری، شمیم فاروقی، ڈاکٹر عبدالخالق اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ فراق گورکھپوری کا ذکر آیا تو کلام حیدری کہنے لگے "میں محمود احمد ہنر کے ساتھ فراق سے ملنے گیا تھا۔ باتوں کے دوران وہ مجھ سے پوچھنے لگے "آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لیے بتائیے کہ میر کے پہلو بہ پہلو اردو کے کس شاعر کو کھڑا کیا جا سکتا ہے؟"

"اختیار مجھے دیا گیا ہے اس لیے میں خود کو کھڑا کر لیتا ہوں۔" کلام حیدری کا جواب تھا۔ فراق مسکرا کر رہ گئے۔

چائے نہ پینے کا نتیجہ

پروفیسر یوسف خورشیدی، رضوان احمد، ڈاکٹر امتیاز احمد، جمیل احمد، مناظر عاشق ہرگانوی اور کئی لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جمیل مظہری کا ذکر آیا تو یوسف خورشیدی نے بتایا "کلکتہ میں پروفیسر عبدالباری، علامہ جمیل مظہری اور کئی احباب مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باری اتفاق سے چائے نہیں پیتے تھے بلکہ اس سے نفرت کرتے تھے اور چائے نہ پینے والوں کو آزاد خطرناک آدمی سمجھتے تھے۔ جمیل مظہری نے مولانا سے پوچھا "پروفیسر باری اتفاق سے چائے نہیں پیتے ہیں۔ ان کے متعلق حضور کی

کیا رائے ہے؟"

مولانا آزاد مسکرا کر بولے "یہ خطرناک تو نہیں ہیں لیکن ایک گوشہ ان کے ذہن کا بہرحال خالی ہے۔ سو وہ جائے نہ پینے کا نتیجہ ہے۔"

فرانسیسی سے واقفیت

مشہور محقق قاضی عبدالودود کے یہاں ڈاکٹر عابد رضا بیدار، قاضی مسعود احمد اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو ابوالکلام آزاد پر ہو رہی تھی۔ قاضی عبدالودود صاحب نے بتایا "ایک بار ایک ڈنر میں ذاکر حسین بھی موجود تھے۔ کسی نے کھانے کے دوران کہا کہ آزاد فرانسیسی بھی جانتے تھے۔"

"جی ہاں، فرانسیسی سے واقف تھے۔" ذاکر حسین نے برجستہ جواب دیا۔ "لیکن ترجمہ کے ذریعہ سے۔"

ٹیلی ویژن کی بینائی

نسیم انہونوی، ابو محمد شبلی، رضوان احمد، مناظر عاشق ہرگانوی اور دو ایک حضرات نسیم بکڈپو لکھنؤ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اردو کی ابتدائی تعلیم پر باتیں ہونے لگیں تو نسیم انہونوی نے فرمایا "میرے گھر میں ایک لطیفہ ہوا۔ فہیم انہونوی بچپن سے انگلش اسکول میں تعلیم پاتے رہے۔ جب ذرا سیانے ہوئے تو اردو تعلیم کی طرف توجہ دی گئی۔ ان کے اردو سیکھنے کے دوران ایک بار گھر پر ان کے کچھ دوست ملنے آگئے۔ اتفاق سے گھر میں ناشتے کا سامان نہیں تھا۔ ان کے دوست ٹی وی دیکھنے لگے اور فہیم میاں نے نوکر کو میرے پاس دوڑایا۔ انھوں نے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا تھا:

"میرے چند دوست ٹیلی ویژن کی بینائی کرنے آئے ہیں۔ گھر میں رزق نہیں ہے۔ برسا بسکٹ فیکٹری سے کچھ بسکٹ خرید کر بھیج دیں۔"

متفنی اور ماشاء اللہ

اسی محفل میں نسیم انہونوی نے بتایا "فہیم میاں کو مقفیٰ اردو بولنے کی عادت ابتداء سے رہی ہے۔ اردو سیکھنے کے ابتدائی دور میں ایک بار وہ گھر سے گھبرائے ہوئے دفتر آئے اور مجھ سے کہنے لگے "امی جان کی طبیعت ماشاء اللہ بہت خراب ہے۔"

ایک بار ایک لالہ جی ملنے آئے تو فہیم انہونوی کہنے لگے "قبل سے تم متفنی تھے، بیماری میں اور متفنی ہوگئے ہو۔" منحنی کو وہ متفنی کہہ رہے تھے۔

تَبّت یَدَا

اسی محفل میں ابو محمد شبلی نے سنایا "مرزا محمد عسکری (مترجم تاریخ ادب اردو) کے ایک گہرے دوست مولوی مجیب اللہ فرنگی محلی تھے۔ وہ ایک فاضل، شاعر، بذلہ سنج اور آزاد طبیعت صوفی تھے۔ ایک مرتبہ ایک درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ درویش نے ان کا اسم گرامی دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ "قل ھو اللہ شاہ" ہے۔ جب شاہ صاحب نے صوفی کا نام پوچھا تو جواب دیا خاکسار کو "تبت یدا" کہتے ہیں۔

مضامین نو:۔ پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر صدیق مجیبی، پروفیسر حسن امام، پروفیسر ظفر سعید، پروفیسر شاداں یزدانی، مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرے لوگ بیٹھے پڑھے لکھے ہوؤں کی بات کر رہے تھے۔ صدیق مجیبی نے بتایا "ایک پروفیسر صاحب نے خلیل الرحمن اعظمی کے مجموعہ مضامین "مضامین نو" کو دیکھنے کے بعد کہا: "اس میں تیرہ مضامین ہیں لیکن نام لکھا ہے مضامین نو، کیسی فاش غلطی ہے۔"

تبصرہ از: اشفاق احمد

پر پرزے

مُصنّف: ڈاکٹر محمد اسد اللہ ★ قیمت: ۳۵ روپے
ملنے کا پتہ: معرفت ایم. آئی قاضی پلاٹ نمبر ۱۹ اخبا کالونی ناگپور ۱۳

علاقہ ودربھ کے مزاح نگاروں شکیل اعجاز، ڈاکٹر بانو سرتاج، شیخ رحمٰن اکولوی، رفیق شاکر، ہالو آبادی کے اور دیگر مزاح نگاروں کی ٹیم کے ساتھ ڈاکٹر محمد اسد اللہ بھی اردو ادب کے کینوس پر ابھر کر سامنے آئے اور پھر وقت کے ساتھ انشائیہ نگاری کی تحریک میں شامل ہو کر مزاح نگاروں کی بھیڑ سے علیحدگی اختیار کر کے برصغیر میں اپنی شناخت قائم کرلی۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں ان کے انشائیے ہندوستان اور پاکستان کے موقر جرائد میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ انشائیوں کا تاریخی و تنقیدی جائزہ پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ محمد اسد اللہ نے تحقیق کے علاوہ تنقید کے لیے بھی طنز و مزاح ہی کا میدان اپنایا۔ جمال ہم نشین کے ان کی پہلی تصنیف ہے جو ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب بوڑھے کے رول میں ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آئی جس میں ۱۴ انشائیے شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی تیسری کتاب "پر پرزے" اردو اکیڈمی مہاراشٹر کی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے "پر پرزے" میں طنزیہ مضامین ہیں کتاب کی ابتدا میں میاں چپاتی، ناک پور، ڈاکٹر صفدر اور مدحت الاختر کے مزاحیہ خاکے شامل ہیں۔ ناگپور شہر پر لکھا گیا خاکہ کچھ کمزور سا محسوس ہوتا ہے۔ "پر پرزے" کے دوسرے مضامین میں "پنگھٹ" جہاں اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں مصنف نے "پنگھٹ" کا پوسٹ مارٹم کیا ہے وہیں سماج میں بڑھتے ہوئے جرائم اور قانون کی بے بسی پر روشنی ڈالی ہے۔

"چوں کہ اس دور میں سزا تک پہنچنے کے لیے پکڑے جانے سے پہلے چوری کا ثابت ہونا اور چوری ثابت ہونے کے بعد مجرم کا پکڑا جانا ضروری ہے لہٰذا ان مراحل کے بغیر قانون کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہمارا قانون آج کل دن بہ دن شریف ہوتا جا رہا ہے۔ اور صرف شریفوں سے واسطہ رکھتا ہے۔ لہٰذا بچے لفنگے غنڈے جرائم پیشہ عناصر ان کے لیے نامحرم کا درجہ اختیار کرتے جارہے ہیں۔"

(پنگھٹ)

کتاب میں ایک انشائیہ ہے "جوتے" جس میں سماج کے ان ٹھیکیداروں پر جوتے برسائے گئے ہیں جو

شرافت کا چولا بدل کر برائیاں پھیلانے والوں میں برابر کے شریک ہیں۔

"بالتحقیق" میں مصنف نے تحقیق کے میدان میں ہونے والی دھاندلیوں کے بارے میں بتایا ہے اور اس کا سلسلہ فسادات پر بٹھائے گئے کمیشن سے ملا کر ان کا بھی مذاق اڑایا ہے۔

مہمانوں کے متعلق اردو میں کئی مزاحیہ مضامین لکھے گئے ہیں لیکن اسداللہ کے قلم سے لکھا گیا انشائیہ "مہمانوں کا سیلاب" میں مصنف نے نہ صرف مہمان بلکہ میزبان کو بھی طنز کا نشانہ بنایا رسم ورواج کو بھی آڑے ہاتھوں لیا آخر میں مصنف خود انسانوں کو بھی ایک مہمان کے روپ میں دیکھتا ہے جو دنیا میں چند دنوں کا مہمان ہے مگر اس بن بلائے مہمان کا کیا حال ہے۔ مصنف کی زبانی سنیئے:

"اس دنیا میں انسان بذاتِ خود ایک بن بلایا مہمان ہے اور وہ بھی اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ جب تک اس کا دانہ پانی موجود ہے وہ یہاں سے ٹلنے والا نہیں خواہ اُسے دھتکار کر ہی کیوں نہ نکالا جائے چنانچہ اب آدمی تلاش روزگار میں لوکل ٹرین اور سٹی بس کے دھکے کھاتا ہے اور بے ٹکٹ جیتا ہے آج کل دانے دانے ہی پر نہیں بس اور ٹرین کے دھکوں پر بھی ہمارا نام لکھا ہوا ہے۔"
(مہمانوں کا سیلاب)

"پرُ پرزے" کے دوسرے انشائیوں میں "لوٹ" "پاکٹ"، "جیب ہے تو جہاں ہے پیارے" کے علاوہ "قرض کی شان میں" ایسے مضامین ہیں جن کا تعلق روپے پیسے سے ہے خاص بات یہ ہے کہ ایک ہی موضوع سے تعلق رکھنے والے ان انشائیوں میں مصنف نے کسی بات کو دہرایا نہیں ہے ایسا لگتا ہے یہ تمام مضامین مصنف نے مالی پریشانی کے زمانے میں لکھے ہیں۔
مصنف کی دوسری کتاب "بوڑھے کے رول میں" کی زبان دقیق اور مشکل تھی اس کے مقابلے میں "پرُ پرزے" کو عام قاری سمجھ سکتا ہے مجموعی اعتبار سے تمام انشائیے دھاکے معیاری ہیں کتاب کا مقدمہ مشہور مزاح نگار یوسف ناظم نے لکھا ہے۔

سرورق دیدہ زیب عمدہ کتابت اور بہترین کاغذ کے ساتھ کتاب کی قیمت ۲۵ روپے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ▫▫

غیر ملکی:

نوح ناروی کسی مشاعرہ میں جب غزل پڑھ کر خوب داد حاصل کر چکے تو ایک مشہور حاکم جو مشاعرہ کے صدر بھی تھے اُن سے کہنے لگے۔
"حیرت ہے نوح صاحب! آپ غیر ملکی ہو کر اردو زبان میں ایسے اچھے شعر کہہ لیتے ہیں؟"
غیر ملکی ——؟
نوح صاحب پریشان ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگے۔
"جی ہاں —! نوح ناروی ہیں نا آپ؟ ناروی یعنی ناروے کے رہنے والے۔"

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

۱۹۹۷ء میں شگوفہ کے تین خصوصی شمارے شائع ہوئے۔ سالنامہ، ۲۵ سالہ نثری انتخاب اور سوو ینیر ـــ سالنامہ ۹۷ء جنوری فروری کا مشترکہ شمارہ تھا۔ لیکن ۱۹۹۸ء کا زیر نظر سالنامہ ماضی کی روایتوں پر عمل کرتے ہوئے جنوری ہی میں شائع کیا جارہا ہے ـــ اس طرح شگوفہ بڑے عزم اور اعتماد کے ساتھ اپنی عمر کے ۳۰ ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے ـــ مارچ ۹۸ء کے مہینہ میں نثری انتخاب کا دوسرا حصّہ شائع ہوگا۔ سپٹمبر ۹۷ء میں شائع شُدہ نثری انتخاب میں مختلف وجوہات کی بنا پر بعض اہم نثر نگاروں کے مضامین شائع نہیں ہو سکے تھے ایسی تمام تخلیقات مارچ کے شمارہ میں شامل رہیں گی ـــ

اِس سال ہمارا اِرادہ ہے کہ نامور مزاح نگار وجاہت علی سندیلوی کی یاد میں ایک شمارہ شائع کریں نیز ہم عصر طنز و مزاح نگاروں کے فکر و فن پر بھی خصوصی توجہ کی جائے گی۔ نئے لکھنے والوں کو متعارف کرنے کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ دراصل طنز و مزاح ہی نہیں اردو زبان کے فروغ و ارتقاء کا یہ سب سے اہم کڑی ہے ہیں اُمید ہے کہ قلمی معاونین اور قارئین کے تعاون سے طنز و مزاح کے واحد عالمی جریدہ کی حیثیت سے ہم شگوفہ کو صوری و معنوی اعتبار سے خوب سے خوب تر بنانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

ـــ قارئین کرام کی خدمت میں نئے سال
اور عید کی دلی مُبارکباد

I. P. F. SYSTEMS

HYDERABAD

WITH
BEST
COMPLIMENTS
FROM

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۱ شمارہ ۲

فبروری ۱۹۹۸ء

قیمت فی پرچہ ۱۵ روپے

زر سالانہ : ۱۳۰ روپے

بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔۱

فون (آفس) 595716

فون (رہائش) 4576064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

دِلاور فگار ــــــ خراجِ عقیدت

مالِ مفت ــــ (اِنشایئے)

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

چُورن (منظومات)

نام	دلاور حسین
تخلص	دلاور فگار
ولد	شاکر حسین
پیدائش	۸ جولائی ۱۹۲۹ ۔ بمقام بدایوں (یوپی)
اولاد	ایک لڑکی، مسز نگار راشد ۔
تعلیم	ایم۔اے اردو، آگرہ یونیورسٹی یم۔اے۔معاشیات، آگرہ
مجموعہ کلام	ستم ظریفیاں، شامت اعمال، آداب عرض انگلیاں فگار اپنی، از سرنو، مطلع عرض ہے خدا جھوٹ نہ بلوائے
انتقال	جنوری ۱۹۹۸۔

خطبہ صدارت (مشاعرہ حیدرآباد دکن)

یہ خطبہ صدارت دلاور فگار نے "زندہ دلان حیدرآباد" کے زیراہتمام منعقدہ آل انڈیا مزاح نگاروں کی کانفرنس کے جلسہ نظم میں بمقام حیدرآباد (دکن) بتاریخ ۱۵ مئی ۱۹۶۶ء پڑھا

اے زندہ دلان حیدرآباد
اے دیدہ وران حیدرآباد

اے شہر غزل کے شہر یارو
اے ملک ادب کے تاجدارو

اے ارض دکن کے خوش دماغو
اے بزم کے خوشنما چراغو

اے زمِ جہاں کے خوش نصیبو
اے عالمو، شاعرو، ادیبو

اے شعر و سخن کے نکتہ چینو
اے، علم و ادب کے نبض بینو

اے خوش نظرو، جواں خیالو
اے دیدہ ورو، نگاہ والو

اے عالمو، اے ادب نوازو
بیمار ادب کے چارہ سازو

ذروں کو قمر بنانے والو
فانی کو امر بنانے والو

بلوا کے ظریف شاعروں کو
معقول و شریف شاعروں کو

تم نے جو مشاعرہ کیا ہے
جدت کا مظاہرہ کیا ہے

یہ طنز و مزاح کے سپاہی
یہ جادہ پر خطر کے راہی

یہ وہ ہیں کہ جنکی قدر ہے کم
اردو کے خدا ہیں ان سے برہم

ناقد نے انہیں حقیر سمجھا
داتا نے انہیں فقیر سمجھا

باپوں نے انہیں کپوت سمجھا
پنڈت نے انہیں اچھوت سمجھا

اکبر جو نہ ان کا ساتھ دیتے
لوگ ان کا تو نام بھی نہ لیتے

تم نے جو انہیں طلب کیا ہے
انصاف کا کام اب کیا ہے

تم نے انہیں وقت پر پکارا
ممنون کرم ہوں میں تمہارا

یہ زندہ دلی ہے قابل داد
اے زندہ دلان حیدرآباد

لیکن مجھے تم سے اک گلا ہے
ہمرہ خوشی کے غم ملا ہے

پکڑا ہے مجھے پئے صدارت
ہے یہ بھی تمہاری اک شرارت

اس عالم رنگ و بو کی رونق
مجھ سے بھی بڑے تھے بعض احمق

کیوں صدر انہیں نہیں بنایا ؟
انصاف کا خون کیوں بہایا

اس جلسہ پر مزاح کا صدر
ہوتا کوئی پیر بانی غدر

یا کوئی سفیر الیر ہوتا
یا کوئی امیر ومیر ہوتا

یا کوئی سخن شناس نیتا
جو شعر غلط کی داد دیتا

یا کوئی خدا کا نیک بندہ
جو داد کے ساتھ دیتا چندہ

یا کوئی بزرگ وقت دیدہ
یا کوئی بھی کینٹ رسیدہ

میں صدر تو ہوں مگر نیا ہوں
یوں کہئے کہ آج پھنس گیا ہوں

کیوں نام میرے ہے قرعہ فال
کیا اتنے برے تھے میرے اعمال

فرماتے یہ ہیں جناب حیرت
" شاعر ہو ، تمہیں اگر ہو غیرت

ظاہر کرو نظم میں کمالات
خطبہ ہو ، جو نظم میں تو ہے بات

لکھتے ہیں مجھے کہ میرے پیٹے
تم صدر نہیں کسی سے ہیٹے

امید ہے فرض جان لوگے
جو حکم دیا ہے مان لوگے

چکرا گیا میں یہ حکم سن کر
" فانوس خیال بن گیا سر "

کچھ پاس و خیال حکم حیرت
کچھ اپنے کئے ہوئے کی غیرت

خطبہ تو ہے کچھ نہ کچھ ضروری
اک رسم تو ہو ہی جائے پوری

مشکل یہ ہے وقت بے تکا ہے
خطبہ پہ مشاعرہ رکا ہے

تقریر کا یہ محل نہیں ہے
خطبہ ہے کوئی غزل نہیں ہے

خطبہ کہ ہے آج فرض مجھ پر
لکھتا ہوں خدا کا نام لیکر

کچھ دیر دلوں پر جبر کیجئے
ہوں بور اگر تو صبر کیجئے

اے طنز و مزاح کے رفیقو
تم راہی راہ پر خطر ہو

تم بار گراں اٹھا رہے ہو
لوہے کی کماں جھکا رہے ہو

یوں بزم میں قہقہے لگاؤ
خوابیدہ جو ہیں انہیں جگاؤ

اس طرح ہنسو کہ زخم دھل جائیں
منہ بند رہے اور آنکھیں کھل جائیں

مقصود ادب نہیں ہنسانا
شاعر نہیں بھانڈ یا زنانا

جعفر کے کلام پر نہ جاؤ
سودا کے مقام پر نہ جاؤ

جعفر کا سماج مختلف تھا
سودا کا مزاج مختلف تھا

غالب کی نگاہ مختلف ی
اقبال کی راہ مختلف تھی

اکبر نے جو کچھ بجا تھا
لیکن وہ زمانہ دوسرا تھا

اب رنگ جہاں بدل گیا ہے
ہر پیرو جواں بدل گیا ہے

بوسیدہ روایتوں کو توڑو
پارینہ حکایتوں کو چھوڑو

ہوتا ہے ہر اک بات کا د ر
یہ دور ہے طنزیات کا دور

ہرگز نہ کرو کسی کی تقلید
فطرت نہیں چاہتی ہے تجدید

تخریب نہیں ادب کا مقصد
شاعر نہ بنو بہ نیت بد

ہیومر میں ابھی بقول شخصے
نثر آگے ہے اور نظم پیچھے

آؤ کر چلیں قدم اٹھاکر
تیشوں کی طرح قلم اٹھاکر

یہ طنز و مزاح کے مزائل
بیکار نہ جانے پائیں زائل

آؤ کہ ادب سے کام لیں ہم
گرتے ہوئے فن کو تھام لیں ہم

دلاور فگار

"مصرع سکڑ گیا"

سکتہ تھا ایک شاعر اعظم کے شعر میں
یہ دیکھ کر تو میں بھی تعجب میں پڑ گیا
پوچھی جو اس کی وجہ تو کہنے لگے جناب
سردی بہت شدید تھی ، مصرع سکڑ گیا

"بیل گاڑی"

اک بڑے افسر کو کل اک حادثہ پیش آگیا
بیل گاڑی لڑ گئی صاحب کی موٹر کار سے
کار کی اسپیڈ تو زیرو تھی صاحب کے بقول
بیل گاڑی جارہی تھی ساٹھ کی رفتار سے

"افلاس"

وہ بری چیز ہے افلاس کہ اللہ بچائے
اچھے اچھوں کا برا حال بنا دیتا ہے
کبھی قوالوں سے کہتا ہے کہ شاعر بن جاؤ
شاعروں کو کبھی قوال بنا دیتا ہے

"شاعر"

اللہ میاں نے فورڈ کو تاجر بنا دیا
نہرو کو پالیٹکس کا ماہر بنا دیا
ہر شخص کو بنایا وہ جو کچھ بھی بن سکا
جو کچھ نہ بن سکا اسے شاعر بنا دیا

"رشوت"

حاکم رشوت ستاں فکر گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آسان صورت چھوٹ جا
میں بتاؤں تجھ کو تدبیر رہائی ، مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے ۔ دے کے رشوت چھوٹ جا

دلاور فگار

شاعر اعظم

کل اک ادیب و ناقد و شاعر ملے ہمیں
کہنے لگے کہ آؤ ذرا بحث ہی کریں

کرنے لگے یہ بحث کہ اب ہندو پاک میں
وہ کون ہے کہ شاعر اعظم جسے کہیں

میں نے کہا جگر تو کہا ڈیڈ ہوچکے
میں نے کہا کہ جوش کہا قدر کھوچکے

میں نے کہا فراق کی عظمت پہ تبصرا
بولے فراق شاعر اعظم ارا ررا

میں نے کہا کلام روش لاجواب ہے
کہنے لگے کہ ان کا ترنم خراب ہے

میں نے کہا ترنم انور پسند ہے
کہنے لگے کہ ان کا وطن دیوبند ہے

میں نے کہا کہ ساحر و مجروح وجاں نثار
بولے کہ شاعروں میں نہ کیجئے انہیں شمار

میں نے کہا شکیل تو بولے کہ نغمہ ساز
پوچھا قتیل بولے کہ بے جا ہے ان کو ناز

میں نے کہا کہ ساغر وآزاد بولے نو
میں نے کہا رئیس تو بولے کہ قطعہ گو

میں نے کہا کہ فیض تو بولے کہ بور بور
میں نے کہا ندیم تو کہنے لگے کہ چور

میں نے کہا خمار کہا فن میں کیا ہے
میں نے کہا کہ شاد تو بولے کہ بچا ہے

میں نے کہا قمر کا تغزل ہے دلنشیں
کہنے لگے کہ ان میں تو کچھ جان ہی نہیں

میں نے کہا کہ شاعر اعظم ہیں کیا نشور
بولے کہ انکے شعر ہیں فہم بشر سے دور

میں نے کہا حفیظ تو بولے کہ تندخو
میں نے کہا کہ عرش تو بولے کہ بدگلو

میں نے کہا عدم کے یہاں اک تلاش ہے
بولے کہ شاعری انہیں وجہ معاش ہے

میں نے کہا نیاز تو بولے کہ عیب ہیں
میں نے کہا سرور تو بولے کہ نکتہ چیں

میں نے کہا ظریف تو بولے کہ گندگی
میں نے کہا سلام تو بولے کہ بندگی

میں نے کہا فنا بھی بہت خوش کلام ہیں
بولے کہ راہ نظم میں کچھ سست گام ہیں

میں نے کہا کہ یہ جو ہیں محشر عنایتی
کہنے لگے کہ آپ ہیں ان کے حمایتی

میں نے کہا کچھ اور تو بولے کہ چپ رہو
میں چپ رہا تو کہنے لگے اور کچھ کہو

میں نے کہا کہ یہ جو دلاور فگار ہیں
بولے کہ وہ تو طنز و ظرافت نگار ہیں

میں نے کہا کہ طنز میں اک بات بھی تو ہے
بولے کہ اس کے ساتھ خرافات بھی تو ہے

میں نے کہا کہ فرقت و شہباز و جعفری
بولے یہ لوگ شاعر اعظم ہٹاؤ بھی

میں نے کہا تو کس کو میں شاعر بڑا کہوں
کہنے لگے کہ میں بھی اسی کشمکش میں ہوں

پایان کار ختم ہوا جب یہ تجزیہ
میں نے کہا ۔ حضور ۔ تو بولے کہ شکریہ

عشق کا پرچہ

دلاور فگار

محوِ حیرت ہوں کہ وہ سیٹر تھا کتنا باکمال
ایسے ہی سیٹر اگر دو چار پیدا ہو گئے
عام ہوگی عاشقی کالج کے ارض وطول میں
عشق کے آداب لڑکوں کو سکھائے جائیں گے
عاشقوں کو علم میں پرفیکٹ سمجھا جائے گا
امتحان ہوگا تو پوچھے جائیں گے ایسے سوال
عشق اک سائنس ہے آرٹ؟ سمجھا کر لکھو
آج اپنے ملک میں عاشق ہیں کتنے فیصدی
کیا تعلق طب یونانی کو ہے رومان سے
عشق کتنے قسم کا ہوتا ہے؟ لکھو باوثوق
ایک تحقیقی مقالہ لکھ کے سمجھاؤ یہ بات
کچھ مثالیں دے کے سمجھاؤ یہ قول مستند
سر کو کیا نسبت ہے سنگ آستان یار سے
کیا سکوں ملتا ہے دل کو آہ شعلہ بار سے
اپنے اندازہ سے طول شام تنہائی بتاؤ
انڈیا کا ایک نقشہ اپنی کاپی پر بناؤ
وصل کی درخواست پر کس کی سفارش چاہئے
اپنی محبوبہ کو ایک درخواست انگلش میں لکھو
کون سے آلے سے دیکھیں حسنِ جاناں نہ لکھو
مادر لیلی نے تو لیلیٰ نہ بیاہی قیس کو
ایک عاشق تین دن میں چلتا ہے انیس میل

عشق کے بارے میں پوچھا جس نے پرچہ میں سوال
دیکھنا اس ملک میں فن کار پیدا ہو گئے
لیلیٰ و مجنوں نظر آئیں اب اسکول میں
غیر عاشق جو ہیں وہ عاشق بنائے جائیں گے
عشق اک کمپلسری سبجیکٹ سمجھا جائے گا
اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال
یا یہ دونوں عشق کا ہیں پارٹ سمجھا کر لکھو،
منتہی ان میں ہیں کتنے اور کتنے مبتدی
کمپئر فرہاد و مجنوں کو کرو لقمان سے
فی زمانہ کیا ہیں عاشق کے فرائض اور حقوق
شاخ آہو پر ہی کیوں رہتی ہے عاشق کی برات
"عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود"
تم نے سر پھوڑا کبھی معشوق کی دیوار سے
گرم نالے عرش پر جلتے ہیں کس رفتار سے
صرف تخمیناً شبِ ہجراں کی لمبائی سے
اور پھر اُس میں حدود کوچۂ جاناں دکھاؤ
عشق کے پودے کو کتنے انچ بارش چاہئے
اس سے یہ پوچھو جواب آرزو نیس ہے کہ نو
حسن کی مقدار جو ناپے، وہ پیمانہ، لکھو
تم اگر لیلیٰ کی ماں ہوتے تو کیا کرتے لکھو
تین عاشق کتنے دن میں جائیں گے اڑتیس میل

آپ کر سکتے ہیں ان میں سے کوئی بارہ سوال
بدخطی کے پانچ نمبر ہیں، رہے یہ بھی خیال

دلاور فگار

اسٹوڈنٹ کی دُعا

(روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
فلم میں میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
زندگی ہو مری 'نوشاد' کی صورت یا رب
ہو مرا کام بزرگوں کو نصیحت کرنا
میرے اللہ پڑھائی سے بچانا مجھ کو
'مغلِ اعظم' و 'برسات' دکھانا مجھ کو
عمر بھر مست رہوں کھاؤں پیوں عیش کروں
شوق کی تشنہ لبی کچھ تو بجھا دے مالک
کیا کروں گا میں یہ تعلیم کی دولت پا کر
علم کی دولت ارزاں مرے قابل ہی نہیں
مجھ سے انگلش نہیں چلتی اسے ایزی کر دے
مجھ سے بالجبر کہا جاتا ہے "پڑھ الجبرا"
کیوں سبق یاد کروں کیوں یہ مصیبت جھیلوں
اب کے نیّا کو مری پار لگا دے مولیٰ
کیسے آسان ہوں یہ دشوار سے مضمون بتا
کم سے کم اتنی خوشی میرے مقدّر میں ہو
پارک میں سیر کروں۔ ستلج۱ کی موجوں میں بہوں

زندگی کھیل میں غارت ہو خدایا میری
متوجہ مری جانب 'مدھوبالا' ہو جائے
فلم کی شمع سے ہو مجھ کو محبّت یا رب
سٹھ گئے ہوں جو بزرگ ان کی مرمت کرنا
نیک جو راہ ہو اُس پر نہ چلانا مجھ کو
"پرتھوی راج" و "دوانند" بنانا مجھ کو
چیک تو مجھ کو دلا دے میں انھیں کیش کروں
کم سے کم جلوۂ ٹن ٹن ہی دکھا دے مالک
میرے اللہ بنا دے مجھے جانی واکر
جس سے تعمیر ہو "عالم" کی یہ وہ گل ہی نہیں
بلکہ ممکن ہو تو اُردو کو بھی ہندی کر دے
اس پہ تاکید کہ فریاد نہ کر۔ مت گھبرا
کیوں نہ تفریح کروں، کیوں نہ کریکٹ کھیلوں
امتحان میں پروموشن ہی دلا دے مولیٰ
پاس ہو جاؤں جسے کھا کے وہ معجون بتا
میں جو گنجی سے رٹوں بس وہی پیپر میں ہو
اور اٹینڈنس۲ رجسٹر میں پریزنٹ۳ رہوں

میری بگڑی ہوئی تقدیر بنا دے مالک
نقل کرنے کی تدابیر بتا دے مالک

۱؎ ایک دریا کا نام ۲؎ ATTENDANCE (حاضری) ۳؎ PRESENT (حاضر)

دلاور فگار

غزلیں

اک دوات، ایک قلم ہو تو غزل ہوتی ہے
جب یہ سامان بہم ہو تو غزل ہوتی ہے

جو بھی کچھ دل پہ گزرتی ہے وہ ٹی وی کے لئے
رقم ملتے ہی رقم ہو تو غزل ہوتی ہے

مفلسی، بھوک، مرض، عشق، بڑھاپا، اولاد
دل کو ہر قسم کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے

تندرستی بھی ضروری ہے تغزل کے لئے
ہاتھ اور پاؤں میں دم ہو تو غزل ہوتی ہے

بھوت، آسیب، شیاطین، اَجنّہ، ہمزاد
ان بزرگوں کا کرم ہو تو غزل ہوتی ہے

پونچھ کتے کی جو ٹیڑھی ہو تو کچھ بھی نہ بنے
اور تیری زلف میں خم ہو تو غزل ہوتی ہے

صرف ٹھرے سے تو قطعات ہی ممکن ہیں فگار
ہاں اگر وسکی و رم ہو تو غزل ہوتی ہے

○

وطن والو! یہ مصنوعی گرانی دیکھتے جاؤ
کہ سستا ہے لہو، مہنگا ہے پانی دیکھتے جاؤ

وہ شئے جس کے لئے جنت کو ٹھکرایا تھا آدم نے
وہ شئے پھر ہو گئی خلد آشیانی دیکھتے جاؤ

جنھیں روٹی نہیں ملتی وہ دس بچوں کے والد ہیں
یہ افلاس اور یہ جوشِ جوانی دیکھتے جاؤ

ہر اک والد یہاں مثلِ مصوّر ہم سے کہتا ہے
کہ بعدِ نقشِ اول، نقشِ ثانی دیکھتے جاؤ

غریبوں کے لئے راشن، امیروں کے لئے خرمن
مگر مارے گئے ہم درمیانی دیکھتے جاؤ

فگار اس دور میں بھی طنزیہ اشعار کہتا ہے
تم اِس شاعر کی آشفتہ بیانی دیکھتے جاؤ

★

خامہ بگوش

اُن کے کلام سے محظوظ ہونے کے لیے

ذہن پر زور نہیں ڈالنا پڑتا

"ایک ایسے زمانے میں جب شاعری ایک غیر سنجیدہ عمل بن چکی ہے، دلاور فگار کی شاعری پر مزاحیہ شاعری کا لیبل لگانا کچھ عجیب سی بات ہے۔ ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے بیشتر شعراء جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ اگر صدفی صد مزاح نہیں ہے تو مزاح سے ملتی جلتی کوئی چیز ضرور ہے، اسے پڑھتے ہوئے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اس کے برعکس دلاور فگار کی "مزاحیہ" شاعری میں سنجیدگی کا عنصر کچھ اتنا زیادہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ خاص طور پر بعض شاعروں کے مجموعوں پر انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں، انہیں پڑھ کر دو مرتبہ آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان شاعروں کے احترام میں جن کے مجموعوں پر یہ نظمیں لکھی گئی ہیں اور دوسری مرتبہ خود دلاور فگار سے اظہارِ ہمدردی کے لیے کہ انہیں کیسے کیسے نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"خدا جھوٹ نہ بلوائے" یہ اقتباس ہماری کسی تحریر کا نہیں ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی کا نتیجۂ فکر ہے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ دلادر فگار کا نیا مجموعۂ کلام شائع ہونے والا ہے تو انہوں نے یہ رائے لکھ کر ہمارے حوالے کی اور فرمایا، دلاور فگار اگر چاہیں تو اس رائے کو اپنے مجموعے کے فلیپ پر شائع کر سکتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا۔ "دلاور فگار اُن شاعروں میں سے نہیں ہیں جو اپنے کلام کے لیے کسی کے سرٹیفکیٹ کے محتاج ہوں۔ وہ خود رائے اور خود کفیل شاعر ہیں۔ وہ اپنے کلام کے بارے میں خود ہی اچھی رائے رکھتے ہیں، اس لیے کسی دوسرے کی رائے کو وہ اہمیت نہیں دیتے۔" لاغر صاحب نے جواب دیا۔ "آپ ان سے بات تو کیجیے، شاید انہیں یہ رائے پسند آجائے۔"

اس سے پہلے کہ ہم دلاور فگار سے بات کرتے، ان کا نیا مجموعۂ کلام "خدا جھوٹ نہ بلوائے" شائع ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے لاغر صاحب کی رائے اپنے کالم میں جھونک دی۔ اس لیے نہیں کہ ہم ان سے متفق ہیں بلکہ اس لیے کہ ہمیں ان کی رائے سے سخت اختلاف ہے۔ اوّل تو یہی بات درست نہیں کہ آج کل شاعری ایک غیر سنجیدہ عمل بن چکی ہے۔ ہمارے خیال میں موجودہ دور میں شاعری نام کی کوئی چیز سرے سے موجود نہیں۔ جب کوئی چیز موجود ہی نہ ہو تو اس کے سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ آج دیوان کثرت سے شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن ان دیوانوں میں عمدہ کاغذ، روشن کتابت اور مصنف کی تصویر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ کاغذ کتابت اور مصنف کی تصویر کو شاعری نہیں سمجھا جا سکتا۔

جناب لاغر کی اس بات سے بھی ہمیں شدید اختلاف ہے کہ دلاور فگار کی مزاحیہ شاعری میں سنجیدگی کا عنصر اتنا زیادہ

ہوتا ہے کہ اُسے پڑھ کر ہنسی کے بجائے رونا آتا ہے۔ ہمیں لاغر صاحب کی سخن فہمی پر رونا آرہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے لاغر صاحب نے دِلاور فگار کی نظموں کے صرف عنوانات پڑھے ہیں، نظمیں نہیں پڑھیں، ورنہ رائے قائم کرنے میں وہ اتنے بغر محتاط نہ ہوتے "بمبئی" "رامپور" اور "حمید نظامی" جیسے عنوانات کو دیکھ کر لاغر صاحب نے سمجھا ہوگا کہ دلاور فگار شاعری سے مذاق فرماتے ہیں۔ کاش لاغر صاحب کو معلوم ہوتا کہ شاعری عنوانات میں نہیں، عنوانات کے نیچے ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ دِلاور فگار نے کچھ کتابوں پر منظوم تبصرے لکھے ہیں جن میں کتابوں اور شاعروں کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ لاغر صاحب کو اس پر اعتراض شاید اس لیے ہے کہ دلاور فگار نے تعریف میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ لاغر صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ اعتراض کا نہیں تعریف کا محل ہے۔ دلاور فگار داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسی کتابوں اور شاعروں میں بھی خوبیاں تلاش کرلیں جن میں کسی دوسرے کو کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

دلاور فگار کا تازہ مجموعہ کلام (خدا جھوٹ نہ بلوائے) اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ مجموعہ ہمیں بے حد پسند آیا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ سامنے کی باتوں کو نہایت شگفتہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے ہمیں اپنی کم علمی کا احساس نہیں ہوا۔ ہمیں وہ شاعری پسند نہیں جس سے محظوظ ہونے کیلئے علم و فضل کا سہارا لے کر غور و فکر کرنا پڑے۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ شعر وہی ہے جو سنتے ہی دل میں اُتر جائے گویا شاعر اور قاری دونوں کو ذہن پر زور نہ ڈالنا پڑے۔

یہ جو ہم نے عرض کیا ہے کہ دِلاور فگار سامنے کی باتوں کو نہایت شگفتہ انداز میں پیش کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے موضوعاتِ سخن غیر اہم ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جن باتوں کو سن کر ہم اور آپ نظر انداز کردیتے ہیں، دلاور فگار ان سے ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے ہیں کہ ان کے ذہن کی رسائی پر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ کچھ عرصے بعد انسانی بیماریوں کے علاج کے لیے دواؤں کی بجائے موسیقی سے کام لیا جائے گا۔ دلاور فگار نے اس خبر سے متاثر ہو کر جو نظم لکھی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

اک محقق نے نئی تحقیق فرمادی ہے آج ؎ فنِ موسیقی سے بھی ممکن ہے انسانی علاج
اب مداوائے مرض ہوگا نئے انداز سے ؎ اب ہوالشافی کی آواز آئے گی ہر ساز سے
تھرما میٹر کی جگہ منہ میں لگا کر بانسری ؎ ڈاکٹر دیکھے گا کیا حالت ہے اب بیمار کی
اس کو کہتے ہیں خدا کی دین، یہ ہوتی ہے دین ؎ اب سول سرجن بنے گا جانشینِ تان سین
اب تو اخباروں میں شائع ہوں گے ایسے اشتہار ؎ جملہ امراضِ خصوصی کی دوا طبلہ ستار

اس قسم کی بے شمار نظمیں زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ سماجی اور قومی مسائل پر بھی دلاور فگار نے خوب لکھا ہے۔ ان مسائل پر لکھتے ہوئے، وہ مزاح کے دائرے سے نکل کر طنز کی وادی میں آنکلتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے ہاں طنز سے زیادہ مزاح ملتا ہے لیکن طنز جتنا بھی ہے اور جیسا بھی ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ مثال کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، ان کا یہ مصرع ؎

لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا

ضرب المثل بن چکا ہے۔

دِلاور فگار کی بیشتر مزاحیہ تخلیقات کا "مواد" ادب سے حاصل کیا گیا ہے۔ ادبی موضوعات پر انھوں نے بے شمار

نظمیں لکھی ہیں اور ایسے ایسے پہلوؤں پر لکھی ہیں کہ اہلِ ادب کی تمام بے ادبیاں سامنے آجاتی ہیں۔ شاعر کیا کرتے ہیں، نقاد کیا نہیں کرتے، مشاعروں میں کیا ہوتا ہے، شاعری کس طرح وجود میں آتی ہے، تشاعر کسے کہتے ہیں۔ اِس قسم کے بہت سے موضوعات پر دلاور فگار نے خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ اس نوعیت کی نظموں میں سب سے عمدہ وہ ہے، جس میں ایک متشاعر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ شادی کی محفل میں وہ اس قسم کے شعر پڑھتا ہے

روئے حسیں پہ سہرے سے کیسی بہار ہے ؛ اے موت آ بھی جا کہ تیرا انتظار ہے

کسی کی موت پر مرثیہ لکھتا ہے، تو وہ اس قسم کے شعروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

پیارے میاں چلے کہ نقصان کو لے چلی ؛ اچھا ہے خاندان کے سر سے قضا ٹلی

زیرِ نظر مجموعے میں چند غزلیں بھی ہیں۔ چند شعر سنیئے ؎

لے کر برات کون سپر ہائی وے پہ جائے ؛ ایسی بھی کیا خوشی کہ سڑک پر وصال ہو

وہ شے جس کے لیے جنت کو ٹھکرایا آدم نے ؛ وہ شے پھر ہو گئی خلد آشیانی دیکھتے جاؤ

ناپ کر دیکھا تو قد میں کچھ درازی آگئی ؛ تول کر دیکھا تو ہر انسان آدھا رہ گیا

۵۵

یوسف ناظم

ایک غیر مقیم ہندوستانی کا سفر نامہ

ویسے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ غیر مقیم ہندوستانی کی پہلے کوئی شناخت نہیں تھی۔ اب بیرونِ دریا موجیں بھی موج ہی کہلاتی ہیں۔ غیر مقیم ہندوستانیوں نے ایک دوسرے سے الگ رہ کر بھی ایک قوم کی شکل اختیار کرلی ہے اور یہی ایک قوم ہے جو ہندوستانی ہونے کے باوجود متحد ہے۔ اصل میں اس پر اب تک کسی کا سایہ نہیں پڑا ہے۔ جب میں یہاں سے باہر گیا تھا تو بہت نوجوان تھا۔ میری تو مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں۔ مجھے یاد ہے اُن دِنوں یہاں اِس عمر کے لڑکوں کے لیے جو الفاظ محاوروں کے نام سے استعمال ہوتے تھے ان میں یہ دو محاورے بہت مشہور تھے! ابھی تو اُس کی مسیں بھی نہیں بھیگی ہیں اور میں سوچتا تھا کہ یہ مسیں یعنی "میڈمات" یہاں کہاں سے آگئیں اور دوسرا محاورہ تھا سبزہ آغاز ہونے کے تعلق سے ۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے غالب کو پڑھتا رہا ہوں۔ جب بھی یہ محاورہ سُنتا غالب کا مصرع ذہن میں کلبلانے لگتا کہ اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب۔ اور جب کبھی اس محاورے کے ساتھ کوئی چہرہ سامنے آتا میں ضرور گنگناتا کہ اُگ رہا ہے لب و رخسار پہ سبزہ یارب۔ لیکن دل ہی دل میں ۔ ہندوستان اُن دنوں صرف مشرق تھا بالکلیہ مشرق۔ انگریز یہاں ضرور تھے لیکن اپنے اپنے کاموں میں مشغول ۔ (اِن کاموں کی تفصیل بہت زمانے بعد معلوم ہوئی) اب تو مجھے باہر رہتے ہوئے پانچ سے بھی زیادہ دہائیاں گزر چکی ہیں۔ جب وطن عزیز سے انگریز رخصت ہوئے میں باہر ہی تھا۔ بعد میں دو چار مرتبہ ہندوستان ضرور آیا لیکن حالات کی برق رفتاری نے نہ تو سنبھلنے دیا نہ کچھ سمجھنے دیا۔ غالب کو بھول گیا اقبال یاد رہے اور زبان پر یہی مصرع رہا مجھے حیرت ہوئی کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ اُن کے شاگردِ رشید داغ بھی اکثر یاد آئے وہ کہا کرتے تھے

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے ؛ چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے

برسوں یہاں فسادات ہوتے رہے۔ ہم غیر مقیم ہندوستانی۔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر آپس میں جب ملتے اور یہاں کی خبریں پڑھتے تو ایسا محسوس ہوتا ہر کسی کی جیب میں علی گڈھ کے تالے موجود تھے جو اس نے اپنے منہ پر لگا لیئے ہیں۔ (مغربی ملکوں میں اظہارِ افسوس کے لیے یہی طریقہ مستحسن مانا گیا ہے وہاں لوگ کسی کے گھر تعزیت کے لیے جاکر ہفتوں مہمان بن کر نہیں ٹھیر جاتے)۔ یہاں لوگ اب تھک گئے ہیں اور قومی یک جہتی کے موضوع پر باتیں

کرنے لگے ہیں۔ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انگریزی میں اسے اچیومنٹ کہا جاتا ہے ۔ چلئے پہلے اردو ہی کی باتیں ہو جائیں۔

میری بڑی خواہش تھی میں اس وقت یہاں موجود رہوں جب ملک میں آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی جارہی ہو بشکر ہے کہ خواہش پوری ہوئی اور میں اتفاق سے ان دنوں لکھنؤ میں موجود تھا جب وہاں نئی حکومت زیر تولد تھی بلکہ تولد یا چکی تھی۔ اترپردیش ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے جب ریاستوں کی تشکیل جدید عمل میں آرہی تھی اور ایک کمیشن اس کام کے لیے بیٹھا ہوا تھا (یہاں کمیشن بہت بیٹھتے ہیں بلکہ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا کہ ایک کمیشن صرف اس لیے بٹھایا گیا کہ یہ معلوم کرے کہ کمیشنوں کی تعداد کیوں گھٹتی جارہی ہے) اس کمیشن نے جس کا عنوان فضل علی کمیشن تھا اس ریاست کے حدود اربعہ میں ایک مربع انچ کی کمی بھی نہیں ہونے دی۔ (یہ مربیانہ طرز عمل تھا)۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں ایک بڑی ریاست کی موجودگی بہت ضروری تھی اور اس ریاست کے وسیع و عریض ہونے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ اترپردیش نام کی اس ریاست میں اس وقت لگ بھگ سو وزراء کی کابینہ برسر کار ہے۔ (اس کابینہ کا کہیں کوئی اتہ نہیں ہے) یہ وزراء حضرات الارض ہیں اور ان میں خواتین بھی شامل ہیں۔ یہ کابینہ کم سے کم مجھے تو بہت پسند آئی۔ ہر کسی کا کلیان ہو گیا۔ (کلیان سنگھ وزیر اعلیٰ ہیں) ان سے پہلے مایا وتی تھیں سب کے سب مایا جال میں اسیر تھے۔ مجھے یہ بات بھی پسند آئی اب ملک میں حالات نہیں بدلے صرف صورتیں بدلتی ہیں لیکن اترپردیش میں سنسکرتی کی مایا کلپ یوں ہوئی ہے کہ اسکولوں میں سنسکرت پڑھائی جارہی ہے اور حال حال میں یہ احکام جاری ہوئے ہیں کہ بچے اسکولوں میں ایک دوسرے کو "وندے ماترم" ضرور کہیں۔ (جے ہند میں حب الوطنی اتنی کہاں ہے جتنی وندے ماترم میں ہے)۔

اس مرتبہ مجھے یہاں گھومنے کا، جس کا مجھے خبط ہے، خاصا اچھا موقع ملا۔ کیلی فورنیا کے میرے ایک دوست نے (جو کافی گھرے ہیں) اپنے ایک عزیز کے نام خط دے دیا تھا یہ اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے نکلے پراگندہ طبع۔ ان کا شجرہ شاید کسی نہ کسی راستے سے ہوتا ہوا حاتم طائی سے ملتا ہے۔ آبا کا پیشہ زمینداری تھا پہلے زمانے کا زمیندار، برائے نام زمین پر رہتا تھا۔ عرش سے پرے تو نہیں لیکن ان کی رہائش تقریباً فلک پر ہوتی تھی میرے میزبان بھی انہی کی مثال تھے۔ ان کی حویلی جتنی بڑی تھی اتنی ہی قدیم بھی تھی۔ اب ان کا مجھے قصیدہ نہیں لکھنا ہے بس یوں سمجھئے لکھنؤ میں پھیلی ہی تھا روزانہ صبح نخاس لے جاتے تھے اور وہاں کی نہاری کھلاتے تھے۔ کہتے تھے گھر پر بھی منگوا سکتا ہوں لیکن نہاری کھانے کا صحیح لطف وہیں آتا ہے جہاں یہ بنتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ لکھنؤ میں اگر اتنی عمدہ نہاری نہ بنتی ہوتی تو یہاں کے باشندے صبح خیزی کی عادت میں مبتلا ہی نہ ہوتے۔ لوگ نہاری کھانے ہی کے لیے اٹھتے ہیں ورنہ سردی کے دنوں میں تو صبح کے وقت ایک تنہا آدمی بھی گھر سے نکلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کوئی قافلہ چلا آرہا ہے کم سے کم ۴ کمبل تو وہ اوڑھے رہتا ہے صرف نخاس کی نہاری اُسے گرم جوشی کے مظاہرے پر اکساتی ہے۔ میزبان محترم کی حویلی میں تو مجھے اردو سنائی دی اور محسوس ہوا کہ یہ لکھنؤ واقعی اہل زبان کا شہر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ جھگڑا اب بھی برقرار ہے کہ جو لفظ دلی میں مذکر ہے یہاں مونث ہے اور جو لفظ لکھنؤ میں مذکر ہے دلی میں مونث ہے اور دونوں جگہوں کے باشندے اہل زبان ہیں۔ حویلی کے باہر بھی میں نے اردو سنی اور اچھی اردو سنی بامحاورہ اور فصیح لیکن فرق یہ نظر آیا کہ یہ اردو اب اینگلو اردو ہو گئی ہے جو بھی دو جملے اردو کے بولتا ہے آٹھ دس لفظ

انگریزی کے ضرور ڈال دیتا ہے۔ اردو پہلے صرف پان کی گلوری تھی نازک اور غنچۂ ناشگفتہ کی طرح۔ اب پان کا بیڑا ہو گئی ہے میٹھا پان جس میں ہر طرح کا ساز و سامان ہوتا ہے پان نہیں ہوتا لکھنؤ کی اردو کا یہی حال ہے۔ میں مثالیں دوں گا تو آپ کنفیوز ہو جائیں گے اور اپ سیٹ بھی۔ پارڈن می کہہ کر ڈس اپیئر ہو جائیں گے اس لیے جانے دیجئے۔ اردو کے لیے اب تعزیتی فنکشن جگہ جگہ منعقد ہونے چاہئیں۔ یہ تو خیر الیکشن کے دن ہیں اس لیے ابھی نہیں الیکشن کے بعد۔ ہاں خوب یاد آیا جب ۱۰۰ نفری کابینہ کی بات حویلی میں چھڑی تو اہل خاندان میں سے ایک نوجوان نے دبی زبان سے یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ ان ۱۰۰ وزراء کے لیے نئے محکمے ڈھونڈے اور پیدا کئے جا رہے ہیں اور ایک قلمدان وزارت برائے تعزیت ایجاد کیا جانے والا ہے جس کے سربراہ کا صرف یہ کام ہوگا کہ قومی سطح کے حادثات کے موقعہ پر خواہ حادثہ کسی نوعیت کا ہو، جا کر زخمیوں کی مزاج پرسی کرے اور مرنے والوں کے ورثاء کو نہ صرف پرسہ پیش کرے بلکہ معاوضے کا اعلان بھی وہی کرے۔ اس نوجوان نے یہ بھی اطلاع دی کہ سرکار ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہے جس کی شکل و صورت، سوز و گداز کے مشغلے کے لیے موزوں ہو اور جسے مناسب تعزیتی جملے اور اشعار یاد ہوں تاکہ متوفیوں کے ورثاء ہی یہ وزیر مقبولیت حاصل کر سکے اور لوگ دل سے خواہش کریں کہ ایکاش وزیر موصوف ہمارے گھر بھی آسکتے۔ میں نے یہ خبر سن کر تو اسی وقت اسے ہنسی میں ٹال دیا لیکن بعد میں اخبارات کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ملک میں واقعی ایک ایسے وزیر کی اشد ضرورت ہے جو ہمہ وقتی تعزیتی امور کی یکسوئی پر مامور ہو تاکہ دوسرے وزراء اپنے مفوضہ کام دلجمعی سے انجام دے سکیں۔ (اس جملے میں اگر کوئی جھول ہو تو قارئین اسے دور کر دیں۔ مجھے اس موضوع پر لکھنا آتا ہی نہیں ہے تعزیت کے نام سے ہی مجھے ہول آنے لگتا ہے)۔ مجھے یاد آیا کہ کیلی فورنیا میں وہاں میرے ایک دوست نے اپنے کسی عزیز سے تعزیت اس طرح کی کہ چھ بیش قیمت رومال انھیں بھیج دیئے اور وہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ آنسو خشک کرنے کا سامان ہے۔ دوری کی دوری قربت کی قربت ــــ ماڈرن کلچر میں تعزیت بھی ایک آرٹ ہے۔ (تعزیتی دستیاں بھی نئے سال کے کارڈ کی طرح بہت جلد بازار میں آنے والی ہیں) ــــ واقعی ضرورت انجانا کا بیٹر نیٹی ہوم ہے۔

میں نے یہاں محسوس کیا کہ بڑے شہروں میں ہر قسم کا کلچر چلن میں آچکا ہے اور خوشی ہوئی کہ کم سے کم مردوں نے ابھی لباس پہننا ترک نہیں کیا ہے۔ دلّی اور بمبئی میں خاص طور پر نظارے زیادہ نظر آئے۔ ایک نیا طبقہ وجود میں آیا ہے جسے دیکھ کر آدمی کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ طبقہ ہے ماڈلوں کا ــــ (ماڈل کو کیا آپ 'نمونہ' کہنا پسند کریں گے)

ایک فرق یہ بھی نظر آیا کہ اب ہندوستان میں جگہ جگہ بم استعمال ہونے لگے ہیں۔ پٹاخوں کا استعمال متروک تو نہیں ہوا ہے لیکن دھیرے دھیرے بم ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ سرکار ان کی جائے پیدائش پر بھی ریسرچ کر رہی ہے لیکن توجہ زیادہ تر ان بموں کی ساخت پر ہے یہ بھی ایک اہم موضوع ہے اور تحقیقی کاموں میں جب بھی فہرست ابواب یعنی سناپسس تیار کیا جاتا ہے تو فروعی امور اس میں پہلے جگہ پاتے ہیں۔ اسے حسن تحقیق کہا جاتا ہے۔ تحقیق تو بعد میں ہوتی رہتی ہے۔ بم دھماکوں نے یہاں ایک مشغلے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے ہیں ــــ ملک بے حد ترقی کر رہا ہے۔ لوگوں کی صحت اور روپے کی قیمت البتہ تیزی سے گر رہی ہے۔ لوگ پہلے ایسے موقعوں پر آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے اب زمین پر نظر جائے رکھتے ہیں کہ روپے کی قیمت ابھی سطح زمین پر ہے یا زمین دوز ہو گئی ہے کچھ ہو روپے کی موجودہ قیمت کے پیش نظر سیاح بہت آنے لگے ہیں۔ انھیں اپنے سکّے کا زرِمبادلہ

واقعی سونا معلوم ہونے لگتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ مفت سیر کر رہے ہیں۔ ان کی ہوس سیر و تماشا بوالہوسی کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔ روپے کی قیمت گرے گی تو ظاہر ہے ہر سیاح، تجمل حسین خاں بن جائے گا۔
بمبئی پہلے فدار شہر تھا اب گرد و غبار کا شہر ہے۔ (ابوالکلام آزاد اگر بقید حیات ہوتے تو غبارِ خاطر کی کئی جلدیں تیار کر لیتے) آلودگی کی افراط اور گندگی کی تقریظ کے لیے یہ شہر بہترین شہر ہے۔ یہاں دو قسم کی کارروائیاں ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔ ایک ابتدائی اور دوسری انتقامی۔ ابتدائی کارروائی میں مکانات ڈھائے جاتے ہیں اور انتقامی کارروائی میں قیامت ڈھائی جاتی ہے۔ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی محلے میں "شوٹنگ" ضرور ہوتی ہے (اس شہر کو اسی لیے بالی وڈ بھی کہا جاتا ہے۔ قدم قدم پر شوٹنگ) جس شوٹنگ کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ نسبتاً آسان ہے۔ اس میں سیٹ نہیں لگانا پڑتا۔ لائیٹ مین، ڈور تین اور کیمرہ مین، نہیں بلوانے پڑتے۔ بلکہ جہاں شوٹنگ کرنی ہوتی ہے وہاں کے ڈور مین کو پہلے ہٹانا پڑتا ہے بعض صورتوں میں تو وہ خود ہی بھاگ جاتا ہے۔ ٹرک ڈرائیور عموماً ایکسیڈنٹ کے بعد ٹرک چھوڑ کر بھاگتے ہیں یہ ڈور مین واردات کی بو سونگھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ (ہر شخص عبدالحمید نہیں ہوتا) شوٹنگ میں کوئی ری ٹیک نہیں ہوتا۔ ۳ منٹ میں پوری فلم اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ مقتول کو دواخانہ ضرور پہنچایا جاتا ہے لیکن مریض کے داخلے کی کارروائی ہی اتنی طویل ہوتی ہے کہ مریض کا داخلہ نہیں ہوتا صرف رخصتی ہوتی ہے۔
ان فلموں کے لیے بمبئی مشہور ہوتا جا رہا ہے۔ بم دھماکوں میں بم کی ساخت پر اور ایسی وارداتوں میں پستول کی گولی کی ساخت پر غور کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو پستول بھی ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ یہ فارن مال ہوتا ہے جس کی مانگ پہلے تھی اب اس کی ضرورت نہیں یہ حال بے مانگ ملنے لگا ہے۔ اس تجارت کا سرکاری نام اسمگلنگ، ہے جو فرسودہ ہو چکا ہے۔ یہ اسمگلنگ نہیں درآمد ہے۔ بس یہ ہے کہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ بالی وڈ میں اب نوجوانوں کے لیے جو بھی مواقع ہیں وہ سنہرے ہیں۔ پرانے اداکار تو سب کے سب 'انتخابات' میں ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی اسکرپٹ نہیں ہوگا مینی فیسٹو ہوگا۔ اسکرپٹ میں مقابلے ہوتے تھے مینی فیسٹو میں مغالطے ہوں گے۔ یہ بھی کام کی چیز ہیں۔ عوام انہی میں مبتلا ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔
ابھی تو میں مصروف سفر ہوں اس لیے باقی پھر کبھی

□□

مجتبیٰ حسین (دہلی)

نئے سال کی پیشگی مبارکباد ملنے پر

نئے سال کی آمد سے قبل ہی ہمارے پاس امریکہ سے نئے سال کا ایک تہنیتی کارڈ آیا ہے جسے ہمارے ایک دوست نے بھیجا ہے۔ اسے پاکر ہمیں ایک تعزیتی جلسہ کی یاد آگئی جو ایک بزرگ شاعر کے گزر جانے کی جھوٹی اطلاع ملنے پر برسوں پہلے ایک انجمن کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا! ابھی یہ تعزیتی جلسہ جاری ہی تھا کہ کسی نے آکر یہ اطلاع دی کہ بزرگ شاعر نے ابھی تک آخری ہچکی نہیں لی ہے اور یہ کہ موصوف کے بدن میں دو چار سانسیں اور باقی رہ گئی ہیں۔ اس اطلاع کو پاکر منتظمین بہت سٹپٹائے اور احساس ندامت کے مارے اس تعزیتی جلسہ کو اُس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ بزرگ شاعر سچ مچ اِس دنیا سے گزر نہیں گئے۔ بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال تھا کہ موصوف کی رحلت کا ایک سبب خود یہ تعزیتی جلسہ بھی تھا۔ ہمیں بھی اِس جلسہ میں مرحوم کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا تھا بلکہ جس وقت ہم اظہارِ خیال کر رہے تھے عین اُسی وقت جلسہ کے ایک منتظم نے چپکے سے ایک پرچہ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا کہ مرحوم کی خوبیوں اور صفاتِ حمیدہ کی تعداد میں مزید کچھ اضافہ فرمائیے اور اپنی تقریرِ دلپذیر کا سلسلہ جاری رکھئے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا ہم نے سمجھا کہ مرحوم کی خوبیوں کے بیان میں شاید ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ حالانکہ ہم اس وقت تک ان کی ذات میں وہ خوبیاں بھی تلاش کر چکے تھے جو ان کی ذات میں سرے سے موجود ہی نہیں تھیں۔ یوں بھی آدمی جب مرجاتا ہے تو اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ آدمی کم اور فرشتہ زیادہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ایک شخص بڑا ظالم اور جابر تھا اور اپنے بیوی بچوں پر بے پناہ مظالم ڈھایا کرتا تھا جب اس کا انتقال ہوا تو پادری نے اس شخص کے تابوت کے سامنے دعائیہ تقریر کرتے ہوئے اس کی انسان دوستی، رحمدلی، مروت، وسیع القلبی اور سچائی کی اتنی تعریف کی کہ اس شخص کی اہلیہ مشکوک ہو گئی اور اس نے تابوت کو کھلوا کر دیکھ لیا کہ کہیں تابوت میں اس کے شوہر کے بجائے کسی اور کی نعش موجود نہ ہو۔ یہ تو ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ بہرحال منتظمین نے جب بزرگ شاعر کی ذات میں مزید خوبیاں تلاش کرنے کی خواہش کی تو ہم نے پوری فراخ دلی کے ساتھ بالآخر اپنی بھی خوبیاں بھی بزرگ شاعر کے کھاتہ میں ڈالنا شروع کر دیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ تعزیتی جلسہ ان بزرگ شاعر کا نہ ہو بلکہ خود ہمارا ہو۔ مانا کہ ہم بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں اور ہم میں وہ اوصاف حمیدہ ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں لیکن انسان کی خوبیوں کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم اپنی خوبیاں گناتے گناتے تھک کر نڈھال ہو گئے اور ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنی خوبیاں بیان کرتے کرتے خود رحلت کر جائیں گے تو چار و ناچار اپنی تقریر ختم کی

اس پر منتظمین نے ایک اور مقرر کو اظہارِ خیال کی دعوت دیتے ہوئے آگاہ کیا کہ جب ہم تازہ دم ہوجائیں گے تو مرحوم کی مزید خوبیاں بیان کریں گے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ دوسرا مقرر بھی جب نڈھال ہورہا تھا تو عین اسی وقت یہ خوشخبری پہونچی کہ بزرگ شاعر سچ مچ گزر گئے۔ پہلی بار کسی تعزیتی جلسہ کے منتظمین کو جتنا خوش اور مسرور پایا اتنا کبھی نہیں پایا۔ جلسہ تو تعزیتی تھا اچانک مسرت و شادمانی میں تبدیل ہوگیا۔

نئے سال کا تہنیتی کارڈ قبل از وقت پانے پر ہمیں اس تعزیتی جلسہ کی یاد اس لیے آگئی کہ جاریہ سال کے ختم ہونے میں ابھی پورے پندرہ دن باقی ہیں اور ہم ابھی سے نئے سال کی مبارکباد قبول کریں تو کیوں کر کریں ہمیں یوں لگ رہا ہے جیسے جاریہ سال کے ختم ہونے تک ہمیں اس کی خوبیوں کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا ہوگا۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں پندرہ دن بہت ہوتے ہیں اور ان پندرہ دنوں میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسابقت کی دوڑ اور انسانوں کی بھیڑ میں پندرہ دنوں کا یہ عرصہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ پندرہ دنوں کی بات کرتے ہیں ہم تو پندرہ برسوں سے اپنے ایک نئے معاملے کی خوشی کا انتظار کررہے ہیں لیکن یہ خوش خبری آج تک نہیں آئی حالانکہ اس عرصہ میں ہم ہر سال بڑی پابندی کے ساتھ اپنے چاہنے والوں کے ہاں سے تہنیتی کارڈ وصول کرتے آئے ہیں۔ جن میں اس تمنا کا اظہار کیا جاتا ہے کہ نیا سال ہماری جھولی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھردے۔ حالانکہ ہماری جھولی اب اتنی بوسیدہ ہوچکی ہے کہ اگر خدانخواستہ دو چار معیاری بھرکم خوشیاں اس میں گر پڑیں تو پھٹ کر تار تار ہوجائے گی۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ پچھلے پینتالیس برسوں سے ہمارے پاس بڑی پابندی کے ساتھ نئے سال کے تہنیتی کارڈ آتے ہیں۔ ہماری زندگی کے ابتدائی اٹھارہ برس تو کچھ ایسے گزرے کہ کسی کے دل میں ہمارے لیے نیک تمنائیں پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں اور کسی کو ہماری خوشی کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ آتا بھی کیسے کہ اس وقت تک خود ہمارے دل میں کوئی تمنا نہیں جاگی تھی اور ہم نے دنیا کو صرف سیدھی نظر سے دیکھا تھا۔ ترچھی نظر سے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ آدمی دنیا اور اس کے باسیوں کو جب ترچھی نظر سے دیکھنے کے قابل ہوجاتا ہے تو تبھی اس کے لیے لوگوں کے دلوں میں نیک تمنائیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں اگرچہ تہنیتی کارڈ دو چار ہی آتے تھے لیکن جو بھی آتے تھے وہ اتنے بھاری بھرکم ہوتے تھے کہ اب سیکڑوں تہنیتی کارڈوں کو پاکر بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی۔ ایک تہنیتی کارڈ تو ایسا بھی آتا تھا جسے ہم گھر سے باہر لیجاکر کھولتے تھے محض اس ڈر سے کہ کہیں سارا گھر معطر نہ ہوجائے۔ پھر بھی اسے کھولنے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری کائنات معطر ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس کارڈ کو پانے کے بعد بھی عملاً ہماری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا لیکن سال بھر ایک خوشبو سی ہمارے ساتھ رہا کرتی تھی۔ پھر دو ایک برس بعد تہنیتی کارڈ کی یہ خوشبو بھی اچانک معدوم ہوگئی۔ پھر

پورے تیس برس بعد ہم نے خوشبو سے البتہ اس پیکر کو ایک مغربی ملک میں دیکھا تو بڑی دیر تک دیکھتے رہ گئے۔ ہمیں دیر تک دیکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس سابقہ پری پیکر کی حیثیت اب دیو پیکر کی ہوچکی تھی۔ فاضل گوشت اور چربی سے ڈھکے ہوئے اس پیکر میں سے تیس برس پہلے کے پیکر کو برآمد کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ تاہم اچانک اس بیتی خوشبو کی یاد آگئی جس میں ہم نے اپنی زندگی کے ڈیڑھ دو برس گزارے تھے۔ وقت جب گزرتا ہے تو شخصیتوں کو اسی طرح روندتا ہوا نکل جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اب اپنا ماضی خود کسی اور کا ماضی نظر آتا ہے۔ ایسے میں

بھلا کیسے فکر کہ کوئی اس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ نئے سال کی آمد کے بکھیڑے میں ہماری زندگی کے ہر برس کے کم و بیش ڈیڑھ دو مہینے اس طرح گزر جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ لوگوں کی نیک تمنائیں، جن کی ہمیں ضرورت نہیں ہوتی قبول کرتے رہو اور اپنی نیک تمنائیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا لوگوں تک پہونچاتے رہو۔ اگر یہ مصروفیت نہ ہو تو ہم اپنا وقت کسی اور بیہودہ کام میں ضائع کر سکتے ہیں۔ وقت تو ایک بہتا ہوا دریا ہے اور کس کی مجال ہے کہ اس بہتے ہوئے دریا کو ہفتوں مہینوں اور برسوں کے حساب سے کاٹ کر الگ کر سکے۔ ہم تو ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر بھی کوئی لکیر کھینچنے کے اہل نہیں ہیں۔

تاہم کبھی کبھار ہمیں ان تہنیتی کارڈوں کا ایک مقصد بھی نظر آتا ہے۔ تیس برس پہلے کی بات ہے کہ ہم نے اپنے ایک دوست سے سو روپے ادھار لیے تھے، جو ہم اس وقت کے اپنے معاشی حالات کی وجہ سے لوٹا نہیں سکے تھے۔ اگرچہ اس دوست نے کبھی ان روپیوں کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا لیکن جب نیا سال آیا تو ہمیں اس کے پاس سے ایک خوبصورت تہنیتی کارڈ وصول ہوا جس میں اس تمنا کا اظہار کیا گیا تھا کہ نیا سال ہمارے لیے خوشحالی کا پیغام لے آئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے دوست نے اس تہنیتی کارڈ میں ہمارے لیے صرف اتنی ہی خوشحالی مانگی ہے کہ ہم اس کے سو روپے واپس کرنے کے اہل بن جائیں۔ چنانچہ اس سال ہم سچ مچ خوشحالی کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہ آئی۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ہمارا یہ دوست ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ ہم نے سوچا کہ کم از کم اگلے برس ہمارا یہ دوست ہماری خوشحالی کی دعا نہیں مانگے گا لیکن جب دوسرا نیا سال آیا تو ہمیں اس دوست کا یوروپ سے پھر ایک تہنیتی کارڈ وصول ہوا جس میں اس نے پھر وہی رٹ لگا رکھی تھی کہ نیا سال ہمارے لیے خوشحالی کا موجب بنے۔ یقین مانیے ہمارا یہ دوست لگاتار پچیس برسوں تک یوروپ میں بیٹھ کر ہمارے لیے خوشحالی اور خوشیوں کی نیک تمنائیں بھیجتا رہا لیکن قدرت ٹس سے مس نہ ہوئی پھر یوں ہوا کہ ہمارا یہ دوست نہ صرف ہماری خوشحالی بلکہ خود اپنی خوشحالی سے بھی بے نیاز ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اس نے پوری نیک نیتی کے ساتھ ہمارے لیے خوشحالی کی دعائیں کی ہوں لیکن ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ وہ اپنے سو روپیوں کی واپسی کی حد تک ہماری خوشحالی میں دلچسپی رکھتا ہے حالانکہ اس عرصہ میں اس نے یوروپ سے نہایت قیمتی تہنیتی کارڈ بھیجنے میں ہم پر سیکڑوں روپے خرچ کر دیئے تھے۔ اب ہمارے اس دوست کے تہنیتی کارڈ کے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی نئے سال کے موقعہ پر اس کی یاد بے ساختہ آجاتی ہے اور ہم اس کے لیے دعائے مغفرت ضرور کرتے ہیں۔

اتنا سب کچھ کہہ دینے کے باوجود ہمیں نہ جانے کیوں نئے سال کے تہنیتی کارڈ اچھے لگتے ہیں اور ہم انھیں بڑے سلیقہ سے سجا سجا کر نہ صرف اپنے ڈرائینگ روم میں جگہ جگہ رکھتے ہیں بلکہ ایک سال تو تہنیتی کارڈوں کی اتنی بھرمار رہی کہ بعض کارڈوں کو اپنے باورچی خانے میں تک سجا کر رکھنے کی نوبت آگئی مگر بعد میں جب ہماری اہلیہ نے "ضرورت شعری" کے تحت ان کارڈوں کی مدد سے گیس کا چولھا جلانے کی ترکیب ایجاد کرلی تو ہم نے ان کارڈوں کو وہاں سے ہٹا دیا کیوں کہ ہمیں ان بے نام تمناؤں کا اس طرح جلنا اچھا نہیں لگا۔ زندگی کا سفر ایسے ہی گمنام جذبوں اور بے نام رشتوں کے سبب ہی تو جاری رہتا ہے ورنہ اکیسویں صدی کی طرف تیزی سے جانے والی اس دنیا میں کم از کم ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔

☐☐

غافل کنولدہوی
بھاگل پور (بہار)

قطعہ

متفق اس بات پر ہے آج ہر اک عام و خاص
گھاس کھانے کے سبب ہیں اپنے نیتا بدحواس
بدحواسی کا سبب اک اور بھی ہو سکتا ہے
عین ممکن ہے نہ ڈالے اب کے جنتا اُن کو گھاس

چارہ گر

یہ مویشی کے مسیحا، یہ طبیب جانور
زور سے اپنے قلم کے، پہلے پھیلائی وَبا
جو دوائیں دی گئی تھیں جانور کے واسطے
پھر وبا میں مر گئے سارے کے سارے جانور
ان غریبوں کو نیا اک جانور پھر سے ملے
پھر وہی ترکیب پہلے کی سی دہرائی گئی
اب سروں پہ ان کے رکھے چند نیتاؤں نے ہاتھ
رات بھر میں سارا چارہ ان کی سازش چر گئی
پھر تو کچھ ہی سال میں وارے نیارے ہوگئے
بھوک سے گو کڑکڑاتی ہی رہیں سب مرغیاں
خار و خس کے ڈھیر جن سے پل رہے تھے جانور
روز فاقہ سے ادھر یہ بے زباں مرتے رہے

کھا گئے چارہ انہی کا جن کے تھے یہ چارہ گر
پھر چکتسا[1] کے لیے مانگی حکومت سے دوا
اُن کو بھی بازار میں یہ بیچ کر سب کھا گئے
جن کو بانٹا تھا انھوں نے پہلے فرضی نام پر
اس لیے موٹی رقم بھیجی انھیں سرکار نے
یعنی فرضی نام پر ساری رقم کھائی گئی
یوں طویلے میں بندھے خچر بھی اب گھوڑوں کے ساتھ
جو طویلے کی بلا تھی بندروں کے سر گئی
گائیں، بھینسیں اور سور سب بیچارے ہوگئے
ان کے دانوں سے مگر بنتے رہے ان کے مکاں
ہوگئے اِن کے لیے وہ سب کے سب لعل و گہر
ان کے حصّے کی غذا وہ بے خطر چرتے رہے

جانور کے چارہ سے انسان جب پلنے لگا
نخل سا ما جک نیا لئے پھولنے پھلنے لگا

[1] بمعنی علاج

سراج نرملی

غزل

کس لیے اور کب نہیں لکھا!
ڈسمِسل کا سبب نہیں لکھا!
میں نے "اُمِّ کلب" لکھا شاید
تجھ کو "بنتِ کلب" نہیں لکھا!
بعد مرنے کے دی خبر اس کو
ہے عدو جاں بلب نہیں لکھا!
لاش اکثر جہاں سے اُٹھتی ہے
اُس جگہ کو "مطب" نہیں لکھا!
تم سے ناراض ہوں یہ لکھا ہے
روٹھنے کا سبب نہیں لکھا!

بے ادب ہے سراج تو ایک دم
اِس لیے باادب نہیں لکھا

فیاض فیضی
(بمبئی)

عید کا ایک دِن معیّن ہے

اگر ایک چاند کا تنازعہ ختم اور دوسرے چاند کا تنازعہ شروع ہوجائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ عید سر پر آگئی ہے۔ یوں تو ذہنی طور پر ہم اپنے آپ کو عید کے لیے مہینوں پہلے ہی تیار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بقرعید کے فوراً بعد جب ہمارے ہاتھوں پر لگے۔ جانوروں کے خون کے داغ ہلکے پڑنے لگتے ہیں اور طیاروں سے نیکیوں اور قیمتی سامانوں سے لدے حاجی صاحبان اترنے لگتے ہیں تقریباً اسی وقت سے ہم اپنے دین و مذہب کی لپ سروس LIP SERVICE کو خیرباد کہہ کر جلدی جلدی اپنی خدمت میں مجٹ جاتے ہیں۔ مبادا رمضان کا چاند دکھائی دے جائے اور ہمیں مسجدوں کو دوبارہ آباد کرنا پڑجائے۔ پھر اچانک شہر کے تفریحی مقامات ویران ہوجاتے ہیں اور غروبِ آفتاب کے وقت سڑکیں سنسان نظر آنے لگتی ہیں تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ اب عید میں شاید ایک مہینہ بھی باقی نہیں رہا۔ پھر جب مسجدوں کے میناروں سے موذن کی صدا کمزور اور ہماری قوتِ سماعت کم زور تر ہوجاتی ہے اور ساحلِ سمندر اور سینما ہال نت نئی طرز کے برقعوں سے معمور ہوجاتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ رسم دنیا، موقع اور دستور کے مطابق عید مبارک کہنے کی گھڑی آپہنچی ہے۔

عیدگاہ کے بغیر عید کا تصوّر اسی طرح ادھورا اور نامکمل معلوم ہوتا ہے جس طرح میدانِ جنگ کے بغیر جنگ یا اکھاڑے کی عدم موجودگی میں پہلوانی یا جھوٹے دعوؤں کے بنا الیکشن یا تہذیب سے عاری تعلیم کا تصور ہوسکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہم ممبئی والے ادھوری عید مناکر دوسروں سے زیادہ خوش نظر آتے ہیں اور جہاں بھی عید کی نماز ادا کرنے کی سہولت مل جائے اسے ہی عیدگاہ مان لیتے ہیں۔

ہمیں عیدگاہ خصوصاً اس لیے پسند ہے کہ اس میں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو صرف عیدین کی نماز باقاعدہ پڑھتے ہیں اس لیے تکبیروں میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ ورنہ سال بھر نماز کی پابندی کرنے والے اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ کب ہاتھ باندھنا ہے اور کب کھلا چھوڑ دینا ہے۔ دوسری وجہ عیدگاہ سے ہمارے لگاؤ کی یہ ہے کہ اس پر پریم چند ایک خوبصورت کہانی لکھ چکے ہیں اور آج بھی ہمیں اس کے اطراف کئی کہانیاں مل جاتی ہیں۔

عید کی صبح جسے دیکھئے رنگ برنگے نئے کپڑے پہنے، عید کی نماز میں شرکت کے لیے یوں چلا جارہا ہے گویا یہ موقع

ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ایک کم ستر دِنوں بعد ہی دوبارہ آئے گا۔ محلے کے کمپاؤنڈ میں لاوڈ اسپیکر لگا دیا گیا ہے تاکہ ایک گھنٹے بعد کان پھاڑنے والی آواز میں نئے نئے ذومعنی بول والے گانے لگائے جاسکیں۔ نماز میں شرکت کی عجلت بھی ہے اور بات چیت کی عادت بھی ساتھ چھوڑتی نہیں ہے۔

"ہر سال چاند کے لیے شہادت دی جاتی تھی مگر امسال تو چاند کی خاطر دو مسلمان بھائی شہید ہوگئے"

"ان کی شہادت رائیگاں نہیں جائے گی۔ اب تم دیکھنا بقرعید کے لیے چاند کا بکھیڑا بالکل نہیں ہوگا۔"

"لیکن عید کے چاند پر تو ان کی قربانی کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ دیکھیے اس مرتبہ دو دو عیدیں منائی جارہی ہیں۔"

"بھئی یہ تو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ہر اچھی چیز کم از کم دو رکھنا چاہتے ہیں۔ پھر عید دو بار منانے میں کیا مضائقہ ہے"؟

"بھائی مجھے تو اس میں بھی شیوسینا کا ہاتھ نظر آتا ہے۔"

"شیوسینا نہیں، بی جے پی۔ اب الیکشن قریب ہیں تو یہ سب ہوگا۔ لیکن تم دیکھ لینا شہیدوں کا خون رنگ لائے گا۔"

"جلدی جلدی قدم بڑھاؤ یار۔ ساڑھے آٹھ بجے کی جماعت ہے۔ اس الیکشن میں کانگریس کا جنازہ نکل جائے گا۔"

"ہاں لیکن اس سے مہنگائی کم نہیں ہوگی۔ دیکھو اس مرتبہ میں ٹوپی خرید ہی نہیں سکا۔"

"ٹوپی تو امسال واجپئی نے بڑی خوبصورت پہنی تھی۔"

"پہنی کہاں تھی یار وہ تو اپنے بھائیوں نے انہیں پہنائی تھی مستقبل کا وزیراعظم سمجھ کر۔"

"اللہ اکبر، اللہ اکبر"

نماز اور خطبہ کے بعد جب مولوی صاحب رقت بھری آواز میں دعا مانگنا شروع کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہماری قوم کس طرح گلے گلے تک گناہوں میں ڈوبی ہوئی ہے جبھی تو اس کے نامۂ اعمال کی تفصیل میں اتنی دیر لگتی ہے اور معافی نامہ پیش کرتے ہوئے گلا بھر آتا ہے۔ جب ہماری آنکھیں نم ہونے لگتی ہیں تو دعا کا رخ قوم کو دین دار اور پرہیزگار بنانے کی سمت مڑ جاتا ہے اور ہمارے دل کو قدرے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کی اونچی آواز آسمانوں کی سیر کرتی ہوئی آہستہ آہستہ سرگوشی کا درجہ پالیتی ہے اور اچانک عید مبارک، عید مبارک کی آوازیں دل و دماغ کو خوشی و مسرت سے معمور کرنے لگتی ہیں۔

"ارے بھئی ذرا گرم جوشی سے گلے ملئے۔ آپ تو روزے رکھ کر دبلے ہوگئے ہیں" قاضی وزیر احمد ہمیں اس قدر بھینچ لیتے ہیں کہ ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے پورے روزے کیوں نہیں رکھے۔ "آپ تو سماج وادی افطار پارٹی میں پہچانے نہیں جارہے تھے۔"

ہم نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یوں سرِعام ہمارا راز افشا ہو جائے گا ہمیں اس کی امید نہ تھی۔ کچھ لوگ گفتگو کررہے تھے۔

"بھئی اس بار افطار پارٹیاں خوب ہوئیں۔ ایسا لگتا ہے الیکشن کمیشن نے جان بوجھ کر انتخابات عید کے بعد مقرر کئے ہیں تاکہ افطار پارٹیوں کی رونق دوگنی ہو جائے۔"

ہم تو کانگریس کی افطار پارٹی میں گئے تھے لیکن وہاں آدھے سے زیادہ مہمانوں کے سر پر ٹوپیاں نہیں تھیں اور نہ وہ باریش تھے۔ ہم سمجھے وہ غیر ہیں مگر جب نماز کا وقت آیا تو ہم حیران رہ گئے کہ زیادہ تر ننگے سر والے افطار

چھوڑ کر نماز کے لیے بھاگ گئے جب کہ بیسیوں لوگ ٹوپی سر پر جمائے میز پر ہی ڈٹے رہے۔ پتہ ہی نہیں لگتا تھا کہ کون مسلمان ہے اور روزہ دار؟"

"یہی تو مشکل ہے۔ جس افطار پارٹی میں جایئے ہر شخص کے چہرے پر اتنی پاکیزگی نظر آتی ہے کہ خود اپنا روزہ مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے۔"

"دیکھو افطار پارٹی میں عام مہمان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ وہ تو خصوصی مہمانوں کو دیکھنے اور دکھانے کے لیے بلائے جاتے ہیں۔"

"یہ تو سو فیصد سچ ہے۔ میں نے جس افطار پارٹی میں شرکت کی اس میں ایک نہیں دو مہمان خصوصی تھے۔ دونوں نے قیمتی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، دونوں ہی باریش نہیں تھے، دونوں ہی روزہ دار معلوم ہوتے تھے بلکہ متقی اور پرہیزگار سمجھے جاتے تھے جب کہ ان میں ایک ہندو تھا اور ایک مسلمان۔ مگر دونوں ہی اداکار تھے۔ فلمی اداکار! اس لیے ان کی تقریروں سے یہ پتہ لگانا دشوار تھا کہ کس کے دل میں مسلمانوں کے لیے زیادہ درد ہے۔"

"یہ افطار پارٹیوں میں لوگ تقریر کیوں کرتے ہیں؟"

"بھائی آج کل کوئی کسی کی دعوت مفت میں تھوڑا ہی کرتا ہے۔"

"ہوگا۔ میں نے تو اس مرتبہ اتنی پارٹیاں اٹینڈ کی ہیں کہ گنتی ہی بھول گیا۔ اتنی تو ہمارے ملک میں سیاسی پارٹیاں بھی نہ ہوں گی۔ آخری پارٹی جو ہر کے پنج ستارہ ہوٹل میں ہوئی جہاں زیادہ تر پولیس والے شریک تھے۔"

"ارے اس پارٹی میں تو میں بھی تھا، وہاں تو زیادہ تر اسمگلر نظر آرہے تھے۔"

"جی نہیں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب پولیس والے بغیر یونی فارم کے کسی دعوت میں شریک ہوتے ہیں تو ان کی شکل و صورت پہناوے اور موبائیل فون کی وجہ سے اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔"

"عید مبارک ہو جناب"، ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے ٹیڑھی ظریف' مراد آبادی اپنے بڑی خان صاحب سے معانقہ میں مصروف تھے۔ خان صاحب خیر سے ایک ریستوران کے مالک ہیں اور بارہ مہینے ان کا ریستوران دن رات کھلا رہتا ہے۔ ظریف نے رسماً ان کے کاروبار کی خیریت دریافت کی۔

"امسال تو کاروبار نو بجی کا ٹھنڈا رہا۔ روزہ خور بھی نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ ہمارے ہوٹل میں تو زیادہ تر ادیب و شاعر آتے ہیں مگر اس مرتبہ وہ بھی دن میں نظر نہیں آئے۔ خدانخواستہ وہ بھی مذہبی ہوگئے تو ہمارا بیڑہ غرق ہوجائے گا۔"

"خان صاحب! بہت سے ادیب و شاعر تو بے چارے سال بھر روزہ سے رہتے ہیں اور آپ کے ریستوران کی چائے سے روزہ بہلاتے رہتے ہیں۔"

قریب ہی دو عدد نورانی چہروں کے مالک سرگوشی کر رہے تھے۔ "حضت عید مبارک ہو۔ بھئی آپ تو مبارک مہینے میں بھی ٹیلی ویژن نہیں چھوڑتے۔ یہ بتایئے اس درمیان میں "حسرتیں" کی کہانی کہاں تک پہنچی۔ بڑا بولڈ اور دلچسپ سیریل ہے۔"

"چھوڑیئے بھی۔ اس سیریل میں وہی پرانی باتیں دہرائی جارہی ہیں۔ اب تو اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔"

"لیکن جناب حکومت کی فرقہ پرست ذہنیت ملاحظہ فرمایئے۔ ٹی وی سیریل کا اب شدھی کرن کیا جارہا ہے۔"

"خدا خیر کرے۔ کیسے کیا ہوا؟"، ایک اور نورانی چہرہ ان کے قریب آگیا۔

اب دیکھیے اچھا بھلا سیریل اور شمع جلتی رہی چل رہا تھا کسی بی جے پی ذہنیت کے افسر نے کہہ دیا یہ نام نہیں چل سکتا۔ مجبوراً پروڈیوسر نے اس کا نام بدل کر "ادھیکار" کردیا۔

یہ اقلیتوں کے حقوق کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ اخاہ نواب صاحب! عید مبارک ہو"۔

ہم جہاں عید کی نماز پڑھنے جاتے ہیں وہاں پیش امام صاحب کے علاوہ صرف سابق وزیروں کی نشستیں محفوظ رہتی ہیں ورنہ باقی اُمت میں چھوٹے بڑے، امیر غریب کسی کا خیال نہیں رکھا جاتا اور محمود و ایاز ساتھ ساتھ ہی وی آئی پی حضرات کے پیچھے ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ظریف اسی بات کو یوں کہتے ہیں کہ پہلی صف محمودوں کے لیے ہے باقی صفیں ایازوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر مسٹر محمود اور مسٹر ایاز کے لیے علاحدہ نماز کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اب ان کی نماز بھی ختم ہوگئی تھی اور جدید طرز کے برقعے تیزی سے ادھر ادھر جا رہے تھے ہم اضطراب ان سے بچتے بچاتے نکل رہے تھے کہ زار و قطار رونے کی آواز سن کر ٹھٹک گئے۔ ایک قدیم برقعہ دوسرے سے مخاطب تھا"۔ بہن کیا بتاؤں۔ ہماری تو عید ساری خراب ہوگئی۔ میں بچوں کے ابو کے ساتھ بھنڈی بازار میں خریداری کے لیے نکل گئی تھی۔ ایک ہی کمان سے سب بچوں کے لیے کپڑے خریدے تو بارہ سو روپے کا بل ہوگیا، سوچا اب جوتے نہیں خرید سکیں گے لیکن بچوں کے ابو نے پیسے ادا کرنے کے لیے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو پرس غائب۔ وہ تو وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور میری آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ جیب کٹ گئی۔ ان ہی میں کوئی جیب کترا بھی رہا ہوگا لیکن اس کا دل نہیں پسیجا۔ ہم لوگ روتے دھوتے گھر آئے اور جو پیسے مہینے بھر کے اناج اور گوشت سبزی کے لیے الگ رکھ چھوڑے تھے وہ لے کر دوبارہ بازار گئے اور کپڑے خریدے اب بہن یہ حال ہے کہ دو روز بعد کھانے کے لیے گھر میں ایک دانہ بھی نہیں ہوگا"۔

دوسری عورت نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا "دل کیوں چھوٹا کرتی ہو تم میرے گھر سے اناج اور دالیں لے جانا میرا گھر بھرا ہوا ہے۔ تم تو جانتی ہی ہو میرے شوہر کی تنخواہ کتنی ذرا سی ہے۔ وہ تو میں ہر رمضان میں برقع اوڑھ کر بچوں کو ساتھ لے کر گھر گھر جاتی ہوں اور زکوٰۃ اور فطرہ کا سوال کرتی ہوں۔ اللہ کا کرم ہے چاند رات تک گھر روپے پیسے، کپڑے لتے اور اناج سے بھر جاتا ہے اور ہم سال بھر چین کی بنسی بجاتے ہیں۔ کیوں نہیں اگلے برس تم بھی ...... !"

ٹریفک سگنل پر لوگوں کے ہجوم نے مظلوم خواتین کو ہم سے الگ کردیا۔ ہم نے ظریف مرادآبادی کی طرف شرارت سے دیکھا "تم کو ہماری جانب سے عید مبارک ہو۔ مگر تم نے اس مرتبہ نئے کپڑے کیوں نہیں بنائے، کیا تمہاری جیب بھی کسی نے کاٹ لی تھی؟"

مسکرا کر کہنے لگے "نہیں جناب، ہم ایسوں کی جیب تو ہر سال مہنگائی کے سبب خالی ہی رہتی ہے۔ ہم عید سے ایک روز پہلے گھنٹوں بازار میں گشت کرتے ہیں مگر کوئی چیز خرید نہیں پاتے۔ گھر لوٹتے ہیں تو بیوی بچوں کی آنکھوں میں کوئی سوال نہیں ہوتا ہے وہاں تو یہ شعر رقم ہوتا ہے۔

جیسے بازار کو صرف سونگھ کے لوٹ آئے ہیں : صورتیں دیکھیے بے چارے خریداروں کی ▫▫

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

مری جو شامت آئی۔۔!

روشن اختر محمد شاہ رنگیلے کی جب شامت آئی تو اس نے دغا باز اور مفاد پرست مصاحبوں کے بہکاوے میں آکر سرخوشی کے عالم میں اپنے، پشتینی وفادار، عظیم مدبر، سیاس اور خیر خواہ سلطنت مغلیہ نظام الملک آصفجاہ اول کے دانش مندانہ مشورے کی عرض داشت کو "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب کن اولیٰ" کہتے ہوئے شراب سے لبریز پیالے میں ڈبو دی۔ ۔ ۔ ۔ اور شامت اسی موقع کی تاک میں تھی۔ آئی ۔ ۔ ۔ ۔ تین روز تک دلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا اور سنہری مسجد میں بیٹھے ہوئے نادر شاہ کی تلوار نیام نہ ہوئی، خلقت ترہ ترہ پکار اٹھی۔ پھر بھی اس کا دل سیر نہ ہوا، تخت طاؤس دیوان خاص سے اکھاڑ کر اور شاہی خزانہ لوٹ کر اونٹوں پر لدوا دیا گیا۔ محمد شاہ کو "کوہ نور" کی فکر ہوئی کہ یہ بھی ہاتھ سے جاتا ہے، اس نے کمال ہوشیاری سے اس کو اپنی پگڑی میں چھپا لیا، کسی نمک حرام نے نادر شاہ کو جا لگایا اور اس نے اسے ہتیانے کے لیے ایک چال چلی۔ عزیزی روشن اختر ہم اور تم آج سے پگڑی بدل بھائی بن جانتے ہیں کہ اخوت کے رشتے سے محبت پائیدار ہو جاتی ہے۔ یہ کہا اور سوچنے سمجھنے کا موقع دیئے بغیر اپنی پگڑی اس کے سر اور اس کی اپنے سر رکھ لی، یوں کوہ نور بھی گیا۔ ۔ ۔ ۔ اور "بعد از خرابیٔ دلی" محمد شاہ جب بیدار ہوا اور ہوش آیا تو بصد حسرت و یاس اپنے آپ سے بولا، اور کیا بولا۔؟ ۔ ۔ ۔ ۔

شامت اعمال ما بصورت نادر گرفت

اسی طرح ہمارے چچا نواب اسد اللہ خاں غالب نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کی جب شامت آئی تو فقیروں کا حلیہ بنا کر گلی میں "ان" کی دلوڑھی کے روبرو یہ آس لگائے جا بیٹھے، شاید جھروکے سے ایک جھلک ہی نظر آجائے دربان نے دیکھا اور یہ سمجھ کر چپ رہا، کوئی گداگر ہے، خیرات کی آس میں بیٹھا ہوا ہے، وہ نہیں ہے جس پر عتاب نازل ہوا اور حکم دیا گیا کہ یہ دیوڑھی میں قدم نہ رکھنے پائے۔ بیٹھا ہے، بیٹھا رہے، ہمارا کیا لیتا ہے۔؟ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے اس گمان سے آپ کو حوصلہ ہوا اور یہ نتیجہ نکالا کہ دربان مجھ پر مہربان ہے۔ اور اگر ذرا منت سماجت کروں تو شاید اندر جانے کی اجازت بھی دے دے۔ یہ قیاس کر کے اچھے خاصے بیٹھے بیٹھے سے اٹھے اور دربان کے آگے پہنچ گئے اور "شامت" بھی ساتھ ساتھ ہی پہنچی۔ دربان نے جب قریب سے دیکھا تو پہچان

گیا، اچھا! تو ذات شریف، یہ آپ ہیں۔؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھا ہوا تھا ..... اور پھر۔؟ ایسی ٹھکائی ہوئی کہ فرشتے بھی کوچ کر گئے اور شامت۔؟ اس تماشے پر کھڑی ہنستی رہی اور آپ نے کف افسوس ملتے ہوئے اپنی سادہ لوحی [illegible] اقرار فرمایا!

گدا [illegible] سے وہ چپ تھا ہی جو شامت آئی ہ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے علی ھذا القیاس! ہماری شامت بھی آئی مگر ذرا بہ انداز دگر آئی۔ اچھے خاصے اپنے موروثی مکان میں فراغت سے رہ رہے تھے جو پرانے شہر میں گنجان آبادی اور بازار کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ وسیع دریچے دالان، پیش دالان دونوں طرف کشادہ ہوادار کمرے سامنے بڑا سا چبوترا اور اس کے آگے نیچے لمبا چوڑا صحن، جس کے درمیان تالاب کی شکل کا خوبصورت حوض، جس میں فوارے کی بہار، ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی پھوار، سرخ سرخ مچھلیوں کی اٹھکھیلیاں اس طرف چنبیلی کا منڈوا، اُس طرف رات کی رانی کی عطر بیز باس۔ آم، امرود اور پپیتے کے درخت۔ جب گرمیوں کا موسم آتا صحن میں پانی کا چھڑکاؤ ہوتا، تخت اور پلنگ بچھ جاتے چنبیلی کی بھینی بھینی اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوش بو مشام جان کو معطر کرتی اور راتوں میں جو نیند آتی تو اللہ قسم ایسے آتی جیسے ابھی ابھی گھوڑے بیچ کر آئے ہیں۔ مگر یہ آرام اور خداداد عیش اور گھوڑے بیچ کر سونا ہضم نہ ہوا ..... آئے دن سننے میں آ رہا تھا، آج فلاں رشتے دار نے پرانے شہر کی "ٹریفک" سے چھٹکارا پانے کے لیے نئے شہر میں اپنا مکان بنوا لیا ہے آج فلاں دوست ایک پوش کالونی میں اپنے فلیٹ میں منتقل ہو رہے ہیں ......

ان باتوں کی کھوج اور فکر اور ان پر مستزاد "غم" ہم سے زیادہ "بیگم صاحب" کو کھائے جا رہا تھا اور ہر دم اپنی آرزو کا اظہار انداز بدل بدل کر ہو رہا تھا "اللہ جانے" اوروں کی طرح ہم بھی کب اپنا مکان بنوا کر نئے شہر میں رہائش اختیار کریں گے؟ اس دقیانوسی مکان میں تو دم گھٹنے لگا ہے"! ..... سن سن کر ہمارا بھی جی کرنے لگا کہ کسی اچھے پُر فضا اور پُر سکون مقام پر مکان بنانا چاہیے۔ بعض بہی خواہوں سے جب ذکر آیا تو انھوں نے بہترا سمجھایا بھی کہ میاں! پچھتاؤ گے، اس گھر کا آرام اور دنیا بھر کی سہولتیں تمہیں نئے شہر میں نصیب نہ ہوں گی۔ پھر تمہارا یہ مکان تو ہزاروں میں ایک ہے۔ ہم نے عرض کیا، وہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہے "دھابے" کا (اینٹ، چونا، لکڑی) ستر، اسی برس پرانا دادا حضرت مرحوم کا بنوایا ہوا، سمنٹ اور لوہے کا نام و نشان نہیں اور آج کل ان کے بغیر کوئی مکان، مکان نہیں۔ سو، لوگوں کے نیک اور صائب مشوروں کو سن سن کر ہم نے بھی ایک بار سوچا بات ٹھیک ہے لیکن، حضرت دل کو ٹٹولا، آپ نے فرمایا! بات تو بیشک ٹھیک ہے مگر "بات وہ جو پانی میں چھپے" والی بات اس میں کہاں؟ چنانچہ "حضرت" ہی کے مشورے کو ترجیح دے کر ایک پوش کالونی میں اچھے مقام پر پلاٹ خرید لیا گیا اور اس ڈر سے کہ کہیں یہ "حضرت" لوگوں کی باتوں میں آ کر ڈانواڈول نہ ہو جائیں، ایک اچھے آرکیٹکٹ سے خوبصورت نقشہ اور پلان بنوا کر بلدیہ میں تعمیر کی اجازت کے لیے درخواست دے دی۔ اب یہ جلدی پڑی کہ منظوری مل جائے تو دوسرے ہی دن کام شروع کر دیں گے۔ سینٹری کا روز صبح آنا اور پوچھ جانا مگر؟ اللہ کا نام لیجیے ہفتہ گزرا، مہینہ گزرا، انتظار انتظار میں دن یہ دن گزرتے چلے گئے او تین مہینے بیت گئے، زمانہ ناپید [illegible] دفتر کی ہیرو نما یہ بیچارہ [illegible] سے وہاں اور وہاں سے یہاں گھومتا ہی رہا۔

ایک وکیل صاحب نے کہا دو مہینے گزر چکے ہیں؟ "فوٹو کاپی" ہو کر بولے جی! تین مہینے۔ ہاں ہاں، وہی۔ دو مہینے

---

٥ فوٹو کا شستہ [illegible]

اگر بلدیہ سے کوئی جواب نہیں ملا تو آپ تعمیر شروع کردینے کے مجاز ہیں۔ ایک تجربہ کار اور بلدیہ کے زخم خوردہ دوست نے کہا، اجی! کہاں مقدمے بازی کی جھنجٹ میں پڑتے ہو، جاؤ "مٹھیاں" گرم کرو اور ٹھنڈے ٹھنڈے منظوری لے آؤ. ہم ٹھیرے ذرا عاقبت اندیش کہ واقعی بلدیہ والے کچی گولیاں نہیں کھیلتے دو کیا اگر چار مہینے بھی ہو جائیں اور ہماری قطر سے اس اذیت ناک تاخیر کا باعث پوچھا جائے، اور تعمیر شروع کردی جائے تو ایسا کرارا جواب ملے گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ نا، بابا، کون بلدیہ کے عملے سے پولیس کی نگرانی میں اپنے مکان کو مسمار کروانے کا جوکھم مول لے؟

. . . . یہ سوچ کر ایک دن انجینئر صاحب کے اجلاس پر حاضر ہوئے اور اپنی کارروائی کے بارے میں استفسار کیا، فائیلوں پر سے نظر ہٹائے بغیر نہایت تجاہل عارفانہ سے فرمایا، آپ کی درخواست اور نقشہ نظر سے گزر چکا ہے' دفتر میں کام بہت ہے بہت سی دوسری فائیلیں نمٹانی ہیں یہ ذرا وقت لیتے ہیں" ارجنٹ" تکمیل نہیں پا سکتے، بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ہم نے عرض کیا درخواست گزار نے تین مہینے گزر چکے پھر بھی ارجنٹ ہی ہوا؟ قانونی طور پر دو مہینے کے اندر جواب مل جانا چاہیے ورنہ درخواست گزار کام شروع کردینے کا خود بہ خود مجاز ہو جاتا ہے۔

آپ کی قانونی معلومات کافی وسیع ہیں، تو پھر شروع کردیجئے، روکا کس نے ہے؟ . . . . . اس "سرد دھمکی" سے ہم ٹھنڈے ہو کر رہ گئے اور ذرا پگھل کر بولے! پھر بھی انجینئر صاحب! ہر کام بطور چینل تکمیل پائے تو باقاعدگی پیدا ہو جاتی ہے اور تعمیر کسی دغدغے کے اسے شروع کیا جا سکتا ہے' ویسے نقشہ میں کوئی ریمارک والی بات تو نہیں ہے، ہم نے شہر کے ایک مانے ہوئے آرکیٹکٹ سے یہ نقشہ بنوایا ہے۔ فرمایا! جی بے شک ایسی کوئی بات نہیں' میں آج کل میں موقع معائنے کے لیے ڈرافٹسمین کو بھیج رہا ہوں، اس کی رپورٹ ملنے کے بعد کارروائی آگے بڑھے گی اور منظوری کے لیے کمشنر صاحب کے پاس فائیل بھیج دی جائے گی۔ نقشہ . . . . ٹھیک تو ہے . . . . مگر . . . . ہم اس "مگر" کی تہ کو پا کر جلدی سے بولے' آپ کل ہی ڈرافٹسمین صاحب کو بھیج دیں۔ نقشے میں جو بھی اس "مگر" کی رہ گئی ہے اسے بھی پورا کردیں گے . . . . دوسرے ہی دن ڈرافٹسمین صاحب تشریف لائے اور فرمایا آپ نے اپنے کچن کا رخ شمال کی طرف رکھا ہے . . . . اپنے ہی کچن کو تو رکھا ہے، آپ کو کوئی تکلیف ہے . . . . ہلکے سے سٹپٹا کر بولے' وہ تو نہیں مگر . . . . اُن کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی ہم نے کہا! ارے تو آپ اس "مگر" کا رخ بھی درست کردیں تاکہ ہماری مرضی، خوشی اور آرکیٹکٹ کی رائے کے مطابق ہمارا چولھا شمال رخ ہی جلنے لگے"۔ . . . اور پھر "مگر" کا ایک لفافہ جیب سے نکال کر اُن کے حوالے کردیا، جسے لے کر وہ تشنا) سے روانہ ہو گئے۔ اور پھر "مگر" کی کرامت ملاحظہ ہو، دوسرے ہی دن انجینئر صاحب کی رائے کے ساتھ کمشنر صاحب سے منظوری حاصل ہو گئی۔ اس کامیابی پر اللہ کا، آرکیٹکٹ اور بلدیہ والوں کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر کے تعمیر شروع کردی گئی ارادہ تھا جنگی خطوط پر کام کر کے جلد سے جلد مکان تعمیر کروالیں۔ مگر اس بات کی خبر نہ تھی کہ!

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

میستری سے بنیادوں کی کھدوائی جلد سے جلد کروالینے کی بات کی، جواب ملا صاحب، وہ تو ایک دو دن ہی کا کام ہے مگر. (ہم ڈرے کہ یہاں بھی "مگر" گھس پڑا) بنیاد کھودنے والے ڈر رہے ہیں۔ حیرت سے پوچھا، وہ کیوں؟ کیا اُن لوگوں نے پہلے یہ کام نہیں کیا یا اس اندیشے سے کہ کہیں ہم اُن کی اُجرت نہ دبالیں؟ میستری بولا! جی نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ آپ کے پلاٹ میں ایک "کونا" آگیا ہے اور یہ مزدوروں اور صاحب خانہ پر "بھاری" پڑتا ہے اور وہ اس لیے ڈر رہے ہیں

تو بھائی میرے، کوناہی تو ہے کوئی پہاڑ تو نہیں، کاٹ پھینکو اُسے۔ منہ پلٹا کر ہنسا (جیسے ہم نے کوئی بچکانہ بات کہدی ہو) اور بولا صاحب، یہ کوئی کپڑا نہیں کہ قینچی لے کر اُسے کاٹ دیں۔ ۔ ۔ ۔ پھر تم ہی کوئی علاج بتلاؤ، کہنے لگا "جھٹک" دینا پڑیگا۔ ایک بکرا کٹوا کر مزدوروں کو بریانی کھلایئے اس "ٹوٹکے" سے وہ راضی ہوجائیں گے اور ان کا ڈر نکل جائے گا۔

ہم نے سوچا جب پورا سر ہی اوکھلی میں خود سے دے رکھا ہے تو یہ ایک موسل اور سہی۔ مزدوروں نے دعوت اُڑائی اور شروع ہوئی بنیاد کی کھدائی۔ ۔ ۔ ۔ پھر یکے بعد دیگر مختلف النوع مسائل میں الجھتے نکلتے رہے۔ کبھی دن مزدور غائب تو کسی دن رنگیا میستری لاپتہ۔ ایک دن تنگ آکر ہم نے رنگیا کو آڑے ہاتھوں لیا کہ تمہاری لاپرواہی سے کام کا بہت حرج ہو رہا ہے اور دن پر دن گزرتے چلے جارہے ہیں پروگریس کا نام نہیں اس طرح کا "اونگھتا یاری" کام ہمیں بالکل پسند نہیں ہے اگر کرنا ہو تو پابندی سے کرو ورنہ ہم دوسرا انتظام کر لیا گے تم اپنی چھٹی سمجھو۔ ۔ ۔ ۔ اس دھمکی نے خاطر خواہ کام کیا۔ بولا! آج دو دن کا کام ایک ہی دن میں نمٹا دیتا ہوں۔ اور مزدوروں کو حکم دیا کہ آج ڈبل مال ملاؤ اور دیواروں کو لنٹل تک اٹھاؤ، ہم مطمئن ہوئے کہ چلو ہماری بندر بھبکی سے کام میں پھرتی تو آئی، پچھلی کسر ایک ہی دن میں پوری ہو رہی ہے۔ مال مسالہ تیار ہو گیا اور رنگیا میستری ہاتھ میں تھاپی لیے اُس سے چابک کا کام لیتے ہوئے اِدھر سے اُدھر گھومتے ہوئے مزدوروں کے سروں پر مُسلط ہو کر انہیں کمانڈ کرنے لگا، دیواریں تیزی سے بلند ہونے لگیں اور ہم نے ٹھنڈی سانس لی اور کام کی اس رفتار سے خوش ہو کر گھر آگئے۔ رنگیا نے کہا تھا آج مغرب کے بعد بھی کام جاری رہے گا روشنی کا انتظام کر دیا جائے۔

شام پانچ بجے ہم پر ٹکس کے لیے آرڈر دیتے ہوئے جب سائیٹ پر پہنچے تو دیکھتے ہیں اینٹوں اور مال مسالے کا ڈھیر پڑا ہوا ہے اور مزدور غائب۔ دل دھڑکا، ہم نے سمجھا، شاید "باجماعت" چائے نوشی کے لیے گئے ہیں اب آتے ہی ہونگے ۔ ۔ ۔ ۔ گھنٹہ بھر انتظار کرتے رہے مگر وہ نہیں آئے سامنے سے رنگیا منہ لٹکائے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ پوچھا، کیا واردات پیش آگئی؟ بولا، آج "ڈبکی پونم" ہے (پورے چاند کی رات) سارے مزدور اکھٹا کر کے چار بجے ہی کام سے اُتر گئے اور بولے آج پوجا کی رات ہے ہم سے یہ اوورٹائم (OVER TIME) نہیں ہونے کا، لاکھ منت سماجت کرنے پر بھی نہیں مانے اور چل دیئے۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے فکرمند ہو کر پوچھا، آخر اس سمنٹ اور مسالے کا کیا بنے گا جس میں پانی بھی ڈال دیا گیا ہے؟ کل صبح تک تو یہ پونم کی بدولت ایک تودے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اُس نے تسلی دی صاحب! کچھ زیادہ نہیں صرف دو تین بورے سمنٹ خراب ہوگی میں کل ذرا سختی سے کام لوں گا۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے دو تین بورے کہے لیکن ہم کو بخوبی اندازہ تھا کم از کم آٹھ دس بورے سمنٹ کا "چونا" ہمارے سر لگ چکا ہے، کیا کرتے "قہر درویش برجانِ درویش" مزدوروں اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے گھر واپس آگئے۔ ۔ ۔ ۔

جوں توں کر کے دیواریں تیار ہوگئیں اور اب باری چوکھٹوں اور دروازوں کی آئی، بڑھئی کو ساتھ لے کر منڈی پہنچے اور اُس کی "پسند" کی دُکان پر گئے، بھاؤ معلوم ہوا تو دن میں تارے نظر آنے لگے اور پھر لکڑی کا حساب اپنے پلے نہیں پڑا چھوٹا سا ایک لکڑی کا ٹکڑا دکھاتے اور کہتے یہ پانچ "گھن فٹ" ہے یہ دس گھن فٹ ہے۔ ۔ پتہ نہیں یہ کیا جناتی حساب ہے؟ ویسے بھی حساب کے معاملے میں ہم ہمیشہ رعایتی نمبروں ہی سے پاس ہوتے آئے تھے۔ یہ حساب کتاب ہم نے خدا اور لکڑی والے کے سپرد کیا اور بڑھئی کو ہدایت کی کہ نپوا اور کٹوا کر لکڑی لے آئے ہم تو چلتے ہیں اس "گھن فٹ" نے تو ہمیں "گھن چکر" بنا دیا ہے۔ لکڑی آگئی چوکھٹیں تیار ہوگئیں اور دیواروں میں فٹ ہونے کا وقت آیا تو بڑھئی اور اس کے کاریگر اڑ گئے کہ نارئیل او

مٹھائی منگوائی جائے، صدر دروازے کی چوکھٹ میں ناریل باندھنا ضروری ہے ورنہ یہ چوکھٹ آپ کے لیے نحس ثابت ہوگی۔ ناریل آئے، مٹھائی آئی اور ناریل باندھنے کے لیے دو تین میٹر "لال مدرا" آیا۔ پوجا ہوئی، زوروں میں مٹھائی پھوٹ پھوڑ گئے اور ایک ناریل کپڑے میں باندھ کر چوکھٹ کے بیچوں بیچ لٹکا دیا گیا جو آنے جانے والوں کے سر کا مزاج پوچھ رہا تھا۔ اُن کی تو پوجا ہوئی اور ہماری حجامت:

مجھ پہ جو احساں نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا!

ان چوکھٹوں کے بعد جب دیواریں لنٹل سے اوپر چھت کی بلندی تک پہنچ گئیں تو سلیب (SLABS) ڈالنے کی باری آئی مگر سمنٹ ختم ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں کنٹرول تھا اور بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد ہی پرمٹ (PERMIT) ملا کرتا تھا اب تک جو سمنٹ استعمال میں آئی وہ رنگیا مینسری کی کوششوں کی بدولت کنٹرول ریٹ سے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایک ٹھیکیدار نے ازراہِ ترحم مہیا کی تھی، اب اس نے ہاتھ اُٹھا لیا کہ آج کل سختی بہت ہو رہی ہے برج کی تعمیر میں صحیح ریشو (RATIO) سے سمنٹ ملانا پڑ رہا ہے . . . . اُسی زمانے میں ہمارے اسکول کے ایک ہم جماعت رام راؤ پٹیل فوڈ اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے۔ اربابِ اختیار نے سمنٹ کا الاٹمنٹ اُن ہی کے تفویض کر رکھا تھا۔ پہنچے اور بولے، یار پٹیل! ہم مکان کی تعمیر کروا رہے ہیں پٹیل بولے، ضرور کرواؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہم نے کہا جب سمنٹ ہی نہ ہو تو کیا خاک کروائیں؟ کہا، "پھر ہم کس مرض کی دوا ہیں"؟ لاؤ درخواست کے ساتھ چار نقشے اور انجینیر کا سرٹیفکیٹ کہ کتنے بورے سمنٹ درکار ہے؟۔

ایک نقشہ نویس کو پکڑا چار نقشے بنوائے اور انجینیر سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا دونوں کو درخواست سے نتھی کر کے پٹیل کی خدمت میں پہنچ گئے۔ درخواست پڑھی، نقشوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا بولے! جلدی سے ایک ہزار روپے کا نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ لے آؤ۔ "حکم حاکم مرگ مفاجات" دوڑے دوڑے پوسٹ آفس گئے اور بھاگے بھاگے N. S. C لے آئے۔ پٹیل نے کہا کل آکر پرمٹ لے جانا۔ خوش کام لوٹے دوسرے دن پرمٹ مل گیا، ڈیلر کے یہاں سے سمنٹ بھی آگئی لوہے کے سریئے بھی آ گئے اور چھت کا سلیب پڑ گیا۔ دروازے لگ گئے، پلاسٹر الکٹرک فیٹنگ، پلمبر، سینیٹری کا کام اور دوسرے تمام کام یکے بعد دیگرے تکمیل پا گئے، جو تکمیل ہونے سے رہ گئے انھیں آئندہ پر چھوڑ دیا۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد ❖ ہر چہ گیرید مختصر گیرید

ایک ہنگامے سے مکان تعمیر ہوا دورانِ تعمیر کچھ ٹکنکی اور بہت کچھ نان ٹکنکی مشورے ملتے رہے ہم نے ٹکنکی پر کم اور نان ٹکنکی مشوروں پر زیادہ دھیان دیا۔ نتیجے میں اِدھر کی دیوار اُدھر اور اُدھر کی اِدھر یہاں کا دروازہ وہاں اور واں کا یہاں لگاتے رہے جس سے سر کی اچھی خاصی صفائی بھی ہوتی رہی۔ آخر کار خدا خدا کر کے مکان تیار ہو گیا جس مکان کی تعمیر کو تین مہینے میں مکمل کر لینے کا بیڑا اُٹھایا تھا وہ آٹھ نو مہینوں میں جا کے مکمل ہوا۔

پہنچا غرضِ عروس کے گھر تک وہ نوجواں ❖ شیخوخیت کے درجے سے کر اُس طرف گزار

نئے گھر میں منتقل ہو جانے کے بعد اپنی خوشیوں میں رشتے داروں اور دوستوں کو بھی شریک کرنے کی خاطر "گھر بھرائی" کی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ سارے دور و نزدیک کے "اپنے" جمع ہوئے، دعوت اُڑائی اور گھر کا معائنہ شروع ہوا، کوئی

کتنا بہت اچھا، کشادہ اور خوب صورت مکان ہے، کسی نے فرمایا ٹی. وی (T.V) لاؤنج ڈرائنگ روم سے بھی بڑا ہے.... عرض کیا، وہ اس لیے کہ ایک یہی وہ مقام ہے جہاں گھر اور باہر کے افراد" نہایت اپنائیت" سے ایک ساتھ مل بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں. میاں بیوی بھی....

ایک صاحب نے اعتراض جڑا تم نے باغبانی کے شوق میں بہت زیادہ زمین بے کار چھوڑ رکھی ہے کیا گل بوٹے لگاکر پھولوں کی تجارت کرنے کا ارادہ ہے؟... تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ گل بوٹے اکھاڑ کر یہاں جوار، باجرہ اور دال مونگ کی کاشت شروع کردی جائے؟....

ہمارے ایک عزیز دوست عبدالودود صاحب دوسری منزل کا معائنہ کرنے کے لیے زینے پر قدم رکھتے ہی پلٹ کر گویا ہوئے، یار! سیڑھیوں کے معاملے میں ہر شخص کوئی نہ کوئی غلطی کرجاتا ہے اور یہ تم نے بھی کی. پوچھا، کون سی غلطی سرزد ہوگئی؟ فرمایا! انہیں پیچ دیتے ہوئے نیچے سے اوپر لے گئے ہو... تو ودود صاحب، کیا ان کا پیچ کھولتے ہوئے اوپر سے نیچے لے آؤں؟... لیکن! آپ کے فرمانے کے مطابق ہر شخص ایسی ہی غلطی کرتا ہے تو اس حساب سے یہ سیڑھیاں بھی" غلط العام صحیح" ہوگئیں، ہے نا؟ خوب ہنسے اور بولے تمہیں باتیں بنانی خوب آتی ہیں. خیر اللہ تمہیں مبارک کرے.

سو، نئے شہر کی ایک" پوش" لوکیلٹی میں نئے، خوبصورت مکان کا نشہ بڑے زور سے چڑھا. بیچے خوش، بیچے والی خوش اور ان کی خوشیوں کو دیکھ کر جینے والا" عبداللہ دیوانہ" بھی بہت ہی خوش.... مگر ان خوشیوں کی عمر سال ڈیڑھ سال سے آگے نہ بڑھ پائی. آہستہ آہستہ روزانہ ایک کے حساب سے مسائل آکھڑے ہوتے گئے.

برسہا برس سے قدیم گھر میں کام کرنے والی نے یہاں آکر کام کرنے سے یک لخت انکار کردیا کہ اتنی دور آکر ہم سے کام نہیں ہوسکتا، حالانکہ رات دن قیام کے لیے ایک کمرہ حوالے کرنے کا" دام" بھی بچھایا گیا تھا. کہنے لگی" ناس ماری" وہ ایسی جگہ ہے جہاں پان کھانے کو جی چاہے تو دو پیسے کے پان کے لیے دو کوس چل کر جانا پڑتا ہے...

جن پنچھیہ تھا وہی پتے!

ایک دن بیگم صاحب نے فرمایا، ایک آدھ روز کی بات ہو تو کوئی سہہ بھی لے، لیکن یہ روز روز برتن، جھاڑو، پوچا اور پکوان ہم سے ہونے والا نہیں... جیچرائے، الٰہی خیر ہوا. یار دوستوں کو اپنی بپتا سنائی اور اللہ کا واسطہ دے کر مدد کے طالب ہوئے. ایک رحم دل دوست مصیبت کے وقت آڑے آئے اور دوسرے ہی دن اپنی ملازمہ کو بھیج دیا. وہ آئی اور بولی بی بی صاحبہ! میرے پاس وقت بہت کم ہے، دو گھنٹوں سے زیادہ آپ کو نہ دے سکوں گی، چھ سات گھروں میں کام کرتی ہوں تب جاکے پورا پڑتا ہے میرا اور بچوں کا پیٹ پلتا ہے. وہ" کوڑھ مغز، ماٹی ملا" تو رکشہ چلاکر جو بھی کماتا ہے شام کو سیندھی خانے میں اڑا دیتا ہے، الٹا پان بیڑی کے لیے" دھینگامشتی" کرکے مجھ ہی سے وصول کرتا ہے... ہر چیز آپ تیار رکھا کریں، جھوٹے برتن ایک جگہ مجھے مل جائیں یہ نہیں کہ پلیٹ یہاں ہے تو چمچہ وہاں. کپ اس کمرے میں اور چائے دانی دوسرے میں. ڈھونڈنے اور جمع کرنے ہی میں آدھا وقت نکل جائے گا، ان دو گھنٹوں میں جتنا کام مجھ سے ہوسکے گا کرجاؤں گی. پانچ منٹ بھی زیادہ رکنے کے لیے مجھ سے نہ کہا جائے....

بیگم صاحب بھیگی بلی بن کر اس کی ہر شرط منظور کرتی چلی گئیں.... پوچھا گیا، تنخواہ کیا لوگی؟ فرمایا گیا، فی گھنٹہ سوا سو کے حساب سے مہینے کے ڈھائی سو لوں گی." بی بی صاحبہ، لوگ ... [illegible]

ساتھ رہ کر، گھر کا سارا کام کاج اور پکوان کر کے بھی اتنا نہیں لیتی جتنا تم دو گھنٹوں کے لیے مانگ رہی ہو۔ جواب ملاحظہ ہو! بی بی صاحبہ! مانگتا فقیر ہے۔ میں تو اپنی محنت کا صلہ لے رہی ہوں، ہمیشہ ذرا زبان کو احتیاط سے استعمال کیا کیجئے، ہم غریب ہیں تو کیا ہوا؟ عزت تو ہماری بھی ہے، وہ تو اُن صاحب کی صورت سے رعایت کر رہی ہوں ورنہ دوسرے گھروں سے ڈیڑھ سو روپے فی گھنٹہ مقرر ہیں۔ . . . اپنے الفاظ واپس لئے گئے اور منت سماجت کر کے اس کی ہر بات منظور کر لی گئی۔ تب جا کر اس ہنگامے سے ایک مسئلہ حل ہوا۔ مگر ایک کے حل ہو جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ مسئلوں کی قطار تھی ایک ہٹتا تو دوسرا منہ بسورے آ کھڑا ہو جاتا ــــ ایک روز خود محترمہ نے فرمایا! سچ پوچھیے تو ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی وہ آرام اور راحت یہاں نہیں جو اُس گھر میں ہمیں حاصل تھا کہ گھر کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی سارا بازار ہتیلی میں۔ پھر قیمتیں بھی بمقابلہ یہاں کے بہت کم یہاں ایک ماچس کی ڈبیہ کے لیے بھی ایک میل چل کر جانا پڑتا ہے۔ روز کا سودا سُلف لاتے لاتے صاحبزادے اب بیزار ہو گئے ہیں اور نوٹس دے دیا کہ ابو سے منگوا لیا کریں یا کسی نوکر کا انتظام کر لیں، پڑھائی خراب کر کے یہ روز روز کا جھنجھٹ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ . . . کچھ خریدی کے لیے اگر شہر جائیں تو آٹو والے میٹر سے پانچ، دس زیادہ مانگتے ہیں۔ گھر کے خرچ کے لیے جو رقم آپ دیتے ہیں وہ پندرہ دنوں ہی میں ختم ہو جاتی ہے، یا تو خود آپ گھر چلائیں یا پھر مہینہ دو گنا کر دیں ورنہ . . . . ہم نے ورنہ کو وہیں بریک لگا کر کہا! مگر بیگم، یہ مکان کا "اشغلا" بھی تو آپ ہی نے چھوڑا تھا، آپ ہی کو بڑی آرزو تھی اپنا مکان بنوانے کی، اپنا گھر الگ بسانے کی اور آپ خوب جانتی ہیں ساری تنخواہ ہم آپ ہی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اُلٹا، اسکوٹر کے پٹرول کے لیے آپ ہی سے مانگ کر پیسے لیتے ہیں۔ بولیں! پھر اپنی آمدنی میں اضافہ کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ کے ساتھی بلکہ آپ سے کم تر درجے کے عہدے دار جن کی تنخواہیں آپ کی تنخواہ سے کہیں کم ہیں، شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں اور "ماڈرن" میں گھومتے ہیں، آخر آپ کے ہاتھ میں بھی لائسنسوں کی اجرائی کا کام ہے۔ . . .

آپ چاہتی کیا ہیں؟ کیا ہم بھی رشوتیں لے کر اپنی عاقبت خراب کر لیں، ایمانداری، دیانت داری کے سارے ریکارڈ پر دھبا لگائیں؟ جب پُرانے گھر میں آرام تھا تو ہمیں اس گھر کے لیے "اشکالنے" میں بھی تو آپ ہی پیش پیش تھیں اپنے عزیزوں، رشتے داروں کی مثالیں دے دے کر ہماری غیرت کو للکارا کرتی تھیں، اب، جب یہ آرزو پوری ہو گئی تو بجائے ہنسی خوشی سے رہنے کے روزانہ نئی نئی شکایتوں کا پلندہ ہمارے سر دے مار رہی ہو . . . اور اسی گھر کی تعریف ہو رہی ہے جس میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

والدہ محترمہ ہمارے ساتھ رہنے کے لیے تشریف لائیں مگر دوسرے ہی دن بولیں، تم لوگ کس طرح یہاں رہ رہے ہو؟ آدم نہ آدم زاد کی صورت، ہُو کا عالم کسی سیکل کی گھنٹی بجنے کی بھی آواز نہیں سنائی دیتی، بچے ہول کھاتے ہوں گے، وہاں تو ان ہی آوازوں اور گھر کے اطراف بچوں کے شور وغل کو سن کر جی بہلا رہتا ہے، نا بابا آپ کا گھر آپ ہی کو مُبارک میں چلی . . . . اور ہم تھے کہ ان شکوؤں، شکایتوں کے بیچ اس طرح پسے جا رہے تھے۔ جیسے چکی کے پاٹوں کے درمیان گھن اور گیہوں پس جاتا ہے۔

سال سوا سال بھی نہ گزرا ہوگا، ہم ہمت ہار گئے نئے مکان۔ نئی کالونی اور "نئے شہر" کا نشہ جس قدر

زور سے چڑھا تھا اُسی قدر زور سے اُترنے بھی لگا۔ اور نوٹس دے دیا کہ بس، بہت ہو چکا نئے مکان کا چاؤ"
اب واپس چلو اپنے اُسی گھر میں جسے بڑی بے مروتی سے پیٹھ دکھا کر آئے تھے، "دھایے کا ہے"۔ ستر برس پُرانا۔
تعمیر کے بیے جن سے سامان ادھار لیا گیا تھا وہ اب تقاضوں پر تقاضے کرنے لگے اور ہم منہ چُھپاتے پھر رہے ہیں مگر!
کب تک چھُپے گی کیری پتّوں کی آڑ میں' ؟

اور پھر ایک دن سارا سامان ٹرکوں پر لاد کر اپنے اُسی گھر میں واپس آگئے۔ یوں لگا بہت دیر تک محروم رہنے کے بعد بچے کو ماں کی گود ملی۔ والدہ صاحبہ نہال ہوگئیں، فرمایا! میں پہلے ہی سمجھتی تھی تم کو وہاں کا رہنا راس نہ آئے گا سو، وہی ہوا۔ چلو، جو ہوا اچھا ہوا تم لوگوں کے آنے سے گھر میں پھر سے رونق آگئی۔ خیر سے اپنے گھر تو لوٹ آئے بیل گُم ہوا تو ہو جانے دو رسّی کو سنبھال کر رکھنا . . . . مکان پر "FOR SALE" کی تختی لٹکا دی گئی اور ایک ایجنٹ کے ذریعہ چند ہی روز میں سودا بھی ہوگیا۔

بڑے شوق سے پسینہ بہا کر بنوایا ہوا مکان سال سوا سال میں بِک بھی گیا اور قرضے بے باق ہوئے۔
کہتے ہیں جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو گاؤں کا رُخ کرتا ہے۔ اور ہم جیسوں کی جب آتی ہے تو مکان بنوانے کے لیے نئے شہر کا رُخ کرتے ہیں . . . .

اظہر حسن صدیقی
(پاکستان)

کلیدِ بیان بازی مکمل

اگر آپ اخبارات کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتے رہتے ہیں، تو آپ نے یہ ضرور محسوس کیا ہوگا، کہ اخبارات میں ایک چیز بڑی باقاعدگی اور یکسانیت سے روزانہ نظر آئے گی اور وہ ہیں بیانات، اگر آپ میں اتنی استطاعت اور صبر کی طاقت ہے اور آپ کے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ ان کا مطالعہ کر سکیں، تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مدت مدید سے یہ سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری و ساری ہے۔ اکثر بیان جاری کرنے والے حضرات و خواتین وہی ہیں، جو برسوں سے یہ کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بیانوں کا متن بھی کم و بیش وہی ہوتا ہے، تھوڑی بہت تبدیلی کبھی کبھار ناموں اور اداروں یا تنظیموں کے سلسلے میں بوقتِ ضرورت اور موقعہ و محل دیکھ کر کر دی جاتی ہے۔ یوں تو بیانات کی بہت سی اقسام ہیں، جو ہم آگے چل کر بیان کریں گے، لیکن ان کی دو بہت عام بنیادی اقسام ہیں، جو بہت زیادہ مستعمل ہیں اور وہ ہیں موافقت اور مخالفت میں جاری ہونے والے بیانات اگر کسی حکم، تحریک، عمل، پروگرام یا ضابطہ اور قانون کی حمایت میں کسی طرف سے کوئی بیان چھپا ہے تو یہ لازم ہے کہ دوسرے روز اس کی مخالفت میں کم از کم ایک، ورنہ دو تین بیان جاری ہوں، یہ موافقت اور مخالفت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ اخبارات ان بیانات کو چھاپنا بند نہ کر دیں، یا پھر کوئی اور نیا شوشہ یا سلسلہ پیدا نہ ہو جائے جس کی طرف بیان دینے والے متوجہ ہو جائیں۔ ان بیانات کے الفاظ اور مفہوم ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں، صرف چند الفاظ کا فرق ہوتا ہے اور کبھی وہ بھی نہیں، اگر آپ پچھلے چند برسوں کے اخبارات اُٹھا کر دیکھیں تو بعض موضوعات پر جاری ہونے والے بیانات کا متن من و عن وہی پائیں گے، جو پہلے کسی اور نام سے چھپ چکے ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ بیانات جاری کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، ساتھ ہی ساتھ بیانات کے موضوع بھی بدلتے جا رہے ہیں اور ان کی تعداد بھی روز بروز بڑھ رہی ہے، ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے عوام کے فائدہ اور اپنے گاہکوں کے آرام، نیز کمپنی کی مشہوری کی خاطر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر موضوع کے تیار بیانات، تھوک اور خوردہ قیمتوں پر اپنے سرپرستوں کو مہیا کریں، اس کے کئی فائدے ہوں گے۔ اول یہ کہ اس میدان میں نئے آنے والے پرانے لوگوں کے مرہونِ منت نہیں رہیں گے، دوئم یہ کہ پیشہ ور بیان لکھنے والوں کے محتاج نہیں رہیں گے، سوئم یہ کہ کم خرچ بر عملہ کام ہوگا، چہارم یہ کہ ہم اخبارات کے ذریعہ مناسب کمیشن پر ان بیانات کے چھپوانے کا انتظام بھی کر دیں گے، پنجم یہ کہ آپ کو بیان لکھنے پڑھنے اور لیجا کر چھپوانے کی زحمت نہیں ہوگی، ہمارے تیار کردہ بیانات کے موضوعات اور ان کی تفصیل کا مکمل

فہرست آپ کو مہیا کردی جائے گی۔ اپنے سرپرستوں کی آسانی کے لیے ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ آرڈر فون پر بھی بک کرائے جاسکتے ہیں، صرف ہمارے دفتر کو بیان کا فہرست نمبر بتانا ہوگا اور فوٹو گراف کی طرح آپ کا بیان آپ کے نام سے چھپوانے کا انتظام کردیا جائے گا۔ اگر آپ کو تیار شدہ حاضر مال کا متن پسند نہ ہو تو اس میں وقت اور موقع کے لحاظ سے مناسب قیمت پر حسب منشا تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے آرٹسٹ، خوش نویس اور کاتب حضرات کی خدمات بھی آپ کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔ ہمارے ادارے نے ایسے تجربہ کار حضرات کی خدمات بھی آپ کے لیے حاصل کی ہوئی ہیں، جنھیں بیان بازی اور بیان نویسی کا تیس سال سے اوپر کا تجربہ ہے۔ وہ آپ کو یہ مشورہ بھی دے سکتے ہیں کہ کس وقت کس قسم کا بیان موزوں رہے گا۔ آپ چاہیں تو کئی قسم کے بیانات ایک ساتھ بھی تیار کرائے جاسکتے ہیں، خیال رہے کہ تین سے زیادہ بیانات ایک ساتھ لینے والے کو خاص رعایت دی جائے گی اور تحفہ میں ان کی پسند کا ایک اعادہ بیان مفت دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر آپ چاہیں کہ بیان کے ساتھ آپ کی تصویر بھی چھپے، تو اس کا انتظام بھی مناسب نہیں اداکرنے پر ہو سکتا ہے۔

ہمارے تیار کردہ بیانات میں دو باتیں خاص ہیں، ایک تو یہ کہ یہ بیانات آپ کو قانون کی زد سے محفوظ رکھیں گے کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس کی قانونی گرفت ہو سکے، دوسری بات، یہ کہ ان کا مفہوم ایسا ہوگا کہ جو شخص جیسا چاہے مطلب اخذ کرے اور اس طرح آپ لوگوں کی بلاوجہ تنقید سے بھی محفوظ رہیں گے، لیکن ساتھ ہی آپ کے بیانات آپ کی تصویر کے ساتھ اخباروں کی زینت بھی بنتے رہیں گے۔ بڑے غور و خوص اور ایک [illegible] مدید تک ریسرچ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت چھپنے والے بیانات، بیان دینے والوں میں [illegible] مقبول ہیں اور ہر موقعہ کی مناسبت سے چھپوائے جاسکتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اگر آپ اکثر بار بار چھپنے والے بیانات کا غور سے مطالعہ کریں تو انہیں کافی حد تک مضحکہ خیز پائیں گے۔ اپنے معاشرتی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیانات کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی: ہمارے ملک میں سب سے زیادہ تعداد سیاسی بیانوں کی چھپتی اور پڑھی جاتی ہے گویا یہاں ہر آدمی کے اندر ایک سیاست داں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس جذبہ کو دبائے یا چھپائے بیٹھا رہے، مگر یہ جذبہ کم یا زیادہ ہوتا ضرور ہے، کوئی بھی تقریب یا محفل ہو، جہاں دوست احباب اکٹھے ہوں، ہیر پھیر کے کسی نہ کسی بہانے اکثر جگہ بات سیاست حاضرہ تک ضرور پہنچے گی، سب سے اچھی بات سیاست پر گفتگو کرنے میں یہ ہے کہ آپ کا سیاست داں ہونا یا سیاست کی شُدبُد رکھنا قطعی ضروری نہیں ہے، پبلک کے رُجحان اور ضروریات کو مدِنظر رکھ کر ہم نے سیاست سے متعلق ہر قسم کے بیان تیار کرائے ہیں، آپ کی آسانی کے لیے چند ایک بیانات کی خصوصیات ہم بتائے دیتے ہیں۔

(۱) تعریفی مختلف اقدامات اور احکامات کی تعریف میں واہ واہ سبحان اللہ اور زمین آسمان کے قلابے ملانیوالا بیان۔

(۲) مذمتی پہلے بیان کا بالکل الٹ، ہر قسم کی خرابیوں اور برائیوں کی نشاندہی کرنے والا اور ہر بات میں کیڑے نکالنے والا بیان ___ (۳)۔ حکومت وقت کے ہاتھ مضبوط کرنے والا بیان، (یہ بیان بہت مقبول اور مستعمل ہے)۔

(۴) قوم میں اتحاد پر زور دینے والا بیان۔ (۵) کسی کو قانون شکنی اور بدامنی پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، (آج تک کوشش بسیار کے باوجود یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اجازت کس [illegible])

(۶) بے مطلب بیان جس کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے [illegible] بیان جاری کرنیوالا

ابھی زندہ ہے اور سیاست سے کنارہ کش نہیں ہوا ہے اور اگر کوئی عہدہ بھی ملجائے تو دُعا دیں گے یا دوسرے الفاظ میں :

اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

یا

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

(۷) ایک دوسرے کو غیر نمائندہ یا غیر جمہوری جماعت بتانے والا بیان ۔

(۸) ایک دوسرے کو غیر ملکی ایجنٹ ، ملک دشمن یا غدار قرار دینے والا بیان ، (یہ دونوں بیان بھی بہت مقبول ہیں اور ہر پارٹی ایک دوسرے کے خلاف جاری ہوتے رہتے ہیں ۔)

(۹) ملک بہت نازک دور سے گزر رہا ہے ، (پچھلے چالیس سال سے یہ بیان متواتر چھپ رہا ہے اور ہنوز اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے) (۱۰) اصولوں پر کوئی سودے بازی نہیں ہوگی یا سمجھوتہ نہیں ہوگا ، (یہ بیان بھی بہت پسندیدہ اور مستعمل ہے) (۱۱) کسی کو ملک توڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی ، (آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اجازت کس ادارے سے ملتی ہے نیز اس کی فیس کیا ہے اور اب تک جنھوں نے ایسا کیا ہے انہوں نے کس سے اجازت لی تھی ۔

معاشی : معاشی بیانات کا تعلق زیادہ تر قیمتوں میں استحکام ، معاشی ناہمواری کم کرنے یا امیر و غریب کا فرق گھٹانے تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ وغیرہ سے ہوتا ہے ، اس کے علاوہ کچھ کارروائی کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے اور کچھ درپردہ دھونس بھی ہوتی ہے ہمارے پاس اس قسم کے متعدد بیانات تیار ہیں مثلاً

(۱) قیمتوں میں استحکام پیدا کرو ، (کون کرے یہ بتانا قطعی ضروری نہیں)

(۲) ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کے خلاف عبرت آموز کارروائی کا مطالبہ ، (یہ بیانات رمضان اور عید کے موقعہ پر بہت زیادہ تعداد میں جاری ہوتے ہیں ۔ ویسے بجٹ کے موقعہ پر بھی ان کی مانگ میں اضافہ ہوجاتا ہے)

(۳) مزدوروں کا استحصال بند کرو (۴) محنت کش کو اس کی محنت کا صلہ دو ۵ ۔ مہنگائی کی مخالفت میں بیان ۔

(۶) ۔ ہڑتال کی حمایت اور مخالفت میں بیان ۔

مذہبی : اس سلسلے کے بیانات میں سب سے زیادہ چھپنے والا بیان ، ایک دوسرے کو اسلام سے خارج کردینے اور کافر قرار دینے والا بیان ہے ۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ بیان سنتے اور پڑھتے چلے آرہے ہیں اور اب تو ہمیں اس بیان کا متن لفظ بہ لفظ یاد ہوگیا ہے ، کوئی ہفتہ یا مہینہ مشکل سے ہی گزرتا ہوگا کہ یہ بیان کسی نہ کسی شکل میں نہ چھپتا ہوگا ۔

اسی کے ساتھ ایک اور بیان ہے جو اتنا ہی مقبول ہے اور جس دن سے ہم نے اخبار پڑھنا شروع کیا ہے ، اس بیان سے مفر نہیں اور وہ ہے "اسلام نازک دور سے گزر رہا ہے" ۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ تمام عالم اسلام یا اسلامی ممالک کا اضافہ ہوجاتا ہے "مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت" "اسلامی نظام نافذ کرو" ان عنوانات کے تحت جاری ہونے والے بیانات بھی بہت پسند کئے جاتے ہیں ۔

سماجی :- اس زمرہ میں وہ بیانات آتے ہیں ، جو سوشل ورکر یا ان کے لیڈر وقتاً فوقتاً اپنی اہمیت اور زندگی کا ثبوت دینے کے لیے جاری کرتے رہتے ہیں ۔ یا کبھی کبھی یہی لیڈران کسی سماجی مسئلے یا منصوبے کے حق میں یا اس کے خلاف

یا کسی ریڈیو ٹی وی کا پروگرام کو جاری رکھنے یا بند کرنے کے متعلق بھی بیانات دیتے رہتے ہیں اور ان تمام بیانات کی زبان ایک سی ہوتی ہے، صرف نام اور مقامات بدل جاتے ہیں مثلاً سماج دشمن عناصر کا سر کچل ہو جائے آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کہاں پائے جاتے ہیں اور ان کے سر ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

تعلیمی : تعلیم اور طلباء کے سلسلہ میں چھپنے والے بیانات کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ کہ جن کا تعلق طلباء کے مطالبات سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اساتذہ کے مطالبات سے واسطہ ہوتا ہے۔ طلباء کے بیانات زیادہ تر ان عنوانات کے تحت چھپتے ہیں :۔ (۱) امتحان ملتوی کرو۔ (۲)۔ تعلیمی ادارے کھولو یا بند کرو (۳) طلباء کی سزائیں معاف کرو۔ (۴) ایشیا سُرخ ہے یا سبز ہے، (پتہ نہیں ان دونوں رنگوں کے علاوہ اور دوسرے رنگ ہمارے طلباء میں کیوں مقبول نہیں ہوئے)

کھیل : کھیلوں سے متعلق زیادہ تر بیانات یا تو کسی تنظیم کی مخالفت یا موافقت میں ہوتے ہیں یا پھر ٹیم کے چناؤ کے وقت کسی مخصوص کھلاڑی کو ٹیم میں شامل نہ کئے جانے کے خلاف ہوتے ہیں یا جن کو شامل کیا گیا ہے، ان کے چناؤ کے خلاف ہوتے ہیں، خصوصاً ٹیم کے کپتان مقرر کئے جانے کے خلاف اور حمایت میں۔

تعزیتی : تعزیتی بیانات کا چھپنا اور جاری ہونا بھی اسی قدر اہم اور ضروری خیال کیا جاتا ہے، جتنا دیگر بیانات کا، اور یہ بھی اسی قدر اہتمام اور باقاعدگی سے چھپتے ہیں، جتنے اور قسم کے بیانات چھپتے ہیں، چند ایک کے عنوانات سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان میں کس طرح کی زبان استعمال کی گئی ہوگی۔

۱. خراجِ عقیدت پیش کرنے والا یا خدمات کے اعتراف کا بیان ۲. گہرے رنج و غم کا اظہار۔

۳. موصوف کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ مشکل سے (یا کبھی بھی نہیں یہ آپ کے تعلقات پر منحصر ہے) پُر ہو سکے گا۔

۴. مرنے والے میں وہی خوبیاں ہوں گی جو عام طور پر پسند کی جاتی ہیں اور وہی صفات گنوائی جائیں گی جو عام طور پر گنوائی جاتی ہیں۔

اس قسم کے بیانات میں استعمال کئے جانے والے مشہور و معروف اشعار کا کافی ذخیرہ بھی ہم نے مُہیا کیا ہے، مثال کے طور پر چند ایک بہت مستعمل مصرعے درج ذیل ہیں :

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(اس کے استعمال کے لیے ضروری نہیں کہ مرحوم کا انتقال کم عمری میں ہوا ہو) ـــــ ان نمونوں کے اشعار کے علاوہ ہم نے وقت اور موقع کی مناسبت سے استعمال کئے جانے والے اشعار بھی ایک بڑی تعداد میں جمع کئے ہیں، کیوں کہ دیکھا گیا ہے کہ جب تک موقع و محل کے اشعار نہ سنائے جائیں تو لوگوں پہ خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا، اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ مصرعے یا اشعار پرانے ریکارڈوں کی طرح بالکل گھس پٹ گئے ہوں،

ـــــ فنونِ لطیفہ : ـــــ

ایک بار کسی ادیب نے مجازؔ سے کہا۔
"مجاز صاحب! ادھر آپ نے شعروں سے زیادہ لطیفے کہنے شروع کر دیئے ہیں"۔
"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟"
اور وہ ادیب مجازؔ کی اس بات پر واقعی گھبراتے ہوئے کہنے لگا۔
اسکا مطلب یہ ہو گا کہ کسی مشاعرہ میں آپ شعر سنانے کے لیے کھڑے ہوں گے تو لوگ کہیں گے شعر نہیں اپنے لطیفے سنایئے"۔
"تو میں ان سے کہوں گا" مجازؔ نے نہایت سنجیدگی اور سادگی سے کہا "کہ شاعری بھی تو فنونِ لطیفہ میں سے ہے"۔

جیسا کہ مندرجہ ذیل کا حشر ہوا ہے۔

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی ہے
پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے ۔ ۔ ۔ ۔
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہمارے جمع شدہ ذخیرۂ اشعار میں سے آپ اپنی پسند کے مطابق اشعار منتخب کرسکتے ہیں، اگر آپ کو اپنے بیان کے لیے ہمارے مہیا کردہ اشعار میں سے کوئی بھی پسند نہ آئے تو آپ اپنے بیان کی مناسبت سے مضمون دے کر شعر تیار کرا سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہم نے آزمودہ اور ماہر شعراء کی خدمات حاصل کی ہیں، جو وقت اور موقعہ کی مناسبت سے قصیدہ، مرثیہ، قطعۂ تاریخِ پیدائش و وفات وغیرہ لکھ سکتے ہیں اور ہم صرف معمولی کمیشن پر آپ کی تمام ضروریات پوری کرسکتے ہیں۔

ہم نہ صرف بیان تیار کراتے اور چھپواتے ہیں، بلکہ جواب آں غزل کے طور پر جوابی بیان بھی تیار رکھتے ہیں تاکہ ہمارے گاہکوں کو اس کے لیے دوڑ بھاگ نہ کرنی پڑے، اسی طرح جواب الجواب بھی آپ کو ہمارے ہاں تیار ملے گا۔ آپ نے بعض لغفات دیکھا ہوگا کہ بعض بیانات کا مقصد کچھ نہیں ہوتا، صرف عوام کو یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ہم نے ابھی لنگر نہیں کھولا ہے۔ آپ کی آسانی کے لیے ہم نے بیانات کی لوزا کشتی کا بھی انتظام کیا ہوا ہے، صرف تھوڑے سے خرچ پر ہم دونوں طرف سے، گولہ باری اور جوابی کارروائی کا بھی اہتمام کرسکتے ہیں اور اگر آپ کو کیچڑ اُچھالنے سے بھی دلچسپی ہو تو اس کا بھی معقول انتظام ہے۔

ہم بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ کیوں نہ ایک اخبار اسی مقصد کے لیے نکالا جائے، جس میں تمام ایسے حضرات کے بیانات اور جوابی بیانات چھاپے جائیں، جو اس کام میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہر قسم کے بیانات کے لیے الگ الگ صفحے مخصوص ہوں، جہاں یہ بیانات اور ان کے جوابات چھپیں۔ عوام کو بھی بڑی آسانی ہو جائے گی، کیوں کہ انھیں بھی یہ معلوم ہوگا کہ کس قسم کا بیان کس صفحہ پر ہوگا اور اس طرح وہ "بقیہ دیکھیے صفحہ فلاں" پر کی زحمت سے بھی محفوظ رہیں گے۔ جب تک ہماری یہ تجویز عملی جامہ پہنے اخبارات کو چاہیے کہ وہ فی الحال ایک آدھ صفحہ اس کام کے لیے مختلف سرخیوں کے تحت موافقت اور مخالفت میں چھپنے والے بیانات کے لیے مخصوص کردیں۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ بہت سے لوگ ہماری اس تجویز کی پُرزور تائید کریں گے۔ ایسی تجویز پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت خصوصاً ایسے زمانے میں اور زیادہ ہو جاتی ہے، جب کسی مسئلہ یا موضوع پر اخباروں میں گرما گرم بحث جاری ہو، ویسے ہمارے ہاں کچھ موضوع تو ہمیشہ ہی زیرِ بحث رہتے ہیں اور کچھ لوگوں کے لیے وقت گزاری کا اچھا مشغلہ ثابت ہوتے ہیں۔

ادبی بیانات :- زیادہ تر ادبی تحریکوں اور تنظیموں کی حمایت یا مخالفت میں جاری ہوتے ہیں، جن میں ترقی پسند

رجعت پسند اور اسلام پسند سرِ فہرست ہیں۔ البتہ ادب پسند کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے پسندیدہ ادیب یا شاعر کی مستند حیثیت یا عظمت منوانے کے سلسلے میں جاری ہونے والے بیانات اسی زمرہ میں آتے ہیں اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ مخالف حضرات کے بیانات بھی جاری ہوں اس لیے کہ کسی بات پر متفق ہونا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں ہے، اور نہ غالباً ہماری سرشت میں ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار "دانشوروں" کی طرف سے بھی اجتماعی بیانات کسی تحریک کی حمایت یا مخالفت میں جاری ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں شائع ہونے والے مواد کا مضمون اکثر ایک جیسا ہی ہوتا ہے اور وہی الفاظ اکثر و بیشتر استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں بھی آپ کے لیے آسانیاں مہیا کر سکتے ہیں، اس لیے ہر قسم کے علمی، ادبی معرکے سر کرنے کے لیے ہم سے رجوع کریں۔

اپیل:- بیانات کی ایک قسم وہ ہوتی ہے، جو اپیل کی شکل میں شائع ہوتی ہے۔ چندہ کی اپیل کو چھوڑ کر بقیہ تمام اپیلیں کسی نہ کسی کے نام پر کی جاتی ہیں۔ چندہ کی اپیلیں تو زیادہ تر خدا کے نام پر کی ہوتی ہیں، ورنہ اپیل مذہب کے نام پر، اسلام کے نام پر، شرافت کے نام پر، انسانیت کے نام پر (اگر اس نام کی کوئی چیز ہوتی ہے تو) وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ ہمدردی کے نام پر بھی اپیل کرنا پسند کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ شاید اس طرح کسی کا دل پسیج جائے۔

شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات

موسمی بیانات:- یہ بیانات عام طور پر خصوصی موقعوں پر جاری ہوتے ہیں، مگر ہوتے ہیں بڑی باقاعدگی سے۔ پہلے ان میں بھی استعمال کئے جانے والے الفاظ اور نقرے عام طور پر وہی ہوتے ہیں، جو برسہابرس سے چھپتے آ رہے ہیں، صرف جاری کرنے والے لوگوں اور تنظیموں کے نام بدلتے رہتے ہیں اور وہ بھی صرف اس صورت میں جبکہ پہلے لوگ داغِ مفارقت دے گئے ہوں، ورنہ وہی بیانات ہر سال انہی لوگوں کے نام سے چھپتے ہیں۔ عید پر فطرہ کی رقم اکٹھی کرنے کے لیے اور قوم کو عید کی مبارکباد دینے، اور عید کی فضیلت بیان کرنے کے لیے بھی بیان کا جاری ہونا بہت ضروری ہے، اسی طرح عیدالضحیٰ کے موقع پر بھی قوم سے کھالیں مانگنے اور سنتِ ابراہیمی کے مطابق قربانی دینے کے لیے تیار رہنے کے لیے بھی بیانات ضرور جاری کئے جاتے ہیں۔

ایک بہت اہم موقعہ بیانات جاری کرنے کا، سالانہ بجٹ کا ہوتا ہے، جب بجٹ کی تجاویز کی موافقت اور مخالفت میں بیانات کا انبار لگ جاتا ہے اور کوئی بھی متعلقہ اور غیر متعلقہ شخص اس سنہری موقعہ کو ہاتھ سے جانے دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ ان بیانات میں ہمارا پسندیدہ بیان وہ ہے جو تجارتی سیاست دانوں کی طرف سے برسہابرس سے چھپ رہا ہے اور جس کا متن کچھ یوں ہے "موجودہ حالات میں اس سے بہتر بجٹ تجاویز نہیں پیش کی جا سکتی تھیں" اس کے علاوہ محرم میں امن و امان اور قوم میں اتحاد کی تلقین"، "۲۳ مارچ اور چودہ اگسٹ کو اتحاد اور عزم و ہمت قائم رکھنے کا عہد" "۲۵ ڈسمبر کو قائداعظم کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم، اتحاد، ایمان اور تنظیم کا سبق دہرانا" اس قسم کے بیانات بھی موسمی بیانات کے زمرے میں آتے ہیں۔

مایوسی سے بچنے کے لیے آج ہی ایک نسخہ "کلید بیان بازی مکمل" ہم سے طلب فرمائیں۔ اس میں بیان چھپوانے کے ایسے ایسے گر بتائے گئے ہیں کہ آپ کا بیان فوراً چھپ جائے اور آپ کو زحمت بھی نہ ہو۔ ☐☐

(کتاب "آئینہ کیوں نہ دوں" سے)

محمد فاروق نشتر (میسور)

ڈیانا کے غم میں......!

ایسا بالکل نہیں ہے کہ ہمیں نہ غمِ دوراں تھا اور نہ غمِ جاناں کہ خواہ مخواہ ڈیانا کی موت کا غم اپنانا پڑا تاکہ زندگی کے بوجھل پن میں مزید اضافہ ہو۔ راتوں کی بے قراریاں بڑھیں اور دن کا چین اور غارت ہو ڈیانا اتنی انسانیت نواز تھیں کہ ان کی انسانیت نوازی کے چرچے اور خرچے اس عالمِ فنا میں بقا کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ جوان تو جوان ان کے عشق میں ہر عمر کے لوگ بلا لحاظ تذکیر و تانیث مبتلا تھے چنانچہ مدر تھریسا سے بھی ان کی موت کا غم سہا نہ گیا۔

ڈیانا کی ایک خوبی ہو تو ہم اس کو بہ آسانی ایک آدھ مضمون کی زلفِ گرہ گیر میں باندھ سکتے، وہ تو خوبیوں کا عطرِ مجموعہ تھیں اور بقول شخصے، جن لوگوں میں زیادہ خوبیاں ہوتی ہیں وہ اس دارِ فانی سے بہت جلد کوچ کر جاتے ہیں تاکہ زندہ بچے ہوئے لوگ ان کے ماتم میں ڈوب کر اپنی رہی سہی خوبیوں پر پانی اور آنسو پھیرتے رہیں۔

اسی خیال کے پیشِ نظر ہم نے یہی سوچا تھا کہ ڈیانا کی موت کا غم نہ منایا جائے کیوں کہ آج کل بہت کم لوگ صحیح وقت پر مرتے ہیں۔ جنھیں صحیح وقت پر مرنا نہیں آتا وہ نتیجتاً عمر کے آخری ایام ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزارتے ہیں جہاں ان کی شہرت اور نیک نامی بھی سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔ ہم صحیح وقت پر موت کے آنے کو ایک نعمت سمجھتے ہیں مگر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم انسان ہیں اور انسان اور خربوزے میں ایک مماثلت یہ ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے اور انسان کو دیکھ کر انسان غم زدہ ہوتا ہے! انسان کو دیکھ کر انسان خوش بھی ہوتا ہے مگر جس صدقِ دل کے ساتھ وہ غم زدگی میں ساتھ دیتا ہے اتنا ساتھ وہ کسی اور جذبے میں نہیں دے سکتا۔

اگر آپ کو ہماری باتوں پر یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیجئے۔ اگر آپ کی جیب خالی ہے تو یہ بڑے رنج و غم اور افسوس کی بات ہے۔ آپ ان تینوں دل دہلانے والے جذبوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کسی شناسا سے قرض مانگتے ہیں۔ ایسے میں اگر وہ شناسا ذرا سا (ذرا سا کیوں، بلکہ پورے کا پورا) دنیا دار ہوا تو بجائے آپ کے رنج و غم اور افسوس کو دور کرنے کے اپنی خود ساختہ اور تازہ بہ تازہ مجبوریوں کا ذکر کر کے خود اپنے آپ پر دھڑا دھڑ غموں کے پہاڑ توڑ لے گا یہ بھولتے ہوئے کہ اس کی جیب تو لوٹوں سے لبالب ہے۔ اسے کہتے ہیں، دوسروں کے غم میں بلا شرکتِ غیرے شریک ہو کر غموں کا مزہ لوٹنا۔ ڈیانا کی موت پر ہمیں کچھ اس قسم کے لٹے پٹے غموں کے انبار نظر آئے۔ اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں کہ ہم صرف دنیا والوں کی طرح ڈیانا کی موت پر ان کے غم میں برابر

کے شریک نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈیانا جب تک رہیں ۔ ان کی زندگی کے غم میں بھی ہم اپنے آپ کو برابر شریک سمجھتے رہے۔

وہ تنہائی سے بُری طرح نفرت کرتی تھیں ، شاید تنہا مرنے کا خوف تھا اور مریں تو اپنے ساتھ موت کی سرنگ میں کار ڈرائیور اور اپنے دوست کو بھی ساتھ لے گئیں۔ انہیں سوچوں میں غلطاں و پیچاں ہم گلبرگہ کے تاریخی راستوں سے گزر رہے تھے کہ ایک دوست سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی ڈیانا کے غم کے کاٹے لگ رہے تھے۔ چہرے سے غم اس طرح ٹپک رہا تھا جیسے پت جھڑ کے موسم میں سوکھے درخت کے پتّے۔ ان کی حالت بھی اسی درخت سے کچھ کم نہ تھی۔ یہاں پت جھڑ کا جملہ صرف سر تک محدود تھا۔ اکثر اپنے سر کے بیابان کا احوال سنانے والے نے سب سے پہلے ہمیں ڈیانا کی حادثاتی موت کا جان لیوا واقعہ اس طرح سنایا جیسے ڈیانا سے ان کا قریبی رشتہ رہا ہو۔ ویسے ان دنوں اپنوں کی حسرت ناک موت پر بھی کون کھرا رشتے دار ملال کا دلی اظہار کرتا ہے۔ لیکن وہ ملال کے اتھاہ سمندر میں اس طرح غوطے لگا رہے تھے کہ ہم نے کئی بار تسلیوں کے لفظی ہاتھوں سے تھا کر انھیں باہر نکالا ، مگر وہ تھے کہ بار بار غوطے کھا اور کھلا رہے تھے۔ ہمیں بھی لامحالہ غوطے کھا کھا کر غم زدہ ہونا پڑا۔ اندیشہ تھا کہ اگر کچھ دیر اور ہم غم زدہ ہونے سے رہ جاتے تو وہ بلک بلک کر ہمیں ہلکان کر کے عالمی سطح کا کوئی ایوارڈ جیت لیتے۔

ان کے بلکنے کو دیکھ کر ہمیں صدقِ دل یقین ہو گیا کہ تادمِ تحریر انسانیت صرف زندہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بلک بلک کر رونے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس دن موصوف کے والد بزرگوار اس دارِ فانی سے کوچ کر کے وہاں چلے گئے جہاں ڈیانا کی موت کے بعد ان کے پہنچنے کے امکانات ہیں تو اس دن قبلہ اپنے آپ کو صبر و ضبط کے اتنے پرخطر بندھنوں میں باندھے ہوئے تھے کہ ہمیں بار بار یہ احساس کچوکے لگاتا رہا کہ مرحوم آیا ، انھیں کے خاص والد ہیں یا پھر کسی اور کے والد کی موت پر ضبط کا یہ مظاہرہ ہو رہا ہے۔

یہ ہماری خام خیالی ہے۔ ورنہ کیا ضروری ہے کہ رشتے داروں کی موت پر رویا پیٹا جائے۔ مانا کہ غم ، غم ہے اور موت کا غم ایک ایسا سسکتا غم ہے جس کا کوئی دلاسا نہیں لیکن ڈیانا کی موت کا غم بڑا ہی عجیب و غریب تھا جس کی حیرت ناکیاں ڈیانا کی زندگی اور انہیں کی موت کی طرح انوکھی ہیں۔

کہنے کو لوگ تو کہتے ہیں کہ اس ترقی یافتہ و تہذیب ساختہ دنیا نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور فی الحال اسے سیکھنے کے لیے اور کوئی ہنر درکار نہیں مگر ڈیانا کی موت کے بعد ہمیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہمیں غم منانے کے طریقے سیکھنا چاہئے ٹیلی ویژن پر جس طرح ڈیانا کا غم مناتے ہوئے دکھلایا گیا۔ اسے دیکھ کر ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے دنیا ڈیانا کی موت کا غم نہیں بلکہ اتوار منا رہی ہو۔ یوں بھی آج کل تعطیل کے دن کون مرتا ہے۔ بڑے لوگ تو جان بوجھ کر بزی ڈیس (BUSY DAYS) اور بزی اورس (BUSY HOURS) میں مرتے ہیں تاکہ عالمی یا ملکی سطح پر ایک کام تو بھلا کر سکیں چاہے وہ تعطیل ہی کیوں نہ ہو۔ بقول فانی بدایونی :

ہاں نہیں زندگی عزیز ، موت ہی زندگی سہی

ڈیانا کا یہ سانحہ سن کر ہم اکلوتی اور جائز بیوی سے غم ڈیانا ، چھپاتے ہوئے یارِ غار میاں دلاور خاں افسوس کے ہاں زار زار رونے اور ہائے ہائے کرنے کے لیے پہنچے تو انھوں نے ہمارے غم اور ارادوں کو دور ہی سے تاڑ لیا اور بغیر کسی تمہید کے موت کے موضوع پر اشعار سنانے لگے۔

ہماری ذاتِ غم زدہ پر اظہار [illegible] کے بعد [illegible] افسوس کے افسوسناک رویہ میں تبدیلی نہیں آئی اُلٹا انہے

نازیبا جملوں تلے روند کر یہ ثابت کرتے رہے کہ اُن کے اور ان فوٹوگرافروں کے جذبات میں کوئی فرق نہیں جو ڈیانا کے آخری لمحات میں اُن کے مُنہ میں پانی ڈالنے کے بجائے اپنے اپنے کیمرے کلک کر رہے تھے۔ اور ہمیں ہماری موت اس طرح یاد دلاتے رہے جیسے کوئی ٹیچر کُند ذہن بچے کو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی نظم یاد دلا رہا ہو۔ ہم نے کہا۔" میاں یقین مانئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اپنی موت کو دن میں کئی بار یاد کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ خدا گواہ ہے۔ ہم اُس زمانہ سے آپ کے پاؤں کو قبر میں لٹکا دیکھ رہے ہیں جب کہ آپ بیس سال کے تھے۔" یہ سُن کر افسوس میاں کا طوفان تھا۔ جو پتا نہیں کیوں غم کی حدود کو توڑ کر غصّے کے علاقہ میں شہر نارتھی بن گیا تھا۔ پھر دیر تک غم و غصّے کے بھولے بسرے آداب یاد دلا کر چلے آئے۔

اس واقعہ کو دو دن نہیں گزرے کہ ہماری ہمشیرہ کا رشتہ طے ہو گیا اور ہم یہ خوشخبری سُنانے میاں افسوس کے یہاں پہنچے، قبلہ سویرے سویرے اپنے مکان سے اس حالت میں نکلے کہ انہیں دیکھ کر جی چاہا کہ بجائے خوشخبری کے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی افسوس ناک خبر سنا دیں کیوں کہ ان کے چہرے پر "تلاشِ بسیار کے بعد بھی خوشی یا اُمید کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پچاس سالہ زندگی نے ان کے چہرے کو مسکراہٹ کے لیے ترسا دیا ہو۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی زبردستی سہی لیکن مسکرا تو دیتے تھے مگر یہاں تو سارے جہاں کے غموں کے ڈونگرے یکمشت برس کر جل تھل ہو چکے تھے۔ یہ دیکھ کر ہمارے خوشخبری سنانے کے سارے جذبات سرد ہو رہے تھے کہ بولے۔" کہو۔ کیا کام ہے؟" ہم نے کہا "یار۔ کام تو کوئی نہیں۔ ۔ بس ایک خوشخبری سنانی تھی" خوشخبری کا نام سُن کر بھی اپنے چہرے کو جذبات سے عاری رکھا تو ہم نے کہا۔" چلو آج تم موڈ میں نہیں ہو۔ ۔ ۔ ۔ پھر کبھی سنا دیں گے لیکن ہوا کیا؟" انتہائی رقت سے بولے۔ ۔ ۔ کیا بتاؤں۔ ۔ خازنہ کے دل کا آپریشن ہے۔"
ہم نے ذہن میں قبلہ کے تمام رشتے داروں کے نام فرداً فرداً لا کر حاصل جمع نکالا تو کوئی بھی دل کے آپریشن والی خازنہ نمودار نہیں ہوئیں تو عرض کیا یار! تم نے اس نام کا رشتہ دار کب پیدا کر لیا"۔۔۔ مسکراہٹ کے قریب قریب آ کر کہا۔ ۔" خازنہ اردو میں سالی کو کہتے ہیں۔ سمجھے!"۔۔۔ ہم نے جواباً عرض کیا۔ ۔" خوش ہو جاؤ۔ ۔ ۔ اس بار بھی ہماری اردو دانی مات کھا گئی"۔ ٹالتے ہوئے کہا۔" خیر بتاؤ۔ تم کس لیے آئے تھے۔"؟ ہم نے قبلہ کا اس حد تک افسوس ناک موڈ دیکھ کر کہا۔" ہم تو ایک خوشخبری دینے کے لیے آئے تھے لیکن ایسے ماحول میں ہمیں خوشخبری دینا کچھ ناجائز سا لگ رہا ہے"۔ وہ تقریباً مسکرا پڑے اور خوشخبری سنانے پر اصرار کیا۔

ہم نے اپنا اور قبلہ کی خازنہ کا دل تھام کر خوشخبری سنائی تو گلے لگا لیا۔ مبارکبادیاں دیں اور زندگی کی طرف اس طرح لوٹ آئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ دس منٹ میں خازنہ کو اُن کے دل کے ہوتے والے آپریشن کے ساتھ بھلا بیٹھے۔

رُخصت ہوتے ہوئے ہم نے انہیں کھنگالا تب بھی خازنہ اور دل کا آپریشن یاد نہیں آیا تو ہم نے انہیں یاد دلایا تو مسکراتے ہوئے بولے۔ دُعا کیجئے۔ ۔ اللہ مالک ہے"۔ ان کی مسکراہٹ دیکھ کر ہم نے شرارتاً انہیں دوبارہ غموں کے جنگل میں اس طرح پھنسا دیا جیسے ڈیانا کے غم میں ہم لوگوں کو دیکھ کر اور لوگ ٹیلی ویژن کو دیکھ کر پھنس گئے تھے۔

وہ پھر سے مُنہ بسورنے لگ گئے تو ہم نے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ۔ پہلے تو ہمیں معاف کر دو اور کوئی فکر مت کرو۔ ۔ ۔ اللہ تو یقیناً مالک ہے۔ لیکن اگر کچھ ایسی ویسی بات ہو گئی تو گھبرانا نہیں۔ ۔ ۔ ہم ابھی زندہ ہیں۔ ۔ ۔ تمہارے لیے نئی سالی کا بندوبست کر دیں گے۔ مفت میں ایک بیوی بھی ہاتھ لگ جائے گی۔

صفیہ شاہین
(حیدرآباد)

دودھ کا جلا

ایک مشہور کہاوت ہے کہ دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک پھونک کر پیئے ہم بھی اس کہاوت پر یقین کرتے آئے ہیں۔ کیوں کہ دودھ کے جلے کچھ لوگوں نے یعنی ہمارے بزرگوں نے ہمیں دودھ سے دور رکھ کر چھاچ ہی پیتے رہنے کی صلاح کچھ اس طرح دی کہ یہ عادت گھٹی میں پڑی عادت کی طرح ساتھ ہوگئی۔

کیا زمانہ تھا وہ بھی جب خدانخواستہ گھر کا کوئی ایک فرد بھی بیمار ہو جاتا تو سارا گھر متاثر ہو جاتا کسی متعدی مرض سے نہیں بلکہ اس فرد کی بیماری سے اور جب تک وہ صحت مند نہ ہو جائے اس کی دلجوئی کی جاتی۔ اس کا پرہیز گھر بھر کا پرہیز اس کی پریشانی گھر بھر کی پریشانی چنانچہ جب ہمارے ایک بزرگ ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہوئے تو ڈاکٹر نے انھیں نمک کھانے سے منع کیا تو اُن کے ساتھ ساتھ سارے گھر نے نمک کا پرہیز کیا۔ ہمارے سالن بے مزا اور پھیکے اس وقت تک ہو گئے جب تک کہ وہ مرحوم نہیں ہوگئے۔ ہماری ایک اور بزرگ ہستی ذیابطیس کا شکار ہوگئی۔ نتیجہ میں ہمارے کھانے سے مٹھاس دُور ہوگئی اور ان کے مرحوم ہو جانے کے بعد تو ہم تا کی مٹھاس سے محروم زندگی ہمیں ان راہوں پر لے آئی جہاں ہم خود بخود جان گئے کہ کھانے میں نمک اور شکر کا کتنا استعمال ہو۔ ہم یہ بھی جان گئے کہ ہمارے بزرگ کن باتوں سے ہمیں دودھ رکھ کر چھاچ بھی پھونک پھونک کر پینے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔

چوں کہ بچپن سے ہی معزز بیماریوں اور بیماروں کو ہم نے آس پاس دیکھا تھا اس لیے ہم ڈاکٹر بننے کے آرزومند ہو گئے۔ مگر جب تک کہ ہم ڈاکٹر بننے کی قابلیت کے امتحان انٹر تک آتے، غضب کی مسابقت شروع ہو چکی تھی۔ ہم نے بھی اس مسابقت میں حصہ لینے کی ٹھانی اور خوب محنت کرنے لگے مگر پتہ چلا کہ ڈاکٹر بننے کے لیے صرف محنت کے نمبرات کافی نہیں ہوتے یہ وہ کیک ہے جس پر چاپلوسی اور خوشامد کی مہر نہ کی گئی تو بے دام رہے گا۔ منسٹروں کا دباؤ ہو تو کیا کہنے اور پھر ایسے نشانات لے کر لوگ پیشۂ طب میں داخل ہونے لگے تو ایمسٹ امتحان عالم وجود میں آیا اور جس کی تیاری کے لیے جو بھگدڑ مچی جو نفسا نفسی تھی اس نے ہمارے جنون پر ٹھنڈک ہی نہیں پوری برفباری کر دی اور ہم نے اس لابی سے باہر آجانے میں ہی عافیت سمجھی۔

لیکن کچھ دنوں بعد اخبارات میں خبریں آنی شروع ہوگئیں کہ غلطی سے ایک ڈاکٹر نے دائیں آنکھ کے بجائے بائیں کا آپریشن کردیا ایک دوسرے ڈاکٹر نے مریض کے پیٹ کے اندر چمٹا چھوڑ دیا۔ بات یہیں تک ہوتی تو کوئی بات نہ تھی ڈاکٹر نے مریض کی جان سے کھیلنے لگے تھے ایک سیدھے سادھے مریض کو انجکشن لگا کر پیٹ کا درد پیدا کیا۔ آپریشن ٹیبل پر لے گئے اس کا گردہ نکالا کسی رئیس کے لگا دیا۔ اس کا دل اس کو۔ اس کا گردہ اس کو۔ چیر پھاڑ لوٹ مار تو جنگل کا قانون تھا مگر ڈاکٹروں کا وطیرہ بن گیا۔ پھر بھی ہم نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ جیسے یہ دنیا چند نیک لوگوں کے وجود سے چل رہی ہے ویسے ہی پیشۂ طب بھی چند شریف ڈاکٹروں کی وجہ سے ساکھ بنائے رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ہم چند تلخیوں کو فراموش کرجائیں اور اپنا بلڈ پریشر CHEK کرواتے وقت ڈاکٹر کی نیک نیتی کو CHCEK کرتے رہیں جہاں اس نے ہماری معمولی بیماری کو بڑی بیماری بتایا تو ہم بھی جائیں دوسرے تیسرے چوتھے اور پانچویں ڈاکٹر کے پاس سب کی تشخیص ایک ہو تو ٹھیک ورنہ چھانچ پھونک پھونک کر پیجئے۔ اور دیکھیے کہ کون سا ڈاکٹر آپ سے کتنی فیس وصول کر رہا ہے منصوبے بنا بیٹھا ہے کونسا ڈاکٹر اپنے پڑوسی کی اولاد کی تعلیم کا بجٹ کو پالنے کا ذمہ لیے ہوئے ہے اور نشانہ آپ ہیں۔ کس ڈاکٹر کی خوفناک منصوبہ بندی گردہ نکال لینے کی ہوسکتی ہے۔ کون سے ڈاکٹر کی THESIS میں دو چار الفاظ کی کمی ہے اور وہ آپ کو تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے۔ ہم تو اپنے آپ کو خوش نصیب ہی سمجھیں جو اس دور میں پیدا ہوگئے ورنہ آنے والے زمانے میں تو شاید چھینکے سے ایک انجکشن لگے گا اور ڈاکٹر دوسرا مریض تیار کرلے گا۔ جو اس کے اشاروں پر بیمار ہو جائے یا آنکھ نکال کر دے یا پھر دل گردہ یا کلیجہ۔ بہرحال مریض کو تو ڈاکٹر کی بات سننی اور ماننی ہی پڑے گی۔ ہم نے تو سنا تھا کہ پرانے زمانے میں حکیم مریض کی نبض دیکھ کر ہی بات کی تہہ تک پہنچ جاتے اور تشخیص ہوجاتی۔ جب زمانہ بدلنے لگا تو لوگوں کو بھی یقین نہ رہا وہ حکیم کی اس صلاحیت پر شک کرنے لگے اس کا امتحان بھی ہونے لگا مثلاً ایک بلی کی ٹانگ سے سُتلی باندھ کر اس کا دوسرا سرا حکیم صاحب کے ہاتھ میں پردے کے دوسری طرف دے دیا اور حکیم نے کہا مریضہ نے کچا گوشت کھالیا ہے اور بدہضمی کی شکار ہے!

پُرانے زمانے میں جہاں حکیموں کی صلاحیتوں کا یہ عالم تھا وہیں کچھ نیم حکیم بھی تھے مگر بہرحال وہ اپنے پیشے میں ایماندار رہنا چاہتے تھے! اس لیے اگر انھیں طبی کتابیں پڑھنے میں مرض اور مریض کو جاننے میں دقت ہوتی تو وہ بزرگوں کی خدمت کرکے کوئی عطیہ حاصل کرلیتے ایک ایسے ہی حکیم کی اطاعت سے خوش ہوکر کسی بزرگ نے اس حکیم کو ملک الموت کو دیکھ لینے کی بصیرت و بصارت عطا کی۔ اگر ملک الموت مریض کے سرہانے ہوتا تو حکیم مریض کا علاج کرنے سے گریز کرتا اور اگر مریض کے پیروں کے پاس نظر آتا تو چاہے وہ کوئی دوا دے مریض بہرحال مرتا نہیں اور اچھا ہوجاتا۔ حکیم کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی اور آخرکار جب خود اس کی موت کا وقت آگیا تو ملک الموت اس کے سرہانے آکھڑے ہوئے۔ حکیم نے گھبرا کر پوزیشن بدلی اور سر کی جگہ پیر اور پیر کی جگہ سر کرلیا۔ مگر ملک الموت نے سرہانہ چھوڑا نہیں حکیم نے پلنگ سے قلابازی لگائی پھر سے سر کی جگہ پیر اور پیر کی جگہ سر کیا مگر ملک الموت سرہانے سے چپکے رہے حکیم نے پلنگ پر مسلسل لوٹ پوٹ کی آس پاس کھڑے لوگ حکیم کی اس حالت سے پریشان ہوگئے اور اس کو رسیوں سے باندھ دیا اور آخرکار حکیم کو ملک الموت کے ساتھ جانا پڑا۔

ہم اپنے طالب علمی کے زمانے میں کوشش کے باوجود ڈاکٹر نہ بن سکے۔ اب تلافی مافات کے طور پر موقع ہے کہ

ہم اپنے بچوں کو ڈاکٹر بنائیں آج کے حالات میں ہماری ذمہ داری صرف پیسے کی فراہمی ہے۔ چند لاکھ روپے سے ڈاکٹری کا نولکھا ہار حاصل کیا جا سکتا ہے چھاچھ پیتے پیتے ہم اکتا گئے ہیں۔ گرما گرم دودھ کا پیالہ ہمارے ہاتھ بڑھانے کا منتظر ہے اور ہم ہیں کہ کم بخت دل و دماغ کی جنگ کے بیچ اب بھی سوچ رہے ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے تو کلیسا میرے آگے

□□

دلیپ سنگھ اردو کے منفرد مزاح نگار تھے!

نئی دہلی۔ اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار دلیپ سنگھ کو ۲ جنوری کو مختلف ادیبوں اور دانشوروں نے شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں اردو کا منفرد طنز نگار قرار دیا۔ غالب اکیڈمی میں حلقۂ اربابِ ذوق کی جانب سے ماہنامہ انشاء کے "دلیپ سنگھ نمبر" کی رسم اجراء کے موقع پر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کہا کہ دلیپ سنگھ کے مزاح میں آمد ہی آمد تھی اور تصنع اور کھینچ تان سے وہ کبھی مزاح پیدا نہیں کرتے تھے ڈاکٹر خلیق انجم نے دلیپ سنگھ کو اس بنا پر ایک منفرد ادیب قرار دیا کہ وہ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے لیے لکھنے کے بعد عمر کے آخری دور میں ادبی دنیا میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنا ایک الگ مقام بنا لیا۔ سپریم کورٹ آف انڈیا کے سینیئر جج جسٹس ایم۔ صغیر احمد نے دلیپ سنگھ نمبر کی رسم اجراء انجام دینے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر چہ وہ "قومی آواز" میں وہ سب سے پہلے دلیپ سنگھ کا ہی کالم پڑھا کرتے تھے انہوں نے کہا کہ دلیپ سنگھ کے انتقال سے انہیں اس قدر صدمہ تھا کہ ان کے کالم "گل گفت" کی جگہ شائع ہونے والے "بقلم خود" کو انہوں نے کئی مضامین [illegible] انتظامی نے پنجابیت اور دہلویت کے تعلق سے دلیپ سنگھ کے اسلوب بیان پر ایک نہایت دلچسپ اور منفرد مضمون پڑھا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی اور برصغیر کے مشہور شاعر قتیل شفائی نے اپنی جذباتی تقریر میں دلیپ سنگھ سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔ ماہنامہ انشاء کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز نے منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ دلیپ سنگھ نمبر کے مرتب کے ایل نارنگ ساقی نے ایک دلچسپ مضمون پڑھا ——— رجہاں ثروت اور نصرت ظہیر نے دلیپ سنگھ کی یاد میں لکھے گئے مضامین پیش کئے۔ تقریب کی صدارت ہندی اور اردو کے معمر ترین ۹۰ سالہ ادیب دیویندر ستیارتھی نے کی جنہوں نے صدارتی تقریر میں اپنی زندگی کے چند دلچسپ واقعات سنائے۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مخمور سعیدی نے دلچسپ اور عالمانہ انداز میں تقریب کی نظامت کی اور آخر میں ملک کے معروف طنز و مزاح نگار اور تقریب کے مہتمم مجتبیٰ حسین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

———

روبینہ تسنیم ایم اے (سال آخر)
(گلبرگہ)

"قوم کا درد دل میں ہے دل توں میں ہے"

[شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام طالب علموں کے لیے ادبی مقابلہ جات منعقد کیے جاتے ہیں۔ جن میں طنز و مزاح کے مقابلے بھی شامل ہیں۔ اس ضمن میں احمد جلیس مرحوم کے نام سے ایک رولنگ شیلڈ جناب عبدالرب استاد لکچرار نے رکھی ہے انعام یافتہ مضامین شگوفہ کو ارسال کیے گئے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں ایک مضمون شریکِ اشاعت ہے۔ شگوفہ نے نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہم چاہیں گے کہ طالب علموں کے مضامین کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ مُدیر]

الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہوتے ہی پارٹی ٹکٹ کے لیے امیدواروں کی دوڑ دھوپ شروع ہوگئی۔ بھارت کی مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے لیڈروں میں سے کچھ چیف منسٹر اور لوک سبھا یا راجیہ سبھا کے ممبر رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ کئی نئے چہرے بھی پارٹی ٹکٹ کے لیے سفارش اور دولت کا جال بچھائے بیٹھے تھے۔ طاقت کے دلالوں کا دھندا زوروں پر تھا۔ جونیئر لیڈر سینئر لیڈروں کی چاپلوسی کرتے دکھائی دے رہے تھے پارٹی آفس کے آس پاس میلہ سا لگا رہتا تھا کھادی کے کپڑوں کا اسٹال بھی لگ گیا تھا۔ اس روز پارٹی کے صدر کی کار جیسے ہی پارٹی آفس کے احاطے میں داخل ہوئی لیڈا ہجوم صدر کے استقبال کے لیے دوڑ پڑا۔ صدر دونوں ہاتھ جوڑے نمسکار کرتا میٹنگ ہال تک پہنچ گیا۔ جب میٹنگ شروع ہوئی تو پارٹی صدر نے ایک مختصر سی تقریر کی۔

"دوستو اور ساتھیو، بھارت میں ہماری واحد پارٹی ہے جس کا ہر لیڈر جنتا کی سیوا کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اس میٹنگ میں سینئر لیڈر بھی ہیں اور جونیئر لیڈر بھی۔ کس کو پارٹی ٹکٹ دیا جائے یہ ایک گمبھیر مسئلہ بن گیا ہے۔ اس خیال سے کہ کسی کو جانبداری یا ناانصافی کی شکایت نہ ہو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پارٹی ٹکٹ کمپیوٹر کے ذریعہ دیا جائے گا۔ یعنی کمپیوٹر کا فیصلہ ہمارا فیصلہ ہوگا۔"

یہ سن کر سب لیڈر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے پھر سرگوشیاں ہونے لگیں: کیا کمپیوٹر صحیح فیصلہ کر سکے گا؟ کسی نے کہا "یار میرا بجلی کا بل تو کم بخت کمپیوٹر کی وجہ سے اس بار دس گنا آیا ہے میرے لڑکے کا رزلٹ بھی کمپیوٹر کی وجہ سے غلط شائع ہوا تھا۔" لیکن کئی نئے چہرے کمپیوٹر کے فیصلے کے حق میں بھی بھنبھنا رہے تھے۔

پارٹی کے صدر کی آواز بلند ہوئی : دوستو! اس میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہم نے ایک سوالنامہ تیار کیا ہے آپ ایمانداری اور سچائی سے سوالوں کے جواب لکھیے ایسی سچائی نہیں جیسی ہم لوگ سیاست میں برتتے ہیں۔ بھگوان کو حاضر ناظر جان کر لکھیے اور ہو سکے تو دستاویزی ثبوت بھی منسلک کیجیے آپ کی دی ہوئی تفصیلات کو کمپیوٹر چیک کرے گا۔ اس طرح صرف اہلیت کی بنیاد پر پارٹی ٹکٹ دیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگ ہمارے اس فیصلہ سے متفق ہوں گے۔

تالیوں کی گونج سے پارٹی بھون گونج اٹھا . . . .

تھوڑی ہی دیر میں ہر لیڈر کے ہاتھ میں پرچے دکھائی دینے لگے۔ ہر لیڈر اُسے پُر کرنے میں اس طرح مصروف ہوگیا۔ جیسے کوئی طالب علم امتحان کا پرچہ حل کر رہا ہو۔

جب کمپیوٹر کے ذریعہ نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ ان ہی لوگوں کو پارٹی ٹکٹ دیا گیا تھا جن کے جیتنے کا قوی امکان تھا نمونے کے طور پر ایک کامیاب امیدوار کا پر کیا ہوا سوالنامہ ملاحظہ کیجیے۔ باقی کامیاب امیدواروں نے بھی کم و بیش ایسی ہی اہلیت اور کارناموں کی (بلکہ سیاہ کارناموں) تفصیل درج کی تھی۔

نام امیدوار مع ولدیت : رام پرساد یادو ولد : دسرتھ پرساد

مذہب اور فرقہ : ہندو۔ گولی عمر : ۵۱ سال ۳ ماہ

پیشہ : دودھ کا کاروبار، گورنمنٹ سے منظورہ دو شراب خانے (ناجائز ۱۴ شراب خانے)

قابلیت : نان میٹرک

کس ریاست سے تعلق رکھتے ہیں؟ کرناٹک سے

کس انتخابی حلقے سے چناؤ لڑنا چاہتے ہیں؟ کروکشیتر نگر (کرناٹک)

اس علاقے میں آپ کا کتنا اثر ہے؟ پورا علاقہ صرف نام سے کانپتا ہے۔

اس سے قبل کتنے چناؤ لڑ چکے ہیں؟ چار چناؤ لڑ چکا ہوں۔

کتنی بار کامیاب ہوئے اور کتنی بار ضمانت ضبط ہوئی؟

ایک بار کامیاب بھاری اکثریت سے۔ تین بار ضمانت ضبط ہوئی۔

کتنے اندولنوں میں حصہ لیا اور کس قسم کے؟

۳۸ اندولنوں میں، جن میں شراب اندولن سٹّہ اور جُوا اندولن، مہنگائی اندولن، پانی اور اناج اندولن مہیلا اندولن شامل ہیں۔ راستہ روکو، ریل روکو جیسے بند ہٹانے کا کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ ہر دو چار دن بعد ایسے ایجی ٹیشن کا منٹوں میں بندوبست کرتا ہوں۔

سرکاری اور غیر سرکاری املاک کا کتنا نقصان کیا؟

زیادہ تر بسوں اور ٹرینوں کا۔ جانی اور مالی نقصان کا حساب رکھا نہیں۔

کتنے بم دھماکوں میں آپ کا ہاتھ ہے؟

اس علاقے میں جتنے بم دھماکے ہوتے ہیں وہ میرے ہی اشارے پر ہوتے ہیں۔

فسادات کتنے کروائے ؟

فسادات کروانا تو سیاسی مشغلہ ہے۔ تعداد کیا بتائیں۔

آپ کے پاس کتنے ہتھیار ہیں ؟

پورا گودام بھرا پڑا ہے !

غنڈوں کی تعداد جنھیں آپ نے پال رکھا ہے ؟

غنڈے ہی ہمیں پال رہے ہیں جب وہ جیل جاتے ہیں تو ہم ہی انھیں رہا کرواتے ہیں۔ تاہم میرے پاس کم و بیش ۱۲۰۰ افراد ہیں جن میں سے ہر ایک سو پر بھاری ہے۔

پولس ریکارڈ : کتنی بار جیل جا چکے ہیں اور کس جرم میں کتنی مدت کے لیے ؟

بیسیوں مرتبہ اتنا تو یاد ہے کہ ۷ مرتبہ قتل کے الزام میں اور ۱۲ مرتبہ سنگین الزامات کے تحت لیکن فوراً رہا ہونا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

گرفتار لوگوں کی رہائی میں کیا رول رہا ہے ؟

سیکڑوں قتل کے ملزموں کو رہائی دلائی ہزاروں نوجوان جو کسی نہ کسی الزام میں گرفتار ہوئے تھے ان کو رہا کروانے کے لیے فون ہی کافی رہا۔ سٹہ خانوں اور قحبہ خانوں کے کارکنوں کو ضمانت پر رہائی دلانا ایک معمول سا ہو گیا ہے۔

پولس محکمے میں کتنا اثر و رسوخ ہے ؟

کانسٹبل سے لے کر ڈی آئی جی تک سے گہری دوستی ہے بلکہ وزیر داخلہ بھی ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوا کرتے ہیں۔

بھوک ہڑتال پر کتنی بار بیٹھے ؟

بہت کم۔ صرف دو بار، بھوک ہڑتال کا زمانہ بھی تو نہیں رہا ہے پولس زبردستی جوس پلوا کر بھوک ہڑتال ختم کرواتی ہے ؟

جائیداد کی تفصیلات

۱۔ ذاتی و مملوکہ و مقبوضہ : دو آبائی بنگلے ۔ دو ایکڑ زمین

۲۔ بے نام ملکیت : آٹھ دلی میں چھ کلکتہ میں، بمبئی مدراس اور بنگلور میں ایک ایک ان کے علاوہ ۲۷ کمرشیل کامپلکس آٹھ سو ایکڑ اراضی دوستوں اور رشتہ داروں کے نام ہے۔

دولت کی تفصیلات :

۱۔ سیاہ : اسی کروڑ ڈالر سوئز بینکوں میں اور چودہ سو ملین ڈالر مختلف ممالک کے گم نام کھاتوں میں جمع ہیں سونا چاندی (مالیت ۸۸ کروڑ) لاکرس میں محفوظ ہے۔

۲۔ سفید : ۱۵ لاکھ

پارٹی کے لیے کتنا ڈونیشن دے سکتے ہیں ؟

۳۵ کروڑ بلکہ اس سے بھی زائد (بڑے بیوپاریوں سے وصول کر کے)

[illegible] !

موقع کی نزاکت کے مطابق گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا اگر پانی کی قلت ہو تو آب رسانی کا پروجیکٹ مکمل کروانے کا وعدہ۔ ایسا بندوبست کہ شراب کم داموں پر عوام تک پہنچ سکے۔ نشیلی دواؤں پر پابندی کا خاتمہ۔ چور بازاری کے لیے رعایت۔ ملاوٹ پر چھوٹ، طلباء کے لیے نقل مارنے کی اجازت اگر مسلمان ووٹرز اس حلقے میں ہوں تو اردو کو اس کا حق دلانے کا وعدہ، بابری مسجد کی اسی مقام پر تعمیر کا جھانسہ۔ اگر ہندو ووٹرز ہوں تو بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنوانے کا عزم ہریجنوں کے لیے برابری کا درجہ (اونچی ذات والوں کے ساتھ بھوجن اور مندر کی پوجا کے سوا) غریبی دور کرنے کے لیے نئی نئی اسکیمیں۔ ان کی تکمیل کے لیے ٹیکس تاکہ مہنگائی بھی بڑھتی رہے۔ بے زمین لوگوں کے لیے پہاڑی علاقوں میں پتھریلی زمین کے پٹے۔ بے روزگاری اور بھوک کا خاتمہ کرنے کے دعوے۔ اس کے باوجود اگر ووٹرز اپنا ووٹ ڈالنے سے گریز کریں گے تو انہیں قتل کی دھمکیاں دی جائیں گی۔ حالات دیکھ کر پولنگ بوتھ پر قبضے کا پورا انتظام ہوگا . . .

میری کامیابی صد فی صد یقینی ہے۔

دستخط امیدوار

دستخط گواہ : (۱) منڈل سنگھ پہلوان (۲) ڈان ، ٹائیگر اور دوسرے

سفارش کمپیوٹر : ۹۹٪ اس لیے پارٹی ٹکٹ دیا جاتا ہے۔

دستخط پارٹی صدر

جب ان امیدواروں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا جن کو کمپیوٹر نے پارٹی ٹکٹ کے لیے موزوں قرار دیا تھا تو ٹکٹ حاصل کرنے میں ناکام ایک نوجوان لیڈر پارٹی صدر کے پاس گیا۔ انہیں کسی ہنگامے کے بغیر پارٹی ٹکٹ دینے کا مرحلہ سر کرنے کی مبارک باد دیتے ہوئے صدر کی نہایت ضخیم پھولوں کے ہار سے گلپوشی کی اور تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ صدر ایک بار پھر اٹھ کر نمسکار کرنے لگا۔ ابھی سب لوگ میٹنگ ہال سے باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ ہال کے اندر اچانک دھماکہ ہوا اور پارٹی صدر کے پرخچے اڑ گئے۔ ▼▼

محمد اسد اللہ
(ناگپور)

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی (خاکہ)

ادب کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بہت ہی بے ضرر سی چیز ہے البتہ یہ بات ادیبوں کے متعلق نہیں کہی جا سکتی بموقع محل کا لحاظ کیے بغیر اپنے اشعار سنانے والا شاعر خطرہ کی گھنٹی ہے۔ اس سے زیادہ خطرناک مخلوق ہے ناقد، آئینے کے علاوہ جس چیز پر نظر پڑے اس کی بخیہ گری شروع کر دیتا ہے، نہ زندوں کو چھوڑے نہ مُردوں کو بخشے۔ ناقد سے بھی زیادہ بھیانک چیز ہے محقق۔ محقق کا تعلق تحقیق سے ہے اور گڑے مُردے اکھاڑ کر ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کرنے کا نام ہم نے تحقیق رکھ چھوڑا ہے۔

شہر ناگپور میں بھی محققین کے قبیلہ کا ایک شخص موجود ہے۔ نام ہے اس کا ڈاکٹر شرف الدین ساحل شہر کے ادبی حلقوں میں اس کے دم قدم سے وہ چہل پہل ہے جو ساحل سمندر [illegible] پائی جاتی ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر ساحل جو نہ کسی یونی ورسٹی کی کھونٹی پر ٹنگے ہیں نہ لیکچرر شپ کی [illegible] تقریباً ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلق تحقیق سے ہے [illegible] "قطرہ قطرہ" کی اشاعت کے بعد کہہ سکتے ہیں۔

قطرہ قطرہ [illegible]

لیکن انکساری ملاحظہ فرمائیے کہ ادب کا سمندر سمجھا جانے والا یہ شخص اپنے آپ کو ساحل ہی کہتا ہے۔ یہ ساحل ادب کا خاموش تماشائی نہیں ہے بلکہ بحیثیت شاعر تخلیق کے امرت منتھن میں شامل بھی ہے۔

ساحل صاحب کی اسٹیشنری کی ایک دکان ہے جہاں طلبہ کے لیے کتابیں دستیاب ہیں یوں تو ساحل صاحب بذاتِ خود ایک شاپنگ کامپلکس کی طرح ہیں جس میں وہ شاعری، تنقید، تحقیق اور صحافت کی دکانیں لگائے بیٹھے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہاں ہر چیز پر لکھا ہے "ناٹ فار سیل" [illegible] غالب کا یہ مصرع بھی درج ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اگر ڈاکٹر شرف الدین ساحل ادب کو دھندا [illegible] کے سامان کی دکان سجاتے اور خوب کماتے۔ ناگپور کے ادبی حلقہ میں انھیں وہی حیثیت حاصل ہے جو [illegible] کی ہوا کرتی ہے۔ ایم اے کی تین ڈگریوں کے علاوہ پی ایچ ڈی کی دو ڈگریاں [illegible] یافتہ ہونے کے بعد تحقیق کا بخار اتر جاتا ہے لیکن ساحل کے متعلق ابھی یہ تحقیق نہیں ہو سکی [illegible] کے بنے ہیں جو ان کا تحقیقی سفر جاری ہے! ادبیہ

تخلیق کے ذریعہ نا موجود کو موجود میں بدلتا ہے ناقد نا معلوم کو روشنی عطا کرتا ہے اور محقق سات پردوں میں چھپی سچائیوں کو اُجاگر کرتا ہے گزشتہ کئی برسوں سے ڈاکٹر ساحل شہر ناگپور کے پیچھے پڑے ہیں گویا ناگپور علمی، ادبی، تہذیبی حیثیت سے برآمد ہونے والا کوئی انوکھا کھلونا ہے جسے انھوں نے کھود کر نکالا اور جھاڑ پونچھ کر اپنی کتابوں کے طشت میں سجا کر ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ تحقیقی کاموں میں مشغول اس کوہکن کے ہاتھ سے جب کبھی تیشہ جُدا ہو کر گر پڑا تو اس نے بانسری اُٹھائی جس کی مدھر آواز سے "دستِ کوہکن" "شرارِ جستہ" "صحرا کی روشنی" اور "آئینۂ سیما" جیسے شعری مجموعے منظرِ عام پر آگئے۔

ساحل صاحب سے میری پہلی ملاقات میرے وطن ورود میں ہوئی تھی جہاں وہ کسی ادبی تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے: بحیثیت منتظم مجھے انھیں اٹینڈ کرنا تھا۔ ناگپور سے ادیبوں کی جو ٹولی وارد ہوئی تھی وہاں اُترتے ہی ان میں سے بیشتر تتر بتر ہو گئے جس طرح وہ آج بھی ناگپور میں پائے جاتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ساحل صاحب مسجد میں ہیں شاید دن بھر کی تمام نمازیں اکٹھی پڑھ کر جب وہ آدھ گھنٹہ بعد برآمد ہوئے تو میں ان کے ساتھ ہولیا۔ میں نے ان سے پوچھا کیا وہ ریڈیو والے ساحل ہیں تب انھوں نے بتایا کہ وہ ساحل ضرور ہیں مگر ریڈیو کے نہیں آل انڈیا ریڈیو کے اناؤنسر جمال الدین ساحل علٰحدہ چیز ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ناگ ندی اور جمعہ تالاب والے ناگپور میں دو دو ساحل کس طرح جمع ہو گئے۔ ریڈیو سے تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ راستہ بھر بجتے رہے اور مجھے محسوس ہوتا رہا کہ اس بستی پر انکوائری کمیشن بٹھا دیا گیا ہے۔

میں کاروبار کے سلسلے میں کئی مرتبہ ناگپور آیا۔ یہاں تمام ادیبوں سے ملنا ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ اس حالت میں شرف الدین ساحل صاحب کا دَم غنیمت تھا ان کے متعلق یہ افواہ گرم تھی کہ بہت ہی منہ پھٹ قسم کا آدمی ہے۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست اورنگ آباد سے تشریف لائے ان دنوں وہ انگریزی میں نعت گو شعرا پر مضمون لکھ رہے تھے اس موضوع پر ساحل صاحب کا کوئی مقالہ ان کی نظر سے گزرا وہ ان سے ملنا چاہتے تھے۔ ملاقات کے بعد مجھ سے کہنے لگے۔ ساحل تو خاصے معقول آدمی ہیں لوگوں نے مجھے خواہ مخواہ ڈرا دیا تھا کہ یہ بے باک اور گستاخ قسم کے آدمی ہیں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ کہنے والوں کی رائے کا بھی اپنا مقام ہے ساحل صاحب کی تقریر کا یہ بھی ایک اسلوب ہے ان کا اپنا ڈکشن اور اپنی ڈکشنری ہے جسے وہ موقع و محل کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں۔

کتابیں لکھنے کا نہ سہی، کتابیں چھپوانے کا ہنر تو یقیناً ساحل صاحب سے سیکھنے کی چیز ہے۔ سُنا ہے کاتبوں سے نمٹنے کا ہنر انھیں آتا ہے۔ جہاں کتابیں لکھنے میں ان کی زبان دانی کا دخل ہے انھیں چھپوانے میں زورِ بیان کا اثر ہے کسی نے مجھ سے پوچھا "کیا مزاحیہ شاعر منہ پھٹ ناگپوری یہی ہیں؟" میں نے انھیں بتایا کہ یہ ناگپور ہی کے ایک شاعر جلیل ساز صاحب کا تخلص ہے جسے انھوں نے بطور قلمی نام اختیار کر رکھا ہے۔ اس کی آڑ میں وہ خود بھی ہنستے ہیں دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں "منہ پھٹ" کی ترکیب جلیل ساز صاحب بطور اسم استعمال کرتے ہیں جب کہ یہ شرف الدین ساحل کے لیے بطور صفت استعمال کی جاتی ہے۔

شرف الدین ساحل کا نام سُنتے ہی یہ سوال سر اُٹھاتا ہے کہ آخر یہ کس سمندر کا ساحل ہے۔ سمندر میں سفر کیجیے تو کئی دنوں تک ساحل نظر نہیں آتا اور ساحل صاحب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تو سمندر ہی دکھائی نہیں دیتا۔ لوگ کہتے ہیں یہ شخص علم کا سمندر ہے ازراہِ انکسار اپنا نام ساحل رکھ چھوڑا ہے ثبوت اس کا تصانیف

کی وہ لمبی پٹی ہے جو ساحل سمندر کی طرح دُور تک چلی گئی ہے۔ البتہ بعض لوگ ایسے بھی ملیں گے جو ڈاکٹر صاحب کے ساحل ہونے سے متفق ہیں نہ سمندر ہونے سے دلیل ان کی یہ ہے کہ یہ شخص سمندر ہے تو سمندر کی طرح خاموش کیوں نہیں رہتا! یوں تو ساحل ایک ٹھہری ہوئی چیز ہوا کرتی ہے مگر شرف الدین ساحل اس معاملے میں اپنے تخلص سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ شرف الدین ساحل اور ان کی ادبی سرگرمیوں اور تحقیقی سفر پر نظر ڈالئے تو بے اختیار یہ سوال ذہن میں آتا ہے۔

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ڈاکٹر ساحل ادب کے ایک کولمبس ہیں اور تلاش و جستجو کی کشتی پر سوار غفلت و بے توجہی کی دھند کو چیرتے ہوئے حقائق کے امریکہ کی طرف رواں دواں ہیں۔ ▫▫

آزادی کے پچاس سال مناتے ہوئے

یوم جمہوریہ کے موقع پر
ہم ترنگے پرچم کو سلامی دیتے ہیں

۲۶ جنوری، ۱۹۹۸ء

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن ؟

رجسٹرڈ آفس 8/825. 1. 4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد اے پی

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱) غربت ہٹاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ ترکاری فروش، میوہ فروش، اگرتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار -/6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6.5% پر دیا جاتا ہے کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 31 مارچ 97 تک 68421 افراد میں 2116.89 لاکھ روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 8975.60 لاکھ روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 1937 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 217.21 لاکھ روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 586.67 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد کو کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹرینڈ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں۔
خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں ــــ!

قادر علی خاں
ایم اے ایچ ڈی سی مینجنگ ڈائرکٹر

اداریہ

طنز و مزاح کے نامور شاعر دلاور فگار کا ۲۱ جنوری کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ بی بی سی کے بموجب صبح وہ اخبار لینے کے لیے گھر سے نکلے تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑا ــــ طنز و مزاح کے اس مقبول ترین شاعر کے انتقال کی خبریں ہندوستان کے اردو اخباروں میں یا تو شائع نہیں ہوئیں یا پھر چار چھ دن بعد نہایت غیر اہم انداز میں اس کا تذکرہ ہوا جس شاعر نے طنز و مزاح کی شاعری کو معیار، وقار اور مقبولیت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اس کو اردو والوں نے بڑی بخالت کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کیا۔

دلاور فگار نے مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۶ء میں معرکتہ الآرا منظوم خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ اور بڑے درد کے ساتھ اس نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا کہ طنز و مزاح کو ادب میں مستحق مقام حاصل نہیں۔ اور طنز و مزاح کی شاعری نثر کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ اس کانفرنس کے بعد دلاور فگار نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہے اور پھر پاکستان منتقل ہوگئے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بتایا تھا کہ ایک آدھ سال بعد دلاور فگار ہندوستان لوٹنا چاہتے تھے لیکن حالات بدل چکے تھے۔ اس لیے انہیں ارادہ بدلنا پڑا۔ اپنی بذلہ سنجی، نکتہ رسی، زبان و اظہار پر قدرت اور کلام سنانے کے دبنگ انداز سے دلاور فگار نے بہت جلد پاکستان میں بھی اہم مقام حاصل کرلیا لیکن ہجرت اور قوم پرستی کے نئے تقاضوں نے ان کی اپج اور شاعری کے فطری عناصر کو مجروح کردیا۔ وہ زیادہ تر فرمائشی کلام لکھتے رہے گو کہ مزاح کی شوخی اس نوعیت کے کلام میں بھی بہجت طرازی کا خون دوڑاتی رہی لیکن ہندوستان میں جو دلاور تھا، پاکستان میں فگار ہوگیا ــــ ان کے ہلکے پھلکے طنز پر احتجاج غالب آگیا اور عام رویہ میں سپھر اپن ــــ وہ بے چین اور مضطرب رہتے تھے۔ دس سال قبل زندہ دلانِ حیدرآباد کے مزاحیہ مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے مشاعرے کے بعد رات تین بجے بہ اصرار ٹیکسی کے ذریعہ تنہا سوا سو کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے قاضی پیٹ پہنچ گئے اور مدراس سے دہلی جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئے ۱۹۸۸ء میں ان سے ہندپاک طنز و مزاح کانفرنس (منعقدہ کراچی) میں اور پھر امارات کے مشاعروں کے موقع پر مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شگوفہ کو ان کا قلمی تعاون ہمیشہ حاصل رہا ــــ ان کا انتقال اردو طنز و مزاح کا عظیم نقصان ہے

اللہ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے

● جناب علی سردار جعفری کو ملک کے سب سے بڑے انعام گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے اردو میں فراق اور قرۃ العین حیدر کے بعد جعفری صاحب کو یہ اعلیٰ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ادارہ شگوفہ ادب کے سردار محترم علی سردار جعفری کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ●●

ضیاء الحق قاسمی (کراچی)

اکبر ثانی حضرت دلاور فگار

مزاح و طنز کی محفل سجانے کون آئے گا
دکھی انسانیت کو اب ہنسانے کون آئے گا

بہاریں روٹھ کر چل دیں گلستانِ ظرافت سے
چمن والو بہاروں کو منانے کون آئے گا

اسی نے خفتہ بختوں کو جگایا اپنے شعروں سے
ہمیں اب خوابِ غفلت سے جگانے کون آئے گا

ظرافت کے سمندر کا وہی تو اک شناور تھا
ہماری ڈوبتی کشتی بچانے کون آئے گا

ظرافت میں صباحت اور ملاحت تھی اسکے دم سے ہی
یبوست کے نشاں آخر مٹانے کون آئے گا

ظرافت کے خزانوں کا امین باصفا تھا وہ
بقایا جات اپنے اب چکانے کون آئے گا

شہنشاہِ ظرافت تھا وہی تھا اکبر ثانی
یہ مسند اب تو خالی ہے نہ جانے کون آئے گا

ظرافت کا یہ میخانہ اب اسکے بعد سونا ہے
سبھی ہیں نا افسردہ پلانے کون آئے گا

ضیا کی عمر ساری اب تو رو رو کر ہی گزرے گی
اسے اب دیکھتے ہیں حُب کرانے کون آئے گا

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد : ۳۱ ـــــ شمارہ : ۳

ـــــ مارچ ۱۹۹۸ء ـــــ

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کتابت : محمود سلیم ۔ محمد عبدالرؤف

طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار ۔ حیدرآباد

قیمت فی پرچہ : ۱۰ روپے
زرِ سالانہ : ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ :
۳۱۔ بیچلرز کوارٹر، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس : 595716 فون رہائش : 4576064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چورن (منظومات)

وائرل ہیپاٹائٹس (پیلیا) سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں

ہیپاٹائٹس بیماری کی وجہ عام طور پر ہیپاٹائٹس وائرس ہوتا ہے
یہ وائرس جراثیم آلود پانی اور کھانے پینے کی اشیا سے پھیلتا ہے۔
اپنے آپ کو انفیکشن سے بچائیں۔ مندرجہ ذیل طریقے اپنائیں:

کھانا کھانے سے پہلے اپنے ہاتھ اچھی طرح دھولیں۔

تنگ منہ والے برتن میں رکھا ہوا صاف ستھرا پانی استعمال کریں۔

بیت الخلاء سے واپس آنے کے بعد ہاتھ اچھی طرح دھولیں

بازار میں فروخت کیے جانے والے کٹے پھٹے پھل و سبزیاں استعمال نہ کریں۔

کچے استعمال کیے جانے والے پھل و سبزیوں کو اچھی طرح دھولیں۔

ہیپاٹائٹس 'بی' اور 'سی' وائرس مریضوں کے تھوک، پیشاب وغیرہ یا ان سے متاثر افراد سے پھیلتا ہے۔ اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھیں اور مندرجہ ذیل طریقے اپنائیں۔

* ہر بار انجکشن لگانے کے لیے سیرنج کو پانی میں اُبال لیں اور ہر بار اچھی طرح اُبالی گئی نئی سوئی استعمال کریں۔ شیشے کی سیرنج اور سوئی کو استعمال سے پہلے بیس منٹ تک اُبالنے پر اصرار کریں۔
* صرف سند یافتہ ڈاکٹر کے ذریعے تشخیص کے بعد ہی انجکشن لگوائیں۔
* کسی ایسے مشہور اسپتال میں ہی آپریشن کروائیں جہاں صفائی ستھرائی پر بہت زیادہ دھیان دیا جاتا ہو۔
* کنڈوم کا استعمال کریں اور غیر محفوظ جنسی ملاپ سے پرہیز کریں۔
* خون چڑھانے کے لیے کسی ایسے رجسٹرڈ بلڈ بینک سے ہی خون حاصل کریں جہاں ہیپاٹائٹس 'بی' کا ٹیسٹ کیا جاتا ہو۔

نوٹ:

* اگر آپ کے علاقے میں پانی کے پائپ ٹوٹے ہوئے ہوں تو اپنے نزدیکی میونسپل دفتر میں فوراً رپورٹ درج کرائیں۔
* اگر آپ کے علاقے میں پیلیا کا کوئی مریض ہو تو اپنے قریبی ہیلتھ سینٹر میں رپورٹ کریں۔
* ہیپاٹائٹس 'بی' کا ٹیکہ بازار میں دستیاب ہے۔ اس کے استعمال کے سلسلے میں اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

davp 97/703

انور سدید (لاہور)

ظرافت کا تاجدار ـــــ دلاور فگار

کل رات اچانک پاکستان ٹیلی وژن کے نیٹ ورک پر خبر آگئی کہ اردو کے ممتاز مزاح نگار ظرافت کے تاجدار دلاور فگار اس دنیا کو روتا بسورتا چھوڑ کر خود عقبیٰ کو سدھار گئے، چند ماہ قبل ذاکر علی خان کی کتاب "برائے نام" کی تقریب رونمائی میں مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو دلاور فگار سے ملاقات ہوئی تھی، میرے اور ان کے درمیان بیرسٹر جمیل الدین عالی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور موضوع ادب اور ادبی ادارے تھا جو تقریب کے آغاز سے پہلے ان تین کرسیوں کے درمیان "شٹل کاک" بنا ہوا تھا۔ یہ تقریب "علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" منا رہی تھی جو کراچی میں اب زیڈ اے نظامی صاحب کی نگرانی میں ایک یونیورسٹی بھی قائم کر چکی ہے۔ صدارت کے لیے قومی اسمبلی کے اسپیکر الٰہی بخش سومرو تشریف لائے تھے جمیل الدین عالی نے انہیں دو مرتبہ پیر الٰہی بخش کہہ دیا تو انھوں نے خود اپنی تصحیح کی اور کہا "پیر الٰہی بخش اس لیے یاد آجاتے ہیں کہ وہ کراچی کے ابتدائی دور کے محسن ہیں انھوں نے بھارت سے لٹے پٹے آنے والے مسلمان قافلوں کو آباد کرنے کے لیے اس شہر میں پہلی بستی آباد کی تھی۔ دلاور فگار سن کر بولے "میں نے ان کا نام بدایوں میں سنا تھا"

میں نے پوچھا "بدایوں میں کیسے"؟

دلاور فگار نے کہا "کراچی سے جو شخص بھی بدایوں میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے جاتا تھا ـــ کیا عورت، کیا مرد ہر ایک کہتا تھا کہ اسے پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان ملا تھا۔ ہم اندازہ لگا لیتے کہ پیر الٰہی بخش پاکستان کے بہت بخیر آدمی ہوں گے ـــ جو اتنے بے گھر لوگوں کو گھر دے رہے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں ہم نے بھی بدایوں کالج کی نوکری پر لات ماری اور پاکستان آگئے لیکن پیر الٰہی بخش کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت فوت ہو چکے تھے۔ اور کراچی میں بہت سی نئی اور خوش پوش بستیاں آباد ہو چکی تھیں"۔

دلاور فگار اس روز مجھے بیمار سے نظر آئے۔ سر پر ایک کن ٹوپ پہن رکھا تھا۔ لباس ڈھیلا ڈھالا جو اُن کے ترنم کی طرح ڈھلکتا ڈھلکتا سا نظر آتا تھا۔ وضع قطع غریبانہ نہیں بلکہ غیورانہ تھی۔ مجھے اسی قسم کے لوگوں کو دیکھ کر غالب کا یہ شعر ضرور یاد آتا ہے۔

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں ❖ دنیا میں ہوں، دنیا کا طلبگار نہیں ہوں

دلاور فگار بھی طلبگار دنیا کبھی نہیں ہوئے تھے۔ اُٹھ کر چلنے لگے تو ان سے سیدھا چلا نہیں جاتا تھا۔ میں نے سمجھا کہ

میری طرح گھٹنوں کے عارضۂ پیری میں مبتلا ہیں۔" لیکن عالی صاحب نے بتایا کہ انہیں عرصے سے گردوں کی تکلیف ہے۔ اور یہ اکثر انہیں پریشان کردیتی ہے۔ ایک مرتبہ ان کے آبائی شہر بدایوں میں ان کی وفات کی خبر پھیل گئی۔ دلاور فگار نے اس خبر پر یہ قطعہ فی البدیہہ کہا:

خبر یہ لے کے بدایوں سے آیا ہے راوی ÷ کہ قبر میں بصد آرام سو گیا ہوں میں!
خبر نہیں کہ مری موت کب ہوئی لیکن ÷ سُنا تو میں نے بھی ہے فوت ہو گیا ہوں میں

یہ قطعہ ۲۵ جنوری ۱۹۹۸ء کو نہ صرف حقیقت بن گیا بلکہ ایک المناک خبر کو جنم بھی دے گیا۔ خبر یہ تھی کہ دلاور فگار بڑی صبح کو گھر سے سیر کرنے اور اخبار خریدنے کے لیے نکلے، راستے میں انہیں اچانک تکلیف ہوئی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑے۔ راہ گیروں نے عباسی شہید ہسپتال پہنچایا تو ان کی حالت انتہائی نازک ہوچکی تھی اور طبی امداد فراہم ہونے سے پہلے ہی دلاور فگار اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ تعجب خیز صدمے کی بات یہ ہے کہ جب ان کی صاحبزادی نگار ارشد ہسپتال پہنچیں تو انہیں دلاور فگار کی موت کی خبر نہیں دی گئی۔ ان کی صاحبزادی اپنے رشتہ داروں کو حادثے اور علالت کی اطلاع کرنے چلی گئیں، واپس آئیں تو دلاور فگار کی میت عباسی ہسپتال کے شعبۂ حادثات میں لاوارث پڑی تھی۔ ان کے قریب ہسپتال کے عملے میں سے کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

جمیل الدین عالی جب علی گڑھ ایسوسی ایشن کی تقریب میں دلاور فگار کی علالت کا ذکر کر رہے تھے تو ان کی زندہ دلی اور استقلال مزاجی سے بہت متاثر تھے! انہوں نے بتایا:

" دلاور فگار کو معلوم ہے کہ وہ شدید علیل ہیں اور انہیں اب آرام کرنا چاہیے۔ لیکن مشاعرہ ہو تو گھر پر رک نہیں سکتے ۔ مشاعرے کی دعوت کو ٹھکرا نہیں سکتے۔ وعدہ کرلیں تو جس حالت میں بھی ہوں ضرور پہنچیں گے اور نظم اس طرح پڑھیں گے جیسے نوجوانی کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے اور فخر سے کہتے تھے:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن "شعر"

بلاشبہ دلاور فگار کی وفات پر "لبِ شاعر پہ مکرر ہے صلا تیرے بعد" لیکن کیا اس داغ کو بحیرۂ عرب کا سارا پانی دھو سکے گا کہ دلاور فگار کس مپرسی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور انہیں بروقت طبی امداد بھی فراہم نہ کی جاسکی۔ ان کی میت ایمرجنسی وارڈ میں لاوارث پڑی رہی، ان کی بیٹی نے دریافت کیا تو انہیں بتایا ہی نہیں گیا کہ وارڈ میں جو میت پڑی ہے وہ جدید مزاحیہ شاعری کے سرخیل دلاور فگار کی ہے۔ اب کسے معلوم ہے کہ ان کا گردے کا درد شدت اختیار کر گیا تھا۔ یا انہیں دل کا دورہ پڑا تھا؟

دلاور فگار کا پیدائشی نام دلاور حسین تھا حروف ابجد کے اعتبار سے ان کا تاریخی نام سعید اختر تھا۔ وہ ۸ جولائی ۱۹۲۹ء کو بدایوں کے مقام پر پیدا ہوئے۔ شاعری کی ابتدا ۱۵ سال کی عمر میں کی، اور اپنے لیے تخلص "شباب" منتخب کیا اس دور میں بدایوں پر فانی کا سایہ تھا۔ اور شاعری بدایوں کی فضا میں اتنی رچی بسی ہوئی تھی کہ بچہ پنگوڑے میں ہی شعر گنگناتا ہے تھا۔ روتا تو باقاعدہ کسی موزوں بحر میں آواز نکالتا۔ ماں باپ خوش ہوتے کہ بچے کی پرورش شعری فضا میں ہوئی اور باپ دادا کے نام کے ساتھ فانی اور بدایوں کے نام کو بھی زندہ رکھے گا۔ دلاور فگار کے خاندان کے سب ہی لوگ شاعر تھے۔ ماموں مطلع کہتے، تو ممانی اس پر دوسرا شعر خود ارشاد فرماتیں خالو کے مصرع طرح پر دلاور فگا

خالہ دو غزلہ کہہ ڈالتی تھیں ـــ دلاور فگار کہا کرتے تھے "بدایوں میں شاعری متعدی مرض کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس سے کس طرح محفوظ رہتا؟"

دلاور فگار ابتداء میں سنجیدہ شاعر تھے، اور بے حد رومانی غزلیں کہا کرتے تھے۔ اس قسم کی نظموں کا ایک مجموعہ "حادثے" نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۵۴ میں چھپا لیکن دلاور فگار اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اسے اپنی شاعری کی تاریخ کا ابتدائی واقعہ شمار کرتے تھے، دلاور فگار کے والد شاکر حسین ممتاز شاعر شکیل بدایونی کے استاد تھے۔ لیکن شکیل نہیں جانتے تھے کہ ان کے استاد کا صاحبزادہ شاعر بن چکا تھا اور اب نہ صرف خود مشاعرے لوٹ رہا تھا بلکہ ایک نا شاعر کو غزلیں لکھ کر بھی دے رہا تھا شکیل بدایونی نے دلاور فگار کو خط لکھا:

"اپنے ٹیلنٹ (Talent) کو اس "شاعر" پر ضائع نہ کرو۔ یہ لڑکا بڑی محفلوں میں بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ بدایوں بدنام ہوگا۔ تم غزل گوئی چھوڑ کر طنزیہ مزاحیہ شاعری شروع کر دو، اور اس متقامی غزل کو اپنی تفریح کے لیے بدایوں تک محدود رکھو۔"

دلاور فگار نے شکیل بدایونی کی بات مان لی اور سنجیدہ غزل سے مزاحیہ شاعری کی طرف آگئے، اپنا تخلص "شباب" ترک کر دیا۔ تخلص "فگار" اختیار کر لیا اور یہ نام چند مہینوں ہی میں برصغیر کے طول و عرض میں مشہور ہوگیا۔ انہیں اولین شہرت اپنی نظم "شاعر اعظم" سے ملی جس میں اس دور کے ایک بڑے شاعر کی عادتوں کو نشانۂ مزاح بنایا گیا تھا۔ دلاور فگار نے اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے ایک انٹرویو نگار کو بتایا:

"نظم "شاعر اعظم" میری دوسری طنزیہ اور مزاحیہ نظم تھی لیکن ہندوستان کے بڑے بڑے شعراء سے اس نظم کے حوالے سے میرا تعارف چند ماہ میں ہوگیا اور سامعین تو سامعین ــ اکثر شعراء کو بھی یہ نظم زبانی ازبر ہوگئی تھی۔ آج تک اس نظم کے پیرپے کرنے کے ناکام تجربے کیے جارہے ہیں۔ گو کہ یہ میری دوسری نظم تھی لیکن اس نے مجھے ایک ماہ میں "آنی بدایونی" سے "آل انڈیا" شاعر بنا دیا تھا۔"

دلاور فگار کثیر التصانیف مصنف تھے۔ ان کی سنجیدہ شاعری کا نمونہ "حادثے" کے بعد طنزیہ اور مزاحیہ کلام کے مندرجہ ذیل دیوان شائع ہوئے:

۱۔ شامتِ اعمال ۱۹۶۴ ۲۔ آداب عرض ۱۹۶۶ ۳۔ انگلیاں فگار اپنی ۱۹۷۰
۴۔ سینچری ۱۹۸۶ ۵۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ۱۹۸۷ ۶۔ مطلع عرض ہے ۱۹۷۹
۷۔ فی سبیل اللہ ۱۹۹۱ ۸۔ ستم ظریفیاں ۱۹۷۱

دینی شاعری میں دلاور فگار نے "آبشار نور" تخلیق کی جو سورۃ الفاتحہ کی منظوم تفسیر ہے۔ انگریزی شعراء کی نظموں کا منظوم ترجمہ "خوشبو کا سفر" کے نام سے پیش کیا۔ "آئینۂ راغب" دلاور فگار کی ایک موضوعی کتاب ہے۔ اس میں راغب مرادآبادی پر رباعیات شائع کی گئی ہیں۔ ایک منظوم تذکرہ انہوں نے افواج پاکستان میں "نشانِ حیدر" پانے والوں پر "صلۂ شہید کیا ہے" کے عنوان سے پیش کیا۔ دلاور فگار نے جمی کارٹر پر سوانحی کتاب "بہترین کیوں نہیں" (WHY NOT THE BEST) کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان کے مزاحیہ نثر پاروں کی تعداد بھی خاصی ہے لیکن ان کا کتابی مجموعہ تاحال نہیں چھپا۔

دلاور فگار نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور معاشیات میں کر رکھے تھے۔ انگریزی زبان میں ایم اے پرائیویٹ کیا تھا۔ اردو میں انہوں نے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں ملازمت کی ابتدا، بدایوں کے اسلامیہ کالج میں لیکچرر شپ سے کی۔ پاکستان آنے کے بعد وہ کئی برسوں تک کراچی ترقیاتی ادارہ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۵ء میں ہارون کالج کراچی میں شعبۂ اردو کے سربراہ مقرر ہو گئے، یہ سب اچھے عہدے تھے لیکن دلاور فگار شاعر پہلے تھے عہدہ دار بعد میں۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ حیثیت کو ہی زیادہ فوقیت دی اور ایک ایسے شاعر کی زندگی بسر کی جو اپنے فن کے ساتھ مخلص ہوتا ہے۔ "براہِ راست" کے تحت ماہ نامہ "چہارسو" کے مدیر گلزار جاوید نے دلاور فگار کے معاشی مسائل کا سوال دریافت کیا تو انہوں نے بذلہ سنجی سے جواب دیا:

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ معاشی مسائل حل کرنے کے لیے میں بدمعاشی کی طرف کبھی مائل نہیں ہوا۔" ان کی رائے میں:

"معاشی مسائل بہت سنگین تھے۔ کراچی کے معاشرہ میں جو قدریں عام ہیں ــــ یعنی شاعروں میں "لابی رنگ" (LOBBYING) اور پبلک ریلیشننگ (PUBLIC RELATIONING) وغیرہ ــــ مجھے ان کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لہٰذا مشکلات پیش آئیں لیکن قابو پا ہی لیا جاتا ہے .... آج وہ آندھیاں چل رہی ہیں کہ ادب کے چراغ کا روشن رہنا ہی مشکل ہے۔ تمام ادبی قدریں تقریباً بدل چکی ہیں، چند اگلے زمانے والے لوگ ہیں، جن کے دم سے آج بھی ادب قائم ہے۔ ان کے بعد کیا ہوگا؟ وہی ہوگا جو اکبر الہ آبادی کہہ گئے ہیں:

"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا"

گلزار جاوید نے مزاح و طنز کے وسیلے سے معاشرے کی اصلاح کا سوال پوچھا تو دلاور فگار نے جواب دیا:

"گولی اور گالی کے اس دور میں مزاحیہ ادب سے کسی اصلاح کی توقع نہ کیجیے۔ بلکہ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کسی طنز و مزاح نگار نے کوئی تلخ اور حق بات کہہ دی تو کوئی سامع کلاشنکوف کا برسٹ مار کر اس کو داد نہ دے دے۔ میں خود ایک بار گولی کا نشانہ ہوتے ہوتے بچا ہوں۔"

دلاور فگار کا یہ بیان ملال انگیز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلاور فگار جب معاشرے کی ناہمواریوں کو زدِ مزاح میں لیتے تو معمولی بات غیر معمولی نظر آنے لگتی، اور رائی جتنی بے اعتدالی بھی ماؤنٹ ایورسٹ کی طرح ایستادہ ہو کر حضرتِ انسان کا منہ چڑانے اور اسے شرمندہ کرنے لگتی۔ واقعاتی مزاح نگاری میں سید ضمیر جعفری نے اکبر الہ آبادی کو "ہمالیہ" کے مماثل قرار دیا ہے۔ "دلاور فگار اس سرچشمۂ مزاح سے ایک ایسے دریا کی صورت میں نکلے جس کا پاٹ چوڑا ہے اور لہروں کی کاٹ میں جولانی بھی ہے اور طغیانی بھی۔" لیکن ان کی جولانی میں عریانی نہیں اور ان کی طغیانی میں حیرانی کا جو عنصر ہے وہ تمام تر زعفرانی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانی بدایونی کے دیس کے اس لوٹتے ہوئے ستارے کو جب غربت راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا تو اس نے "بے گور و کفن" لاش بننے اور ہمیشہ کے لیے لب بستگی اختیار کرنے کی بجائے زندہ دلی کا زاویہ قبول کیا اور بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ اب پورا معاشرہ دلاور فگار کی زدِ نگاہ میں تھا اور وہ اس کے معائب کو اس فنکاری سے نمایاں کرنے لگے کہ معاشرہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ اپنی یاسیت کا مداوا دلاور فگار [illegible] کرنے لگا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دلاور فگار کی شاعری سے چند اقتباسات پیش کر دیے جائیں۔

غزل کی ہیئت میں ایک نظم جس کا عنوان ہے "گیٹ کیپر اور ہم"

شور ہے بچوں کے گھبراتے ہیں گھر پر اور ہم
ورنہ خود ہی سوچئے صاحب اکہ دفتر اور ہم

تو تو گھر میں سو رہا ہے یار، تجھ کو کیا خبر
گیٹ پر زخمی پڑے ہیں گیٹ کیپر اور ہم

ہے جگہ دل میں تو اک گھر میں گزارا کرتے ہیں
آٹھ بچے، ایک بیگم، چار شوہر اور ہم

گھر کی تہذیب اور ہے، دفتر کا کلچر اور ہے
گھر کے اندر اور ہیں، ہم گھر کے باہر اور ہم

سہرے میں مرثیے کا پُرمزاح رنگ دیکھئے:

پیارے میاں کا عقد ہوا ہے بہار میں
کہہ دو کسی سے پھول بچھا دے بہار میں

نوشاہ کو عروج وہ ربِ جلیل دے
اور اس کے وارثین کو صبرِ جمیل دے

دولہا دلہن شریف گھرانے میں ہیں پلے
"لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے"

دلاور فگار کے مزاح کا ایک دلآویز روپ ان کی سیاسی شاعری میں سامنے آتا ہے، وہ گردشِ دوراں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور معاشرے کو گردشِ دوراں کا شکار بنانے والے عیار سیاستدانوں کو بھی مزاح کی گرفت میں لیتے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کڑوی باتوں کو وہ اس طرح شہد میں ملفوف کر دیتے ہیں کہ مضحکہ خیز حقیقت بھی میٹھی لطافت سے لبریز ہو جاتی ہے۔ دلاور فگار کی معنوی پیروڈی "لیڈروں کے کام آیا خونِ رائیگاں اپنا" ملاحظہ کیجئے:

لیڈروں کے کام آیا خونِ رائیگاں اپنا
بن گئے محل ان کے، بک گیا مکاں اپنا

آپ پانچ سو چھپن، شوق سے پئیں لیکن
میری ناک سے ہٹ کر چھوڑیے دھواں اپنا

دیکھیے وہ اب کس کو انتخاب کرتے ہیں
ان سے عشق کرتا ہے، پورا خاندان اپنا

گھر میں میہماں ہو کر ہم اگر نہیں نکلے
میز لے کے بھاگے گا، آج میزباں اپنا

پیار ایک بزنس ہے، کون کس کا مخلص ہے
حسن خود غرض ان کا، عشق کائیاں اپنا

بعد مردن اپنے گھر چور کس لیے آئے
ایک چارپائی ہے آخری نشاں اپنا

ہم بڑے ہیں یا غالب خود ہی فیصلہ کیجئے
انگلیاں فگار ان کی، گھٹنا خونچکاں اپنا

دلاور فگار نے ایک طویل عرصے تک "نوائے وقت"، "مساوات" اور "جسارت" میں حالات و واقعات کی بوالعجبیوں کو قطعہ نگاری سے آشکار کرنے کی سعی کی، روزنامہ "جسارت" سے ان کا ربط و تعلق نسبتاً زیادہ تھا اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ "جسارت" جن قدروں کا نقیب تھا دلاور فگار بھی ان قدروں میں نہ صرف یقینِ کامل رکھتے تھے بلکہ ان قدروں کے استحکام کے داعی بھی تھے۔ قدروں کی شکستگی پر وہ ملول ہو جاتے تھے۔ اس ملال کا کتھارسس وہ قطعہ لکھ کر کرتے اور حالاتِ زمانہ پر اپنے ردِ عمل کی مہر ثبت کر دیتے۔ انور مسعود، ضمیر جعفری، سرفراز شاہد، فاتح واسطی، شفیق الرحمن شفق، طالب علی اطہر شہر کوٹی، اسد جعفری، سرفراز شاہد، ضیاء الحق قاسمی اور عنایت علی خان نے مزاحیہ قطعہ نگاری میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ لیکن دلاور فگار نے سیاست کو معاشرت سے ہم آہنگ کرنے کا اپنا منفرد اسلوب ابھارا۔ ان کے چند اخباری قطعے،

جمہوریت اور لوٹے

ملی تھی راہ میں جمہوریت کل — جو میں نے خیریت پوچھی تو رو دی
وہ بولی میں بھی باعزت تھی پہلے — مگر "لوٹوں" نے لٹیا ہی ڈبو دی

بی بی سی ٹیلی وژن پر خبریں پڑھتے ہوئے ایک نیوز کاسٹر خاتون گھبراہٹ میں میاں نواز شریف وزیراعظم پاکستان (دوبارہ) کو بھارت کے وزیراعظم نرسمہا راؤ سے موسوم کر گئی۔ دلاور فگار نے یہ خبر پڑھی تو قطعہ بند لکھا :

بی بی سی

نرسمہا راؤ کو نواز شریف — کہہ گئی ایک بنت بی بی سی
بی بی سی تجھ سے یہ جو سہو ہوا — ایک لغزش سہی یہ چھوٹی سی
ہم تو ہنس دیں گے اس غلطی پہ مگر — تو بھی اپنی زباں کو بی بی سی

ایک مرتبہ پیر پگاڑا کا پالا ہوا ایک لنگور مر گیا۔ پیر صاحب ان دنوں وطن سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے مریدوں نے اس لنگور کی لاش کو محفوظ کر کے رکھ دیا۔ پیر صاحب واپس آئے تو اس "ممی" کو اعزاز سے دفن کیا۔ اس خبر پر دلاور فگار کا قطعہ حسب ذیل ہے :

گمنامی میں پیدا گزری تو کیا زندگی و موت ÷ اس ملک میں آئے تھے تو مشہور ہی ہوتے
انسان کی طرح جی کے تو حاصل نہ ہوا کچھ ÷ ہم پیر پگاڑا ترے لنگور ہی ہوتے

سیاسی راہنماؤں پر دلاور فگار کا ایک دلچسپ طنزیہ قطعہ دیکھئے :

زندگی ہے ایک سنگم پر حیات و موت کے ÷ شام ہے شام غریباں، صبح صبح عید ہے
مختصر لفظوں میں یہ صورت ہے اب حالات کی ÷ رہنما امید سے ہے، قوم ناامید ہے

بنگلہ دیش کے معزول صدر جنرل ارشاد کے زیر عتاب آنے پر قطعہ :

لو صدر بنگلہ دیش بھی زیر عتاب آ گئے — یہ شیوز بھی لیے ہوئے اب "نیوز ڈیک" ہے
اکثر صدور ملک یوں ہی مارے جاتے ہیں — اپنے مشاعروں کی صدارت ہی ٹھیک ہے

میرا جی کر آیا ہے کہ آپ کے سامنے دلاور فگار کے چند منفرد اشعار ان کی غزلوں سے منتخب کر کے پیش کر دوں، خود لطف اٹھاؤں آپ کو لطف حاصل کرنے کا موقعہ دوں :

ڈبے کا دودھ پی کے جو بچہ جواں ہوا — اس کو خبر نہیں ہے وہ پیدا کہاں ہوا
ایک شادی تو ٹھیک ہے لیکن — ایک دو تین چار، حد کر دی
فٹ پاتھ پہ بھی اب نظر آتے ہیں کمشنر — کیا تم نے کوئی "ادھ کمشنہ" نہیں دیکھا
خوش قسمتی سے میں نہ ہوا سوار اس جہاز میں — ساحل پہ جس جہاز کا کپتان رہ گیا
ضیاء الحق! تمہیں نے کر دیا غرقاب خادم کو — "نہ تم ساحل پہ ہوتے اور نہ کشتی ڈوبتی اپنی"
موسم کچھ ایسا گرم کچھ ایسا خراب تھا — شاعر جو بزم شعر تک آیا کباب تھا

دلاور فگار کے بعض منفرد مصرعوں اور شعروں میں ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ چنانچہ یہ اتنے زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں کہ اکثر لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کا خالق دلاور فگار ہے۔
چند مصرعے حسب ذیل ہیں:

لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا

—

سڑک پہ جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے

—

تیری قربانی کروں یا تیرے قربان جاؤں

—

حالات بنا دیتے ہیں انسان کو لیڈر　　　بے وجہ کوئی ملک کی خدمت نہیں کرتا

خوش نما وعدوں کے جھولوں میں نہ اب مجھ کو جھلا

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی کا حامل ہوگا کہ دلاور فگار مزاح نگاروں کا چلتا پھرتا پیکر تھے۔ بات اس انداز میں کرتے کہ اس سے بے ساختہ مسکراہٹ پیدا ہو جاتی۔ مثلاً ان سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کو ایک دن کی حکومت مل جائے تو؟ دلاور فگار نے کہا "اس سوال کا جواب جنرل ضیاء الحق کی اجازت کے بغیر نہیں دیا جا سکتا"۔ سوال تھا "سواری کونسی پسند ہے"؟ جواب تھا "جسے ڈرائیو نہ کرنا پڑے"۔

دلاور فگار خوش قسمت شاعر تھے کہ ان کے معاصرین میں سے سید ضمیر جعفری، انور مسعود، نیاز سواتی، رئیس امروہوی، راغب مرادآبادی، ڈاکٹر افضل اقبال، ضیاء الحق قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، تابش دہلوی اور عبدالحکیم ناصف نے ان کے فن کا اعتراف کیا۔ گلزار جاوید نے رسالہ "چہارسو" میں انہیں قرطاسِ اعزاز پیش کیا۔ میں یہاں عنایت علی خاں کے حروفِ تحسین پیش کرتا ہوں:

یہ کشتِ زعفراں کے گُلِ نو بہار ہیں　　　ملکِ سخن وری کے درِ شاہوار ہیں
ملکِ مزاح گوئی کے جاگیر دار ہیں　　　گو دل فگار ہیں، یہ دلاور فگار ہیں
اِن کا مقام مجھ سے بہایت بلند ہے　　　بیڑی اگر ہوں میں تو دلاور سگار ہیں

مجھے یوں لگتا ہے کہ ہمارے عہد میں اللہ تعالیٰ نے دلاور فگار کو اکبرالہ آبادی کی صلاحیتیں دے کر دنیا میں بھیجا تھا۔ دلاور فگار کی وفات سے اکبرالہ آبادی دوبارہ وفات پا گئے۔ اکبرالہ آبادی کی جس مسند کو دلاور فگار نے پُر کیا تھا وہ عرصے تک خالی رہے گی تاآں کہ کوئی نیا دلاور فگار پیدا ہو جائے۔

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ اپنی تخلیقات پر مکمل پتہ ضرور لکھیں۔

قیسی قمر نگری

ھائیکو

۱

ظروف خانہ سے تیلوں کی چکناہٹ ہٹانے کو
نہ نرما کی ضرورت ہے نہ حاجت سرف پاؤڈر کی
بس ان کی جگمگاہٹ کے لیے درکار ہے شوہر

۲

ساری دنیا کو بہ اک لمحہ جلا سکتی ہے
قلب شاعر میں نہاں آتش شعری قیسی
جب کہ اس آگ سے جلتا نہیں گھر کا چولھا

۳

کر لیتے ہیں مل بانٹ کے ہم دونوں ہر اک کام
دھوتا ہوں میں کپڑے تو پہنتی ہے وہ کپڑے
وہ کھاتی ہے کھانا تو بناتا ہوں میں کھانا

۴

ماروتی کار، بنگلہ، کلر ٹی وی اور فریج
بیٹی کو تم جہیز میں ہر چیز دو مگر
دینا نہ بھولو آگ بجھانے کی اک مشین

۵

چوہوں کی تعداد زیادہ اور شیروں کی کم کیوں ہے؟
اس پر صدیوں غور کے بعد یہ ایک نتیجہ اخذ ہوا
شیروں کی شادی ہوتے ہی بن جاتے ہیں وہ چوہے

۶

چاہتے ہیں وہ اک ایسی بیوی
جو ہو معشوق بھی اور بیوی بھی
یعنی مطلوب ہے ان کو ہڈ والف

۷

ہمیں معلوم ہے یہ لفظ "کشتی"
مونث کس لیے لکھا گیا ہے!
ہوا کی سمت ہی چلتی ہے کشتی

۸

پہلے آگے نواب و راجا کے
لوگ عزت سے سر جھکاتے تھے
آج حقدار اس کے ہیں حجام

۹

صرف و نحو کا ٹیچر
بچوں سے کہہ رہا ہے
"تنکے" کی جمع "جھاڑو"

۱۰

شاعری کام آگئی میری
مل گئے آج ڈائس پر مجھ کو
میری بیگم کے سائز کے پاپوش

۱۱

بعد از مرگ اپنا سارا کچھ
بخش ڈالا یتیم خانے کو
چار بیٹے اور ایک عدد بیٹی

۱۲

باپ تھا میں بھی دو دو بیٹوں کا
آج میں ایک ہی کا والد ہوں
دوسرا بن گیا ہے اب شاعر

خامہ بگوش

سخنورانہ سخن پروری

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ منیر نیازی سخنور بڑے ہیں یا سخن پرور۔ جیسی عمدہ باتیں وہ کرتے ہیں، اس کے لیے اردو میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا "باتونی" اور "بسیار گو" میں ذم کا پہلو پایا جاتا ہے۔ ان لفظوں کا استعمال کرنا ہمارے ممدوح کے شایانِ شان نہیں، اس لیے ہم نے "سخن پرور" کا سہارا لیا ہے۔ ممکن ہے بعض اہلِ زبان یا زبان داں اس لفظ میں بھی ذم کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوں، ہم اپنا کالم پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

منیر نیازی بلاشبہ موجودہ عہد کے ایک خوبصورت شاعر ہیں۔ شاعری تو وہ کبھی کبھار کرتے ہیں اور بہت سوچ سمجھ کر لیکن ان کے انٹرویو آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں، اور باتیں بھی ایسی کہ ان پر شعروں کا گمان ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ شعر وزن میں ہوتے ہیں موضوع کوئی بھی ہو، وہ جب رواں ہو جاتے ہیں تو ان کی روانیِ طبع کے آگے بند باندھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی باتیں بہت مزے کی ہوتی ہیں، جی چاہتا ہے کہ سلسلۂ کلام کبھی ختم نہ ہو، خواہ سامع ختم ہو جائے۔ ایک سامع ہی کیا منیر نیازی جس کے بارے بات کرتے ہیں، اُسے منزلِ آخر تک پہنچا دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ خبر چھپی تھی کہ منیر نیازی نے ایک پستول خرید لیا ہے۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ جو شخص جنبشِ لب سے کام نکال سکتا ہو، اُسے پستول خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ منیر نیازی کی جنبشِ لب کا بھرپور اندازہ ان کے اس تازہ ترین انٹرویو سے کیا جا سکتا ہے جو کراچی کے انگریزی کا رسالے "ہیرالڈ" میں چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے معاصرین کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شکل و صورت پر بھی ناگفتہ بہ قسم کے تبصرے کیے ہیں۔

"ہیرالڈ" کے نمائندے نے جب انٹرویو لینے کے لیے انہیں فون کیا اور ان کے گھر تک پہنچنے کے لیے رہنمائی چاہی تو انہوں نے بتایا ان کا دولت خانہ لاہور ٹاؤن شپ میں گندے نالے کے بالکل ساتھ ہے۔ اس نالے کے بدبودار پانی کی نکاسی کے لیے ان کے گھر کے بالکل سامنے پمپ لگا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی عذاب ہوگئی ہے اور مکان کی قیمت بھی گر گئی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بلدیاتی کارکنوں نے اس کا نام "منیر نیازی ڈسپوزل

بھرے لہجے میں کہا، "یہ گندا نالا زندگی بھر میرا پیچھا کرتا رہا ہے۔ میں نے لاہور کے جس محلے میں بھی رہائش اختیار کی، وہاں ایک عدد گندا نالا ضرور تھا۔ ہمیں حیرت ہے کہ منیر نیازی نے گندے نالوں کی ہمسائیگی میں ایسی خوبصورت اور خوشبودار شاعری کیسے کرلی۔ یہ تو معلوم تھا کہ شاعروں کو زندگی بھر نالہ و فغاں سے کام رہتا ہے، یہ اب معلوم ہوا کہ گندا نالہ بھی زندگی بھر ساتھ دے سکتا ہے۔

انٹرویو کے دوران منیر نیازی نے بتایا کہ ایک زمانے میں انہوں نے رائٹرز کالونی بنانے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں خاصی بھاگ دوڑ کی گئی مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ اچھا ہی ہوا کہ یہ تعمیراتی منصوبہ منیر نیازی کے دوسرے خیالی منصوبوں کی طرح مکمل نہ ہوا، ورنہ ہر مکان کے سامنے ایک گندا نالہ ضرور ہوتا اور پھر ہر صاحب مکان ادیب کے نام پر ایک ڈسپوزل پمپ بھی لگانا پڑتا۔ ویسے بعض حکماء کا خیال یہ ہے کہ ہر ادیب کے مکان کے ساتھ ایک ڈسپوزل پمپ ضرور ہونا چاہیئے تاکہ ایک دوسرے کے خلاف وہ جو کچھ سوچتے رہتے ہیں، اس کی نکاسی ہوتی رہے ورنہ یہ بات سچ ثابت ہوجائے گی کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں۔

منیر نیازی نے اوروں کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اپنے متعلق بھی خاص فکر انگیز باتیں کیں۔ ان کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ مجھے مطالعہ کا شوق نہیں ہے۔ جب کسی ادیب کی کوئی کتاب مشہور ہو جاتی ہے تو وجہ شہرت جاننے کے لیے اسے پڑھ لیتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ آوارگی میں اور مختلف قسم کے لوگوں کے درمیان گزارا ہے، جو کچھ سیکھا انہیں لوگوں سے سیکھا اور انہیں سے مجھے شعر کہنے کی تحریک ملی ہے۔ میرا وہی حال ہے جو اس عقل مند کا تھا جس سے پوچھا گیا تو نے عقل کہاں سے سیکھی تو اس نے جواب دیا، بے وقوفوں سے۔

غالب نے انسان کو "ورقِ ناخواندہ" کہا تھا (ہے ہر ایک شخص جہاں میں ورقِ ناخواندہ)۔ منیر نیازی نے غالب کے نہلے پر دہلا مارا ہے اور مذکورہ ترکیب سے "ورق" کو خارج کر کے باقی جو کچھ بچتا ہے، اس میں موجودہ عہد کے انسان کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ درست بھی ہے، جب الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے ورق اور اس پر جو کچھ لکھا جاتا ہے، ہماری زندگی سے خارج ہوگیا تو غالب کی ترکیب میں بھی یہ "ورق" کیوں باقی رہے۔ ناخواندگی کی وجہ سے انسان بہت سی پریشانیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ علم شکوک و شبہات کے دروازے کھولتا ہے اور اس کا سودا بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ پہلے ہی ہمارے ملک میں مہنگائی بہت زیادہ ہے، علم کے ذریعہ مہنگے سودے کرنے سے مہنگائی اور بڑھے گی اور زندہ رہنا مزید مشکل ہوجائے گا۔

یہ بات منیر نیازی کی علم دوستی کی دلیل ہے کہ وہ ان کتابوں کو ضرور پڑھتے ہیں جو مشہور ہو جاتی ہیں۔ پچھلے پچیس برسوں میں جو کتابیں مشہور ہوئی ہیں، خوش قسمتی سے وہ منیر نیازی ہی کی تصانیف ہیں۔ امید ہے منیر نیازی کا نے انہیں ضرور پڑھا ہوگا، اگر نہیں تو اب پڑھ لیں، گھر کی مرغی دال برابر سمجھ کر نظر انداز نہ کریں۔ ان کے مطالعے سے انہیں معلوم ہوگا کہ گفتگو میں دوسروں کو بُرا بھلا کہنے والا کیسے شائستہ لہجے میں شاعری کرتا ہے۔

ہاں! پچھلے پچیس برسوں میں ایک اور کتاب "آبِ گم" بھی مشہور ہوئی ہے، مگر افسوس کہ بقول انیس ناگی، اس کتاب کو ڈکشنری کی مدد کے بغیر پڑھنا ممکن نہیں، گویا علم حاصل کرنے کی طرح اس کتاب کا پڑھنا بھی بڑا مہنگا سودا ہے کہ اس کے ساتھ ڈکشنری خریدنی پڑتی ہے۔ ہماری رائے میں ان دو مہنگی کتابوں کو ایک ساتھ نہیں خریدنا چاہیئے،

بہتر ہوگا کہ پہلے ڈکشنری خریدلی جائے جب لفظوں کے معنی خوب اچھی طرح ذہن نشین ہوجائیں تو پھر اسے آدھی قیمت پر دکاندار کو واپس کر کے "آبِ گم" خریدلی جائے۔ اس طرح رقم کی بچت بھی ہوجائے گی اور بہت سے ان الفاظ کے معانی بھی معلوم ہوجائیں گے جو "آبِ گم" میں استعمال نہیں کیے گئے۔ لفظوں کے معانی معلوم ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بات کرتے وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، ورنہ اسے دوسرے ہی بتاتے ہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔

نقادوں کے بارے میں منیر نیازی کی رائے ہمارے نقادوں کی تنقید سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نقادان کی شاعری کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ عام طور پر لوگ نقادوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے لیکن وہ نقادوں کی تحریریں پڑھنے کے بعد ایسا کرتے ہیں۔ منیر نیازی نے تو اپنے اوپر نہ پڑھنے کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ ظاہر ہے بغیر پڑھے کوئی رائے قائم کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اگر منیر نیازی کچھ نقادوں کی تحریریں پڑھ لیں تو امید ہے ان کی رائے میں قدرے لچک پیدا ہوجائے گی۔ بعض نقاد منیر نیازی کی شاعری کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دِنوں شمس الرحمٰن فاروقی نے منیر کی نظم "آغازِ زمستاں میں دوبارہ" کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا: "میرا دعویٰ ہے کہ اس پایہ کی کوئی نظم فیض نے نہیں لکھی"۔ کیا اس قولِ فیصل کے بعد بھی منیر نیازی یہ کہیں گے کہ نقادان کی شاعری کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟ فاروقی کی رائے جاننے کے بعد منیر نیازی کو غصہ تھوک دینا چاہیے اور اس دن کا انتظار کرنا چاہیے جب کوئی نقاد انہیں صرف ایک نظم کے حوالے سے نہیں پوری شاعری کے حوالے سے فیض سے بڑا شاعر ثابت کر دکھائے۔ شعبدہ باز ٹوپی سے کبوتر نکال سکتے ہیں تو نقادوں کے لیے ہاتھ کی صفائی دکھانا کون سا مشکل کام ہے۔ وہ بھی ایک کی ٹوپی دوسرے کے سر پر رکھ سکتے ہیں۔ (جی چاہتا ہے کہ یہاں منیر نیازی کی مذکورہ نظم درج کردی جائے، لیکن افسوس کہ ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ یہ خوف دامن گیر ہے کہ کہیں شمس الرحمٰن فاروقی کا دعویٰ باطل نہ ہوجائے)۔

فیض صاحب کا ذکر آیا ہے تو یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ منیر نیازی فیض کے بارے میں ویسی بری رائے نہیں رکھتے جیسی شمس الرحمان فاروقی کی ہے کہ وہ فیض کو ان کے معاصرین میں سب سے کمتر سمجھتے ہیں۔ منیر نیازی سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ سمجھ کا یہ پھیر ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جو شاعروں اور گھوڑوں کو ایک ہی طرح کے جاندار نہیں سمجھتے۔ گھڑدوڑ کے میدان میں گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں نہ کہ شاعر۔ گھوڑے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے ناک کی سیدھ دوڑتے ہیں، شاعر اپنی اپنی چال چلتے ہیں اور اپنے اپنے راستے پر۔

فیض صاحب تو بزرگ تھے، اس لیے منیر نیازی نے انہیں معاف کردیا، لیکن اپنے ہمعصروں کو وہ معاف کرتے نظر نہیں آتے۔ ان کا کہنا ہے کہ "میرے معاصرین میرے سب سے بڑے دشمن ہیں، کیوں کہ وہ خراب شاعری کر رہے ہیں۔ ان میں کوئی شاعر نہیں ہے سب کے سب تک بند ہیں"۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا کہ دوسروں کے بارے میں خراب رائے رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن منیر نیازی نے اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کیا۔ فرماتے ہیں: "آج کے دور میں میرے علاوہ کوئی شاعر نہیں ہے"۔ گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل سے صرفِ نظر کر کے اپنے آپ کو آج کے دور تک محدود کر دینا بڑی ناانصافی ہے۔

منیر نیازی نے غصے میں ایک ہم عصر کو انتہائی "بدصورت" اور دو ہم عصروں کو "چھوٹے چوہے" کہہ کر یاد کیا ہے۔ ہم نے تو یہ سُنا ہے کہ منیر نیازی درویش صفت آدمی ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ قہرِ درویش برجانِ درویش، لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ کچھ الگ قسم کے درویش ہیں جن سے قہرِ درویش برجانِ دیگراں کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔

منیر نیازی سے نئے شاعروں کے بارے میں رائے پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: "میں ان لوگوں کی وہ کتابیں دیکھتا رہتا ہوں جو یہ میرے پاس بھیجتے ہیں۔ بعض نئے شاعروں کی کتابوں پر میری رائیں بھی درج ہیں، مگر ان کتابوں میں شاعری نہیں ہے۔ جب کوئی نیا شاعر ایک آدھ کام کا مصرع لکھتا ہے تو امید بندھتی ہے کہ وہ شاعری کرے گا، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد وہ دوسروں جیسا ہو جاتا ہے۔ اس کے سینئر معاصرین اس پر اپنا سایہ ڈال دیتے ہیں یا تعریفیں کر کے یا مشورے دے کر اسے تباہ کر دیتے ہیں۔"

منیر نیازی کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ نئے شاعروں کی تباہی کے ذمہ دار وہ خود بھی ہیں۔ کئی شاعروں کے مجموعوں پر ان کی جو تعریفی رائیں شائع ہوئی ہیں، وہ ان کے استحقاق سے زیادہ ہیں۔ منیر نیازی سے گزارش ہے کہ وہ نئے شاعروں کے بارے میں مبالغہ آمیز رائے دینے سے اجتناب کریں تاکہ انہیں تباہ ہونے سے بچنے کا موقع مل سکے۔ ہاں! موصوف اگر چاہیں تو ان پر اپنا سایہ ضرور ڈال سکتے ہیں تاکہ وہ اچھی شاعری کر سکیں ویسے بھی ہمارے ادب میں سایہ ڈالنے کی روایت بہت پرانی ہے جس کے ثبوت میں یہ مشہور شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا ÷ ناتواں ہوں، کفن بھی ہو ہلکا

منیر نیازی مزاحمتی ادب سے بھی خوش نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں: "ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں ہر شاعر پر عوامی شاعر بننے کی دھن سوار تھی۔ ضیاء الحق کے زمانے میں یہ شاعر ایک خاص قسم کی شاعری کرنے لگے جسے مزاحمتی ادب کا نام دیا گیا۔ یہ سارا مزاحمتی ادب اس لائق ہے کہ اسے کوڑے دان میں ڈال دیا جائے۔"

منیر نیازی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان کی خواہش پوری کر دی گئی ہے۔ اکادمی ادبیات نے مزاحمتی ادب کو کوڑے دان میں ڈال دیا ہے یعنی کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ ۵۷

سید طالب حسین زیدی (حیدرآباد)

(پہلی قسط)

شرم تم کو مگر، نہیں آتی!

احساس برتری (Superiority complex) ایک ایسی بیماری ہے جس کے وائرس جب کسی انسان کے دل و دماغ میں سرایت کر جاتے ہیں تو وہ طرح طرح کی قلابازیاں کھانے لگتا ہے۔ رنگ رنگ کی خیالی خوبیاں، اچھائیاں اور ہنرمندیاں اپنے اندر تلاش کر کے ایک مرتبہ خود بھی یہ یقین کر بیٹھتا ہے "میرے سوا سب حقیر ہیں۔ میرا کوئی ثانی نہیں"۔ موقع بے موقع دھونس جمانے کے لیے اپنی حکمت و دانش کے تذکرے کرتا رہتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے، سامنے والے میں "بڑائی" آپ ہی آپ نظر آرہی ہے تو اُس کے دل میں یہ چور سر اُبھارتا ہے کہ ایسی ہی صفتیں مجھ میں بھی ہونی چاہئیں بلکہ اس سے سوا، پھر وہ بے مغز زبان کا سہارا لے کر شخص مذکور کے کمالات میں کیڑے نکال کر کم ظرفی سے یہ جیریہ جتانے لگے گا! لوگ خواہ مخواہ تمہیں بانس پر چڑھاتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے تم میں یہ قابلیت ہے ہی نہیں۔ اور میں چاہوں تو ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہوں۔ شعر کہنے پر آؤں تو میر و غالب میرے آگے پانی بھرنے لگیں حکمت و فلسفہ کا ذکر ہو تو افلاطون کانوں پر ہاتھ رکھ لے۔ شکاریات پر گفتگو ہو تو آپ کا مارا ہوا شیر پندرہ فٹ سے ایک انچ بھی "اِدھر" ہونے کی جرأت نہ کرے اور ضرورت پڑنے پر جم کاربٹ اور صاحب "کتاب شکار" شہرہ آفاق شکاری نواب قطب یار جنگ بہادر کو بھی دو چار کام کی باتیں سکھلا دیں۔ . . . ان اصنام خیالی کی کہانیاں سن کر وہ غریب مسکراتے ہوئے نہایت متانت سے جواب دے گا، اول تو مجھ میں یہ کمالات ہیں ہی نہیں اور نہ میں کبھی اس کا دعویٰ کرتا ہوں۔ اگر آپ "بحر العلوم" ہیں تو آپ کو مبارک . . . .

ذرا عمیق نظروں سے مریض کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا "احساس برتری" نام کی کسی شے کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ احساس کمتری (Inferiority complex) کی ایک انتہائی شکل ہوتی ہے جب یہ احساس اپنی آخری حدوں کو چھو لیتا ہے تب، اُس کے بطن سے اِس کی ولادت ہوتی ہے اور اس مرض میں مبتلا کھوکھلا، کم ظرف اور بے مغز "خلیل خاں" خیال فاختے اڑا اڑا کر رعب جمانے میں سرگرداں ہو جاتا ہے اور خود بھی اس بات پر ایمان لے آتا ہے کہ وہ تمام تر "عالی جاہیاں" اور "عزت مآبیاں" اُس کے اندر موجود ہیں جو دوسروں میں نہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے فساد کی ابتداء ہو جاتی ہے، یاروں کے ہاتھ ایک مشغلہ آجاتا ہے، اسے بانس پر چڑھا چڑھا کر مزے لینے لگتے ہیں . . . . فرد سے جب اس مہلک مرض کا وائرس افراد میں پھر ساری قوم کی رگوں میں پھیل جاتا ہے

تو دنیا اس عجوبۂ روزگار "تماشے" کو اُلو بنا بنا کر خوب فائدے اٹھانے لگتی ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ ادھر مریض کو خبر ہی نہیں ہو پاتی سر پر سے گزر گیا۔۔۔۔ جب یہ کلیہ طے ہو گیا تو آئیے اس کی چند "شکلوں" سے بھی تعارف حاصل ہو جائے!

ورلڈ ریکارڈ ؛ ایک دن ٹی۔ وی کے اسکرین پر ایک صاحب سے انٹرویو لیا جا رہا تھا جن کی مونچھیں سر پر لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں شکل سے "اودبلاؤ" لگ رہے تھے۔ پوچھا گیا، آپ کے آدھے سر پر بال نظر آ رہے ہیں اور آدھا صاف ہے۔ مسکرائے اور اپنی مونچھ کھولی، ہاتھوں سے کھینچ کر لمبا کیا مشرق والی ڈیڑھ فٹ اور مغرب والی ڈیڑھ فٹ تک لمبی ہو گئی، فرمایا، یہ میری مونچھیں ہیں جنھیں بل دے کر سر پر لپیٹ لیتا ہوں۔ پوچھا گیا یہ جمبو سائز تین فٹ لمبی مونچھ ! لینے سے آپ کا مقصد کیا ہے ؟ بولے، ورلڈ ریکارڈ قائم کردوں گا "گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ" میں میرا نام چھپے گا۔ اور دیش کا نام اونچا ہوگا۔۔۔۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو، گویا، دیش کا نام اُونچا کرنے کے لیے تین فٹ لمبی مونچھیں بھی ضروری ہوئیں۔۔۔۔

ہمارے ایک آنجہانی وزیر اعلیٰ اپنے دل کے علاج کے سلسلہ میں امریکہ گئے۔ واپسی کے بعد پریس والوں نے پوچھا امریکہ کو آپ نے کیسا پایا ؟ بولے، امریکہ کی کیا بات ہے" وہاں کی سڑکیں بھی ہمارے ڈرائینگ روم کے فرش سے زیادہ اچھی اور نفیس ہوتی ہیں۔۔۔۔ اور پھر موصوف کو جو اشتعال آیا تو امریکہ کا ریکارڈ توڑنے کی دھن سمائی اور شہر کی سڑکیں ڈرائنگ روم کا فرش تو نہ بن سکیں مگر بعض کی لمبائی چوڑائی ایئر پورٹ کا رن وے ضرور بن گئی۔ ساتھ ہی "لمبی بن بس اسٹیشن" بنا کر سارے ایشیا کا ریکارڈ توڑ ڈالا (Biggest Bus Station in Asia)

ہمارا بھی اکثر یہاں آنا جانا رہتا ہے اپنی سواری سے اُتر کر بس میں سوار ہونے کے لیے جب اس "ریکارڈ توڑ" اسٹیشن کی عمارت تک آدھے فرلانگ اوبڑ کھابڑ راستے اور سخت نوکیلے پتھروں پر سے گزرنا پڑتا ہے تو دن میں تارے نظر آجاتے ہیں۔ جوتے کا تلا جواب دے جاتا ہے۔ اور پاؤں خونچکاں ہو کر غالب کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ شاید کسی وقت انہیں بھی ایسی ہی گزرگاہ سے پالا پڑا تھا۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ؛ جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اور یہ بھی ایشیا کیا ورلڈ توڑ ریکارڈ ہی ہے کہ اسٹیشن کے حدود کی ساری فضا موسیٰ ندی میں بہنے والی شہر کی گندنالیوں کے پانی کی بدبو میں بسی ہوئی ناک پر مستقل رومال رکھنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ بے چارے وزیر اعلیٰ معلوم نہیں اور کون کون سے ریکارڈ توڑتے، وائے افسوس، کہ خود ان ہی کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ بھلے "داماد" نے ختم عمر نے وفا نہ کی ورنہ شہر کا نقشہ یقیناً ریکارڈ توڑ ہوتا اور مُرشد آباد والے جنرل اسکندر مرزا کے ماموں سر مرزا اسماعیل کی طرح یہ بھی "توڑ پھوڑ" وزیر اعلیٰ کے لقب سے ملقب ہو جاتے۔۔۔۔۔ سیر گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد!

ایکسپو، ۷۰ کی سیر کے لیے ایک مقام سے آڑھت کے گیارہ آڑھتی جاپان روانہ ہوتے ہیں روانگی سے پہلے سفر کا بخار چڑھا ایک دن ہمارے پاس آئے اور اطلاع دی، آپ کو معلوم ہے ہم جاپان جا رہے ہیں ؟ عرض کیا ایک ہم ہی کیا، سارے شہر میں ڈھنڈوری پٹ چکی ہے فرمائیے، کیا خدمت کی جائے ؟ بولے! آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے کہ وہاں پہنچ کر ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟ (درعو! ذہنیت اور سخت احساس کمتری) سوال حیرانی کا باعث ہوا ہم نے پوچھا آپ حضرات وہاں کس لیے جا رہے ہیں ؟ بولے "ایکسپو کی نمائش" اور جاپان دیکھنے کے لیے۔ عرض کیا تو بس کچھ کرنے

کرانے کی بجائے سیدھے سیدھے نمائش دیکھئے، جاپان گھومیئے اور ٹھنڈے ٹھنڈے واپس چلے آئیے۔ تسلی نہ ہوئے بولے،
پھر بھی صاحب! "پھورن" جانے کا پہلا اتفاق ہے۔ وہاں کے طور طریق معلوم کرلینا اچھا ہوگا تاکہ ہماری انسلٹ نہ ہونے پائے ....
(احساس کمتری کی دلیل) کیا پہنا، کھانا چاہیئے؟ وہاں کے لوگوں سے کیسے ملیں؟ ہم نے کہا ان باتوں کے بھوت کو پہلے سر سے نکال
دیجئے، جیسے آپ ہیں ویسے ہی جائیں "مور کے پر" لگا کر جانے کی ضرورت نہیں جو آپ کو پسند ہو وہ پہنیں اور کھائیں، اخلاق
وکسر نفسی سے پیش آئیں۔ ہر قسم کے کمپلکس کو پہلے سر سے نکال کر پلین کی سیڑھیوں پر قدم رکھیں .....

جب جاپان سے ان کی واپسی ہوئی تو دیکھا گیا یہ گیارہ کے گیارہ "جاپان" سے ایک قدم بھی نیچے اترنے کے لیے آمادہ نہیں۔
ان کی اس "جاپانیت" کو دیکھ کر ہم نے انہیں "گیارہ جاپانی" کا نام دے دیا تھا اور یہ اُن کی پہچان بن گیا ....."بات ہے تو
جاپان کی، شان ہے تو جاپان کی، چیز ہے تو جاپان کی، اور پیار ہیں؟ سو، وہ بھی ہیں جاپان کی"؟ .... ایک روز اپنا سفرنامہ
سنانے کے لیے آئے۔ ہم نے مبارک باد دی اور احوال پوچھا، فرمائے! بڑا مزا آیا صاحب، آپ نے بھی ارادہ کرلیا ہوتا تو اچھا ہوتا،
اپنے "انڈیا" (اب بھارت یا ہندوستان نہیں بولیں گے) میں تو وہاں کی ایک بات بھی نہیں۔ کیا بلڈنگیں، کیا سڑکیں، کیا کارخانے اور
کیا "گیشا گرلز"، سیب کے گال، کندن کا رنگ اور ریشم کے بدن ..... کیسے کیسے رنگین ٹی۔ وی ہیں بس دیکھتے ہی بنے انڈیا میں
تو اب تک بلیک اینڈ وہائیٹ بھی برابر نہیں اور جاپان؟ کیا جاپان ہے واپس آنے کو جی چاہتا ہی نہ تھا ....

ایک جاپانی نے ہنستے ہوئے دوسرے جاپانی کا لطیفہ سُنایا!

جب ہم بمبئی پہنچے تو ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے بازار گئے ان صاحب کے پاس صرف قومی لباس ہی تھا مجھ سے بولے جاپان
میں پہننے کے لیے دو چار جوڑے پینٹ شرٹ کے خرید وادو، وہ خرید سے گئے اور جاپان پہنچ کر انھوں نے جب پتلون پہنا تو وہ
کمر میں ڈھیلا نکلا، بلٹ تھا نہیں کچھ سوجھا تو چڈی میں سے ناڑا کھینچا اور اس سے بلٹ کا کام لیا۔ جب ٹوکیو کی سڑکوں پر گھومنے
کے لیے ہوٹل سے باہر آئے تو جاپانیوں کی نظر ان کے حلیئے پر گئی ڈھیلا ڈھالا وہ ریڈی میڈ سستا پتلون، کمر میں بجائے بلٹ کے ناڑے
سے کسا ہوا، پاؤں میں موٹے سول کی چپل۔ اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر وہ ان کے سامنے آتے نیچے سے اوپر تک بڑے غور سے
معائنہ فرماتے، پھر ہاتھ جوڑ کر تھوڑا سا خم ہوتے، نمستے کہتے اور پوچھتے، "انڈیا"؟ اثبات میں جواب پاکر پھر جھکتے نمستے کہتے
سارے بازار میں ہم سب ان کی وجہ سے تماشا بن گئے تھے ....

بغیر کسی احساس کمتری کے اپنا ہی لباس اگر وہ پہنے رہتے تو دوسرے ملک میں یہ "روز بد" نہ دیکھے ہوتے ....
ایک اور صاحب بھی جو اپنے پیروں میں بانس باندھ کر اپنے آپ کو بہت اونچے مقام پر پہنچا چکے تھے۔ وطن میں ہر جگہ "اپنے ہی"
لباس میں نظر آتے تھے۔ جب کبھی انہیں دوسرے ملک جانے کا اتفاق ہوتا تو ایسا لگتا تھا کہ ایئرپورٹ پہنچ کر ہی ان کو خیال
آیا کہ اس لباس میں "پھورن" والوں کے آگے میرا قد چھوٹا لگے گا ..... اور شاید جلدی سے وی۔ آئی۔ پی لاؤنج کے حمام میں
جاکر جھٹ پٹ اپنا لباس اُتار کے "سفاری سوٹ" زیب تن کرنے کے بعد "منہ میں سُپاری گھولتے ہوئے" پلین کی سیڑھیوں پر
قدم رکھا کرتے تھے۔ اس وثوق سے یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ گھر سے روانہ ہونے تک ان کو ٹی۔ وی کے اسکرین پر بعض
مرہ ہی کے لباس میں دکھایا جاتا تھا ....

جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسی دیوقامت ہستیاں بھی جب یورپ
اور امریکہ جایا کرتی تھیں تو قومی لباس ہی میں، کیوں؟ اُن کے پاس تصنع، بناوٹ، ذہنی مرعوبیت اور احساس کمتری نام کی

کوئی چیز نہ تھی وہ اندر سے بھی بڑے تھے اور باہر سے بھی بڑے ہی نظر آتے تھے اس کے لیے "سفاری سوٹ" کے محتاج نہ تھے۔۔۔۔

حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را !

(محبوب کے خوبصورت چہرے کو غازے اور فیس پوڈر کی حاجت نہیں)

۱۹۳۰ میں لندن کی گول میز کانفرنس کے موقع پر جب "باپوئے قوم" سے کہا گیا ملک معظم سے ملاقات کے وقت وہ درباری پروٹوکول کے مطابق "لنگوٹی" کے بجائے مکمل لباس زیب تن کرلیں۔ ۔ ۔ ۔ بے نیازی ہائے فقیرانہ کی دلآویزیوں کا ملاحظہ کیجئے جواب میں قلندرانہ شان سے فرمایا گیا۔ "فقیر کا یہی لباس ہے اور اسی میں وہ شاہ وگدا سے ملاکرتا ہے، بادشاہ کو اگر پسند ہو تو ملیں ورنہ دور ہی سے انہیں فقیر کا سلام"۔ ۔ ۔ ۔ اور تاج برطانیہ کو اس شانِ قلندری کے آگے سرتسلیم خم کرنا ہی پڑا تھا۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم ٭ شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کُلہ اند !

(بوریا نشین متوالوں کو حقارت سے نہ دیکھو تمہیں کیا معلوم کہ یہ وہ "تاجدار" ہیں جنھیں دستار و بگلوس کی احتیاج نہیں)

خالد عرفان (امریکہ)

متفرق اشعار

ملتا نہیں مزاج چچی کا چچا کے ساتھ
جیسے چراغ باندھ دیا ہو ہوا کے ساتھ

دونوں کے بچے راہ کی دیوار بن گئے
شادی شدہ کا عشق ہے شادی شدہ کے ساتھ

کرسی کے گرد ناچ رہے ہیں یہ رہنما
جیسے زوہیب رقص کرے نازیہ کے ساتھ

مجھ کو جو روکتے تھے بہت تانک جھانک سے
وہ جا رہے ہیں اپنی نئی اہلیہ کے ساتھ
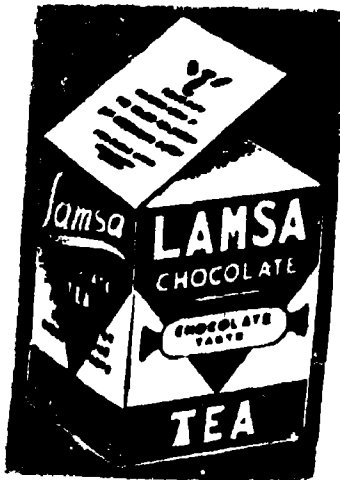
بیوی کے سامنے جو زباں کھولتے نہیں
چلتے ہیں راہ میں وہ گریبان کھول کر

وہ ناشتہ کی میز پہ بیٹھی ہے اس طرح
جیسے کہ رکھ دیا ہو نمک دان کھول کر

میری گلی میں اونچے پلازا بہت سے ہیں
میں کیا کروں گا گھر کے ہوا دان کھول کر

خالد ہمارے شعر ادب کے یہ اژدہے
سنتے ہیں منہ کو بند کئے، کان کھول کر

غزل

ظفر کمالی
سیوان (بہار)

نہ گھبرا رہے ہیں نہ شرما رہے ہیں
کھلی بے حیائی پہ اترا رہے ہیں

نہیں چار بالشت کی پاس چادر
مگر چار گز پاؤں پھیلا رہے ہیں

ہوا ہے انھیں عقل کا جب سے ہیضہ
کہو بات کوئی بھی ٹھکرا رہے ہیں

لگا کر جہالت کا آنکھوں پہ چشمہ
وہ ڈالر کے پیچھے اڑے جا رہے ہیں

کہیں دیوبندی کہیں ہے بریلی
ہزاروں اسی سے کما کھا رہے ہیں

فلیتے کو تیلی دکھائی جنھوں نے
وہی امن کے گیت بھی گا رہے ہیں

نتیجہ تمہیں عقد کا کیا بتائیں
ہم اپنے کئے کی سزا پا رہے ہیں

سکھایا ہے میں نے انھیں پاؤں چلنا
مجھے ہی اکڑ اپنی دکھلا رہے ہیں

صداقت کی راہوں میں سب کچھ لٹا کر
زمانے کو دیکھا تو پچھتا رہے ہیں

نکالیں گے اردو زباں کا دوالہ
جو اردو کے استاد کہلا رہے ہیں

مرا نام سن کر محلے کے بنئے
لیے اپنا کھاتا چلے آ رہے ہیں

جو دشمن تھا جانی ہوا "زانی دشمن"
تلفظ کی وہ مشق فرما رہے ہیں

چلیں گے ظفر سر پہ دنیا اٹھائے
کمانے سعودی عرب جا رہے ہیں

قطعات

اقبال ھاشمی
حیدرآباد

نیتا یا گرگٹ

کبھی میں دل بدلتا ہوں، کبھی میں دَل بدلتا ہوں
نئی مچھلی پکڑنی ہو تو فوراً گَل بدلتا ہوں
نقابوں اور چہروں کی مجھے حاجت نہیں ہوتی
نئی رنگت میں گرگٹ کی طرح ہر پَل بدلتا ہوں

●

الیکشن یا مصیبت

مرے اللہ یہ کیسی گھڑی ہے
الیکشن کی مصیبت آ پڑی ہے
سبھی نیتاؤں کے ہیں ہاتھ پھیلے
مگر جنتا کے ہاتھوں میں چھڑی ہے

●

پیاز کی مہنگائی

کھانا پروسنے کا بھی انداز چاہیئے
کچھ تو تخیلات کی پرواز چاہیئے
عزت بچائے رکھنی ہے مجھ کو سماج میں
مجھ کو تمھارا پیار نہیں پیاز چاہیئے

ہندوستان کی کہانی اندرا گاندھی کی زبانی

اندرا گاندھی جب پہنچی ہیں باپو جی کے چرنوں میں
باپو نے پوچھا اے بیٹی میرا بھارت کیسا ہے
اندرا جی رو رو کے بولیں، مجھ کو دیکھو باپو جی
جیسی میں ہوں چھلنی چھلنی میرا بھارت ویسا ہے

غزل

دن رات ہانکتا تھا جو ڈینگیں شکار کی
خود آگیا ہے زد میں وہ ڈینگو بخار کی
اک بار لگ گئی تو کبھی چھوٹتی نہیں
کتنی بُری بلا ہے ہوس اقتدار کی
سو شعر سُن کے اس نے مجھے ہوٹ کر دیا
سچ ہے کہ سو سُنار کی اور اک لُہار کی
فلمی حسین بوڑھیاں دیکھیں ہیں بے شمار
لیکن ہے بات اور للیتا پوار کی
غالب کی پیروی میں اگر شاعری کریں
غالب کی پیروی میں پیئیں گے اُدھار کی
خود اشتہار بن کے بھٹکتے ہیں در بدر
کھاتے ہیں جو دوائیں سدا اشتہار کی
لیڈر کو اس کا چارہ کھلانے کے بعد خود
چٹنی کے ساتھ کھائیے روٹی جوار کی
لوٹوں گا دونوں ہاتھوں سے ہر اک مشاعرہ
دُھن چھیڑ دوں اگر میں جناب خمار کی
ہیں ناشتے میں سارے جہاں کی ڈشیں مگر
کچھ اور بات ہے ترے کھچڑی اچار کی
جب چٹکلوں کے بل پہ ہنساتا ہے بھانڈ پن
یہ راہ تم نے ہاشمی کیوں اختیار کی

★

انیسؔ صدیقی (حیدرآباد)

یارو خطا معاف کرو

حضرات! سب سے پہلے میں آپ سب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں نے کوئی قصور کیا ہے بلکہ اس لیے کہ ؎

جس کو کہتے ہیں بشر اس میں ہے شر دو تہائی

— اور میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے کبھی مجھ سے بھی کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے کہ معافی مانگنے کی ضرورت پڑ جائے۔ میں نے سوچا کہ جب ضمانت قبل از گرفتاری لی جا سکتی ہے تو کیوں نہ معافی قبل از دل آزاری ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ معافی مانگنا آج کل کا جدید فیشن ہے۔ افراد ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے ممالک اور قوموں میں بھی معافی طلب کرنے اور معافی مانگنے کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ اگر میں اس موقعہ کا فائدہ نہ اُٹھالوں تو لوگ مجھے دقیانوسی اور از کار رفتہ سمجھ لیں گے۔

آج کل کوریا چاہتا ہے کہ جاپان، ان سے ان قدیم مظالم کی معافی مانگے جو اس نے اپنے دورِ اقتدار میں کوریا پر روا رکھے تھے۔ اور ایک اور مشرق بعید کے ملک نے جاپان سے معافی کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان خواتین سے بھی معافی مانگے جنھیں اس نے دوسری عالمی جنگ کے دوران قحبہ گری پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر ہندوستان بھی چاہے تو برطانیہ سے قحط بنگال، جلیانوالہ باغ کے حادثے اور اودھ کی لوٹ مار پر معافی کا مطالبہ کر سکتا ہے اور ممکن ہے کہ ایک مستحکم حکومت آجائے تو وہ یہ مطالبہ کر بیٹھے۔

اس معافی کے چکر میں بھلا امریکہ ملوث ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ جاپان نے مطالبہ کیا ہے کہ امریکہ ایٹم بم گرانے پر معافی مانگے ؎

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو

لیکن صاحب! امریکہ جو کہ اس وقت دنیا کا واحد سُوپر پاور ہے، اس سے بھلا یہ اُمید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے کیے کی معافی مانگے۔ وہ چین سے تو مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ حقوق انسانی کی پامالی پر معافی مانگے لیکن وہ اس جسارت کو کیسے معاف کر سکتا ہے کہ کوئی اس سے امریکہ کے اصلی باشندوں یعنی ریڈ انڈینوں کے انسانی حقوق کی پامالی پر معافی کا مطالبہ کرے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں معافی مانگنے کا رواج نہیں۔ رواج ہے اور ضرور ہے لیکن امریکی جدت پسندی کی جھلک یہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ معافی مانگنے میں بھی سود سے بازی سے نہیں چوکتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امریکی سینیٹ نے حال ہی میں کہا ہے کہ اگر امریکی صدر عراق کے خلاف فوجی کارروائی کریں تو امریکی ان کے حالیہ جنسی بے راہ روی

کے معاملے کو نظر انداز کردیں گے۔ یعنی انہیں معاف کردیں گے۔ دیکھا آپ نے۔ معافی کو بھی سودے بازی کے لیے استعمال
کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ آپ سوپر پاور ہوں۔

اب دیکھیے معافی نہ مانگنے کا نتیجہ۔ روس میں سٹالن نے معافی نہیں مانگی اگر وہ ہماری طرح احتیاطاً معافی
قبل دل آزاری یا کم از کم قبل از مرگ ہی معافی مانگ لیتے تو ان کے اور لینن کے مجسموں کا

"ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے"

جیسا حشر نہ ہوتا۔ اجی صاحب نہ صرف معافی نہ مانگنے کو معاف نہیں کیا جاسکتا بلکہ معافی مانگنے میں دیر ہوجائے تو بھی کوئی
معاف کرنے تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر آپ آجکل کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں تو آپ ہماری رائے سے متفق ضرور ہوجائیں گے
کہ دیر سے معافی مانگنے والے سے تو معافی نہ مانگنے والا زیادہ مزے میں رہتا ہے۔ اور ان معافی نہ مانگنے والوں کی بھی
دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جو خم ٹھوک کر کہتی ہے کہ معافی کس بات کی؟ ہم نے تو کوئی خطا نہیں کی۔ بلکہ قوم کے
ماتھے سے ایک کلنک مٹایا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو معافی نہیں مانگتی بلکہ "اظہارِ افسوس" کرتی ہے۔ اور بوقتِ ضرورت
کچھ آنسو بھی بہالیتی ہے ــ چاہے وہ مگرمچھ کے آنسو ہی کیوں نہ ہوں۔

آئیے اب دیکھیں کہ تاریخ اس مسئلہ پر کیا کہتی ہے۔

قبل مسیح دور میں بروٹس نے جولیس سیزر پر خنجر آزمائی کی تو سیزر صرف ET TU BRUTE کہہ سکا اور
جاں بحق ہوگیا۔ لیکن بروٹس نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ اس نے معافی نہیں مانگی ورنہ ملعون ہوجاتا اور آج اس عزت
سے اس کا نام نہ لیا جاتا کہ وہ مطلق العنانی کی مخالفت کا علمبردار جانا جاتا ہے۔ اس کی ایک حرکت نے روم کی تاریخ
بدل کر رکھ دی۔ دور کیوں جائیے، اگر آپ اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اگر راجہ دسرتھ آجکل کے لیڈروں کی طرح رانی کیکئی
کو دیئے وچن سے مکر جاتے اور برسوں بعد اتنا کہہ دیتے کہ معافی چاہتا ہوں میں تم سے کیئے وعدے کو پورا نہ کرسکا تو رامچندر جی
کو ۱۴ برس کا بن باس نہ ملتا۔ یا اگر راون نے اپنے کیئے کی معافی مانگ لی ہوتی تو لنکا کیوں تباہ ہوتا؟ لیکن مشکل تو یہی
تھی کہ دونوں راجہ تھے۔ لیڈر نہیں تھے۔

یہ نہ سمجھیں کہ معافی مانگنے کے مواقع صرف تاریخ یا سیاست میں آتے ہیں کھیل تفریح بھی اس کی زد میں آتے ہیں
ویسٹ انڈیز کے ایک بولر نے ایسی خطرناک گیند پھینکی کہ بیچارے ناری کنٹراکٹر کی جان پر بن آئی اور وہ مرتے مرتے
بچے اور ہندوستان ایک اچھے کرکٹر اور کپتان سے محروم ہوگیا لیکن یہ چونکہ کھیل کھیل میں ہوا تھا اس لیے معافی کا سوال ہی
نہیں اٹھا۔ قطب الدین ایبک اور اس کے صدیوں بعد ٹائیگر پٹوڈی کے والد افتخار علی خاں نواب آف پٹوڈی کی جانیں
بھی پولو کھیلتے میں گئیں۔ اس میں کسی کا قصور نہیں تھا۔ یہ محض ایک حادثہ تھا۔ لیکن یہی حادثے اگر آج کل کے زمانے میں ہوتے
تو ضرور کوئی نہ کوئی سیاسی پارٹی اس سے فائدہ اُٹھاتی اور اسے مخالف پارٹی یا کسی بیرونی طاقت کی سازش قرار دیتی
اور پھر وہی سوال اُٹھتا کہ کون کس سے معافی مانگے ؎

تم خطا کاروں میں ہو ہم بھی خطا کاروں میں ہیں ؛ کون دے کس کو سزا اب تو گنہگاروں میں ہیں

لیکن یہ سمجھیے کہ کھیل میں ہوئی خطا پر بغیر مانگے ہی معافی مل جاتی ہے۔ اس کی تازہ مثال باکسر مائیک ٹائسن کا اپنے حریف کا کان
کاٹ لینے کا واقعہ ہے۔ اس کی تو اسے بہت بڑی قیمت چکانی پڑی۔ اس سے قبل دنیا کے عظیم باکسر محمد علی کو ویٹ نام کی

جنگ کے خون خرابے میں حصہ نہ لینے پر کڑی سزا دی گئی. ممکن ہے اگر وہ معافی مانگ لیتا تو ایسا نہ ہوتا.
معافی کی ایک اور شکل وہ ہوتی ہے کہ بغیر معافی مانگے ہی معاف کر دیا جاتا ہے. قدیم ریاست حیدرآباد میں تقاوی قرضہ جات دیئے جاتے تھے. ہوتا یہ تھا کہ یہ قرضے رعایا کو مصیبت سے بچانے دیئے جاتے تھے اور اس کی وصولی پر سختی بھی نہیں کی جاتی تھی. بلکہ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ وقت اگر خوش ہو جائیں، چاہے وہ کسی بیماری سے صحت یاب ہو جائیں یا حادثے سے بچ جائیں یا پھر ان کی تخت نشینی کی سالگرہ یا جوبلی ہو تو یہ قرضے معاف کر دیئے جاتے تھے. رعایا اس کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ وہ تقاوی قرضہ جات کی ادائی کی سوچتی ہی نہیں تھی. بلکہ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ وہ تقاوی قرضہ لیتے ہی اپنے بادشاہ کی خرابی صحت کے لیے خدا کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہو جاتے تاکہ ان کے صحت یاب ہونے پر ان کے قرضے معاف کر دیئے جائیں. آج کل اس کی بدلی ہوئی شکل ہم نے پنجاب کے قرضوں کی معافی کی صورت میں دیکھی. حسب معمول اسے حکومت نے جائز گردانا اور حزب مخالف نے ایک سیاسی چال.
آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم معافی مانگنے یا معاف کرنے کے مخالف ہیں. ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ صدق دل سے معافی مانگنا یا معاف کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں. اس کے لیے اعلیٰ کردار کی ضرورت ہوتی ہے — معافی مانگنے کے لیے بھی اور معاف کرنے کے لیے بھی. سکندر نے پورس کو محض ایک دلیرانہ جواب کے عوض معاف کر دیا تھا اور اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے اس کی ریاست لوٹا دی تھی. یا پھر تاریخ میں فتح مکہ کی مثال بھی موجود ہے جب اسلامی لشکر اپنے بدترین دشمن پر فتح پا کر مکہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے دشمنوں کی عام معافی کا اعلان کیا گیا.
آپ کو تعجب ہوگا کہ معافی مانگنے جیسے سنجیدہ موقعہ پر بھی بعض دفعہ مزاح کا پہلو نکل آتا ہے. بس میں جو سفر کرتا ہے وہ عموماً بے بس ہوتا ہے اور بوقت واحد اردو اور انگریزی دونوں میں سفر کرتا ہے. ایک ایسی ہی کھچا کھچ بھری بس میں سفر کے دوران یکایک بریک لگنے سے ایک مسافر دوسرے پر لیسے گرا کہ اسے چوٹ لگ گئی. گرنے والا اور کیا کرتا. عاجزی سے معافی مانگ لی. جسے چوٹ لگی تھی اس نے غصہ سے پوچھا "یہ کیا تک ہے؟ مجھے تکلیف پہنچا کر بعد میں معافی مانگ رہے ہو؟ اس سے کیا فائدہ؟" بیچارہ قصوروار کیا جواب دیتا؟ پوچھ بیٹھا "کیا آپ کا مطلب ہے کہ مجھے پہلے معافی مانگنا چاہیئے تھا پھر آپ پر گرنا تھا؟"
خیر صاحب بیرون خانہ اور تاریخی واقعات کا ذکر تو ہو چکا. اب ذرا اندرون خانہ بھی ایک نظر ہو جائے معافی مانگنے میں مرد کی حد تک سب سے مشکل اپنی بیوی سے معافی مانگنا ہوتا ہے اور اس میں معافی ملنے کی امید بھی بہت کم ہوتی ہے کیوں کہ بقول فیض ؎

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے

حالانکہ اکثر اوقات قصور نہ ہوتے ہوئے بھی مصلحت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ خوشحال ازدواجی زندگی کی خاطر یا اپنے بچوں کے. اپنے مزید بے عزتی سے بچنے کے لیے معافی مانگ لی جائے — لیکن اتنی احتیاط ضرور کر لی جائے کہ بیوی کو یہ شبہ نہ ہونے پائے کہ یہ معافی اس امید پر مانگی جارہی ہے کہ — شاید وہ اپنا مہر معاف کر دے.

نگار لکھنوی
(ممبئی)

میں کیا کروں؟

کچھ تجربہ نہیں ہے مجھے سر! میں کیا کروں
پہلے پہل بنا ہوں منسٹرؔ، میں کیا کروں

ملحق ہے میرے نام سے ہی "ٹر" میں کیا کروں
ٹرٹر نہ گر کروں تو برادر، میں کیا کروں

عزت مآب ہوں کوئی عزت نہیں مگر
کہتا ہے کوئی خر کوئی خچر میں کیا کروں

کانٹے چھری ہیں راہِ وزارت میں پیش پیش
چمچوں کا ساتھ ساتھ ہے لشکر میں کیا کروں

چالاکیوں سے ہے میری رگ رگ بھری ہوئی
ہوں ڈارون کی نسل کا بندر میں کیا کروں

اس لیڈری میں عزتِ سادات بھی گئی
دو چار بار ہوگیا اندرؔ، میں کیا کروں

پھسلے اگر زبان تو کر دیجئے معاف
لکھوا کے آج لایا ہوں پیچر میں کیا کروں

تم کہہ رہے ہو جس کو ہے تعلیم کا وزیر
مجھ کو تو صاف لگتا ہے جوکر میں کیا کروں

میں بھی عجیب آدمی "ح۔غ۔د" ہوں
پوچھوں نہ ہوں دلبروں سے یہ دن بھر میں کیا کروں

یارب کوئی تو آئے محمد علی سا پھر
اِن پتھروں میں اب نہیں جوہرؔ میں کیا کروں

ا۔ محمد علی جوہر

مصطفیٰ شہاب
(لندن)

کھانسی

(ظفر اقبال سے متاثر ہوکر)

سویرے جب وہ اُٹھ کر کھانستا ہے
پھر اس کے بعد گھر بھر کھانستا ہے

میں خالی پیٹ بھی کھانسوں تو گھر کا
ہر اک خالی کنستر کھانستا ہے

میں اپنی کھانس لیتا ہوں مرے بعد
مرا ہم درد بستر کھانستا ہے

فقط میں ہی نہیں کرتا ہوں کھوں کھوں
پڑوسی بھی برابر کھانستا ہے

دکھائی دے بڑا شاعر کہیں تو
سڑک کا شوخ پتھر کھانستا ہے

بچا ہے کون اس کھانسی سے اب تک
وہ مضطر ہو کہ وضطر کھانستا ہے

کسی سے کم نہیں وہ بھی کہ بن کر
ہر اک کھانسی کے اوپر کھانستا ہے

ہر اک کھڑکی سے آنکھیں جھانکتی ہیں
گزرتا ہوں تو گھر گھر کھانستا ہے

جب اندر رک نہیں سکتی ہے کھانسی
تو بندہ اپنے باہر کھانستا ہے

کبھی خود کی کبھی دنیا کی خاطر
مداری ہو کہ بندر کھانستا ہے

★

سلیم مقصود*

ذکر اس پری وش کا.....

آپ اس خوب صورت عنوان سے یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم واقعی کسی پری وش کا ذکر کرنے والے ہیں۔ یہ عنوان تو ایسا ہی ہے جیسے چوہے مارنے کی خطرناک دوا کو کس دیدہ زیب پیکٹ میں لپیٹ دیا جائے۔ اس عنوان کے تحت ہم آج ایک ایسے قائد کا تذکرہ کرنے جا رہے ہیں جنھیں ایک وقت تھا، سیاسی میدان میں دوڑ لگانے کے لیے کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور یہ بے دریغ میسور تا دلی دندناتے پھرتے تھے۔ حالانکہ بے چارے شاہ عالم اسم بے مسمّیٰ ہو کر دونوں ٹانگوں کی سلامتی کے باوجود بھی دلی سے پالم تک جا نہیں سکتے تھے۔ کیوں کہ انگریز ان کے دلی سے دور جانے کو اپنے لیے بدشگونی تصور کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزوں کی یہ غلط فہمی شاہ عالم کے لیے خوش فہمی کا باعث بن گئی تھی اور انہیں اس بات پر فخر تھا کہ انگریز انہیں پالم سے آں عالم جانے نہیں دیتے۔ ورنہ وہ بھی سکندر کی طرح سمندر پار نکل جاتے بلکہ گنگا کے پانی میں نہانے کے بہانے ڈوب جاتے۔ یہ مت سمجھیے کہ بین السطور یہ مشورہ ہم نے قائد موصوف کو دیا ہے۔ تاریخی واقعات تو صرف عبرت حاصل کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ریکارڈ توڑنے کے لیے نہیں (ویسے گنگا اور جمنا اب نہ تو شرم سے ڈوب مرنے کے لیے ہیں اور نہ گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کے لیے بلکہ اس لیے ہیں کہ ان کے پانی کی تقسیم کے لیے ایک دوسرے کا حقہ پانی بند کیا جائے)۔

قائد موصوف کا تعلق ٹیپو سلطان شہید کی سرزمین سے ہے اور قائد محترم راج سنگھاسن کو اپنا علاقائی حق سمجھتے ہیں۔ راج سنگھاسن سے (جسے جمہوری زبان میں گدی یا کرسی بھی کہا جاتا ہے) نیتا جی کو اس قدر پیار ہے کہ خدا جانے وارفتگی کے عالم میں کیا ناگوار حرکت کر بیٹھے کہ راج سنگھاسن سے دو بار ہاتھ دھونا پڑا۔ بلکہ ایک بار تو منہ بھی دھونا پڑا۔ لیکن منہ پر لگی کالک صاف نہ ہو سکی اور آج کل ایک رسوائے زمانہ سیاسی جماعت کے دامن داغدار سے منہ پونچھ رہے ہیں۔ اور اس کوشش میں اپنے چہرے کو مزید سیاہ کر رہے ہیں۔ اردو لغت میں منہ اور ہاتھ سے متعلق جتنے بھی شائستہ و غیر شائستہ محاورے ہیں تقریباً سارے ہمارے سیاسی قائدین پر صادق آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان لیڈروں کی وجہ سے اب تک یہ محاورے زندہ ہیں۔ ہمیں امتحان میں جب بھی ایسے محاوروں کو جملوں میں استعمال کرنے کے لیے کہا جاتا ہم کوئی نہ کوئی سیاسی جملہ بنا دیا کرتے تھے یہ باتیں ہم نے جملۂ معترضہ کے طور پر کہی ہیں۔ ورنہ ہم اپنی زبان اور اپنی دھن کے اس قدر پکے ہیں کہ جب ہماری زبان چل پڑتی ہے تو رکتی نہیں اور جب رک جاتی ہے تو چلتی نہیں۔ اور دھن کا یہ عالم

ہے کہ ہم انگلش دُھن میں دیسی گانا گا لیتے ہیں اور اس میں مست بھی ہوجاتے ہیں۔ مُنہ زبانی سے ہمیں کوئی مطلب نہیں ہوتا غرض ذکر ہم کس پری وش کا کر رہے تھے۔ مگر قومی ریل گاڑی کی طرح موضوع کی پٹری سے اُتر گئے۔ آپ کو اندازہ ہو رہا ہوگا کہ ہمارے قومی قائدین کی خدمات کا تذکرہ کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کام میں "عزت سادات" کے ساتھ ساتھ "ناموس قلم" بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور بعض اوقات صاحب مضمون کسی جانے انجانے زور بازو کا شکار بھی ہوجاتے ہیں۔ قصہ کوتاہ ابھی حال ہی میں موصوف نے اپنی ڈھائی اشخاص کی جماعت الگ بنالی ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کو ووٹ دیں جس کی خدمات کا ریکارڈ اس قدر شاندار ہے کہ اس ریکارڈ کو توڑنے کے لیے ہندوستان کی ساری عبادت گاہوں کو توڑنا ضروری ہے مختصر یہ کہ ہمارے نیتا ایسے پارہ صفت ہیں کہ ان کے تذکرے سے قلم بار بار موضوع سے بھٹک جاتا ہے۔ اور بار بار ہمیں "دل بدلی" کا احساس ہوتا ہے موصوف کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ خوش خوراک، خوش بیان اور خوش فہم ہیں۔ ان کی خوش خوراکی یا خوش بیانی سے ہمیں کیا لینا دینا۔ ہم نہ انہیں کوئی ڈنر دینے والے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی بیان سننے والے ہیں۔ البتہ ان کی خوش فہمی پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا کہ دو نیتاؤں میں اس بات پر جھگڑا ہوگیا کہ دونوں میں مقبول عام کون ہے۔ فیصلہ ایک ووٹر پر چھوڑ دیا گیا۔ اس نے بہانہ بنایا کہ وہ تو دونوں لیڈروں کو ووٹ دیتا ہے وہ کیسے تبلائے گا کہ اسے کون زیادہ عزیز ہے۔ دونوں نیتاؤں نے متفقہ طور پر طے کیا کہ چونّی اچھال کر مقبولیت کا فیصلہ کیا جائے۔ دونوں نے ووٹ کنندہ سے چونّی مانگی اس نے پوچھا۔ "آپ اپنی جیب سے چونّی کیوں نہیں نکالتے؟" ایک نیتا بول اُٹھے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ عوام ہی کا ہے جو ہم نے اسکام اور گھپلوں سے حاصل کیا ہے۔ اس لیے یہ چونّی بھی ہم عام آدمی ہی سے مانگ رہے ہیں۔" ووٹر ان نیتاؤں کی نیت سے ۵۰ سال سے واقف تھا اس لیے اس نے چونّی خود اچھالی۔ دونوں نیتاؤں میں سے ایک نیتا کو بہرحال ہارنا تھا۔ سو وہ ہار گئے اور غصّے میں جلتے جاتے اس ووٹر کی چونّی بھی لیتے گئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ برسوں میں کسی لیڈر کی مقبولیت کا اندازہ چونّی اچھال کر یا پھر پگڑی اچھال کر لگایا جا سکے گا۔

جب ہم کسی سیاسی قائد کا ذکر کرتے ہیں تو اکثر ہمیں احسان دانش کا یہ شعر بے اختیار یاد آجاتا ہے

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

۵۷

ڈاکٹر سید عباس متقی (حیدرآباد)

بچاؤ ہمیں ہمارا جشن منانے والوں سے

جن ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرلی جاتی ہے یا جن کا جشن منالیا جاتا ہے۔ ان سے قوم و ملت کو گویا کوئی توقع باقی نہیں رہتی اور ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے کہ لوگ ہمارے بارے میں اس طرح کی ناواجبی باتیں سوچنے لگیں۔ اس لیے علم و ادب کے دانشمندوں سے ہم التماس کرتے ہیں کہ خدارا ہمارا جشن مناکر ہمیں ناکارہ تصور کرنے کی گھناؤنی سازش نہ کریں۔ اور اگر کوئی ہماری مرضی کے بغیر اس طرح کا غیر واجبی ارادہ فرمائے گا یاد رہے کہ ہم اسے اپنے درخشاں و تابناک مستقبل پر ظلم گردانیں گے۔ جشن ان کا منایا جاتا ہے جن کے دن پورے ہوجاتے ہیں یا جن کی اُلٹی گنتی شروع ہوجاتی ہے۔ اگر ہمارا جشن ہوجائے گا تو لوگ ہمیں ہمارے جشن کے دن تو یاد کریں گے اس کے بعد کچھ ایسا بھولیں گے کہ بھول کر بھی یاد نہیں کریں گے۔ اور ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ لوگ ہماری موت سے پہلے ہمیں بھول جائیں ایک شاعر اور ادیب کی اس سے زیادہ توہین نہیں کہ اسے اس کی زندگی میں بھلا دیا جائے۔ جن جن حضرات و خواتین کا جشن منایا گیا ہے ہم ان کی حالت زار بخوبی دیکھ چکے ہیں۔ ان کی حالت اس کُھڑک مرغی کی سی ہوجاتی ہے جسے انڈوں پر سے اُٹھا دیا گیا ہو۔ جو محض اپنے بال و پر اپنے قد سے زیادہ اونچے کیئے چونچ مارتی پھرتی ہے۔ اور پھر ہماری عمر انڈے دینے کی ہے انڈے سینکنے کی نہیں۔ ہمیں غم اس وقت ہوتا ہے جب لوگ جشن منائے جانے پر خوش ہوتے ہیں نزع کے تبسم پر زندگی کے قہقہوں کو قربان کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہم کچھ کام کرنا چاہتے ہیں خواہ ہمارے کام کسی کام کے ہی نہ ہوں ہم کچھ کرگزرنا چاہتے ہیں خواہ اس آرزو میں دنیا ہی سے کیوں نہ گزر جائیں۔

پرسوں کی بات ہے "انجمن جشن شاعراں" اور "بزم بزیرائی" کے عہدہ داران نے ہلّہ بول دیا۔ کہنے لگے "آپ بھی تیار ہوجائیے ہم آپ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منائیں گے"۔ ان حضرات کے لبوں پر زہریلا تبسم رقصاں تھا گویا کہہ رہا ہو "غسل آخری کے لیے تیار ہوجاؤ۔ ہم ایسا غسل دیں گے کہ پھر کسی اور غسل کی نوبت ہی نہ آئے گی"۔ عموماً جشن اور جلسہ تعزیت میں کچھ زیادہ مدت حائل نہیں رہتی۔ اِدھر جشن منایا کہ اُدھر تعزیت کے جلسہ کی کارروائی شروع ہوگئی ہم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "بھائی۔ مجھے احمق نہ بناؤ۔ میرا جشن نہ مناؤ۔ میں اس لائق ہی نہیں کہ جشن کا تصور بھی میرے بارے میں کیا جائے"۔ کہنے لگے "انجان نہ بنئے کیا ہم آپ کو نہیں جانتے۔ آپ شہر کے عظیم شاعر ہیں، بلند پایہ ادیب ہیں۔

صف اول کے طنز و مزاح نگار ہیں خود ہی بہت تنقید بھی کر لیتے ہیں کچھ کچھ تقریریں بھی فرما لیتے ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے ہیں ایک درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں کئی مقامات پر آپ نے اعزازی لکچر بھی دیئے ہیں اور اپنی منفرد فکر کے گھوڑے دوڑائے ہیں آپ کا نام ہے۔ آپ کے کام ہیں آپ کا جشن نہیں تو اور کس کا جشن منائیں گے؟" ہم نے کہا "پہلے میرے اساتذہ کرام کا جشن مناؤ پھر میرا جشن منانا۔" کہنے لگے وہ کہتے ہیں کہ پہلے ان کے اساتذہ کے جشن منائے جائیں تب ان کا جشن منایا جائے۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہو گئے۔ کیوں کیسی کہی۔ جشن کی بھینٹ پر پہلے انہیں چڑھنا چاہیئے جنھوں نے اس بھینٹ پر چڑھنے کے ہمیں لائق بنایا ہے۔ ہمارے جواب سے لاجواب ہوئے تو ہمیں پھانسنے کی دوسری کوشش کرنے لگے۔ کہنے لگے۔ عباس صاحب آپ کو کیا کرنا ہے۔ نوشہ کی طرح وقت مقررہ پر آجایئے۔ جلسہ کے بعد آپ کو آپ کے دولت کدہ پر چھوڑ دیا جائے گا۔ ہم نے لقمہ دیا گویا ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جائے گا جس طرح مردے کو قبر میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے بھول جاتے ہیں۔ کہنے لگے آپ کو اپنی شہرت کی اس درجہ چاہ کیوں ہے۔ نام دری کی اس قدر آرزو کیوں ہے ہم نے کہا بھائی۔ میں تو شہرت و مقبولیت سے دُور بھاگ رہا ہوں جشن منا کر تو آپ میری شہرت کے اسباب مہیا کر رہے ہیں۔ ہم نے پھر جشن منانے والوں کو پُر خلوص مشورہ دیا کہ بھائی جشن اقبال جب منایا گیا تو اقبال کی عمر ۶۰ سال کے اوپر تھی اور سارے ہندوستان میں منایا گیا۔ صرف لاہور میں نہیں اور یوں بھی جشن ایک عظیم لفظ ہے ہر کوئی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ میرا جشن بھی سارے ہندوستان میں منانے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے، بسم اللہ چشم ما روشن، دل ما شاد۔ کہنے لگے آپ کو حیدرآباد میں لوگ اچھی طرح نہیں جانتے ہندوستان میں کیا جانیں گے۔ ہم نے کہا تو پھر ان کا جشن منایئے جنھیں سارا ہندوستان جانتا ہے۔ یہ کہہ کر ہم نے اپنے گھر کے کواڑ بند کر لیئے۔ ایسا معلوم ہوا گویا دل کے کواڑ کھل گئے ہوں۔! ◘◘

فارم ۱۷ حسب قاعدہ بابت "شگوفہ" حیدرآباد 500001

مقام اشاعت : ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۱
وقفہ اشاعت : ماہنامہ
پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال ۸-۶۶۸-۶-۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۔ ۲۳
مالک کا نام اور پتہ : قیصر کمال " " " " " " "

میں سید مصطفےٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط
سید مصطفےٰ کمال

بابو آر کے (اچل پوری)

★

میاں رمضانی

یوں تو میاں رمضانی اس دارِفانی میں رمضان کی مُبارک ساعتوں میں پیدا ضرور ہوئے تھے لیکن ایک عرصہ سے انہوں نے اپنے روزوں کے بیچ دسترخوان بچھانے رکھا تھا۔ میاں رمضانی، بلا کے خوش خوراک واقع ہوئے ہیں اس لیے رمضانی ہونے کے باوجود رمضان سے دامن بچاتے رہے ہیں۔ ہر رمضان کی طرح اس سال بھی ہم نے انھیں ایک دن بیچ بازار میں دھر لیا۔ اور علیک سلیک کے بعد انہیں مخاطب کیا۔۔۔ واہ صاحب واہ۔۔۔ کیا بات ہے؟ ایک تو آپ خود میاں رمضانی یعنی سراپا رمضان ٹھہرے اور اس پہ یہ منہ میں کلوں کے بیچ دبی پان کی گلوری، تو بہ توبہ کیا بے حیائی ہے کیسی ڈھٹائی ہے! ہم کہتے ہیں اگر آپ رمضان کا خیال نہیں رکھتے نا سہی کم ازکم اپنے نامِ نامی اسمِ گرامی کا ہی خیال کر لیا کرو رمضان کا احترام کر لیا کرو۔ ہماری نصیحت کے جواب میں۔۔۔ وہ پان کی گلوری کو منہ میں کروٹ دے کر بولے، یہ بھی آپ نے خوب کہی یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ رمضان کے مہینے میں پیدا ہو کر ہم نے کوئی جرم کیا ہے؟ یعنی ہم رمضان میں پیدا ہوئے اور رمضانی کہلائے تو آپ روزوں کی بندش لیے ہم پہ چڑھ دوڑے۔ ہم کہتے ہیں اگر ہمارا نام اسمٰعیل ہوتا تو کیا آپ ہم سے قربان ہو جانے کی توقع رکھتے اور حُسین ہوتا تو شہادت کی آرزو کرتے۔۔۔ ﷲ، ہم آپ سے کہہ دیتے ہیں خدا کے واسطے روزوں کا اصرار آپ ہم سے نا ہی کریں تو بہتر ہے۔ ہمارا نام رمضانی بھلے ہی ہو لیکن آپ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم دسترخوانی پہلے ہیں اور رمضانی بعد میں۔۔۔ یہ کہہ کر وہ نئے کپڑوں کو بغل میں دبا کر کھسکنے لگے۔ اس وقت ہم بھی ان کے ساتھ ہو لیے اور چلتے چلتے انھیں ایک چٹکی اور بھری، اچھا جی یعنی عید کے کپڑوں کی خریداری بھی ہو گئی واہ صاحب واہ روزے ندارد اور عید باشد، ہماری جلی کٹی سن کر وہ بولے واہ بھئی واہ، اُلٹے سید ھے روزے رکھ کر عید کا ٹھیکیدار بن جانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ ہم کہتے ہیں آپ روزہ داروں اور ہم روزہ خوروں میں فرق بس اتنا ہی تو ہے نا۔۔۔ کہ آپ لوگ اِفطار کے بعد سے سونے تک اور پھر سحری کے بہانے سحر ہونے تک کھاتے ہیں اور ہم رات میں بجائے کھانے کے سوتے ہیں اور سحری سے افطار کے درمیان کھاتے ہیں۔ یعنی آپ رات بھر کھائیں تو روزہ دار اور ہم دن میں کھائیں تو روزہ خور، یہ کہاں کا انصاف ہے، عید پر جتنا حق آپ کا ہے اتنا ہی حق ہمارا بھی ہے۔ میاں رمضانی کی روزہ خوری کے متعلق تمام دلیلیں سُننے کے بعد ہم نے کہا، خیر صاحب روزے اور عید کی یہ منطق آپ اپنے ہی پاس رکھیں۔ دراصل ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ عید الفطر یہ صرف روزہ داروں کی عید ہوتی ہے اس لیے عید کے جملہ تکلفات روزہ داروں کو ہی زیب دیتے ہیں آپ جیسے روزہ خوروں کو نہیں، ویسے اگر آپ رمضان کی چھبیس تاریخ کا ایک آدھ روزہ ہی رکھ لیں تو شاید عید کی خوشیوں پر تھوڑا

بہت حق آپ کا بھی بن جائے گا۔ اور اس طرح عید کے مزے لوٹنے میاں رمضانی نے ہم سے وعدہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے جان جائے یار ہے وہ چھبیس رمضان کا روزہ رکھ کر رہیں گے۔ اور اس طرح اس اعادہ کے بعد قرار یہ پایا کہ اس روزے کی سحری میں ہم بھی ان کے ہم طعام رہیں گے۔

تو صاحب، اس ایک روزے کے اہتمام کا یہ واقعہ ہے کہ میاں رمضانی، رمضان کی پچیس تاریخ کی صبح ہی سے مصروف ہوگئے۔ سحری کے لیے انواع و اقسام کے پھلوں کے ذخیرے جمع ہونے لگے۔ بریانی قورمے کے لوازمات اکٹھا ہوئے۔ زردے سموسوں کے اہتمام ہوئے۔ روزے کی فکر اور سحری کی لگن نے شاید میاں رمضانی کو رات بھر جگائے رکھا۔ نصف شب کو ہمیں بیدار کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ اٹھو میاں جاگو، چھبیس تاریخ کا کڑیل روزہ حملہ زن ہونے کو ہے۔ صبر اور بھوک پیاس میں گھمسان کا رن چھڑنے کو ہے۔ دسترخوان پر ہم نے تمام لاؤ لشکر جمع کردیئے ہیں۔ چلو بستر سے دسترخوان کی طرف کوچ کرو۔ بریانی کی ڈھال اور قورمے کی تلوار سے لیس ہوجاؤ۔ سموسے پھلوں اور زردے کی صف بندیاں فوراً اپنے معدے میں کرلو۔ الغرض میاں رمضانی نے روزے کو جہاد سے تعبیر کیا اور پھر روزے سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے انہوں نے محاذ دسترخوان پہ وہ وہ ہاتھ چلائے کہ اللہ کی پناہ! یعنی وہ نصف شب سے سحر ہونے تک سحری کرتے رہے اور ہم بجائے سحری کرنے کے ان کی سحری دیکھتے رہے۔ پھر خدا خدا کرکے رمضان کی چھبیس تاریخ کا سورج میاں رمضانی کے لیے بھوک اور پیاس کا توشہ لیے طلوع ہوا۔ ابھی ٹھیک سے دن کے دس بھی نہیں بجے تھے کہ میاں رمضانی پہ ڈکاروں کا زبردست دورہ پڑا۔ وہ ڈکاریں لیتے جاتے تھے اور سوکھے ہونٹوں پر زبان ......

....تو پانی کے رنجنوں اور مشکوں پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے جس وقت گھڑی نے گیارہ بجائے تب وہ بولے۔ روزے کے متعلق روزہ دار سے اللہ رب العزت نے جو وعدہ کیا تھا اس وعدے کے معانی و مطالب بہت دنوں بعد آج ہماری سمجھ میں آئے .... کہ روزہ واقعی ایک سخت امتحان ہے مشکل کام ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کا اجر میں اپنے ہاتھ سے روزہ دار کو دوں گا۔ حقیقتاً روزہ اگر ایسا ویسا عمل رہا ہوتا تو رب العزت براہِ راست اس کا اجر نہ دیتے۔ اتنا کہنے کے بعد انہوں نے نڈھال ہوکر آنکھیں بند کرلیں اور بستر پر لیٹے لیٹے پیٹ سہلا سہلا کر ڈکاریں لینے لگے۔ پھر بستر سے اٹھتے ہوئے صاف دو ٹوک لہجہ میں بولے، روزہ رکھ کر جان دینے سے بہتر تو یہ ہوگا کہ ہم روزہ توڑ کر ساٹھ غریبوں مسکینوں کو کھانا کھلا دیں اور یہ کہہ کر وہ پانی کا گلاس منہ سے لگا کر چوہدری کھانے ہی والے تھے کہ ہم نے انھیں دبوچ کر بستر پر بٹھا دیا اور پانی کا گلاس پھینک دیا۔ پھر ہم نے انھیں، بجائے پانی کے ....

.....روزے کی افادیت اور اس کی اہمیت کا لیکچر پلا دیا۔ روزے کے متعلق ہماری نصیحت شاید ان پر اثر کر گئی تھی۔ اسی لیے وہ روزے کی شہادت کی جگہ افطار کی ضیافت کا تذکرہ کرنے اور اس کے لوازمات کا جائزہ لینے بیٹھ گئے۔ بعد ازاں افطار کے ذکر اذکار میں ہی ظہر کی اذان ہوگئی۔ ظہر کی نماز انھوں نے بیٹھے بیٹھے ادا کی۔ حالتِ نماز میں بھی ان کی آستین ڈکاروں کے ساز چھیڑتی رہیں۔ بدہضمی کا آرکسٹرا پیٹ کے اندر برابر شور مچائے رہا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ بولے، واقعی آج روزے کی حالت میں ہمیں ان بیچاروں کی پریشانی اور تکلیف کا احساس ہوا۔ ہم نے کہا... غریبوں محتاجوں کی بھوک پیاس کے احساس کا نام ہی تو روزہ ہے اور اَلحَمدُ لِلّٰہ! آپ کو اس کا احساس ہوگیا گویا آپ کے روزے کا مقصد پورا ہوگیا۔ یہ سن کر وہ بولے، اجی میاں بھاڑ میں جائے غریبوں کی بھوک پیاس

ر مارو گولی محتاجوں کی محتاجی کو۔ ۔ ۔ ۔ ابھی ہم تو بڑی توند والے نیتاؤں اور بسیار خور مالداروں کی پریشانی کی با
یہ رہے ہیں کہ بسیار خوری کے باعث ان بیچاروں کو کتنی پریشانی ہوتی ہوگی۔ کتنے ڈکاروں کے قافلے ان کی
نتوں سے نکل کر انھیں تکلیف میں مبتلا کرتے ہوں گے۔ بدہضمی کے ہاتھوں کیسی بے چینی کے وہ شکار ہوتے ہوں گے
۔۔۔ ارے ایک سحری کی بسیار خوری نے ہمارا ناک میں دم کر دیا۔ ڈکاروں نے بے دم کر دیا۔ ۔ ۔ ان بیچاروں کو تو
ندگی بھر بسیار خوری سے سابقہ پڑتا ہے۔ ارے کھٹی کھٹی ڈکاروں کا کرب اور بدہضمی کا عتاب تو کوئی ان سے پوچھے
اقعی آج ہمیں روزے کی حالت میں احساس ہوا کہ بسیار خوری کے باعث ان بیچاروں کی زندگیاں کتنی المناک
زرتی ہوں گی۔ اور اس طرح، میاں رمضانی نے بجائے غریبوں محتاجوں کے موٹی توند والے نیتاؤں اور بسیار خور
ز داروں پہ ترس کھا کھا کر چھبیس تاریخ کا روزہ جیسے تیسے رکھ لیا اور اسی اکلوتی ایک روزے کے باعث وہ
ید کی تیاریوں میں جٹ گئے۔ پھر عید کے دن نیا جوڑا نیا جوتا اور نئی ٹوپی پہنے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ نوشہ کی طرح سج دھج
ر گھر سے نکلے اور عیدگاہ کی جانب چل پڑے۔ عیدگاہ جاتے وقت وہ نمازیوں کے جلوس کے آگے آگے اس
ان سے چلنے لگے گویا یہ نوشہ ہوں اور نمازیوں کا جلوس باراتی ہو۔۔۔!

امریکہ کی سیر

ضیاء الحق قاسمی
کراچی (پاکستان)

میں کراچی سے چلا جب گرمیاں زوروں پہ تھیں
اس قدر سردی یہاں ہے ایک ہیٹر چاہیے
میرے رہنے کا ٹھکانہ بھی نہیں کوئی یہاں
اک تر و تازہ سی مجھ کو بے بی سیٹر چاہیے

●

باپ نے بیٹے کو ڈانٹا اور سزا کے طور پر
گھر سے باہر کر کے اس کو نو دو گیارہ کر دیا
باپ کی تنبیہہ سے بیٹا بڑے غصے میں تھا
اس نے ڈائیل فون سے پھر نو سو گیارہ کر دیا

●

ہم کو امریکہ تو بالکل راس آیا ہی نہیں
اپنی ناکامی پہ آؤ مل کے سب تھو تھو کریں
مال و دولت اب بھی مل سکتے ہیں ہم سب کو اگر
لاٹری نکلے ہماری یا کسی پر سو کریں!

●

اس ملک میں شاعر کی پذیرائی بہت ہے
موسم ہے سہانا یہاں آنا ہو تو آئیں
مہمان نوازی تو بہت ہوتی ہے لیکن
سگرٹ کی جو حاجت ہو تو گیراج میں جائیں

لڑکیوں میں ہم بڑے مقبول تھے اپنے یہاں
رہ کے امریکہ میں کیا ہوگا کبھی سوچا نہیں
ہم پہ عاشق ہو سکی کوئی نہ گوری اب تلک
اور ہم نے بھی کسی کو آج تک تاڑا نہیں

●

ہم کو امریکہ کا ویزا ملٹی پل تو مل گیا
چھ مہینے رہ سکیں گے یہ اشارہ ہے ہمیں
اور رکنا ہو تو شادی کر کے رک سکتے ہیں ہم
لولی، لنگڑی اور کانی بھی گوارا ہے ہمیں

●

وہ جلا کر کشتیاں ویزا تو کب کا لے چکے
آنے کو تیار بیٹھے ہیں جو فہرستوں میں ہیں
آ کے ٹک جانا یہاں مشکل نہیں بالکل نہیں
کار، بنگلہ اور بیوی بھی یہاں قسطوں میں ہیں

●

جہاں قدر چغتائی (بھوپال)

"باپ کی تلاش"

ہم جب دادا بن گئے تو ہم کو باپ یاد آیا۔ ماں یاد آئی۔ کیوں کہ ماں اور باپ ہی کا اولاد سے بہت پاس کا رشتہ ہوتا ہے آگے چل کر رشتوں میں فاصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ دُنیا کے ہر مذہب میں بچوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ماں باپ کی عزت کرنا بچوں کا دھرم ہے۔ ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے اِس فرض کے نباہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ستر سال بعد بھی کوئی ان کی طرح محبت کرنے والا ہم کو تو ملا نہیں۔ ہندوستانی سماج میں ماں کا درجہ زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ مگر کیوں۔ ہم اس بحث میں ہرگز نہیں پڑنا چاہیں گے۔ مگر ماں اور باپ دونوں اولاد کی نظر میں برابر ہونے چاہئیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال میں ہم کو باپ کی قیمت دنیا کے بازار میں برابر گرتی نظر آئی تو ہم دادا ہوتے ہوئے بھی چونکنا پڑا اور ہو سکتا ہے کہ ہماری بات سن کر آپ کو بھی غور کرنا پڑے کہ باپ کے رشتے کا ڈی ویلوایشن کیوں ہوا۔ کس نے کیا اور کیوں کیا یہ بات ہر باپ کے لیے غور کرنے کی چیز ہے۔ دادا تو دُور سے یہ تماشہ دیکھ سکتا ہے۔ اس معاملے میں ہم کو جہاں زندہ میٹریل سکتا ہے وہ ہیں ہندوستانی فلمیں جو آج بھی سماج کی سچی تصویر پیش کرنے کا دعویٰ کرتی دکھائی دیتی ہیں ہم آج کے اس بہروپیا دور میں یہ نہیں کہیں گے کہ ہماری فلمیں نسلوں کو بگاڑتی ہیں۔ جب ہندوستان میں سینما نہیں تھا تو دوسری طرح کے تماشے دیکھے جاتے تھے۔ جیسے بندر کا تماشہ۔ ریچھ کا تماشہ نٹ کا تماشہ۔ رام لیلا۔ رہس وغیرہ۔ پھر بائسکوپ۔ سرکس اور تھیٹر۔ اور تھیٹر میں اندر سبھا وغیرہ۔ جب پارسیوں نے تھیٹر کو بطور تجارت اختیار کیا تو اِس میں بھی کہانی میں اخلاقیات کے رشتوں کا لحاظ ضرور رکھا گیا۔ شو کے آغاز پر خدا اور بھگوان کی تعریف ضروری تھی۔ فلم پہلے گونگی ہوتی تھی مگر اس میں بھی خدا اور بھگوان کا خیال رکھا جاتا تھا۔ تھیٹر میں رومانی کہانیوں کو مقبولیت حاصل ہوئی تو ماں اور باپ کے کردار کو اہم سمجھا جانے لگا۔ پھر جب فلموں نے بولنا سیکھ لیا تو سینما کی مقبولیت دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ ہم فلم کی تاریخ بیان کرنا نہیں چاہتے ہم کو دراصل تلاش ہے ہندوستانی فلموں میں باپ کے کردار کی ہم نے اپنے لڑکپن میں ایک فلم خزانچی دیکھی تھی۔ اس فلم کی کہانی میں ایک ایسا منظر تھا جس میں بیٹا اپنے باپ کو مارتا ہے۔ باپ جیل سے رہا ہو کر بیٹے کے بنگلے پر بطور مالی ملازم ہو گیا تھا۔ خزانچی فلم کا یہ سین بہت پسند کیا گیا۔ لاہور کی یہ فلم پنچولی نے بنائی تھی پھر بمبئی میں لگاتار کئی ایسی فلمیں بنائی گئیں جن میں باپ کو بیٹے سے پٹوایا جانے لگا مگر سب فلاپ ہی ہوئیں۔ کئی برس پہلے ایک فلم باپ کے نام پر

ضرور بنی تھی لیکن وہ بچہ اس کا اصلی بیٹا نہیں تھا فلم تھی کنوارا باپ ۔ گزشتہ پچاس سالوں میں بہت بڑی بڑی فلمیں ہندوستان نے بنائیں لیکن باپ کا کردار برابر پھیکا پڑتا گیا ۔ جب اسٹنٹ فلموں کے میدان میں ہماری انڈسٹری نے قدم رکھا تو "اچھے باپ" ختم ہونے لگے ۔ مالدار غنڈے اور بدمعاش زیادہ نظر آنے لگے جو اپنی حرکتوں کی وجہ سے گولی مارے جانے لگے ۔ اس دور میں جو فلمیں دیکھنے میں آئیں اُن میں ماں کی ممتا کا ڈنکا پیٹا جانے لگا ۔ ماں کی خاطر بیٹا ڈاکو بن گیا ۔ کسی نے اپنے باپ والی ماں کے لیے ہوٹل بنوائے ۔ پلازا بنوائے اور مری ہوئی ماں کا نام مرنے کے بعد روشن کیا ۔ خاموش فلموں سے لے کر آج چلنے والی فلموں تک ہم نے کوئی ایسی فلم نہیں دیکھی جس میں کسی بیٹے نے اپنے باپ کی محبت میں اس کے مرنے کے بعد ایک یتیم خانہ ہی بنوا کر اپنے باپ کی محبت ظاہر کی ہو ۔ ایک ایسی فلم بھی ہندوستانی سینما گھروں میں چلی جس میں باپ بیٹے سرکس کے مسخروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ۔ ایک کنجوس باپ اسکرین پر ایسا بھی دیکھنے کو ملا جس کا گلا بیٹے نے دبا دیا کیوں کہ باپ اپنے بیٹے کی محبت میں رکاوٹ بن رہا تھا ۔ ایک ایسا شخص جو فلم خزانچی سے آج تک فلموں میں باپ کی درگت دیکھ رہا ہو کیا وہ ہاتھ فلم سازوں سے نہیں پوچھ سکتا کہ اپنی فلموں میں ذرا باپ کو ڈھونڈ کر لاؤ ۔ اگر خاندان کی یہ لمبی ریل گاڑی ایک پہیے پر چلی تو کتنی دور تک جائے گی ۔ کیا یہ سوچنے والی بات نہیں ہے ؟ ! فلم کے علاوہ ٹی وی پر جتنی بھی کامیاب فلمیں سیریلیس پر دکھائی جا رہی ہیں ان میں سے اکثر میں "بے باپ" والے بیٹے نظر آ رہے ہیں ۔ یہ سب دیکھ کر ہم کو تو ایسا لگتا ہے کہ جب ہمارا ملک اکیسویں صدی میں داخل ہوگا تو شاید اس وقت تک باپ کا کردار ہندوستانی سماج سے باہر نکل چکا ہوگا ۔

▲▼

پیاز

مجاہد لکھنوی

جب کبھی بازار میں نایاب ہو جاتی ہے پیاز
ہم کہاں کھاتے ہیں اسکو پھر ہمیں کھاتی ہے پیاز

ان کے آنسو دیکھ کر ہوتا ہے صدمہ کس قدر
ہائے کیسی شربتی آنکھوں کو رُلواتی ہے پیاز

سُرخ چہرہ، ڈبڈبائی آنکھیں، پھیلی پُتلیاں
اِک مجسّم انقلابِ حُسن بن جاتی ہے پیاز

ہے اسی پر ازدواجی زندگی کا انحصار
گر نہ ہو گھر میں، میاں بیوی کو لڑواتی ہے پیاز

بے سبب جب لڑ پڑیں آپس میں دو ہمسائیاں
چھوٹی موٹی سنگباری میں بھی کام آتی ہے پیاز

جب اچانک روڈ پر چھٹ جائے تھیلی ہاتھ سے
کیسے کیسے اہلِ علم و فن کو دوڑاتی ہے پیاز

ہو نہ کھانے کے لئے جب کچھ بھی دسترخوان پر
ایسے نازک وقت میں بھوکے کو بہلاتی ہے پیاز

وہ چقندر ہو کہ شلغم، پھول گوبھی یا مٹر
جان ہر ہانڈی کی، ہر موسم میں بن جاتی ہے پیاز

دیکھنا پڑتا ہے اس کے ہر بدلتے رنگ کو
پھیر لیجئے گر نظر دم بھر کو جل جاتی ہے پیاز

ہے مزاجِ یار سے بھی کچھ سوا اس کا مزاج
مُنہ تک آتے آتے کتنے ناز اُٹھواتی ہے پیاز

وقت اور حالات سے ڈریئے مجاہد ہر گھڑی
گر بگڑ جائے تو پھر تقدیر چھلواتی ہے پیاز

غزل

فرید سحر
نرساپور

جب کبھی ان کی دید ہوتی ہے
اپنی مٹی پلید ہوتی ہے

پیسے والوں کی یہ کرامت ہے
اُن کی دُنیا مرید ہوتی ہے

سائیڈ بزنس بھی اب ضروری ہے
اس سے اِنکم مزید ہوتی ہے

مسجدوں میں نماز پڑھتے رہو!
ورنہ مسجد شہید ہوتی ہے

ہنس کے ملنا بھی اک مصیبت ہے
احمقوں کو اُمید ہوتی ہے

سر پہ جس کے اوارڈ ملتا ہو
اُس کے سر کی خرید ہوتی ہے

وردی والے کی یہ نشانی ہے
اُس کی گالی جدید ہوتی ہے

نیک بننا بھی پاپ ہے یارو
اُس کی مٹی پلید ہوتی ہے

ملنے جاتی ہیں جب وہ میکے میں
سحر صاحب کی عید ہوتی ہے

★

رؤف رحیم
حیدرآباد

غزل

فخر تھا میرا تخلص مختصر اُس نے کیا
"ف" تخلص سے نکالا لاحد خر اُس نے کیا

دل لگایا اور پھر دریوزہ گر اُس نے کیا
میرا سب کچھ لے کے مجھ کو دربدر اُس نے کیا

کر کے وعدہ عقد کا مجھ کو کنوارا ہی رکھا
"میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا"

اُس کی مٹھی گرم کی جو گائیڈ پی ایچ ڈی کا تھا
میں تھا جاہل مجھ کو ڈگری ہولڈر اُس نے کیا

میری غزلوں کو چرا کر ہر جگہ پڑھتا رہا
گاڑی میری تھی مگر اُس میں سفر اُس نے کیا

جو بھی مجھ کو دیکھتا ہے دیکھتا رہتا ہے بس
یوں مری ہستی کو عریاں پوسٹر اُس نے کیا

کتنا ہے معصوم میرا جانِ جاں مت پوچھئے
اِک رقیبِ روسیاہ کو خامہ بر اُس نے کیا

سڑکیں چوڑی کرنے والے کا بڑا احسان ہے
میں گلی میں رہ رہا تھا روڈ پہ اُس نے کیا

تھا مرا نقاد مچھر کی صفت کا دوستو
رات دن رہ رہ کے مجھ کو تار جر اُس نے کیا

کر کے اک تنقید بے جا ایک محفل میں رحیم
خوش ہے جیسے میرے فن کو بے اثر اُس نے کیا

افتخار وصی
بھیلائی

پتھروں کو پھینک کر پانی کا اندازہ لگا

چھن گئی کرسی صدارت تو اندازہ لگا
تھا مری شہرت کے پیچھے مُلّا دوپیازہ لگا

باتوں باتوں میں جھگڑ کر اہلیہ میکے گئیں
یہ مجھے میری حماقت ہی کا خمیازہ لگا

ڈاکٹر صاحب کلینک میں نہ بیٹھیں مکھیاں
اپنے کمرے سے تو اتنا کس کے آوازہ لگا

دیش کیا ہے! بیچ کر کھا جانے کی شئے کے سوا
جب سیاست میں قدم رکھا تو اندازہ لگا

نل برابر بھی جگہ خالی نہیں تھی داغ سے
پھر بھی اُس کا چہرہ مجھ کو چاند سا تازہ لگا

اس سے پہلے کہ تری نالی میں آجائے اُبال
"کوئی پتھر پھینک کر پانی کا اندازہ لگا!"[1]

جھریاں چہرے کی جائیں گی اس میں افتخار
آنکھ میں کاجل لگا، رخسار پہ غازہ لگا

۱۔ تضمین اک حرف کے تصرف کے ساتھ!

عابد معز

مجتبیٰ حسین کی کتاب
"آخر کار" کی رسمِ اجراء

چھٹی پر وطن کے دورے میں ادبی محافل میں شرکت کا پروگرام بھی رہتا ہے۔ احباب سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور ادبی سرگرمیوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں آمد کے ساتھ ہی اطلاع ملی کہ عید کے بعد نامور طنز و مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کی بارھویں تصنیف "آخر کار" کی رسم اجراء عمل میں آنے والی ہے۔ اخباروں کے ذریعہ تقریب کی تیاری اور پروگرام کی خبریں ملتی رہیں۔

آخر کار ۸ فروری ۹۸ء کا مقررہ دن اور وقت آپہنچا۔ شہر حیدرآباد کے ادیب، شعراء، صحافی، دانشور اور باذوق سامعین اور قارئین کی ایک کثیر تعداد جمع تھی۔ ادبی محفلوں میں سامعین کی کمی ایک روایت بن گئی ہے۔ سامعین کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے لیکن اس محفل کی خوبی یہ رہی کہ وسیع ہال، سامعین سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں نے دو ایک شاعر اور ادیبوں کو کہتے سنا "حاضرین کی اتنی تعداد دیکھ کر ہمیں مجتبیٰ سے رشک ہونے لگا ہے"۔ اس تقریب میں شہر حیدرآباد کے علاوہ دیگر مقامات سے بھی لوگ شریک تھے۔ اورنگ آباد، گلبرگہ اور دیگر اضلاع سے آئے ہوئے مجتبیٰ کے چاہنے والے موجود تھے۔ بمبئی سے پرویز یداللہ مہدی آئے تھے۔ برطانیہ سے آئے ہوئے مہمانان خصوصی عباس زیدی اور نقی تنویر اسٹیج پر براجمان تھے۔ جناب نقی تنویر مجتبیٰ کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ دوستی کا ثبوت مجتبیٰ نے اپنی اس کتاب "آخر کار" کو نقی تنویر کے نام معنون کرکے دیا ہے۔ اس جلسہ میں خلیج کی نمائندگی میں کر رہا تھا تو امریکہ سے ذیشان خوند میری موجود تھے۔ محفل میں اور کئی حضرات ایسے بھی شریک تھے جنھیں میں نہ جانتا تھا۔ سامعین کی تعداد کو دیکھ کر خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا کہ اس پُر آشوب دور میں بھی لوگ اردو اور ادب کے نام پر جوق در جوق جمع ہوجاتے ہیں۔ اس کا سہرا مجتبیٰ اور طنز و مزاح کے سر ہے۔ احباب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک عرصہ بعد اردو ہال کا وسیع و عریض مرکزی آڈیٹوریم اردو کے کسی جلسہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے ورنہ سامعین کی کمی کے پیشِ نظر محفلیں ہال کے بجائے ایک مختصر سے کمرے میں منعقد ہو رہی تھیں۔

اس تقریب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی تھی کہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراج پوری پہلی مرتبہ شہر کی کسی ادبی محفل میں شریک تھے۔ موصوف کا پرجوش استقبال کیا گیا اور انھیں بھرپور تعاون کا یقین دلایا گیا۔ پروفیسر صاحب نے کتاب کی رسم اجراء انجام دینے کے بعد فرمایا کہ وہ مجتبیٰ حسین کے "فین" ہیں اور ان کی کتاب

کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے انھیں فخر محسوس ہو رہا ہے۔ پروفیسر شمیم صاحب نے اردو یونیورسٹی کے خط و خال پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی۔

اردو زبان کا منفرد اور طنزیہ و مزاحیہ ادب کے لیے مختص، ربع صدی سے زائد عرصہ سے شائع ہونے والا ماہنامہ "شگوفہ" کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی تقریر حاصل تقریب رہی۔ کیوں کر نہ ہوتی! موصوف پچھلے تیس سال سے مسلسل بے تکان اردو طنز و مزاح کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ اردو طنز و مزاح پر ڈاکٹر کمال کی گہری نظر ہے۔ ڈاکٹر کمال نے کہا کہ اردو میں مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب ہیں۔ ہر مکتبہ فکر اور ادب کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والا ان کی تحریروں سے محظوظ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ طنز و مزاح دوسرے درجہ کا ادب ہے سراسر بے بنیاد ہے۔ دراصل کوئی صنف یا رجحان بذاتِ خود کوئی درجہ نہیں رکھتی بلکہ ادیب یا شاعر اپنی تخلیقات کی بنیاد پر کوئی مقام یا درجہ حاصل کرتا ہے۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک جلسہ میں جناب عزیز قیسی نے کہا کہ میرے خیال میں طنز و مزاح دوسرے درجہ کا ادب ہے۔ سامعین میں بیٹھے جناب یوسف ناظم نے کہا "اور پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جارہا ہے؟" یہ تو محض ایک لطیفہ تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں طنز و مزاح کی افادیت پر سنجیدگی سے کام ہو رہا ہے اور ماس میڈیا پر طنز و مزاح ہی حاوی ہے۔

ڈاکٹر کمال نے یہ بھی کہا کہ مجتبیٰ حسین نے نثر کی اکثر اصناف میں طنز و مزاح کو برتا ہے۔ ان کا سفر سیاست کی کالم نگاری سے شروع ہوا اور اب زیادہ توجہ کالم نگاری ہی کی طرف ہے۔ لیکن ۳۵ سال کے اس عرصہ میں مجتبیٰ نے انشائیے، خاکے، سفرنامے، مقدمے، رائیں، رپورتاژ، استقبالیے وغیرہ وغیرہ جو کچھ لکھا، اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ ان تحریروں کو طنز و مزاح کا شاہکار بنادیا۔ ڈاکٹر کمال نے اپنی تقریر کے دوران کامیاب طنز و مزاح نگاری کا گُر بھی بتایا۔ ایک کامیاب بذلہ سنج کے لیے انسانی نفسیات سے واقفیت اور کسی قدر ذہنی برتری ضروری ہے۔

اردو طنز و مزاح کے بزرگ ACTIVIST سید ضمیر جعفری نے دنیا کے کئی شہروں میں بہ بانگ دہل یہ اعتراف کیا ہے کہ حیدرآباد دکن طنز و مزاح کا مکہ ہے۔ حیدرآباد اور مجتبیٰ کے حوالے سے ڈاکٹر کمال نے کہا کہ مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں حیدرآبادیت کا خون دوڑتا نظر آتا ہے اور حیدرآباد، حیدرآباد کے گلی کوچے، حیدرآباد کے کردار اور تہذیب یہ سب، ان کی تحریروں پر حاوی ہیں۔ حیدرآباد کے باہر رہتے ہوئے بھی وہ حیدرآباد کی بات کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا بہت تفصیلی احاطہ کیا اور مجتبیٰ کے فن کے بعض ایسے نئے پہلوؤں پر گفتگو کی جس کا ذکر سامعین جلسہ کے بعد بھی کرتے رہے۔

تقریب میں پروفیسر مغنی تبسم نے مجتبیٰ کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مجتبیٰ حسین کو انشائیہ کی طرف بھی پھر ایک بار توجہ کرنی چاہیے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے مجتبیٰ کی باریک بینی اور مشاہدے کا خاص طور سے ذکر کیا۔ جناب عباس زیدی نے جو اردو مجلس کے زیر اہتمام لندن میں اردو کی شاندار محفلیں سجاتے رہے ہیں اپنے پرانے دوستوں مجتبیٰ حسین اور نقی تنویر کی شخصیت پر ایک مختصر خاکہ پڑھا۔ جناب نقی تنویر نے بھی محفل کو مخاطب کیا۔

جناب مرزا وحید بیگ اور ممتاز مزاحیہ شاعر، آرٹسٹ اور نامور آرکیٹکٹ جناب طالب خوندمیری نے منظوم خراج پیش کیا۔ طالب خوندمیری فرماتے ہیں ـــ

جہاں کا درد چھپانا ہنسی کے پردے میں ۔۔۔ اسی کا حق ہے اسی کے قلم کا حصہ ہے
دھمک رہا ہے یہ دلی میں آج قول لیکن ۔۔۔ یہ کوہ نور دکن کی زمین سے نکلا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، صدر زندہ دلان حیدرآباد نے مدارتی خطاب میں توقع کے مطابق طنز و مزاح کی سماجی اہمیت اور افادیت پر تفصیل سے گفتگو کی اور مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری اور مقبولیت کا ذکر کیا۔

جناب مجتبیٰ حسین نے نقی تنویر پر لکھا اپنا ایک خاکہ سُنایا جس کے ایک ایک جملہ پر ماضی بعید کی طرح تحسین اور واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔

یہ جلسہ زندہ دلان حیدرآباد اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے مشترکہ زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ جلسہ کی کارروائی جناب نصرت محی الدین نے چلائی اور شکریہ جناب طالب خوندمیری نے ادا کیا۔

"آخر کار" سیاست میں شائع شدہ اکیس منتخب کالموں کا مجموعہ ہے جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کیا ہے۔ ناشر نے فروخت کے لیے بہت کم کتابیں فراہم کی تھیں۔ بہت سے خواہشمند حضرات کتاب حاصل نہ کر سکے۔

عام طور پر جلسہ کے بعد شرکاء فوری منتشر ہو جاتے ہیں لیکن اس دن لوگ مزید گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رُکے رہے۔ مجتبیٰ حسین اور اس جلسہ کی گفتگو چھڑی رہی۔ آخر کار سب کو جانا ہی تھا۔ خوشگوار یادیں سمیٹے سب اپنے اپنے گھر سدھارے۔

نٹ کھٹ عظیم آبادی

"گھٹالوں" کا سال

ہے بھرشٹاچار اپنے دیش میں عالی جناب
اب نہیں پڑھتا کوئی ایمانداری کی کتاب
ہے کہیں چوری چماری تو "حوالہ" ہے کہیں
دیش میں دیکھو "پشو پالن گھٹالہ" ہے کہیں
لپت ہیں نیتا مرے سب ہی بھرشٹاچار میں
کچھ تو بالکل گپت ہیں کچھ سامنے اخبار میں

کچھ بڑے نیتاؤں کا "ٹو فورس" میں بھی نام ہے
وہ مگر کہتے ہیں یہ الزام ہے الزام ہے
نام پر مذہب کے چمکایا ہے کچھ نے کاروبار
"یوریا" کے بھی دلالوں میں ہے کچھ کا اب شمار
کچھ نے دھن "جین گھٹالے" میں کمایا ہے بہت
بینک بیلنس اس طرح اپنا بڑھایا ہے بہت
یہ زمیں بھی ان کے چکر سے نہ بچ پائی ابھی
دام میں ان کے ہوا پانی نہ آجائے کبھی
دیکھیں "اسرو کانڈ" میں کس کس پہ اب انگلی اٹھے
یا "پرولیا کانڈ" کی طرح نہ اٹھ کر یہ دبے
دانت گاڑے ہیں گھٹالہ باز اب پیٹرول پر
ہو رہا ہے کچھ نہ کچھ کھیلا یہاں اب کول پر
اب تو عورت بھی گھٹالہ کر رہی ہے مرد سے
مال شوہر سے محبت دوسرے اک فرد سے
اس پہ ہے الفت گھٹالے سے گھٹالہ باز سے
دیکھئے ہم جی رہے کس بڑے انداز سے
گویا جو یہ سال گزرا، بس گھٹالوں کا رہا
جو کبھی بھی حل نہ ہوں ایسے سوالوں کا رہا

ہے دعا نٹ کھٹ کی اگلا سال ان سے پاک ہو
پھر گھٹالوں سے نہ سینہ دیش کا اب چاک ہو

غزلیں

مسز فریدہ لاکھانی فرح
(آسٹریلیا)

پہلے تو میرے دل میں مہماں ہو گئے وہ
بربادیوں کا آخر ساماں ہو گئے وہ
منزل کی میری جب سے پہچان ہو گئے وہ
رستے میں مل کے اک دن انجان ہو گئے وہ
مشکل بنے رہے وہ پت جھڑ کے موسموں میں
ساون جب آگیا تو آسان ہو گئے وہ
ہنسنے لگے تو گویا مشتاق یوسفی تھے
روٹھے تو میر جی کا دیوان ہو گئے وہ
کہتے تھے وہ کسی کو یاد اب نہیں کرینگے
جب یاد فرح آئی حیران ہو گئے وہ

محمد روشن علی کرنل (کریم نگر)

اک پل بھی ہم نہ سوئے رات بھر
مچھروں کے تھے جو حملے رات بھر
واہ مچھر دان بھی کیا چیز ہے
مچھروں کو دور رکھے رات بھر
کھٹملوں کا دور اب بالکل نہیں
ہائے وہ دن جب وہ کاٹے رات بھر
ہم تکلف میں ڈنر تھوڑا لئے
پیٹ میں بس چوہے دوڑے رات بھر
چھوڑ کر کرنل کو وہ میکہ گئی
شاعری کرتے گزارے رات بھر

دلشاد رضوی (حیدرآباد)

نشہ بندی

یہ واقعہ دراصل ہمارے اُن تین دوستوں کا ہے جنھوں نے بذاتِ خود اپنے اوپر نشہ بندی نافذ کرلی اُن کے نامِ نامی ہیں جناب سید، دیشپانڈے جی اور میاں محمود۔ یہ تینوں بلا کے مئے نوش تھے۔ اور ہم ٹھیرے ناکارہ، نا ہنجار جنھیں کبھی بھی مئے جیسی سرور آور انگور کی دُختر کا چسکہ نہیں لگا۔ لیکن یاری دوستی میں کیا کچھ نہیں ہوتا لوگوں نے نہ صرف ہم کو اُن کے ہمراہ باروں میں جاتے دیکھا بلکہ وہاں سے آتے بھی دیکھا یہ اور بات تھی کہ نا اِن بیچاروں نے کبھی ہمیں پینے پلانے پر مجبور کیا اور نا ہی ہم نے کبھی کوکا کولا جیسی مشروبات کی حد پار کی۔ بس اُن کے ساتھ جاتے، اچھی اچھی صحت آور غذائیں کھاتے اور شربتوں سے محظوظ ہوکر اُن کے ساتھ ہی باہر نکل جاتے لیکن یہ افسوس ہمیں ضرور رہتا کہ بد اچھا بدنام بُرا کے مصداق لوگ ہمیں دیکھ کر یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ یہ مردود بھی یقیناً مئے خوار ہوگا تبھی تو باروں کے چکر کاٹتا ہے لیکن جب ما جہاں دوستی نبھانی ہو وہاں جوانمرد بھی بننا ہی پڑتا ہے ہم نے ایسی ویسی باتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی اور برابر اُن کا ساتھ دیتے رہے۔ بار میں جب لوگوں کو بہت زیادہ نشہ چڑھ جاتا ہے تو وہ مزیدار حرکتیں کرنے لگتے ہیں مثلاً ایک دفعہ ہم اپنے انھی تین دوستوں کے ہمراہ ایک بار میں براجمان تھے کہ اتنے میں دو اصحاب دو عدد خواتین کے ہمراہ وہاں آموجود ہوئے اور ہماری برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ بڑے خوش پوش و خوش مزاج لگتے تھے۔ ان چاروں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں ہم چاروں کی نگاہیں بھی اُن سے چار ہونے لگیں وہ کچھ پیتے رہے ہم بھی اپنے معمول کے مطابق کچھ پیتے رہے، پھر انھوں نے کچھ کھایا ہم نے بھی بہت کچھ کھایا۔ اتنے میں ایک خاتون ساتھی نے آہستہ آہستہ رونا شروع کیا۔ ہمارا تجسس بڑھنے لگا جب وہ زیادہ ہی رونے لگیں تب ہمیں بھی کچھ کچھ رونا آنے لگا لیکن تب بھی ہم نے اپنی جوانمردی دِکھلائی اور صبر سے کام لیا۔ کیوں کہ وہ جگہ بھلا یوں آنسو بہانے کی تھوڑا ہی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ اُن صاحبہ کو کچھ زیادہ ہی نشہ چڑھ گیا تھا اور ایسے میں آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے چنانچہ وہ خاتون بھی کچھ ایسی ہی کیفیات سے دوچار ہوگئیں اور رفتہ رفتہ دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ اب ظاہر ہے کہ انسان اگر کہیں کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر چلّا چلّا کر رونے لگے تب بھی کوئی بات نہیں ہوتی کیوں کہ اس جمہوری دور میں ہر شخص کو شخصی آزادی حاصل ہے۔ آپ رونا چاہیں، شوق سے روئیں کسی کی مجال ہے کہ آپ کو اپنے اِس جمہوری حق سے روک سکے۔ ویسے رونا بھی بہت بڑے دل گردے کا کام ہے ہر ایرا غیرا بھلا کہیں رو سکتا ہے۔ بڑے بڑے

کتنے تیا لوگ ہیں اور کیسی بڑی بڑی دھاندلیاں کرتے ہیں لیکن کیا مجال کہ اُن کی آنکھ سے کبھی ایک آنسو بھی ٹپکا ہو۔ تاہم بھلا یہ کیوں کر ممکن ہو کہ کوئی میخانے کے آداب کی اس طرح بے حرمتی کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساتھیوں کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی خاتون کو دم دلاسہ دینا شروع کردیا۔ تب آں محترمہ جیسے بآوازِ بلند رونے پر اُتر آئی تھیں ٹھیک اُسی طرح قہقہے مارنے پر مائل ہوگئیں اور پھر رفتہ رفتہ بالکل ساکت و جامد ہوگئیں۔ اسی طرح میخانوں میں رونما ہونے والے بہت سارے واقعات وحادثات کے ہم چشم دید گواہ ہیں۔ اب ایک دن یہ ہوا کہ ہم چاروں حسب معمول ایک حسین شام کو شہر کے ایک بڑھیا اسٹار ہوٹل میں روایتی شان سے داخل ہوئے معمول کے مطابق سید صاحب، دیشپانڈے جی اور میاں محمود نے جام بھرنے شروع کردیئے اور ہمارے لیے بھی ٹھنڈا ٹھنڈا شربت منگوا لیا گیا۔ اُس دن پتہ نہیں اُن چاروں کو کیا ہوگیا تھا کہ وہ بس پینے پر اُترے تو پیتے ہی چلے گئے لیکن جیسے ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح پینے کی بھی سرحد ہوتی ہے چنانچہ وہ منزل آگئی کہ جہاں سید نے جام تو پورا بھرا لیکن آدھا پی کر بس کر گئے۔ دیشپانڈے سے جی سے رہا نہیں گیا بولے "یار سید یوں شراب جیسی چیز کا بچانا آدابِ مے خانہ کے خلاف ہے"۔ سید بولے "نا بھائی نا اب بالکل پیا نہیں جاتا" ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بگڑ کر کہا "یار سید تم بھی عجیب آدمی ہو اگر اتنا پینا نہیں تھا تو جام بھرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اب بھلا تم ہی بتلاؤ کہ تمہارا جھوٹا کون پیئے گا؟" اتنا سُننا تھا کہ میاں محمود کا چہرہ تمتما اُٹھا یوں لگتا تھا کہ جیسے اُن کا نشہ جاگ اُٹھا ہو۔ بگڑ کر بولے " ارے تم جھوٹے کی بات کرتے ہو، بھائی یہ سید کا جھوٹا ہے ایسے کون نہیں پیئے گا یار سید کا جھوٹا پی کر تو میرا کردار سنور جائے گا" اتنا کہہ کر انھوں نے سید کا آدھا بھرا جام اُٹھایا اور غٹاغٹ نوش کر گئے۔ سید ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے سارا نشہ ہرن ہوگیا ہو۔ میاں محمود کے آگے سے خالی جام چھینا اور دھم سے اُسے فرش پر پٹخ دیا "میاں محمود تم نے آج کردار کی بات کہہ کر میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے آج تم نے یہ کہہ کر مجھ سے میری پہچان کروادی چلو آج میں عہد کرتا ہوں کہ پھر کبھی اس ناپاک چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میاں محمود اور دیشپانڈے جی نے اپنے اپنے ہاتھ بڑھائے اور جب تین ہاتھ ملے تو ایک ہی آواز سنائی دی کہ اب ہم کبھی بار کا رُخ نہیں کریں گے۔ چنانچہ اس دن کے بعد کسی نے اُنھیں کبھی بھی میخانوں میں بھٹکتے نہیں دیکھا۔ لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ آخر اُن تینوں نے خود پر اس طرح نشہ بندی کیوں لاگو کردی جب کہ سرکار نے سارے میخانوں کے دروازے کھول رکھے ہیں ــــ!

ڈاکٹر خلیق انجم
(نئی دہلی)

اُردو شاعروں اور اَدیبوں کے لطیفے

"اردو مجلس نے اردو ادیبوں اور شاعروں کے لطیفوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں لطیفوں پر مشتمل پہلا ریڈیائی مقالہ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے۔ اردو مجلس کے پروڈیوسر رئیس صدیقی صاحب کا کہنا ہے کہ لطیفوں پر مشتمل سات آٹھ ریڈیائی مقالے اور لکھوائے جا رہے ہیں۔"

اردو میں ادیبوں اور شاعروں کے لطیفوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ اردو شاعروں کے تذکروں میں خاص بڑی تعداد میں لطیفے مل جاتے ہیں۔ بعض شاعر تو اپنی لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ ان میں مجاز لکھنوی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے لطیفے دو تین کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کتابوں میں سب سے اہم کتاب کے۔ایل۔نارنگ ساقی کی "ادبی لطیفے" ہے، جس میں بڑے سلیقے سے مستند لطیفے شامل کیئے گئے ہیں۔

اس محفل میں آپ کو چند ایسے لطیفے سنانا چاہتا ہوں جو میری موجودگی میں وجود میں آئے تھے۔

میں علی گڑھ میں بی۔اے کا طالب علم تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ وہ طالب علموں کی حاضری بڑی پابندی سے لیتے تھے۔ ایک دن حسبِ معمول حاضری کے رجسٹر پر جھکے ہوئے رول نمبر پکار رہے تھے۔ جب انھوں نے ایک رول نمبر پکارا تو بہت عرصے کے بعد اس رول نمبر کے جواب میں کسی نے یس سر کہا۔ رشید صاحب نے گردن اُٹھا کر پوچھا یس سر کس نے کہا۔ ایک طالب علم نے ہاتھ اُٹھا دیا۔ رشید صاحب نے کہا آپ آج پہلی بار کلاس میں تشریف لائے ہیں۔ طالب علم نے جواب دیا "بد نصیبی ہے"۔ رشید صاحب نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا کس کی۔ اور کلاس میں قہقہہ گونج گیا۔

انجمن تعمیر اردو دہلی کی ایک اہم ادبی تنظیم تھی۔ اس کے سکریٹری پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی تھے۔ اردو بازار میں واقع اردو ہال میں ہر اتوار کو اس تنظیم کا ادبی جلسہ ہوا کرتا تھا اور یہاں ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات پڑھتے تھے۔ اس محفل کے دو لطیفے سن لیجیے۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ جلسوں کی صدارت کا اعزاز عام طور سے صرف ان حضرات ہی کو حاصل ہوتا تھا جو تیس چالیس سامعین کو پیش کیئے جانے والے ایک کپ چائے اور ایک سموسے کا خرچ برداشت کر سکتے ہوں! اس

لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض غیر ادبی شخصیتوں سے مجبوراً صدارت کرائی جاتی تھی۔ اب لطیفہ سنیئے: انجمن تعمیر اردو نے پیروڈی پر ایک تقریب منعقد کی۔ ادیبوں اور شاعروں نے بہت اچھی پیروڈیاں پڑھیں۔ مجھے پیروڈی پر ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ اتفاق سے اس دن جناب صدر غیر ادبی شخص تھے۔ انہیں میرے مقالے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے جب میں مقالہ پڑھ رہا تھا تو وہ برابر میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے غصے میں گلزار دہلوی صاحب سے کہا کہ جناب آپ نے ایسے صاحب کو صدر بنایا ہے جو محفل کے آداب سے واقف نہیں ہیں۔ گلزار صاحب کی حسِ مزاح جاگ اٹھی۔ اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑ کر فرمانے لگے۔ جناب یہ پیروڈی پر جلسہ ہو رہا ہے اس لیے آج کے صدر صاحب بھی باقاعدہ صدر نہیں بلکہ صدر کی پیروڈی ہیں۔

اسی محفل کا ایک لطیفہ اور سنیئے:

گوپال متل مرحوم غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔ زبردست حاضر جواب تھے۔ اور ان کی حسِ مزاح بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک دفعہ انجمن تعمیر اردو کا طرحی مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ردیف تھی۔ نفس میں قفس میں وغیرہ۔ اس دن اتفاق سے کچھ ایسے شاعر اکٹھا ہو گئے جو صرف تک بندی کر رہے تھے۔ گوپال متل اکتا کر کھڑے ہو گئے اور جانے لگے۔ گلزار صاحب انہیں روکتے ہوئے کہا متل صاحب آپ چل کہاں رہے ہیں؟ ابھی تو آپ کو اپنا کلام سنانا ہے۔ متل صاحب نے کہا کہ بھائی میں نے آج کی طرح میں صرف ایک شعر کہا ہے وہ سن لیجیے اور پھر یہ شعر سنایا ؎ تری بزم سے اٹھ کے جاتا ہوں لیکن ٭ پھر آؤں گا واپس برس دو برس میں

یہ شعر پڑھ کر متل صاحب لاکھ روکنے کے باوجود محفل سے چلے گئے۔ اسی انداز کا متل صاحب کا ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو: ایک مشاعرہ میں مانی جائسی مرحوم ایک طویل غزل پڑھ رہے تھے۔ زمین تھی: معصوم پہ رحم آتا ہے، معدوم پہ رحم آتا ہے، مخدوم پہ رحم آتا ہے وغیرہ۔ مانی مرحوم جب سولہ سترہ شعر پڑھ چکے تو متل صاحب نے مانی صاحب سے کہا حضرت میں نے آپ کی زمین میں فی البدیہہ ایک شعر کہا ہے اجازت ہو تو سنا دوں۔ مانی صاحب مہذب اور پرانی وضع کے انسان، کہنے لگے فرمائیے فرمائیے۔ گوپال متل صاحب نے کھڑے ہو کر شعر پڑھا۔ ؎

سننے والوں پہ تجھے رحم نہ آیا مانی ٭ تو تو کہتا تھا کہ مظلوم پہ رحم آتا ہے

جامع مسجد کے اردو بازار میں اردو کتابوں کی ایک دکان تھی جس کے مالک مولانا سمیع اللہ قاسمی تھے۔ دنیاوی اور دینی علوم کے ماہر، ادب نواز، اور خاص طور سے شعر و شاعری کے شوقین تھے۔ دکان تو برائے نام چلتی تھی۔ شام کو پانچ بجے ہی سے ان کی دکان پر شاعروں اور ادیبوں کا ہجوم لگ جاتا۔ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی جیسے بڑے شاعروں کو ہم نے پہلی بار اسی دکان پر دیکھا تھا۔ قاسمی صاحب اودھ کے رہنے والے تھے بڑے مہذب، نیک اور شریف۔ اردو بازار میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے مجاہد آزادی میر مشتاق صاحب رہتے تھے۔ میر صاحب رات کا کھانا کھا کر ٹہلنے نکلتے تو مولانا سمیع اللہ کی اس دکان پر کچھ دیر کے لیے آکر ضرور بیٹھتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کئی دن تک میر صاحب ٹہلنے تو آئے لیکن مولانا سمیع اللہ کی دکان پر نہیں ٹھہرے۔ ایک دن میر صاحب دکان کے آگے سے گزر رہے تھے، مولانا سمیع اللہ نے آواز دے کر ان کو بلا لیا اور کہا کہ کیا آپ ہم سے ناراض ہیں۔ اتنے دنوں سے آئے کیوں نہیں؟ میر صاحب نے غصے میں جواب دیا جی ہاں! میں آپ سے ناراض ہوں۔ آپ نے فلاں آدمی سے میرے خلاف یہ یہ کہا۔ مولانا سمیع اللہ نے کہا۔ میر صاحب ہم جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ہم نے ضرور کہا، آپ جانتے ہیں کہ ہم اودھ کے مہذب لوگ ہیں۔ اگر آپ کا برا [illegible] ہو گا تو [illegible] کے منہ پر کریں گے۔

اس پر میر صاحب ہنس پڑے اور بات ختم ہوگئی۔

مولانا سمیع اللہ کی دکان کا ایک لطیفہ اور سنیئے: ساغر نظامی صاحب نے "شکنتلا" کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا، جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ساغر صاحب مولانا سمیع اللہ کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فرقت کاکوروی اور دوسرے حضرات بھی تشریف رکھتے تھے۔ ساغر صاحب نے کہا کہ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک طویل نظم لکھی ہے۔ اس کا عنوان ابھی تک طے نہیں کر پایا ہوں۔ فرقت کاکوروی صاحب نے برجستہ کہا: "اماں اس کا عنوان "شکنتلا" رکھ دیجیے" ساغر صاحب نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا حضرت! اس کا شکنتلا سے کیا تعلق؟ فرقت صاحب نے بڑی برجستگی سے جواب دیا۔ اماں وہ جو آپ کی شکنتلا شائع ہوئی تھی، اس کا شکنتلا سے کیا تعلق ہے۔ چوں کہ یہ ایک محض مذاق تھا اس لیے ساغر صاحب اور دوسرے حاضرین ہنس پڑے۔

فرقت صاحب کا ایک لطیفہ اور سنیئے۔ ایک شاعر دلچسپی پیدا کرنے کے لیے بات کو ذرا مبالغہ آرائی سے پیش کرتے تھے۔ ایک دن پہلے وہ پاکستان کے دورے سے واپس آئے تھے اور وہاں کے قصے ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے، ان شاعر صاحب نے کہا کہ بھائی پاکستان میں صدر ایوب خاں نے روک لیا تھا۔ آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ سرکاری کام کاج چھوڑ کر سارے سارے دن میرا کلام سنتے رہتے تھے۔ بہت دیر تک وہ صاحب جب اسی طرح کی باتیں کرتے رہے تو فرقت صاحب سے رہا نہیں گیا، کہنے لگے جی ہاں! بڑے شریف آدمی ہیں ایوب خاں صاحب یہیں میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ان صاحب نے جھلا کر کہا وہ تو پشاور کے رہنے والے ہیں۔ ان کا میرٹھ سے کیا تعلق۔ فرقت صاحب نے انتہائی انکساری کے ساتھ جواب دیا۔ حضرت میں نے آپ کے سو جھوٹ برداشت کیے۔ آپ میرا ایک جھوٹ برداشت نہیں کر سکے۔

استاد رفیق رسا دہلوی اپنے انداز کے عجیب و غریب شاعر تھے۔ مرحوم کے بے شمار قصے اور لطیفے مشہور ہیں۔ کچھ گفتنی اور بے شمار ناگفتنی۔ شاگردوں کو غزلیں کہہ کر دیتے تھے اور مناسب معاوضہ وصول کرتے تھے۔ عام طور سے ان کے شاگرد کم پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ایک مشاعرے میں ان کے ایک شاگرد غزل پڑھ رہے تھے، شاگرد نے مصرع پڑھنا شروع کیا۔ "اللہ رے تیری چون" استاد مائک کے پاس ہی بیٹھے تھے! انہوں نے شاگرد کو ٹوکا۔ بیٹے ٹھیک سے پڑھو۔ شاگرد کے ہاتھ میں کاغذ تھا، جس پر غزل لکھی ہوئی تھی۔ اس نے کاغذ کو غور سے پڑھ کر پھر مصرع اٹھایا "اللہ رے تیری چون" استاد نے پھر ٹوکا۔ تیسری بار بھی شاگرد نے مصرع اسی طرح پڑھا تو استاد کو غصہ آگیا۔ اس کی کمر پر زور سے بید رسید کرتے ہوئے چیخے "ابے یہ چوں چوں کیا کر رہا ہے' چتون پڑھ چتون۔

ایک بہت خوبصورت خاتون وزیر ایک مشاعرے کی صدارت کر رہی تھیں۔ اسٹیج پر بسمل سعیدی مرحوم تشریف رکھتے تھے۔ میں ڈاکٹر اسلم پرویز اور پروفیسر نثار احمد فاروقی ان کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ پتا نہیں ان خاتون کو کیا سوجھی کہ انھوں نے اکبرالہ آبادی کا ایک شعر اپنا کہہ کر سنا دیا۔ بسمل صاحب نے اس شعر کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیئے۔ جھوم جھوم کر کہتے رہے۔ بیگم صاحب آپ نے کیا شعر کہا ہے۔ سبحان اللہ، مرحبا۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے سب شاعر حیرت سے بسمل صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا اور ہم لوگ باہر آئے تو اسلم پرویز نے کہا بسمل صاحب ٹھہریئے ٹھہریئے۔ بسمل صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا! آپ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ وہ شعر اکبرالہ آبادی کا تھا۔

ذرا سوچیے ایسی خوب صورت خاتون یہ کہے کہ رامائن میں نے لکھی ہے تو کیا میں تردید کر سکتا ہوں۔

ہری چند اختر اردو کے ممتاز اور مشہور شاعر تھے۔ مجاز لکھنوی کی طرح غضب کے حاضر جواب اور لطیفہ گو تھے۔ ایک مشاعرے میں وہ اپنی غزل سنا رہے تھے۔ خلاف معمول سامعین خاموش تھے۔ کہیں سے داد دینے کی آواز نہیں آ رہی تھی، چوتھے پانچویں شعر پر کسی سامع نے زور دار آواز میں سبحان اللہ کہا۔ پورے ہال میں یہ تنہا آواز تھی۔ ہری چند اختر صاحب رک گئے۔ چشمہ ناک کے آگے بڑھایا اور تھوڑی سی گردن جھکا کر داد دینے والے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ الحمد للہ!۔ انہی ہری چند اختر کا ایک لطیفہ اور سنیئے : اختر صاحب کے گھر کا نمبر تھا ۸۳۴۰۔ ایک دن انھوں نے اپنا پتا لکھ کر ایک صاحب کو دیا۔ ان صاحب نے کہا کہ یہ ۸۳۴۰ کیا ہے۔ اختر صاحب نے سوگھا سا منہ بنا کر کہا کہ بھائی حکومت نے شاعروں پر نمبر ڈال دیے ہیں۔ یہ میرا شاعر نمبر ہے۔

ایک دفعہ دہلی کے ایک چائے خانے میں ادیبوں اور شاعروں کی محفل سجی ہوئی تھی۔ ایک ایسے شاعر کا ذکر آ گیا جو مدت سے غائب تھا۔ اس کا نام سن کر چائے خانے کے مالک نے کہا کہ صاحب ان پر ہمارے بہت پیسے قرض ہیں۔ کسی نے کہا کہ بھائی وہ ایک لڑکی کے عشق میں تباہ ہو گئے ہیں۔ مارے مارے پھرتے ہیں۔ میری زبان سے بے ساختہ ایک مصرع نکلا :

ایسا تو کم ہوا ہے محبت میں ہار کے

میں ابھی یہ مصرع دوہرانے بھی نہیں پایا تھا کہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے دوسرا مصرع کہہ دیا اور یہ شعر اس طرح ہو گیا ؎

ایسا تو کم ہوا ہے محبت میں ہار کے!!
عشاق نے چکائے نہیں پیسے ادھار کے

۸۷

جی۔ ڈی۔ احمد (جمشید پور)

مُشاعِرہ ختم ہو گیا؟

جدید لب و لہجہ کے استاد شاعر شائق صاحب ذاکر نگر کے اولڈ پرولیا روڈ پر رہتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کے یہاں مشاعرہ کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی طرحی مشاعرہ بھی سرزد ہو جایا کرتا ہے۔ جب کہ اس مہنگائی کے دور میں لوگ ادبی نشست کے اہتمام کی سوچتے ہیں تو گھبرا جاتے ہیں۔ لیکن شائق صاحب کے یہاں اللہ کے فضل و کرم سے والنٹیرس کی کمی نہیں ہے۔ لہٰذا بہرصورت مشاعرہ سڑک کے کنارے سجا ہی دیا جاتا ہے۔ اور سارے شہر کے شعراء کو دعوت سے سرفراز فرمایا جاتا ہے۔ شائق صاحب فطرتاً سنجیدہ مزاج، نیک نفس اور نہایت مخلص انسان ہیں۔ اس لیے اُن کی اِس "دعوت" کو نظر انداز کر دینا یا اس سے بے توجہی کرنا قطعی ممکن نہیں۔ یا یوں کہیئے کہ اُن کا "مقناطیسی خلوص" شہر کے تمام شاعروں کو اپنی طرف کھینچ لاتا ہے۔

آج بھی اُن کے یہاں مشاعرہ تھا۔ اور میں نے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے گھر چھوڑ دیا۔ غزل بڑی دھواں دھار بلکہ دھار دار میں نے کہہ رکھی تھی جس کی چبھن مجھے بے چین کر رہی تھی۔ لہٰذا مشاعرہ گاہ تک پہنچنے کی لاشعوری طور پر جلد بازی تھی۔ ذاکر نگر اولڈ پرولیا روڈ پہنچنے کے لیے آزاد نگر سے گزرنا پڑتا ہے اور ایک راستہ مانگو سے ہے لیکن وہ اِتنا زخم خوردہ اور خستہ حال ہے کہ اُس پر چلنا جہنم رسید ہونے کے مترادف ہے بڑے بڑے گڑھوں اور بڑے بڑے ٹیلوں کا ایسا خوبصورت امتزاج شاید ہی ہندوستان میں کہیں دیکھنے کو ملے۔

بہر حال اس راستہ کی خوفناکی کے پیشِ نظر میں نے آزاد نگر سے گزرنا گوارا کر لیا۔ یہ آزاد نگر جسے آزاد بستی بھی کہتے ہیں۔ واقعی آزاد طبیعت کے مالک لوگوں کی بستی ہے جس طرح اِس "آزاد" ہندوستان میں آزادی کے بعد ہر بُرے کردار کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ اُسی طرح اس بستی میں بسنے رہنے والے ہر من مانی کے لیے مکمل طور پر آزاد ہیں۔

جب میری کار روڈ نمبر ۲ کی طرف مڑی تو مجھے اچانک بریک لگانا پڑا۔ آزاد نگر میں یوں تو داخلہ کے لیے تین سڑکیں سلسلہ دار روڈ نمبر ۱، نمبر ۲ اور نمبر ۳ ہیں۔ لیکن مین روڈ۔ روڈ نمبر ۲ ہی ہے۔ ۹۰ فی صد لوگ اِسی سڑک کو آمد و رفت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا میں بھی لاشعوری طور پر روڈ نمبر ۲ تک آ گیا اور میری گاڑی اندر بستی کی طرف مُڑی تو مجھے بریک لگانا پڑا۔ ایک پان کی دکان پر آتنی بھیڑ تھی کہ آدھی سڑک بلاک ہو رہی تھی۔ اور سڑک کی دوسری طرف چار پانچ اشخاص اس طرح کھڑے خوش گپیوں میں پان کے شغل کے ساتھ مصروف تھے کہ انہیں خبر ہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ کوئی گاڑی اس

بنگلہ سے گزرنا چاہتی ہے جہاں وہ بھینسوں کی طرح کھڑے جگالی کر رہے ہیں۔ میں نے ہارن پہ ہارن بجانے کی مشق کر ڈالی مگر اس ہارن کا کسی پر جیسے اثر ہی نہ ہوا۔ خیر کسی طرح وقت کی بربادی کو برداشت کیے رومال میں لپیٹ کر میں آگے بڑھا۔ آگے کہیں کچھ بدتہذیب لڑکے سائیکلیں آڑی ترچھی اَڑائے سڑک پر اس طرح کھڑے نظر آئے جیسے گاندھی میدان کے وسیع احاطے میں خوش فعلیاں یا تفریح کر رہے ہوں۔ اور کہیں لوگ سڑک پر بیچ و بیچ اس طرح چلتے نظر آئے بلکہ رینگتے نظر آئے گویا "جوبلی پارک" میں چہل قدمی کر رہے ہوں اور بڑی خصوصیت یہ کہ کسی پر ہارن کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

مشاعرہ کا مقررہ آدھا گھنٹہ روڈ نمبر ۲ کراس کرنے میں خون ہو گیا۔۔ آگے بڑھا۔ روڈ نمبر ۷ کافی بڑی جان کر، کیوں کہ اس سڑک پر تین چکیوں کا راج چلتا ہے! انہیں کا آنا اور انہیں کا جانا اس سڑک پر روا ہے۔ یہ تین چکیئے کے چالک بھی بھینس کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں پسنجر پر نظر پڑی فوراً بریک لگا دیئے آگے دیکھا نہ پیچھے۔ داہنے دیکھا نہ بائیں اور یہ بھی نہ دیکھا کہ گاڑی سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہے۔ موڑنا ہو تو ہاتھ دکھانا نہ پیر، نہ کوئی اشارہ نہ کوئی کنایہ۔ تین چکیہ دھڑ سے مڑ گئی۔ آپ کا بریک اگر اچھا ہے تو خیر ورنہ ایکسیڈنٹ لازمی! میں نے قصداً بلکہ احتیاطاً روڈ نمبر ۷ کو خدا حافظ کہا اور روڈ نمبر ۸ کی طرف گاڑی بڑھا دی۔ گاڑی کی رفتار ذرا تیز کر دی۔ ایک موڑ آیا۔ میں نے بے دھیانی میں ہلکا سا بریک لیتے ہوئے گاڑی کو موڑ دیا اور اچانک میری گاڑی اسی طرح ایک فٹ اوپر اچھل گئی جیسے چھاننے کو دیکھ کر بھینس بدک جایا کرتی ہے۔ بات بعد میں سمجھ میں آئی کہ ایک بڑا سا بے تکا سا انگنی رود ھک "سڑک پر اونٹ کی طرح گردن اٹھائے براجمان ہے۔ گاڑی اچھلی تو چند راہ گیر تماشائیوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگوں کی "تبسی" بھی دکھائی پڑ رہی تھی۔ میں نے ایک سے ڈپٹ کر پوچھا "ایسا جان لیوا ہمپ کیوں بنوایا گیا ہے؟ جواب ملا" بچے سڑک پر کھیلتے ہیں نا اسی لیے ورنہ بچوں کی جان کے لالے پڑ جائیں" میں نے دل ہی دل میں اپنا سر پیٹ لیا کیوں کہ سر پیٹنے اور قوم کی بے چارگی پر ماتم کرنے کا وقت نہیں تھا۔

خیر اس "حادثہ ورد ھک" سے آگے بڑھا تو سڑک پر جا بجا گائے اور بھینس بیٹھی بھی نظر آئیں۔ میں گاڑی بھینسوں اور گایوں کے درمیان سے بہ وقت تمام نکالنے لگا لیکن خدا کی مار، لعنت میری قسمت پر، ایک ایسی اڑیل بھینس سڑک کو کور کیئے نظر آئی جو نہ گاڑی کی لائٹ سے متاثر نظر آتی تھی اور نہ ہارن کی آواز سے محظوظ۔ بھینس نما انسان میں آگے چھوڑ آیا تھا اور یہ بے چاری تو original بھینس ٹھہری۔ میں نے گاڑی روک کر ادھر ادھر بے چارگی کے عالم میں رحم طلب نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا کہ کوئی مسیح وقت مجھے اس پریشانی سے نجات دلائے مگر ....

کوئی امید بر نہیں آتی ؎ کوئی صورت نظر نہیں آتی

میں نو نمبر کی طرف بھاگا یہ کہتے ہوئے کہ میاں احمر یہی حال رہا تو پڑ چکے آج مشاعرہ روڈ نمبر ۹ اچھی سڑک ہے چوڑی ہے، صاف ستھری ہے۔ یہ میرے تصور میں خاکہ ابھرا۔ میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی کیوں کہ مشاعرہ کا ایک گھنٹہ وقت نکل چکا تھا۔ میں نے جیسے ہی روڈ نمبر ۹ میں گاڑی موڑی تو مجھے اچانک بریک لگانے پڑے دیکھتا کیا ہوں کہ سڑک کے بیچ و بیچ "ہائی لوجی" کی، دشنی پھیلی ہوئی ہے اور کرکٹ کا ٹورنامنٹ زور و شور سے جاری ہے۔ میں نے سوچا مسلمان کے بچے صرف پیدا گھر میں ہوتے ہیں ورنہ پرورش و پرداخت، کھیل تماشا اور دیگر امور کی ادائیگی سڑکوں پہ ہی ہوا کرتی ہے "کسی طرح کرکٹ اور مرط منتھی" [illegible]

پار کرتے ہوئے سوچا چلو اب آگے راستہ کلیئر ہی ملے گا۔

گاڑی چلتی رہی۔ آگے ایک جگہ پھر مجھے گاڑی روکنی پڑی۔ سڑک باقاعدہ طور پر دو طرفہ بند نظر آئی معلوم یہ ہوا کہ ایک صاحب کا مکان بن رہا ہے اور سڑک پر مزدور مسالہ بنانے میں مصروف ہیں "را میٹیریل" بالو، گٹی اور اینٹ کی شکلوں میں ڈھیر لگے نظر آرہے ہیں۔ بیچارگی کے عالم میں گردن ہلاتے ہوئے میں نے وہاں سے بھی گاڑی موڑ لی۔ اب میں نے ایک کراس روڈ کے سہارے نکلنا چاہا مگر واہ رے مقدر کی ستم ظریفی ۔! یہ روڈ بھی بند نظر آیا۔ قنات اور شامیانے سے ہی پتہ چل گیا کہ آگے شادی کی تقریبات چل رہی ہیں۔ اور سڑک ایک بالشت بھی رحم کے لائق نہیں سمجھی گئی۔ خیر میری تو کار ہے۔ گزر ممکن نہیں لیکن لوگ اتنے بد دماغ اور ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں کہ سڑک پر پیدل گزرنے تک کی جگہ نہیں چھوڑتے اور پوری سڑک اُن کے آباء و اجداد کی میراث بن جاتی ہے۔ میں وہاں سے بھی گاڑی موڑ چکا تھا اور اب مشاعرہ میں جلدی پہنچنے کی "لالسا" ماند پڑ گئی تھی۔ رفتار خود بخود دھیمی ہوگئی تھی مشاعرہ پڑھنے کا شوق مدھم پڑ گیا تھا۔ ذہن عوامی سطح پر بے شمار خرابیوں کے درمیان ہچکولے کھا رہا تھا۔ کسی طرح گاڑی شائق صاحب کے دولت کدے تک پہنچی تو معلوم یہ ہوا کہ "مشاعرہ ختم ہو گیا"۔

△▼

تپ دق (ٹی بی)
کے بارے میں معلومات

آج موجودہ حالات میں

- تپ دق کا علاج پوری طرح ممکن ہے
- حکومت تپ دق کا علاج مفت فراہم کرتی ہے۔
- تپ دق کی نئی دوائیں زیادہ موثر ہیں، جلد اثر کرتی ہیں اور ان سے علاج کی مدت بھی کم ہوگئی ہے۔

پھر بھی، ہندوستان میں

- تپ دق سے ہر منٹ پر ایک فرد ہلاک ہوتا ہے۔
- ایک کروڑ چالیس لاکھ افراد تپ دق میں مبتلا ہیں۔
- 35 لاکھ تپ دق کے مریضوں کے تھوک میں تپ دق کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ جس سے دوسرے لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔
- ایک مریض کے تھوک میں پائے جانے والے جراثیم سے ہر سال دس سے پندرہ افراد اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

تپِ دق کو پھیلنے سے روکئے

طبی امداد حاصل کیجیے

اگر

- تھوک میں خون آ رہا ہو
- تین ہفتے سے زیادہ بخار رہے یا بلغم آئے۔
- بھوک میں کمی کے ساتھ ساتھ وزن گھٹ رہا ہو

پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسٹرکٹ ٹی بی سینٹر یا نزدیکی
سرکاری صحت مرکز سے

رابطہ قائم کریں

davp 97/883

ڈاکٹر طیب انصاری
(گلبرگہ)

"مسیح انجم۔ ایک طرفہ تماشہ؟!"

مسیح انجم اپنی صورت ہی سے مزاح نگار لگتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی کی صورت دیکھ کر اس کے پیشہ یا فن کا اندازہ لگایا جا سکے۔ البتہ عام طور پر شاعروں کے بارے میں ایسا کہا جاتا ہے کہ شاعر اپنی صورت سے پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً خمار بارہ بنکوی کو دیکھتے ہی کہیں گے یہ شاعر ہیں لیکن جوش ملیح آبادی کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ حالانکہ جوش فراق اور خمار سے بڑے شاعر ہیں۔ جوش اپنی ہیئت اور جسامت کے لحاظ سے پہلوان ہو سکتے تھے شاعر ہرگز نہیں! میں تو کہتا ہوں جوش اگر شاعر نہ ہوتے تو یقیناً پہلوان ضرور ہوتے اور اس میدان میں بھی اتنے ہی نامی گرامی ہوتے جتنے وہ شاعری کے میدان میں تھے۔ اس طرح کا تضاد شخصیت اور فن میں بہت کم ہوتا ہے۔ مسیح انجم اس تضاد سے (بلکہ تضاد بیانی سے بھی) پاک ہیں۔ ظاہر ہے جس شخص کی شخصیت اور فن میں تضاد نہیں ہے تو اس کا فن تضادات کا شکار کیسے ہو سکتا ہے؟!

مصطفےٰ کمال نے "طرفہ تماشہ" کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے: "ان کی تحریروں کے رگ و پے میں شگفتگی اور ظرافت کا خون اچھلتا کودتا نظر آتا ہے"۔ میں کہتا ہوں شگفتگی اور ظرافت کا یہ خون تحریروں میں پہنچنے سے پہلے خود مسیح انجم کی رگ و پے میں اچھلتا رہا ہے۔ بھلا بتائیے اگر مسیح انجم کے رگ و پے میں خون نہ ہوگا تو وہ ان کی تحریروں میں کہاں سے آئے گا۔ کیوں کہ مسیح انجم زندگی میں کبھی کوئی چیز کسی سے ادھار یا مستعار نہیں لیتے تو وہ بحیثیت مزاح نگار کیوں اور کہاں کسی سے ظرافت ادھار لینے چلے۔ یہ بات ان کی شرافت کے خلاف ہے۔ حالانکہ اردو غزل میں بہت اور مزاح نگاری میں کبھی کبھی اور بہت کم اس طرح کی "دوعملی" جائز اور روا رکھی گئی ہے! مسیح انجم نے مزاح نگاری میں اپنی انفرادیت کو باقی رکھا ہے۔ وہ اس فن کے ایک شیر ہیں جو دوسروں کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتے! — میری اس بات کی تصدیق آپ خود کریں گے اگر آپ ان کے مضامین کے مجموعے سائیڈ سے چلئے، ذریرہ، چنانچہ اور طرفہ تماشہ کا مطالعہ کریں گے۔ میرے پیش نظر صرف ان کا چوتھا مجموعہ مضامین "طرفہ تماشہ" ہے! —

سائیڈ سے چلئے پہلا اور طرفہ تماشہ (فی الحال) ان کا آخری مجموعہ مضامین ہے عمر کے ساتھ ساٹھ آدمی ہیں

سنجیدگی اور بُردباری کا آنا ضروری ہے ۔ ہر دو مجموعہ مضامین کے مطالعے سے آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ عمر کے لحاظ سے مسیح انجم کے ظاہر و باطن میں کچھ خوشگوار اور کچھ ناخوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں اِسی طرح کی تبدیلیاں یقیناً ان کے فن میں بھی راہ پا گئی ہیں ۔ جو بے راہ روی ان کی جوانی میں آپ کو نظر آتی تھی اب وہ ان کے بڑھاپے میں نظر نہیں آئے گی ۔ یہ بڑھاپا آپ کو مسیح انجم کے چہرہ مہرہ سے بھی اور ان کے فن سے نظر آئے گا ۔ ان کے بڑھاپے کی تصنیف طرفہ تماشہ کے پیش نظر ہی تو مصطفےٰ کمال نے لکھا ہے :

" وہ متشرع تبسم کا پاک و صاف مزاح لکھتے ہیں ۔"

مسیح انجم کا فنی شعور طرفہ تماشہ کو پہنچتے پہنچتے پختہ ہو گیا ہے ۔ ان کی نظر میں گہرائی آگئی ہے ۔ وہ مسائل کی تہہ تک دیکھ سکتے ہیں ۔ سماج میں آئے دن کی اچھی بری تبدیلیوں نے انھیں متاثر کیا ہے ۔ وہ صرف مزاح نگار نہیں ہیں وہ طنز نگار بھی ہیں ۔ کہیں کہیں طنز کا گھاؤ بڑا گہرا ہو جاتا ہے ۔ اس بات کا دار و مدار سماج میں پائے جانے والے ناسور سے ہے ۔ ناسور جتنا کہنہ اور گہرا ہوگا طنز کا نشتر بھی اتنا ہی تیز ہوگا ۔ ظاہر اس کی وجہ سے مریض کو زیادہ درد ہوگا ۔ مسیح انجم اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کے طنز سے کس کو کتنا درد ہوا ہے وہ تو مرض کے علاج سے دلچسپی رکھتے ہیں ۔ ان کے طنزیہ مضامین میں " دسواں سیارہ " اچھا مضمون ہے ۔ اس مضمون میں جہیز کے لینے والے دولہے پر طنز کیا گیا ہے اور اس کو مسیح انجم نے جہیز یار جنگ کے نام سے یاد کیا ہے ۔

مسیح انجم اپنے قارئین کے لیے مزاح کے سامان بھی خوب فراہم کرتے ہیں ۔ بقول کے این واصف (ریاض) آج کے دور میں خوش مزاجی بذلہ سنجی اور مزاح کو لوازمہ حیات سمجھا جاتا ہے ۔ وقت کی رفتار سے ہم قدم رہنے، مسابقت کی دوڑ میں اوروں کے شانہ بہ شانہ چلنے کے لیے آج کا انسان جس جاں فشانی سے کام لیتا ہے اور جو ذہنی بوجھ برداشت کرتا ہے اس کو زائل کرنے کا یہ سب سے اچھا ذریعہ ہے ۔" (ماہنامہ شگوفہ مئی ۱۹۹۷ ص ۱۴) اس سلسلہ میں مسیح انجم کی مزاح نگاری اہم مقام پا جاتی ہے ۔ اردو کے جدید اور ہم عصر مزاح نگاروں میں ہم مسیح انجم کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ ان کے مضامین میں ہلکا گہرا طنز بھی موجود ہے اور مزاح بھی ۔ مزاح کے سلسلہ میں مجھے " املی کی مدح میں " اچھا مضمون لگا ۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں :

" املی مونث ہے اس کا مذکر نہیں ۔ یہی بات جب ہم نے ایک " کٹھ حجتی " قسم کے ریسرچ اسکالر سے کہی تو فرمایا " آپ قواعد اردو میں خاصے کمزور معلوم ہوتے ہیں ۔ آپ کو یہ تک نہیں معلوم کہ اِملی کا مذکر املا ہے اور یہ لفظ ارضِ دکن سے نکلا ۔"

مسیح انجم نے اِملی کا مذکر املا بنا کر مزاح تو پیدا کر دیا لیکن ساتھ ہی ہماری اردو تحقیق پر طنز بھی کیا ہے ۔

طرفہ تماشہ میں اس طرح کے طنزیہ و مزاحیہ جملے وافر تعداد میں موجود ہیں ۔ اور مختلف عنوانات کے تحت ہیں ۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ " طرفہ تماشہ " نے خود مسیح انجم کو ایک طرفہ تماشہ بنا دیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ دنیا مسیح انجم کی آنکھ سے اگر دیکھیں تو ایک طرفہ تماشہ ضرور نظر آتی ہے ۔ اور اس طرفہ تماشہ سے ہم مسرت بھی حاصل کرتے ہیں اور عبرت بھی ! ۔ یہی مسرت اور عبرت ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا [illegible] ہے !

مبصر: ڈاکٹر محبوب راہی

تبصرہ: (شخص) اک شاعر
صفحات: ایک سو اکتیس قیمت چالیس روپے
ملنے کا پتہ: ناولٹی ہاؤس محمد علی روڈ۔ آکولہ (مہاراشٹر)

کسی شاعر یا ادیب کے منتشر شیرازہ روز و شب کو یکجا کرنے اس کی شخصیت کی ٹوٹی کڑیوں کو ایک زنجیر میں مربوط کرنے اور اس کے تخلیق پاروں کے بکھرے اوراق سمیٹ کر ایک کتاب کی شکل میں مرتب و مدون کرنے کا چلن اردو میں عام ہے۔ یہ محنت طلب کام ایک خاص مقصد کے حصول کی غرض سے انجام دیا جاتا ہے۔ ایک معینہ مدت کے بعد جس کی تکمیل کی اُجرت یا صلۂ محنت ایم فل یا پی ایچ ڈی کی ارفع ترین ڈگری کی شکل میں مل جاتا ہے ایسی کسی غرض و غایت کے نہ ہوتے اگر کوئی صاحبِ قلم اپنے کسی ہم عصر فنکار کی زندگی، شخصیت اور فن کو ایک کتاب میں محفوظ کر دیتا ہے تو اسے اس کے لیے انتہائی خلوص پر مبنی ایک عملِ خیر سے تعبیر کیا جائے گا اور یہ عملِ خیر برار کے ایک باصلاحیت شاعر و ادیب فصیح اللہ نقیب نے معروف اور ممتاز شاعر غنی اعجاز کی زندگی، شخصیت اور فن پر کتاب تصنیف کر کے انجام دیا ہے علاقۂ برار کبھی بھی دور میں اردو کے باصلاحیت فنکاروں کے وجود سے خالی نہیں رہا۔ اس کے باوجود بہت کم نام ایسے ملتے ہیں جو شعر و ادب کی تاریخ میں اپنے لیے کوئی جگہ بنا پائے ہیں۔ اسے مصنف نے "سخنِ نقیبی" کے تحت "سازِ استغنا" سے تعبیر کیا ہے جو کسی حد تک قابلِ قبول ہے لیکن اس کی بنیادی وجہ ہے ہمارا اپنے فنکاروں کے ساتھ بے نیازی۔ تغافل اور ناقدری کا سفاکانہ رویہ۔ ہمیں کبھی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ جی کھول کر ان کے کارناموں کو سامنے لاتے [illegible] مصنف کا کوئی

مرتبے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایسے حوصلہ شکن حالات میں نقیب کے روشِ عام سے ہٹ کر ایک صحت مند روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس کی بجا طور پر تحسین و ستائش ہونی چاہیئے۔

شاعری اگر اوپر سے اوڑھی ہوئی نہ ہو تو وہ شاعر کے وجود کا سر بسر اظہار اور اس کی زندگی کا مکمل آئینہ خانہ ہوتی ہے۔ اس کی شاعری میں زندگی اور زندگی میں اس کے شعروں کی جھلک صاف دکھائی دیتا ہے، نقیب نے غنی اعجاز کی زندگی کے روزِ اول سے لمحہ موجود تک تمام بکھرے ہوئے نقوش یکجا کر کے نہایت سلیقے سے ایک نگار خانہ سجا دیا ہے۔ اور اس پر "اک شخص اک شاعر غنی اعجاز" کی تختی آویزاں کر دی ہے۔

واقعات کے تسلسل۔ اندازِ بیان کی دلکشی و شگفتگی اظہار کی بے ساختگی اور زبان کی لطافت۔ شائستگی اور شستگی کے ساتھ غیر جانبداری کی شعوری کوشش کے باوجود غنی اعجاز کے تئیں والہانہ ذہنی وابستگی اور پُرخلوص جذباتیت نے تاثر آفرینی اور تاثر انگیزی کو دوچند کر دیا ہے۔

بہ اعتبار مجموعی یہ کتاب غنی اعجاز کو بیک وقت ایک سعادت مند بیٹے۔ ایک اچھے شوہر۔ ایک شفیق باپ۔ ایک مخلص دوست۔ ایک کامیاب انسان اور ایک عہد ساز شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ □□

نمائش سوسائٹی، کُل ہند صنعتی نمائش

مکرم جاہی روڈ، نمائش میدان حیدرآباد ـــــ ۱

یکم جنوری تا ۱۵ فروری

ہندوستان کی ہمہ مقصدی عظیم نمائش اور جنوبی ہند کی سب سے بڑی فروخت کنندہ دکانیں
جہاں ۴۶ دن میں زائد از ۲۵ لاکھ افراد آتے اور ۱۵ کروڑ کی خرید و فروخت ہوتی ہے ۔
ایک غیر منافع بخش ادارہ جو اپنی آمدنی تعلیم اور خاص طور سے خواتین پر خرچ کرتا ہے اور حسبِ ذیل اداروں کو مالی امداد فراہم کرتا ہے ۔

۱. کملا نہرو پالی ٹکنک فار ویمن، حیدرآباد.
۲. سروجنی نائیڈو ونیتا مہا ودیالیہ حیدرآباد.
۳. سردار پٹیل کالج، سکندرآباد.
۴. لال بہادر کالج ورنگل، ضلع ورنگل.
۵. شری لکشمی نرسمہا سوامی کالج، بھونگیر. ضلع نلگنڈہ
۶. شری وینکٹیشور کالج، سوریہ پیٹ، ضلع نلگنڈہ
۷. کستوربا گاندھی ڈگری کالج فار ویمن، سکندرآباد
۸. کستوربا گاندھی جونیر کالج فار ویمن سکندرآباد.
۹. سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس. سکندرآباد.
۱۰. وسویشوریا انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر. سکندرآباد
۱۱. راجیو گاندھی انڈسٹریل، ٹریننگ سنٹر. نرل. ضلع نلگنڈہ
۱۲. روی نارائن ریڈی انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر. ہالیہ، ضلع نلگنڈہ
۱۳. شنکرجی میموریل گرلز ہائی اسکول، حیدرآباد
۱۴. یل. ین گپتا میموریل ڈسپنسری نمائش گراؤنڈ، حیدرآباد
۱۵. سری رام لنگوایشور ڈگری کالج، ملکچرلہ رنگاریڈی ڈسٹرکٹ.

صنعتوں، بزنس، مارکٹنگ، ٹریڈ اور پبلسٹی کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتی ہے
کُل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد ریاست کے عوام کے لیے ایک سالانہ فیچر اور نئے سال کا تحفہ ہے۔

اشفاق حیدر
اعزازی سیکریٹری

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۱ شمارہ ۴

اپریل ۱۹۹۸ء

قیمت فی پرچہ ۱۵ روپے

زر سالانہ: ۱۳۰ روپے

بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

۱۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱

فون (آفس) 595716

فون (رہائش) 4576064

"آئندہ نسلیں مشکل ہی سے
یقین کریں گی کہ
گوشت پوست سے بنا کوئی
ایسا آدمی بھی کبھی اِس
سرزمین سے گذرا تھا....."

— البرٹ آئنسٹائن

باپو کی یاد میں
ان کے یومِ شہادت پر۔ 30 جنوری

davp 97/663

اس تھیلی کے چٹے بٹے

"نجومی"

دلاور فگار

آپ کا طالع بیدار بہت اونچا ہے
آج کل آپ پہ مریخ چڑھا بیٹھا ہے
برج عقرب میں عطارد سے زحل ملتا ہے
ان ستاروں سے ترقی کا پتہ چلتا ہے

میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ کمزور زیادہ ہیں توقع کے خلاف
مجھ کو خطرہ ہے کرنٹ آپ کا ہوجائے گا آف
بات میں صاف کئے دیتا ہوں تقصیر معاف
آپ کی جنس بدل جانے کا اندیشہ ہے

میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ کے واسطے موزوں ہیں کرپ سول کے بوٹ
جون میں پہنا کریں سرج و گبرڈین کا سوٹ
نام میں جنکے ہو." ر " کھایا کریں ایسے فروٹ
جیسے امرود ہے تربوز ہے ۔ خربوزا ہے

میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

مونگ کی دال نہ کھائیں وہ سڑی ہوکہ گلی
دودھ پینے سے بھی گھٹ جائے گا خون ایک پلی
آپ کو فائدہ پہنچائے گی بس مونگ پھلی
ایک جوگی کا بتایا ہوا یہ نسخا ہے

میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ کو ہے کسی معشوق غرض مند سے عشق
اس کے فرزند سے ، فرزند کے فرزند سے عشق
اس کی شلوار سے ، جمپر سے کمر بند سے عشق
آپ کے عشق کا معیار بہت اونچا ہے

میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ حج کے لئے امسال عرب جائیں گے
واپس اس ارض مقدس ۔ جب آپ آئیں گے
اپنی رومالی میں کچھ گولڈ چھپا لائیں گے
بمبئی آکے پکڑ جانے کا اندیشہ ہے

میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

شاعری چھوڑ کے اب ماہری فرمائیں آپ
کسی استاد سے لکھوا کے غزل گائیں آپ
وہ کرے فکر سخن داد سخن پائیں آپ
یہی ہوتا ہے یہی ہوتا چلا آیا ہے

میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ تو گیت بھی لکھ لیتے ہیں رنگین و جمیل
آپ اگر فلم میں جانے کی کریں کوئی سبیل
فلک فلم پہ یوں چمکیں گے جس طرح شکیل
کار چڑھنے کو ہے رہنے کے لئے بنگلا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

کچھ بزرگان وطن آپ کو دیتے یہ صلاح
اک ریٹائرڈ طوائف سے آپ کریں نکاح
کہیں ان باتوں سے ہوتی ہے وطن کی اصلاح
" دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے "
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ کی ماہ محرم میں سگائی ہوگی
ایک اچھائی کے ساتھ اک برائی ہوگی
وصل کی رات رقیبوں سے لڑائی ہوگی
شب وعدہ جسے سمجھے ہو شب گھپلا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ کے ایک شناسا کا ترنم ہے کرخت
اس سے کہئے کہ وہ شاعر ہے نہایت بدبخت
بیٹھے جس تخت صدارت پہ الٹ جائے وہ تخت
اس کی تقدیر میں کرسی بھی نہیں مونڈھا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

اک خزانہ جو ہے موجود قریب کشمیر
آپ کو مل کے رہے گا یہ ہے حکم فقیر
آپ کا نام ہے اس گنج نہاں پر تحریر
بلکہ قاروں کے خزانہ میں بھی کچھ حصا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

قید شادی سے ابھی آپ ہیں کچھ دن آزاد
لیکن اب جلد بر آئے گی عزیزوں کی مراد
ایک ہی سال میں ہوجائے گی کافی اولاد
پہلے دس لڑکیاں ہیں بعد میں اک لڑکا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

آپ کی موت زمانہ پہ گراں سی ہوگی
نہ بخار آپ کو آئے گا نہ کھانسی ہوگی
آپ کو عشق کے الزام میں پھانسی ہوگی
آپ مرجائیں گے اک روز مرا دعویٰ ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

غیب کا حال بتاتا ہے مرا علم نجوم
علم سچا ہے کہ جھوٹا یہ مجھے کیا معلوم
اصل میں قادر مطلق ہے وہ حی و قیوم
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے
میں نجومی ہوں مرا علم یہی کہتا ہے

مُجتبیٰ حسین

دیش کِدھر جا رہا ہے

ایک بہت پُرانے دوست کل راستہ میں اچانک مل گئے۔ پہلے تو رسمی باتیں ہوئیں پھر انھوں نے ہم سے پوچھا "یار! ذرا یہ تو بتاؤ کہ ہمارا دیش کدھر جارہا ہے؟" بجائے اس کے کہ ان کے اس آسان سے سوال کا جواب دے دیتے الٹا ہم نے ان سے پوچھ لیا "پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کدھر جارہے ہو؟"

(ہمارے اس سوال پر ہمیں اس آدمی کی یاد آگئی جس کے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کٹی ہوئی تھیں کسی نے اس سے انگلیوں کے کٹ جانے کا سبب پوچھا تو بولا "ایک بار میں نے اپنے گھوڑے کے دانتوں کی تعداد کو جاننے کی خاطر اس کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈالا تھا۔ ابھی میں دانتوں کو گن ہی رہا تھا کہ اچانک گھوڑے کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ بھی میری انگلیوں کو گن لے۔ لہٰذا اس نے اپنا منہ اچانک بند کردیا اور میری انگلیاں اس کے منہ میں رہ گئیں)۔

بہرحال ہمارے اس غیر متوقع سوال پر ہمارے دوست سٹپٹا گئے۔ کچھ سوچا پھر بولے "بات دراصل یہ ہے کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پھر ان دنوں بچوں کے امتحانات بھی چل رہے ہیں سوچا کہ گھر میں نہیں رہوں گا تو بچوں کو شاید میرے کمرے میں پڑھنے کی سہولت مل جائے اسی خیال سے گھر سے نکلا ہوں سوچتا ہوں کچھ دیر کافی ہاؤس میں گزاروں پھر کسی لائبریری میں جاکر بیٹھ جاؤں گا مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کدھر جارہے ہو؟" ہم نے کہا "میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے گھر سے تو باہر نکل آیا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کدھر جاؤں۔ تمہاری طرح شاید کافی ہاؤس چلا جاؤں ورنہ ہوسکتا ہے یہیں کھڑے کھڑے بازار کی رونق کو دیکھتا رہ جاؤں۔ یوں سمجھو کہ میں کہیں جانے کے خیال سے گھر سے باہر نہیں نکلا ہوں بلکہ کہیں نہ جانے کے ارادہ سے باہر نکل آیا ہوں۔ ہمارے دوست امیر قزلباش کا شعر ہے۔

تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو　　کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

نہ تو مجھے اپنے بارے میں پتہ ہے کہ کدھر جانا ہے اور نہ ہی تم جانتے ہو کہ تمہیں کدھر جانا ہے۔ ایسے میں تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ بتاؤ دیش کدھر جارہا ہے۔ جب ہمیں ہی یہ پتہ نہیں کہ ہم کدھر جارہے ہیں تو یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ دیش کدھر جارہا ہے۔ جا بھی رہا ہے یا نہیں یا اپنی جگہ چپ چاپ کھڑا ہوگیا ہے۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ دیش بھی کافی ہاؤس جانے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔" ہمارے اس جواب سے ہمارے دوست کچھ مطمئن سے ہوگئے پھر بولے "ایسی بات ہے تو چلو ہم بھی

کافی ہاؤس چلتے ہیں۔" اس کے بعد ہم دونوں نے بڑی دیر تک کافی ہاؤس میں خاصا وقت گزارا۔ رخصت ہوتے وقت
نہ تو ہمارے دوست نے پوچھا کہ ہم اس کے بعد کہاں جا رہے ہیں اور نہ ہی ہم نے ان سے پوچھا کہ وہ اس کے بعد کہاں
جا رہے ہیں؟ کیوں کہ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کون کدھر کو جا رہا ہے۔ یہی حال اپنے دیش کا ہے، بیس پچیس برس پہلے
تک تو ہمیں پتہ تھا کہ ہمارا دیش کہیں نہ کہیں جا رہا ہے۔ ہمارے رہنما اسے جدھر لے جانا چاہتے تھے وہ چلا جاتا تھا۔ اب
رہنماؤں کو خود پتہ نہیں کہ وہ خود کدھر جا رہے ہیں اور دیش کدھر جا رہا ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ دیش کہیں بھی نہیں جا رہا ہے
دنیا کے نقشہ میں تو وہ وہیں موجود ہے۔ پھر جب سے اس ملک میں "لٹکتی پارلیمنٹیں" HUNG PARLIAMENTS
بننے لگی ہیں تب سے تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ پہلے تو پارلیمنٹ انگریزی میں "ہنگ" بنتی ہے پھر بعد میں ہندی میں
"بھنگ" ہو جاتی ہے اور یوں ہماری جمہوریت "ہنگ" اور "بھنگ" کے بیچ لٹکنے لگی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہم
ہندوستانیوں کی زندگی خود ایک عرصہ سے معلق چلی آ رہی ہے۔ ہم شخصی طور پر ہمیں تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔
کیوں کہ ہمارا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور متوسط طبقہ وہ طبقہ ہوتا ہے جو امیر اور غریب طبقات کے درمیان پنڈولم
کی مانند لٹکتا رہتا ہے کبھی امیر طبقہ کی طرف جاتا ہے اور کبھی غریب طبقہ اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور یونہی لٹکتے
لٹکتے یہ طبقہ اس جہان فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ ہمیں تو خیر اب لٹکنے کی اچھی خاصی پریکٹس ہو چکی ہے جو آدمی پچھلی چھ
دہائیوں سے لٹکتا چلا آ رہا ہو اس کے لٹکنے کی مہارت کے بارے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ یوں بھی زندگی کی ستر سال میں
ہم نے لٹکنے کے سوائے کوئی اور کام نہیں کیا ہے۔ اب اگر اس ملک میں لٹکنے والی پارلیمنٹیں بننے لگی ہیں تو اس میں اتنا
پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے ایک بزرگ دوست ہیں جن کی جائیداد کا مقدمہ پچھلے پچاس برسوں سے عدالت
میں لٹکا ہوا ہے جب انہوں نے یہ مقدمہ لڑنا شروع کیا تھا تو ماشاء اللہ اس وقت ان کی عمر بیس برس تھی۔ اب ستر برس
کے ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں انھوں نے نہ صرف شادی کی بلکہ چھ بچے بھی اس امید میں پیدا کیے کہ شاید مقدمہ کا فیصلہ ان
کے حق میں ہو جائے۔ یہی نہیں بعد میں انھوں نے اس مقدمہ کی آس میں اپنے بیٹوں کی شادیاں بھی کیں اور ان بیٹوں نے
ماشاء اللہ حسب استطاعت اپنے بچے پیدا کیے۔ گویا اس مقدمہ کی ڈور سے پہلے تو ہمارے دوست ہی لٹکا
کرتے تھے اب پچیس تیس افراد (خاندان) اس مقدمہ کی ڈور سے لٹکے ہوئے ہیں۔ لٹکنے کی بھی ایک حد ہوتی
ہے۔ پچھلے دنوں ہم اپنے ان بزرگ دوست سے ملنے گئے تو دیکھا کہ موصوف اپنے فرزند اکبر کو اپنے سامنے
بٹھائے مقدمہ کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے "میاں! زندگی کا کیا بھروسہ ہے
کسی بھی وقت بلاوا آ سکتا ہے۔ اس لیے مقدمہ کی ذمہ داری اپنے بیٹے کو سونپ رہا ہوں کہ بعد میں وہ
لڑتا رہے" ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ اب ان کے بڑے بیٹے کی لٹکنے کی باری ہے۔ لٹکنے اور متواتر لٹکنے
کی یہ مثال تو ہمارے سامنے کی ہے۔ جو لوگ سرکاری دفتروں کے اسرار و رموز سے واقف ہیں وہ جانتے
ہیں کہ ہمارے ہاں دفتروں میں فائلیں کھولی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ معاملوں کو لٹکایا جائے۔ فائل ایکبار کھلتی
ہے تو پھر بند ہونے کا نام نہیں لیتی۔ ہمارے ایک اور دوست کا طلاق کا مقدمہ پچھلے تیس برسوں سے عدالت میں
زیر دوراں ہے۔ میاں اور بیوی دونوں نے نہ جانے اپنی کتنی ہی توانائیاں اس مقدمے کے پیچھے صرف کر دیں۔ دونوں
الگ الگ رہتے ہیں لیکن پچھلے ہفتہ ہمارے دوست نے ایک دن آئینہ میں اپنے آپ کو تفصیل سے دیکھا تو

انھیں احساس ہوا کہ جس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تھا وہ مقصد ہی فوت ہوا جارہا ہے۔ پرسوں ملے تو ہم سے کہنے لگے "بھیا! زندگی کے تیس برس تو میں نے طلاق کے مقدمہ میں لٹکنے میں ہی گزار دیئے،، اب سوچتا ہوں کہ کیوں نہ اپنی بیوی کو گھر لے آؤں تاکہ اپنی زندگی کے باقی پانچ چھ برس اس کے ساتھ ہنسی خوشی گزار سکوں،، جس ملک میں لٹکنے کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہو وہ ملک بھلا آگے کس طرح جا سکتا ہے۔ یوں بھی دنیا کے نقشہ میں ہمارے ملک کا جغرافیائی محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ لگتا ہے کسی دھوبی نے اپنا کوئی کپڑا سوکھنے کے لیے الگنی سے لٹکا دیا ہے۔ جب ملک ہی لٹک رہا ہو تو ہم کس شمار قطار میں ہیں۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی کی سرگرمیوں کا ہی جائزہ لیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ روز آنہ ہمارا زیادہ تر وقت یونہی لٹکنے میں بیت جاتا ہے۔ صبح اُٹھتے ہی دودھ کے ڈپو کی قطار میں لٹکنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہاں سے آتے ہیں تو خود اپنے ہی گھر کے باتھ روم کی قطار میں لٹکنے لگ جاتے ہیں، بس کی قطار، راشن کی قطار، لفٹ کی قطار، سینما گھر کی قطار، غرض سارا دن ایک قطار سے نکل کر دوسری قطار میں جاتے رہتے ہیں اور اتنی ساری قطاروں سے گزرنے کے بعد جب آدمی کے اس دنیا سے جانے کا وقت آتا ہے تو اس کی نعش تک کو قبرستان میں "مردوں کی قطار" میں بیجا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی لیے جب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ ملک کدھر جارہا ہے تو ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا ملک کہیں بھی نہیں جارہا ہے۔ اگر وہ کہیں جارہا ہوتا تو ہم بھی اس کے ساتھ چلے جاتے۔ ہم تو برسوں سے معلق کھڑے ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد ہم عرصہ تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ہمارا ملک ضرور کہیں نہ کہیں جارہا ہے۔ کچھ دن تو یہ جاتا بھی رہا۔ مگر اب پتہ ہی نہیں چلتا کہ چل بھی رہا ہے یا نہیں۔ آپ نے بالوں سے بھرا ہوا پومیرین کتا ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ بالوں سے اتنا ڈھکا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے سر اور اس کی دُم کے محل وقوع کا پتہ چلانا دشوار ہوتا ہے۔ جب تک یہ چلنے نہ لگے تب تک آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کدھر جائے گا۔ ہمارے ملک کی حالت بھی ایسی ہی ہوگئی ہے۔ پارلیمنٹیں بن رہی ہیں اور ٹوٹ رہی ہیں۔ پہلے بڑی سیاسی پارٹیوں کی اہمیت تھی اب وہ بھی جاتی رہی کیوں کہ آزاد امیدوار سیاسی پارٹیوں سے زیادہ اہم بنتے جارہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماچل پردیش میں وہاں کی سرکار کا سارا دار و مدار ایک آزاد امیدوار کے کندھوں پر ہے اور آزاد امیدوار وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں کبھی پیش قیاسی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کب کدھر چلا جائے گا۔ اس لیے ملک کے شہریوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ یہ جاننے میں اپنا وقت بالکل برباد نہ کریں کہ ملک کدھر جارہا ہے البتہ یہ ضرور جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کدھر جارہے ہیں۔!

ڈاکٹر محبوب راہی

اینگلو اُردو غزل

بیٹے کو بولڈ کر رہا ہوں لوہے کو گولڈ کر رہا ہوں
کان دھر کر ادھر ذرا سُن میں تجھ سے ٹولڈ کر رہا ہوں
ہاں! جو کہنا ہے آپ کہیئے لیجیے میں ہولڈ کر رہا ہوں
ہے وہ بڑا ہی ہاٹ ٹمپر اس کو قدرے کولڈ کر رہا ہوں
گرما رہا ہوں دل کو اس کے پتھر کو مولڈ کر رہا ہوں
نیلام کر رہا ہوں خواہشوں کو جذبوں کو سولڈ کر رہا ہوں
کہہ کے جوانی کو اپنی گڈ بائے اب خود کو اولڈ کر رہا ہوں
اخلاص اور ریا ملا کر باہم جیسے رولڈ گولڈ کر رہا ہوں
راہی غزل کمپلیٹ کر کے
پیپر کو رولڈ کر رہا ہوں

اقبال شانہ

غزل

آپ سے جو مرا سامنا ہو گیا عاشقی کا شروع سلسلہ ہو گیا
تیرے در پر کھڑے ہیں مریضِ وفا تیرا گھر جیسے دارالشفا ہو گیا
بوجھ بھاری بہت زندگانی کا ہے آدمی ڈھوتے ڈھوتے گدھا ہو گیا
میرا معشوق بھی اک عجب چیز ہے ہنستے ہنستے وہ مجھ پر خفا ہو گیا
اُن کے ڈیڈی پہ کہدی ہے میں نے غزل حق مری شاعری کا ادا ہو گیا
آج کل وہ مری بات سُنتا نہیں میرا فرزند کافی بڑا ہو گیا
میری شامت ہے یا میری تعظیم ہے دیکھتے ہی مجھے وہ کھڑا ہو گیا
پیار کا میرے دل پر جو حملہ ہوا دیکھتے دیکھتے میں فنا ہو گیا
رابطہ اُن سے شانہ مرا جو ہوا
منقطع مجھ سے ہر سلسلہ ہو گیا

★

یوسف ناظم

(دوسری قسط)

ایک غیر مقیم ہندوستانی کا سفرنامۂ ہند

یہاں پہنچ کر مجھے لکھنوی کُرتے پہننے کی عادت ہوگئی ہے بلکہ یوں سمجھئے میں یہ کُرتا نہ پہنوں تو خود کو بڑا بے لباس محسوس کرنے لگتا ہوں۔ مجھے تو لکھنؤ کی یہ صفت بمبئی میں زیادہ مقبول دکھائی دی خاص طور پہ طبقۂ اناث میں۔ لکھنوی کام کی ساڑیاں اور شلوار سوٹ نے بمبئی کو لباس کے معاملے میں اُتر پردیش بنا دیا ہے۔ لکھنوی کام کے شلوار سوٹ پہن کر خواتین اور لڑکیاں مراٹھی زبان بولتی ہیں تو گنگا جمنی تہذیب سے زیادہ گنگا گوداوری تہذیب بولتی نظر آتی ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں جب لکھنؤ سے چلا تو میں نے خود اپنے اور بستی کے چند پُرانے دوستوں کے لیے کئی کُرتے خرید لیے۔ میرے پُرانے دوست یہ تحفہ پا کر بے حد خوش ہوئے اور اُنھوں نے میری تعریف کی کہ ۵۰ سال ہندوستان سے باہر رہنے کے باوجود میری رگِ حمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ (ویسے اپنی سمجھ سے رگِ حمیت کا لکھنوی کُرتے سے کیا تعلق ہے کم سے کم میری سمجھ میں نہیں آیا۔)

ہندوستان میں پتہ نہیں اور کتنے جال بچھ گئے ہیں لیکن ریلوں کا تو واقعی ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ ہر طرف ریلیں ہی دوڑتی نظر آتی ہیں اور کبھی کبھی تو شبہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی پوری آبادی سفر کر رہی ہے۔۔ بسوں میں مسافر لدے ہوئے۔ ٹرکوں کی چھتوں پر مُسافر چڑھے ہوئے۔ ایک چھوٹی سی اسکوٹر ہے تو اس پر بال بچے اور خاندان لپیٹے ہوئے اور ریلوں میں تو مسافروں کا حال مت پوچھو۔ ایک پر ایک گرا پڑتا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مجھے دہلی کے ٹکٹ کے لیے زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی۔ یہاں یہ بھی ایک تجارت ہے خاص طور پر بڑے شہروں میں۔ ایک ٹراویلنگ ایجنٹ کے توسط سے مجھے دو سو روپے میں ٹکٹ آسانی سے مِل گیا۔ یہ دو سو روپے ایجنٹ کی جیب کے علاوہ کئی اور جیبوں میں جائیں گے۔ یہ اچھی بات ہے کہ یہاں ایسی معمولی باتوں کا بُرا نہیں مانا جاتا۔ ٹرینیں اب آرام دہ بھی بہت ہوگئی ہیں۔ ٹکٹ کے دام میں کھانے کے دام بھی شامل کر دیئے گئے ہیں اور بعض صورتوں میں تازہ کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ جن ٹرینوں میں مسافروں سے کھانے کے پیسے وصول کئے جاتے ہیں وہ ٹرینیں بالعموم وقت پر چلتی ہیں لیٹ ہو جائیں تو ایک آدھ کھانے کے خرچ کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں ہوائی سروس بھی اچھی خاصی ہوگئی ہے۔ کئی ہوائی کمپنیاں کھل گئی ہیں۔ سُنا ہے اس وقت ملک میں سب سے اونچی تنخواہ ہوائی عملے کے افراد کی ہے۔ ان کا زیادہ وقت تنخواہ گننے ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔ پلین اکثر لمحات وقت کی پابندی سے اُڑتے اور اُترتے ہیں بشرطیکہ اضافہ ڈیوٹی پر آجائے۔

کچھ لوگ اتفاق سے اس کے عادی ہیں۔

یوں تو پورا ہندوستان ہی بدلا ہوا ہے لیکن پرانا بمبئی تو مرے سے ہی غائب ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی آدھی آبادی اس شہر میں سمٹ آئی ہے۔ اجنبیت میں لوگ کتنی فرحت محسوس کرنے لگے ہیں۔ اپنے گاؤں میں نئی نسل کیسی پھنسی پھنسی محسوس کرتی ہے۔ ہر شخص چچا ہے یا ماموں۔ ہر کسی کی نگرانی ہر جگہ۔ سگریٹ جیسی معمولی اور فرسودہ چیز بھی پیو تو چھپ کر پیو۔ راستہ چلو تو جیسے اس طرح کوئی گناہ کر رہے ہو۔ جو بھی ایک مرتبہ آتا ہے اگر ۱۵، ۲۰ دن کے اندر اندر اپنے وطن واپس نہیں ہوا تو پھر اس کا بےنام اس شہر کے نام ہو جانا یقینی ہے۔ بے نامی کی زندگی بھی بہرحال زندگی ہے۔ اور تقدیر ساتھ دے تو لوگ اس بن بھی نام کما لیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس شہر میں اچھے شہریوں کی کمی ہے لیکن اچھے شہریوں کو اب یہاں پسند نہیں کیا جاتا۔ شہر بمبئی میں ایک تیسری دنیا بھی بن گئی ہے جو زیرِ زمین دنیا کہلاتی ہے انڈر ورلڈ۔ اس دنیا کے لوگ رہتے زمین کے اوپر ہی ہیں لیکن یہ اُن کی پناہ گاہ ہے رہائش تو ان کی انڈر ورلڈ ہی کی ہے اور ان کے دوستوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ جو بھی ہیں پولس میں ہیں۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا انڈر ورلڈ کے باشندوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انڈر ورلڈ کے باشندوں کا قبیلہ ایک ذمہ دار اور اصولوں کا پابند قبیلہ مانا جاتا ہے۔ ڈاکوؤں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قبیلے کے معزز افراد کون ہیں لیکن زیرِ زمین باسیوں کو مطلق علم نہیں ہوتا کہ ان کے شہر کا ئے قبیلہ کون ہیں۔ لاعلمی کا اتنا زبردست اہتمام اور کسی گروہ یا جماعت میں نہیں ہوتا۔ انھیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اُن کا سردار کون ہے جس سے ان کا قول و قرار ہوا ہے۔ یہ لوگ اپنے سردار کے بے حد وفادار ہوتے ہیں اور ان کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ چوں و چرا نہ کریں۔ معمولی ڈاکو ں میں یہ لوگ حصہ نہیں لیتے۔ اس میں ان کی ہتک ہوتی ہے ریلوں اور بسوں کے مسافروں کی گٹھریاں، گھڑیاں اور بٹوے اور مسافر خواتین کے زیور یہ لوگ نہیں لوٹتے یہ کام ان کے نصاب میں ہی نہیں۔ یہ سیدھے سادے لوگ ہوتے ہیں اعلیٰ درجے کے نفیس کام ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اپنی جان بھی ہتھیلی پر رکھتے ہیں۔ اگر کام پورا نہیں کر سکے تو جی جان سے گزر جاتے ہیں۔ جب سے یہاں ماروتی کاریں بننی شروع ہوئی ہیں عجیب اتفاق ہے کہ ان کا کام بہت بڑھ گیا ہے اور یہی کاریں یہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے سفرنامے کا موضوع نہیں ہے یہ تو یونہی برسبیل تذکرہ انڈر ورلڈ کا ذکر آ گیا۔

نصف صدی پہلے کی بمبئی تو میں نے خود دیکھی تھی لیکن اُس سے پہلے کی بمبئی ناولوں اور افسانوں میں پڑھی تھی۔ یہاں اُس وقت نام بھی عجیب عجیب تھے۔ ایک نام تھا کھڑا پارسی۔ یہ نام مجھے سب سے زیادہ پسند تھا اور یہ جگہ کچھ ایسی مقبول تھی کہ بمبئی کا ہر شخص دن میں ایک مرتبہ یہاں سے گزرتا ہی تھا۔ اس زمانے میں بمبئی میں ٹرام بھی چلتی تھی۔ غالباً ۱۹۶۵ء کے اردگرد اس کی رخصتی عمل میں آئی۔ لوگ چلتی ٹرام پر چڑھ جاتے تھے اور چلتی ٹرام سے کود کر اتر جاتے تھے۔ ہر کسی پر ٹکٹ خریدنا لازمی نہیں تھا۔ چند لوگ ٹکٹ خرید لیتے تھے اور اتنے ہی پیسوں میں ٹرام شہر کی آدھی سے زیادہ سڑکوں پر دوڑتی رہتی تھی۔ تنخواہیں بھی سارے عملے کو وقت پر ادا کر دی جاتی تھیں۔ بنا ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑا جانا انوکھی بات تھی۔ جو بھی پکڑا جاتا سب لوگ اس پر ہنستے اور اس سے برملا کہتے جب تمہیں سفر کرنا نہیں آتا تو ٹرام میں چڑھے ہی کیوں تھے۔ آئندہ سے اس گاڑی کو چھونا بھی مت۔ آخر ہم لوگ بھی برسوں سے سفر کر رہے ہیں

کسی زمانے میں ٹرام کو بیکن کہا جاتا ہے ٹرام میں سفر کرنے والے مسافروں میں قانون اور اپنے ضمیر سے ڈرنے والے لوگ بھی شامل تھے لیکن جب گھڑ دوڑ سے کوئی حرف اس لیے بھی آنے لگا کہ جلو ٹرام میں سفر کریں گے تو انتظامیہ کو شور و غوغا کا یہ کاروبار بند کرنا پڑا۔ اب یہاں آدمیوں کا شور زیادہ ہے اور ان کی مدد سے یہ شہر دن رات لاؤڈ اسپیکر جاری رہتے ہیں۔ پولیس اجازت دیتی ہے ۱۱ بجے رات تک لاؤڈ اسپیکر بجانے کی۔ لیکن اہل ممبئی اس اجازت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ۱۱ بجے رات سے آلہ مکبر الصوت کو زیادہ تیز کر دیا جائے۔ امتحانات کے زمانے میں والیوم ذرا زیادہ ہوتا ہے۔

شہر بمبئی میں اگر کوئی سڑک کھدی ہوئی نہ ہو تو لوگ بہت برا مانتے ہیں۔ اس انتظام کا فائدہ یہ ہے کہ گاڑیاں کم، رکشا، کر ٹیکسی اور بافراط کالا اور گاڑھا دھواں خارج کرتی ہیں۔ جو نہ صرف راہ گیروں کے کام آتا ہے بلکہ رہائشی مکانوں اور مکینوں کو بھی فیض پہنچاتا ہے۔ اس دھویں سے کہا جاتا ہے آدمیوں کے پھیپھڑے بہت مضبوط و مستحکم ہو جاتے ہیں اور کھانسنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ ماہرین طیور کا کہنا ہے کہ جتنے پختہ رنگ کے کوے بمبئی میں پائے جاتے ہیں کسی دوسرے علاقے میں نہیں پائے جاتے۔ یہ گہرا رنگ بھی اسی کالے دھویں کی دین ہے۔ میرے بمبئی میں قیام کے دوران ہولی کا تہوار بھی منایا گیا۔ ہولی کے دن یہاں ریل اور بس کے مسافر بچ کے رہتے ہیں۔ ان پر رنگین پانی سے بھرے ہوئے غبارے پھینکے جاتے ہیں اور اگر یہ عرق محبت افزا کھڑکی کے راستے داخل ہو جائے تو اس کی بینائی پر محبت کی ایسی مہر لگ جاتی ہے کہ اسے مہر و محبت کی اس مہر کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ ریل کی پٹریوں کے دونوں سمت آبادی ہی آبادی ہے اور کیسی آبادی۔ جس میں گزرنے والی ٹرینوں پر غبارے پھینکنے والے بچے ہی آٹے کے برابر ہیں۔ خالی دنوں میں انھیں ٹرینوں پر پتھر پھینکنے کی زیادہ عادت ہے اور اگر شہر میں کوئی مہم جاری ہو جیسے راستہ روکو یا ریل روکو تو اس دن اگر کوئی بچہ ٹرین پر پتھر نہ پھینکتا ہوا پایا جائے تو سوشیل ورکر اسے تنبیہہ کی خاطر دو چار گھنٹے اپنی تحویل میں رکھتے ہیں۔

بمبئی میں ہر دن کوئی نہ کوئی بڑا جلوس ضرور نکلتا ہے یہ احتجاجی جلوس ہوتا ہے اور اس کا رخ عام طور پر منترالیہ کی طرف ہوتا ہے۔ منترالیہ وہ عمارت ہے جہاں حکومت بھی اور بیٹھی رہتی ہے۔ جلوسوں کو پورے شہر میں چلنے پھرنے اور گھومنے کی اجازت ہوتی ہے صرف منترالیہ کے اردگرد کا علاقہ ان کے لیے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہاں ۲۴ گھنٹے پولیس متعین رہتی ہے اور اکثر موقعوں پر احتجاجی حضرات بلکہ خواتین بھی حدود ممنوعہ کے کنارے اپنے بستر لگا لیتی ہیں۔ یہ انتظام احتجاج کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے اور عموماً اس موقع پر آزمایا جاتا ہے جب عوام زنجیری بھوک ہڑتال پر مامور ہوں۔ بعض صورتوں میں احتجاجی جلوس دور دراز کے علاقوں سے بھی منگوائے جاتے ہیں۔ ایسا ایک جلوس میری نظر سے بھی گزرا۔ جلوسیوں کی حالت غیر تھی۔ نعروں کے کرنے کا کام آدمی نہیں کر سکتے۔ سب کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا جس کام کی غرض سے وہ لوگ آئے تھے وہ کام اور زیادہ بگڑ گیا جس علاقے سے آئے تھے وہاں الگ ڈاکے پڑ گئے لیکن کہا جاتا ہے ان ڈاکوؤں میں کوئی ڈاکو ملوث نہیں تھا۔

لوگ کہتے ہیں یہ شہر نیویارک ہو گیا ہے۔ ان کا کیا مطلب ہے پتہ نہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے امریکی شہروں میں نیویارک سب سے زیادہ گنجان علاقہ ہے اور اگر امریکہ میں کہیں گندگی ہے تو وہ

ِف نیویارک میں ہے اگر مقابلہ گندگی کا ہے تو بات اور ہے ورنہ بمبئی کو نیویارک بننے میں ابھی عرصہ لگے گا۔
۔یارک میں جاپانی زیادہ بسے ہوئے ہیں بمبئی میں یہ لوگ خال خال ہیں۔ جو شخص بھی ترک وطن کر کے کسی دوسرے
اقے میں بسنے کے لیے جاتا ہے تو پہلے معلوم کر لیتا ہے کہ وہاں کی معیشت کا کیا حال ہے اور "تارکانِ وطن کا ذریعۂ
اش کیا ہوگا۔ بمبئی میں کسی دوسرے ملک کے لوگوں کی رہائش اور افزائش کے لیے بالکل جگہ نہیں ہے۔ اِسی
ب کے لوگ ضرورت سے زیادہ ہیں۔ معیشت کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ذریعہ معاش کی نوعیت پر زیادہ توجہ نہ دی
ائے اور یہ نہ سوچا جائے کہ لوگ کیا کہیں گے تو حالات ٹھیک بلکہ بہت ٹھیک رہتے ہیں۔ اس لیے اب
ں شہر میں بیر بار بہت کھل گئے ہیں۔ یہ بھی لاؤڈ اسپیکروں کی طرح رات کے ۱۱ بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ ۱۱ بجے
ں کا بند کیا جانا اس لیے ضروری ہے کہ ان میں کام کرنے والی لڑکیاں کم سے کم ایک بجے رات تک اپنے اپنے گھر
ہنچ جائیں۔ شہر بمبئی کے مضافات میں اکثر جگہ پینے کا پانی نہیں ملتا ہے لیکن جگہ جگہ بیر بار کھل جانے کی وجہ
سے اب مرد لوگ پیاسے نہیں رہتے ہیں۔ گھر کی خواتین اپنے پانی کا کوئی نہ کوئی انتظام کر لیتی ہیں۔ ۱۱ بجے کے بعد
پلس کی نگرانی سخت ہو جاتی ہے اور جس بیر بار کو پولس کے چھاپے کی خبر نہیں ملتی ہے اُس کا لائسنس ضبط کر لیا
جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کے پاس لائسنس ہونا چاہیئے۔ بیر بار میں کام کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں کئی
قصے مشہور ہو جاتے ہیں لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں۔ یہ شہر ہے ہی قصوں اور قضیوں کا۔ قضیوں میں تو آدمی دن
لی روشنی میں بھی تاریکی میں چلا جاتا ہے۔

شہر بمبئی میں ہیروں جواہرات کا کاروبار عروج پر ہے۔ ہر ہوٹل سے متصل ایک دوکان چاندی سونے کی
ضرور لگی ہوتی ہے اور ہوٹل تو قدم قدم پر لگے ہیں۔ ان دوکانوں میں اب خود چوکیدار چوریاں کرنے لگے ہیں۔
ہر لاکر کی چابی کی کلوننگ ہو جاتی ہے اور راتوں رات دوکان کا چوکیدار بمبئی سے میلوں دور اپنے وطن
مالوف پہنچ جاتا ہے بیس یا ۵۰ لاکھ کے ہیرے تو اُس کے پاس ہوتے ہی ہیں لیکن بمبئی میں دس بارہ لاکھ کی چوری کو
چوری نہیں کہا جاتا تفریح کہا جاتا ہے۔ دلچسپ شہر ہے۔ اور تو اور یہاں ادیب اور شاعر بھی پائے جاتے ہیں۔
مجھے افسوس ہوا کہ میں لکھنؤ جانے سے پہلے بمبئی کیوں نہیں آیا ـــ کئی سال پہلے جب میں اس شہر میں آیا تھا تو یہ
باسی تھا اب یہ ممبئی ہے۔ خالص ملکی شہر۔ سارے کام خود کردہ ہیں۔ (جاری)

پرویز یداللہ مہدی

چھیڑ غالب سے چلی جائے

(قسط اوّل)

شروع کرتا ہوں اس کے نام سے یہ خاکہ، جو اُس چچا غالب کی طرح ہیں ہے جس کی زندگی میں نہ تو سالگرہ منائی گئی اور نہ مرنے کے پورے ننانوے برس تک کسی نے برسی منائی، لیکن پورے سو سال بعد دنیا بھر میں دُنیا والوں نے ان کی "صدی" مناکر سلا کے لیے انہیں جو کہ پہلے ہی منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں اپنے احسانوں کے بوجھ تلے ایسا دبا دیا کہ بے چارے قیامت تک سر نہیں اُٹھا سکتے کیوں کہ سر اٹھاتے ہی غالب صدی کے روپ میں کی جانے والی سنگساری کا خیال آجائے گا اور یوں جس شاعر خستہ نے اپنے لڑکپن میں میاں مجنوں پر صرف سنگ اُٹھایا تھا مارا نہیں تھا، اسے اپنی اس حرکتِ ناتمام کی سزا اس طرح بھگتنا پڑا۔ ویسے تو ایصالِ ثواب پہنچانے کے مختلف طریقے دنیا میں برسوں سے رائج ہیں کوئی پھول لے کر مرحوم کی قبر پر جاتا ہے تو کوئی مرحوم کے نام پر دو چار مسکینوں کو کھانا کھلاتا ہے (ویسے خود بھی کھا سکتا ہے اگر اس کی اپنی دانست میں قرب وجوار میں کوئی اس سے بڑھ کر مسکین نہ ہو)۔ یہ تو خیر عام زندگی کی بات ہوئی جہاں تک ادب کا تعلق ہے خصوصاً زرِ ادب کا تو ہم بڑے ہی مُردہ پرست واقع ہوئے ہیں، زندگی میں کسی شاعر یا ادیب کی مدد کرنا گناہِ کبیرہ تصور کرتے ہیں، بے چارہ ادیب یا شاعر نظروں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر فاقوں سے مرتا ہے کوئی اسے پانی کو نہیں پوچھتا لیکن مرنے کے بعد اس کا نام لے لے کر جام پہ جام لنڈھائے جاتے ہیں غرض یہ کہ بعد مُردنی مرحوم کا نام خوب اُچھالا جاتا ہے (اس طرح خود اپنی پگڑیاں اچھالنے کا موقع مل جاتا ہے اور اردو والوں میں یہ پگڑی اچھال کھیل خاصا مقبول ہے) البتہ پچھلی ربع صدی سے اردو ادب میں کچھ انقلاب ضرور آیا ہے بعض ادیبوں شاعروں کی زندگی ہی میں قدر کرنے کی کوشش کی گئی یعنی جشن کے نام پر کچھ نامور ادیبوں شاعروں کو جیتے جی بانس پر چڑھایا گیا، لیکن یہ قدر شناسی اکثروں کے حق میں اس قدر مہنگی پڑی کہ بے چارے زندہ درگور ہو گئے (ظاہر ہے جشن کے نام پر ادیب یا شاعر سے نقد رقم لے کر جواباً کیسۂ زر کی شکل میں جھوٹے چیک دیئے جائیں تو اس کا زندہ درگور ہونا یقینی ہے)۔

ہر بڑے شاعر یا ادیب کا یوں تو زندگی ہی میں یا تو لوگ استحصال کرتے ہیں یا پھر شاعر و ادیب خود جان بوجھ کر اپنا استحصال کرواتا ہے، البتہ یہ استحصال شاعر و ادیب کی شخصیت کے حساب سے چھوٹے پیمانے پر ہوتا ہے یا

بڑے پیمانے پر تاہم بڑے اور نامور ادیبوں و شاعروں کے استحصال کا سلسلہ ثواب جاریہ کی طرح مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور پیشہ ور استحصالیوں کو طرح طرح سے فیض پہنچاتا رہتا ہے، اور مرزا غالب کا نام نامی بلاشبہ اس قسم کے فیض رساں ناموں میں سر فہرست ہے، تبھی تو انہیں مرکر بھی چین نہیں انتقال کے سو برس کے بعد بھی یار لوگوں نے طرح طرح سے ان کا استحصال کیا اور کر رہے ہیں اس قدر دور رس اور دیرپا استحصال کی مثال اردو کیا دیگر ملکی و غیر ملکی زبانوں کے ادب میں بھی خال خال ہی ملے گی، چنانچہ ملک کے طول و عرض میں بہ فیضِ استحصال غالب ایسے ویسے نتھو خیرے کیسے کیسے ہو گئے جنھیں ان کا نام بھی ٹھیک سے لینا نہیں آتا انھیں بھی چچا غالب نے سرفراز کرکے چھوڑا، چچا تو دوست دشمن سب کے چچا لگتے اور ہیں خدا کو بھی جانے انکی کون سی ادا بھا گئی جو آج تک کوئی ان کا چچا نہ پیدا ہو سکا اور نہ آگے اس کی امید ہے۔

اردو کے استاد شاعروں و ادیبوں سے عام قارئین کا ادبی رشتہ ضرور ہوتا ہے لیکن جہاں تک رشتہ داری کا تعلق ہے تو سوائے مرزا غالب کے کسی سے چچا پھوپا، ماموں، تاؤ موسا خالو والی رشتہ داری اردو ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی، گویا ہر اردو والے کے گھر میں ہر وقت ایک چچا غالب ہی کیبل ٹی وی کی طرح گھسے ہوئے ہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ اگلے وقتوں کے کچھ اور مستند شاعروں و ادیبوں کو بھی رشتہ داروں کا درجہ دیا جائے، بھلے ہی منہ بولا سہی یعنی اردو والے اپنی روزمرہ گفتگو میں اگلے وقتوں کے مستند و نامور شعراء و ادباء کا ذکر رشتوں کے حوالے سے یوں کیا کریں، مثلاً ہمارے میر ماموں کے کیا کہنے، جو کچھ فرمایا اس کے بارے میں دھڑلے سے یہ فرمایا کہ ؎

مستند ہے میرا فرمایا ہوا   سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

اس کے جواب میں کوئی اور یوں ٹکڑا لگائے — آپ کے میر ماموں کی طرح ہمارے تاؤ محمد ابراہیم ذوق کا بھی اپنے وقتوں میں بڑا دبدبہ تھا کہ استادِ شاہ تھے محل میں بلا روک ٹوک رسائی تھی جو تاؤ ذوق کے چل چلاؤ تک قائم رہی —! حضرت ذوق کو کسی نے اگر تاؤ بنا لیا تو کسی اور کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، حکیم مومن خان مومن کو اپنا خالو یا پھوپا بنا کر ان کی حکیمانہ شاعری اور شاعرانہ حکمت کے قصیدے پڑھے جا سکتے ہیں بلکہ بات بات میں ان کے اس مشہور زمانہ گویا والے شعر کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس ایک شعر کے بدلے میں مرزا غالب نے اپنا پورے کا پورا دیوان بے مول ان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ البتہ بعض ادبی شخصیتیں چاہے داڑھی دار ہوں یا بے داڑھی، اس قدر گاڑھی ہوتی ہیں کہ منہ بولے رشتے میں بھی ان کی بزرگی کا خواہ مخواہ خیال رکھنا پڑتا ہے نتیجتاً نانا یا دادا کے بھاری بھرکم القاب ہی ان پر جچتے ہیں اور اس کی بہترین مثال ہیں مولانا الطاف حسین حالی جن کے مقدمہ شعر و شاعری کے نیچے دوسروں کے کلام کے ساتھ خود ان کی اپنی شاعری بھی بُری طرح دب گئی ہے، بہر حال رشتوں کے سلسلے میں اس رشتہ سے بہر صورت جو نیئر رہیں گے جو اردو والوں اور مرزا غالب کے بیچ ہے یعنی چچا اور بھتیجے کا رشتہ کیوں کہ ادبی دنیا میں چچا غالب سے استوار ہونے والی یہ ادبی رشتہ داری سب سے اولین رشتہ داری ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی بے شمار ترقی یافتہ و ترقی پذیر زبانوں میں اردو ہی وہ واحد زبان ہے جس میں کسی بھی شاعر یا ادیب پر تحقیق و تنقید کے لیے محقق و نقاد کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر اردو داں جو شد بد اردو پڑھ لکھ لیتا ہو یا صرف بول سکتا ہو وہ بھی بلا روک ٹوک بڑے سے بڑے ادیب و شاعر پر قلم اٹھا سکتا ہے۔

زبان ہلا سکتا ہے اب رہا ہمارے ممدوح مرزا اسداللہ خاں غالب کا معاملہ تو ان پر تحقیق و تنقید کرنے کے لیے زبان کی بھی قید نہیں، یہ حق خود چچا غالب دے گئے ہیں، البتہ تحریری طور پر دے گئے ہیں یا [illegible] منہ زبانی، اس پہ ہنوز تحقیق جاری ہے ہو سکتا ہے اس بات کا علم ہونے تک ان کے اتنے بخیئے ادھیڑے جا چکے ہوں گے کہ نہ تو مرزا غالب کا نام رہے گا نہ ان کا دیوان اگر کچھ باقی رہے گا تو ع

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط

مرزا غالب پر تنقید کے آرے تحقیق کے بھالے یوں تو ہر دور میں چلتے رہے ہیں لیکن غالب صدی تقاریب کے سرکاری درباری ہنگاموں میں یہ آرا یہ بھالا نوازک [illegible] کھیلوں کے اولمپک [illegible] لگی تھی چنانچہ غالب صدی تقاریب کے طفیل [illegible] مرزا غالب [illegible] [illegible] بھی تحقیق و تدقیق کے سینکڑوں دروازے کھل گئے اور غالب کے طرفداروں [illegible] پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دھڑلے سے جوتوں سمیت اندر گھس گئے [illegible] ان کی شخصیت کو کھنگالنے لگے البتہ جو سخن فہم محققین بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ان دروازوں [illegible] مرزا کی شخصیت میں نقب لگا کر داخل ہو گئے نتیجتاً اس شب خوں کے ذریعے ایسے ایسے معرکۃ الآرا مضامین اور مقالے منظر عام پر آئے کہ مرزا غالب کی شخصیت ایک ایسا معمہ بن کر رہ گئی جو سمجھنے کا [illegible] سمجھانے کا۔۔۔ کچھ [illegible] و مقالوں کے عنوان ملاحظہ فرمائیے :۔

* غالب ماضی کے آئینہ میں * غالب حال کے آئینہ میں * غالب مستقبل کے آئینہ میں
* غالب اپنے آئینہ میں * غالب پڑوسن کے آئینہ میں * غالب [illegible] کے [illegible]

قصہ مختصر یہ کہ برساتی پرنالوں کی طرح غالب صدی [illegible] نے غالب کو مختلف آئینوں میں پیش کرنے کے جوش میں انہیں ادبی آئینہ میں [illegible] طرح یاد ہے ایک محقق جدید نے مرزا غالب کو فلمی آئینہ میں تک دیکھ ڈالا موصوف کے مقالے کا عنوان تھا ۔۔۔۔" غالب فلم مرزا غالب کے آئینہ میں ۔ مذکورہ مقالے میں خوبی یہ تھی کہ اس میں فاضل محقق نے نہ صرف اپنے مکمل مطالعے کو نچوڑ دیا تھا بلکہ مرزا غالب کو بھی خاصا نچوڑ دیا تھا، فاضل محقق نے یوں تو اپنے مقالے میں بے شمار سوال اٹھائے تھے جن میں سے چند واقعی کمال کے سوال تھے مثلاً فلم مرزا غالب میں اداکار بھارت بھوشن کی جگہ اگر مرزا غالب خود ہیرو ہوتے تو کیا یہ فلم تجارتی نکتہ نظر سے کامیاب ہوتی ؟ نیز کیا اسے راشٹریتا کا سونے کا تمغہ حاصل ہوتا ؟ سوال ۲: فلم مرزا غالب میں چچا غالب خود اپنا کلام گلوکار طلعت محمود کی آواز میں گاتے ہوئے کیسے لگتے ہیں سوال ۳: فلم مرزا غالب میں اپنے زمانے کی مشہور گلوکارہ و اداکارہ ثریا نے چچا غالب کی منظور نظر ڈومنی چودھویں بیگم کا کردار ادا کیا تھا کیا چودھویں بیگم عرف ثریا کے کوٹھے کی سیڑھیاں ایکبار چڑھنے کے بعد مرزا غالب آسانی سے واپس اتر جاتے ؟ فاضل محقق کے علمی سوالات اپنی جگہ درست تھے لیکن ایسے وقت اٹھائے گئے تھے جب مرزا کا نام تو خوب اچھالا جا رہا تھا خود مرزا غالب ان ہنگاموں میں موجود نہیں تھے کہ انہیں دنیا سے کوچ کیے ہوئے ایک صدی بیت چکی تھی۔ للہٰذا یہ سارے جواب طلب سوالات بعد از وقت تھے !

(جاری)

قطعات

سگار لکھنوی

کلیاں چٹک رہی تھیں فضا باغ باغ تھی
آیا تھا گلستاں میں وہ گیسو سنوار کے
ہم نے تو دل کو چیر کے قدموں پہ رکھ دیا
کوّے کو اُس نے دے دیا صدقہ اُتار کے

ہمیشہ پٹنے پٹانے کا کام رہتا ہے
اسی فراق میں دل صبح و شام رہتا ہے
رقیب سامنے آئے تو نوچ لوں مونچھیں
یہ جوشش دل میں بصد انتقام رہتا ہے

★

تلاش کرتے ہیں شام و سحر نہیں ملتا
ہزار کوششیں کرتے ہیں پر نہیں ملتا
تڑا کے بھاگا ہے رسّی کو جب سے اُن کا گدھا
جنابِ شیخ کو اب ہمسفر نہیں ملتا

★

بیویاں چار ایک شوہر ہے غلط
مشورہ دیتا ہوں میں دُنیا کو نیک
روکنا ہے بڑھتی آبادی اگر
پانچ شوہر مل کے رکھیں بیوی ایک

★

ہر طرف اے سگار ملتے ہیں
کھدّری تاج دار ملتے ہیں
چار سو بیں رہبرانِ کرام
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

غزل

مُنہ پھٹ ناگپوری

ہمارے دوست بنیں اور آپ! ناممکن
منافقوں سے ہمارا ملاپ، ناممکن

یہاں جدھر بھی گئے ہم گدھے نظر آئے
یہاں پہ بیڑی ملے اونٹ چھاپ، ناممکن

خبیثوں اور سیاست گروں کے ہوتے ہوئے
کوئی مٹائے زمانے سے پاپ، ناممکن

وہ کام لوگوں کو کر کے دکھا دیا ہم نے
جسے سمجھتے رہے اپنے باپ، ناممکن

ہر ایک گھر میں ہے ٹی وی بفضلِ مالِ حرام
اب اور بند ہو طبلے کی تھاپ، ناممکن

وہ اور کوئی نہیں، برہمن کا لڑکا ہے
ہمیں کھلائے وہ بکرے کی چاپ، ناممکن

بچا کر ہوتی ہے تاثیر جادو ٹونے میں
بنا بھی سکتے ہیں ممکن کو آپ، ناممکن

جُدا ہے سب سے مذاقِ سخن مرا مُنہ پھٹ
ہو میرے شعروں میں اوروں کی چھاپ؟ ناممکن!

سید طالب حسین زیدی
حیدرآباد

(دوسری آخری قسط)

"ھمارے" ایک جاپانی نے جاپانیوں کی فرض شناسی اور دیانت داری کا یہ دل پذیر واقعہ سنایا!
پروموٹر نے بلٹ ٹرین کے ذریعہ کسی دوسرے شہر کی سیر کا پروگرام بنایا، یہ فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہونا تھا مگر کسی تکنیکی خرابی کے باعث ٹرین منزل پر آدھا گھنٹہ تاخیر سے پہنچی ہمارے "یہ گیارہ جاپانی" ٹرین کی صبا رفتاری اور آرام سفر کے گن گاتے ہوئے پلیٹ فارم پر اُترے اور گائیڈ کی رہنمائی میں اکزٹ (EXIT) پر پہنچے جہاں ایک کاؤنٹر پر انھیں روکا گیا اور ٹکٹ دیکھ کر تاخیر سے پہنچانے کی معافی چاہتے ہوئے اُسی درجہ ٹکٹ کا آدھا کرایہ واپس کردیا! انہوں نے گائیڈ سے پوچھا یہ کس بات کے پیسے دیئے جا رہے ہیں؟ اُس نے بتلایا، ٹرین کو یہاں ایک گھنٹے میں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر وہ آدھا گھنٹہ لیٹ پہنچی، ریلوے والے آپ کے "قیمتی" وقت کے زیاں کا احساس کرتے ہوئے اپنی کوتاہی کی پاداش میں مسافروں کو آدھا کرایہ لوٹا رہے ہیں۔ بلا طلب پیسوں کے ملنے پر "آرشی" اُچھلے اور بولے کاش! بجائے آدھے کے ایک گھنٹہ ہی لیٹ ہوجاتی ...... مزا آجاتا ...... پورا کرایہ واپس ملتا اور "چھوکٹ" میں بلٹ ٹرین کی سواری کا لطف اُٹھاتے ...... دیش میں تو ٹرینوں کا گھنٹوں لیٹ ہوجانا روز کا دھندا ہے، کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، نہ ہمارے نہ ریلوے والوں کے، رقم کی واپسی کا کیا سوال؟ ......

مگر ہمیں اس بات پر بڑا گربھ ہے کہ ہماری ریلوے "دنیا کی سب سے بڑی ریلوے لائن ہے"۔ ذرا کمپارٹمنٹ کے اندر جاکر دیکھئے اور اس بات پر بھی گربھ کیجئے سب سے متعفن اور گندی ریلوے کا ریکارڈ بھی ہم ہی توڑتے ہیں۔ ٹوائیلٹس میں پانی ندارد، فرش پر کچرے اور غلاظت کی دو دو انچ تہ چڑھی ہوئی، راہداری میں بستر کھول کر مسافر خواب راحت کے خراٹے لیتے ہوئے، دروازوں میں لکڑی کے گٹھے، اناج کے بورے، دودھ کے ڈبے مع کوڑی بھکاریوں کے اس طرح ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے کہ دروازہ کھولنا اور بند کرنا تقریباً ناممکن۔ پھر بھی دنیا کی سب سے بڑی "ریلوے لائن" ہونے کا سودا سر میں سمایا ہوا۔
کاش! دنیا کی سب سے چھوٹی مگر سب سے پیاری ریلوے ہوتی اور ہم سر اُونچا کرکے اس بات پہ "گربھ" کرتے ...
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ایک جاپانی جو رائیس مل کا مالک ہے کہنے لگا، "یہ بات مجھے بہت کھلتی ہے کہ ہمارے" وائیو وائیوں" اور

ہوٹلوں میں جو کھانا ملتا ہے وہ "بچا کھچا" ہی کا ملتا ہے، ہم کو تو چاہیئے کہ یورپ والوں کو جو ہمیشہ اپنے ملکوں میں یہی کھانے کھاتے ہیں، ہمارے جہاز اور ہماری فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ہمارے "ڈشس" کھلایا کریں، "آلو؟ دیسی پانی" بولا "یہی اپنا دوشہ"، "اڈلی"، "وڈا سانبر اور فیکی رائس، وہ بھی خوب مزے لے لے کر انگلیاں چاٹتے ہوئے کھائیں گے"..... آپ اس بارے میں اخباروں میں ضرور لکھیں۔ ہم اول تو چکرائے، "گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل" کے حیص بیص میں پھنس گئے، جواب نہ بن پڑا تو ٹیبل پر رکھا ہوا السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کا تازہ میگزین اٹھایا اور ان کے ہاتھ میں دے کر کہا اسے پڑھ لیجیے، آپ کی بات کا شافی جواب مل جائے گا اور اس "بخار" کی کیفیت میں کافی افاقہ محسوس کریں گے ... اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بنگال کے بڑھے نراد چوہدری نے جو برسہا برس سے لندن میں بیٹھا ہوا ہندوستان کی ایسی ہی قابل فخر "پرمپراؤں" کے بخیے ادھیڑتا رہتا ہے، لکھا تھا! "مغرب کا عام آدمی جو کسی مل میں فورمین، کسی دفتر کا کلرک، کسی کمپنی کا نمائندہ اور ٹیکسی ڈرائیور ہوتا ہے، سال بھر محنت کرنے کے بعد کچھ پونجی جوڑ کر "اپنی روایات" کے مطابق دوسرے ملکوں میں چھٹیاں گزار کر تازہ دم ہونا چاہتا ہے۔ اور اسی غرض سے جب یہ ہندوستان میں وارد ہوتا ہے تو اس کی گوری چمڑی دیکھ کر اور گدھ، پنڈا، "سن کر یٹم کمپلاکس ہائے کمتری" کے ہاتھوں اسے گریٹ بریٹین (جی۔بی) کی کسی کاؤنٹی کا "کاؤنٹ"، امریکہ کا راک فیلر یا ہنری فورڈ کا پوتا باور کر لیتے ہیں اور از راہ میزبانی بجائے پتروں کے "پلیٹ" میں لگا کر دوشہ، وڈا اور "اڈالی" پیش کر کے چار چھ گنا زیادہ بل اس کی جیب سے جھڑائیں گے وہ ان کھانوں کو اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے تعریف کر کر کے کھائے گا، مگر جب دیکھے گا کہ جیب کافی ہلکی ہوگئی ہے تو پھر کانوں پر ہاتھ بھی رکھ لے گا"...... "بخشو بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا"...... ہم کو اپنے کھانوں کا بھی بڑا غرّہ ہے، شاید ہی دنیا کی کسی قوم کو ایسے "لذّت" دار کھانے نصیب ہوں، سن پچاس کے دہے میں اس بات کا بڑا شہرہ تھا کہ مصر کے جمال عبدل ناصر (جمال عبدالناصر) کو ہمارے "نام ور" سفیر کی بیگم نے "بگھارے بیگن" اور بریانی کھلا کھلا کر ہندوستان کا ہم نوا بنا لیا تھا جس کے باعث "بانڈونگ کانفرنس" اور "پنچ شیل" کی ولادت ہوئی تھی...

ہمارے عزیز دوست محمد علی خاں جو کیڑے مار دوائیں (pesticides) بنانے والی سوئیز کمپنی "سینڈوز" (sandoz) کے سیلس ایکزیکٹو تھے ایک مزیدار قصہ سناتے ہیں، ایک مرتبہ سوئیزرلینڈ سے سینڈوز کا ایک ڈائرکٹر ہندوستان کے دورے پر آیا، گھومتے گھامتے خاں صاحب کے علاقے میں بھی پہنچا وہ میزبان کی حیثیت سے اسے ساتھ لے کر اپنی کمپنی کے ڈیلروں سے ملاتے اور بزنس پروگریس کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ ایک ڈیلر کا جب ڈائرکٹر سے تعارف ہوا تو اسے "بخار" چڑھا، خاں صاحب سے بولا "بڑا صاحب کو کل دوپہر میں "ڈنر" کے لیے میرے گھر لے آیئے ہوٹلوں کا کھانا کھاتے کھاتے یہ سب بیزار ہوگئے ہوں گے"، خاں صاحب نے ڈائرکٹر کو بتایا اس نے نہایت خوش دلی سے شکریہ ادا کر کے دعوت قبول کرلی۔ دوسرے دن ایک بجے خاں صاحب "ڈنر" کے لیے اسے اپنے ہمراہ ہوٹل سے ڈیلر کے گھر لے گئے۔ وہ بہت خوش ہوا اور گرمجوشی سے دونوں کا استقبال کر کے ڈرائینگ روم تک پیشوائی کی۔ کچھ دیر بعد اس کی دھرم پتنی نے آ کر اطلاع دی "[illegible] ہے"

آپریشن کے بعد دوسرے دل سے تبدیل کردیا'، مگر مریض ۔؟ خیر بچی ہوئی سانسیں پوری کر کے پرلوک سدھار گیا! ....

شرم تم کو مگر نہیں آتی،

ساری دنیا میں کرسچین برنارڈ کے بے مثال کارنامے کی دھوم مچ گئی اور کئی ملک، اُسے مدعو کر کے تعریفوں کے ڈونگرے برسا برسا کر اعزازات اور انعامات سے نوازنے لگے، کارنامہ بھی تو ایسا ہی تھا،

ہم کیوں پیچھے رہتے ۔؟ یہاں بھی اُسے بلایا گیا اور شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ بمبئی میں اُس کے اعزاز میں شہریوں کی جانب سے استقبالیہ جلسہ منعقد ہوا "پری ٹوریا" کا وہ انگریز نسل کا ڈاکٹر محض ایک باکمال سرجن ہی نہ تھا بلکہ انگریزوں کی مخصوص صفت قوموں کی نفسیات سے واقفیت کا عنصر بھی اُس کے خون میں رچا اور بسا ہوا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ہندوستانیوں کو کس "منتر" سے رجھایا جا سکتا ہے ۔؟ اُس نے اِس کا حال اپنے پُرکھوں سے سن رکھا تھا اور بچپن ہی میں درسی کتابوں میں پڑھ بھی چکا تھا۔

کہتے ہیں اُنیسویں صدی کے اوائل میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے ہندوستان پر "پورن" قبضہ جمانے کے لیے، "دانایانِ فرنگ" اور فوج کے ماہرین سے مشورہ طلب کیا کہ کن ہتیاروں کو استعمال میں لا کر اور کون سی اسٹرٹیجی، (○ Strategy) اپنا کر اس "سونے کی چڑیا" کو ہتیایا جائے ۔؟ ایک پادری نے جو حال ہی میں ہندوستان کا ٹور کر کے واپس ہوا تھا کمپنی کو لکھا! "ہندوستان کو تاج برطانیہ کی زینت بنانے کے واسطے تمہیں توپ و تفنگ کی ضرورت نہیں، بس، اتنا کام کرو، ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ایک ٹائی تھما کر کہو! "پدرت" سلطان بود ..... اور وہ جواب میں اقلیم ہند کو ایک کشتی میں لگا کر تمہیں پیش کر دیں گے"......

قارئین! یہاں عیار انگریز کی قوموں کی نفسیات کی مہارت کا ایک واقعہ بھی سُن لیجیے جو ہندوستان کے باہر پیش آیا تھا مگر بالواسطہ ہم پر بھی صادق آتا ہے۔

جان گلب (John Glubb) انگلستان سے شرق اردن پہنچتا ہے اور شاہ عبداللہ کے چہیتے پوتے طلال کے بیٹے حسین کو (موجودہ شاہ حسین) ایک بائیسکل تحفہ میں دیتا ہے۔ شاہ عبداللہ اپنے پوتے کے لیے سیکل کا تحفہ پا کر اس قدر خوش اور ممنون ہوئے کہ اُسے "پاشا" کا خطاب عطا فرما کر "جان گلب، پاشا" بنا دیا ... اور پھر اُردن میں مُدتوں "ڈھنڈوری" اس طرح پٹتی رہی! زمین اللہ کی، ملک بادشاہ کا، حکم جان گلب پاشا کا،

نتیجے میں اس "آزمائش" سے آج تک اسرائیل عربوں کے سینے پر دمڑلے سے مونگ دل رہا ہے اور "خدایانِ" کب تک دلتا رہے گا۔؟ .....

بمبئی کے استقبالیہ میں جب کرسچین برنارڈ کو پھولوں، تحفوں سے لاد کر اور "شال اڑھا کر" تعریفوں کے پل پہ پل باندھ دیئے گئے تو ہم سادہ لوح ہندوستانیوں کی نفسیات کا ماہر وہ "انگریز" "جواب آں غزل" کے انداز میں ہمیں بانس پر چڑھانے کے لیے اُٹھا اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہوا! "میرا یہ معمولی سا کام آپ کے لیے حیرت کا باعث کیوں ہوا ۔؟ آپ کے یہاں تو ہزاروں برس پہلے ایسے ایسے بے شمار کارنامے انجام پایا کرتے تھے"۔ لوگ

○ حکمتِ عملی ● بیوقوف، [illegible] یعنی

حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے وہ کون سے کارنامے ہیں جنھیں ہم خود نہیں جانتے اور یہ ہمیں بتلا رہا ہے۔؟.....

سِرّ خدا عارف کامل بکس نہ گفت ؛ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

(خدائی اسرار کو عارف کامل نے کسی سے بیان نہیں کیا، مجھے حیرت ہے کہ پھر بادہ فروش نے کہاں سے سن گن لے لی۔؟)

"گرگ باراں دیدہ" انگریز، کچھ دیر تک اپنی پیدا کردہ سسپنس (suspense) کا مزا لیتا رہا جب کھسر پھسر کم ہوئی تو بولا! "ایک مثال تو یہ آپ کے سامنے ہی موجود ہے، اُدھر دیکھیے، انسان کی گردن پر ہاتھی کے سر کی پیوندکاری۔ یہ بے نظیر کارنامہ تو ہندستان میں ہزاروں برس پہلے انجام دیا گیا تھا"۔....

ڈاکٹر کرسچین برنارڈ کی جئے جئے کار ہونے لگی اس "انکشاف" پر سارا مجمع مارے خوشی کے دیوانہ وار ناچنے لگا۔

گنپتی بپا موریا، لڈو چوریا۔ گنپتی بپا موریا، لڈو چوریا۔....

ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے مسلمانوں کی "پدرم سلطان بود" والی ذہنیت پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے! "جتنا وقت اور روپیہ" مسلمانوں کے سائنس پر احسانات گنوانے میں صرف کیا جاتا ہے اس کا دسواں حصہ بھی بچوں کو سائنس پڑھانے میں صرف کیا جائے تو مسلمانوں پر بڑا احسان ہوگا"

(شرم تم کو مگر نہیں آتی) ۵۳

- وہ گنیش اتسو کے دن تھے اور شہر میں جگہ جگہ منڈلیاں بٹھائی گئی تھیں۔

رؤف رحیم
حیدرآباد

ہے خواہش اُن کی میک اپ سے شال حور ہوجانا
مگر ممکن کہاں کشمش کا پھر انگور ہوجانا

عبادت شیخ نے کی اور وہ بھی حور کی خاطر
اسے کہتے ہیں زاہد کا فنا فی الحور ہوجانا

ترا بچپن بھی دیکھا اور جوانی بھی ضعیفی بھی
یہ ہے کیری سے آم اور آم سے انجور ہوجانا

ہمارے دیش کی یہ تو روایت عام ہے لوگو!
بہو کا نان بننا ساس کا تندور ہوجانا

بُرا جو آدمی دیکھو اٹھاؤ انگلیاں اس پر
برائی سے بہت آسان ہے مشہور ہوجانا

عدو کی حرکتیں ایسی بھی دیکھیں ہم نے محفل میں
سمجھ میں آگیا انسان کا لنگور ہوجانا

رحیمؔ اپنا تو مسلک ہے سنانے کو غزل اپنی
اگر محفل غزل کی دور سے بھی دور ہو جانا

ہائیکو

قیسی قمر نگری

(۱)
ڈاکٹر کہتا ہے صبح گرم پانی پیجیے
جبکہ ہر دن گرم پانی صبح کو پیتا ہوں میں
ہاں مگر بیوی مری اس کو کہا کرتی ہے چائے

(۲)
ناز بیگم کو ہے جو ساڑی پہنتی ہیں وہ آج
اس کو دوبارہ پہنتی ہیں وہ اک سال کے بعد
جبکہ دوبارہ پہنتی نہیں ساڑی کوئی دھوبن

(۳)
یہ تو حجام کا کرشمہ ہے
میں نے باندھی تھی آج صبح سفید
ہوگئی سرخ رنگ کی ٹائی

(۴)
آج بیگم صاحبہ میک اَپ سے رشتہ جوڑ کر
کر رہی ہیں میرا استقبال چشم شوخ سے
آج پھر سالن میں زائد پڑ گیا ہوگا نمک

(۵)
یہ بات چار سو فیصد صحیح ہے قیسیؔ
کہ بھاگتا نہیں چوہے کے پیچھے چوہے دان
کسی کے پیچھے نہیں بھاگتی حسین عورت

(٦)
صدر جمہوریہ عورت کوئی بن پائی نہیں
کیونکہ اس کے لیئے لازم ہے چھیالیس کی عمر
تادمِ مرگ چھیالیس کی ہوتی نہیں عورت

اسلم مرزا ۔ (اورنگ آباد)

دانش، دانش مندی اور دانشور نہایت مقبول الفاظ ہیں۔ بار ہا نظروں سے گزرے، کانوں کے پردوں سے ٹکرائے۔ عاشقوں نے اُن سے دُور کا واسطہ نہیں رکھا۔ لیکن تاجروں نے گرہ میں باندھا۔ ایک نے نام کمایا دوسرے نے دام۔

معلوم تاریخ کے ہر دور میں نہایت جغادری قسم کے دانشمندوں کی افواج نظر آتی ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ ان دانشمندوں کی کہی اور ان کہی باتیں دہرا کر آج بھی ایک، دوسرے کو مرعوب کرنے کی سازش میں منہمک نظر آتا ہے۔ یہ ایک آرٹ بھی ہے اور سائنس بھی۔

دانش مندی کی اعلیٰ قسم دانشوری کہلاتی ہے۔ یہ جن حضرات کی ملکیت ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو دانشور کہلاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اور زراف کی طرح گردن اکڑائے پھرتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں دانشوروں کی صحبت میں رہنے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے تھے لیکن اب ہمیں دانشوروں کو خواہ مخواہ جھیلنا پڑتا ہے۔

دانشوری کی اصطلاح مارکیٹ میں ادھر چند سالوں سے زیادہ مروّج ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو دیگر علوم وفنون، سیاست بازی اور دیگر اشیاء کی طرح دانشوری کا کیڑا مغرب کی دین ہے۔ یوں بھی ہر چیز کو مغرب سے وابستہ کرنے میں ایک الگ لطف ہے۔

شاعری اور سپہ گری کی طرح دانشوری پشت در پشت چلنے والی بیماری نہیں ہے۔ تاہم اسے نہایت آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کی ذہنی چالاکی اور عیاری کی ضرورت ہوتی ہے چرب زبانی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اکثر و بیشتر سفارشی گھوڑے بھی دوڑائے جاتے ہیں۔

دانشوروں کو آپ لاکھوں میں پہچان سکتے ہیں۔ غلطی سے اگر آپ انہیں نہ پہچان پائیں تو یہ خود آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرواتے ہیں۔ ان کی عادات، اطوار، چہرے کے مختلف پوز وغیرہ شناخت میں آپ کی مدد کرتے ہیں۔
نہایت عرق ریزی سے تحقیقات کرنے کے بعد پتہ چلا ہے کہ دانشور حضرات زیادہ تر سوسائٹی کے درمیانی طبقہ،

اعلیٰ درمیانی طبقہ اور ادنیٰ درمیانی طبقہ سے نکل کر منظر شہود پر آتے ہیں۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ دانشوری کی ابتدا اکثر و بیشتر کھانے کے ٹیبل پر طبلہ بجانے سے شروع ہوتی ہے۔

دانش ور جغرافیائی حد بندیوں، موسمیات کی غیر اخلاقانہ خصوصیات اور سماج کی بیزارکن حرکتوں سے اکثر و بیشتر مبرا ہوتے ہیں۔ تحقیق سے ایک نئی بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ تمام ممالک جو تعلیمی، صنعتی اور معاشی میدانوں میں پیچھے ہیں یا جہاں ان چیزوں کا ٹمپو کم ہے وہاں ہر قسم کے دانشور حضرات کی پیداوار خوب ہوتی ہے ان دنوں امریکہ، روس، فرانس، جاپان اور جرمنی جیسے ممالک میں اور چند عرب ممالک میں دانشوروں کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے اسی لیے یہ ممالک کمپیوٹروں پر انحصار کرنے لگے ہیں۔

دانش ور حضرات دُور کی کوڑی لانے میں استاد مانے جاتے ہیں۔ چند ایک عشق پیشہ اور معشوق پسند ہوتے ہیں۔ خوفزدہ اور محتاط رہنے کی اداکاری کرتے ہیں۔ کچھ خبطی، بے وقوف اور بے رونق نظر آتے ہیں اور اسی طرح زندگی جی لیتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں گزارتے بلکہ زندگی انہیں گزار لیتی ہے۔ چند ایک نہایت عیار اور معاملہ فہم ہوتے ہیں۔ کچھ بیوپاری قسم کے ہوتے ہیں اور دانش وری کی دکان کس طرح چمکائی جائے اس کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ چند دانش ور حضرات صحافیوں سے اور رسائل کے مدیران سے اپنے تعلقات استوار رکھتے ہیں نیز خبروں میں رہنے کے لیے سیاسی ہتھکنڈوں کا بھی استعمال کرتے دیکھے گئے ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں دانشوروں کی کئی اقسام منظر پر آئی ہیں جن کا احاطہ اس طرح کیا جاسکتا ہے

۱۔ ادبی دانشور

ان کو الف، بے، اور تے کے خانوں میں بہ آسانی تقسیم کیا جاسکتا ہے مثلاً (الف) میں ہم صرف علمی دانشور (ب) میں کتبی یا کتابی دانشور اور (ت) میں جدید، جدید تر اور مابعد جدید دانشوروں کو بغیر کسی تکلیف یا تکلف کے شامل کرسکتے ہیں۔

الف۔ علمی دانشور

ان دنوں یہ حضرات درجن اور کلو کے حساب سے اسکولوں، کالجوں اور دانش گاہوں (اردو میں یونیورسٹی) میں مل جاتے ہیں۔ یہ قوم اور ملک کے نہایت اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ اشخاص ہوتے ہیں یا ہونے کا ڈھونگ بھی کرتے ہیں دوسروں پر یا عموماً کم پڑھے لکھے لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے ایک عدد تحقیقی مقالہ لکھ لیتے ہیں جس پر انھیں ڈاکٹر کی ڈگری عطا کی جاتی ہے۔ اس ڈگری سے کس کا کیا فائدہ ہوتا ہے اس پر اب تحقیق لازمی ہے۔ کچھ علمی دانشور اپنے ادبی مقالوں کو یا اپنی شاعری کی بیاضوں کو ہمیشہ بغل میں دبائے نظر آتے ہیں۔ ان حضرات سے خوف زدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ نہایت سرنجان مرنج قسم کے اور اکثر نیم مُردہ ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی اور ہونٹوں پر لطیف بے معنی مسکراہٹ کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ علمی دانشور حضرات اپنے مرد ساتھیوں سے نہایت خشک، بعید از فہم اور غیر ضروری موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں لیکن جب کبھی یہ خواتین کے جھرمٹ میں اور خصوصاً تعلیم یافتہ خواتین کی محفل میں ہوتے ہیں تب زیادہ تر رومانوی شاعری پر اور ادب کے غیر ادبی موضوعات پر بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں۔ نیم تعلیم یافتہ خواتین کو مرعوب کرنے کی شدید ضرورت میں مبتلا نظر آتے ہیں اور ان میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔

یہ حضرات اکثر وبیشتر آپ کو کسی گوشہ میں نہایت گہری سوچ میں غلطاں نظر آئیں گے۔ ان کی یہ اداکاری دیکھنے والوں کو مرعوب کرنے کے لیے ہوتی ہے ان سے اگر آپ گفتگو کرنے کی کوشش کریں تو ان کی باتیں آپ کو کم سنائی دیں گی چونکہ یہ زیرِ لب گفتگو کو فن سمجھتے ہیں اور اس طرح اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر نہایت دبیز، سیاہ رنگ کی عینک آپ کو نظر آئے گی۔ یہ حضرات انگریزی، ہسپانوی چینی اور جاپانی شعراء اور ادبا پر نہایت گہری نظر رکھتے ہیں اور اس وجہ سے ان کی آنکھوں میں ہمیشہ تکلیف پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی یہ اکثر شکایت کرتے رہتے ہیں۔

کئی علمی دانشوروں پر اسمگلر ہونے کا بھی شبہ ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ یہ حضرات اکثر بیرونی ادب، "خصوصاً مغربی ادب کی" نگارشات ہمارے ملکی اور قومی ادب میں نہایت طمطراق کے ساتھ امپورٹ کرتے ہیں اور یہ مال کہاں سے لایا ہے اس کا نام بتانا کسرِشان سمجھتے ہیں۔ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے اس طرح خود کو اور ادبِ اردو کو مالدار بنا دیا ہے لیکن اکثر یہ حضرات دوسروں کی عقل کا اور اپنی جیب کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔

(ب) کتبی یا کتابی دانشور نہایت خطرناک قسم کے ہوتے ہیں۔ ملک کے ہر گوشہ میں بہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ علمی کم اور کتابی زیادہ ہوتے ہیں۔ صرف کتابیں پڑھتے ہیں، غور و فکر میں غلطاں اپنے چہرے پر فکر و تردد کی لکیروں کا جال اس طرح پھیلاتے ہیں جیسے دنیا کا کاروبار صرف انہی کے شانوں پر ہے۔ بلیغ قسم کی گفتگو سے عموماً پرہیز کرتے ہیں کہ ان کی دانشوری کا بھانڈہ نہ پھوٹ جائے۔ پہلے ان حضرات کو دانشوروں میں شمار نہیں کیا جاتا تھا لیکن انھوں نے کافی واویلہ مچایا۔ بات پارلیمنٹ تک پہنچ گئی۔ پردھان منتری نے مداخلت کی پھر اس کے بعد ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا اور کمیشن کی رپورٹ ملنے کے بعد طوعاً کرہاً انہیں دانشوروں کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔ آج کل انھیں بیک ڈور دانشور بھی کہا جاتا ہے۔

کتبی یا کتابی دانشور انتہائی درجہ کے معاملہ فہم، دنیا دار اور چرب زبان دیکھے گئے ہیں۔ یہ اکثر شی بنار، سمپوزیم نمائش اور ادبی ورکشاپ کے انعقاد اور ترتیب و تقریب اور تخریب میں منہمک رہتے ہیں۔ بحث کرنے میں گرمی دکھاتے ہیں لیکن بحث اور تقریر کا لبِ لباب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔

اپنی آمدنی کے ذرائع پیدا کرنے میں حد سے زیادہ چالاک اور ہمیشہ ہشاش بشاش نظر آتے ہیں صحت قابلِ رشک ہوتی ہے۔ اکثر کو دیکھ کر پہلوان ہونے کا گمان بھی ہو جاتا ہے۔ تنقید اور تبصرہ نگاری ان کے خاص میدان ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین، اور مقالے مستند ادبا کے حوالوں سے مزین ہوتے ہیں جس میں ان کا اپنا مال بالکل نہیں ہوتا۔ یہ حضرات سرقہ کو جائز قرار دیتے ہیں اپنا زیادہ وقت صرف کتابیں پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ یہ کتابیں بالکل نہیں خریدتے۔ اکثر انہیں دوسروں کی چرائی ہوئی کتابوں میں گھرا دیکھا گیا ہے۔

(ت) جدید، جدید تر اور مابعد جدید تر دانشور یہ حضرات ہندوستان کی اردو فضاء میں ۱۹۶۲ء کے بعد نہایت تیزی سے ابھرے ہیں۔ نہایت لیٹسٹ قسم کے دانشور ہیں۔ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں خوش گفتار اور خوش پوش ہوتے ہیں۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔

فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم میں بھی خود کو نہایت پہنچا ہوا سمجھتے ہیں۔ ان کا دار و مدار انگریزی اور دوسری یورو پین زبانوں کے علوم اور ادبی منظر نامہ پر ہوتا ہے۔

ان دانشور حضرات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہایت ادق زبان لکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس کو ان کے علاوہ کوئی نہیں سمجھتا۔ قیاس غالب ہے کہ یہ لوگ شاید ہماری آئندہ نسلوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔ انہیں اپنی تحریروں میں ابہام پیدا کرنا آرٹ کی علامت نظر آتا ہے۔ ان دنوں ان حضرات کو برداشت کرنے کے علاوہ کوئی راہِ فرار نظر نہیں آتی۔ ویسے ملک میں کمپیوٹر کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے اور کچھ سالوں میں ان دانشور حضرات کی باتیں شاید کمپیوٹر کے ذریعے آسانی کے ساتھ سمجھنے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

(۲) سیاسی اور سماجی دانشور

جب ملک میں انتخابات کی تجارتی ہوائیں چلتی ہیں اس وقت ان دانشوروں کے دام آسمان سے محوِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سیاسی اور سماجی کام کرنے والوں کے گروہ میں دکھائی دینا پسند کرتے ہیں۔ بازار کی تیزی، مندی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہ ہر قسم کا لباس زیبِ تن کرتے ہیں۔ زود فہم اور موٹی کھال کے ہوتے ہیں۔ بات بے بات مسکراتے رہتے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہوجاتے ہیں اردو میں سوچتے ہیں اور انگریزی میں بولتے ہیں۔

نہایت خوش خوراک ہوتے ہیں۔ دوسروں کے سگریٹ اور پان نہایت رُعب سے پیتے اور کھاتے ہیں۔ سیاسی بازی گروں کے دستِ نگر رہتے ہیں گفتگو سیاسی اور سماجی موضوعات پر کرتے ہیں لیکن ان کا اپنا کمٹ منٹ اکثر ہواؤں میں رہتا ہے۔ ان دنوں ریڈیو پر کم اور ٹی۔وی اور اخبارات پہ چھائے رہتے ہیں۔ ان میں چند ایک ڈاکٹر کی ڈگری بھی رکھتے ہیں۔ ویسے ان کی تحریریں خشک، بدمزہ اور بور ہوتی ہیں اور اسی کو یہ اپنی معراج سمجھتے ہیں۔ ان کے اپنے سنڈیکیٹ ہیں۔ اپنی دانشوری کو اس کے یا اُس کے حق میں فروخت کرنے کو تجارتی آرٹ سمجھتے ہیں۔ ویسے سیاست دان اور سماجی کارکن انہیں اپنے قریب رکھنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

(۳) کامریڈ دانشور

پہلے انہیں سُرخ دانشور کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۲ء تک ہندوستان میں ان کا طوطی اور مینا دونوں بولتے تھے لیکن صد افسوس کہ یہ پُرانے بادہ خوار اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لیے کوئی تیار نظر نہیں آتا۔ ان دانشوروں کا بھی کیا زمانہ تھا جب انھوں نے کالج اور یونیورسٹیوں کے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں اور کارخانوں کے مزدوروں میں ایک طویل عرصہ تک اپنی مقبولیت کو برقرار رکھا اور نہایت فائدہ اُٹھایا۔

یہ ہمیشہ غصّہ میں نظر آتے ہیں۔ اونچی آواز میں بولتے ہیں اور حد سے زیادہ بولتے ہیں۔ دوسروں کو بولنے کا موقع دینا یہ کسرِ شان سمجھتے ہیں ان کی تحریریں بھی کافی غصیلی ہوتی ہیں۔

انہیں صاف ستھرے کپڑے پہننے سے رغبت نہیں ہوتی۔ اکثر لمبے بال اگائے رہتے ہیں جن میں کبھی تیل یا لوشن نہیں لگتا۔ بالوں میں ہاتھوں کی اُنگلیوں سے شانہ کرنے کو رومانٹک گردانتے ہیں۔

خود مفلوک الحال رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی مفلس اور کنگال بنانے پہ تلے رہتے ہیں۔

قلم کار [illegible]

عزیز و اقارب ان سے اپنا رشتہ داری بتاتے ہوئے شرماتے ہیں اور اکثر تو منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ ادب میں صرف مقصدی ادب کے قائل ہوتے ہیں۔ شاعری میں اپنی بیوی یا محبوبہ کو زندگی صرف محبت نہیں کچھ اور بھی ہے کہہ کر ناراض کرنے میں لطف اٹھاتے ہیں۔

ارباب حکومت کے حاشیہ بردار ہوتے ہیں لیکن ارباب حکومت کو لعن طعن کرنا فرض مارکسی سمجھتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے مدیران سے ان کی نہیں بنتی اس لیے نجی طور پر اپنے اخبار اور رسائل کا اجرا کرتے ہیں جن کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ ساون کے اندھے نہیں ہوتے اس لیے انہیں ہر چیز سرخ نظر آتی ہے۔

(۴) فنون لطیفہ دانشور

اس فنون لطیفہ کے میدان عمل میں جو دانشور حضرات ملتے ہیں وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے فراڈ سمجھے جاتے ہیں۔ آج کل ان کی دیکھ بھال، پرورش و پرداخت کی ذمہ داری حکومت نے اپنے نازک شانوں پر اٹھالی ہے کہ بیرون ملک جاکر یہ اپنے وطن کے فنون لطیفہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ یہ حضرات حکومت کی جانب سے کلچرل ڈیلی گیشنوں میں پیش پیش رہتے ہیں اور اپنے ملک کے فنون لطیفہ کو ایکسپورٹ کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

ان دانشوروں کی سب سے بڑی علمی قابلیت یا خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ حضرات بذات خود رقاص، گائک، سنگتراش، مصور، موسیقار یا شاعر نہیں ہوتے ہیں لیکن ان علوم پر اور فنون پر اپنے آپ کو اتھارٹی سمجھتے ہیں۔ یہ اتھارٹی انہیں کون دیتا ہے اس کا علم انہیں خود بھی نہیں ہے۔ ہندوستان کے ۹۹ فی صد لوگ ان کی کارستانیوں سے لاعلم رہتے ہیں اور اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ ان دانشوروں نے ٹی۔ وی کو اپنی اجارہ داری سمجھ کر ناظرین کو خودکشی کرنے کی حد تک بور کر دیا ہے۔

(۵) ریڈیائی اور دوردرشنی دانشور

دانشوروں کی یہ کھیپ نہایت تازہ کار ہے۔ پہلے یہ حضرات صرف ریڈیو کی حد تک محدود تھے لیکن جیسے جیسے ریڈیو کا چلن کم اور ٹی۔ وی کا چلن زیادہ شروع ہوا انھوں نے چھلانگ لگا کر خود کو ٹی۔ وی۔ اسٹیشنوں میں داخل کرلیا ہے۔ پہلے ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام پروڈیوسرس ان سے نالاں تھے اب ٹی۔ وی۔ پروڈیوسرس ان سے پریشان ہیں۔

یہ حضرات نہایت بیوٹی کانشس ہوتے ہیں۔ خود کو نوک پلک سے درست رکھنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ چند ایک نہایت ذمہ داری کے احساس تلے روزانہ بیوٹی پارلر بھی جاتے ہیں۔ شوخ رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔

یہ دانشور حضرات ہر موضوع پر گفتگو کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ عالموں سے کم اور فلمی اداکاروں سے زیادہ مرعوب رہتے ہیں۔ چبا چبا کر گفتگو کرتے ہیں اور نہایت اونچی آواز میں کھوکھلے قہقہے بلند کرتے ہیں۔

ان کی سب سے اعلیٰ خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ ہمیشہ اپنے موضوع سے ہٹ کر بولتے ہیں، دور از کار امثال اور محاوروں کو بات چیت میں شامل کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اپنے حریف کو یا ساتھی کو بولنے کا موقع کم دیتے ہیں جس سے ٹی۔ وی پر جنگ کا منظر پیدا ہوتا ہے۔

ان کی بات چیت کا انداز بناوٹی ہوتا ہے۔ امریکی لوگوں کی طرح بار بار شانے اچکانا، آنکھیں مٹکانا ہاتھوں کو اور انگلیوں کو کثرت سے انداز میں گھمانا ان کے فن کا ادنیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ اکثر صرف کھنکھارنے

کھنکھارنے میں اپنا وقت گزار دیتے ہیں۔ یہ جس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں اس کا لبِ لباب ٹی۔ وی کے ناظرین اور دیکھنے سننے والوں کی سمجھ سے ہمیشہ پرے ہوتا ہے اس لیے ان کے پروگرام نہایت کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ ان دنوں ان دانشوروں میں صحافی حضرات رسائل کے مدیران، کھیل کود کے میدان سے آئے ہوئے ناکام کھلاڑی زیادہ تعداد میں ہیں۔ آیندہ برسوں میں ان کی تعداد میں خطرناک حد تک افزائش ہونے کے امکانات ہیں کیوں کہ چینل بڑھتے جارہے ہیں۔

(۶) تنقیدی دانشور یہ دانشور حضرات دراصل ناکام عاشق، ناکام شاعر یا ناکام افسانہ، ناول نگار رہتے ہیں۔ نقاد اور مبصر بن کر دانشوروں کی صفوں میں ہٹ دھری سے گھستے چلے جارہے ہیں۔ یہ اپنا اُلو سیدھا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نقاد اور مبصر کبھی تخلیقی کرب سے گزرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں بھی یہ حضرات ہوتے تھے لیکن لُوڈی پوائنٹ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ بات خیال وخواب ہوگئی ہے۔ چار صفحوں کے افسانہ کی تنقید یہ پچاس صفحوں میں کرتے ہیں جس میں تنقید برائے نام ہاں خودستائی اور خودنمائشی زیادہ ہوتی ہے۔ ادیب اور شاعر بےچارے دم سادھے اپنی مٹی پلید ہوتے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اسی لیے ادیب اور شاعر ان سے خوفزدہ رہتے ہیں اور مُفت میں اپنی کتابیں انہیں بھیجتے ہیں۔ یہ حضرات گو پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن ان کے علم وتبحّر کا عوام کو فائدہ نہیں پہنچتا۔

مندرجہ بالا دانشوروں کی فہرست اور بھی طویل ہے لیکن اس کو آئیندہ کے لیے اٹھائے رکھنے میں عافیت ہے۔

(نوٹ):(گو یہ مضمون ادھورا ہے لیکن گمان غالب ہے کہ اس کو پڑھ کر کئی حضرات دل شکنی محسوس کریں گے۔۔ اس کی پوری ذمہ داری ادارۂ شگوفہ پر عائد ہوگی کہ اس نے اسے شائع کرنے کی جرأت کی ہے۔

۸۷

مرزا کھونچ (نیا ٹولہ، بیتیا)

★

"کچھ بدعنوانی کے حق میں"

جسے دیکھئے وہ بدعنوانی کے پیچھے لٹھ لے کر پڑا ہے اور اپنے آپ کو صاف ستھرا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو بدعنوانی پر فردِ جرم عاید کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ اگر بدعنوانی نہ رہے تو ایمانداری، وفاداری اور امانت داری کو کون پوچھے گا۔ بدعنوانی کی بدولت تو ان اوصافِ کہنہ کی پوچھ ہے۔ بدعنوانی کے خلاف عام طور سے دو ہی قسم کے لوگ آواز اٹھاتے ہیں۔ ایک وہ جو صاحبِ ایمان ہیں، دوسرے وہ جو برائے نام ایماندار ہیں۔ صاحبِ ایمان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز جیسی ہے۔ اس لیے ان کی باتوں پر خاص توجہ نہیں دی جاتی اور نہ ان کی باتوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ یہ صاحب ایمان اپنی ایمانداری کے زعم میں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ اگر انھیں روکا بھی جائے تو وہ نہیں رکیں گے کوئی اُن کے منہ میں زبردستی نوالہ تو نہیں ڈال سکتا۔ پکڑے رہیں ایمانداری کا دامن اور بھوکے مرتے رہیں۔ وہ ایماندار ہیں تو خود کیوں نہیں سوچتے کہ یہ ایمانداری اُن کے لیے کتنے مصائب و مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی مہیا نہیں کر سکتے۔ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم نہیں پا سکتے انہیں وقت پر قرض نہیں ملتا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک ایماندار شخص ہے پیسہ حاصل ہوتے ہی ادا کر دے گا پھر بھی اُسے کوئی قرض نہیں دیتا۔ پتہ نہیں اس کے پاس پیسہ کب ہوگا اوپری آمدنی بھی تو نہیں ہے چونکہ وہ رشوت نہیں لیتا اس لیے بڑے صاحب کو ان کا حصہ نہیں دے پاتا اس لیے صاحب الگ ناراض ہیں۔ چونکہ وہ صاحب کا نورِ نظر نہیں بن سکتا اسی لیے اُس پر تبادلے کی افتاد بھی زیادہ پڑتی ہے۔ دفتر کا چپراسی تک ان کی ایمانداری سے نالاں رہتا ہے۔ ایمانداری کا مطلب یہ ہونا چاہیئے کہ آپ پیسے لیکر آپ کا کام کر دیا جائے۔ جہیز کو بھی بدعنوانی کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ آجکل کوئی اپنے بیٹے کی شادی بنا جہیز کرنا چاہتا ہے تو سمجھتے ہیں ضرور لڑکے میں کوئی نقص ہے!

آج کی سیاست میں ایمانداری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایماندار رہ کر آپ اپنی پارٹی نہیں چلا سکتے۔ آپ ایمانداری دکھائیں گے تو انتخابات میں جیت بھی نہیں سکتے۔ کچھ نہ کچھ بدعنوانی تو کرنی ہوگی۔ ایمانداری دکھانے والے کو آج کل بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ اب آپ ہی کہیئے کہ ایسے لوگ جب بدعنوانی کے خلاف بولتے ہیں تو کیا اُن کی بات سنی جاتی ہے؟ اُن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی نہ گھر میں نہ باہر۔ بدعنوانی کے خلاف دوسرے بولنے والے وہ ہیں جنھیں حصہ نہیں ملتا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ خطرے ہم اٹھائیں، عاقبت خراب ہم کریں، پکڑے جائیں تو جیل ہم جائیں اور انہیں حصہ دیں۔

کیا یہ ممکن ہے۔ وہ ہماری کمائی دیکھ کر جلتے ہیں! اسی لیے وہ ہمارے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں۔ اے ہمارے خلاف بولنے والو ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ ہم کہاں غیر واجب بات کر رہے ہیں۔ آپ میں کچھ کمانے کی صلاحیت نہیں تو ہمیں کیوں روکتے ہیں۔ ہر کسی کو ترقی کرنے کا حق ہے۔ جب ہماری ترقی پوری طرح ہو جائے گی تو ملک خود بخود ترقی کر لے گا اگر ہم کچھ لے کر آپ کا کام کر دیتے ہیں تو ہم بے ایمان کیسے ہوئے۔ آپ کو تو ہمارا احسان ماننا چاہیئے۔ اُلٹے آپ ہم پر بدعنوانی کا الزام لگاتے ہیں۔ اگر ہم آپ کا سٹنڈر پاس کراتے ہیں تو آپ بھی کہاں پیچھے ہٹتے ہیں۔ دو نمبر کا مال استعمال کر کے ایک نمبر کا بل تھما دیتے ہیں۔ ہم بھی خوش آپ بھی خوش۔ ہم بیک ڈور سے آپ کے لڑکے کا داخلہ دلا دیتے ہیں تاکہ آپ کا لڑکا تعلیم حاصل کر کے خوب جہیز بٹورے اور اپنا مستقبل سنوار سکے۔ ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ ایمانداری کا سہارا لیتے تو آپ کے لڑکے کو نوکری نہیں ملتی۔ آپ کا نالائق لڑکا اسی بدعنوانی کے بل پر نوکری پا گیا۔ کیا یہ بدعنوانی کی کرم فرمائی نہیں ہے۔

اگر ہم بدعنوانی کے اصولوں کو نہ اپنائیں تو ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ آج کی سیاست صرف دو زبانیں سمجھتی ہے پیسے کی اور لاٹھی کی۔ لاٹھی کے لیے بھی پیسہ چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ پیسہ حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور اس کچھ نہ کچھ کو اگر آپ بدعنوانی کہہ لیں تو بھلا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہم غیر ملکوں سے سامان خریدتے ہیں اور سامان خریدتے میں کچھ ادھر اور کچھ اُدھر ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ تو خرید و فروخت کا دستور ہے۔ زیادہ سامان خریدنے پر دکاندار خریدار کو کچھ نہ کچھ چھوٹ دیتا ہے۔ ہم نے وہ چھوٹ اگر حاصل کر لی تو یہ ملک سے غداری کیسے ہوئی۔ اور آپ ہیں کہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں کہ یہ کمیشن کھا گیا۔ جب کمیشن بٹھانا غلط نہیں ہے تو کمیشن کھانا کیسے غلط ہے؟ ہم اپنی ذات والوں کی ترقی دیکھنا چاہتے ہیں غریبوں کو اُونچا اُٹھانا چاہتے ہیں اور اتنا اونچا اٹھانا چاہتے ہیں کہ وہ وہاں سے اپنی غریبی نہ دیکھ سکیں۔ جب ہمارے پاس ذرائع ہوں گے تبھی ہم ایسا کر سکیں گے۔ اور جب ہم ذرائع اکٹھا کرنے لگتے ہیں تو آپ ہم پر بدعنوانی کا الزام لگاتے ہیں۔ ہم بدعنوان ضرور ہیں مگر ہماری نیت خراب نہیں ہے بلکہ آپ کی نیت میں فتور ہے۔ ہمارا پیسہ دیکھ کر آپ کا ایمان بھی ڈول رہا ہے۔

ہم لوگ بھی اپنے وجود کی حفاظت کے لیے کمر کس رہے ہیں۔ ایک بدعنوانی بچاؤ کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے وہ دن دُور نہیں جب ہم پر آنکھیں دکھانے والے ہم سے آنکھیں چراتے پھریں گے۔ جو ہمارے خلاف بولے گا اس پر ہتک عزت کا دعویٰ ٹھوک دیں گے۔ آپ کو ہمارے ادارے میں شامل ہونا ہے تو آ جایئے، دروازہ کھلا ہے۔ ورنہ بعد میں جگہ بھر جانے پر آپ کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ جو ہمارے ادارے میں آئے گا ہم اُس کی ترقی کے ضامن اور معاون بنیں گے۔

بولو سب جیئے بدعنوانی

۸۷

غزلیں

شجاع الدین عاطف
(آسٹریلیا)

چال چلنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
یہ چرائی ہوئی سینڈل کبھی ایسی تو نہ تھی

اُن کے میک اپ نے خدا جانے کیا، کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

بن گیا ہوں میں بیوٹی پارلر میں نوکر ابھی
زندگی میں خوشی شامل کبھی ایسی تو نہ تھی

آج اُس نے مری ہوٹنگ نہیں کی تب ہی
تشنگی سی مجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

بجلی کے آلے سے وہ زُلف سُکھائے عاطف
جیسی اب، بجلی کی ہے بل کبھی ایسی تو نہ تھی

●

(روح غالبؔ سے معذرت کے ساتھ)

چور ناداں تجھے ہوا کیا ہے
جیب شاعر میں ڈھونڈتا کیا ہے

مال تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا بچا کیا ہے

وہ ہیں بیکار، بیوی افسر ہیں
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ ذائقہ کیا ہے

ہوگا پرہیز پھر کبھی عاطف
یہ کہو کہ تلا ہوا کیا ہے

●

میرے لب پر تری اُلفت کا بیاں آج بھی ہے
میرے سر پر تری سینڈل کا نشاں آج بھی ہے

ایک عرصہ ہوا جب چھوڑ دی سگرٹ میں نے
پھر بھی سینے سے میرے اُٹھتا دھواں آج بھی ہے

گرچہ وہ جا چکے ہیں اجنبی اک شخص کے ساتھ
ہم کو تو ان کی محبت کا گماں آج بھی ہے

کاش جمڑے کا وہ سکہ چلے اس دیش میں پھر
یہ زمیں ڈھونڈتی تعلق کا زماں آج بھی ہے

تپتے صحرا میں ہو جوں پیڑ کا سایہ عاطف
میرا سسرال میں چھوٹا سا مکاں آج بھی ہے

●

مرزا کھونچ بیتیا (بہار)

نہ تو ہوں سرکاری نوکر اور نہ ہوں میں لینڈ لارڈ
جی رہا ہوں ٹھاٹ سے کرتا ہوں میں چندہ کلکٹ

ہائے رے کیا چیز ہے یہ فارورڈ اور بیک وارڈ
ہر الیکشن میں اسی کے بل پہ ہوتا ہوں الیکٹ

آپ کو میں کیا بتاؤں، میرا فوکس دیکھ کر
کرلیا ہے اُن کی نظروں نے مجھے فوراً سلکٹ

پی رہا ہوں اس لیئے مرزا کہ غالبؔ کی طرح
میرے شعروں میں بھی کچھ ہونے لگے اس کا ایفکٹ

غزلیں

کوثر صدیقی
(بھوپال)

لکھ پتی ایسی کوئی ساس ملے — جس سے لاکھوں کا مصرف خاص ملے
جیل بھی "اے" کلاس ملتی تھی — ہم کو جنت بھی "اے" کلاس ملے
تیرے حمّام کی سیاست میں — سب کے سب لوگ بے لباس ملے
تیرے گلشن کی ہے فضا کیسی — منہ کو لٹکائے پھول اداس ملے
جیسے لوٹے ہوں گول بے پیندے — نیتا حضرات بے اساس ملے
یار جو خوش مزاج تھے بے حد — تیری محفل میں سب اُداس ملے
ہانپتے کانپتے پریشاں حال — شہر میں لوگ بدحواس ملے
تیرا دیدار روح افزا ہے — روح افزا کا اک گلاس ملے

گھر کرائے کا ڈھونڈتا ہوں مگر
آپ کے گھر کے آس پاس ملے

التمش شمس
(اکولوی)

●

تکیہ بھی ہے نرم ملائم اچھا سا ہے بستر بھی — تیری خلوت میں لیکن کچھ کھٹمل بھی ہیں مچھر بھی
اللہ حافظ قوم کا اپنی سوئی ہوئی ہے غفلت میں — بھٹکے ہوئے ہیں راہ سے اپنی آج ہمارے رہبر بھی
چھیڑا ہے پرسچ کہنے کا آخر یہ انجام ہوا — سمت ہماری آئے ہیں کچھ جوتے چپل پتھر بھی
شادی کی تقریب یہ کیسی یہ تو سرکس لگتی ہے — ناچ رہے باراتوں میں گھوڑے بھی اور بندر بھی

اُن کی گلی میں آج رقیبوں سے ٹکر ہے شمسؔ مری
ساتھ چلا ہوں لے کر اپنے برچھی، بھالا، خنجر بھی

سید اسد اللہ حسینی چکرؔ
کیلفورنیا (امریکہ)

●

کیا تم کو بتلاؤں میں یارو کس ڈھب سے بسر ہو جاتی ہے — "ویلفیر" سے کچھ مل جاتا ہے پنشن سے گزر ہو جاتی ہے
جب ہٹا کٹا تھا میں جواں تھا ہوش کہاں رکوع و سجود کہاں — اب سجدے کی خاطر جھکتا ہوں تو سیخ کمر ہو جاتی ہے
پہلے تھیں محبت کی باتیں اور کٹ گئیں آنکھوں میں راتیں — اب ان کے ہمارے جھگڑوں میں ہر شب کی سحر ہو جاتی ہے
وہ شوخ حسینہ بھی گویا تھالی میں لڑھکتا بیگن ہے — اِک پل میں ادھر ہو جاتی ہے، اک پل میں ادھر ہو جاتی ہے
وہ اپنی پری وش بیگم سے بھی بڑھ کے حسیں آتی ہے نظر — جو نکٹی چپٹی دوشیزہ منظورِ نظر ہو جاتی ہے

انگڑائی جب اُن کو آتی ہے اور زُلف پریشاں ہوتی ہے
یہ دیکھ کے چکرؔ تیری نظر کیوں زیر و زبر ہو جاتی ہے

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم (جگتیال)

آستین کے سانپ

جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تب اردو کے ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ "آستین کے سانپ" کو جملے میں استعمال کیجئے۔ ہم حیران ہوئے کہ آستین کے سانپ سے کیا مراد ہے؟ اور اس کا جملہ کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ ہم نے وضاحت چاہی تو صاحب نے ہنس کر کہا۔ سانپ صرف جنگل اور کھنڈرین ہی نہیں ہوتے بلکہ آستین میں بھی ہوتے ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ ہمارے جسم میں ایک جھرجھری سی آگئی گویا ہمارے پیروں پر سانپ رینگ گئے ہوں۔ ہم نے مزید استفسار کیا تو کہنے لگے "جب آدمی سانپ بن جاتا ہے تو وہ آستین کا سانپ کہلاتا ہے۔"

ہم نے پوچھا "اگر کوئی سانپ آدمی بن جائے تو؟" انہوں نے سانپ کی طرح پھنکار تے ہوئے کہا —

"سانپ بڑے خوددار ہوتے ہیں۔ اس قدر گری ہوئی حرکت نہیں کرتے۔"

بہرحال ہم گھر جاکر تمام قمیصوں کے آستینیں جھٹکتے رہے تاکہ کوئی سانپ ہو تو باہر نکل آئے۔ صبح سے شام تک گھر کے تمام افراد کے آستینوں کو جھٹک ڈالا۔ جس سے سوائے گرد اور دھول کے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ ویسے ہم نے بہت سے سانپ دیکھے ہیں لیکن کوئی سانپ آستین اوڑھے نہیں تھا۔ ہم نے سینکڑوں آستین دیکھے ہیں لیکن کسی سے بھی سانپ کو آتے جاتے نہیں دیکھا ہے۔

جنگل کے سانپ اور آستین کے سانپ میں کافی فرق ہوتا ہے۔ جنگل کے سانپ خود رو پودوں کی طرح اُگتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں اور بے گور و کفن ہی مر جاتے ہیں۔ آستین کے سانپوں کو پیدا کرنا پڑتا ہے۔ پال پوس کر بڑا کرنا پڑتا ہے اور اس کے خاتمے کے لیے بڑے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ جب کسی کو سانپ ڈستا ہے تو وہ فوری دارِ فانی کو کوچ کر جاتا ہے۔ گویا ایک ہی مرتبہ اور ہمیشہ کے لیے مرتا ہے۔ لیکن آستین کا سانپ اگر ڈس لے تو آدمی ایک مرتبہ نہیں مرتا بلکہ لمحہ لمحہ مرتا ہے اور مر مر کر زندہ رہتا ہے حالاں کہ آستین کے سانپ سادہ آنکھ سے نظر نہیں آتے اور نہ ہی آنکھیں ٹیڑھی کرنے سے دِکھائی دیتے ہیں یہ خوردبین سے دیدار نہیں کرواتے اور نہ ہی دوربین کی زد میں آتے ہیں۔ سائنس دانوں نے دن رات محنت کرکے "راڈار" ایجاد کیا تاکہ دشمن [illegible] ان سے دوستی کرکے دشمن کا خاتمہ بالخیر کیا جا سکے۔ مگر

راڈار بھی ان سانپوں کی جلوہ نمائی سے قاصر ہے۔
آستین کے سانپ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتے۔ یہ اُن کی میراث ہیں جن کا جیب میں دنیا ہوتی ہے۔ سوٹ بوٹ کے حامل افراد کے یہاں آستین کے سانپوں کی روایت کافی مستحکم اور پائیدار ہوتی ہے۔ غریبوں کو آستین ہی نصیب نہیں ہے تو بھلا سانپوں کی دولت سے مالامال کیسے ہو سکتے ہیں آدمی جتنا دولت مند اور مشہور ہوگا اتنے ہی سانپ اس کے آستین میں پناہ لیں گے۔ چونکہ سیاسی لیڈر نہ صرف دولت مند اور مشہور ہوتے ہیں بلکہ اپنا حلقہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے وہ لاشعوری طور پر بڑے شوق سے ان سانپوں کی پرورش کرتے ہیں ان کے ناز اٹھاتے ہیں، ان کی ہر ناجائز خواہش پوری کرتے ہیں تاکہ وہ وقتِ ضرورت کام آسکیں۔ بڑی نادانی تو یہ ہے کہ آستین کے مالک ان سانپوں کو سانپ نہیں مانتے۔ یہ بھرم تو اس وقت ٹوٹتا ہے جب وہ انھیں ڈستے ہیں اور ذہنی، جسمانی، اور معاشی طور پر کنگال کر دیتے ہیں۔
یہ مشہور ہے کہ سانپ کسی کے وفادار نہیں ہوتے۔ زندگی بھر انہیں دودھ پلایا جائے تب بھی وہ کسی نہ کسی دن اپنے مالک، کو ہی کاٹ کھاتے ہیں ہماری بات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم سیاسی لیڈروں کو سانپ سے تشبیہہ دے رہے ہیں۔ کیوں کہ سانپ ایسی ذلت برداشت نہیں کرتے۔
یہ بات تو طے ہے کہ آستین کے سانپ اسی وقت ہی ظاہر ہوتے ہیں جب وہ ڈستے ہیں اس سے پہلے ہر کوئی انہیں اپنا عزیز، دوست اور یار سمجھنے لگتا ہے ویسے ان سانپوں کے ہاں رشتہ داریوں کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ باپ بیٹے کا، خسر داماد کا اور دوست دوست کا آستین کا سانپ بنا پھرتا ہے اور ایک دوسرے کو چکمہ دینے کی کامیاب کوشش کرتا ہے یہ سانپ کبھی متحد نہیں ہوتے ان کا کوئی منشور نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی نیشنل ایجنڈہ وہ مل بیٹھ کر ترتیب دیتے ہیں۔ بلکہ اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ من مانی کرتے ہیں اور کسی بھی اعتراض پر بڑی پھرتی سے ایک آستین سے دوسری آستین میں چھلانگ لگاتے ہیں اور بحران پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ خود چونکہ چھپے رہتے ہیں اس لیے ان کا ایجنڈہ بھی HIDDEN ہوتا ہے۔
بہت سے لوگ ان سانپوں سے ڈرنے لگے ہیں۔ کچھ لوگ بغیر آستین کی قمیص پہنتے ہیں تاکہ سانپوں سے محفوظ رہ سکیں۔ کچھ افراد اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے موقع بے موقع اپنے ہاتھ جھٹکتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی سانپ آستین میں چھپا ہو تو باہر نکل جائے۔ ان ہی سانپوں سے بچنے کے لیے مہاتما گاندھی نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کی طرح قمیص چھوڑ دو تحریک کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری! آپ بھی اپنا جائزہ لیجئے کہ کہیں آپ کی آستین میں بھی کوئی سانپ تو چھپا ہوا نہیں ہے؟ یا پھر کہیں آپ خود ہی کسی کی آستین کے ....؟

قلمی معاونین صفحہ کے ایک جانب صاف اور خوش خط لکھیں تخلیقات پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں۔

رشید عارف (پٹنہ) *

شاعر

شاعر اسے کہتے ہیں جو موزوں ناموزوں شعر کہے۔ موزوں شعر وہ ہوتا ہے جو کسی بحر کی قید میں ہوتا ہے ناموزوں شعر وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ نثری اور آزاد شاعری کی جاتی ہے۔ شاعر کی یوں تو کئی قسمیں ہیں لیکن قدرتی ساخت کے اعتبار سے شاعر کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ایک فطری دوسرا غیر فطری۔ فطری شاعر وہ ہوتا ہے جس کے خون میں پیدائش کے وقت ہی قوت شعر گوئی بخشنے والے جراثیم کلبلانے لگتے ہیں۔ انتہائی فطری شاعر ۷، ۸ سال کی ہی عمر سے شعر اگلنے لگتا ہے۔ غیر فطری شاعر اسے کہتے ہیں جو دوسرے کا کلام اپنے نام سے پڑھتا یا چھپواتا ہے۔

فطری اور غیر فطری شعراء دو خیموں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا ایک قبیلہ مشاعرے کا شاعر کہلاتا ہے تو دوسرا اخبارات و رسائل کا شاعر۔ ان میں بطور استثنیٰ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی دونوں طرف مقبول ہوتے ہیں۔ ایسے شاعر کو زیادہ ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔

اخبارات و رسائل میں چھپنے والے شاعر کی حالت قابل افسوس ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس غریب کو مختلف جگہ چھپنے کے لیے زیادہ سے زیادہ نظمیں یا غزلیں کہنی پڑتی ہیں۔ عمر عزیز کا بیشتر حصہ شعر گوئی ہی میں ضائع ہو جاتا ہے۔ (یہ بات الگ کہ کبھی کبھی ایک ہی کلام کئی جگہ چھپوا دیا جاتا ہے۔) چھپنے والے شعراء میں ان کی تعداد زیادہ ہے جن کا کلام یا تو مدیر حضرات ہضم کر جاتے ہیں یا لوٹا دیتے ہیں۔ (عام طور پر مدیران بڑا نام دیکھتے ہیں کلام نہیں دیکھا کرتے)۔ ایسی صورت میں شاعر کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود شعراء کی تعداد دن دگنی رات چوگنی ترقی پر ہے۔ مدیر کی خوشامد کرنے، سفارش کا سہارا لینے یا سالانہ خریدار بن جانے کے بعد کلام شائع بھی ہوتا ہے تو بیشتر مدیر کلام کا معاوضہ نہیں دیتے۔ ایک رسالہ ہی بھیج دیں تو ان کا کرم ان کی مہربانی۔ کہیں کہیں سے معاوضہ ملتا بھی ہے تو محض چند روپے اور بس مگر ان کی وصولیابی اتنی تاخیر سے ہوتی ہے کہ روپے کی قیمت گھٹ کر نصف رہ جاتی ہے۔

اب سنیئے مشاعرہ مار یا مشاعرہ باز شاعر کا حال۔ مشاعرہ مار شاعروں میں متشاعروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ جو صرف اپنی خوش گلوئی کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور جس استاد کا یہ کلام پیش کرتے ہیں اسے مقررہ کمیشن ادا کر دیتے

رہیں ۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اکثر استاد کا حق مار جاتے ہیں۔ مشاعرے کا شاعر کلام کی تخلیق کے سلسلے میں کفایت شعار واقع ہوتا ہے کیوں کہ ایک ہی غزل کئی برسوں تک کئی مشاعروں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ صرف ایک ہی غزل سے اچھی خاصی کمائی ہوجایا کرتی ہے۔ مشاعرے میں پڑھنے والے شعراء کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی گا کر پڑھتا ہے تو کوئی رو کر۔ کوئی گرج گرج کر پڑھتا ہے تو کوئی لرز کر۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کلام تو پھیکا ہوتا ہے مگر اپنی مخصوص اداؤں سے، اپنی تقریروں سے سامعین کو داد دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بہاری شعراء میں عموماً یہ خوبی نہیں پائی جاتی۔

شاگرد شاعروں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں، کچھ شاگرد باصلاحیت ہوتے ہیں کچھ کم صلاحیت والے، کچھ بالکل بے صلاحیت اور کورے۔ بے صلاحیت شاگرد استاد کی زیادہ خدمت کرتے ہیں لہٰذا ان پر استاد کی نظر کرم زیادہ ہوتی ہے۔ جب استاد انہیں زیادہ عمدہ کلام عطا کردیتا ہے تو اس ادبی بے ایمانی سے باصلاحیت شاگرد کبیدہ خاطر ہوتے ہیں ۔۔۔ کچھ باصلاحیت شاگرد اپنے استادِ محترم کا نام صیغۂ راز ہی میں رکھنا پسند کرتے ہیں ۔۔۔ کچھ ہوشیار شاگرد استاد کی بیاض ہی لے اڑتے ہیں تاکہ استاد کے بعد کسی کا محتاج نہ رہنا پڑے۔

کبھی کبھی استاد کی ذرا سی غلطی سے بے صلاحیت شاگرد بھری محفل میں رسوا ہو جاتا ہے۔ ایک بار استاد نے "نوکِ سناں" لکھا مگر غلطی سے "ن" پر نقطے ڈال دیئے۔ کورے شاگرد نے ٹوکے جانے کے باوجود "ٹوکِ ستاں" کی رٹ لگادی۔ اسی طرح ایک بار استاد نے لفظ "رطب اللساں" کا استعمال کیا مگر حرف "ر" "ط" سے لغل گیر ہوگیا۔ قابل شاگرد نے ایک آل انڈیا مشاعرے میں اس لفظ کو "لُطبُ اللساں" پڑھا۔ دوسرے شاعر نے طنزاً کہا "واہ وا" "لُطبُ اللساں" کا جواب نہیں پھر پڑھیئے یہ مصرع۔ اور کورے شاعر نے بار بار "لُطبُ اللساں" ہی پڑھا۔ وہ شاعر تا حال آج بھی مشاعرے کا ایک مشہور و مقبول شاعر مانا جاتا ہے۔

ناانصافی ہوگی اگر شاعرات کا ذکر نہ کیا جائے، شاعرات کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں شاعرات میں بطور خاص قابل ذکر وہ شاعرات ہیں جو محفل مشاعرہ کی زینت بنتی ہیں۔ ان شاعرات میں ان کی تعداد زیادہ ہے جنھیں تخلیق کلام کی زحمت خود نہیں اٹھانی پڑتی۔ اس سلسلے میں تو یہ تخلیقی کرب سے محفوظ رہتی ہیں۔ اسٹیج پر جانے سے قبل ان کا سارا وقت اپنے بناؤ سنگھار ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔ لوگ انہیں سنتے کم اور دیکھتے زیادہ ہیں۔ کلام خواہ جیسا بھی ہو سامعین انہیں اپنی پوری قوت سے داد دیا کرتے ہیں۔

حبیب احمد انجم دتیاوی
(مدھیہ پردیش)

راج نیتی گائن

اپنے ہی پاپ پُن کے سانچے میں ڈھال کے
حربے دکھا کے اپنی سیاست کی چال کے
ہنسا کی دھول آنکھ میں لوگوں کی ڈال کے
جنجال سے میں لائی ہوں اس کو نکال کے
کرسی مری رکھو مرے چمچو سنبھال کے

داسوں کو اپنے دیتی رہوں گی سدا اماں
دُربھاگ سے پھنسے بھی کبھی کوئی ناگہاں
مجرم بنے تو چھوٹ گئے بن کے سورماں
میرے یہ دیش بھگت ہیں کیسے کمال کے
کرسی مری رکھو مرے چمچو سنبھال کے

جنتا کی بھوک پیاس کی چنتا میں کیوں کروں
روپیہ کماؤں عیش کروں اپنا گھر بھروں
قانون میرا داس ہے پھر کس لئے ڈروں
کرلے گا کوئی کیا مرا کیچڑ اچھال کے
کرسی مری رکھو مرے چمچو سنبھال کے

گاندھی جی آپ ست و اہنسا کے دوت تھے
ان کو گلے لگایا جو پہلے اچھوت تھے
دراصل آپ ہند کے اعلیٰ سپوت تھے
میں یہ کہوں کہ آپ تھے اُلٹے خیال کے
کرسی مری رکھو مرے چمچو سنبھال کے

میری بَلا سے بڑھتی ہے مہنگائی تو بڑھے
بیروزگار لوگوں کا غم کوئی کیوں کرے
رشوت کے ہاتھ لٹتی ہے جنتا یہاں لٹے
لوگوں کو بھول جاتی ہوں مطلب نکال کے
کرسی مری رکھو مرے چمچو سنبھال کے

اپنے وطن پہ کر دیا قربان جان و مال
بھارت کے وہ شہید تھے دنیا میں بے مثال
وہ گورے لوگ کر گئے ہم کو پائمال
اب بھینٹ چڑھ چکا ہے سیاست کی چال کے
رکھے گا کون دیکھئے اس کو سنبھال کے

★

غزل

فیض الرحمٰن فیض

(حضرت ناظم انصاری کی رُوح سے معذرت کے ساتھ)

شعر اوروں کے چراتے ہو یہ کیا کرتے ہو
بھری محفل میں سناتے ہو یہ کیا کرتے ہو

تم تو بیزار زمانے سے الگ بیٹھے ہیا
وقت بے وقت بلاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

شہر میں صرف پڑھاتے ہو جنازے کی نماز
حق امامت کا جتاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

ہم کو منظور نہیں چمچہ منسٹر کا بنیں
ہم کو کیوں پٹی پڑھاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

کس ڈھٹائی سے وہ کہتے ہیں مصرعے اقبال
بات بے پر کی اڑاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

تان چھیڑی ہے دھبی نہ پہنچ جائے کہیں
راگ دیپک جو گاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

تم تو میخوار نہیں بیٹھے ہو میخواروں میں
بے پیئے دھوم مچاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

غیر کے مال پہ دیدے نہ کرو لال اسے
مفت آئے تو لٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

ہو پٹائی نہ کہیں بیچ سڑک پر اک دن
آنکھ ہر اک سے ملاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

اپنے عاشق کا نہیں کچھ بھی تمہیں پاس و لحاظ
اپنی نظروں سے گراتے ہو یہ کیا کرتے ہو

مشک اور عشق چھپائے سے نہیں چھپ سکتے
خواہ مخواہ اس کو چھپاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

آنکھیں ملتے ہی گری تھی میرے دل پر بجلی
دانت ہونٹوں میں دباتے ہو یہ کیا کرتے ہو

دل میرا زلفِ گرہ گیر میں قیدی جو بنا
کنگھی کر کر کے چھڑاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

باہمی عشق و محبت کے رموزِ پنہاں
آہ! اوروں کو سناتے ہو یہ کیا کرتے ہو

ڈھیل دیکر بھی اٹھانا نہیں آتا تم کو
کیوں پتنگ اپنی کھپاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

ہے خجالت سے نظر آپ کی نیچی نیچی!
راز کیوں اپنا چھپاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

عرق آلودہ جبیں آپ کی غماز بنی
اور آنکھیں بھی چراتے ہو یہ کیا کرتے ہو

محفلِ شعر میں ہڑبونگ مچی ہے کیسی
فیض کو لا کے کھپاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

○

اسرار جامعی

پرانی چیزیں

سب پرانی چیزیں سستی ہو رہی ہیں جامعی
حد تو یہ ہے گاندھی جی بھی اور سستے ہو گئے
پانچ سو کی تھی ان کی قیمت کچھ دنوں پہلے مگر
دس روپے کے نوٹ ہی میں آج وہ بکنے لگے

ہندی زبان

ہندی زبان ملک کی قومی زبان ہے
گنگا کا حسن اس میں ہمالہ کی شان ہے
انگلش مگر یہ کہتی ہے کہ اس کے باوجود
میرا غلام آج بھی ہندوستان ہے

صفیہ شاہین (حیدرآباد)

سستا سونا مہنگی پیاز

جیسے ہی یہ خبر آئی کہ سونا سستا ہو گیا ہے ہم نے جلدی جلدی بچت کی ہوئی پونجی اکٹھا کی اور تو اور آٹا چاول کے لیے رکھے پیسوں کو تک نہ چھوڑا اور چل پڑے سونے اور زیورات کے شوروم کی طرف۔ ارادہ تھا کہ سونے کے قیمتی زیورات کوڑیوں کے مول خرید لائیں گے مگر راستے میں پیاز کی بنڈیوں کے اطراف جم غفیر کو دیکھ کر ہمارا ماتھا ٹھنکا پوچھنے پر پتہ چلا کہ پیاز کس قدر سستی فروخت ہو رہا ہے۔ گو کہ شہر میں عام طور پر مہنگے داموں بک رہی ہے۔ پتہ نہیں کچھ دنوں بعد نظر بھی آئے کہ نہیں۔ یہ سن کر ہم ٹھٹھک کر ہو رکے تو رک ہی گئے۔ ایسے لگا کہ کوئی زرین موقعہ ہمارے ہاتھ آگیا ہو مالدار بننے کی کنجی ہمارے ہاتھ لگ گئی ہو۔ ہم نے دیکھا تھا کہ کئی جمع خور ذخیرہ اندوز ایسے ہی موقعوں کا فائدہ اٹھا کر راتوں رات مالدار بن چکے ہیں۔ ہم کیوں بھلا پیچھے رہیں آخر کو۔ رسم دنیا بھی ہے دستور بھی اور موقعہ بھی کیوں نہ مٹھی میں دبے ان پیسوں سے پیاز کے انبار لگا لیں گودام خرید لیں اور سونا خریدنا ملتوی کر دیں۔ تصور میں ابھی ابھی زیورات کی دکان تھی۔ ہم تھے آئینہ تھا مگر وہ چمک دمک اچانک کھن کھنا کھن سکوں کی گونج میں بدلنے لگی۔ اگر ہماری نانی اماں دادی اماں نے بچپن میں ہمیں شیخ چلی کی کہانی نہ سنائی ہوتی تو واقعی ہم بھاؤ تول کرنے میدان میں اتر ہی جاتے مگر ہمارا دل، دماغ بہت سی باتوں میں پرانی نصیحتوں سے ناطہ جوڑ لیتا ہے اور ہمیں کوئی بھی قدم بے خطر اٹھانے نہیں دیتا اسی لیے تو پیاز کے گودام کے ساتھ ہی ہمیں اپنا باورچی خانہ یاد آگیا جہاں لاپرواہی سے رکھی باسکٹ کی پیاز ہمیں بلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہاں بھی تو ایک ایک پیاز سونے کا بسکٹ ہے سونے کی اینٹ ہے اور اچانک ہی ہمیں اس سرمایہ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ کل ہی تو ہماری پڑوسن ہم سے ایک کیلو پیاز مانگ کر لے گئی تھی کہیں وہ ہماری غیر موجودگی میں تمام کی تمام پیاز تمام نہ کر دے اس خیال کے ساتھ ہی مالدار بننے کی ذہنی تدبیریں آنچ پانے سے پہلے ہی کہیں غوطہ لگا گئیں۔ پیاز کے گودام ذہن سے محو ہو گئے اور ہم اپنا فرض اولین ادا کرنے یعنی اپنی پیاز کی جو باورچی خانے میں رکھی تھی، حفاظت کرنے گھر واپس ہو گئے۔ گھر پہنچ کر دیکھا تو پیاز باسکٹ میں قابل رحم حد تک گھٹ چکی تھی قبل اس کے کہ ہم پڑوسن کو الزام دیں ہماری یادداشت نے ہماری رہنمائی کی اور ہمیں یاد آیا کہ ہم نے تو دو پیاز ا تیار کیا تھا بازار جانے سے پہلے ہم نے سب

پہلے یہ کام کیا کہ دو پیازے کو اُٹھا کر فریج میں رکھ دیا تاکہ بطور "ہالی ڈے ڈش" کام آئے! ابھی ہم نے پیاز کے پس انداز کرنے کے طریقوں پر نظر ڈالنی شروع ہی کی تھی کہ ہمارے پڑوسی ڈاکٹر صاحب کا بچہ آیا اور کہنے لگا آنٹی ایک پیاز دیجئے۔ ہمارے پاپا کہتے ہیں کہ اُن کے مریض مہنگی دواؤں سے بہت مرعوب ہوتے ہیں اور پیاز جو ایک زخموں کو مندمل کرنے والی گھریلو دوائی تھی اب راتوں رات نایاب دوائی بن گئی ہے جو ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔ اب ایسی نفسیات کو کیا کیجئے ہمارے ہندوستانی مریضوں کو دور دراز کے ڈاکٹروں سے اور بھاری قیمت والی دوائیوں سے فائدہ ہوتا ہے۔ بہر کیف ایک پیاز اگر پڑوسی ڈاکٹر مانگے تو ہم کیسے انکار کردیں۔ اس ایک پیاز کو ہم نے پچھلے دس سال اور آنے والے پانچ سالوں کی پورے کے پورے خاندان کے میڈیکل چیک اپ کی فیس سمجھ کر حوالے کردی۔ ابھی ہم اس پیاز کا غم بھولے بھی نہیں تھے کہ اگلے فلیٹ سے کوئی بچہ آکر کہنے لگا۔ آنٹی پچھلے سال جب آپ مئی کی دھوپ میں گھر سے باہر نکل رہی تھیں تب ہماری امی نے آپ کے پرس میں ایک پیاز کی ڈلی ڈال دی تھی اگر وہ سوکھ بھی گئی ہو تو براہِ کرم واپس کردیں۔ ہم نے جل کر سوچا نہیں سوکھی کہاں ہم نے تو اس سوکھی پیاز کے بیجوں سے چھت پر پوری بلڈنگ والوں کے لیے پیاز کا باغ تیار کردیا تھا۔ بہر حال پڑوسیوں سے دوستی قائم اور برقرار رکھنا ہمارا زرّین اصول رہا ہے اس لیے ایک سوکھی سی پیاز کی ڈلی شکریہ کے ساتھ واپس کردی سوکھی پیاز کی تلاش کے دَوران ہمیں ایسی پیاز بھی ملی جو سڑنے لگی تھیں ہم نے انھیں نکالا۔ لان میں لگے خوبصورت پودوں پھولوں کو گملے سے نکال باہر کیا اور پیاز کی ڈلیوں کو مٹی میں دبا دیا تاکہ ان سے ہری ہری پتیاں نکل آئیں جو ہرے ہرے نوٹوں کی طرح ہمارے دل کی ہریالی بھی لہلہادیں۔

حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینے پھر ہم نے خبریں سُنیں تو پتہ چلا کہ پیاز جو اب دُرِ نایاب کی طرح ہے کچھ دنوں بعد پھر سستی ہو گی مگر ایک لمبے عرصے تک اپنی پیاز کی رکھوالی کرنا ہمارے لیے ضروری تھا اس لیے ایک جالی دار محفوظ جگہ پیاز کو رکھ کر ہم نے تالا ڈالا تاکہ یہ دل کو لبھاتی پڑوسیوں کو جلاتی ہوا کھاتی رہے اور اسکی سانسوں سے ہماری سانسیں بھی محفوظ و سلامت رہیں۔ جب یہ سارے انتظام ہو چکے تو ہم نے سوچنا شروع کیا کہ اگر پیاز سستی ہو جائیگی تو سونا بھی تو پھر سے مہنگا ہو سکتا ہے کہیں یہ ہماری دسترس سے باہر نہ ہو جائے سونا ہم پھر سے اپنی طرف کھینچنے لگا اور آخر کار ہم نے سونا خرید ہی ڈالا۔ ایک بہترین سٹ اپنی دانست میں خرید کر گھر والوں سے داد لینے اُنکے سامنے رکھا۔ وہ پوچھنے لگے کہ آپ سونا لینے گئی تھیں یا پیاز۔ کان کے بندے گول گول دھاریوں والے یوں لگیں گے جیسے آپ نے گلابی پیاز کے بجائے سُنہری پیاز ہی کانوں میں پہن لی ہوں۔ واقعی بھوکے انسان کو چاند بھی روٹی کیطرح لگتا ہے اور ہم بھی پیاز کے فراق میں نکلے تھے اور سونا بھی پیاز کے مشابہ خریدا۔ ہم اپنے فلسفیانہ خیالات میں اتنے گم تھے کہ کھانے کا وقت ہو چکا ہے پتہ ہی نہیں چلا بچوں نے بھوک بھوک کا شور مچایا تب بھی ہم فلسفیانہ خیالات سے نہ جاگے تو بچوں نے مرغ کی بانگ والی الارم گھڑی لاکر کانوں سے لگا دی ہم جاگ اُٹھے۔ ہم تو خیالی پلاؤ پکا رہے تھے۔ کھانا کہاں پکا تھا ہم نے سوچا چلو آج ابھی ہمارے بچوں کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھا لیں بچے پاپا کو تو آنے دو۔ احتیاطاً اپنے پرس کا بھی جائزہ لیا۔ یہاں تو کچھ بھی نہ تھا ۴ آنے ۲۸ نئے کا حلیہ تک تو ہم اُٹھالے گئے تھے ہمارے صاحب کے آنے میں دیر ہو رہی تھی بالآخر ہم نے باورچی خانہ کا رُخ کیا۔ دیکھا تو چاول کا ٹن خالی۔ آٹا ندارد بچوں نے پھر ککڑوں کوں کا الارم بجایا اور اس مرتبہ کوئی مرغ ہمارے بچپن میں پڑھی ہوئی کہانیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا گویا حال میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی مرغ تھا جو مٹی میں دانہ تلاش کر رہا تھا اور جس کو سونے کا موتی ملا۔ بھلا وہ موتی کس کام کا ــــ ؟ جو پیٹ کی آگ نہ بجھا سکے ـــــ!

نریندر کوہلی (پٹنہ)
ترجمہ: عطا عابدی

دُور بینی

ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ میری بیوی کی دُور کی نظر بالکل درست تھی، لیکن نزدیک کی نظر کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے دلاسہ دینے کے لہجے میں بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ عموماً چالیس پار کرتے کرتے تمام لوگوں کی نزدیک کی نظر میں کچھ نقص آجاتا ہے اور ان سب کو پڑھنے اور سینے پرونے کے لیے عینک لگانی پڑتی ہے۔

لیکن میں اس اطلاع سے ذرا بھی فکرمند نہ تھا۔ میں تو علمی استفادہ کے عجیب لُطف سے سرشار تھا۔ ڈاکٹر کی اسی اطلاع نے میری زندگی کی کئی چھوٹی بڑی اُلجھنیں سُلجھادی تھیں، میرے مختلف مسائل کا حل نکل آیا تھا، اور اپنے ہی نہیں، اپنے کئی پڑوسیوں تک کی خانگی زندگی کا خاکہ میرے سامنے واضح ہو گیا تھا۔

اب میں سمجھا کہ میری بیوی کو مجھ میں وہ ساری خصوصیات کیوں دکھائی نہیں دیتی تھیں، جو میری پڑوسنوں کو دکھائی دیتی تھیں، میں اس کے اِتنے قریب جو تھا . . . میں اپنی بیوی یا اپنی کسی بھی شناسا خاتون پر شوہر کی وفادار نہ ہونے کا الزام نہیں لگا رہا ایسا کچھ نہیں ہے۔ سبھی ہندوستانی بیویاں شوہر کی مکمل وفادار ہیں، وہ اپنے شوہروں سے محبت بھی بہت کرتی ہیں، لیکن انہیں یہ احساس ہمیشہ رہتا ہے کہ ان کے شوہر ذرا بدّھو (بے وقوف) ہیں۔ آس پاس کے تمام شناسا مردوں میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔ وہ چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں، لیکن اپنا شوہر پورا بدّھو ہی نظر آتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کا جواب تو آج ہی آنکھوں کے ڈاکٹر کی اطلاع سے مِلا۔ اپنا شوہر ان کے نزدیک جو رہتا ہے . . . .

میں نے اپنی زندگی کے کئی سال اسی ادھیڑبن میں گزار دیئے تھے کہ اگر میری بیوی کو مجھ میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی، تو اس نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟ اس مسئلہ کا حل بھی آج ہی مِلا۔ اُس وقت اس کی عمر ۴۰ سے کم جو تھی۔ اُس وقت اُس کی نزدیک کی نظر ٹھیک ٹھیک دیکھ سکتی تھی۔ نتیجتاً میں جیسے جیسے اس کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا گیا تھا، ویسے ویسے پیارا سے پیارا ہوتا گیا تھا . . . حادثہ تو اس وقت ہوا، جب وہ چالیس پار کر گئی۔

چالیس پار کرتے کرتے عورتوں کے کردار میں نقص نہیں آتا، نقص تو صرف نزدیک کی نظر میں آجاتا ہے۔

کل تک جو شوہر انھیں بڑا سجیلا جوان دکھائی دیتا تھا، اب وہ کاہل بوڑھا دکھائی دینے لگا ہے۔ اس کی بہادری جھگڑالو پن لگنے لگتی ہے۔ اس کی سمجھ داری اس کی انا میں بدل جاتی ہے، اس کا چست دُرست نظام گھر میں تانا شاہی کا نام پانے لگتا ہے۔ کل تک جس شوہر سے انھیں پیار بھری شکایت تھی کہ وہ ان کا خیال رکھتے ہیں کہ آزاد طور سے کچھ کرنے ہی نہیں دیتے، چالیس پار کرتے کرتے گلی محلے میں چرچا ہونے لگتا ہے کہ شوہر کو ان کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اچانک پڑوس کے مردوں میں کئی خوبیاں جھلکنے لگتی ہیں۔ ناگہانی طور سے کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ سارے شناسا مرد مہذب اور متین دکھائی دینے لگتے ہیں، بس اپنا شوہر ہی ہر لمحہ لڑتا جھگڑتا، جھنجھلایا اور کھسیایا سا لگتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اپنی جمہوریت بھی اب چالیس پار کر چکی ہے۔ اسے بھی یہ تو دکھائی دے رہا ہے کہ فلسطین اور یوگوسلاویا میں کیا ہونا چاہیے، لیکن پنجاب، کشمیر اور آسام میں کیا ہونا چاہیے، یہ دیکھنے کی تو اب عمر ہی نہیں رہی۔ وہ سری لنکا میں تو ایل ٹی ٹی ای سے لڑ سکتا ہے لیکن اپنے ملک کے دہشت پسند اس کی نظر میں واضح نہیں ہیں۔

آنکھوں کے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ نزدیک کی نظر کی عینک لگا لینے سے میری بیوی کو نزدیک کی چیزیں بھی ٹھیک ٹھاک دکھائی دینے لگیں گی۔ وہ پڑھنے اور سینے پرونے لگے گی۔ ۔ ۔ لیکن یہ کون بتائے گا کہ وہ کون سی عینک ہے، جسے لگا کر میرے ملک کی جمہوریت خود اپنے ہی مسائل کو ٹھیک ٹھاک دیکھ سکے گی ؟! ▼▲

شمشیر بھاٹیے
انگریزی سے ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علیخاں

عائلی زندگی کے لوازمات

"کیا تم عورت ذات کو سمجھ سکتے ہو"؟ میرے ایک دوست نے جن کی شادی ابھی ابھی ہوئی تھی۔ اپنے چہرے پر عجیب سی بے بسی لیے مجھ سے پوچھا۔ اس لیے نہیں کہ میں ایسے پیچیدہ مسائل حل کرنے میں ماہر ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ شادی شدہ لوگوں میں میں ان سے ذرا سینیئر ہوں۔ ان کے سوال کے جواب میں جب میں نے اپنا منہ لٹکا کر انھیں نفی میں جواب دیا تو وہ بوجھل قدموں سے اُٹھے اور دوسرے ایسے شخص کی تلاش میں نکل پڑے جو ان کے ذہن پر چھائی ہوئی دُھند کو اس طرح پونچھ ڈالے جیسے کہ موٹر کار کا وائپر اس کے ونڈ اسکرین کو صاف کرتا ہے مگر ان کے اس سوال نے مجھے ایک بیکار سی اُلجھن سے دوچار کردیا۔ اب بار بار میں یہ سوچنے لگا کہ کیا میں اپنی شریمتی جی کو اچھی طرح سے جان اور پہچان سکا ہوں؟

مثال کے طور پر مجھے وہ دن یاد آیا جب میں نے اپنی نصف بہتر سے کہا تھا۔ "آپ آج تو باغ و بہار سی لگ رہی ہیں"! یہ سنتے ہی اُن کے چہرے پر شفق کی سی سُرخی کھل اٹھی تھی۔ ایسے ہی دوسری بار جب وہ گم صم کچھ اُداس سی بیٹھی تھیں۔ میں نے اُن سے کہا۔ "آج آپ اگنی دیوی جیسی لگ رہی ہیں"! تو انھوں نے جن تیر و تفنگ والی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ آج تک وہ نظریں میری سامنے گھومتی رہتی ہیں۔

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح سے یاد ہیں جب میں ان کے عشق میں گرفتار ہوکر ان کو اِدھر اُدھر لیے پھرتا تھا۔ تاکہ والدین، رشتہ دار اور دوست احباب کی ناک میں اِس "مشک" کی بو گھسنے نہ پائے۔ ایک دفعہ وہ اور میں پکچر دیکھنے گئے۔ ایک گرما گرم سین کے آتے ہی میں نے اپنا داہنا ہاتھ اُن کے کندھے پر رکھا۔ بہت ہی بے مروتی سے انھوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ پکچر ختم ہونے تک ان کے سامنے میں ایک شریف اور تمیز دار عاشق بنا رہا۔ واپسی پر میں نے دیکھا کہ انھیں چُپ سی لگی ہوئی ہے۔ غصّہ سے چہرہ تمتما اٹھا ہے۔ یوں لگا جیسے آتش فشاں [illegible] اب پھٹنے ہی والا ہے۔

"آپ مجھے سچے دل سے پیار نہیں کرتے۔ آپ میں اب وہ پہلے سی گرمجوشی نہیں رہی"!

"لیکن ...... لیکن ...... لیکن آپ ہی نے تو میرے پیار کو میری گرم جوشی کو آگے بڑھنے سے روک دیا"۔

[illegible]

جب کوئی عورت آپ کی کسی بات پر "نہ" کہہ دیتی ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ سو فیصدی اس کا جواب نفی میں ہی ہو۔ ان کے "نہیں" میں بڑے بڑے فلاسفر اپنا سر کھپانے کے باوجود بھی یہ نہیں جان سکے کہ ان کا کونسا "نہیں" "ہاں" ہے اور کونسا "ہاں" "نہیں"!

ایک مرتبہ میری بیوی نے بیٹھے بٹھائے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا "آپ میری سہیلیوں کو پسند نہیں کرتے؟

"نہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں تو انھیں دل و جان سے چاہتا ہوں" انھیں یقین دلانے کی میں نے بارہا کوشش کی مگر وہ اسے ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھیں۔ اس کو ثابت کرنے کا موقعہ مجھے ایک پارٹی میں ہاتھ آیا۔ میں نے ان کی ایک پیاری سی سہیلی کو چُن لیا۔ ان سے بہت ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ اُن کے حسن کی تعریف بھی کر ڈالی۔ اس طرح چند منٹوں میں ان سے قریب ہونے میں میں کامیاب ہوگیا۔ جب ڈانس کا دور شروع ہوا تو میں نے ان کا ہاتھ مانگا (یہ مجھے بن مانگے بھی مل سکتا تھا) ناچ کے دوران ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہوگئے۔ گھر واپس ہوتے ہوئے، میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"دیکھا۔ آپ نے۔ میں نے آپ کی سہیلی کو کس قدر پیار دیا ہے؟"

"ہاں ۔ میں نے دیکھا۔ اور پارٹی کے سارے لوگ بھی دیکھتے رہے۔ لیکن آپ کو اس چڑیل سے اس طرح گوند لگا کر چپکنا نہیں چاہیے تھا۔ کبھی آپ نے میرے ساتھ اس طرح کا ڈانس کیا ہے"؟

اس "نہ" اور "ہاں" کی طرح آپ ان کی تنک مزاجی سے بھی کما حقہٗ واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ ان کی عادتوں کا گہرائی سے مطالعہ نہ کریں۔ میں بڑے ہی مزے سے اپنے دونوں پیر جوتوں سمیت جن میں کبھی کبھار کوئی نہ کوئی نجاست لگ ہی جاتی ہے، ڈریسنگ ٹیبل پر لمبے کیے کسی اخبار یا ناول کا مطالعہ کر سکتا ہوں۔ کیا مجال ہے کہ شریمتی جی ناک بھوں چڑھائیں۔ ہاں! جب بھیگا تولیہ بستر پر ڈال دوں تو مجھے "سولو ہارکی" سُنے بغیر چھٹکا نہیں ملے گا۔ اس چھوٹی سی غلطی پر میرے کردار پر اتنا کیچڑ اُچھالا جاتا ہے کہ بارش میں کیا کوئی ایمبسڈر کار آپ پر چھینٹے اڑائے گی۔ اب شاید آپ جان گئے ہوں گے کہ کیوں اکثر شوہر اپنی بیویوں کو "طوفان یا بلا" کے القاب سے نوازتے ہیں۔

میری بیوی اکثر و بیشتر میری اچھائیاں یوں گنواتی ہیں "آپ کاہل ہیں۔ گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ نہیں بٹاتے۔ میرے ساتھ تھوڑا سا وقت بھی گزارنا آپ کو پسند نہیں۔ آپ گھنٹوں ٹی وی سے چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ روزانہ شیو نہ بنانے سے بوڑھے لگتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ" اور جب میں ایک فرمانبردار شوہر بننے کی خاطر کچن میں گھس کر برتن صاف کرنے لگتا ہوں۔ تو انھیں یہ پسند نہیں آتا۔ آپ جائیے ٹی وی دیکھئے یا منّی کے ساتھ کھیلئے۔ جب بلا ناغہ نئی اور تیز دھاری والی بلیڈ سے شیو بناتا ہوں تو مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتی ہیں آج آپ نے ضرورت سے زیادہ آفٹر شیو لوشن استعمال کیا ہے" اگر وہ بیمار پڑ جاتی ہیں تو ان کا پرہیزی کھانا پکانے میں کچن میں جاتا ہوں۔ تو پلنگ سے اُٹھ کر سیدھا میرے قریب آتی ہیں۔

"آپ جائیے میں اب بالکل ٹھیک ہوں"۔

ان سارے جھمیلوں سے گزرنے کے بعد بیوی کو خوش رکھنے حسبِ ذیل ترکیبیں اب میری سمجھ میں آئی ہیں۔

۱۔ آپ کی بیوی اُس وقت خوش ہوں گی جب آپ اُن کو ایک عدد چمکتے دمکتے موتیوں کا ہار تحفے میں دینگے۔
۲۔ وہ جیسا بھی روکھا پھیکا پکوان پکائے آپ اپنی پوری بتیسی کھول کر ان کی تعریف کے پُل باندھیئے۔
۳۔ اپنی خوشدامن کی سالگرہ کی تاریخ کبھی نہ بھولیں۔
۴۔ اپنے کپڑے اُتار کر یونہی پھینک دینے کے بجائے اِسے اچھی طرح سے تہہ کر کے میلے دان میں ڈالیئے۔

شادی خانہ آبادی آپ سے یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ آپ اپنی بیوی کو ٹوٹ کر چاہیں مگر غلطی سے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ کیوں کہ شادی شدہ زندگی عجیب و غریب حالات دل خوش کن ــــ دل شکن حادثات پیار بھری مُسکان، نفرت بھری نگاہ ۔ کُٹی و ملاپ اور ان گنت ایسے متضاد حادثوں سے عبارت ہے۔!

□□

غوثیہ سلطانہ
(شکاگو)

جعفر رضوی کا "یونہی مذاق میں" شعر کہنا

لیل و نہار کی تبدیلیوں کے ساتھ ہر شخص زندگی کے مختلف حادثات سے دوچار ہوتا ہی رہتا ہے لیکن وہ فنکار جو معاشرے کے غمناک ماحول کو لطف و نشاط بخشنا جانتے ہیں ان واقعات کو نظم و نثر کے ذریعہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی جڑیں کلچر کی زمین میں اتر جاتی ہیں۔ ہر خطۂ زمین کی ایک خاص آب و ہوا اور اپنا مزاج ہوتا ہے۔ طنز و مزاح کے لیے اس مزاج اور ماحول کی اچھائی اور برائی کا بخوبی مشاہدہ ضروری ہے ظرافت نگاری جس میں معاشرے کا کرب اور حالات کا پُرزور تبصرہ شامل رہتا ہے ایک نہایت ادق صنف سخن ہے ہم لوگ مشرق و مغرب کے نہ صرف خانوں میں بلکہ ذہنی طور پر مختلف درجات میں منقسم ہیں۔ مشرق و مغرب کا موازنہ کرنے پر حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ اس مشینی زندگی میں مزاح اور حس مزاح سے بڑھ کر قابل قدر کوئی شئے نہیں ہے جو دل و دماغ کو تازگی اور سب سے بڑھ کر رنج و ملال، درد و غم سے وقتی طور پر ہی سہی سکون دلاتا ہے۔ اس لطف اندوزی کی صورت کے پیچھے آسودگی کا منبع چھپا ہوا ہوتا ہے اس لیے ظرافت انسان کی وہ ضرورت ہے جس کے بغیر وہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایک مشہور کہاوت ہے "DO NOT WORRY, BE HAPPY" امریکہ میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مختلف خطوں کی مختلف بولیوں کی طرح ہمارے ساتھ لشکری اردو بھی چلی آئی ہے مگر بڑی حد تک گھر میں مقید ہے کیوں کہ باہر انگریزی کا دور دورہ رہتا ہے ایسی صورت میں جہاں اردو کی روشنی معدوم ہے وہاں طنز و مزاح پر طبع آزمائی یا مجموعہ کلام کا منظر عام پر آنا یقیناً ایک قابل قدر امر ہوگا۔ مغربی و مشرقی تہذیبوں کا ٹکراؤ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ گرمی و سردی کے آپس میں ملنے سے STATICS کا پیدا ہونا۔ ان عصری حالات کا بہترین عکاس ایک ظرافت نگار ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے واشنگٹن (ڈی سی) کی آب و ہوا میں ظرافت کی خنکی کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے! اس لیے کہ ایک نہیں یہاں چار ظریف جمع ہیں نسیم فروغ۔ باقر زیدی عطرت حسین عطرت اور سید جعفر رضوی پچھلے سال کا ذکر ہے پاکستان سے ڈاکٹر جاوید آتے ہوئے تھے واشنگٹن اسٹیٹ پر بے شک ناز ہونے لگا تھا جب اردو فورم کے اصغر نقوی کی سجائی ہوئی محفل طنز و مزاح میں ان ظریف شخصیتوں کو سنا گیا۔ عطرت سنجیدہ شاعر گر شگفتہ مزاج بڑے ہی خاموش نظر آتے ہیں لیکن اچانک ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ ان کی تہذیب کی کوسوں دور ہوتا

ہے۔ سید جعفر رضوی اپنے سر پر ایک نمایاں ہیٹ لگائے ہوئے یہاں کے COW BOY اور وہاں کے میاں چنگیزی معلوم ہوئے جب کلام سنانے لگے تو دورِ حاضر کی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آنے لگیں۔ زندگی کے تجربے، حوادث و مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ان کے کلام سے وہ سب پہلو اُجاگر ہوتے ہوئے نظر آئے جن کا تعلق ہماری یہاں کی روزمرہ کی سماجی زندگی سے ہے۔

درحقیقت انھیں طنزیہ و مزاحیہ شاعر بنانے میں مشرق و مغرب کے سماجی تصادم نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ برسہا برس سے امریکہ یا باہر کے ملکوں میں مقیم لوگوں نے کبھی اپنی زبان یا انگریزی لہجے پہ توجہ نہیں دی۔ انگریزی اس وقت تک بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے جب تک کہ ضروری یا لازمی نہیں ہوجاتا۔ ویسے بھی ہماری عادت غیاب میں بولنے کی زیادہ ہوتی ہے شاید اس لیے کسی کے سامنے کم ہی بولتے ہیں۔ لہٰذا جب انگریزی بولتے ہیں تو لہجہ ایسا لگتا ہے جیسے لوہے کے چنے چبائے جارہے ہیں۔ برخلاف اس کے امریکن لہجہ MELODIOUS کہلاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ان ہی تاثرات کا حقیقی مشاہدہ ہے۔

کہنے سے پہلے سوچئے الفاظ کو تولیئے ؛ لہجہ نہ ہو درست تو پھر منہ نہ کھولیئے
سب پوچھتے ہیں کونسی آخر زباں ہے یہ ؛ باوا خدا کے واسطے انگلش نہ بولیئے

شاعر بے شک اپنے وقت کے سماجی حالات کا غماز ہوتا ہے۔ آگے دیکھئے وہ کس طرح اظہار مجبوری کرتے ہیں۔

وقت کی رو میں بہہ نہیں سکتا ؛ بن کہے یہ میں رہ نہیں سکتا
مجھ کو کیسے زباں آئے گی ؛ "زیڈ" کو "زی" جو کہہ نہیں سکتا

جعفر رضوی نے ظرافت نگاری کے فن کو پوشیدہ رکھتے ہوئے خلوص و اہتمام کے ساتھ شعر کہے ہیں۔ اکثر اوقات مشرق و مغرب کا موازانہ اور سماجی پس منظر کو اپنا موضوع سخن چنا ہے اور بڑی خوبی سے اس پر طنز کرتے ہیں مثلاً یہاں کے طویل فاصلے اور کچھ تو ہماری پرانی روش کے مطابق کسی مشاعرے یا پارٹی میں کبھی کوئی وقت مقررہ پر نہیں پہنچا لیکن وقتِ مقررہ پر ہال خالی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ؎

جو جلد آئے تھے وہ لوٹ کر بھی جانے لگے ؛ سفید بال بھی داڑھی میں جگمگانے لگے
خدا کے واسطے فنکشن کی ابتداء کیجئے ؛ جوان ہوگئے بچے پیام آنے لگے

ہائی وے کی طویل مسافت اور بے چینی و بے کلی ایک عادت سی بن گئی ہے۔ میلوں کا ٹریفک کا رک جانا۔ وقت پر پہنچ نہیں پانا۔ اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ بڑی خوبی سے اس پر اظہار کرتے ہیں۔

کیوں ٹریفک میں پھنسایا ہے مجھے عید کے دن ؛ دے مجھے قوت پرواز میں طائر ہوجاؤں
سال میں پڑھتا ہوں میں صرف یہی ایک نماز ؛ وہ بھی کیا چھوڑ کے میں پورا ہی کافر ہوجاؤں

ان کے کلام میں روایات کا صحیح شعور موجود ہے اور رجحان بنیادی طور پر مائل بہ مثبت نظر آتا ہے بشرطیکہ مغرب کی طرف ہجرت کا جنون کبھی کوئی اور بات سوچنے کا اس وقت تک موقع ہی نہیں دیتا جب تک کہ کوئی عمر کی نئی فصلوں کا بدلہ ہوا رنگ نظر نہ آجائے ؎

اتلاف اپنی فصل کا خود ہم نے ہے کیا ؛ نقشہ اپنی شکل کا خود ہم نے ہے کیا

الزام کس کو دیجیے کہ ڈالر کے شوق میں ؛ سودا بھی اپنی نسل کا خود ہم نے ہے کیا

خواہ وہ کیسا ہی موضوع کیوں نہ ہو ظرافت کے بغیر اظہارِ خیال نہیں کرتے اور اپنے شعور کے رچاؤ سے طنز بہ ظرافت میں متانت پیدا کر دیتے ہیں ؎

مذہب کی خوبیاں اسے قایل نہ کر سکیں ؛ بس ایک ہی اصول پہ قربان ہو گیا

جوں ہی سُنا کہ چار بھی جائز ہیں بیویاں ؛ فوراً وہ کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو گیا

مضمون آفرینی سے کام لیتے ہوئے بات جچی تلی سادہ اور برجستہ حالات حاضرہ کی یوں عکاسی کرتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندستان ہمارا ؛ ڈالر ہوں پاس تو پھر سارا جہاں ہمارا

ہم نے سجا کے اس کو طاقوں میں رکھ دیا ہے ؛ قرآن پڑھ رہے ہیں گوروں کے یہاں ہمارا۔

طنز و مزاح کے علاوہ غزلیات، ھزلیات، نظمیں اور حمد بھی ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہیں اور دلاور فگار حمایت علی شاعر اور بابائے ظرافت سیّد ضمیر جعفری کی مفصل رائیں بھی شریک ہیں امریکہ کی اردو ظرافت نگاری کی تاریخ میں شاید جعفر رضوی پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد بجا طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے وہ محض "یونہی مذاق میں" کہنے کے لیے نہیں بلکہ پست در پست ظرافت نگاری کے فن کو پوشیدہ رکھتے ہوئے پورے خلوص و اہتمام کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۱ شمارہ ۵ حیدرآباد

مئی ۱۹۹۸ء

قیمت فی پرچہ -/10 روپے
زرِ سالانہ: ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۱۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔۱

فون (آفس) 595716
فون (رہائش) 4576064

۳

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

— —

مطبوعات، مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
اتھی آموز	ڈاکٹر عصمت جاوید	25 روپئے
ب ہی پیالہ (ڈرامہ)	رام گنیش گڑکری مراٹھی سے ترجمہ ر خلیل مظفر	20 روپئے
یورپ میں اردو	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	50 روپئے
مرا ہم راضی	ڈاکٹر کرنل محمد غفران	90 روپئے
چاند تارے	اسحاق خضر	15 روپئے
یبوٹرا اور اس کی بیسک زبان	عبدالباری مومن	20 روپئے
سر سنایت کار	بی آر دیودھر مراٹھی سے ترجمہ ر دستگیر شہاب	25 روپئے
مکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		40 روپئے
مکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		25 روپئے
مکان ایک بابی ڈرامہ (خصوصی شمارہ)		10 روپئے
مکان سراج اورنگ آبادی (خصوصی شمارہ)		20 روپئے
مکان ادبیات سوانح (خصوصی شمارہ)		

ملنے کے پتے - مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی / فون 2672703

اوللڈ کسٹم ہاؤس-ڈی ڈی بلڈنگ ، شہید بھگت سنگھ مارگ ممبئی

2-مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنس بلڈنگ جے جے اسپتال ، ممبئی 400 008

شاعری یا معجون شباب آور

بعض شاعروں کے شاعر ہونے کی تصدیق ان کی شاعری سے ہو نہ ہو، گفتگو سے ضرور ہو جاتی ہے۔ اسی لئے تو جاتا ہے کہ ہمارے کئی شاعر اپنے کلام کی وجہ سے نہیں، انٹرویوز کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔ ایسے شاعروں میں عموماً نیازی اور جون ایلیا کا نام لیا جاتا ہے۔ ان دونوں کا جب بھی کوئی انٹرویو شائع ہوتا ہے تو دنیائے ادب میں ویسا ہی شرابا ہوتا ہے جو ریل گاڑی کے پڑی سے اترتے وقت سنائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان دونوں مقبر ترین شاعروں پر ہر وقت ایک مخصوص شاعرانہ کیفیت طاری رہتی ہے۔ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو کر اپنے حال میں مس رہتے ہیں۔ انہیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ زبان مبارک سے ارشاد فرما رہے ہیں، اس کا دوسرے کیا اثر گے لیکن ان دونوں میں ایک واضح فرق ہے۔ منیر نیازی دوسروں کی دل آزاری سے دریغ نہیں کرتے جب کہ جون اپنے ہی دکھے ہوئے دل کے داغوں کی نمائش کرتے ہیں۔ ان دونوں میں ایک اور فرق بھی ہے۔ جون ایلیا علوم ظا میں خاصی دسترس رکھتے ہیں جبکہ منیر نیازی کی تعلیم علم باطن تک محدود ہے یعنی غالب کی طرح ہنوز مکتبِ غم دل سبق لیتے ہیں۔

یہ دونوں طرح دار شاعر ایک دوسرے کے بارے میں اچھی خاصی سخن گسترانہ رائے رکھتے ہیں۔ ایک نیازی نے اپنے ایک انٹرویو میں جون ایلیا کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ریختے کے نہیں ریختی شاعر ہیں۔ واضح رہے کہ ریختی مردوں کی اس شاعری کو کہتے ہیں جو عورتوں کی زبان میں کی جاتی ہے۔ جون ایلیا نے ایک تازہ ترین انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے منیر نیازی کے نہلے پر دہلا مارا ہے: "آپ منیر نیازی کی بات کرتے ہیں۔ وہ تو ایک غیر سنجیدہ انسان بلکہ غیر سنجیدہ شاعر ہے۔ اس کے کلام میں تو عروضی خامیاں بھی ہوتی ہیں"

ہم دونوں شاعروں کا احترام کرتے ہیں، اس لیے ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک درست سمجھیں اور دوسرے کو غلط قرار دیں۔ احترام کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کو حق بجانب سمجھا جائے اور ا فرمودات کو حرف بحرف درست تسلیم کیا جائے۔ جون ایلیا اگر ریختی کے شاعر ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ ہما بعض بڑے شاعروں نے ریختی میں طبع آزمائی کر کے اسے ریختہ سے بھی بلند مقام پر پہنچا دیا ہے۔ سعادت یار خاں ر اور انشاء اللہ خان انشا کا ریختی کا کلام ان کے کلام ریختہ سے بدرجہا بہتر ہے۔

منیر نیازی اگر غیر سنجیدہ انسان اور غیر سنجیدہ شاعر ہیں تو اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی شاعری نہیں ہوتی۔ عروضی خامیاں اس شاعری کو سنجیدہ بنا دیتی ہیں۔ یعنی معنوی خامیوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور پڑھنے عروضی خامیوں ہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

جون ایلیا کا مذکورہ بالا ارشاد ان کے جس انٹرویو سے لیا گیا ہے، وہ گزشتہ ہفتے روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہوا ہے اور اس لائق ہے کہ اس پر ذرا تفصیل سے بات کی جائے۔ یہ انٹرویو ایوب ندیم نے لیا ہے۔ ا تمہید میں وہ لکھتے ہیں: "جون ایلیا شاعر ہیں اور اپنی شکل اور عمل کے اعتبار سے بھی شاعر ہی نظر آتے ہیں۔ ؟ ہوئے بال اور حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے، کے عادی جون ایلیا اپنی عمر کے چونسٹھ سال مکمل کر چکے انگریزی، فارسی اور عربی زبان و ادب سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفے کا بھی خاصا علم رکھتے ہیں۔"

اس تعارف میں خاصا داخلی تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص شکل اور عما

شاعر نظر آتا ہو، وہ اتنا پڑھا لکھا کیسے ہوسکتا ہے۔ پھر علم کا بکھرے ہوئے بالوں سے کیا تعلق؟ بال تو ہوا سے بھی بکھر سکتے ہیں۔ علم سے تو نہیں بکھر سکتے خواہ وہ ہوائی علم ہی کیوں نہ ہو۔ تعارف نگار جون ایلیا کے علم اور شاعری دونوں سے مرعوب ہوگئے اور اپنی عبارت میں ربط پیدا نہ کرسکے۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جون ایلیا بہت پڑھے لکھے ہیں۔ لیکن ان کا علم ان کی شاعری یا کسی دوسرے عمل سے ظاہر نہیں ہوپایا۔

جن لوگوں نے جون ایلیا کو دیکھا ہے وہ ہرگز اس کا یقین نہیں کریں گے کہ ان کی عمر چونسٹھ برس ہے۔ جو شاعر اس قسم کی شاعری کرتا ہو:

شرم، دہشت، جھجھک، پریشانی　　ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
آپ، وہ، جی، مگر یہ سب کیا ہے　　تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

اس کو چونسٹھ برس کی عمر تک پہنچنے کے لیے مزید نصف صدی درکار ہوگی۔ بہرحال یہ حیرت کی بات ہے کہ کوئی عین عالم شباب میں چونسٹھ برس کا ہوجائے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر ہماری دعا ہے کہ

چونسٹھ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہیں۔

جون ایلیا اپنے ہر انٹرویو میں اپنی گھریلو زندگی کا ذکر ضرور کرتے ہیں جو ایک غیر شاعرانہ حرکت ہے۔ اگر اپنی بیگم سے ان کی علیحدگی ہوچکی ہے تو بار بار اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم اس قسم کے معاملات کا اپنے کالم میں ذکر نہیں کرتے مگر زیرِنظر انٹرویو میں جون ایلیا نے ایک ایسی معنی خیز اور شاعرانہ بات کہہ دی ہے کہ اس کا حوالہ دیئے بغیر موصوف کی شخصیت اور شاعری کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ بیگم سے علیحدگی کی وجوہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں " وہ ایک طاقت ور عورت ہے۔ اس نے مجھے بیوی بناکر رکھا ہوا تھا اور خود شوہر بنی ہوئی تھی۔ " اگر یہ بات درست ہے تو پھر منیر نیازی کی بات کو بھی درست سمجھنا چاہیے کہ جون ایلیا ریختے کے نہیں ریختی کے شاعر ہیں۔ بقول ساحر لدھیانوی، سچا شاعر دنیا سے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ حاصل کرتا ہے، اسے شاعری کی صورت میں لوٹا دیتا ہے۔ جون ایلیا سچے شاعر ہیں، وہ اپنے گھریلو تجربات و حوادث کو ریختی ہی کی صورت میں لوٹا سکتے تھے، سو انہوں نے یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

اس انٹرویو میں جون ایلیا نے اپنے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا: " میں اپنے آپ کو پنجابی سمجھتا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد تین چار سو سال پہلے سوہدرہ (پنجاب) میں مقیم تھے۔ امروہے تو وہ بعد میں منتقل ہوئے۔ اس لیے میں پنجابی پہلے اور اہل زبان بعد میں ہوں۔ "

ہمارے نزدیک کسی کا پنجابی یا غیر پنجابی ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم سب کی بنیادی شناخت یہ ہے کہ ہم پاکستانی ہیں مگر وہ لوگ زیادہ پاکستانی ہیں جو ایک طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے کسی دوسرے طبقے سے اپنا رشتہ جوڑیں۔ جون ایلیا مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ہر طرح کے تعصبات سے بلند ہوکر اپنا رشتہ پنجاب سے جوڑ رہے ہیں۔ ان کے شین قاف کی وجہ سے ہمیں پہلے ہی شبہ تھا، خوشی کی بات ہے کہ اب ان کے بیان سے اس کی تصدیق ہوگئی۔

جون ایلیا سے ایک سوال کچھ اس قسم کا کیا گیا کہ کراچی میں آپ کو کوئی نہیں پوچھتا، آپ عام مشاعروں میں نظر آتے ہیں نہ ٹی وی کے مشاعروں میں مگر جب آپ لاہور آتے ہیں تو آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ آپ کے اعزاز میں مشاعرے ہوتے ہیں، لاہور اور پنڈی ٹی وی پر آپ اپنا کلام سناتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کے جواب میں جون ایلیا یہ کہیں گے کہ سوہدرہ سے تعلق کا کوئی نہ کوئی مثبت نتیجہ تو نکلنا ہی تھا لیکن انھوں نے اہل پنجاب کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: میرے نزدیک ٹی وی کے مشاعروں میں شرکت یا عدم شرکت سے شاعر کے ادبی قدوقامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "

ہم نہایت ادب سے گزارش کریں گے کہ قدوقامت میں فرق تو اسی وقت پڑسکتا ہے جب پہلے سے قدوقامت موجود ہو۔ ٹی وی پر تو وہ شاعر بھی اپنی چہرہ نمائی کے لئے آجاتے ہیں جن کا ذکر صہبا اختر مرحوم نے اس شعر میں کیا ہے

اور یہ شعر انھوں نے پی ٹی وی کے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا:

ان کو مرے فروغِ سخن سے ہے کیوں حسد ماچس کی تیلیوں کے برابر ہیں جن کے

جون ایلیا کے مزاج میں انکسار بہت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ اردو کے بڑے شاعر ہیں تو انھوں نے صرف میر اور اقبال کا نام لیا، حالانکہ وہ ایک اور شاعر کا نام بھی لے سکتے تھے مگر حیا مانع رہی سوال ساقی فاروقی سے کیا جاتا تو وہ پہلے گرج دار آواز میں اپنا نام لیتے اور پھر دبی زبان میں میر اور اقبال کو بھی

جون ایلیا نے اردو کے بڑے شاعروں میں غالب کو شمار نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ غالب شاعر ہے نہ کہ اردو کا۔ مزید یہ فرمایا ہے کہ ہمیں غالب کا براہ راست مطالعہ کرنے کے لئے اس کا فارسی چاہیئے۔ عرض ہے، ابھی تو غالب کے اردو کلام کا براہ راست مطالعہ ممکن نہیں ہوسکا کہ شرحوں کا سہارا لینا پ فارسی کلام کو براہ راست کون پڑھ سکتا ہے! ہمارے شاعروں میں جون ایلیا فارسی جانتے ہوں تو جانتے ہوں، با اتنی بھی فارسی نہیں جانتے جتنی انھیں اردو آتی ہے۔

جون ایلیا سے بعض شاعروں کے بارے میں ان کی رائے پوچھی گئی تو انھوں نے کہا: "فیض کے عروضی غلطیاں موجود ہیں تاہم میں انھیں شاعر مانتا ہوں۔" بڑا کرم کیا کہ عروضی غلطیوں کے باوجود آپ نے شاعر مان لیا جب کہ اسی قسم کی غلطیوں کی بناء پر آپ منیر نیازی کو شاعر ماننے سے انکار کرچکے ہیں۔ جون ایلیا کو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ شاعری صرف عروض کا نام نہیں ہے۔ بے شمار شاعر ہیں (جن میں خود جون ایلیا بھی ش جنھوں نے کبھی عروض کی کوئی غلطی نہیں کی لیکن ان میں کتنے ہیں جو فیض یا منیر نیازی کی سطح تک پہنچتے ہوں غلطی سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آدمی بلاضرورت شعر کہے۔

احمد فراز کے بارے میں جون ایلیا کا خیال یہ ہے کہ وہ بیس سال کی عمر تک کے نوجوانوں کے شاعر ہیں ظفر اقبال کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ پختہ ذہن کے نوجوانوں کے شاعر ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ نو ذہن پختہ کس عمر میں ہوتا ہے۔ ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں، اس میں تو پختہ عمر کے لوگوں کا ذہن نہیں ہوتا تو یہ بے چارے نوجوانوں سے اس قسم کی توقع رکھنا کہ وہ ظفر اقبال کی شاعری کو سمجھ لیں گے، سخن انتہا ہے۔ ظفر اقبال نے اپنی شاعری کے بڑے حصے میں جو لسانی توڑا مروڑی کی ہے، اس کے معانی خود ظ دسترس سے باہر ہیں تو کسی دوسرے تک ان کی رسائی کیا ہوگی۔

احمد فراز کی مقبولیت اس کے اکثر ہم عصروں کو کھٹکتی ہے اور وہ رشک و حسد کی آگ میں تپ کر ای دہراتے ہیں کہ فراز بیس برس تک کی عمر کے نوجوانوں میں مقبول تھے۔ اب وہ جس قسم کی شاعری کر رہے ہیں اسی برس کے لوگوں کے لیے معجون شباب آور کا درجہ رکھتی ہے۔

اپنے متعلق جون ایلیا نے کہا ہے کہ میں ایک ناکام شاعر ہوں۔ گزارش ہے کہ اس قسم کے معاملات سے کام لینا چاہیئے۔ جہاں اہل نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرتے ہیں، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کرسکتے

مجتبیٰ حسین

چلو اکیسویں صدی میں

ایک دن ہم خراماں خراماں کہیں چلے جارہے تھے کہ راستے میں اچانک ایک دوست مل گئے، کہنے لگے "کہاں جارہے ہو؟ ان دنوں تمہاری چال میں ایک ایسا ٹھہراؤ، دھیماپن اور اعتماد آگیا ہے کہ لگتا ہے چوری چوری اکیسویں صدی میں جانے کا ارادہ رکھتے ہو ورنہ اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں جہاں آدمی کو ابھی کچھ دیر بعد آنے والے لمحے کے آنے کا بھروسہ تک نہ ہو وہاں تمہارا یوں اطمینان اور بے فکری کے ساتھ چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ یوں بھی اب اکیسویں صدی کے آنے میں دن ہی کتنے باقی رہ گئے ہیں۔ بھیا! اس رفتار سے تو تم سچ مچ اکیسویں صدی میں داخل ہو جاؤ گے" ہم اس سوال کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ہمارے دوست، جو ہمیشہ عجلت میں رہتے ہیں اور ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں آگے کو نکل گئے۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمارا تو یہ عالم ہے کہ آج کا دن بیت گیا تو یہ پتہ ہی نہیں رہتا کہ آنے والا دن آئے گا بھی یا نہیں اسی لیے رات کو سونے سے پہلے اپنے گناہوں کی نہ صرف معافی مانگ لیتے ہیں بلکہ بچوں کو یہ تک بتادیتے ہیں کہ ہم نے کس کس سے کتنا قرض لے رکھا ہے۔ ہم انہیں پابند بھی کرتے ہیں کہ ہمارے بعد وہ ان سب کا قرض ادا کردیں ورنہ ہماری روح کو تکلیف پہنچے گی۔ یوں بھی ہماری روح بہت حساس ہے۔ ہمارے جسم کے ساتھ جو ہوا سو ہوا کم از کم ہماری روح کو تو سکون ملنا چاہیئے ہماری اولاد اتنی سعادتمند ہے کہ ہر رات کو سونے سے پہلے جب ہم دوستوں سے لیے ہوئے قرض کی رقم اور خود قرضداروں کی تعداد میں ضرور کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیتے ہیں تو وہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتی اس کے دو ہی مطلب ہیں یا تو ان کی نیت بہت اچھی ہے یا پھر بہت ہی خراب ہے۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ ہم بیسویں صدی میں پچھلے ۶۲ برسوں سے لگاتار جی رہے ہیں اور ۶۲ برس کی عمر وہ ہوتی ہے جس میں آدمی اچھے برے سب کاموں سے فارغ ہو جاتا ہے بلکہ برے کام کرنے کا تو اہل ہی نہیں رہتا۔ جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا تھا تو ہم اس دنیا میں موجود نہیں تھے اور ہماری اجازت کے بغیر پہلی جنگ عظیم تک لڑی جاچکی تھی۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے وقت ہم پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن اس وقت بھی کسی نے ہم سے اجازت نہیں لی تھی دنیا میں جب پہلا ایٹم بم گرایا گیا تو تب بھی ہمیں مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ پھر ہم ملک کی آزادی میں باوجود تمنّا کے حصہ لینا ہی چاہتے تھے کہ ملک آزاد ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ جب دنیا کے معاملات بالا بالا ہی طے پاجاتے ہیں تو ہم نے بھی وقت اور زمانہ کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو ایک شاعر نے اختیار کیا تھا۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں ٭ بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

جس آدمی کا بیسویں صدی میں ہی جب کوئی عمل دخل نہ رہا ہو تو وہ اکیسویں صدی میں جا کر کیا کرے گا لیکن اب جب کہ اکیسو
صدی ہماری زندگی کے تھکے ہوئے وقت کے آگے دستک دینے لگی ہے تو دل میں ایک خواہش سی جاگتی ہے کہ خدا
کرے اکیسویں صدی ایسی ہو کہ اس میں دکانیں تو بہت سی ہوں لیکن دکاندار کوئی نہ ہو، مکان تو بہت سے ہوں لیکن
مالک مکان کوئی نہ ہو کیونکہ بیسویں صدی میں ہمارا زیادہ تر وقت دکانداروں اور مکان مالکوں سے ہی لڑتے جھگڑتے
گزرا، اکیسویں صدی میں کچھ ایسا ہو کہ ہم دوکانوں سے جو چیز چاہیں گھر لے آئیں اور دکاندار ہم سے بھاؤ تاؤ نہ کرے ہم سے
کوئی دام ہی نہ لے تو اور بھی اچھا ہے۔ بیسویں صدی میں سائنس نے وہ وہ کرشمے دکھائے کہ ہماری عقل اب تک دنگ ہے۔
اکیسویں صدی میں تو سائنس اور بھی کرشمے دکھائے گی ہو سکتا ہے کہ آپ کا گھر زمین پر ہو، دفتر مریخ میں اور آپ کی سسرال
زہرہ میں ہو کبھی آپ بور ہونے لگیں تو بال بچوں سے کہیں گے "بھئی! آج زمین پر بہت گرمی ہو رہی ہے چلو ذرا مریخ تک ہو
آئیں، دوپہر کا کھانا وہیں کھالیں گے۔ شام کی چائے واپسی میں چاند میں پی لیں گے" ہو سکتا ہے اکیسویں صدی میں انسانی جسم
کے پارٹس بھی بازار میں ملنے لگ جائیں۔ اگر آپ کا دل ٹوٹ گیا تو آپ بازار سے ایک نیا دل خرید کر لے آئیں گے یا کسی سے
ادھار لے لیں گے۔ مثال کے طور پر زید اپنے پڑوسی بکر کے پاس جا کر کہے گا "یار! تمہارے پاس کوئی فالتو دل ہو تو دینا گھر
ہوتے وقت مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں اپنا دل کسی کو دے آیا ہوں۔ اب دل کے بنا گھر جاتے ہوئے ڈر ہونے لگا ہے۔ اگر
بیوی پوچھے کہ دل کسے دے آئے تو کیا جواب دوں گا" اس پر بکر بڑی بے دلی کے ساتھ بولے گا "یار! تم بھی کیسے وقت میرے پا
دل مانگنے آئے۔ چار دن پہلے عمر مجھ سے میرا فالتو دل مانگ کر لے گیا تھا وعدہ کر گیا تھا کہ ایک ہی دن میں واپس کر دے گا
اب تک نہیں آیا، اگر ہوتا تو میں تمہیں ضرور دیتا"۔ پھر سائنس کی ترقی کے باعث اکیسویں صدی میں آدمی کے بہت سے کام بٹن د
ہی پورے ہو جایا کریں گے۔ کیا عجب کہ بٹن دباتے ہی آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ جائیں۔ بٹن دباتے ہی کھانا آپ
کے سامنے آجائے دوسرا بٹن دباتے ہی یہ کھانا آپ کے پیٹ میں پہنچ جائے اور تیسرے بٹن کو دباتے ہی یہ کھانا خود بہ خود ہضم
ہونے لگ جائے۔ ایک اور بٹن دبائیں تو آپ کو ڈکار آجائے اور پھر کسی بٹن کو دباتے ہی آپ کو نیند آجائے۔ اکیسویں صدی
تعلق سے ہمارے دل میں یوں تو طرح طرح کی خواہشات ہیں لیکن ہم لالچی اور حریص آدمی بالکل نہیں ہیں، پھر ہماری ضرورتیں
بھی بہت محدود ہیں ہمیں نہ فالتو دل چاہیے اور نہ ہی ہمیں ایسے بٹن چاہئیں جن سے آدمی کا کھانا ہضم ہو جائے ہمیں تو کھ
ہی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ کیا ہم بے وقوف ہیں کہ اسے خواہ مخواہ ہی ہضم کرتے پھریں۔ ہماری تو بس ایک چھوٹی سی خواہش
ہے کہ اگر ہم اکیسویں صدی تک زندہ رہے تو ہمیں بس میں بیٹھنے کی جگہ آسانی سے مل جائے۔ پچھلے کئی برسوں سے ہم بس کے ڈنڈ
سے لٹک کر سفر کر رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہم بس کے ڈنڈے سے لٹک کر ہی اکیسویں صدی میں پہونچیں۔ ہم کو تو خیر کوئی ا
نہ ہوگا لیکن اکیسویں صدی کو تو اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس کہنے کو یوں تو بہت سی باتیں ہیں لیکن چونکہ ہم لکھنے پڑھنے
والے آدمی ہیں اسی لیے ہماری دعا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی لکھنے پڑھنے کا کاروبار چلتا رہے۔ شاعر شعر کہتے رہیں اور افسا
افسانے لکھتے رہیں۔ ہم تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ شعروں اور افسانوں میں کوئی معنی بھی ہونے چاہئیں۔ بیسویں صدی کے بہت سے
شعر اور بہت سے افسانے اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ جب بھی ہم نے شکایت کی تو ہم سے کہا گیا کہ یہ ادب آنے و

آخر میں ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ آج ہم بیسویں صدی میں جی رہے ہیں اور اکیسویں صدی کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں لیکن اب بھی ہمارے یاں بعض ایسے لوگ ہیں جو ذہنی طور پر ۲۰۰ سال قبل مسیح میں زندہ ہیں۔ ہمارے ایک دوست آج بھی سولہویں صدی میں جی رہے ہیں۔ ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کہ وہ سولہویں صدی میں جی کر بیسویں صدی میں کیوں سانس لے رہے ہیں۔ ہمیں ان پر اصل اعتراض تو یہ ہے کہ پہلے تو انہوں نے پیدا ہونے میں اتنی دیر کر دی اور اب ہم سب کو اپنی سولہویں صدی سے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ہماری خواہش صرف اتنی ہے کہ ہم جب اکیسویں صدی میں جائیں تو ہمارے ساتھ جو لوگ چلیں وہ کم از کم براہ راست بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں پہنچیں یہ نہ ہو کہ کوئی صاحب اچانک سولہویں صدی سے اکیسویں صدی میں پہنچ جائیں اکیسویں صدی میں چاہے کچھ بھی ہو مگر حساب کا گھپلا نہیں ہونا چاہئے۔

غزلیں

اقبال شانہ
حقل (سعودی عرب)

جانِ جاناں تیرے در پر آگئے
باندھ کر ہم اپنا بستر آگئے

آئے ہیں کیسے نہ ہم سے پوچھئے
آپ کی محفل میں گھس کر آگئے

بچ گئے رکشے کے پیسے آج بھی
تیرے گھر تک ہم تو چل کر آگئے

پیار سے جب یار نے آواز دی
بن کے ہم لوٹن کبوتر آگئے

اُڑ گئے ہاتھوں کے طوطے وہ مرے
سامنے جب بن سنور کر آگئے

آج بیگم صاحبہ کا ڈر نہیں
سارے برتن ہم تو دھو کر آگئے

آئے ہیں ایسے مری شادی میں وہ
جیسے بریانی میں کنکر آگئے

کاٹنی تھی پیاز کی بس اِک ڈلی
ہاتھ میں وہ لے کے خنجر آگئے

ڈاکئے کی اب ضرورت ہی نہیں
ان کا خط لے کر کبوتر آگئے

آنسوؤں کی بہہ گئی ہیں ندیاں
جب تری یادوں کے لشکر آگئے

کیسے بنتی میری رقی دوستو
ڈھیر سارے اُن کو جوکر آگئے

چھیڑ دی شانہ ترنم میں غزل
ہر طرف سے ہم پہ پتھر آگئے

★

ترے در پر ہجوم بیکراں ہے
ترا گھر ہے کہ مچھلی کی دوکاں ہے

زمیں اوپر ہے نیچے آسماں ہے
مرے معشوق کا اُلٹا جہاں ہے

پہاڑوں میں جو گہرائی ہے پیارے
سمندر میں وہ اونچائی کہاں ہے

مجھے سرسبز جنگل کاٹنا ہے
مری چھوٹی سی لکڑی کی دوکاں ہے

پرندوں کی حفاظت ہے ضروری
مگر صیّاد کو فرصت کہاں ہے

بہت مشکل ہے یارو سانس لینا
تمہارے شہر میں اتنا دھواں ہے

ذرا سہما سا جو بیٹھا ہوا ہے
سکندر خاں اور ابنِ شیر خاں ہے

تمہارے سامنے کہتے نہیں کچھ
ہمارے بھی مگر مُنہ میں زباں ہے

ہمارا ناخدا مجنوں ہے گویا
گریباں ہے کہ اس کا بادباں ہے

جو فلموں کی دھنوں میں دب رہی ہے
میاں شانہ وہ آوازِ اذاں ہے

یُوسف ناظمؔ

ایک غیر مُقیم ہندوستانی کا سفرنامہ ہند

(تیسری قسط)

میں ابھی ممبئی ہی میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ حیدرآباد جانا چاہتا تھا لیکن میرے میزبان کے شدید اصرار نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ انھوں نے کہا کہ میں ممبئی کا مشہور و معروف آم الفانسو عرف ہاپس کھا کر لکھنؤ جاؤں وہ خود لکھنؤ کے باشندے ہیں لیکن میں نے بچشم خود دیکھا کہ الفانسو آم کی تعریف کرتے کرتے ان کا حلق خشک ہوجاتا تھا اور وہ کوئی ٹھنڈا مشروب پی کر از سرِ نو الفانسو کا قصیدہ پڑھنے لگتے لیکن ان کی اس محبت کے پیچھے ایک معقول دلیل تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ الفانسو اپریل کے مہینے ہی میں لذتِ کام و دہن کے لیے آموجود ہوتا ہے جب کہ لنگڑا دسہری، اور مجری جون جولائی میں نمودار ہوتے ہیں اس لیے آدمی چاہے تو سال کے ۳، ۴ مہینے آموں کی صحبت میں گزار سکتا ہے۔ یہ بات میرے جی کو لگی اور میں ٹھیر گیا لیکن ہوا یہ کہ اس سال یہاں آموں کی فصل ہی کو کسی کی نظر لگ گئی آم ہوں یا عوام سب مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں نائدے میں صرف عاملدار اور خاص دار ہیں یہاں ایم ایل اے کو عام دار اور ایم پی کو خاص دار کہا جاتا ہے۔ مجھے یہ القاب اچھے معلوم ہوئے۔ ویسے اب خاص داروں کی اہمیت کم ہوگئی ہے خاص الخاص دار بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو خاص داری کے متمنی ہوتے ہیں۔ اس کیلئے الیکشن میں کھڑے ہوتے ہیں اور بُری طرح ہار جاتے ہیں۔ خاص الخاص دار بننے کے لیے الیکشن میں ہارنا ضروری ہوتا ہے۔ وزارت سے بھی بالا عہدہ ملتا ہے لیکن یہ موضوع سفرنامے کے لیے موزوں موضوع نہیں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے اپنے دونوں پیروں میں دو مختلف رنگ [illegible] پہن رکھے ہوں اس لیے میں اس غیر متعلق (لیکن بے حد دلچسپ) موضوع کو نامکمل حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آموں کی فصل ٹھیک سے نہ ہونے کی وجہ سے آم کے دام عرش سے [illegible] پہنچ گئے ہیں۔ بازار میں آم ہیں ضرور لیکن شرفا کو ان کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے۔ دام پوچھ کر خریدار خود ہی جھینپ جاتا ہے دکاندار دل ہی دل میں کہتا ہے "بڑے آئے تھے آم خریدنے کے لیے"۔ آموں کے بارے میں ماہرین کی رائے یہ ہے کہ یہ پھل درخت ہی پر پکنا چاہیئے۔ خام حالت میں درخت سے اُتار لیا جائے گا تو یہ آم نہیں ہوگا صرف خام ہوگا۔ اسے بھٹی میں نہیں پکایا جا سکتا۔ بھٹی میں صرف ڈبل روٹی یا نان پکتی ہے۔ بہرحال آموں کے ساتھ یہاں کافی ظلم ہوا۔ جن لوگوں نے آم کو اپنے وقار کا مسئلہ بنایا آم کھا کر غرارہ کرتے

ہوئے پائے گئے ۔ میرے میزبان بھی دل ہی دل میں خفیف ہو گئے ہیں۔ ہاں یہاں خربوزے اور اناناس کم
سے ہیں اور عمدہ ہیں۔ ویسے دونوں پھل ہیں تکلیف دہ۔ خربوزوں میں بیج ہی بیج ہوتے ہیں جن کی بیخ کنی میں کافی
لگتا ہے اور اناناس میں چھلکے ہی چھلکے۔ یہ تنہا پھل ہے جس کی آنکھیں نکالنی پڑتی ہیں۔ چھری الگ کند ہو جاتی
یہ پھل مجھے اس لیے پسند ہے کہ کچھ لکھے بغیر آدمی کی انگلیاں فِگار ہو جاتی ہیں۔ یہ پھل ہماری طرف بھی ہوتا ہے لیکن
ہندوستان سے باہر بھی لیکن ہندوستانی اناناس کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ میں تو یہاں سے جاتے وقت لکھنوی گرتوں
علاوہ اناناس کا مربّہ بھی ساتھ لے جاؤں گا بازار کے تجارتی مربے اور خانہ زاد مربے میں وہی فرق ہوتا ہے جو گیندے
اور گلاب میں ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہم لوگ خوردنی نعمتوں کے صحیح ذائقے سے واقف نہیں ہوتے اس لیے جو
پھل جس جگہ جس نوعیت یا ہیئت اور خاصیت کا ملتا ہے ہم اُسے ہی خدا کی قسم لاجواب ہو تم مان لیتے ہیں۔ جب
حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ ہوا اور مٹی کی تاثیر کیا ہوتی ہے یہ پھلوں ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ میں نے بیسیوں سیا
کو ہندوستان سے پیپے کے پیپے بھر کر آم کا رس لاتے دیکھا ہے۔ یہ رس نہیں ملغوبہ ہوتا ہے انگریز اسے مینگو پلپ
کہتے ہیں۔ (کتنا بڑا نام ہے پمپ شوز کا ہمزاد معلوم ہوتا ہے) ہندوستان میں پہلے ملغوبہ نام کا ایک آم بھی پیدا ہو
تھا۔ اب بھی ہوتا ہے لیکن اس میں کہتے ہیں وہ ذائقہ نہیں رہا جو آزادی سے قبل ہوا کرتا تھا لیکن اس ملغوبہ نام کے آ
کو وہ رتبہ حاصل نہیں تھا جو بنارس کے لنگڑے یوپی کے آعظم الثمر، اور اورنگ آباد دکن کے حیات نام کے آم کو حاصل ،
ملغوبہ اصل میں شکم پُری کے کام آتا تھا۔ ایک آم کھا لو تو پھر دو دن تک کچھ اور کھانے کی ضرورت نہیں۔

میں کیا پھلوں کے چکر میں پڑ گیا۔ سفرناموں میں غذائیت ہی غذائیت اچھی نہیں معلوم ہوتی سفرنامہ مشا
پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ زرعی معلومات پر ۔ ممبئی میں ان دنوں ہر کام عروج پر ہے پورا شہر حساس علاقہ ہو گیا ہے حسا
علاقہ پولس لغت میں اس علاقے کو کہتے ہیں جہاں پولس کی کڑی نگرانی میں فتنے برپا ہوتے ہیں۔ فتنہ و فساد اس شہر کے
معمولات میں شامل ہیں۔ دو قسم کی پولس سپاہ ہمیشہ مصروف رہتی ہے۔ ایک گشتی سپاہ اور منجمد سپاہ گشتی سپاہ بالعموم واردا
کے بعد موقع واردات پر پہنچتی ہے اور واردات کا پوسٹ مارٹم کرتی ہے اس گشتی سپاہ کے سربراہ کو لوگ اب کارونر
کے القاب سے یاد کرنے لگے ہیں۔ اس کی پوسٹ مارٹم (مابعد الوفات تحقیقاتی رپورٹ) سے ثابت ہو جاتا ہے
جس پستول سے گولی چلائی گئی تھی وہ کس ساخت کا پستول تھا اور یہ کہ گولی اور گولی کے ممدوح میں (جو وفات پا چکا
کتنا فاصلہ تھا۔ ایسے موقعوں پر ہوتا یہ ہے کہ گشتی پولس کے آنے تک چشم دید گواہ اپنی عافیت کے خاطر مجرموں کی
طرح روپوش ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے جو تماشائی وہاں بغیر ٹکٹ کا ڈراما دیکھنے کھڑے ہوتے دستیاب ہوتے
ہیں انھی میں چند کو چشم دید گواہ کی حیثیت سے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ یہ گواہ جیسا کہ اخباروں سے ظاہر ہوتا ہے عدالت
میں لوٹ جاتے ہیں۔ لوٹ جانے کی اصطلاح شاعری میں بھی استعمال ہوتی ہے مثلاً یہ کہ مصرع لوٹ گیا لیکن گو
کا لوٹنا گو کہ نوعیت کے اعتبار سے ایک علاحدہ واقعہ ہے لیکن ہے یہ بھی نومشقی کا ثبوت۔ اچھے اور معتبر گواہ لوٹتے
نہیں ہیں)۔ منجمد سپاہ کا معاملہ یہ ہے کہ یہ موقعہ واردات پر ایستادہ حالت میں موجود رہتی ہے لیکن دست بستہ
ہوتی ہے اس کا کام صرف حاضر رہنا ہے اس کا ہر سپاہی ایک مجسمہ ہوتا ہے اسلحہ بردار لیکن بے حس و حرکت خود
سپاہی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے تنخواہ کیوں دی جاتی ہے ـــــ غریب سپاہی!!

میں چونکہ فرصت میں ہوں اس لیے شہری زندگی کے رموز و نکات کا تفصیل سے مشاہدہ اور مطالعہ کر رہا ہوں۔ جو بھی ملتا ہے اس سے محوِ گفتگو ہو کر اس کے زرین خیالات معلوم کرتا ہوں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ زرین چیزیں اب صرف جوہریوں کے شوروم میں مقیّد ہیں عوام کے خیالات جو بھی ہیں آہنی اور فولادی ہیں۔ شہر کا ہر نا خواندہ شخص بہت بڑا سیاسی ہے اچھا خاصا دانشور، سیاسی معاملات کا مبصر اور ناقد۔ ہر عام آدمی ملک کے بڑے سے بڑے مدبّر کی ایک ہی نہیں دونوں ٹانگیں گھسیٹ سکتا ہے اور ٹانگیں گھسیٹنے کے بعد اسے سیاست کے داؤ پیچ سمجھا سکتا ہے۔ میں رات میں سوتے وقت جب اپنی ذہنی اور دماغی حالت پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں خود چند ہی دنوں میں ہندوستانی سیاست پر عبور حاصل کر چکا ہوں اور اگر اس موضوع پر کوئی ورکشاپ منعقد ہو تو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتا ہوں۔ (چڑھنے میں شہ نشین پر چڑھنا شامل ہے)

اس شہر میں شب و روز گینگ وار ہوتی رہتی ہے۔ گینگ کے کچھ شہ زور کو کبھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے لیکن چند راہ گیر بھی جو اپنا ٹفن ہاتھ میں لیے کام پر جا رہے ہوں یا کسی بس میں لٹکنے کے لیے، بس اسٹاپ پر کھڑے ہوں جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ بڑے شہروں میں آدمی کو اپنی موت مرنے کا موقع کبھی ملتا ہے لیکن کم۔ دوسرے کی موت آسانی سے مہیا ہوتی ہے۔ زندہ رہنے والوں کے لیے سرکار کے پاس کوئی خاص فنڈ نہیں ہوتا لیکن متوفیوں پر سرکار بہت مہربان ہوتی ہے۔ اسے جان و مال کی حفاظت کا نام دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو میں اس شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ ہندوستان کا شہر ہے یا نہیں، افلاس اور امارت، عُسرت اور عشرت کا ایسا عمدہ امتزاج مجھے کسی دوسرے ہندوستانی شہر میں دکھائی نہیں دیا۔ سات ستاروں والے ہوٹلوں میں جگمگاتا اور عبادت گاہوں کے سامنے ہاتھوں میں کاسہ دریوزہ گری لیے ہوئے ہمہ تن مصروف لوگوں کا جلسۂ عام، اس سے بہتر کامیڈی، اور کہاں ہو سکتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے یہ شہر نہیں دیکھا تھا لیکن ان کے آدمی نامہ کا ہر آدمی یہاں موجود ہے ـــ ابھی کچھ دن ہوئے میں نے کسی اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی کہ آسٹریلیا میں آدمی کم ہیں اور کنگرو زیادہ۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ ان دنوں ہر جگہ کنگرو ہی تعداد میں زیادہ ہیں۔ بس اتنا ہے کہ انہیں سب جگہ کنگرو نہیں کہا جاتا ـــ اور شاید اس لیے نہیں کہا جاتا کہ شہروں میں آدمیوں کے علاوہ جو مخلوق پائی جاتی ہے اُسے بہائم کہا جاتا ہے۔ میں اس شہر میں ابھی کچھ دن اور ٹھہروں گا۔ یہ شہر تو اچھا خاصا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ایسی انسائیکلوپیڈیا جس کی بیسیوں جلدیں ہیں اور ہر جلد آدمی کی جلد کی طرح ہوگی۔ ▲

اردو کے بیشتر ڈگری یافتہ نقادوں محققوں اور ریسرچ اسکالروں کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تو ان کے ذہن خوب چلتے ہیں دُور دُور کی کوڑیاں لاتے ہیں لیکن جہاں تک ادبی جہان پھٹک کا اور تحقیق کا تعلق ہے یہ زیادہ تر مکھی پہ مکھی بٹھاکر موضوع سے سرسری گزر جاتے ہیں اپنے پیشرو محققین کی ریسرچ سے سرمو اختلاف نہیں کرتے بلکہ پٹی پٹائی لکیر کو مزید پیٹ کر خود کو لکیر کا فقیر ثابت کرتے ہیں۔

اب مرزا غالب پہ ریسرچ کرنے والے ٹوٹے ہی کو لیجیے ہر محقق لٹھ لیے بس ان کی شاعری کے درپے نظر آتا ہے، کسی کو یہ توفیق ہی نہیں ہوتی کہ شاعری کے علاوہ بھی مرزا کی کسی اور شئے کو موضوع تحقیق بنائے، آخر مرزا غالب کی شخصیت صرف شعر و ادب تک ہی محدود نہیں ان کی شخصیت کے کچھ اور پہلو بھی تو ہیں جن پر ریسرچ کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی دستار نما ٹوپی ہے ان کا چغہ نما جُبّہ ہے۔ ان پر بھی تو ریسرچ کی جا سکتی ہے۔ سچ پوچھیے تو مرزا غالب کی مخصوص ٹوپی اور منفرد چغہ نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہم نے تو آج تک گھوڑے کو بیٹھی ہوئی حالت میں اور مرزا غالب کو بغیر ٹوپی کے کسی تصویر کسی پورٹریٹ میں نہیں دیکھا بلکہ ہمارا تو دعویٰ ہے کہ کوئی بھی اردو داں بغیر ٹوپی کے مرزا غالب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ جب مرزا غالب نے پہلے پہل اس دنیا میں قدم رنجہ فرمایا تھا تب بھی ان کے سر پر ٹوپی موجود تھی، البتہ اس کا سائز تب یقیناً چھوٹا رہا ہوگا۔ بہرحال اس باب میں ریسرچ کا کافی مواد موجود ہے کوئی ریسرچ اسکالر اگر بسم اللہ کرے تو مرزا غالب کی ٹوپی اور چغے میں کافی دور تک اپنا ریسرچ کا گھوڑے دوڑا سکتا ہے۔

مرزا غالب کی ٹوپی اور چغہ یقیناً ریسرچ اسکالروں کی توجہ کے مستحق ہیں لیکن فی الحال ان سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے ان کا اِزار بند کیوں کہ اس پر ابھی تک ویسی توجہ نہیں دی گئی جیسی کہ دی جانا چاہیے تھی۔ ٹوپی اور چغے پر ازار بند کو فوقیت ہم اس لیے دے رہے ہیں کہ ٹوپی اور چغے کا تعلق صرف مرزا کی شخصیت سے ہے جب کہ اِزار بند شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا بھی لازمی حصہ ہے ذرا سوچیے اگر ازار بند کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا تو شعروں کی مسلسل آمد کے وقت بطور یادداشت مرزا گرہ کس میں لگاتے، اور جب گرہ ہی نہ لگتی تو نہ کلام محفوظ ہوتا نہ دیوان غالب چھپتا نتیجتاً دیوانِ غالب کے بغیر اردو زبان کا شعر و ادب کس قدر بے مایہ، کس قدر حقیر ہوتا، دوسرے لفظوں میں کلیتہً یتیم ہوتا، یسیر ہوتا، پس مرزا غالب کے ازار بند کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اردو کی تمام یونی ورسٹیوں اور کل اردو اکیڈمیوں کو چاہیے کہ اس موضوع پر مقالے لکھوائے سمینار و سمپوزیم منعقد کروائے اور ظاہر ہے یہ سارے ہنگامے اس عنوان کے تحت ہی ہوں گے مرزا غالب اور ازار بند!

کلام غالب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ دینی کُتب کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والی اردو کتاب کا کریڈٹ دیوانِ غالب ہی کو جاتا ہے۔ ایک عام اندازے کے مطابق دیوانِ غالب ہی وہ واحد شعری مجموعہ ہے جو بائیبل کی طرح آئے دن چھپتا رہتا ہے، البتہ بائیبل بلا ھدیہ تقسیم ہوتی ہے اور دیوانِ غالب معقول قیمت کے عوض ہاٹ کیک کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور یہ بات کسی عام شاعر کے لیے یقیناً اعزاز

سے کم نہیں لیکن دیوانِ غالب کا کمال اس کے آئے دن شائع ہونے والے ایڈیشنوں کی تعداد نہیں بلکہ کلامِ غالب کی وہ شرحیں ہیں جن کی رفتارِ اشاعت اور تعداد دیوانِ غالب کے کل ایڈیشنوں کی تعداد کے اگر برابر نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے غالب پر ریسرچ کرنے والے اسکالروں کی طرح ان کے شارحین کی بھی کمی نہیں بلکہ ایک انبوہ کثیر ان موجود ہے البتہ اس انبوہ کثیر ان میں شعر فہم شارحین تو آٹے میں نمک کے برابر باقی میں زیادہ تر کا تعلق شارحین کے اس گروہ سے ہے جو ہر اس شعر کی تشریح کرنے بیٹھ جاتا ہے جو لاکھ کوشش کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ ان شارحینِ کلامِ غالب کی کوششوں و کاوشوں کے نتیجے میں جو ماحصل تشریح آتا ہے اس کا تعلق موضوعِ سخن کے سوائے ہر چیز سے ہوتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ مرزا غالب کا صرف ایک شعر مع تشریح کے پیش ہے، شارح کا تعلق ظاہر ہے شارحین کے شعر نافہم گروہ سے ہے: مرزا غالب کا مشہور شعر ہے ؂

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

شارح موصوف فرماتے ہیں کہ شعر مذکور میں مرزا غالب نے دراصل اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جو کسی سراپا ناز کی محفل میں ایک دن پیش آیا تھا اگرچہ مذکورہ سراپا ناز بھی کافی مہذب اور سلیقہ مند تھی اور اس کی محفل میں بھی عموماً شرفاء ہی حاضری دیا کرتے تھے، خود مرزا غالب کو بھی مفتی شہر مفتی صدر الدین آزردہ کی سفارش پر اس محفل میں داخلہ ملا تھا جہاں احباب سرِ شام چراغ جلتے ہی جمع ہوتے سب کے جمع ہوتے ہی محفل میں شمع جلتی چونکہ وہ دورِ شرافت کا دور تھا تب بدمعاش بھی تھوڑے بہت شریف ہوا کرتے تھے نتیجتاً اس سراپا ناز کی شریف محفل میں ناز و نوش کے دور بھی شرافت سے چلتے چھیڑ چھاڑ بھی شرافت سے ہوتی شمعِ محفل کے گرد جمع پروانے بھی شرافت سے شمع کا طواف کرتے اور طواف میں بھی پہلے آپ پہلے آپ کا مظاہرہ کرتے قصہ مختصر یہ کہ ہر کام شرافت کے جامے میں ہوتا جہاں شرافت کے دریا قدم قدم پر بہتے ہوں وہاں دھول دھپے کا ماحول مرزا غالب کی ذرا سی نادانی سے بن گیا۔۔۔ ہوا یوں کہ ایک دن جب محفل پورے شباب پر تھی کہ کسی کی شریفانہ چھیڑ پر سراپا ناز کے گلابی ماتھے پر مارے شرم کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں مرزا غالب سے اس سراپا ناز کا یوں بھری محفل میں شرم سے پسینہ پسینہ ہونا دیکھا نہ گیا انھوں نے جھٹ اپنی دستی بالفاظ دیگر استعمال شدہ رومال سراپا ناز کی خدمتِ اقدس میں اس شاعرانہ درخواست کے ساتھ پیش کر دیا ؂

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے ؛ پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

سراپا ناز کے حضور رومال عرف دستی پیش کرنے کے جوش میں مرزا غالب کو یہ ہوش ہی نہیں رہا کہ رومال کا جائزہ لے کر یہ دیکھ لیتے کہ ان کا رومال بدقسمتی سے کس قدر گندہ اور میلا ہے۔ جب صورتِ حال ایسی نازک ہو تو محفل چاہے کتنی تمیز تہذیب والی ہو اس کا درہم برہم ہونا یقینی ہے، اور سراپا ناز چاہے کتنی ہی مہذب اور سلیقہ مند ہو اس کا آپے سے باہر ہونا بگڑنا یہاں تک کہ دھول دھپے پہ اتر آنا لازمی ہے۔ یہ مرزا غالب کا بڑا پن ہے کہ انہوں نے حقیقت چھپائی نہیں یعنی اپنے دھول دھپے کی کارروائی پر پردہ نہیں ڈالا بلکہ اسے من و عن بیان کر کے شعرا حضرات کے تعلق سے علم اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا کہ یہ حضرات مقطعوں میں ہمیشہ تعلّی سے کام لے کر صرف اپنی بڑائی ہی ہانکتے ہیں بھی کبھی شعرا حضرات کو مقطع میں اپنی پٹائی کا بھی اعتراف کرنا چاہیے ۔۔۔!

ملاحظہ فرمایا آپ نے فاضل شارح نے شعر کی تشریح کے نام پہ کس چابک دستی سے شعر میں موجود مذکور پیش دستی میں سے دستی کو الگ کرکے پہلے تو اسے استعمال شدہ رومال میں بدلا پھر اس رومال کو مرزا غالب کے ہاتھوں سراپا ناز کی خدمت میں پیش کروا کے شرفاء کی محفل میں دھول دھپہ کروا دیا۔۔۔ مرزا غالب کو بھی شاید دورِ جدید کے شارحین کے ہاتھوں اپنے اشعار کے ہونے والے حشر کا اندازہ تھا تب ہی تو وہ اس حشر کے تعلق سے پیشگی یہ شعر کہہ گئے۔ ؎

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ ٭ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے ۸۲

ممتاز شاعر مظفر مجاز کے "پیامِ مشرق" کے منظوم ترجمے پر یوپی اردو اکادمی کے انعام کا اعلان ہوا۔ اخبار میں یہ خبر دیکھ کر رؤف خیر نے انھیں فون کیا۔ مظفر مجاز صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "بھئی رؤف خیر تمہارے ہاں فون نہیں ہے اس کے باوجود تم نے پبلک فون سے مبارکباد دی۔ مگر ہمارے احباب جن کے گھروں پر فون ہے انھیں مبارک باد دینے کی توفیق نہیں ہوئی"۔۔۔ رؤف خیر نے کہا، ہاں مظفر بھائی لوگوں کا فون سفید ہو گیا ہے۔ مظفر صاحب شکایت بھول کر بہت دیر تک ہنستے رہے۔

★

ماہنامہ "تیر نیم کش" مراد آباد میں رؤف خیر کی چار غزلیں ایک ہی شمارے میں شائع ہوئیں۔ جہاں پسندیدگی کے کچھ خطوط اگلے شمارے میں شائع ہوئے وہیں سہراب بدایونی نامی کسی صاحب کا خط بھی چھپا کہ رؤف خیر جیسے غیر معروف شاعر کی غیر معیاری غزلیں شائع کرکے صفحات ضائع کئے گئے۔ اس پر رؤف خیر نے ایڈیٹر کو خط لکھا جو شائع ہوا۔ رؤف خیر نے لکھا تھا،

"بدایون کے سہراب بھلے ہی ہمیں ادب کا رستم تسلیم نہ کریں
ہم تو انھیں سہراب ہی مانیں گے"۔

رؤف خیر کے لطیفے

منظور الامین
(حیدرآباد)

سُوئی

سوئی پاکستان کا ایک علاقہ ہے جہاں گیس کا بہت بڑا بھنڈار ہے لیکن جس سوئی کا ذکر اب ہم کرنے جا رہے ہیں وہ ایک ایسی معمولی سی شئے ہے جو ہر گھر میں دستیاب ہے خواہ گھر امیر کا ہو یا غریب کا، فارسی زبان میں سوئی کو سوزن کہتے ہیں ویسے سوزن کا لفظ اردو زبان میں بھی استعمال میں آتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں ٭ جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

ایک چھوٹا سا سوال ہے جس کا صحیح سا جواب یہی ہو سکتا ہے، سوئی کس نے ایجاد کی؟ جواب ہے درزی نے!

گھر میں بچیاں جب ذرا سا ہوش سنبھالتی ہیں تو مائیں ان کے ہاتھ میں قلم کے بعد سوئی پکڑا دیتی ہیں بلکہ زیادہ تر حالات میں سوئی پہلے پکڑا دی جاتی ہے اور قلم بہت بعد میں۔ (اگر موقع رہا) بچیاں کپڑے پر ٹانکے ڈالنا شروع کر دیتی ہیں آگے چل کر ٹانکے ٹھیک سے لگنے نہ پائیں تو مائیں ان کی اچھی خاصی مرمت کر دیا کرتی ہیں، ٹانکے ڈالنا بھی ایک فن ہے جو لڑکی جتنے خوب صورت ٹانکے ڈالتی ہے اس کے فن کی اتنی ہی تعریف ہوتی ہے۔

سوئی کے ٹانکوں کو دلچسپ نام دیئے گئے ہیں مثلاً HERRING BONE یہ ٹانکا مچھلی کے کانٹے کی طرح کا ہوتا ہے ZIG - ZAG (ٹیڑھا میڑھا) رواں ٹانکا (RUNNING STITCH) سندھی ٹانکا، FEATHER STITCH تریچی وغیرہ۔

پرانے زمانے میں جب سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی سرجری کے بعد زخم کو سوئی سے سینے کا رواج اتنا عام نہیں تھا تب زخم کے سروں کو ملا کر ایک بڑے مکوڑے کے منہ میں پکڑوا دیا جاتا تھا پھر مکوڑے کا سر دھڑ سے الگ کر دیا جاتا تھا زخم کے مندمل ہونے تک مکوڑے کا شکنجہ دہیں رہتا تھا۔ ابھی حال حال تک سرجری کے بعد زخم مندمل ہونے سے پہلے ہی کے ٹانکوں کو کاٹ کر نکالا جاتا تھا جس میں مریض کو خاصی تکلیف ہوتی تھی پھر CAT - GUTS سے زخم کی سلائی کی جانے لگی۔ پھر ایسی CAT GUT ایجاد ہوئی جسے کاٹنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی یہ ٹانکے خود بخود تحلیل ہو جاتے ہیں۔

سوئیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں گھڑی کے سکنڈ اور منٹ کے کانٹوں کو بھی سوئی ہی کہتے ہیں اسے بھی سوئی کہتے ہیں جس سے انجکشن دیا جاتا ہے۔ وہ بھی سوئی ہی ہوتی ہے جس سے کپڑوں کو سیا جاتا ہے مشین ہو جس سے

لائی کی جاتی ہے ایک قسمت کی سوئی ہوتی ہے جو کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیتی ہے وہ طعن و تشنیع کی سوئی
ہے جو کلیجے میں چبھ کر رہ جاتی ہے نکالنے کی کوشش کرو تو بھالا بن جاتی ہے بابا فرید رحمتہ کے اقوال سکھوں کی
مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب میں جگہ جگہ نقل کیئے گئے ہیں) نے ایک جگہ لکھا ہے "مجھے سوئی دیجئے قینچی نہیں کیونکہ
میں جوڑنا چاہتا ہوں، کاٹنا نہیں"، اب اس قول میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہے، سوئی سے دراصل جوڑنے ہی کا
کام لیا جاتا ہے اس حقیر سی مگر غضب کی نازک سی شے سے جو ملبوسات ـــــ عام آدمی کے پہننے والے بھی اور
ڈیزائنر ملبوس بھی ـــــ تیار کیئے جاتے ہیں وہ آدمی کو انسان بنا دیتے ہیں اس طرح ایک نہایت ہی ادنیٰ شئے کی مدد
سے آدمی کے نہ صرف عیوب برہنگی کو ڈھانپا جا سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ جسم کی حفاظت اور زینت بھی ہو جاتی ہے
ایک معمولی سی شئے کی مدد سے آدمی کو ایک تہذیب یافتہ انسان بنا دیا جاتا ہے اسے سوئی کا اعجاز ہی کہہ سکتے ہیں.

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست !

کنوئیں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پیاس لگنے کی صورت میں جب کسی کنوئیں سے پانی پیو تو اس شخص کو
نہ بھولو جس نے وہ کنواں کھدوا تھا، مطلب کنوئیں کھودنے والے کے حق میں دعائے خیر کرو، اسی طرح ہم
کہیں گے جب تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے پہنو تو اس شخص کو نہ بھولو جس نے سوئی ایجاد کی تھی اور تمہیں سر سے پاؤں
تک انسان بنا دیا ـــــ ذرا سوچیں کہ جو سوئی نہ ہوتی تو کیا ہوتا! بس اے انسان اس شخص کو دعائیں دے جس
نے سوئی ایجاد کر کے تجھے ملبوس کی دولت عطا کی، صاحبو! ویسے سچائی تو یہ ہے کہ آج کا انسان ہر لباس میں ننگِ
وجود ہے! وہ شخص جس نے پہلے پہل سوئی ایجاد کی ہوگی واقعی دنیا کا بے حد عقل مند شخص رہا ہوگا، انسانیت پر
اس کا بہت بڑا احسان ہے اگر سوئی نہ ہوتی تو انسان آج بھی جانوروں کی طرح تن برہنہ گھومتا پھرتا ہوتا. ایک ایسی
سچویشن جس کا تصور بھی ممکن نہیں! اگر سوئی نہ ہوتی تو شاید انسان صرف چادر لپیٹے گھوم رہا ہوتا. نہ پتلونیں ہوتیں
نہ قمیصوں کی فراوانی، نہ سوٹ ہوتے نہ شیروانی، نہ زحمت ہوتی نہ پریشانی. اگر ہوتی تو صرف تن آسانی!

سوئی سے متعلق بہت سے الفاظ اور محاورے انگریزی زبان میں استعمال میں ہیں، نیڈل ورک سوئی کاری
کو کہتے ہیں، نیڈل فش ایک قسم کی مچھلی ہوتی ہے نیڈل فل اُس دھاگے کی لمبائی کو کہتے ہیں جسے ایک ہی وقت میں
سوئی میں پرو دیا جاتا ہے انگریزی میں ایک اور محاورہ عام ہے NEEDLE IN A HAY STACK
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے سوئی کی تلاش بے سود ہے کیوں کہ وہ تو گھاس کے انبار تلے دبی ہوتی ہے نیڈل گیم اس
کھیل میں فریقین آپس میں اپنا بغض و عناد نکالتے ہیں. نیڈل پوائنٹ اہم ترین نقطے کو کہتے ہیں، تلو پطرہ کی سوئی
کا مطلب ہے نکیلی چٹان یا پہاڑ کی چوٹی، مگر الکٹرانک میڈیا میں کام کرتے ہیں نیڈل ٹائم کی اصطلاح سے بخوبی
واقف ہیں یہ پروگرام کا وہ حصہ ہے جس میں ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔
آپ نے دنیا کے مشہور ترین ماہر قلب (CARDIOLOGIST) ڈاکٹر مائیکل ڈی بیکے کا نام شاید سنا
ہو یہ ڈاکٹر ہیوسٹن (امریکہ) کے مشہور اسپتال ٹیکساس میڈیکل سنٹر کے امراض قلب ڈویژن سے برسوں تک وابستہ
[illegible] صدر یلتسین کے دل کا [illegible] ڈاکٹر

ڈی بیکے بہ نفسِ نفیس موجود تھے اور ٹی وی اسکرین پر آپریشن ہوتا دیکھ رہے تھے اگر ضرورت پیش آتی تو ڈی بیکے
اپنے شاگرد کو ہٹا کر خود ملیٹیشن کی سرجری کر دیتے۔

ان ہی ڈی بیکے کا ایک واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ میتھوڈسٹ اسپتال کے راؤنڈ پر تھے کہ
انھیں ڈاکٹر انیتا سے ملنے کا خیال آیا جو اس اسپتال میں کام کرتی تھیں ڈی بیکے، ڈاکٹر انیتا کے کمرے میں داخل ہوئے
تو انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنی بیٹی جِل کی ایک سہیلی کے لیے ایک ملبوس سیتی بیٹھی ہیں ان کے ہاتھ میں سوئی تھی، ڈی بیکے
نے وہ ملبوس انیتا کے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈال کر انیتا سے پوچھا کہ جو بھی ٹانکے وہ لباس پر ڈال رہی
ہیں امید کہ وہ (BASTE STITCHES) کچی سلائی یا ٹپا سلائی کے ٹانکے ہیں انیتا نے نفی میں سر ہلایا اور
بولی کہ وہ REGULAR ٹانکے ہیں، ڈاکٹر ڈی بیکے نے بچی کا فراک انیتا کے ہاتھ سے لے لیا اور ان ٹانکوں
کو غور سے دیکھ کر کہا سنو انیتا، میری والدہ (SEAMSTRESS) درزن تھیں انھوں نے ہی مجھے کپڑوں
پر سوئی ڈالنا سکھایا تھا، اگر والدہ نے مجھے کپڑے پر اس طرح غلط ٹانکے ڈالتے دیکھا ہوتا تو یقین ہے کہ وہ
مجھے مار ڈالتیں۔"

اتنا کہہ کر ڈی بیکے نے انیتا کے پاس رکھی قینچی اٹھالی ساتھ ہی سوئی دھاگا بھی ہاتھ میں لے لیا کپڑے
کے سارے ٹانکے ادھیڑ دیئے اور پھر نہایت ہی چابک دستی سے سوئی سے نئے سرے سے ٹانکے ڈالنے شروع کر دیئے۔
انیتا نے بعد میں کہا ڈاکٹر ڈی بیکے نے کپڑے پر نہایت خوب صورت چھوٹے چھوٹے ٹانکے ڈالے اور فراک
تیار کر دیا۔

اس دنیا میں کئی اشخاص آج بھی موجود ہیں جن کے جسموں کو ماہر قلب سرجن ڈی بیکے نے اپنی سوئی سے
سیا ہے، لیکن ایسا ایک آدھ ہی خوش قسمت ہوگا (اشارہ ہے انیتا کی بیٹی کی سہیلی کی طرف) جس کا پورا ملبوس
اس مشہور ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ سے سیا ہوگا وہ سوئی بھی قابلِ احترام ہے جسے اس مقتدر ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ
لے کر دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوب صورت لباس تیار کر دیا۔

نادان ہوتے ہیں وہ لوگ جو ایسی جگہوں پر جہاں سوئی نہیں گھس سکتی وہاں بھالے سے کام لینے کی کوشش
کرتے ہیں ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سوئی کے ناکے میں سے خود سوئی نہیں گزر سکتی۔

قرآن مجید میں بھی سوئی کا ذکر آیا ہے اور بڑے خوب صورت اور پُر تاثیر انداز میں، قرآن کے آٹھویں پارے
کے سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ۔۔۔۔ وہ لوگ کبھی جنّت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ
سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جائے۔"

دیوانگی اور رفوگری کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، دیوانہ، عالمِ جنوں میں ہی اپنا گریباں چاک کر دیتا ہے
اور پھر عالمِ ہوش میں سوئی لے کر اسے رفو کرتا چلا جاتا ہے، میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مگر دیوانہ تھا گُل بھی کسو کا

اردو شاعری میں چاک دامن، چاک گریباں، چاک قمیص جیسے الفاظ اکثر استعمال کئے جاتے ہیں، اردو شاعروں کی عجب حالت ہے، بہار آتے ہی وہ چاک گریباں کرکے صحرا صحرا نکل پڑتے ہیں۔ اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں۔ جب شاعروں پر طاری یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو انھیں سوئی کی تلاش ہوتی ہے کہ وہ گریباں کو پھر سے سی ڈالیں، تب ایک عدد سوئی حاصل کرکے وہ اپنے تار تار جامے کی بخیہ گری کرتے جاتے ہیں مگر وہ ہے کہ پھٹتا جاتا ہے ہاں اِتنا ہوش ضرور رہتا ہے کہ انھیں صد چاک جامہ بدل لینا چاہئے مگر ۔ ۔ ۔ مہلت ہی نہ دی فیض کبھی بخیہ گری نے!

تابش خانزادہ (امریکہ)

احمق

چوری اور چور نسل انسانی کی طرح پرانے ہیں معلوم نہیں کہ سب سے پہلے کس نے چوری کی تھی اور اس کے
ساتھ کس طرح کا سلوک کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے چوری بھی بہت سی دوسری بلاؤں کی طرح GENETIC ہے۔
ہر انسان نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر چوری ضرور کی ہوگی۔ کوئی ایک پیسہ چراتا ہے، تو کوئی ایک کروڑ۔ یعنی چور بھی حسبِ توفیق
چوری کرتے ہیں۔ جس کو جیسا موقع ملا اس نے پیسہ چرایا جس کو لاکھوں اور کروڑوں کا موقع اس نے لاکھوں اور کروڑوں
چرائے۔ کسی صاحب نے اپنے دفتر سے ایک پن یا پنسل چرا کے اپنے بچوں کو لا کر دے دی تو کسی نے وقت کی چوری کی تو کسی
نے محنت سے جی چرایا۔ کبھی کبھار کوئی آنکھیں بھی چرا لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے "میں نے کبھی کچھ نہیں
چرایا"، تو میں اس کو زبان چرانے کا ملزم یعنی جھوٹا کہوں گا۔ اس لیے کہ چوری انسان کی فطرت ثانیہ ہے مطلب ہر انسان
جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے زندگی میں کسی نہ کسی موقع پر چوری کا ارتکاب ضرور کرتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ
ہر آدمی زندگی کے کسی نہ کسی موقع پر چوری کا مرتکب ضرور ہوا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اپنے آپ کو راہِ راست پر لے آیا اور اس
نے چوری کا پھر ارتکاب نہ کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے خود کو اس چوری کا ارتکاب کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو اور پھر تائب ہو گیا ہو۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو چوری کو اپنی عادت بنا کر ہمیشہ کے لیے یہ فن اپنا لیتے ہیں۔ وہ جہاں کبھی جائے
ہوں، جس حال میں بھی ہوں، اپنی چوری کرنے والی عادت سے باز نہیں آئیں گے۔ چور کس طرح اپنے نشانے بناتے ہیں یہ
تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میرا ایک دوست پچھلے ایک سال سے مسلسل چوروں کی ستم ظریفی کا شکار ہوتا چلا آرہا ہے
معلوم نہیں چور کو اس کی کون سی ادا بھا گئی پچھلے سال اس کے گھر چوری کی تین وارداتیں ہوئیں معلوم ہوا کہ صاحب گھر پر نہیں تھے،
چور آئے اور جھاڑو پھیر گئے۔ ایک دفعہ چور ڈریسنگ روم میں رکھا ہوا زیورات کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے۔ میں نے پوچھا، یار یہ
تم پر ہی بجلی کیوں گرتی ہے کچھ روشنی تو ڈالو، کہنے لگے یار ایک دفعہ ہم کسی دعوت میں گئے تو جاتے وقت گیراج کا دروازہ
بند کرنا بھول گئے۔ دوسری دفعہ کسی کے ہاں ملنے گئے تو گھر کا مین گیٹ کھلا چھوڑ گئے۔

سلیم بھائی کا حال اس سے بھی برا ہوا۔ ایک ماہ میں ان کے گھر چوری کی تین وارداتیں ہوئیں۔ میں نے کمال کر کے اظہارِ
افسوس کیا اور پوچھا کہ بھائی ذرا مجھے چوری کی تفصیل تو بتاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے ہاں ایک ماہ میں چوری کی یہ تیسری واردات
ہوئی ہے تمہارے گھر میں چور کو بھگانے والا الارم بھی تو ہے کہ کسی شخص نے بھی ذرا غلط طریقے سے گھر میں داخل ہونے کی کوشش

کی فوراً الارم بجنے لگتا ہے اور پولیس کو خبر ہو جاتی ہے اور پولیس موقع واردات پر پہنچ کر چور کو پکڑ لیتی ہے جواب دیا ”یار الارم کا کوڈ نمبر ہم یا میری بیوی کو یاد نہیں رہتا اس لیئے ہم نے نمبر الارم کے بالکل نیچے لکھ کر لگا دیا ہے“۔ بقول شاعر ع

ہم ہنس دیئے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردہ تیرا

اور یہ کلیم صاحب سے ملیں ان کے ساتھ بھی اس قسم کی وارداتیں ہوئیں۔ چار دفعہ کسی نے ان کی مختلف گاڑیوں میں سے ٹیپ ریکارڈر چرا لیا۔ ایک دفعہ ان کی دو گاڑیوں کے سارے ٹائر چرا کر لے گئے اور گاڑیاں اگلے دن اینٹوں پر کھڑی ہوئی ملیں۔ ایک دفعہ تو ان کی نئی کرولا ہی لے اڑے۔ مجھے بہت افسوس ہوا میں ان کے گھر گیا کہ بھائی کو کچھ دلاسہ دوں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ان کے گھر میں دو کاروں کا گیراج تھا۔ اس کے باوجود ان کی گاڑیاں باہر کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا یہ چوری کی واردات کہاں ہوئی کہنے لگے ”اس گھر کے باہر رات“ کو میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا کہ آپ اپنی گاڑیاں باہر کھڑی کرتے ہیں جب کہ آپ کے گھر میں دو کاروں کا گیراج بھی ہے۔ بڑی معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے بولے ہمیں تو معلوم ہے۔ امریکہ ہے اور یہاں لوگ گیراجوں میں کوڑا کباڑ رکھتے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہماری بے پروائی چور کو ہمارے گھر میں چوری کرنے کا موقع دیتی ہے اور ہماری حماقت چور کو ہماری متاع پر ہاتھ ڈالنے کی دعوت دیتی ہے۔ احمق ہم ہیں جو کوڑا کباڑ گیراج میں رکھ کر قیمتی گاڑیاں سڑکوں پر چوروں کے لیے کھڑی کر دیتے ہیں۔

باز غ بہاری
(کلکتہ)

"الکشن کی بہار"

پھر ملک میں آیا ہے الکشن کا زمانہ
ہر شہر میں، ہر گاؤں میں ٹینشن کا زمانہ
نیتاؤں کا جنتا سے کنکشن کا زمانہ
مائک سے اُبلتے ہوئے بھاشن کا زمانہ
وہ شہد میں ڈوبی ہوئی تقریر دھواں دھار
تقریر میں ہے وعدۂ تعمیر دھواں دھار

کہتا ہے کوئی چھوٹ کسانوں کو ملے گی
اور نوکری بے کار جوانوں کو ملے گی
سروس پہ بڑی فنس پٹھانوں کو ملے گی
بی کو مدد پاک مکانوں کو ملے گی
ہر لفٹ غریبوں کو سرِ راہ ملے گی
اب وقت پہ ٹیچر کو بھی تنخواہ ملے گی

کرتے ہیں نظر اس پہ تو ہوتا ہے گماں اور
دُنیا میں بھلا ہے کہیں اُردو سی زباں اور
کہنے کو تو بسیار زبانیں ہیں یہاں اور
کہتے ہیں کہ اردو کا ہے اندازِ بیاں اور
پرکھوں کا، بزرگوں کا اثاثہ ہے یہ اُردو
نازاں ہو وطن جس پہ وہ بھاشا ہے یہ اُردو

البرٹ ہے، شرفو ہے نہ پربھو ہے یہ اُردو
سکھ ہے نہ مسلماں ہے نہ ہندو ہے یہ اُردو
اِک ضربِ دَر و بامِ من و تو ہے یہ اُردو
ہر جذبۂ تعمیر سے مملو ہے یہ اُردو
بنواؤں گا ایک شیش محل بعدِ الکشن
اور نام سے اردو کے کروں گا میں معنون

تسلیم مجھے، شہر میں پانی کا ہے فقدان
ہر گاؤں میں آتا ہے نظر حشر کا میدان
اب مجھ پہ بھروسہ کریں، سکھ ہندو مسلمان
وعدہ ہے مرا آپ سے یہ برسرِ اعلان
گھر میں گھسا دوں گا سمندر کی روانی
بھگوان قسم سب کو پلا دوں گا میں پانی

(سلسلہ صفحہ ۲۸ پر)

ہر گھر میں جو رہتا ہے گھٹا ٹوپ اندھیرا
منہ روز چڑھاتا ہے غریبوں کا سویرا!
کرتی ہے شبِ تار جہاں رین بسیرا
کھا کر میں قسم کہتا ہوں وعدہ ہے یہ میرا
بن جاؤں اگر آپ کی کرپا سے منسٹر
بجلی کا بٹھا دوں گا ہر اک گھر میں ہی میٹر

امرت نہ سہی، زہر کا پیالہ میں نہیں ہوں
بھگوان قسم! دال میں کالا میں نہیں ہوں
وشواس کرو مجھ پہ "حوالہ" میں نہیں ہوں
ناموسِ وطن بیچنے والا میں نہیں ہوں
ووٹوں کو برتنے میں اگر بھول ذرا کی
یہ دیش بھی بن جائے گا حمام کی لنگی

کہتا ہے کوئی، دیکھو، گدھا میرا ہے سمبل
بھر دیجئے کہتا ہے کوئی میرا کمنڈل
پبلک سے کوئی کہتا ہے، آ، ساتھ مرے چل
وعدہ ہے کھلاؤں گا، کلو دو روپے چاول
واللہ یہ لیڈر کی پئے ووٹ گزارش
وعدہ ہے الیکشن کا، فقط ٹائیں ٹائیں فش!

شیخ امیر سرور (اکولہ)

الیکشن

آگیا لو پھر سے بھارت میں الیکشن دیکھنا — لیڈروں کا بھولی جنتا سے افیکشن دیکھنا
ہوگئے تھے قوم سے نیتا ہمارے ڈسکنکٹ — جُڑ گیا پھر قوم سے ان کا کنکشن دیکھنا
جانے کیسی دیں گے یہ سرکار ہم کو دیش میں — رنگ کیا دکھلائے گا اپنا سلیکشن دیکھنا
پھر گراتے ہیں حکومت یا چلاتے ہیں اُسے — ایکشن ہم نے کیا ہے تم ری ایکشن دیکھنا
سب کے نعرے ہیں الگ اور سب کے وعدے مختلف — جانے کیا کیا گل کھلائے گا کلیکشن دیکھنا
سب کو یہ دعویٰ بنائیں گے نیا ہندوستان — کر بھی پائیں گے یہ بھارت کا کریکشن دیکھنا
سونپ دی ہم نے حکومت ان پہ کر کے اعتماد — لے نہ ڈوبے دیش کو ان کا فریکشن دیکھنا
قوم اوندھے منہ پڑی ہے انتخابی میز پہ — ہو رہا ہے پوسٹ مارٹم یا ڈی سیکشن دیکھنا
اب تو سرور سارے عالم کی نگاہیں ہم پہ ہیں — مان بڑھتا ہے یا ہوتا ہے ری ڈکشن دیکھنا

مرزا کھونچ نیا ٹولہ، بیتیا (بہار)

"بُفے سسٹم"

دعوت کا رواج کب سے ہے، کہنا مشکل ہے۔ لیکن دعوت کا نام سنتے ہی منہ میں پانی آنے لگتا ہے۔ اور اس پانی میں انواع اقسام کے مزے تیرنے لگتے ہیں۔ لاکھ مشغولیت ہو لیکن دعوت کے لیے وقت نکل آتا ہے۔ کچھ لوگوں کو دعوت کھانے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ کئی میل پیدل چل کر بھی دعوت میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں انھیں دو دنوں تک آرام کرنا پڑتا ہے۔ کچھ مدعوئین دعوت کی خوب تعریف کرتے ہیں "خوب کھلایا، میں نا نا کرتا جا رہا تھا اور وہ میری پلیٹ میں ڈالتے جا رہے تھے"۔ کچھ کھانے میں عیب نکالتے ہیں "گوشت گل گیا تھا مگر شوربہ کچا ہی رہ گیا تھا۔ پکے تیل کی بو آ رہی تھی۔ میٹھے میں چینی کی کمی تھی۔ رائتہ میں کئی دنوں کا باسی دہی تھا۔ لگتا ہے طبیعت ضرور خراب ہوگی"۔ کچھ انتظام کاروں کو کوستے ہیں، "میں آدھا پیٹ ہی دسترخوان سے اٹھ گیا۔ ایک بار جو میری تھالی میں رکھ کر گئے تو دوبارہ نہیں آئے۔ اوقات نہیں تھی تو پوچھا ہی کیوں"؟ غرض کہ جتنے منہ اتنی بات۔ پھر بھی دعوت کی اہمیت اپنی جگہ پر جوں کی توں برقرار ہے۔ اس کی عزت اور شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

جہاں تک دعوت کھلانے کے آداب کا سوال ہے تو میں یہ عرض کر دوں کہ یہ اپنی طرز رہائش پر منحصر ہوتا ہے کہ کون کیسے کھلاتا ہے۔ پائجامہ، لنگی اور دھوتی میں زمین پر بیٹھ کر کھانا دشوار نہیں ہے۔ ایسا لباس زیب تن کرنے والوں کو دسترخوان بچھا کر کھلایا جا سکتا ہے لیکن آج کل پینٹ شرٹ والے مہمان زیادہ آتے ہیں انہیں آلتی پالتی مار کر کھانے میں دقت ہوتی ہے۔ ٹیبل کرسی پر کھانے میں کسی کو دقت نہیں ہوتی۔ ان ہی مسائل کو دیکھتے ہوئے کھڑے کھڑے کھلانے کا رواج چل نکلا ہے اس رواج میں آپ کی بحث کسی مولوی سے کھانے کے آداب پر ہوگی نہ کسی پنڈت سے بھوجن پروسنے سے سمبندھت پروچن سننا پڑے گا۔ آپ کو یقین نہ ہو تو چلئے کسی ایسی دعوت میں جہاں بُفے سسٹم کے تحت مہمانوں کو کھلایا جا رہا ہو۔ یہاں آپ چاہے جتنا کھالیں کوئی روکنے والا یا ٹوکنے والا نہیں ملے گا۔ آپ چاہیں تو کھڑے کھڑے کھائیں چاہیں تو بیٹھ کر کھائیں، آپ کی مرضی۔ آپ کو جس طرح کھانے میں سہولت نظر آئے اسی طرح کھائیے۔

اگر آپ بدن یا ہاتھ سے مضبوط ہیں، کہنی مارنے اور ہاتھ مارنے میں استاد ہیں، 'کہو کلچر' کے خوگر ہیں یعنی رائٹن

کی سرکاری دُکان کی لائین میں کھڑے ہونے کے عادی ہیں تو آپ اس بُفے سسٹم کا بھرپور مزہ لے سکتے ہیں ورنہ کبھی آدھا پیٹ اور کبھی صرف رائتہ پر صبر کرنا پڑے گا۔ اس سسٹم میں ہوتا یہ ہے کہ کھانے کے الگ الگ کاؤنٹر لگے رہتے ہیں۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو اس کاؤنٹر پر جائیے اور اپنی رکابی کاؤنٹر لوائے کے سامنے کر دیجئے وہ حسب ضرورت آپ کی رکابی میں وہ چیز ڈال دے گا۔ گوشت کی ضرورت ہو تو گوشت کے کاؤنٹر پر جائیے۔ پلاؤ کم پڑ جائے تو پلاؤ کے کاؤنٹر پر جائیے۔ گویا کشکول لیے دسترخوان دروازے پر آواز لگاتا ہے اور یہیں سے شروع ہوتا ہے آپ کی قسمت آزمائی اور طاقت آزمائی کا سلسلہ۔ ادھر میزبان کا اشارہ ہوا اُدھر دعوت کی کارروائی شروع سارے رشتے ناطے توڑ کر ہر شخص اپنی پلیٹ بھرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اگر آپ رشتے ناطوں کی پرواکریں گے تو آپ کی پلیٹ ہمیشہ خالی رہے گی۔ اس طرح کی دعوت میں آپ بھری رکابی لیے ذرا بھی لڑکھڑائے تو آپ کے کپڑے کی خیر نہیں، شوربہ آپ کے کپڑوں کو شرابور کر دے گا۔ جب جب کاؤنٹر پر جائے گا تب تب روک ٹوک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اللہ اللہ کر کے پلیٹ لیے کاؤنٹر تک پہنچ گئے اور من پسند چیزیں لینے کے بعد اگر غلطی سے کاؤنٹر لوائے سے نظریں مل گئیں تو اس وقت بڑی شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ نظروں ہی نظروں میں وہ کہتا ہے "لگتا ہے اسے اچھا کھانا ملا ہی نہیں، چلا آرہا ہے ہاتھ پسارے"۔ اگر دوسری بار وہاں پھر پلیٹ لیے ہوئے پہنچے تو وہ آپ کو ایسی حقارت بھری نظروں سے دیکھے گا کہ اگر آپ باظرف ہوں گے تو فوراً اپنا کچھ لیے لوٹ آئیں گے۔ اس لیے کاؤنٹر پر بار بار جائیے پر مگر نظریں نیچی کیے۔

اس طرح کی دعوت میں کامیاب وہی ہوتا ہے جو اپنی پلیٹ کو ہر کاؤنٹر تک پہنچاتا رہتا ہے۔ اور پلیٹ میں خالی جگہ نہیں رہتی اب ذرا اس بھری پلیٹ کا نظارہ کیجیے۔ پلیٹ میں ایک بغل میں دہی بڑا ہے تو دوسری طرف میٹھا ٹکڑا کبھی میٹھا ٹکڑا شوربے میں ڈبکی لگا رہا ہے تو کبھی دہی بڑا پلاؤ کے بوجھ سے دبا ہوا رائتہ اپنے وجود کی حفاظت کے لیے سرمار رہا ہے کیوں کہ اس نے پلیٹ میں پہلے قدم رکھا تھا اس بات سے یہ ظاہر ہوا کہ کسی بھی معاملہ میں پہلا قدم جو رکھتا ہے اس کا انجام رائتہ کی طرح ہوتا ہے اُدھر پاپڑ بیچارا اپنی ساری اکڑ فوں بھول کر اپنی آبرو بچانے کے چکر میں پڑے ہیں کیوں کہ میٹھے ٹکڑے کا رس انہیں بے بس کئے ہوئے ہے۔ ایک ذائقہ دوسرے ذائقہ میں مل کر قومی یک جہتی کا نظارہ پیش کر رہا ہے۔

تو جناب یہ ہے بُفے سسٹم کوئی خوب کھاتا ہے تو کوئی صرف آہیں بھر کر ہی رہ جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف بھری ہوئی پلیٹ یک جہتی اور سیکولرزم کا درس دیتی ہے وہیں دوسری طرف اس طرز کی دعوت انسان کو قوتِ ارادی خود غرضی اور انفرادی کوشش کا درس دیتی ہے۔ بُفے سسٹم اپنے ملک میں کیسے آیا اس پر مورخ چُپ ہیں لیکن یہ طے ہے کہ یہ سسٹم ہمارے یہاں آگیا ہے جب کہ روایتی دسترخوان کی شان ہی کچھ اور ہے اس دعوت میں جو بھی کھانے کا سامان آتا ہے وہ اپنا منفرد ذائقہ لئے آتا ہے جس سے اچھے بُرے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ دعوت پلاؤ گوشت کی ہو یا ترکاری کی۔ کمزور دل گردہ والا مہمان اور کبھی باز مہمان ایک ہی ساتھ بیٹھ کر کھاتے نظر آتے ہیں۔ دسترخوانی دعوت میں منزل خود بخود چل کر سامنے آجاتی ہے میزبان کتنے پیار سے گھوم گھوم کر پوچھ پوچھ کر کھلاتا ہے اس کا اندازہ بُفے سسٹم میں نہیں ہوتا۔ بُفے سسٹم جلد وجبار کا نام ہے۔ ذائقوں کے کھو جانے پر۔ کھانے والا بھی اس ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔

الیاس فرحت

(اورنگ آباد)

بَیر

سُنتے آئے ہیں کہ دُنیا میں جھگڑے عموماً تین باتوں کی وجہ سے ہوتے ہیں ''زر''. ''زن'' یا ''زمین'' لیکن ہمارا معاملہ کچھ اور ہی ہے. زر نام کی چیز ہمارے پاس ہے نہیں. ایک معمولی تنخواہ ہے جو بمشکل مہینے کی دسویں تاریخ تک چلتی ہے اور اس کے بعد وہی اُدھار سُدھار. کبھی یہاں سے کبھی وہاں سے اور کبھی کہیں سے کچھ بھی نہیں. رہی زن کی بات تو ہماری ایک عدد کالی پیلی ٹوٹی پھوٹی بدصورت بیوی تھی جو دو عدد بچے ہمارے متھے مار کر اللہ کو پیاری ہو گئی. پتہ نہیں اللہ میاں کو اس کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ فوراً اُٹھا لیا. اس کے تعلق سے لڑائی جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب رہی زمین کی بات تو وہ ہماری پشتوں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی. بس کرایہ کے مکانوں میں گزارا کرتے چلے آرہے ہیں کبھی اِس مکان میں تو کبھی اُس مکان میں اور آئندہ بھی ہماری سات پشتوں تک ہماری اپنی زمین ہونے کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا پھر بھی آغا صاحب کو ہم سے بَیر ہے. نہ جانے کیوں ــ؟ وہ آتے جاتے ہمارا اکثر مذاق اُڑایا کرتے ہیں. ہم کو قریب سے گزرتا دیکھ کر وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ ضرور دیتے ہیں. طنز بھری مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر کھیلنے لگتی ہے اور جیسے ہی سامنا ہوتا وہ گلا پھاڑ کر ضرور ہنستے ہیں. ہم نے اُن کے گلا پھاڑ کر ہنسنے کا نوٹس کبھی نہیں لیا اور بازو سے اس طرح گزر گئے جیسے وہ ہم پر نہیں کسی اور پر قہقہہ لگا رہے ہیں. ہم نے یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ آخر اُن کو ہم سے کس بات پر ''بَیر'' ہے. ممکن ہے شاید اُن کو ہمارا حلیہ پسند نہ ہو یا شاید ہماری پھٹے حالوں شخصیت. بہر حال آج کل جمہوریت کا زمانہ ہے اور ہر کسی کو اپنی کہنے کی آزادی ہے لیکن آغا صاحب شاید یہ نہیں جانتے کہ آزادی کا یہ حق کسی کی دل آزاری کی اجازت نہیں دیتا. لیکن وہ کہاں اتنے پڑھے لکھے تھے کہ اس بات کو سمجھ سکیں اس لیے ہم نے ہمیشہ چُپ سادھ لی اور آغا صاحب اس خاموشی کا فائدہ اُٹھاتے رہے. ویسے خود آغا صاحب کس قماش کے آدمی تھے آپ ان کی ان باتوں اور حرکتوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عمر کے پچاسویں سال بھی وہ جینس پتلون پہنتے تھے اوپر سے رنگوں والی جرسی جس پر بروسلی کا فوٹو اُترا ہوا تھا! آنکھوں پر کالا چشمہ. گلے میں ریشمی مفلر پیروں میں لانگ بوٹ اور یوں اکڑ کر چلتے تھے جیسے کسی فلم کا ویلن جا رہا ہو. محلے میں ہر کسی کے معاملہ میں ٹانگ اڑانا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے. وہ تھے تو کسی دفتر میں چپراسی لیکن محلے والوں پر ایسا رعب ڈال رکھا تھا جیسے وہی دفتر کے باس ہوں. ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی بول لیتے تھے. تھینک یو بھی بول لیتے تھے مگر بڑی تجاہل سے سر پہ نیلے کی کالی ٹوپی پہنتے تھے جس کا

اگلا حصہ فیشن کے طور پر بائیں طرف کان کے اوپر رکھتے تھے۔ مونچھیں گھنی اور لانبی جن کو کالی مہندی مل مل کر کڑک کر لیا جاتا تھا۔ آنکھوں میں غضب کی مکاری۔ دیکھتے ہی محسوس ہو جاتا تھا کہ آدمی گھاگ ہے۔ کبھی کسی کو نہیں بخشتے جو ان سے ایک بار ٹکرا جاتا جیب خالی کر کے ہی لوٹتا تھا۔ 'ملائی والی چائے'، لانبا فلٹر سگریٹ اور خوشبودار زردہ کا پان کھائے بغیر نہیں چھوڑتے۔ ہاتھ میں ایک عدد چھڑی بھی ہوتی تھی جو کسی افسر نے جاتے جاتے عطا کی ہوگی اور بعد میں واپس لینا بھول گیا ہوگا یا آغا صاحب نے ہی گول کر لی ہوگی۔ ہر شام بڑی آن بان کے ساتھ گھر سے نکلتے اور باہر نکل کر ایک طائرانہ نظر اطراف و اکناف پر ڈال لیتے اور پھر آپ ہی آپ ہلکا سا مسکرا دیتے۔ چونکہ ہمارے پڑوس میں بلکہ بغل کے گھر میں رہتے تھے اس لیے ہم پر باہر سے بلند آواز سے پھبتی کسے بنا ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ہماری کھڑکی کے پاس آ کر ضرور آواز نکالتے "او چڑی کے غلام۔ کیا حال ہے۔ سب خیریت ہے نا۔" وہ یہ یوں کہتے جیسے کسی اور سے مخاطب ہوں۔ پھر ان کے حواری زوردار قہقہہ لگاتے "ارے بھائی باہر نکل کیا چوہے کی طرح بل میں بیٹھا ہے"۔ یہ دوسرا حملہ ہوتا مگر ہم ہیں کہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ ہمارے دونوں بچے خوف زدہ ہو کر ہم سے لپٹ جاتے اور ہم ان کی دلجوئی میں لگ جاتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ آغا صاحب کیا چاہتے تھے۔ وہ کیوں ہم سے الجھنا چاہتے تھے یہ ہم آج تک نہیں سمجھ پائے۔ ہمارا کبھی ان سے جھگڑا نہیں ہوا۔ آج تک ہم نے ان کے خلاف کسی کے سامنے ان کی شان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا پھر بھی وہ ہم سے نالاں تھے اور ان کی ہر بار یہی کوشش ہوا کرتی تھی کہ ہم کسی طرح اشتعال میں آئیں اور ان سے لڑ بھڑ بیٹھیں ـــــ یہ عمل پچھلے دو سال سے جاری تھا جب وہ ہمارے بغلی والا مکان اونے پونے داموں میں خرید کر رہنے کے لیے آ گئے تھے۔ کئی بار خیال آیا کہ اس بار ان سے نپٹ لے ہی لیں اور روز روز کی جھک جھک سے چھٹکارا پا لیں مگر پھر یہ سوچ کر ہم خاموش رہ جاتے کہ کون کتوں کے منہ لگے۔ وہ تو یونہی بھونکا کرتے ہیں۔ آج کل ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کا مشغلہ ہی کسی بھی شریف آدمی کو چھیڑنا ہے ـــــ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ طبل و علم ہی پاس ہو یا مال و زر ہو تو لوگوں کو بیر ہوا کرتا تھا بلکہ اب تو نیچی نگاہیں کر کے چلنے اور سر جھکائے رہنے پر بھی لوگوں کو بیر ہونے لگا ہے۔ ▲▼

سراج وجیہہ
(اندول، گلبرگہ)

کرکٹ کامنٹری

جن ممالک کو کرکٹ کھیلنا ہی نہیں آتا ظاہر ہے وہ کرکٹ کھیلنے اور دیکھنے والوں کو بھی ٹھیک نہیں سمجھتے۔ جی ہاں جو بموں سے کھیلتا ہے وہ ملک بھلا گیند سے کیا کھیلے گا۔ بہرحال کرکٹ کے کھیل کا بین الاقوامی کھیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ معزز گھرانوں کی ہابی میں کرکٹ کی واردات سُننا، کھیل دیکھنا اُس پر بحثیں کرنا شرطیں لگانا، مضامین لکھنا، سوالات پوچھنا، تبصرے پڑھنا، اپنے بچوں کو یہ کھیل سیکھنے پر مجبور کرنا انھیں ترغیب دینا اونچے معیار کی علامت ہے۔ اس کھیل کا لطف کرکٹ کی کامنٹری سننے والوں کو جتنا ملتا ہے اتنا لُطف اسٹیڈیم میں بیٹھ کر دیکھنے والوں کو بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ سال بھر میں یہ کھیل کسی وقت اور کسی ملک میں کیوں نہ کھیلا گیا ہو مگر بحث ہر موسم میں بالکل گرم اور تازہ ہی رہتی ہے اور آداب زندگی کا جُز سمجھی جاتی ہے۔

آپ کے گھر کوئی مہمان آئے بھی ہوں تو آپ پُرانے رسم و رواج کے سارے ریکارڈ توڑ کر اُن کی خاطر تواضع چائے پان کی بجائے گفتگو سے یوں کرتے ہیں۔ "ویسٹ انڈیز سے بھارت کا کرکٹ ٹسٹ جو ہوا تھا اس کا آغاز تو اچھا تھا مگر انجام کیوں بُرا ہوا۔؟"

مہمان خوش ہو کر کہے گا۔

جی ہاں! بھارت نے چنائی میں بھارت کی آبرو رکھ لی تھی لیکن جمبئی میں وہ بوکھلا گئے۔ چونکہ شتک کے اظہراب اردھ شتک کے ہو گئے ہیں۔ سِدّو بھی چھکّے بجاتے تھے اب وہ شونیہ پر آؤٹ ہو رہے ہیں۔ لازمی بات ہے انت خراب ہونا تھا۔ خراب ہوا۔"

اس طرح آج کل کے اس رُوکھے سوکھے فیشن پر مہمان بھی خوش اور آپ کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ آپ کو کرکٹ کے زیر و زبر آتے بھی ہوں یا نہ ہوں کھیل پر بحث کرنا فی زمانہ آپ کو لازم ہے۔ ورنہ آپ پی ایچ ڈی ہیں بھی تو تعلیم یافتہ نہیں سمجھے جاتے۔

اتفاقاً آپ کو کسی ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو پر بُلایا گیا تو آپ کو وہاں بھی یہی پوچھا جائے گا۔

"بتائیے وجئے مرچنٹ کون تھا؟"

آپ نے کہا کہ وہ! وہ! ــــ بھارت کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ جواہرات بیچتا تھا!" تو آپ انٹرویو کے

میدان ہی سے یل بی ڈبلیو ہو جائیں گے۔

"لالہ امرناتھ کون تھے؟" سے سوال پر آپ کو بتلانا ہوگا کہ وہ کوئی بینک کے منیجر نہیں تھے بلکہ ایک مشہور کھلاڑی تھے۔ اُن کے دو لڑکے بھی تھے اور دونوں ہی بھارت کے اہم کھلاڑی رہ چکے ہیں!" تو آپ کو اتہاس کا زبردست طالب علم مانا جائے گا! اسی طرح کے اسپین سوالات ہیں نواب آف پٹوڈی کس سن میں بھارت کے کپتان رہے پوچھنے پر اگر آپ اُنگلیاں گنتے رہ جائیں گے تو سوال کرنے والا خود کو بڑا چمپئن گھوشت کرتے ہوئے کہہ اٹھے گا۔ ۱۹۶۴ء میں بھارت کے وہ کرکٹ کیپٹن تھے"!

آپ سے انٹرویو میں کوئی ممبر جواہر لال نہرو کی وفات کب ہوئی تھی پوچھ بیٹھے اور آپ کو صحیح جواب نہ بن پڑا تو بھی گھبرایئے گا نہیں۔ آپ کو بخش دیا جائے گا۔ مگر کرکٹ کے تعلق سے آپ پر کیسا بھی سوال ڈالا جائے تو آپ کو کیا کمپیوٹر کی طرح فوراً جواب حاضر کرنا پڑے گا۔ یہ بیماری صرف بھارت ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ ہر ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ریل ہو یا بس کوئی مسافر مدر ٹریسا کی موت پر بحث نہیں کرے گا۔ سونتر تا سنگرام کے ویروں کے چرتر پر بات آگے نہیں بڑھائے گا، اور نہ ہی دھرم کے دائیتو پر ہی کان دھرے گا آپ کسی بازو والے مسافر سے پوچھیں گے کہ

۱۳ ستمبر کو ہونے والا ٹورنٹو کرکٹ میاچ کیا اپنے وقتِ مقررہ پر شروع ہوگا۔" ؟ ایک مسافر کیا بس کے سارے مسافر ٹپاخ سے کہہ اٹھیں گے۔

"کیوں نہیں! اوش شروع ہوگا!" اور یہ بھی بتائیں گے کہ ہر ٹیم اپنی اپنی جگہ سے ٹورنٹو کے لیے کوچ کر چکی ہے۔ دوسرا مسافر ساتھی یہ بھی بتلائے گا۔" اس بار تھوڑی سی تبدیلی ہوئی ہے اس ٹیسٹ میں چھ نئے کھلاڑی شامل کیئے گئے ہیں۔ بھارت اب بہت مضبوط ہو گیا ہے۔ اب جیت یقینی ہے۔ بھارت کو اب کوئی ہرا نہ سکے گا۔"

دن ہو یا رات جب کبھی بھی کہیں کھیل کا آغاز ہوا تو اُس دن سے اخیر تک ہمارا ٹی وی بند نہیں ہوگا: بجلی فیل ہو جائے تو ریڈیو چلتا رہتا ہے۔ ہمارے گھر کا دالان عورتوں بچوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ کھیل میں ڈرنکس کا وقفہ ہو تو ہمارے گھر کے سبھی ناظرین اپنی اپنی نشستوں سے ہلے بغیر کرکٹ کی تاریخ و جغرافیہ دُھرا لیتے ہیں۔ گھر کے دالان میں کامنٹری سننے والوں میں شامل صرف انسان ہی نہیں ہمارے کتے بلیاں اور چوہے بھی ہیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے ۲۳۵ رن بنا کر بھی ظہیر عباس ناٹ آوٹ رہے تو ہمارے ایک کیپٹن چوہے نے ٹی وی کا وائیر ہی کُتر ڈالا تھا۔ وہ اس لیے کہ ظہیر عباس کے ورلڈ ریکارڈ قایم کر لینے کے "پکش" میں ہمارا چوہا نہیں تھا۔ آپ کو ہمارے چوہے کی یہ حرکت پسند آئی ہوگی!۔ ہاں البتہ اپنی پوری سنجیدگی اور وفاداری کے ساتھ دہلیز کے باہر بیٹھے بیٹھے ہمارا اپنا کتا خاموشی سے کامنٹری سنتا رہتا ہے۔ البتہ آروندا ڈِسلوا۔ جیسے ضدی کھلاڑی کو بھارت کے کسی گیندباز نے جلد اسٹمپ آؤٹ نہیں کیا۔ تو اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر بڑے ہی ادب سے ٹینڈولکر سے بھوں بھوں کر کے اپنی بھاشا میں کہتا ہے۔ تم کرکٹ کھیل رہے ہو یا ہماری طرح کامنٹری سن رہے ہو؟ اور پھر سچن کو ابھی بچہ ہے کہہ کر بیٹھ جاتا ہے۔

ہمارے گھر میں ممی ہی ایسی شخصیت ہیں جو کرکٹ سے نفرت کرتی ہیں۔ اور کرکٹ کی کامنٹری شروع ہوتے ہی ٹی وی کے روم سے نکل کر باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں۔ اور ارباب ٹیلی ویژن کو کوسنے لگتی ہیں۔ کوئی سنجیدہ غزل۔ کوئی اچھا ساٹی وی سیریل ہی دکھاتے تو کچھ لُطف آتا۔ یہ کیا ہے کھیل کھیل دلوں کوئی اچھا پروگرام دیکھنے سے ہم محروم

ملا رموزی کی واپسی

نثری پیروڈی

کوثر صدیقی (بھوپال)

اوباش

(اہل وسائل بہت اہم شخصیات)

پناہ مانگتا ہوں میں آج کی "اہل وسائل بہت اہم شخصیات (اوباش)" سے جو ہیں بہت ہی خاص الخاص
جیسے نوابی دور میں ہوا کرتے تھے خواص، جن کی ہوتی تھی تلوار، تنک پکڑ اور جو کاٹتے تھے غریب لوگوں کی سادہ ڈور کی
پتنگ اور جڑ۔ ہندوؤں کو رام رام اور مسلمانوں کو سلام، سکھوں کو ست سری اکال۔ ہندوؤں کے دھرم پر ہے
سنکٹ اور اسلام پر پڑا ہے اسی کے بکٹ۔ مُلّا کی جیب میں دارُو کی تولی، ہونٹوں پر اللہ عز و جل۔ ہندو کی بغل میں چھری،
منہ پر رام۔ لیکن نہیں مل رہا ہے موقع مسلمان کو ہندو سے لڑنے کا اور ہندو کو سکھ سے جھگڑنے کا۔ کیوں کہ سب لگے
ہیں "سکارے" پر جمی اپنے اپنے چارے پر۔ نمبر دو کی کمائی میں سب کو دلچسپی ہے ملائی میں۔ کمائی کرنے میں سب ہیں ہٹے
کٹے، ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ رحیم ہو یا رام، سب کا ہے ایک ہی کام۔ دبلا ہو یا مسٹنڈا کوئی کسی کو نظر نہیں آتا ننگا۔
چور کے موسیرے بھائی ٹھگ، کیسا ہو گیا ہے جگ۔ سب کا ہے ایک اصول جو ہر "اوباش" کو ہے قبول۔ ہر جگہ آباد ہر جگہ بھیڑ،
آم باشد یا کبیٹ۔ پکاتے ہیں سب گھپلوں کی کھچڑی، جو پکی ہو یا کچی، ہوتی ہے مزے میں چوکھی۔ غرض ہے حلال سے نہ حرام
سے۔ مطلب ہے آم سے اور اس کو کھانے سے نہ کہ ہاتھی کی طرح دانت دکھانے سے۔ سب اوباش ہیں بھوکے، سب کے
چہرے ہیں سوکھے لیکن بھوک نہیں ہے پیار محبت کی، بھوک ہے کمیشن، دلالی اور رشوت کی۔ سب "اوباش" حدیثِ کُلِّ
اوباشُن اِخوۃ" پر ہیں گامزن اور سب ہیں اپنے کام میں سولہ ہنر فن۔ تعلق نہیں ہے مذہب و ملت کی، سب میں او
باس ہے اوباشی خصلت کی۔ پہلے گھاس، بھوسا چارا کھاتا تھا حیوان، اب ہندو یا مسلمان کھا رہا ہے اوباشی انسان۔ کوئی
بل رہا ہے یا پڑ کر مارو "نکھ پتی" کو جھاڑ اور جس کے اچار یا پڑ نے سب کے کئے ہاضمے ٹھیک، اُس سے منگوا دو بھیک۔
مولانا بھاشانی ہوں یا پیر پگاڑو سب پر مارو سیاست کی جھاڑو۔ مذہب کو سیاست میں لاکر پکاؤ کھچڑی اوپر سے دو
مندر مسجد کا بگھار، کھاؤ مل بانٹ کر لیکن لینا مت ڈکار۔ سرابوں میں خوابوں کی اینٹوں سے بناؤ سیاست کا محل اور
اس میں بناؤ منصوبوں کا جھروکا۔ آنکھوں پر چڑھاؤ حکومت کے نشے کا چشمہ اور ووٹروں کو دو دھوکا۔ بولو زور سے جے
سیارام۔ سارے سکھ دنیا رام۔ جیتے جیتے بن جاؤ سکھ رام یا بن جاؤ "ارشد بوٹا" جو روپیوں کی بہاتا ہے گنگا۔ دونوں
ہاتھوں سکو دھولو، گنگا میلی ہو گئی ہے یہ مت بولو۔
پرانے زمانے میں ہوتے تھے تیتر باز، بٹیر باز۔ اب تیتر ہے نہ بٹیر، باز ہے نہ شہباز۔ اب ہیں کلجگ کے

تیتر باز جو ہوتے ہیں گھپلے باز جن کو لوگ کہتے ہیں گھوٹالے باز۔ پہلے اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنا محاورہ تھا جس کا مطلب بچوں سے اسکول میں پوچھا جاتا تھا۔ اب مطلب سمجھانے کی نہیں ضرورت۔ کیوں کہ گلی گلی مل جائیں گے ایسے اوباش حضرت جو تھے کوڑی مل لیکن گھپلوں سے بن گئے کروڑی مل۔ یہ "اوباش" جب سنبھالتے ہیں ہوش تو خوب پیتے ہیں دارو اور کھاتے ہیں روغن جوش۔ پھر کرتے ہیں ٹھن ٹھنا ٹھن کا دھندا اور اس میں اگر ہوا مندا تو مندر مسجد کے نام پر کیا چندہ اور جب اُس سے بھی بھرا نہ پیٹ تو کیا بلیک میلنگ سیٹ۔ کچھ ہیرا پھیری کی، تھوڑی کوٹا بیسی کی، پھر شہد ملائی چار سو بیسی کی تو وہ چیز بڑی مست ہوئی تیار، جسے کہتے ہیں معجونِ ہمہ ستا چار۔ سنت کے کٹ میں رکھدی کسی کی پگڑی اور رقم مانگی تگڑی اور نہیں دی جس نے رقم تو پھوٹے اُس کے کرم — کومہربان بھائی جان، یہ ہیں آج کے اوباشی انسان جو کر رہے ہیں دُنیا میں مشہور ہندوستان۔ لیکن ہم بھول گئے بتانا، یہ حقیقت ہے سمجھنا نہ اِسے افسانہ — یہ اوباشی انسان جن کی تعریف کی ہم نے بیان، یہ نہیں ہے اصلی ہندوستان۔ ہر چیز کی ہوتی ہیں کئی قسمیں، ذات کہو یا نسلیں ہر انسان کا ہے ایک سا جسم لیکن دو الگ الگ ہیں قسم۔ ایک ہے غریبی کی ریکھا کے اوپر کھڑے، دوسرے ہیں ریکھا کے نیچے پڑے، اوپر والوں کے بوجھ سے دبے۔ جو لوگ ہیں ریکھا کے اُوپر وہ ہیں سیٹھ، ہنسٹر، افسر۔ جو ہیں لائن کے نیچے وہ ہیں ہما شما ووٹر، جن کی قسمت میں لنچ ہے نہ ڈنر۔ نہ کھڑے ہوتے ہیں، با ادب با تمیز، ہوٹل کے اندر، اُن کی خدمت میں ویٹر۔ دلو ہر سال کچھ دن سو کر جاگتے ہیں تب کنوارے شادی کرنے کے لیے بھاگتے ہیں لیکن جاگتا ہے ان ووٹروں کا مقدر اور بجتا ہے آرزوؤں کا بتاشہ، پانچ سال میں ایک بار، جب جھونپڑی کے سامنے آتی ہے کار، جس میں بیٹھا نیتا ساہوکار، دکھاتا ہے کاندھی چھاپ کے بڑے نوٹ اور مانگتا ہے اپنے حق میں ووٹ۔ کبھی نیتا کی قسمت پھوٹی اور جھونپڑی والوں کی قسمت چیتی تو پانچ سال سے پہلے بھی آجاتے ہیں چناؤ۔ پکنے لگتا ہے سیاست کی دیگ میں ووٹوں کا پلاؤ۔ الیکشن سے پہلے جن کی قسمت تھا " بوٹ (BOOT) پلاؤ" اُن کو ملنے لگتا ہے چکن پلاؤ۔

جس طرح جھوٹ مانٹ پناہ مانگتا ہوں شیطان سے اور دل سے کرتا ہوں اُس کی تائید اور عمل سے تقلید۔ اسی طرح غریبی کی ریکھا کے نیچے کی ووٹر ذات، مانگتی ہے سیٹھ نیتا اور منسٹر سے نجات لیکن دیتی رہتی ہے اُس کا ساتھ جس طرح مسلم قبرستانوں میں جواری، سٹّور بیچے، تیل چمپی مالش والے رہتے ہیں قبروں پر سوار، اُسی طرح غریبی کی ریکھا کے نیچے دبے ہوئے ان زندہ بحالتِ مُردہ لوگوں پر رہتے ہیں سوار، بقال منسٹر اور سُود خوار اور رہتے ہیں یہ قبروں کے مُردوں کی طرح بے رُوح بے جان، بے زبان، ذلیل اور خوار اور ہو جاتی ہے عاقبت بھی ان کی فیل جس طرح میر جی کے مزار پر لکھنؤ میں چلتی ہے ریل۔

اب میں شروع کرتا ہوں ساتھ نام بھوپالیوں کے جو عاشق تھے پہلے بالائی دار میٹھی چائے، پان اور سیکرین کی گالیوں کے، جو دی جاتی ہیں اکثر میدانِ ہاکی میں اُن کھٹیریوں (ہاکی کے کھلاڑیوں) کے نام۱ فائز الحرام، جنھیں گرفت نہ ہوتی تھی اِسٹک اور بال پر، فنکارانہ اس انداز میں جس طرح غالب دہلوی کو تھی پریکٹس ہائے دو چشمی والے ذوق دہلوی کو اپنے کلام کا اسٹک ورک دکھانے میں، سینے پر مونگ کے بجائے چنے دلنے میں اور گول پر گول داغنے میں۔ اور اُتر آتے تھے کھپوٹے بازی پر۔ اب نہ وہ کھپوٹے ہیں نہ بال، پتلی ہے ہاکی کی دال۔ اور بھوپال جہاں تھا اردو کا بول بالا اور انگریزی کے سالوں کا

---

۱ کھپوٹا۔ بھوپال میں ہاکی کی شکل کی ٹیڑھی لکڑی سے بچے ہاکی کی اسٹک کا کام لیتے تھے اُس لکڑی کو کھپوٹا کہتے تھے۔

منہ کالا وہاں انگریزی کا شیر بنا لئے ڈکار، گیا اردو کو چیکار۔ اب کوئی ہمت کرے جو چیخ پکار اور بھونٹی کرے شیر کے پنجوں کی دھار۔ "کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ"، اب نہ اردو ہے نہ اس کے قدرداں، مہرباں، ہاکی ہے نہ یاں۔ اُردو کو ہوگیا یرقان، ہاکی کو ہوگیا ہذیان، حکیم ہیں حیران کیوں کہ سب ہیں خطرۂ جان۔ اردو جب ہوئی زیادہ بیمار، معالج ہوگئے لاچار اور بیزار تو اردو کو بھرتی کردیا یتیم اور یسیر خانے میں جہاں پانی تھا نہ کھانا، یتیم خانہ تھا گویا بے آب و دانہ۔ روز صبح بینڈ بجاتے نکلو جو بھیک ملے اس سے پیٹ بھرلو۔ اس یتیم خانے میں دوا تھی نہ روٹی دال کیونکہ نہیں تھا یہ خیراتی ہسپتال۔
جب اردو کی سانس اُکھڑنے لگی اور نبض ڈھیلی پڑنے لگی تو مشورہ کیا گیا بڑے اجمل خاں سے جنھوں نے تجویز کی اکیڈمی کی آکسیجن اور بیماروں کے لیے زرِ نقد کی اعانت کا انجکشن۔ اعلان ہوا یتیم خانے سے اردو کے بیمار آئیں، پیسہ نقد لیکر جائیں، پھر دوا ہو یا دارو جو چاہیں خریدیں کھائیں، موج مستی اُڑائیں، بڑے اجمل خاں کو دیں دعائیں۔
ہاں تو مہربان ہم اپنی قبر کے اندر پڑے، پٹیوں کے نیچے مٹی میں گڑے، کر رہے تھے انتظار کہ آئے کوئی یار غار اور سنائیں ہم اپنی پکار کہ ہوئے نمودار، کچھ پڑھے لکھے دکھنے والے جاہل اور گنوار اور ہوگئے ہماری قبر کے چبوترے پر سوار۔ نکالی انھوں نے تاش کی گڈی پھٹا پھٹ اور بانٹے تین پتے کھٹا کھٹ۔ ہم نے کہا اے پتے باز و اس مردود کھیل سے باز آؤ۔ کمائی کا راز ہم سے پوچھو۔ تین پتے کھیلنا ہے جوا، یہ کام ہے بہت برا۔ سچ جانو میرا کہنا مانو کھیلنا ہے تو ہاکی کھیلو، گول اپنے سینے پر جھیلو۔ اولمپک تک جاؤ خوب نام اور پیسہ کماؤ۔ پڑھنا ہو تو اردو پڑھو فارسی پڑھو۔ ایک نے جواب دیا اے دادا رموزی جولیٹ! ہاکی سے بھرتا نہیں سب کا پیٹ۔ اور اولمپک میں تو کھلی اڑتی ہے، عزت کے بدلے بدنامی ملتی ہے۔ دوسرا بولا چپ بوڑھے کھوسٹ۔ کیا ہم کو بیچتا ہے تیل جوار دو بڑھ کے دیکھیں قدرت کا کھیل، ایک بولا "بھیا" اب پہچان (پہچان) ہیں" یہ تو ہیں اپنے مُلّا رموزی، انھیں کا تو ہے "رموزی مارکیٹ"۔ اب راموجی بھیا، اسیان دھرم سے کہنا میرے سوال پر چپ مت رہنا۔ تم نے بھی تو خوب لکھی ہے اردو۔ تم کو ہی بنادیا راموجی تو ہم کو کیا سوجھی کہ یتیم خانے میں جائیں، دن میں بھوکے پیٹ بینڈ باجہ بجائیں، رات کو اردو کے بھجن گائیں اور بیمار پڑجائیں تو آکسیجن لگوائیں۔ مرنے سے بچ جائیں تو غریبی کی ریکھا کے نیچے لیٹ کر اوباشی بنیں۔ بتعال منتر کے ہر پانچویں سال پڑ جائیں باقی چار سال آپ کے مزار پر بیٹھ کر تاش کے پتے جمائیں۔ ایک بولا بھیا "راموجی لال" مت بگھارو اپنی دال، ہم کو رہتے دو جاہل اور بدحال۔ ہم کھیلتے ہیں تاش لیکن نہیں ہیں اوباش۔ ہم پڑھ لکھ کر بن گئے اگر کسی قابل تو اوباش بیٹھے نیتا منتر سب کی دولت طاقت ہو جائے گی چھومنتر کہ نہ پائے گا کوئی کھیل یا کھیلا نہ بچا پائے گا بھرتا چار کا ڈھیلا۔ پھر اگر یہ دکھائیں گے اوقات تو اُن کی جگہ ہوگی حوالات جہاں ملے گی کھانے کو ہوا لعدلات!

* قلمی معاونین صاف اور خوش خط صفحہ کے ایک جانب لکھیں۔
* ہر تخلیق پر اپنا پوسٹل پتہ ضرور لکھیں۔

خوردہ

سگار لکھنوی
ممبئی

ہاں اسی جمہوریت میں ایک دن وہ آئے گا
منتری کا سنتری بھی منتری بن جائے گا

تھی جس کی آرزو بخدا ہم کو مل گئی
سسرے سے دیدِ دل کی دوا ہم کو مل گئی

حسین جو کوئی مل گیا سعودیہ جہاز پر
جبینِ شیخ جھک گئی اُسی کے پائے ناز پر

ہزاروں احمقوں کا ایک احمق اس کو کہتے ہیں
جو اپنا گھر جلانے کے لیے پیٹرول دیتا ہے

یہی تو عاشقی کی راہ میں درکار ہوتا ہے
گلا جو اپنا کٹوا دے سپر اسٹار ہوتا ہے

قصۂ درد سنانے میں تو مشہور ہیں ہم
آپ بہرے ہیں تو پھر کیا کریں مجبور ہیں ہم

"ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں"
گالیاں دو ہمیں جو ہمت ہے

عکس بیرونی تو دکھلاتا ہے سب کو آئینہ
دل کے اندر کی سیاہی ایکسرے کرتا نہیں

اللہ وہی آنکھ وہی رنگ وہی جسم
یہ بھینس تو بالکل مرے دلبر کی طرح ہے

ڈھیری نظر کے تیر کو دل سے لگا لیا
تجھ کو نگاہِ یار پشیماں نہ کر سکے

ہر اک نیتا ہر اک نیتا کا ہم پلہ نہیں ہوتا
کوئی بدکار ہوتا ہے کوئی بےکار ہوتا ہے

اللہ کا کرم ہے کہ ایسا نہیں کیا
ہم نے کسی حسین سے لفڑا نہیں کیا

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"
کبھی ہم ان کو کبھی اُن کی ماں کو دیکھتے ہیں

لٹکا کے سارے گھر میں صحیفے مزاح کے
ہم نے غمِ حیات کو ٹھینگا دکھا دیا

"دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے"
ابھی تو خود تماشا بن گیا ہوں تاڑی خانے میں

جوانی دیکھ کر تیری یہ ارزانی ہوا ہوگا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا

ان کی ممی سے کہ پاپا سے کہ بہنوئی سے
"کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے"

مل نہیں سکتا جہنم میں سگار
گھس کے وہ جنت میں داخل ہو گیا

دلشاد رضوی (حیدرآباد)

بم اندازی

ہمارے لڑکپن کی بات ہے معلوم ہوا کہ جاپان نے رنگون پر بموں سے یلغار کردی ہے۔ ہمارے ہم جماعت لڑکے نے ہم سے ایک روز کہا کہ جرمنی نے بھی لندن پر بم برسائے ہیں۔ بات کچھ ہمارے پلے نہیں پڑی کیوں کہ ہم تب تک بم کی اے بی سی ڈی سے بھی ناواقف تھے۔ چنانچہ گھر آتے ہی بستہ ٹیک کر ہم نے اپنے والدِ محترم سے بم کی تعریف پوچھی مرحوم نے ہمیں یوں سمجھایا کہ بم ایک فٹ بال کی طرح کا گولہ ہوتا ہے جس میں پٹاخوں کی طرح بارود بھری رہتی ہے اور جب گولہ غبارہ کی طرح پھٹتا ہے تو اس میں سے یوں آگ نکلتی ہے جیسے ہمارے باورچی خانے کے لکڑیوں کے چولھے میں نکلتی ہے لیکن وہ آگ ذرا بڑے سائز کی ہوتی ہے جو پورا ایک کمرہ نہ صرف جلاکر راکھ کردیتی ہے بلکہ اُسے پورے کا پورا مسمار بھی کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اتنا سن کر ہم سہم گئے اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگے کہ خدا کرے جاپان کا اپنے ہی شہر میں منہ کالا ہوجائے اور وہ کبھی ہمارے شہر میں ایسے فٹ بال جیسے بم نہ برسا پائے۔ اُن ہی دِنوں ہم نے دیکھا کہ نیلی بلکہ شیالی رنگ کی وردی پہنے سڑکوں پر لوگ پھرنے لگے اور جگہ جگہ گڑھے کھودے جانے لگے جیسے مکانوں کی بنیادیں کھودی جاتی ہیں۔ تب ہمیں ساتھیوں سے معلوم ہوا کہ وردی والے اے آر پی ایف یعنی ایر ریڈ پریڈ فکیشن فورس کے لوگ ہیں اور گڑھے گھر کی بنیادیں نہیں بلکہ جاپان کے بم کے ڈر سے چھُپنے کی پناہ گاہیں ہیں تب تو ہمارے خوف میں مزید اضافہ ہوگیا پھر پہلی بار جب ہم نے سائرن کی اونچی نیچی دھنوں میں ہیبتناک آوازیں سُنیں اور لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے تب معلوم ہوا کہ یہ جاپان کے بم گرنے کے خطرے کی علامت ہے لہٰذا اگر ہمیں اپنی جان عزیز پیاری ہے تو ہمیں بھی فوراً گڑھے میں کود جانا چاہئیے چنانچہ ہم بھی دھم سے ایک خندق نما گڑھے میں کود گئے پھر ایک لمبی سیدھی سریلی آواز میں سائرن بجا پتہ چلا کہ یہ خطرہ کے ٹل جانے کا اشارہ ہے۔ ہماری جان میں جان آئی اور بڑی کاوشوں کے بعد ہم اس کھڈ سے باہر نکل پائے غرض بم کے خطرہ سے ہمارا زندگی میں یوں پہلا پہلا تعارف ہوا۔ پھر خدا خدا کرکے جنگ ختم ہوگئی اور ہمیں آج بھی یاد ہے کہ سرکارِ وقت نے مدرسوں میں لڈو بانٹے وہ لڈو کیا تھے اچھے خاصے چھوٹے چھوٹے بم جیسے ہی تھے اور جب ہم پورے چار لڈو کھا نہ سکے تب شیروانی کے جیبوں میں بھر کر گھر لے آئے۔ غرض اس وحشت ناک جنگ کے خاتمے کے عرصے بعد تک بم ہمارے لیے ایک خطرناک لفظ بن گیا۔ لیکن

جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی گئی ہمارا ملک بھی ترقی کی راہوں پر گامزن ہوگیا اور ہر چیز ہمارے ہی ملک میں بننے لگی حتیٰ کہ بم سازی میں بھی خلا رکھے اب ہمارے ملک کا کوئی مقابلہ کرتے شرمانے لگا۔ ہمیں ملک کی اس ترقی پر از حد خوشی ہونے لگی اور ہم سوچنے لگے کہ اب کسی ملک کی کیا مجال کہ وہ ہمارے ملک کی طرف دونوں آنکھیں تو کجا ایک آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھ سکے۔ ایسے ہی دن گزرتے گئے حتیٰ کہ اب ہم ضعیف ہوگئے اور اب جو اخباروں پر نظر پڑتی ہے تو عینک کے اندر ہماری دونوں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں کیوں کہ خبریں ہی کچھ ایسی نرالی ہیں۔ ایک خبر یوں ہے کہ ملک کی ساری صنعتوں میں سب سے اعلیٰ معیاری صنعت اگر کوئی ہے تو آج صنعتِ بم سازی ہے اور صاحب ہمارے ملک پر ہی کیا منحصر ہے سارے جگ کا یہی عالم ہے اخباروں، ریڈیو و ٹیلیویژن کے مطابق نہ صرف ملکوں ملکوں بلکہ شہروں و نیز گاؤں کے نکڑوں پر تک بم پھٹنے لگے ہیں مگر اب نہ تو اے آر پی جیسی کسی فورس کی ضرورت ہے اور نہ ہی جگہ جگہ گڑھے کھدوانے کی۔ کیوں کہ یہ بم اب ہوائی جہاز سے نہیں گرائے جاتے بلکہ خود زمین ہی سے اُگتے لگے ہیں اور ان کی پیداوار بھی بھٹے کے دانوں کی طرح ہونے لگی ہے۔ بچپن میں ہم نے تاریخ میں پڑھا تھا کہ سکندر نے جب پنجاب پر حملہ کیا تھا تو راجہ پورس کی فوجوں نے بھی تیر و تلوار کے ایسے جوہر دکھلائے کہ بالآخر سکندر کو مجبور ہو کر یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ تو صرف نام کا سکندر ہے ورنہ اصل میں تو وہ راجہ پورس ہی کی ذاتِ عالی ہے جو مقدر کا سکندر کہلانے کی مستحق ہے چنانچہ اُس نے پورس کو حکومت یوں لوٹا دی جیسے ہم کسی کا مانگا ہوا بال پن لوٹا دیتے ہیں اور پھر ــــ اور پھر راجہ پورس مونچھوں پر تاؤ دے کر دوبارہ حکومت کرنے لگے لیکن آج کہاں کے تیر اور کیسی تلوار، اب اگر کسی کو اپنا لوہا منوانا ہے تو اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ کس معیار کا بم اپنے پاس رکھتا ہے کیا ہندوستان اور کیا پاکستان، کہاں کا آئرلینڈ اور کیسا سری لنکا، جدھر نظر دوڑائیں بم سازی کی صنعت کی یوں روز افزوں ترقی کو دیکھ کر ہمیں ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو فنونِ بم سازی و بم اندازی کے ماہرین کہلاتے ہیں لیکن اب فکر و تردد کی کوئی بات نظر نہیں آتی کیوں کہ ایک تو مذہب سے دوری کا رجحان عام ہوگیا ہے دوسرے خیر سے بداخلاقی کی تعلیمات اور تشدد کی تربیت پر میڈیا اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے ان ہوشربا حالات میں ہمیں وہ دن دُور نہیں نظر آتے کہ جب بندوق جیسی دقیانوسی چیز سے کام نہیں چلے گا اور نتیجتاً حفاظتِ خود اختیاری کی خاطر سرکاریں خود بندوقوں کی جگہ بم رکھنے کے لیے لائسنس جاری کریں گی تاکہ عوام و خواص چاہے وہ اپنے گھر میں ہوں، ریل، بس یا ہوائی جہاز ہی میں کیوں نہ سفر کر رہے ہوں بم اندازی کر کے اپنی جان و مال کی حفاظت کریں چنانچہ ہم نے بھی یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ جیسے ہی سرکار لائسنس جاری کرے گی اور ہم لائسنس یافتہ بنیں گے ہر رات سرہانے بم رکھ کر سویا کریں گے تاکہ اگر کوئی چور اُچکا گھر میں داخل ہونے کی جرأت کرے تو ہم بھی موقع واردات پر بم اندازی کے ایسے جوہر دکھائیں گے جیسے ہمارے آباء و اجداد کے زمانے میں راجہ پورس کی فوجوں نے تیر و تلوار کے دکھلائے تھے۔ لیکن ایک خطرہ شاید پھر بھی لگا رہے گا کہ خدانہ کرے اگر اُس کے ہاں ہمارے بم سے بھی زیادہ معیاری قسم کا بم موجود ہو تب تو وہ ہمیں شکستِ فاش دے کر ہمارے پیارے گراموفون سمیت دوسرا سارا ہمارا "اینٹک" سامان لے کر چلتا بنے گا اور ہم اپنے دونوں ہاتھ ملتے رہ جائیں گے!

غزلیں

پاگل عادل آبادی

تم تو ٹھہرے سنیاسی بیاہ کیا رچاؤ گے
گھر چلا نہیں سکتے دیش کیا چلاؤ گے

بھاگ جاتے گر شوہر ڈر سے آپ کے سوچو
کون ڈھوئے گا برتن کس کو لِک لگاؤ گے

پچھلے سال چندے سے گھر نیا بنائے تھے
اب کے سال مولانا بولو کیا بناؤ گے

راج گھاٹ پر یوں تو تم نے لی شپتھ لیکن
چانس گر ملے تم کو گھاٹ بیچ کھاؤ گے

سال بھی نہیں گزرا پھر نیا الیکشن ہے
دیش کی جو دولت ہے کیا یونہی لٹاؤ گے

وہ ہے شیر جنگل کا گھاس کب چبائے گا
تم گدھے ہو سرکاری کلکٹے چباؤ گے

تعزیت بہانہ ہے قبر پر میری آ کر
قبر کا میری پتھر لے کے بھاگ جاؤ گے

تم میں ریل گاڑی میں فرق کچھ نہیں پاگل
وہ بھی لیٹ آتی ہے تم بھی لیٹ آؤ گے

●

محبوب مانجوی
(بلاسپور)

(روحِ حسرت موہانی سے معذرت کے ساتھ)

فرماں بردار میں شوہر ہوں مگر کیا کیجئے
دوست کہتے ہیں کہ بیگم نے ڈرا رکھا ہے

ایک دو جام سے کب شیخ کی ہوگی تسکیں؟
واسطے ان کے گھڑا مئے سے بھرا رکھا ہے

گھر سے مفلس کے بھلا اور توقع کیا ہو؟
سب ہی کہتے ہیں جہنم سا بنا رکھا ہے

حسن والوں کا اسے کیوں نہ کرشمہ کہیئے
اچھے خاصوں کو بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

ہم تو 'ہندی' کو بھی سر آنکھوں پہ دیتے ہیں جگہ
اور 'اردو' کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے

ہم ہیں کس گنتی میں؟ امراء بھی یہی کہتے ہیں
اس گرانی نے تو بس ہوش اڑا رکھا ہے

شعر بس کہتے ہیں تفریحِ طبع کی خاطر
بیشتر شعراء نے فن اپنا بھلا رکھا ہے

مر نہ جائے کہیں دہشت سے یہی ہے خدشہ
ہم نے یوں "ٹینٹوا" ظالم کا دبا رکھا ہے

کہہ دیں یہ بانگِ دہل اہلِ حکومت سے عوام
آج کے کام کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

کس کے سر حضرتِ محبوب دھریں ہم الزام
ہم نے خود اپنی شرافت کو بھلا رکھا ہے

★

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

★

بیگم تمہارے واسطے زیور کہاں سے لائیں
سر پہ کسی رئیس کا دستِ کرم نہیں

ہم کیا کریں جو لوگ تلفظ بگاڑ دیں
ہم نے جناب ختم لکھا تھا، خَتَم نہیں

کر دیں وطن سے اپنے گھٹالوں کا خاتمہ
نیتاؤں میں ہمارے ابھی اتنا دم نہیں

نیتا سے جب کہا کہ کرپشن پہ بولیئے
کہنے لگے کہ آپ کی زلفوں کا خم نہیں

آکاش پھٹ پڑا جو ہوئی ڈاٹنا کی موت
میں مر رہا ہوں اور کوئی آنکھ نم نہیں

سرکار ہے کرپٹ مگر اس کو کیا کریں
سرکار کو ہٹانے کا جنتا میں دم نہیں

جس سے کسی بھی بینک کا پیسہ نکال لیں
منہ پھٹ ہمارے پاس تو ایسا قلم نہیں

●

اُن کے دیدار کی لذت کا مزہ مت پوچھو
رات اپنی ہوئی درگت کا مزہ مت پوچھو

سیر و تفریح نہ شاپنگ نہ پکچر وکچر
جیب خالی ہو تو چاہت کا مزہ مت پوچھو

پان کھا کھا کے میں ساحر کی غزل پڑھتا ہوں
شامِ فرقت کی طوالت کا مزہ مت پوچھو

دوست احباب بھی کترا کے گزر جاتے ہیں
چائے اور پان کی عادت کا مزہ مت پوچھو

بے بلائے ہوئے مہمان چلے آتے ہیں
آنے والوں کی ضیافت کا مزہ مت پوچھو

قوم کی قوم، زمیں بوس ہوئی جاتی ہے
ایک جاہل کی قیادت کا مزہ مت پوچھو

ہم کسی کے نہ ہوئے، کوئی ہمارا نہ ہوا
منہ پھٹ اپنی بھی حماقت کا مزہ مت پوچھو

●

گوشت اور دال چھوڑتے کب ہیں
مفت کا مال چھوڑتے کب ہیں

مچھلیوں کے شکار کے عادی!
جھیل میں جال چھوڑتے کب ہیں

گوشت تو گوشت ہے عقیقے کا!
مولوی کھال چھوڑتے کب ہیں

مفت میں چائے پان ملتا ہے
لوگ چوپال چھوڑتے کب ہیں

لاکھ ٹوکو، مگر میرے ساتھی
بھیڑ کی چال چھوڑتے کب ہیں

نوٹ چھپتے ہوں جس میں سو سو کے
ایسی ٹکسال چھوڑتے کب ہیں

بھونڈی تقلید، ہو بہو سرقہ
اپنے نقال چھوڑتے کب ہیں

استرا ہاتھ میں تو آنے دو
سر پہ وہ بال چھوڑتے کب ہیں

بے سُرے پن کی حرکتیں منہ پھٹ
سارے قوال چھوڑتے کب ہیں

●●

بابو آر کے (اچل پور سٹی)

ٹک کان دھر سلوتم

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ کے کرّوفر سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ غالب صاحب کے دولت کدہ پر آنے والے مہمان کوئی V.I.P یا ہز ہائینس قسم کے انسان تھے اور آنے سے قبل ان کا کوئی ٹور شیڈول اخبارات میں شائع ہوا تھا یا ریڈیو پہ نشر ہوا تھا۔ خیر جو بھی ہو، مذکورہ مہمان کی آمد کی سُن گُن ملتے ہی غالب صاحب میزبانی کے جملہ اُمور بھول کر بوریا کی عدم دستیابی پر کفِ افسوس ملنے لگے اور بوریا بوریا کہنے لگے۔ ان حالات میں بوریے کے لیے غالب صاحب کے تڑپ تڑپ جانے پر آپ کہیں یہ قیاس نہ کرلیں کہ وہ آنے والے مہمان محض بوریے کے حصول کے لیے ہی تشریف لا رہے تھے یا پھر غالب صاحب کوئی بے سرو سامانی کی زندگی جی رہے تھے اور اتنے گئے گزرے تھے کہ بچھانے کے لیے ان کے گھر میں بوریا تک نہیں تھا بلکہ بوریے کے لیے غالب صاحب کے واویلا مچانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ آنے والے مہمان کی حیثیت غالب کی نظروں میں پسندیدہ اور ہر دلعزیز نہیں تھی اور شاید ان کے تئیں غالب کے دل میں کسی قدر نفرت پائی جاتی تھی۔ اسی لیے ایسے مہمان کی آمد کی خبر سن کر انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ . . . . گھر کے گدّے، غالیچے، چادریں اور شطرنجیاں اٹھا کر رکھ دیں اور مذکورہ مہمان کے شایانِ شان بوریے کی خدمات حاصل کرنی چاہیں۔ شاید ان کا منشأ تھا کہ مہمان بوریے پر ہی بیٹھے اٹھے اور سوئے جاگے . . . . تاکہ بوریے کی تکلیف دہ نشست سے اکتا کر وہ فوراً ہی رختِ سفر باندھ لے کیوں کہ بوریے اور کانٹے اپنے درمیان زیادہ تفاوت نہیں رکھتے بس اُنیس بیس والا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ الغرض مذکورہ شعر میں غالب کا بوریا بوریا کرنا . . . . بوریے سے ان کی رغبت کی دلیل نہیں ہے بلکہ مہمان کے تئیں ان کی انتقامی کارروائی کا پیش خیمہ ہے۔

طریقِ عشق میں ہے رہنما دِل پیمبر دل ہے قبلہ دل خُدا دِل (میر تقی میر)

مذکورہ شعر کے متن سے ظاہر ہے کہ میر اہل دل ہی نہیں تھے بلکہ سراپا دل بھی تھے اور مذہبِ عشق میں وہ دل کی

حکمرانی کے قائل تھے ۔ مذہبِ عشق کی ریاضت و عبادت کے معاملات میں انھوں نے کبھی بھی اپنے جگر و دماغ کو اور گردوں و پھیپھڑوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا ۔ نیز اعضائے جسمانی میں انھوں نے صرف دل کو با وقار مقامات پہ فائز رکھا ۔ نت نئے کاموں کی انجام دہی میں اُسے معروفِ کار رکھا ۔ دل کو مختلف محاذوں پہ جھونک دینے کے باعث اگر ہم یہ کہیں کہ میر اپنے دل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے تو بے جا نہ ہوگا ۔ ایسے میر کو اپنے دل پہ حد درجہ اعتبار و اعتماد تھا اسی لیے تو متعدد ذمہ داریوں کا بوجھ انھوں نے دل پہ ڈال دیا تھا اور تمام اعضائے جسمانی کو اس کے حضور SURRENDER کروا دیا تھا ۔ میر کے دل کی ہمہ جہت کارکردگی ملاحظہ کیجیے اور اندازہ لگائیے کہ ان کا دل کتنا فعال سوشل اور کوآپریٹو نوعیت کا تھا ۔ یوں تو میر کے دل کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی ۔ اُسے بہت سارے کام کاج کرنے پڑتے تھے جیسے سب سے پہلے تو اس دل کو دھڑکنے کے عمل میں مصروف رہنا پڑتا تھا ۔ پھر اسی دل کو کسی پہ آنا بھی ہوتا تھا ۔ آنے کے بعد یہی دل کسی کو دیا بھی جاتا تھا ۔ یہی دل لگتا بھی تھا دکھتا اور ٹوٹتا بھی تھا ۔ یعنی اتنے سارے اچھے بُرے کاموں کی تکمیل کے بعد بھی میر بیچارے دل کو کسی پہلو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے ۔ اُسے دنیوی کاموں کے ساتھ ساتھ دینی امور پہ بھی مامور کر رکھا تھا ۔ مذکورہ شعر کا مصرعۂ ثانی غماز ہے اس حقیقت کا . . . کہ مذہبِ عشق کے کاروبار میں ان کے دل کا رول از اول تا آخر بہت جاندار رہا ہے ۔ وادیٔ عشق کی پُرخار راہوں میں وہ اسی دل کی انگلی تھام کر چلتے بھی تھے اور اسی دل کو منزلِ عشق کی رسائی کے لیے انھوں نے اپنا رہبر و رہنما بھی مان لیا تھا ۔ بعد ازاں اسی دل کو پیغمبر تسلیم کر کے وہ اس کے اُمتی بھی بن بیٹھے تھے ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہی دل ان کا قبلہ و کعبہ بھی بنا اور پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ خدائے سخن کا دل ان کا خود ساختہ خدا بن بیٹھا ۔ آفریں ہے میر کے دل پہ . . . کہ اتنے سارے پہاڑ جیسے کاموں کا بوجھ اپنے اُوپر لادنے کے باوجود وہ کبھی دل برداشتہ نہیں ہوا اور سلام اس دل پر کہ . . . . جو ہنس کھیل کر اپنے فرائض پورے کر گیا ۔ ہم آفریں کے تحفے اور سلام کے نذرانے محض اس لیے ارسال نہیں فرما رہے ہیں کہ یہ دل شہنشاہ تغزل خدائے سخن میر تقی میر کا دل تھا بلکہ اس لیے ارسال کر رہے ہیں کہ . . . . واقعی یہ دل ایک غیر معمولی دل گردے والا دل تھا ۔ یہ واقعہ ہے کہ میر کے دل کو ڈھیروں کام کرنے پڑتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کے ماتھے پہ شکن تک نہ آتی تھی اور وہ دھڑکتے رہنے کے عمل سے کبھی بے بہرہ نہیں ہوتا تھا جبکہ آج کل آپ کے اور ہمارے دلوں کا حال کیا ہے یہ آپ ہم اچھی طرح جانتے ہیں یعنی ہم نے میر کی طرح اپنے دلوں کو کبھی قبلہ و کعبہ بنایا نہ خدا ، پیمبر و رہنما کی ذمہ داریاں ان پہ لادیں یعنی ہم نے ہمارے دلوں کو صرف دل ہی رہنے دیا اور دھڑکنے کے عمل کی واحد ذمہ داری اُن پہ ڈالی ۔ ہماری اتنی زیادہ رعایت و مروت کے باوجود آپ نے دیکھا . . کہ ہمارے دل کیا کیا گل کھلا رہے ہیں ۔ کبھی یہ والو (VALVE) کی خرابی کا بہانہ بناتے ہیں تو کبھی سکڑ جانے کا ڈھونگ ، تو کبھی بڑے ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان پہ دورے بھی پڑتے ہیں اور یہ فیل بھی ہو جاتے ہیں ۔ . کام چور کہیں کے ! میر کے اور ہمارے دلوں کے تقابلی جائزے کے بعد ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتاً دل کہلانے کے لائق اگر کوئی دل تھا تو وہ میر کا دل تھا جو اتنے سارے بہروپ بھرنے کے باوجود ، کبھی بیمار ہوا نہ فیل ہوا ۔

انگریزی : سا پٹ نیکر

ترجمہ : ڈاکٹر میر گوہر علی خان

سرکار کا ایک روپیہ

چالیس سال قبل جب میں ین. ڈی. اے میں بھرتی ہوا تھا تو اُس وقت زندگی پریڈوں سے عبارت تھی. صبح سویرے سے لے کر شام چراغ جلنے تک بس پریڈ ہی پریڈ تھے. صبح تڑکے پی ٹی پریڈ ہوتی تھی. پانچ بجے "چھوٹی ہزاری پریڈ". پھر شوٹنگ پریڈ اور ڈرل پریڈ یہاں تک کہ ضروریات سے فراغت کو بھی پریڈ ہی کہا جاتا تھا. اگر ان ساری پریڈوں میں سے کسی ایک پریڈ کی بھول چوک ہو جاتی تو اس پریڈ کے بدلے فوجی قاعدہ کے تحت بے شمار پریڈ کرائے جاتے. ان پریڈوں کی گنتی یہیں ختم نہیں ہوتی. جو بچ رہی پریڈیں ہیں وہ ہیں لنچ پریڈ ڈنر پریڈ. اور سینما پریڈ. بعض نئے بھرتی سورما تو ان پریڈوں کو اس باقاعدگی سے ادا کرتے تھے کہ ان کے بدلے آخر کار انہیں کامیابی ملتی گئی اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے.

جب میرا کمیشن ہوا تھا تو سوچا تھا کہ اب ان پریڈوں کے جنجال سے چھٹکارا مل جائے گا. مگر ایسا بالکل نہیں ہوا. اس شوخ دن ہی کمپنی کے کمانڈر نے سختی سے مجھے حکم دیا." مسٹر ساپٹ نیکر. میں چاہتا ہوں کہ آج اور اب ہی تم "B" کمپنی والی تنخواہ کی پریڈ جلد از جلد کر ڈالو. ہاں کمپنی کے صوبہ دار تمہارا ہاتھ بٹائیں گے". یہ صوبہ دار ایک ضعیف العمر شخص تھا. اس کے چہرے کی جھریاں اور مسکراہٹ سے عاری صورت اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ فوجی زندگی کی سختیاں آسانی سے جھیل چکا ہے. اس نے ایک اسکولی بچے کی طرح کمپنی کے کمانڈر کے حکم کو قبول کرتے ہوئے اپنے دونوں جوتوں کو کھٹاک کے ساتھ ملا کر ایک زوردار سلیوٹ کمانڈر کو دے مارا. اور مجھے سر سے اشارہ کیا. چلئے صاحب چلتے ہیں.

"تنخواہ پریڈ" کا مطلب تھا کمپنی کے سارے جوانوں کی ماہوار کی تقسیم. میرا کام صرف یہ تھا کہ ان جوانوں کے ذمہ جو رقم بنتی ہے وہ گن گن کر ان کو دے دوں. اور وہ یہ رقم لے کر صوبہ دار کے پاس جائیں لیکن مصیبت یہاں یہ تھی کہ اس کمپنی کے سارے جوان "گورکھا" تھے. ان کی بڑی تعداد تعلیم سے نابلد تھی حتی کہ رقم بھی نہیں گن سکتے تھے. اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بہت سے جوان تین چار سال بعد اپنے اپنے گاؤں لوٹ رہے تھے اور ان کے ذمہ ہزاروں کی رقم بنتی تھی.

میں آم کے ایک گھنے درخت کے نیچے میز کرسی ڈالے بیٹھا تھا. اور قریب کے دوسرے درخت کے سائے میں صوبہ دار تھے. گورکھا جوانوں کی لمبی قطار میرے سامنے کھڑی تھی. ایک ایک آگے بڑھتا. مجھے سلوٹ کرتا. اپنا نمبر عہدہ اور نام بتاتا تب میں رقم اس کے حوالے کر دیتا. وہ شکرانہ کے طور پر پھر مجھے آداب کرتا. رقم کی وصولی کے فوراً بعد وہ کسی کلرک کے پاس

جاتا ۔ رقم کی تصحیح کرواتا۔ تب صوبہ دار کے سامنے حاضر ہوکر کہتا "صاحب مجھے رقم ٹھیک ملی ہے" نیز اس پریڈ میں میرا سر اس وقت چکرایا جب میں نے دیکھا کہ تقریباً ہر گورکھے کا نام یا تو مان بہادر ہے یا دھن بہادر ! ایسے میں یہ خوف فطرتی تھا کہ کہیں کسی گورکھے کو رقم کم یا زیادہ نہ دے دی جائے اور پھر پیری پریڈ کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔ مگر بھگوان کی کرپا سے اس معاملہ کو میں نے محنت اور ایمانداری سے نمٹا لیا۔

چند دنوں بعد ایک صبح مجھے ایک منی آرڈر ملا۔ ڈاکیہ بڑے ادب و احترام سے میرے ہاتھ میں ایک روپیہ تھما کر چلتا بنا۔ منی آرڈر کا سلپ جب میں نے پڑھا تو گورکھا زبان میں لکھا تھا۔

"صاحب ! آپ نے مجھے پوری رقم دی تھی۔ گننے میں مجھ ہی سے غلطی ہوئی ہے۔ ایک سرکاری روپیہ جو مجھے زیادہ دیا گیا تھا اس کو واپس کر رہا ہوں"

معافی کا خواستگار

آپ کا دھن بہادر

اس ایک روپے کی رقم واپس کرنے کے لیے دھن بہادر کو اپنا پہاڑی گاؤں چھوڑ کر پوسٹ آفس پہنچنے تقریباً دو دن تو ضرور لگے ہوں گے اور پھر اس ایک روپیہ کی منی آرڈر فیس بھی اس نے اپنی ہی جیب سے دی ہوگی۔ اتنی ساری مشکلات برداشت کرنے کے باوجود بھی اس نے میری بھول چوک کو اپنی ہی غلطی مانا۔

"دھنیا ہو دھن بہادر"

یہ جملہ میری زبان سے نکلا ۔۔۔۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے مگر اب اس کی یاد کی ایک خاص وجہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب میں نے ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ بوفورس کی ٦٤ کروڑ روپے کی سرکاری رقم غائب ہونے کی ذمہ داری کوئی بھی سرکاری افسر قبول کرنے تیار نہیں ہے ۔ تو دوسری بار پھر میرا سر چکرایا۔ اب کی بار میں نے اپنی شریمتی جی کو آواز دی کہ وہ چائے کا ایک، اور کڑک دار پیالہ میرے پاس بھیج دیں۔

نریندر لوتھر*
(حیدرآباد)

صاحب نظر بنے ہے .....

حیدرآباد میں مجھے دو غیر معمولی شخصیتوں کی دوستی کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک عابد علی خان جنھیں مرحوم کہنے کو دل نہیں مانتا اور دوسرے ہاشم علی اختر جو حال ہی میں امریکہ ہجرت کر گئے ہیں۔ اس مضمون میں ہاشم بھائی کا ذکر خیر ہے۔

۱۹۵۸ء میں جب میں حیدرآباد سکریٹریٹ میں انڈر سکریٹری بن کر آیا تو اس وقت ہاشم بھائی ڈپٹی سکریٹری تھے۔ بہت ہی وضعدار خوش مزاج شخصیت۔ ایک ہی ملاقات میں دوستی ہو گئی۔ ان دنوں سکریٹریٹ میں افسروں کے دو لنچ کلب تھے ایک میں سابق آندھرا یا مدراس کے افسر مدراس کی روایت کے مطابق جمع ہوتے تھے۔ دوسری میں تلنگانہ کے افسر مل کر کھانا کھاتے اور گپ شپ کرتے۔ یہ دونوں کلبیں انفارمل تھیں اور ان میں داخلہ کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ مجھے دونوں کلبوں میں مدعو کیا جاتا اور میں موڈ کے مطابق کبھی ادھر کبھی اُدھر چلے جاتا۔ آندھرا کلب میں بطور حق (میرا تعلق آندھرا ریاست کے افسروں میں سے تھا) اور تلنگانہ کلب میں ازراہِ خوش سگالی ہو خر الذکر کلب میں مجھے کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کیوں کہ ہر افسر اپنی ضرورت سے زیادہ لاتا تھا۔ جب پہلی بار میں اپنا لنچ بنوا کے لے گیا تو میری بیوی نے حیرت سے پوچھا "کیا سکریٹریٹ کو کھانا کھلانا ہے"؟

اس کے علاوہ ہاشم بھائی اور میں اکثر چائے بھی اکٹھے پی لیتے۔ کیوں کہ وہ تو اضع محکمہ کے انچارج بھی تھے اس لیے ان کی چائے بہت اچھی ہوتی تھی اور بڑے اہتمام سے "سرو" کی جاتی تھی۔ پھر ہمارا ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا شروع ہو گیا اور اس طرح ہمارے کنبوں میں بھی دوستی ہو گئی۔

۱۹۵۶ء کی ریاستی تنظیم نو کے بعد جب ریاست حیدرآباد کا وجود ختم ہو گیا تو حیدرآباد شہر پر مدراس سے آئے ہوئے افسروں کی یلغار ہوئی۔ حیدرآباد کے افسروں اور اسٹاف میں رکھ رکھاؤ، وضعداری اور "پالش" زیادہ تھی۔ اس کے برخلاف یہ رائے بھی عام تھی کہ آندھرا کا اسٹاف کام بہتر کرتا ہے۔ اس رائے کا اظہار اکثر کھلم کھلا بھی کیا جاتا۔ تلنگانہ کے عملہ پر یہ بات بہت گراں گزرتی کیوں کہ لحاظ سے حیدرآباد کا نظم و نسق آندھرا سے زیادہ "پروگریسو" تھا۔ خود ان کو کام کرتے دیکھ کر کبھی یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ تلنگانہ کے افسر کم اہل ہیں۔ خود ہاشم بھائی غیر معمولی قابلیت کے افسر رہے ہیں۔ سکریٹریٹ میں ایک پوسٹ تھی جو خاص طور پر قابل اور قابلِ اعتماد افسر کو دی جاتی تھی۔ ڈپٹی سکریٹری پولیٹیکل (جس کا رتبہ اب بڑھا کر سکریٹری کر دیا گیا ہے)۔

یہ پوسٹ راست سکریٹری کے تحت تھی اور تمام خفیہ اور راز کے امور اسی کے تحت رہتے تھے۔ چیف سکریٹری نے اعتراض کیا کہ اس پوسٹ پر کسی مسلم افسر کو لگانا دانشمندی نہیں ہوگی۔ اس وقت کے چیف منسٹر سنجیوا ریڈی نے اس اعتراض کو ٹھکرادیا اور خاص طور پر ہاشم بھائی کے تعلق سے کہا کہ اگر وہ بھروسے کے قابل نہیں تو ریاست میں کوئی افسر بھی بھروسے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ ہاشم بھائی اس پوسٹ پر پانچ سال تک فائز رہے۔ اور جب وہاں سے ان کا تبادلہ ہوا تب چیف منسٹر نے ان کو یہ بات بتائی اور ساتھ ہی ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ان کے اعتماد کا پوری طرح احترام کیا۔

ہاشم بھائی کی ہر صفت غیر معمولی ہے۔ غیر معمولی ذہانت، غیر معمولی یادداشت، غیر معمولی خیر سگالی کا جذبہ اور غیر معمولی قصوں اور حکایتوں کا ذخیرہ۔ اور اس کے اوپر حکایت نگاری اور محاورہ نگاری کی غیر معمولی قابلیت۔ پھر ان سے متاثر ہوئے بغیر کون رہ سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی وہ غیر معمولی حد تک صاف گو ہیں۔

خود اپنے آپ کو "منہ پھٹ" کہتے ہیں۔ اگر کوئی نامناسب کارروائی ہورہی ہو یا غلط تجویز ہو تو وہ چپ نہیں رہتے۔ ریاست کی نوکر شاہی کے ایک طبقہ سے انھوں نے بارہا ٹکر لی ہے۔ یہ طبقہ یہاں حاوی ہے اور صرف اپنوں میں ہی گڑ بانٹنے کا عادی ہے۔ خود ان کے ساتھ بھی ایک بار بڑی ناانصافی ہوئی تھی جب ریاستوں کی تنظیم نو کے وقت ان کی سینیارٹی کے سات آٹھ سال مار لیے گئے۔ یہ خلش ان کو ہمیشہ رہی ہے۔

پھر ایک وقت آیا جب ان کو ایک ایسی پوسٹ دی گئی جو نئی نوعیت کی تھی اور جس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے۔ کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ۔ وہ تقریباً دس سال تک اس پوسٹ پر رہے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے اس کو اتنا اہم بنا دیا کہ سب حیران ہوگئے! اسی پوسٹ سے بارہا غیر ملکوں کا سفر کیا اور عالمی بینک کے اکسپرٹ کی حیثیت سے اتنا نام کمایا کہ انہیں اکثر غیر ممالک سے دعوت نامے آتے۔ لیکن اگر وہیں ان کا کیریر ختم ہوجاتا تو وہ شاید CONSULTANT بن جاتے اور ان کی شخصیت پورے طور پر ابھرنے نہ پاتی۔ اس کے لیے ابھی ایک اور موڑ آنا تھا۔

کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ کے بعد وہ ترقی پر پرنسپل سکریٹری اور AGRICULTURAL PRODUCTION - اگریکلچرل پروڈکشن کمشنر بنے اور چیرمین ایریگیشن کمیشن کے عہدے سے وظیفہ پر ہٹے۔ اس عہدہ پر ان کی دو جلدوں پر مشتمل رپورٹ ہندوستان میں آب پاشی پر پہلی رپورٹ ہے۔

انسان کی زندگی، اس کے مقدر کا انحصار کس قدر اتفاقی واقعات اور حادثات پر ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۸۳ء کے الیکشن سے پہلے ایک مانگ جو آندھرا پردیش میں بڑے زوروں پر تھی وہ یونیورسٹی اور ہائی کورٹ میں مسلمانوں کے تقرر کی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی جگہ خالی تھی۔ چیف سکریٹری رامن نے صلاح دی کیوں نہ ہاشم کو اس جگہ لگادیا جائے۔ تقرر ہوگیا۔ یہ اعزاز ہاشم بھائی کے لیے ایک جذباتی اہمیت رکھتا تھا کیوں کہ انھوں نے نہ صرف یہاں تعلیم پائی تھی بلکہ وہاں پڑھایا بھی تھا۔ لیکن یونیورسٹی کے حالات دگرگوں تھے اور خاص طور پر ایک یونین نے وہاں ناجائز طور پر لوٹ مچا رکھی تھی۔ اس تقرر کے خلاف احتجاج بھی ہوا۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر شعبہ میں لاقانونیت تھی۔ لا کالج میں نہ طلباء آتے تھے نہ استاد۔ ہاشم نے دھمکی دی کہ اگر طلباء کی حاضری پوری نہ ہوئی تو وہ UGC کو اس شعبہ کو DERECOGNIZE کرنے کے لیے لکھیں گے۔ پھر ایک ایک کرکے سب مسئلوں کو گرفت میں لیا۔ یہاں ہاشم کی انتظامی صلاحیتوں کا کڑا امتحان ہوا۔ بالآخر یونیورسٹی راہ راست پر آگئی۔ اس ضمن میں بے شمار چھوٹے اور بڑے واقعات ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں۔

ابھی عثمانیہ یونیورسٹی میں ہاشم کی میعاد پوری نہیں ہوئی تھی کہ پنت نے جو اس وقت مرکز میں وزیر تعلیم تھے، ہاشم کو علیگڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلرشپ کی آفر دی، یہ پوسٹ کسی بھی مسلمان کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کانٹوں کی سیج بھی ہے۔ وہاں بڑے بڑے شیخوں کی پگڑیاں اچھل چکی تھیں۔ لیکن عثمانیہ میں کامیابی پانے کے بعد ہاشم کا حوصلہ بلند ہو گیا تھا۔ اور پھر فطرتاً وہ چیلنجوں سے ڈرنے والے نہیں۔

علیگڑھ یونیورسٹی کی تاریخ میں اتنی اصلاحات کبھی نہیں ہوئیں جتنی کہ ہاشم کے دور میں ہوئیں۔ وہاں ہر چیز، ہر امر ہر فیصلہ، ہر تجویز ایک خاص نقطہ نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ہاشم بھائی کا کہنا ہے کہ اگر وہ علیگڑھ نہ جاتے تو انہیں مسلم فرقہ پرستی کا تجربہ نہ ہوتا (ہندو فرقہ پرستی کا تجربہ انہیں عثمانیہ میں ہو چکا تھا) انھوں نے اپنے مخصوص اسٹائیل میں طلباء کی یونین کے لیڈروں سے راست اور دو ٹوک بات چیت کی ان کے واجب مطالبوں کی یکسوئی کی اور ناواجب مانگوں کو رد کر دیا۔ اسی طرح کئی اساتذہ کیساتھ ناانصافیاں ہوئی تھیں۔ ان کا بھی ازالہ کیا۔ جب ایک سر سید ڈے پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو مدعو کیا تو چند طلباء نے منہ نیچا کر کے اجتماعی طور پر سی سی کرنا شروع کر دیا۔ ہاشم بڑے سکون سے اٹھے اور طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہا جو اعتماد سر سید نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا وہ آج پنکچر ہو رہا ہے سب لوگ ہنس پڑے اور طلباء بھی کھسیانے ہو کر چپ ہو گئے۔ کچھ مسلمان لیڈروں اور خاص طور پر یوپی کے چند وزراء نے اس یونیورسٹی کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کے رکھا تھا۔ ہاشم نے کہا سب کام قاعدہ کی رو سے ہونگے۔ جب چانسلر نے وائس چانسلر کی سفارش کے خلاف سینٹ کی میٹنگ بلائی تو ہاشم نے اسے چیلنج کیا اور کہا کہ یہ دستور کے خلاف ہے۔ کافی لے دے ہوئی، گڑبڑ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ہاشم نے کسی کی نہ چلنے دی۔ انھوں نے وہاں کے ملاؤں کو بھی للکارا۔ جب ان کی کاوشوں کی وجہ سے میڈیکل کالج کی سیٹوں میں ۱۰۰ فیصدی اضافہ ہوا تو اس کی مخالفت کی گئی کہ اس کا فائدہ زیادہ ہندوؤں کو ہوگا۔

ہاشم نے سمجھوتہ کرنے کی بجائے قدم آگے بڑھائے! انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو تجویز پیش کی کہ ہماری دو یونیورسٹیوں کے درمیان باہمی تال میل بڑھانا چاہیے۔ ڈاکٹر رستوگی نے اس آفر پر لبیک کہا۔ جب کھلاڑیوں کی ٹیموں کا EXCHANGE PROGRAMME بنایا گیا تو اس کی مخالفت ہوئی۔ لیکن جب اس کے باوجود ہاشم نے اسے عملی جامہ پہنایا تو علی گڑھ کے طلباء نے اپنے وائس چانسلر سے حیرانگی سے کہا "سر۔ وہ تو بالکل ہمارے جیسے ہیں!" تعلیم کے میدان میں بھی ایک EXCHANGA PROGRAMME تیار کیا گیا ہاشم نے کہا بنارس یونیورسٹی CLINICAL STUDIES میں مضبوط ہے جب کہ علیگڑھ یونیورسٹی MEDICAL STUDIES پر کافی زور دیتی ہے۔ کیوں نہ ایک دوسرے کے اساتذہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس طرح جو نفرت اور شک کا آہنی پردہ دونوں یونیورسٹیوں کے درمیان تھا اس کو اٹھا دیا گیا اور غالباً پہلی بار دونوں یونیورسٹیوں کے طلبا اور اساتذہ نے دیکھا کہ "وہ تو بالکل ہمارے جیسے ہیں"۔ مینجمنٹ میں اس رویہ کو SYNERGETIC APPROACH کہا جاتا ہے۔ ہاشم نے اس کو INTEGRATION THROUGH INTERACTION کا نام دیا۔

واقعات بیشمار ہیں۔ ہر واقعے سے ان کی جدت پسندی اور تخلیقی اپروچ ظاہر ہوتی ہے۔ مختلف قومی مسائل کو انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے دائرہ عمل میں لانے کی کوشش کی۔ ان کی نہ صرف اپروچ نرالی ہوتی ہے بلکہ ان میں غیر معمولی دلیری اور ہٹ دھرمی بھی پائی جاتی ہے۔

— —

ہر مسئلے کا حل تجویز کرنے یا ہر موضوع پر رائے دینے سے پہلے وہ اپنا "ہوم ورک" بخوبی کرتے ہیں۔ آج تک کتابیں، اخبار اور مضامین اسی انہماک سے پڑھتے ہیں جیسے وہ اسکول اور کالج میں اپنا کورس پڑھتے تھے۔ پڑھے ہوئے مواد کے نوٹس بناتے ہیں۔ ہر نئی کتاب، ہر نیا مضمون گویا اس عمارت پر جو انھوں نے برسوں کے مطالعے سے استوار کی ہے ایک نئی اینٹ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی تخلیقی عمارت بڑھتی جاتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف قرآن شریف بلکہ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کا بھی بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ میں جب حیدرآباد کی تاریخ پر کتاب لکھ رہا تھا تو پولیس ایکشن سے پہلے اور بعد کے دور کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہ نگاہ کے متعلق متعدد مسلمانوں سے بات چیت کی۔ ان سے بھی مشورہ لیا۔ انھوں نے مجھے سید عبداللطیف کی کتاب BASES OF ISLAMIC CULTURE پڑھنے کو دی جس میں مختلف موضوعات پر قرآن کی آیات اور حدیث کی رو سے تشریح کی گئی ہے۔ اس سے مجھے متعلقہ باب لکھنے میں کافی مدد ملی۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھے چند ایسے لوگوں سے بلوایا جو اس دور سے گزر چکے تھے اور جن کو اس بارے میں ذاتی تجربہ تھا اور اس کی بنا پر چند واقعات پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ کیوں کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے اس لیے وہ کٹ پنتھیوں سے کبھی دبے نہیں۔

ذہانت کا ایک روپ بذلہ سنجی ہے۔ طنز و مزاح بھی اسی قبیل سے ہے۔ ہاشم بھائی کی گفتگو اور تقریر میں بڑا صاف ستھرا مزاح ملتا ہے! انہیں مسلسل اُکسانے کے بعد ایک بار ہم ان کو زندہ دلانِ کے جلسے میں لانے میں کامیاب ہو سکے! انہوں نے غالباً اہلِ غرض، پر مضمون پڑھا تھا جو بہت سراہا گیا۔ اس کے بعد وہ اسٹیج پر نہیں آئے حالانکہ خود ان کو بھی اپنے اس جوہر کا اعتراف ہے۔ شاید یہ فیصلہ دور اندیشی پر مبنی تھا کیوں کہ ایک افسر کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی شہرت نقصان دہ نہیں ہوتی کہ وہ مزاح نگار ہے۔ پھر اسے ہر سنجیدہ کام کے لیے نا اہل سمجھا جاتا ہے۔ کتنے افسر اور کتنے سیاستدان اپنی حسِ مزاح کو چوروں کی طرح دبائے رہتے ہیں! اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ہم نے عالمی جشنِ مزاح کا اہتمام کیا۔ ہاشم بھائی میری موجودگی میں جب بھی کسی سے ملتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں "میں صرف گفتگو میں مزاح نگاری کرتا ہوں" یہ تحریر اور تقریر دونوں میں" اور پھر شاید دل ہی دل میں کہتے ہیں" اس لیے یہ اکثر پکڑا جاتا ہے" وہ نہ صرف مزاحیہ جملے اور SNIPPETS اکٹھے کرتے ہیں بلکہ خود اپنے مزاحیہ قول بھی نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ ایک بار ایک ایسی لسٹ انہوں نے ازراہ نمونہ دی تھی۔ کبھی بلیک میل کرنے کا موقع آیا تو استعمال کروں گا۔ وہ دانشمندی اسی میں سمجھتے ہیں کہ حسِ مزاح چھپی رہے اور مزاح نگاری چوری چھپے کی جائے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بارہا ان کی کامیابی کی وجہ ان کی بذلہ سنجی اور حسِ مزاح ہی تھی۔ ہم مزاح نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہاشم بھائی جیسا کامیاب شخص مزاح کی سودمندی کا علانیہ اعتراف کرے۔

جب وہ عثمانیہ کے وائس چانسلر تھے تو اپنی شادی کی (غالباً) ۳۷ ویں سالگرہ پر انھوں نے اپنے چند دوستوں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد سب چلے گئے میں اور میری بیوی ان سے باتیں کرتے رہے۔ کار کے پاس پہنچنے کے بعد ہاشم بھائی تھوڑے سے جذباتی ہو گئے۔ میرا بازو پکڑ کر کہنے لگے "آج ہماری شادی کو ۳۷ برس ہو گئے۔ اس دوران ایک بار بھی ہمارا آپس میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور اس کا سارا کریڈٹ وحید کو ملتا ہے۔ نہ جانے یہ کیسے مجھ جیسے بگڑے شخص کے ساتھ نباہ کرتی رہی" میں نے کہا "یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ جھگڑا تو ہونا ہی چاہیئے۔ اس کا مطلب ہے آپ نے ابھی تک گرہستی کا مزا نہیں چکھا۔ چلیے میں آپ کو سکھاتا ہوں جھگڑا کیسے کرتے ہیں" میری بیوی نے یہ سنا تو وہ بول اٹھیں "آپ کیا سکھائیں گے؟ میں سکھاتی ہوں" اسی بات پر ہماری تکرار شروع ہو گئی اور وہ جوڑا کھڑا مسکراتا رہا۔

وحید بھابی کی شخصیت میں روایت اور جدیدیت کا بڑا حسین امتزاج تھا۔ مجھے ہمیشہ بھلے نام سے بلاتیں، ہمیشہ بڑے پیار سے ملتیں، تم بہت دبلے ہوگئے ہو، کیا بات ہے؟ اور پھر میری بیوی سے مخاطب ہوتیں "اپنے میاں کا خیال رکھو بھابی" ہاشم بھائی کا فون آتا۔ "وحید کہہ رہی تھی کہ بہت دن سے آپ کی خبر نہیں آئی" ہم جا کے خبر دے دیتے۔ رمضان میں ایک آدھ بار افطار کے لیے جاتے اور عید کے دن تو وہ گھر ہمارا لازمی اسٹاپ ہوتا۔ جب 1989 میں مَیں شدید بیمار ہوا اور مجھے دہلی کے آل انڈیا انسٹیٹیوٹ میں داخل کرایا گیا تو ہاشم بھائی اور وحید بھابی سب سے زیادہ بار مزاج پُرسی کرنے آنے والوں میں سے تھے۔

حالانکہ دیکھنے میں وہ چھوٹے قد کی اور نازک اندام لگتی تھیں لیکن وحید بھابی بڑے مضبوط کریکٹر اور ارادے کی عورت تھیں۔ ہاشم کے لیے گویا ایک چٹان کا سہارا تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب اور بڑے شخص کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ اور اس عورت کے پیچھے اس کی بیوی! یہاں اس سلسلے کی بیچ کی کڑی غائب تھی ابھی عثمانیہ کا وائس چانسلر بنے ایک دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ ہاشم وہاں کی روز کی ہڑلونگ سے تنگ آگئے اور ایک دن انہوں نے وحید بھابی کو بتایا کہ وہ استعفیٰ دینے جا رہے ہیں۔ بھابی نے کہا "دیکھو۔ یا تو آپ کو یہ آفر منظور نہیں کرنی چاہیے تھی یا پھر اب اس سے منہ مت موڑو۔ حوصلہ قائم رکھو۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا" ہاشم نے اسی نصیحت پر عمل کیا۔ اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

۱۲ نومبر ۹۳ء کی رات کو جب وہ THE WORLD THIS WEEK پروگرام دیکھ رہے تھے تو اچانک وحید بھابی کی طبیعت خراب ہوگئی اور پیشتر اس کے کہ کوئی طبی امداد دی جا سکتی وہ اس دنیا سے چلی گئیں۔ ہاشم بھائی لاش کو لیے اسپتال پہنچے کہ شاید بے ہوش ہو۔ لیکن وہاں ڈاکٹروں نے کہا کہ یہ ابدی نیند ہے۔ قدرت کی بات بھی عجیب ہے۔ دل کس کا کمزور تھا، بائی پاس سرجری کس کی ہوئی تھی اور دورہ کس کو پڑا؟

اس صدمہ سے ہاشم بھائی بالکل ٹوٹ گئے۔ دیوالی کی شام ہم بھابی کو دفنانے لے گئے۔ شہر میں پٹاخے جل رہے تھے۔ ہر طرف چراغاں تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا کیا یہ چراغاں بند نہیں ہو سکتے؟ پھر خیال آیا کہ ایسی نیک روح کے آخری سفر پر شاید چراغاں ہی مناسب ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر انہیں الوداع کہہ رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انسان فانی ہے، موت پر دُکھ ہوتا ہے خاص طور پر اگر وہ ایسے عزیز کی ہو۔ لیکن قدرت کا نظام ایسے ہی چلتا ہے ایسے نیک لوگوں کے مٹی میں مل جانے سے ہی مٹی میں زرخیزی پیدا ہوتی ہے اس سے فصلیں پیدا ہوتی ہیں، پھول کھلتے ہیں زندگی پنپتی ہے۔

عموماً عورتیں خاوند کی موت پر بے سہارا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہاشم بھائی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی میں ان کے لیے صرف ایک ہی سہارا تھا۔ مجھے ہاشم بھائی کا وہ قول یاد آیا کہ "ہمارا ایک بار بھی جھگڑا نہیں ہوا" ہاشم بھائی کی یادوں میں صرف پیار ہی پیار، صرف خوشبو ہی خوشبو ہے۔ ان کا ایسے ٹوٹ جانا قدرتی تھا۔

پھر ایک بار ہاشم بھائی کی زندگی نے ایک اتفاقی واقعہ، ایک ناگہانی حادثے کی بنا پر موڑ لیا۔ اس بار وہ موڑ کربناک تھا۔ وہ جو اس شہر کے دانشوروں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ جو ہر محفل کی زینت تھا، وہ جو کہتا تھا کہ ہم یہیں رہیں گے، یہیں مریں گے، اچانک بے سہارا، اجنبی بن گیا۔ مشورہ کس سے کرے؟ فیصلے کی ڈور پھسل کر بچوں کے

ہاتھ میں چلی گئی۔ انہوں نے کہا "بابا آپ کی دیکھ بھال دہیں ہمارے پاس ہو سکتی ہے"۔ یہاں نہیں۔ انہوں نے پچھلے ۶۰ سال کی جڑوں کو کاٹ پھینکا۔ وہ جو اتنا بکھیڑا پھیلا ہوا تھا وہ سب سمیٹا لاگیا۔ گھر بیچ دیا گیا۔ اثاثہ ادھر اُدھر دے دیا گیا، کتابیں لائبریریوں کو دے دی گئیں۔ رختِ سفر باندھا گیا۔ محض ایک موت نے ان کی زندگی کا رُخ ایسا موڑا کہ وہ سات سمندر پار چلے گئے۔ مجھے ہاشم بھائی کے الفاظ یاد آئے جن کا میں نے کہیں استعمال بھی کیا ہے۔ "میں یہاں ایک انسان ہوں۔ میری اپنی شناخت ہے۔ وہاں امریکہ میں ایک گھر میں محض ایک بڈھا ہوں، دوسرے میں صوفہ سیٹ کی ایک سیٹ اور تیسرے میں ایک ٹیلیفون"۔ ہاشم بھائی اپنے بچوں کی انگلی پکڑ کر ایک بچے کی طرح چل پڑے۔ ایک نئے سفر پر۔ انسان کو اپنی زندگی پر، اپنے مقدر پر کتنا اختیار ہے۔؟

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی

لیکن ہاشم کے سینے میں دل ہے جس میں انسانیت کے لیے تشویش ہے، قوم اور ملک کے لیے تڑپ ہے۔ وہ دل وہ تڑپ وہاں بھی زندہ رہیں گے۔ اور وہ ان کو زندہ بھی دیکھیں گے۔ یہاں بھی وہ صرف ایک ریٹائرڈ افسر، ایک وظیفہ یاب وائس چانسلر ہی نہیں تھے۔ وہ یہاں کے دانشور تھے۔ اور رہیں گے۔ کافی عرصے سے ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں میں خود احتسابی کا جذبہ پیدا ہو۔ انہوں نے ۱۹۹۱ میں شکاگو میں اپنی تقریر میں، اپنے بعد کے مضمونوں میں اور ہمیشہ اپنی تقریر اور تحریر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ہمیں ہر شخص ہر فرقہ کو۔ اپنے گریبان کے اندر منہ ڈال کر جھانکنا چاہیئے نہ کہ دوسروں کی خامیاں ڈھونڈنی چاہئیں۔ وہ مسلمانوں کو تعلیم کی تلقین دیتے ہیں کہ اسی میں ان کی ترقی کا راز ہے۔ ایسے مثبت مشورے بعض حلقوں میں پسند نہیں کئے گئے۔ ان کی وجہ سے انہیں دھمکیاں بھی وصول ہوئیں۔ خاموش ہو جاؤ۔ اپنا قلم روک لو۔ ہم صرف وہی سنتے ہیں جو ہم سننا پسند کرتے ہیں۔ وہ نہیں جو ہمیں سننا چاہیئے۔ جو ہمارے لیے مفید ہو۔ یہی ہمارا المیہ ہے۔ لیکن طوطی کو نقار خانے میں خاموش نہیں ہو جانا چاہیئے۔

نہ جانے مستقبل کے بارے میں ہاشم کے کیا پلان ہیں۔ لیکن میں اگر انہیں مشورہ دے سکوں تو یہ کہوں گا کہ آپ اپنی آپ بیتی لکھیئے۔ (یہ بات میں بار بار عابد بھائی سے بھی کہتا رہا۔ بالآخر انہوں نے لکھنا شروع کیا اور ابتدائی حصے مجھے سنائے بھی لیکن وقت سے پہلے ان کو بلاوا آ گیا) ہر غیر معمولی کامیاب شخص کا یہ فرض بنتا ہے اس کے علاوہ انہیں اب طنز و مزاح کی طرف مائل ہونا چاہیئے کیوں کہ اب ان کو اپنی نیک نامی متاثر ہونے کا کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیئے۔ امریکہ میں مزاح نگاروں کی بجا طور پر بڑی پذیرائی ہوتی ہے۔ اور لگتا ہے بلکہ ہے وہ کچھ پند و نصائح بھی کرتے رہیں۔ آپ کا ہندوستان سے چلے جانا ایک بہت بڑا BRAIN DRAIN ہے۔ لیکن آج کے زمانے میں DRAIN یکطرفہ نہیں ہوتے۔ ہم اتنی دوری سے بھی آپ کے ذہن سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اشارتی وی کے اشتہار میں کہا جاتا ہے۔

"آخر ہم ایک دوسرے سے ایک FAX کی دوری پر ہی تو ہیں"۔ یقین کیجیئے۔ ہمیں آپ کی صاف گوئی۔ دانشمندانہ صاف گوئی کی ابھی بہت ضرورت ہے۔ اور وہاں بھی تو آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کتنے ہندوستانی۔ کتنے حیدرآبادی نوجوان اور ان کے بچے وہاں ہیں۔ یقیناً ہمارا نقصان ان کا فائدہ ہے۔

اور ہمارے دل میں آپ سے ملنے کی آرزو ہمیشہ جوان رہے گی

غوثیہ سلطانہ (شکاگو)

ڈاکٹر شفیقہ فرحت شکاگو میں

کئی ادیب سرزمین امریکہ آتے اور جاتے رہتے ہیں بلکہ قبل ازیں فضاؤں کی روش پر ان کے آنے کے چرچے بھی شروع ہو جاتے ہیں لیکن کسی مصنف کا گزر کم ہی ہوتے دیکھ کر ایک خیال سا ذہن میں گردش کرنے لگا کہ ویسے تو ہما سا آئین عورتوں اور مردوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا پھر بھی دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ گوشہ حیات میں چلے جائیے خواتین کو بہ ہمت و مقابلہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر شفیقہ فرحت سے عموماً شگوفہ کے ذریعہ ملاقات کے بعد شکاگو میں اس مصنفہ کی آمد اور شخصیت کا ملن نے گویا خشک سالی میں جل برسایا "نئی دیوار چین" کے سلسلے میں WORLD. TOUR پر نکلنے والی اس خاتون مشرق کے کئی ادبی شہ پارے ملتے ہیں جو انہیں عام ڈگر سے ہٹا کر منفرد انشا پردازی کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر زور کہ "اسلوب مصنف کی تمام زندگی کا عکس ہوتا ہے"۔ نامحرم، راجہ جی، تیسہ کرسی کا اور رنگ نینوں کی سحر، ایوارڈ یافتہ ادب پارہ بھوپال کی گیس ٹریجڈی پر دردمندانہ تاثرات، اسلوب کی خوبیاں، اظہار سوز و گداز جس میں روانی ایسی کہ جیسے دریا رواں ہو۔ ان کے ذہن و فکر کی روشنی سے منظر عام پر آنے والی بچوں کی کہانیاں کل کے قومی معمار کے لیے خاص طور پر لکھی گئیں جن میں چھن چھن بیگم رانگ نمبر، گول مال، بچوں کے نظیر اکبرآبادی اور بچوں کی شفیقہ فرحت قابل ذکر ہیں۔

دوران گفت و شنید وہ اپنے تاثرات کو الفاظ میں بڑے ہی موثر انداز کے ساتھ مجسم کرتے ہوئے اپنی ACTIVITIES کا ذکر کر رہی تھیں۔ وہی دھیما دھیما مگر وسیع العلم و مکالماتی انداز اور خیال کی ہم آہنگی جو اُن کی تحریروں میں بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ بہت سے لوگ اچھی اچھی باتیں کہہ جاتے ہیں لیکن ان کو سن کر اثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے لیکن بات کی کامیابی اس میں ہے کہ سننے والے پر اثر کر جائے اور وہ بات ڈاکٹر فرحت میں نظر آئی۔ ایک لمبے عرصے تک بحیثیت صدر اردو ڈپارٹمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کو اپنی شخصیت اور فن کے ذریعہ نکھارتی اور سنوارتی رہیں سرکاری اور غیر سرکاری ادبی سرگرمیوں، اردو کانفرنس، سوشل اور لٹریری ORGANISATIONS میں "دھنک" کی نمائندگی کرتی رہی ہیں۔ طنزیہ شاعری کے پارس یعنی نظیر اکبرآبادی کو پی ایچ ڈی کا تحقیقی موضوع بنایا جس کا ہندی بھاشا میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ نظیر پر تحقیقی مقالے کے بعد خود ان کے قلم کو طنز و مزاح کی منصفانہ و مخلصانہ جلا ملی ڈاکٹر فرحت کے ادبی شہ پارے موجودہ دور میں اردو کا بے مثال ذخیرہ ہیں جس میں انسانی معاشرے اور زندگی کے عقائد کی عکاسی نظر آتی ہے انھوں نے اپنی بیشتر تحریروں میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ وقت، حالات اور ماحول کی تصویر کشی کی ہے الفاظ کی تراش خراش اور طنز و مزاح کی گلکاریاں انہیں منفرد مصنفہ کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتی ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انسانی فلاح و بہبودی اور ادب عالیہ کے بے شمار کاموں میں منہمک رہ کر اس انشا پرداز نے اس عام قیاس آرائی کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ عورت بیکاری میں فقط رانی کا پربت ہی بناتی ہے بلکہ یہ ثابت کیا کہ عورت علم و ادب کے ایوان بھی سجاتی ہے اور جگت بھر میں روشن چراغاں رکھتی ہے۔ ڈاکٹر فرحت کے خیال میں ادب زندگی کے معنوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے ایسا ہی کچھ JAMES REVEES نے بھی اپنی تخلیق THE CRITICAL SENSE میں کہا تھا کہ "ادب کے ذریعہ زندگی اور تنقید کے ذریعہ ادب کو سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے"۔ ڈاکٹر فرحت کے پسندیدہ طنز و مزاح نگار

علیگڑھ کے زندہ نشان، تکرار سے مزاح پیدا کرنے والے
جسے اردو کا چسٹرٹن CHESTERTON کہا جا سکتا
ہے، رشید احمد صدیقی ہیں۔ شعر و شاعری میں غالب کے رنگ
ہنر کو ترجیح دیتی ہیں۔ ان کا مخصوص زاویہ نگاہ صرف جدت
پسندی یا فن برائے فن ہی نہیں بلکہ ان کا مقصد قاری کو لطف
میں شریک کرنا بھی نظر آتا ہے اسی لیے شب و روز کی تصویریں
میں ان کے احساس کے لہو کی گرمی و فکر کی تابانی ملتی ہے۔
سماجی و اقتصادی پس منظر کو اوجھل نہیں رکھتیں بلکہ نظروں
کے سامنے رکھتی ہیں اس طرح اپنی عقاب نگاہی سے افسانے
کے قدوخال کو سامنے لے آتی ہیں۔

"قصہ کرسی کا" تکرار و بحث میں سماجی زندگی کا وسیع
مطالعہ اور معاشرے کے پہلوؤں کا بہترین احاطہ نظر
آتا ہے۔ ان کے خیال میں مزاح ادب پیدا کردار کے
ذریعہ عام انسان یا سماج کی خامیوں کی جانب متوجہ
کراتا ہے۔ بذلہ سنجی WIT اور خیال کی ندرت کو
ترجیح دینے والی خاتون بحیثیت مصنفہ تہذیب و تمدن
کے غیر معمولی عروج و زوال کا ماہرانہ اور صداقت
پسندی کے ساتھ تجزیہ کرنا جانتی ہیں۔ معروف اردو
دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پس انتخاب کے معیاری
ہونے کے لیے اس مصنفہ کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔

ریحانہ سلطان (بھوپال)

شگوفے

بیگم ممتاز امید نے ایک دن ڈرائنگ روم کی تنقید کرتے ہوئے کہا "یہاں کسی کو میچنگ کا دھیان ہی نہیں رہتا ـ دیواروں کا رنگ دودھیا پردے ہرے، صوفے کے غلاف لال، گلدان سرخ آپ کے گھر میں لوگوں کی پسند ٹھیک نہیں ہے"۔

ڈاکٹر علی عباس امید نے گمبھیر لہجہ میں ان کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا۔ "بالکل صحیح کہہ رہی ہو بیگم! اگر ایسا نہ ہوتا تو آج اس گھر میں تم کیسے دکھائی دیتیں"۔

○ ایک مشاعرہ کے دوران کسی نے فراق صاحب سے کہا "میں تو اس کو شاعر مانوں گا جو اس مصرعہ پر مصرعہ لگا دے: ؎

مہترانی سے دل لگائیں گے

فراق صاحب نے فوراً مصرعہ ثانی پڑھ دیا: ؎

وہ کمائے گی آپ کھائیں گے

○ ایک مشاعرہ میں فراق گورکھپوری کے بعد زبیر رضوی سے کلام پیش کرنے کی فرمائش کی گئی۔ انھوں نے انتہائی نیاز مندی سے کہا "قبلہ فراق صاحب کے بعد میں کیسے شعر سنا سکتا ہوں"؟

یہ سن کر فراق صاحب بڑی بے نیازی سے بولے "واہ میاں! تم اگر میرے بعد پیدا ہو سکتے ہو تو پھر میرے بعد شعر کیوں نہیں پڑھ سکتے"۔

اور پورا مجمع زعفران زار ہو گیا۔

○ کسی جلسے میں بندی کوی رجن شرلوا ستو نے ڈاکٹر علی عباس امید سے شکوہ کیا "کہاں رہتے ہیں آپ؟ ملاقات ہی نہیں ہوتی"۔

انھوں نے بتایا "بھائی بیوی آج کل میکے میں ہیں اس لیے کچھ پابندی لگ گئی ہے"۔

شرلوا ستو جی بگڑ کر بولے "کیا مطلب، کیا ہماری بیوی نہیں ہے جو ہم گھومتے پھرتے رہتے ہیں"؟ دوسرے احباب بھی جب اُن کی تائید کرنے لگے تو امید صاحب نے وضاحت کی "دوستو! میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کا اکلوتا ہوں"۔

○ فراق گورکھپوری کہہ رہے تھے "بہت سے شعراء نے رباعی کہی ہے، جوش صاحب بھی کہتے ہیں لیکن وہ باقاعدہ فن کی حیثیت سے استعمال نہیں کرتے۔ دراصل وہ اپنی شاعری کے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے دوسری چیزیں لکھتے لکھتے کبھی کبھی رباعیاں بھی لکھ دیتے ہیں۔ ان کی رباعیاں ایک طرح سے چٹنی ہیں اور میری رباعیاں"۔۔۔۔

"ایک طرح سے مربّہ"، مجاز نے فراق صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

○ ایک بے تکلف محفل میں مجنوں گورکھپوری نے فراق صاحب سے پوچھا "چٹکنا اور چٹخنا میں کس کا استعمال کہاں مناسب ہے؟"

فراق صاحب نے قہقہہ لگایا پھر بولے "چٹکتی ہے کلی اور چٹخائی جاتی ہیں جوتیاں"۔

○ سرجن ساہتیہ سمتی نے سہور میں ڈاکٹر علی عباس امید کا استقبال کیا اس موقع پر منعقد مشاعرے میں رات کے دو بجے نرل ورما کو دعوت سخن دی گئی وہ مائیک پر پہنچے اسی درمیان کچھ لوگ اُٹھ کر جانے لگے ناظم مشاعرہ نے نرل جی سے شروع کرنے کو کہا تو وہ بولے "لوگ چلے جائیں تو سناؤں"۔

یہ سنتے ہی امید صاحب نے کہا "بھائی اس کی فکر نہ کیجیے آپ شروع تو ہوں لوگ خود ہی چلے جائیں گے"۔

دے کے خط ـــــ مُراسلے

محترم شگوفہ صاحب

تسلیمات!

نہایت افسوس ہے آپ کو اطلاع کر رہا ہوں کہ پاکستان بلکہ پوری اردو دنیا کے نامور مزاح نگار دلاور فگار ۲۱ جنوری کو کراچی میں انتقال کر گئے، انھوں نے یاسیت زدہ لوگوں کو ہنسانے کے لیے مزاح و طنز نگاری کو بڑی کامیابی سے وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اور اس دور میں اکبر الٰہ آبادی کے نام روشن کرنے والے مزاح نگار تسلیم کیے گئے۔ افسوس اب نہ ان کو دیکھ سکیں گے، نہ ان کو سن سکیں گے اور نہ ان کا نیا کلام عطا ہوگا۔

شگوفہ صاحب! آپ بھارت میں مسکراہٹیں تقسیم کرنے کا کام ایک لمبے عرصے سے کر رہے ہیں۔ دلاور فگار آپ کے معاصر تھے۔ میں ان کی وفات کی تعزیت آپ سے کرتا ہوں۔ ازراہِ کرم اپنے قارئین تک یہ اطلاع پہنچا دیجیے۔

بھائی شگوفہ! جل جلاؤ کا دور کبھی ملاقات کا موقع دیجیے، آپ کی صورت دیکھے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے آپ کو یاد ہے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟ مجھے تو یاد ہے کہ آپ کراچی میں مزاح کانفرنس میں تشریف لائے تھے۔ لیکن مجھے ملاقات کا شرف لاہور میں عطا کیا۔

والسلام

انور سدید
(لاہور)

محبی ڈاکٹر مصطفٰی کمال صاحب

تسلیمات۔

ماہنامہ "شگوفہ" کا فروری ۱۹۹۸ء کا شمارہ مل گیا ہے عرصے کے بعد شگوفہ سے ملاقات ہوئی تو ایک بہت پرانا شعر یاد آ گیا جو اس موقع پر استعمال کرنے کے لیے ہی لکھا گیا تھا۔

اے دوست "شگوفہ" سے یہ تجدیدِ ملاقات
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے"

زیرِ نظر پرچے میں دلاور فگار پر ایک باوقار گوشہ چھاپ کر آپ نے مرحوم کو ہی نہیں بلکہ دلاور فگار کے سب چاہنے والوں سے تعزیت کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ گوشہ تحسین سخن شناس کا درجہ بھی رکھتا ہے۔

یوسف ناظم صاحب کے مضامین یہاں "سب رس" کراچی میں دوبارہ چھپتے ہیں، بھارت کے رسائل یہاں بہت کم آتے ہیں۔ اس لیے یہ قندِ مکرّر کے طور پر نہیں بلکہ قندِ تازہ کے طور پر پڑھے جاتے ہیں۔ دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں دور سے پہچان لیا۔ ان کی ہیئت کذائی کی کیا شان تھی۔ ایسی ہیئت کذائی یوسف ناظم ہی کی ہو سکتی تھی۔ انھوں نے مجھے میرے گنجِ گراں مایہ سے پہچان لیا اور جب لغاری صاحب کہہ کر بلایا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے "گنج" کو ترقیِ درجات مل گئی تھی اور صدر پاکستان کے گنج کے مشابہ ہو گیا تھا۔ افسوس کہ اب میرا گنج سابق صدر لغاری کے مشابہ قرار پائے گا آپ اسے ترقیِ معکوس بھی کہہ سکتے ہیں۔

۲۵ فروری ۹۸ء — انور سدید (لاہور)

جناب ڈاکٹر کمال صاحب آپ کا سب سے بڑا کمال بغیر مانئے DISCOVERY OF TAAIB ZAIDI ہے ادھر ایک ڈیڑھ سال سے ان جناب نے مذاق مذاق میں جو باتیں بیان کی ہیں ان پر سر دھنتے رہتا ہوں مزاح نگار تاریخ داں اور طنز کے تیر چلانے والے واللہ جواب نہیں ہو سکتا پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہی ہوتا ہے وسیع مطالعہ رکھتے ہیں جب ہی تو قلم میں اتنی جان ہے میں شگوفہ میں موصوف کا ہر مضمون کئی کئی بار پڑھتا ہوں جب بعض باتیں سمجھ میں آتی ہیں اور لطف دوبالا ہوتا ہے

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۳۱ شمارہ ۶

جون ۱۹۹۸ء

طباعت :
دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے
زرِ سالانہ : ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔۱

فون (آفس) 595716
فون (رہائش) 4576064

الفلاح
کمپنی (رجسٹرڈ)

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

جناب مسیح انجم

ممتاز مزاح نگار جناب مسیح انجم کا انتقال

حیدر آباد۔30۔ مئی (راست) ممتاز مزاح نگار جناب مسیح انجم (محمد مسیح الدین) کا مختصر سی علالت کے بعد آج شام 7:30 بجے انتقال ہوگیا۔ انھیں آج صبح قیام گاہ ین جی اوز کالونی و نستھلی پورم سے سی ڈی آر ہاسپٹل منتقل کیا گیا تھا۔ جناب مسیح انجم جو محکمہ تعلیمات سے وابستہ تھے تلگو زبان پر بھی کافی عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی بحیثیت مزاح نگار زبردست خدمت کی ادبی مزاحیہ محفلوں میں ان کی شرکت کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ وہ زندہ دلان حیدر آباد کے قدیم رکن تھے اور معتمد عمومی بھی رہ چکے انھیں زندہ دلان حیدر آباد کے سالانہ اجلاسوں میں سامعین بے حد پسند کیا کرتے تھے۔ مرحوم کے مزاحیہ 4 مجموعہ سائیڈ سے چلئے 'درپردہ' چنانچہ اور طرفہ تماشہ شائع ہوئے اور کافی مقبول ہوئے رہنمائے دکن کے بعد روزنامہ منصف سے بھی وابستہ رہے۔ وہ زندہ دلان کے ترجمان ماہانہ شگوفہ کی مجلس ادارت کے بھی رکن رہے۔ انتقال کی اطلاع ملتے ہی کئی ادبی شخصیتوں اور شعراء نے مکان پہنچ کر پسماندہ کو پرسہ دیا جن میں جناب حمایت اللہ' جناب سعادت علی خاں' ڈاکٹر مصطفے کمال شامل ہیں۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 4 لڑکے بشمول مسٹر سمیع الدین اسنٹنٹ انجینئر محکمہ ٹور ازم' 2 لڑکیاں شامل ہیں ایک لڑکی اور داماد یوتانی ڈاکٹر ہے

ممتاز مزاح نگار مسیح انجم کی تدفین

حیدرآباد 31 مئی (بھارت نیوز) نامور مزاح نگار جناب مسیح انجم کو آج اشکوں سے نم آنکھوں کے ساتھ ان کے ساتھیوں طنز و مزاح نگاروں، مزاح کاروں، رشتہ داروں اور احباب کی کثیر تعداد نے مسجد معراج کرما گوڑہ کے عقبی قبرستان میں سپرد لحد کردیا۔ نماز جنازہ بعد ظہر مسجد معراج میں ہی ادا کی گئی۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ پڑھانے اور ہنسانے میں گذارنے والے مسیح انجم کے اس آخری سفر میں شریک اور اسے ہمیشہ کیلئے وداع کرنے والوں میں جناب کبیر احمد اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد، زندہ دلاں حیدرآباد کے اراکین مسرس حمایت اللہ، مصطفی علی بیگ، طالب خوندمیری، فیرور حیدر، رؤف رحیم اور ڈاکٹر سید مصطفی کمال مدیر شگوفہ کے علاوہ جن سے ان کی بڑی دیرینہ وابستگی رہی ڈاکٹر سید داود اشرف، ناصر کرنولی، مضطر مجاز، پروفیسر عیاش متین، ڈاکٹر مجید بیدار، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، پروفیسر یوسف کمال، علی الدین نوید، ڈاکٹر مصطفی علی کاظمی، مظور احمد منظور اور صحیفہ نگاروں میں ذہانت علی بیگ، عزیز احمد، فاضل حسین پرویز اور ق۔م۔ سلیم شامل تھے۔ جناب مسیح انجم کا کل شام انتقال ہوگیا۔ جناب علی رضا کانگریس آئی لیڈر نے افراد خاندان سے دلی ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ جناب مسیح انجم کی فاتحہ سوم دوشنبہ یکم جون کو بوقت عصر مسجد معراج کرما گوڑہ میں مقرر ہے۔

مسیح انجم مرحوم اعلیٰ درجہ کے انشائیہ نگار اور منفرد خاکہ نگار

زندہ دلان حیدر آباد کا تعزیتی اجلاس 'ادیبوں و شاعروں کا خراج عقیدت

حیدر آباد ۔ 5جون (راست) زندہ دلان حیدر آباد کے ایک خصوصی تعزیتی اجلاس میں مشہور و ممتاز مزاح نگار مسیح انجم کو حیدر آباد کی متعدد نمائندہ شخصیتوں، ادیبوں اور شاعروں نے دل کی گہرائیوں سے بادیدہ نم خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے گذشتہ ربع صدی کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ایک قرارداد تعزیت منظور کی گئی جس میں اردو کے صف اول کے مزاح نگار، تلگو کے مترجم اور دیانت دار و محنتی مدرس کی حیثیت سے انھیں یاد کیا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کی۔ قرارداد میں مسیح انجم کی زندہ دلان حیدر آباد سے 31 سالہ وابستگی نائب معتمد، معتمد عمومی، رکن مجلس ادارت شگوفہ کے طور پر ادارے کے ادبی معیار اور وقار کو بلند کرنے میں مرحوم نے جو کاوشیں کیں اس کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ مسیح انجم نے سماجی تلخیوں اور حقیقتوں کی تصویریں پیش کیں۔ ادیب کے انتقال کے بعد اس کی تحریریں اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ پروفیسر جعفر نظام نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسیح انجم اعلیٰ درجہ کے انشائیہ نگار کے ساتھ منفرد خاکہ نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ نے جذبات سے مغلوب اپنی مختصر تقریر میں مسیح انجم کو ایک پر خلوص، محبت و دیانت کا مجسمہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ تدریس ہو کہ مزاح نگاری یا نجی معاملات وہ ہر کام پوری توجہ اور ایمان داری سے انجام دیتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے کہا کہ مسیح انجم ایک بے ساختہ آدمی تھے۔ طنز و مزاح جیسے سفلی عمل کو انھوں نے علوی علوم بنادیا تھا۔ زندہ دلان حیدر آباد نے جو قلم کار پیدا کئے ان میں مسیح انجم کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ جناب مضطر مجاز نے کہا کہ مسیح انجم کے مزاج اور مزاح میں فرشتہ صفتی تھی۔ وہ کسی کی کھلی نہیں اڑاتے تھے۔ ان کا ادبی ذوق اعلیٰ تھا۔ مزاح کیلئے انھوں نے لطیفوں کا سہارا نہیں لیا۔ پروفیسر غیاث متین نے کہا کہ مسیح انجم بظاہر بذلہ سنج لیکن بہ باطن ٹوٹے اور بکھرے ہوئے انسان تھے۔ ان کے تازہ مضامین کے مجموعی کی اشاعت کی ضرورت پر انھوں نے زور دیا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنی چالیس سالہ رفاقت کا ذکر کیا اور کہا کہ مسیح انجم کا فن جزئیات نگاری سے عبارت تھا۔ جناب صلاح الدین نیر نے کہا کہ مسیح انجم نے اپنی شخصیت کو ابھارنے اور اپنی پہچان کیلئے خود سے کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے ساتھ انصاف بھی نہیں کیا گیا۔ وہ نہایت کم آمیز شخص تھے۔ جناب مصطفیٰ علی بیگ نے مسیح انجم کو 'لوک ہیومر' کا ادیب قرار دیا۔ مسیح انجم کے ہم عصر مزاح نگار دوست پرویز یداللہ مہدی نے کہا کہ رشک اور چشمک ان کے ہاں نام کو نہیں تھی۔ انھیں طنز و مزاح کے فروغ سے دلچسپی تھی۔ ان کے مزاح میں دیہات کی بوباس تھی۔ محفلیں لوٹنے کا ان کا خاص انداز تھا۔ ڈاکٹر دہاب قیصر نے کہا کہ مسیح انجم نے ہمیشہ نوجوانوں کی ہمت افزائی کی۔ آخری زمانے میں نہ لکھ پانے کا انھیں دکھ تھا۔ ڈاکٹر طیب انصاری، ڈاکٹر مصطفیٰ علی فاطمی، جناب اسلم فرشوری اور جناب فرید سحر نے بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر عباس متقی، رؤف رحیم اور اقبال ہاشمی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسہ میں جناب کبیر احمد، اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو، محترمہ برج رانی گوڑ، جناب ولی تنویر، جناب رشید الدین، رحیم الدین توفیق، سعادت علی خاں کے علاوہ زندہ دلان حیدر آباد اور فائن آرٹس اکیڈیمی نے اراکین نے شرکت کی۔ جناب رؤف رحیم نائب معتمد نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔

ریاض میں مسیح انجم کا تعزیتی جلسہ

ریاض 6 جون (نمائندہ خصوصی) بزم شگوفہ ، ہندوستانی بزم اردو ریاض اور بزم احباب دکن ریاض کی جانب سے کل ممتاز مزاح نگار جناب مسیح انجم کے تعزیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا اور مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ۔ اس تعزیتی جلسہ کی صدارت ریاض کی بزرگ شخصیت جناب صفدر حسین نے کی ۔ نواب سکندر علی خاں ، ڈاکٹر عابد معز ، جناب سید یونس حسینی ، جناب عبدالرحیم اکرم اور جناب کے امین واقف نے مرحوم مسیح انجم کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی اور انہیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ۔ ابتداء میں ڈاکٹر محمد عبدالمعز (جامعہ ملک سعود) نے قرات کلام پاک سے جلسہ کا آغاز کیا اور آخر میں مرحوم کیلئے مغفرت اور پسماندگان کیلئے اللہ تعالی سے صبر جمیل کی دعا کی گئی ۔

تعزیتی پیام

فیکس : زندہ دلان شکاگو

ادارہ زندہ دلان شکاگو ۔ امریکہ کے تمام اردو بولنے والوں کی جانب سے نامور طنز و مزاح نگار جناب مسیح انجم کی رحلت پر اپنے گہرے رنج ملال کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالی سے دست بہ دعا ہیں کہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفرنامہ	۵۰ روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۳۰ روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۴۰ روپے
آئی ایم ساری	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰ روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	"	۱۰۰ روپے
بہ فرض محال	خواہ مخواہ	"	۷۵ روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	"	۵۰ روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	"	۶۵ روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسن	سفرنامہ	۴۵ روپے
درگت	ٹی ین راز	کلام	۷۰ روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	کلام	۵۰ روپے
الف تماشہ	نریندر لوتھر		۳۰ روپے

مجتبیٰ حسین (دہلی)

ہنسنا چھوڑو اور قوم کی خدمت کرو!
نقشِ قدم پر کیوں چلیں؟

دہلی سے ایک ہفتہ وار رسالہ نکلتا ہے "خبردار جدید" جس کے ایڈیٹر ہمارے نوجوان دوست معصوم مراد آبادی ہیں۔ ہمارے حساب سے مُراد آباد نے بمشکل تمام جگر مراد آبادی کے روپ میں ایک ہی معصوم ہستی پیدا کی تھی۔ ان کے بعد چونکہ مُراد آباد میں معصوموں کی پیدائش پر پابندی سی عاید ہوگئی ہے۔ اسی لیے اس کی تلافی کے لیے معصوم مرادآبادی نے "معصومیت" کو اپنے نام کا حصہ بنا لیا ہے۔ معصومیت چاہے برائے نام ہی کیوں نہ ہو بہرحال معصومیت ہی ہوتی ہے۔ ان ہی معصوم مراد آبادی نے کچھ عرصہ پہلے ہمارا ایک مضمون اپنے رسالہ میں چھاپا تھا۔ چنانچہ اس مضمون کے سلسلہ میں ان کے پاس بعض توصیفی خطوط بھی آئے لیکن ایک خط ایسا بھی آیا ہے جسے آپ نہ تو تعریف کے خانہ میں رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی مذمت کے۔ اس خط کے لکھنے والے محمد سراج الدین ہیں (یہ چراغ والے الدین نہیں ہیں) جو چتر پور ضلع ہزاری باغ (بہار) کے رہنے والے ہیں، مکتوب نگار نے ہمارے مضمون کی تعریف کرنے کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے۔

"میں ان کے مضامین اکثر پڑھتا رہتا ہوں، نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ بے ساختہ ہنسی بھی آجاتی ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کب تک ٹھٹھا، ہی ہی ہا ہا کرتے رہیں گے انھیں دیکھنا چاہیئے کہ ان دنوں حالات کتنے سنگین ہوتے جارہے ہیں۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں معاشرہ کی خرابیوں کا بخوبی اندازہ ہے لیکن وہ جان بوجھ کر ان پر صرف ہنس کر خاموش ہوجانا چاہتے ہیں"۔ انھیں اصلاح معاشرہ" کے سلسلے میں عملی طور پر بھی کچھ کرنا چاہیئے اور قوم کی خدمت کرنے کے لیے ایک باضابطہ لائحہ عمل بنا کر کام کرنا چاہیئے۔ انھیں قبر کے عذاب کو بالکل نہیں بھولنا چاہیئے، دوسری دنیا میں جب ان سے پوچھا جائے گا کہ پیچھے کی دنیا میں وہ کیا کام کر کے آئے ہیں۔ تو وہ کیا جواب دیں گے"!

یقین مانیئے جب سے ہم نے "خبردار جدید" کی معرفت، اپنے بارے میں یہ مکتوب پڑھا ہے تب سے ہمیں بار بار "خبردار قدیم" کا خیال آرہا ہے۔ دل کو دہلانے والی ایسی تعریف سے آج تک ہمارا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ قبر کے عذاب کے تصور ہی سے ہمارا سارا وجود لرزنے لگا ہے۔ مکتوب نگار نے بعد از وقت ہی سہی ہماری آنکھیں تو کھول دی ہیں۔

اب پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ لگ بھگ چالیس برسوں سے ہم نے ہنسنے ہنسانے کے سوائے کوئی کام نہیں کیا۔ (بشرطیکہ ہنسنے کو واقعی ایک کام سمجھا جائے)۔ اس سارے عرصے میں ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ لوگوں کو ہنسانا اور ان میں خوشیوں کو بانٹنا بھی ایک نیک کام ہے ہمیں دوسری خوش فہمی یہ بھی لاحق تھی کہ سماج کی بے اعتدالیوں پر ہنس کر اور ان پر طنز کے نشتر چلا کر ہم قوم کی اصلاح کر رہے ہیں۔ قوم کی اصلاح تو نہ ہوئی اُلٹا ہماری عادت خراب ہو گئی۔ چنانچہ اب ہر سنجیدہ بات کو ہنسی میں ٹال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہ رہا کہ وہ زمانے کب کے لد گئے جب پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر بھی کٹ سکتا تھا۔ ابھی ساٹھ ستر برس پہلے تک علامہ اقبال (اپنی شاعری میں یہ کام بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے ہیں)۔ ہمیں اس وقت اس دانا کا قول یاد آرہا ہے جس نے کہا تھا کہ اگر طنز کے تیر و نشتر سے قوم کی اصلاح ہو سکتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ دانا کے اس زرین قول کے باوجود نہ جانے کیوں ہم نے اپنی عمرِ عزیز کے چالیس برس ہنسنے ہنسانے میں گزار دیئے۔ واقعی یہ سوال سنجیدہ غور و فکر کا طلبگار ہے۔ تاہم مکتوب نگار کی خدمت میں ہماری دست بستہ عرض یہ ہے کہ شروع میں ہم بھی بے حد سنجیدہ آدمی تھے۔ بات بات پر رو دیتے تھے، کھانے کو نہیں ملا تو رو دیتے، نوکری نہیں ملی تو رونے لگے۔ کسی نے ہماری ذرا سی بے عزتی کی اور ہماری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے اور بھی ایسے کئی معاملات ہیں جن میں ہم چھپ کر یوں روتے تھے جیسے کوئی جرم کر رہے ہوں، ہمارے یہ آنسو کسی نے نہیں دیکھے۔ ان ظالموں اور کافروں نے بھی نہیں دیکھے جن کے لیے یہ بہائے گئے تھے بعد میں بدقسمتی سے ہمیں ایک ایسا کام ملا جس میں ہنسنے ہنسانے کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی، لوگ پیٹ کے لیے روتے ہیں اور ہم اسی پاپی پیٹ کے لیے ہنسنے لگے، گویا اب جو ہم ہنستے ہیں تو اس طرح ہنستے ہیں جس طرح کوئی کشاکشِ روزگار کے لیے روتا ہے۔ ہمارے اس طرح ہنسنے اور دوسروں کے رونے میں کوئی بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔

اِتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں۔

آپ نے اس مریض کا واقعہ تو سنا ہو گا جس کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ ڈاکٹر کے پاس گیا، ڈاکٹر نے مریض کی کیفیت پوچھی ______________ تو بولا "ڈاکٹر صاحب! ایک عجیب سا اضمحلال اور عجیب سی کسلمندی سارے وجود پر طاری رہتی ہے کسی کام میں جی نہیں لگتا، سانسوں کے اس تسلسل کو روک دینے کو جی چاہتا ہے"۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں تم پر اداسی کا غلبہ طاری ہے۔ ان دنوں شہر میں ایک سرکس لگی ہوئی ہے یوں کرو کہ آج شام اس کا شو دیکھنے کے لیے چلے جاؤ۔ اس میں ایک مسخرا کام کرتا ہے اسے دیکھو تو تمہاری ساری اداسی کسلمندی اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

مریض نے منہ بنا کر کہا "ڈاکٹر صاحب پریشانی کی اصل جڑ تو یہی ہے"۔
ڈاکٹر نے پوچھا "کیسی پریشانی؟"
مریض بولا "حضور! سرکس کا وہ مسخرا میں ہی تو ہوں"۔

سچ تو یہ ہے کہ بسا اوقات ہم بھی ایسی ہی کیفیت سے گزرتے ہیں اور لوگ ہمیں ہمارے ہی لطیفے سنا کر شاش بشاش اور تازہ کار بنانے کی ناکام سعی کرتے ہیں۔ برسوں کی اس کشاکش اور ریاض کی وجہ سے ہمارے جسم میں رونے کے جو غدود
[illegible] آنسو آنکھوں [illegible] نہیں آتے۔

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

یہی وہ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے ہم زندگی میں ڈھنگ کا کوئی کام نہ کر سکے۔ اب جو مکتوب نگار نے ہمیں "قبر کے عذاب" سے ڈرا کر قوم کی اصلاح کے لیے کام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ایک زمانہ میں ہمارے دل میں بھی قوم کی خدمت کرنے کا خیال شدت سے آیا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ خدمت کے معاملہ میں کبھی ہم میں اور قوم میں اتفاق رائے نہ پیدا ہو سکا، جسے ہم خدمت سمجھتے تھے قوم اسے بیوقوفی کا نام دیتی تھی، ہم جسے خدمت سمجھتے تھے قوم اسے "حماقت" گردانتی تھی۔ اس اختلاف رائے کی وجہ سے "ہم اصلاح معاشرہ" سے کنارہ کش ہو گئے ورنہ آج ہمارا نام بھی کسی راہ جیسے لیلا اور چارہ گھوٹالے کے ذمہ داروں کے ساتھ لیا جا سکتا تھا۔

کام نے غالب نکما کر دیا ؛ ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

یوں بھی ہمارے معاشرے میں پہلے ہی سے کئی لوگ قوم کی اتنی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اگر ہم خدمت انجام دینے کے لیے آگے بڑھتے تو کب کے پیچھے ڈھکیل دیئے جاتے، پھر ہر پانچ برس بعد قوم کی خدمت کرنے کے خواہش مند حضرات اتنی کثیر تعداد میں نمودار ہو جاتے ہیں کہ اس نقار خانے میں ہم جیسے طوطی کی آواز کون سنتا، پھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ قوم کی خدمت کرنے کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ بھی ملتا۔۔۔ اسے بنک میں تو نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ گھر میں ہی رکھنا پڑتا اور ابھی چار پانچ برس پہلے تک تو ہم کرایہ کے ایسے مکانوں میں رہا کرتے تھے جہاں ہمیں خود اپنے آپ کو رکھنا بھی دشوار نظر آتا تھا۔ ایسے میں قوم کی خدمت کے سلسلہ میں جو معاوضہ ملتا اسے کہاں رکھتے۔ آج بھی کہیں سے ہمیں دو چار سو روپے فالتو مل جاتے ہیں تو انہیں دیوان غالب اور مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں چھپا کر رکھتے ہیں انکم ٹیکس والوں کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے ہی بال بچوں اور بیوی کے چھاپوں کے ڈر سے۔ بہت پہلے ہم نے قوم کی خدمت کی خاطر اپنا تھوڑا بہت ضمیر بیچنے کی کوشش بھی کی، خریدار بھی آگے آئے لیکن ہم نے یہ سوچ کر اسے نہیں بیچا کہ ایک یہی چیز تو ہمارے پاس رہ گئی ہے اسے بھی بیچ دیں تو ہمارے پاس کیا رہے گا، سچ تو یہ ہے کہ قوم کی خدمت کا جذبہ ہم میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن بعد میں عدالتوں وغیرہ کے چکر لگانے سے ڈر ہوتا ہے۔ مانا کہ ضمانت پر بھی رہا ہو سکتے ہیں لیکن کون اس جھنجھٹ میں پڑے، سیاسی رہنماؤں کا کیا ہے وہ تو حکومت کو باہر سے سپورٹ دے کر بھی اپنی جان بچا سکتے ہیں، ہماری سپورٹ کی کسے ضرورت ہے، ہمیں نہ کوٹھیاں بنوانی ہیں اور نہ ہی اپنے بنک بیلنس میں اضافہ کرنا ہے۔ ایسے میں قوم کی خدمت کر کے کیا کرتے غرض ایسی ہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے ہم نے اپنے آپ کو "اصلاح معاشرہ" سے دور رکھا ہے۔ اب ذرا کبھی ہنس لیتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر اپنے آپ پر تو اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہونے لگا ہے تاہم مکتوب نگار نے جو بنیادی سوال یہ اٹھایا ہے کہ دوسری دنیا میں جب ہم سے پوچھا جائے گا کہ ہم پیچھے کی دنیا میں کیا کرتے رہے تو اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہوگا تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ بھلے ہی نیچے کی دنیا میں رہنے والوں کو یہ پتہ نہ ہو کہ ہم اس دنیا میں کیا کر رہے ہیں لیکن اُوپر والے کو تو سب کچھ پتہ ہے اسے تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ جو ہم دھاڑیں مار مار کر قہقہے لگاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر ہنستے ہیں تو ہمارے دل پر کیا گزرتی ہے اور اس ہنسی کے پیچھے کتنے آنسو چھپے ہوتے ہیں۔

خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس لیے مکتوب نگار سے ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ ہمیں ہنسنے سے منع نہ کریں اور خدارا قوم کی خدمت کرنے کا مشورہ ہرگز نہ دیں۔

نقش قدم پر کیوں چلیں

ایک رسالہ میں ایک ایسے روشن خیال نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا ہے جو پچھلے کئی برسوں سے یورپ اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ نوجوان نے اپنے [illegible] اور تجربات کی روشنی میں ایک بنیادی سوال یہ اٹھایا ہے کہ برطانیہ میں نئی نسل سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کے نقش قدم پر چلے۔ فرانس میں کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی نے نوجوان نسل کو نپولین یا ڈیگال کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی ہو۔ امریکہ میں کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ نوجوان کو جارج واشنگٹن یا ابراہم لنکن کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کرے۔ دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ جب بھی کسی گزرے ہوئے رہنما کا یوم پیدائش یا یوم وفات چھٹی کے ساتھ منایا جاتا ہے تو نوجوانوں کو لازماً یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس رہنما کے نقش قدم پر ضرور چلیں۔ چاہے اس رہنما کو گزرے ہوئے کئی سو برس ہی کیوں نہ بیت چکے ہوں، گویا پہلے تو نقش قدم تلاش کریں اور اگر یہ خوش قسمتی سے مل جائیں تو ان پر چلنے لگیں۔ مراسلہ نگار کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی نوجوان نسل کے ساتھ یہ سراسر زیادتی ہے۔ نوجوان نسل جدھر جانا چاہتی ہے اسے جانے دیں خواہ مخواہ اسے الٹے سیدھے راستے دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر نسل اپنا راستہ آپ بناتی ہے۔

مراسلہ نگار کا کہنا اپنی جگہ بالکل درست ہے اور اس کی شکایت بھی بجا ہے۔ بلا شبہ یورپ اور امریکہ میں نوجوانوں سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغربی ممالک میں صفائی کا انتظام بہت اچھا ہوتا ہے اور وہاں کی میونسپل کمیٹیاں اپنے ذمہ کا کام بحسن وخوبی انجام دیتی ہیں وہاں پر بزرگوں کے نقش قدم کو تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جب کہ ہمارے ہاں بزرگوں کے نقش قدم کو بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھنے کی برسوں پرانی روایت موجود ہے۔ چنانچہ راستوں پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور ان کے نیچے بزرگوں کے نقش قدم بھی محفوظ رہتے ہیں۔ آپ حیرت کریں گے کہ پچھلے دنوں پورے پندرہ برسوں بعد ہمیں اپنے آبائی قصبہ میں جانے کا موقع ملا تھا اور ہمیں خود اپنے پندرہ برسوں پرانے نقش قدم بھی محفوظ مل گئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے خود اپنے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیوں کہ بڑھتی ہوئی عمر نے ہمارے راستے بدل دیئے تھے اور ہماری منزل بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ جب ہم خود اپنے نقش قدم پر نہیں چل سکے تو لوگوں کے نقش قدم پر کیسے چل سکتے ہیں۔ مراسلہ نگار کو اس ضمن میں بلاوجہ غم و غصہ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کو کہتا ہے تو ایسی باتیں سن کر خاموش ہو جانا چاہیے یہ کوئی ضروری تھوڑا ہی ہے کہ آپ بزرگوں کے نقش قدم پر ضرور چلیں۔ ہمارے ہاں بہت سی باتیں رسماً بھی کہی جاتی ہیں اور ان کے کہنے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ دن میں اگر دس دوست راستہ میں ہمیں مل جاتے ہیں تو ہم ان کی خیریت ضرور پوچھ لیتے ہیں۔ دوست اگر خیریت سے نہ ہوں تو تب بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ خیریت سے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی دوست غلطی سے کہہ دیتا ہے کہ وہ خیریت سے نہیں ہے اور پچھلے کئی دنوں سے اسے بخار آرہا ہے اور کھانسی بھی رہنے لگی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ اپنے سارے کام چھوڑ کر دوست کو اپنے ساتھ اسپتال لے جائیں اور جب تک وہ پوری طرح صحت مند نہ ہو جائے تب تک اس کے ساتھ رہیں اور اس کی دیکھ بھال کریں اگر خدانخواستہ ایسی صورتحال پیدا ہو جائے تو ہم بھی اپنے لیے ایک اچھی سی بیماری کا انتخاب کر لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہی بیماری اختیار کر لیتے ہیں جس میں ہمارا دوست مبتلا ہوتا ہے اور اس طرح ہماری گلو خلاصی ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مراسلہ نگار مغرب میں رہنے کے بعد ہمارے معاشرہ کی روایات سے بے بہرہ ہو گیا ہے۔ یاد آتا ہے کہ بچپن میں ہمارے استاد نے ہمیں تلقین کی تھی کہ ہم ہمیشہ سچ بولیں

چاہیے نہیں کتنی بڑی مصیبتوں کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ اس ضمن میں انھوں نے سقراط کا حوالہ بھی دیا تھا کہ کس طرح سقراط نے سچائی کی خاطر خوشی خوشی زہر کا پیالہ پی لیا تھا۔ پھر ہمیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ہم سقراط کے نقش قدم پر چلیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں زہر کا پیالہ پی لینے کے خیال سے ہم خوفزدہ سے ہوگئے اور ہم نے معصومیت میں اپنے استاد سے پوچھ لیا تھا "صاحب کیا آپ ہمیں اس شخص کے نقش قدم کی نشاندہی نہیں کرسکتے جس نے سقراط کو زہر کا پیالہ دیا تھا تاکہ ہم فی الحال اسی کے نقش قدم پر چلیں۔ ہم نے تو ابھی دنیا بھی نہیں دیکھی ہے۔ ابھی سے زہر کا پیالہ پی لیں تو دنیا کو کیسے دیکھیں گے امتحانوں میں فیل کیسے ہوں گے۔ بے روزگاری کے مزے کیسے لوٹیں گے وغیرہ وغیرہ۔ آپ سقراط کی بات کرتے ہیں یہاں تو ہر بڑے آدمی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زہر کے پیالے اور بندوق کی گولی کا خیال آتا ہے؟"

مراسلہ نگار کو اصل میں یہ خوش فہمی ہے کہ ہماری نوجوان نسل کو جب کہا جاتا ہے کہ وہ بزرگوں کے نقش قدم پر چلے تو وہ فوراً چلنا شروع کردیتی ہے۔ بات ایسی نہیں ہے۔ ہمارے موجودہ رہنما جب بزرگوں کے نقش قدم پر نہیں چلتے تو نئی نسل کہاں سے چلے گی۔ یہ مغرب کی نوجوان نسل کو بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین اس لیے نہیں کی جاتی کہ مغرب کے اکثر رہنما موٹروں میں سفر کرتے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں کی طرح "پد یاترا" نہیں کرتے۔ سر ونسٹن چرچل کے نقش قدم بھی اگر آپ ڈھونڈنا چاہیں تو یہ نقش قدم ان کے گھر اور ان کے دفتر نمبر 10، ڈاؤننگ اسٹریٹ کے آس پاس ہی مل سکتے ہیں۔ ان پر کوئی چلے تو آخر کب تک چلے اور کہاں تک چلے۔ خوب یاد آیا کہ اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار آنجہانی کرشن چندر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہمیشہ ٹیکسیوں میں سفر کرتے تھے۔ بہت پاس میں بھی کہیں جانا ہوتا تو فوراً فون کرکے ٹیکسی منگوا لیتے تھے۔ سنا ہے کہ ایک بار انھوں نے اپنے بیڈ روم سے باتھ روم تک جانے کا ارادہ کیا تو بے خیالی میں فوراً ٹیکسی منگوالی۔ کرشن چندر ہمارے محبوب افسانہ نگار تو تھے ہی ہمارے کرم فرما بھی تھے۔ ہم ان کے نقش قدم پر چلنا تو چاہتے ہیں لیکن ہمیں یہ نقش قدم کیسے ملیں گے۔

بات دراصل یہ ہے کہ نقش قدم کا تصور پرانے زمانہ کے ان اچھے رہنماؤں کی دین ہے جو جب چلتے تھے تو ان کے پیچھے عوام بھی چلتے تھے۔ ایسے رہنماؤں پر کبھی رہزنوں کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ عوام ان کی رہنمائی میں چپ چاپ چلتے ہی چلے جاتے تھے، اور اکثر صورتوں میں منزل پر بھی پہونچ جاتے تھے۔ پرانے زمانے کے رہنما صحیح قیادت کرتے تھے۔ اس لیے لوگوں کو ان کے نقش قدم کی ضرورت بھی پیش آتی تھی۔ جب کہ آج کا رہنما اپنا کوئی نقش قدم چھوڑنا نہیں چاہتا اسے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ عوام اس کے نقش قدم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کہیں خود اس تک نہ پہنچ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام آج کے رہنما کے پیچھے چلتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ رہنما کی قیادت میں چل نہیں رہے ہیں بلکہ رہنما کا تعاقب کررہے ہیں۔ کسی کا تعاقب کرنا اور کسی کی قیادت میں پیچھے چلنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ آپ نے اس لیڈی اسٹینوگرافر کا قصہ تو سنا ہوگا جو ایک دن دیر سے دفتر آئی تو اس کے عہدیدار نے دیر سے دفتر آنے کا سبب پوچھا۔ اس پر لڑکی نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا "سر! میں دیر سے دفتر آنے پر مجبور ہوگئی تھی کیوں کہ آج جو نوجوان میرا تعاقب کررہا تھا وہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔ نتیجہ میں مجھے بھی آہستہ چلنا پڑا۔" دیکھا جائے تو قیادت کا یہ ایک نیا زاویہ ہے۔ ماضی میں بھی اکثر یہ ہوتا تھا کہ قوم بہت زیادہ نکمی اور ناکارہ ہوتی تھی تو رہنما کو قدم قدم پر رک جانا پڑتا تھا اور قوم کو للکارنا پڑتا تھا تب کہیں قوم رہنما کے پیچھے چل پڑتی تھی۔ جب کہ آج کا رہنما قوم کے انتظار میں رکنے کو ضروری نہیں جانتا۔ وہ تو دو چار برس کے اندر ہی

اپنی "رہنمائی" کے جوہر دکھا کر اچانک غائب ہو جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ بعد میں اسے بعض اوقات عدالتوں کے چکر ضرور لگانے پڑتے ہیں اور اکثر صورتوں میں وہ "رہنمائی" سے باعزت بری بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے رہنما کے اگر نقش قدم ہوتے بھی ہیں تو وہ انھیں زمین پر نہیں چھوڑتا۔ پرانے زمانے کے رہنماؤں کے نقش قدم ضرور ہوتے تھے لیکن آج کسی کو ایسے نقش قدم کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے ایسے رہنماؤں کو سال میں دو ایک مرتبہ یاد کر لیتے ہیں اور ان کے کام کے لیے اس دن سرکاری چھٹی بھی دی جاتی ہے۔ پھر بھی لوگ انہیں یاد کرنے کی بجائے "پکنک" منانے کو ضروری گردانتے ہیں۔

آخر میں نوجوان مراسلہ نگار سے ہماری عرض یہ ہے کہ وہ رہنماؤں کے نقش قدم پر چلنے کے چکر میں نہ پڑے وہ جو ان نقش قدم کو چھوڑ کر مغربی ملکوں میں چلا گیا تھا تو اب سے انکی فکر کیوں لاحق ہو رہی ہے اگر کسی وجہ سے اسے یہ خوش فہمی یا غلط فہمی ہے کہ ہماری نوجوان نسل اپنے رہنماؤں کے نقش قدم پر چل رہی ہے تو وہ اسے دور کرے۔ اس ملک میں اب کون کدھر کو جا رہا ہے اس کا اندازہ نہ رہنما کو ہے اور نہ ہی عوام کو ہے۔ نہ پرانی نسل کو ہے اور نہ نئی نسل کو۔

ڈاکٹر سید عباس متقی
(حیدرآباد)

لو ـــ اب ہم بھی کروڑپتی ہیں!

دولت مندوں کی لسٹ میں جب سے ہمارا نام آگیا ہے، ہم مجبور، بے کس، مظلوم اور احمق لوگوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں۔ جب تک ہم غربت و افلاس کا شکار رہے، رئیسوں، امیروں اور دولت مندوں کو دیکھ کر رشک کرتے تھے۔ لیکن جب سے خود امیر ہو گئے ہیں۔ غریبوں کو دیکھ کر رشک کرنے لگے ہیں۔ شاید رشک کرنا ابن آدم کی گھٹی میں پڑا ہے کہ وہ کبھی رشک و حسد کا دامن چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ ہم تو پھر بھی بہت شریف امیر ہیں کہ ہمیں غریبوں کو دیکھ کر رشک آرہا ہے بعض امیر تو اتنے شریف بلکہ ذات شریف ہوتے ہیں کہ انھیں اپنے سے زیادہ امیروں پر رشک آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غربت اور امارت کا یہ چکر تا دم نفخ صور چلتا ہی رہے گا۔ کوئی سوچ بھی سکتا تھا کہ ہم بے ایں ہمہ سیادت و تغافل والکسی راتوں رات امیر کبیر ہو جائیں گے کوٹھی، بنگلہ، کار، نوکر، چاکر، سونا چاندی، ہیرے جواہرات اچانک دستیاب ہو جائے گا۔ حالانکہ نہ ہم نے ملک کی سیاست میں قدم رکھا تھا نہ مذہبی قیادت میں۔ لیکن اب اسے کیا کیا جائے کہ "چچا" مر گئے ـــ ہمارے چچا کیا مرے کہ لوگوں کی "نانی" مرنے لگی کہ چچا مرحوم کی دولت خود مشتبہ تھی لیکن وراثت میں آئی ہوئی یکمشت کروڑہا کی دولت کو ہم ٹھکرا بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ویسے ہم کون بایزید تھے جو تقوی کی آخری منزل پر گامزن نظر آتے۔ دس بارہ کروڑ کی دولت کچھ کم نہیں ہوتی اور اس موروثی دولت کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے پیسہ پانی کی طرح بہا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔ قانونی جنگ میں تو آدمی دنگ رہتا ہے۔ ہم نے جو تھا پھونک دیا۔ دولت کے لیے فقیر ہو گئے لیکن حق حاصل کر کے ہی دم لیا۔ چچا کی دولت کوئی اردو کی لکچرر شپ نہیں تھی جو سازش سے روکی جاتی۔ نہ یہ مقدمہ رشوت خور ججوں کے سامنے ہی پیش ہوا تھا۔ حق بہ حقدار نصیب کے بقول آخر ش ہم کروڑپتی ہو ہی گئے۔

دولت اپنے ساتھ ہمہ اقسام کی الجھنیں لاتی ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب مرحوم کی چھوڑی ہوئی دولت نے ہمارے چھکے چھڑا دیئے۔ حق کو پانے کے لیے ناحق تکالیف جھیلنی پڑیں۔ لیکن ان مع العسر یسرا ورد زبان رہا۔

مشیروں نے لوٹا، وکیلوں نے ٹھگا۔ قانون نے سہارا دیا اپنوں نے ہمت دلائی۔ بہی خواہوں کے سامنے بدخواہوں کی ایک نہ چلی۔ لوگ جب جوق در جوق ہمیں مفت کی دولت ہاتھ آنے پر مبارکباد دینے چلے آئے۔ گل پوشیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم نے خود کو پسینے میں کم اور شرم و حیا کے دریا میں زیادہ غرق پایا۔ مبارکباد دینے والے گلے میں پھول کا ہار ڈال کر دل میں چنگاریاں بھرنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جتنی چنگاریاں ہم نے عوام کے ذریعے عوام کے لیے عوام پر برسائی تھیں وہ جوابا وصول ہو رہی ہیں۔ پتہ نہیں لوگوں کو کسی آدمی کا امیر کبیر بن پانا ناپسند کیوں ہوتا ہے۔ حالانکہ ہر آدمی امیر کبیر بن جانے کی آرزو رکھتا ہے لوگ بظاہر مبارکباد دیتے تھے مگر دل میں خار کھاتے تھے۔ ان کی عین تمنا تھی کہ ہم ہمیشہ کی طرح غربت و افلاس کا شکار رہیں۔ مدام محتاج زندگی بسر کریں تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔ مگر یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ خدا جب دینے کا ارادہ کر لیتا ہے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں۔ اور جب خدا کسی کو محروم کرنا چاہے کوئی اسے دینے والا نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہم کون ایسے جفاکش اور زیرک تھے جو اتنی دولت امڈ آگئی۔ ہمیں اس بچکانہ خیال پر تبسم آگیا۔ اگر کشادگی رزق کا باعث عقلمندی ہی ہوتی تو بے وقوف ناقوں سے مر جاتے اور ہر محنتی ہی کو دولت میسر آتی تو کاہلوں کو لوٹ ہاتھ میسر نہ آتا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا قطعی نہیں۔ وزیروں کی دانائی رکھنے والے فاقے کرتے ہیں اور احمق لوگ لوٹ گنتے نظر آتے ہیں۔ مقدرات اٹل ہیں۔ ان پر ایمان لائے بغیر کوئی ذی روح جنت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ غرض ہمیں مبارکباد دینے والوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا ان میں وہ لوگ بھی تھے جو کسی نہ کسی غرض سے بندھے ہوئے تھے۔ بعض وقت غرض مند آدمی خواہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو گدھے کو باپ کہنے گریز نہیں کرتا۔ مبارکباد دینے والوں میں کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس میں حیرت و حیف کی دھندلاہٹیں نہ ہوں۔ آنکھیں بھی عجیب ہوتی ہیں دل کے راز کو اگلنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ محبت۔ نفرت۔ حیرت، غم، غصہ، ہوس، حیرانی، لالچ، حسد، آمادگی ناراضگی۔ کون سا جذبہ ہے جو کم بخت ان آنکھوں سے وا نہیں ہوتا۔ آنکھ وہ شفاف پانی کا گھر ہے جس میں لگی قرینے کی چیزیں ہی نظر نہیں آتیں بے ترتیب اشیاء بھی نظر آجاتی ہیں۔ اسی لیے لوگ محض ان آنکھوں پر تنک دے کر چلے آتے ہیں۔ جب آنکھوں ہی سے وحشت برسے تو دل میں کون اترنے کی ہمت کرے البتہ بعض جھیل سی آنکھوں کی گہرائیاں ڈوب جانے کی دعوت دیتی ہیں اور جو ان آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے ساحل اسی کا مقدر ہوتا ہے۔ لوگوں کی نوک زبان پر ہدیہ تبریک ضرور تھا لیکن طنز کے نشتر بھی مخفی تھے۔ کچھ کچھ سچتے کچھ تمتماتے اور نکلتے تھے۔ حدیث میں آیا ہے کہ العین حق۔ نظر کا لگ جانا برحق ہے اور ہم بری نظر سے بہت ڈرتے ہیں یہ نظر تو تقویٰ و طہارت کو بھی لگ جاتی ہے چنانچہ ہم نے لوگوں کو دیکھنے کی عادت ڈالنے کے لیے ایک "کھٹارہ" رہن کھٹارا فیٹ کار خرید لی تاکہ لوگ ہمیں "موٹر نشین" دیکھنے کی بسم اللہ کریں اور انھیں کوئی "خاص زحمت" نہ ہو۔ اگر ہم پہلے ہی "اسٹیم" خرید لیں تو پتہ نہیں کتنوں کے سینوں سے "دھواں" اٹھنے لگے۔ لیکن حیرت ہے کہ ہمیں اس معمولی "فیٹ" پر بھی لوگوں نے برداشت نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے ہمیں پرانی اٹلس سیکل پر یکہ و تنہا کار چلاتا ہوا کیوں کر برداشت کرسکتے تھے کسی محلہ کے بھی افراد اعلیٰ ظرف ہوں یہ ضروری بھی نہیں جب کہ کم ظرفی سے مبرا نفوس مطہرہ کا فقدان ہے لوگوں میں چہ گوئیاں ہونے لگیں۔ ظاہر ہے کہ غربت کے بعد اچانک امارت کے ساتھ ہی دو گروہ میں چہ میگوئیاں ہو سکتی تھیں ایک پڑوسی دوسرے قرابت دار۔ تیسرا گروہ جاننا بھی تو اسے نہ ہماری غربت سے سروکار تھا نہ امارت سے۔ انھیں نہ ہم سے حسد پیدا ہوتا ہے نہ عداوت۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ کسی نے کہا مولوی صاحب نے کہیں زبردست ہاتھ

مارا ہے۔ کسی نے کہا خطیب صاحب نے چلہ کشی کر کے اجنا کو قبضے میں کر لیا ہے کوئی بول اٹھا یہ ان کی تیسری شریک حیات
کا مال ہے۔ ہم عمر، ہم پیشہ وہم رتبہ انسانوں نے اپنی انسانیت کا ثبوت فراہم کیا۔ علماء کرام بھی جنھوں نے ولا تجسس
کی تعلیم دی تھی کھوجی پائے گئے۔ سوال تحملہ وغیر متحملہ سے الگ ناطقہ تنگ کیا۔ دولت بھی عجیب شئے ہوتی ہے دوستوں
کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بنا دیتی ہے۔ وہ احباب جن کے ہاں ہم نہایت محبت اور خلوص سے جایا کرتے تھے وہ
نہایت پابندی و باقاعدگی سے ہمارے دور دراز مقام تک معہ اپنے اہل و عیال کے آنے لگے۔ جن کی بیویاں ہماری بیویوں
سے علاقہ رکھنے کو عیب سمجھتی تھیں سہیلیاں بن گئیں جو حضرات ہمارے گھر ہماری غربت کا تماشہ دیکھنے اور دلاسہ
دینے کا لطف حاصل کرنے آیا کرتے تھے کنارا کر گئے۔ بعض احباب تو ہمیں "ڈراگن" معلوم ہونے لگے۔ ان کی آنکھوں
سے ناک سے منہ سے شعلے برآمد ہوئے آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں۔

ہم قبلہ رو ہو کر دعا کرتے "اللھم اجعلنی محسوراً ولا حاسداً" ــــ ہم نے موٹر کیا خرید لیا کہ لوگوں کا
موڈ آف ہو گیا ان کے آپسی اشاروں اور کنایوں سے الگ ہمارا موڈ آف ہوتا رہا۔ مقولہ یاد آ گیا دنیا نہ کھاتے
پیتے کو دیکھ سکتی ہے نہ بھوکے کو دے سکتی ہے کیا مجال جو فراغت سے کار چلاتے۔ لوگ راستہ ہی نہ دیتے۔ ہارن مار
مار کے تھک جاتے اور کار ہی میں بیٹھے بیٹھے سر پیٹنے لگتے۔ عاجزی کرتے گھوڑ دبھائی۔ ذرا رکشہ ٹہالیں تو غریب کی کار نکل
جائے مگر یہ کار گھوڑ دبھائی ہیں کہ جب تک بیٹری ختم نہ کر لیں اٹھیں گے نہیں اور یہاں پٹرول اور دل دونوں جل رہے ہیں۔
بچے (جو شریر ہوتے ہیں) ہماری موٹر کے آگے آگے سیکل چلاتے۔ ان کے خیال میں ہم "پا پیادہ" ہیں۔ شریر بچوں کے منہ
کون لگے جب کہ ان کے منہ میں گالیاں ہوں۔ تنگ راستے، تنگ دل، تنگ ذہن آخر ش بیزار ہو کر ہم نے اپنی
فیٹ کار اپنے ایک قرابت دار کو تحفۃً گزران کر (جنھوں نے اپنی امیری کی زمانے میں ہمیں پرانی سیکل مستعار عنایت
فرمائی تھی) ٹاٹا سومو خرید لی۔ سفید بے داغ کاریں بھی نہایت مطہر اور نازک ہوتی ہے۔ نبی اللہ ہوتے ہی فقیروں
نے آ گھیرا۔ اور گاڑی کے قریب ہو ہو کر بھیک مانگنے لگے۔ کیا یہ بدتہذیب لوگ دور کھڑے رہ کر بھیک نہیں مانگ سکتے۔
کاش ہم انھیں بھیک مانگنا سکھا سکتے، ڈرتے ہیں کہیں لوگ ہمیں اس فن کا استاد نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس خوف سے کہ
بھکاریوں کے کشکول کار کی باڈی سے جبراً بوس و کنار نہ کر لیں ہم خود کار سے اتر کر فقیروں میں شامل ہو گئے۔ اچھا بھی لگا
بہت دنوں بعد تسکین روحانی کا سامان چھپا ہوا گاڑیاں۔ بیویاں اور قلمیں اس کے متقاضی ہوتی ہیں کہ انھیں لمس نگاہ سے
بھی مخفی رکھا جائے لیکن امیروں کی سنتا کون ہے نادیدہ نگاہوں کے شعلے کار کا بدن جھلس رہے تھے۔ آخر ش ہم نے فی کس
دس روپیے کے حساب سے ان کے امیر کو سو کا ایک کرارہ نوٹ دے دیا اور اس نے اسے حقارت سے ایسے پھینک دیا گویا
ہم نے "ایکس گریشیا" دی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اس نوٹ کے فگر میں ایک نقطہ اور لگنا چاہیئے اور ہم اس کی "نقطہ نوازی"
پر سر پیٹ کر رہ گئے۔ شدید غصہ آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی کوئی کان میں پھونک رہا تھا "واما السائل فلا تنھر"
صبر کے کڑوے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ امیروں کو کہاں کہاں صبر کرنا پڑتا ہے غریبوں کو یہ کیا معلوم۔ غریب سمجھتے ہیں کہ امیر
مغرور ہیں کسی کو منہ نہیں لگاتے انھیں کیا معلوم کہ بعض وقت یہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ امیرانہ چمک دمک کے
پیچھے کتنی بھیانک تاریکیاں ہوتی ہیں وہ تعصب کا چشمہ لگانے والے فقیروں کو کیا معلوم۔ غریب آدمی غصہ میں آتا ہے تو
دوسروں کو گالی دیتا ہے امیر آدمی کو غصہ آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو گالی دے لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے "امیر کا غصہ امیر کے

دامن میں"

ہمارے امیر ہوتے ہی پاس پڑوس والوں نے ہزاروں کا قرض مانگ لیا اور ہم نے ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے انھیں بروقت و بادلِ ناخواستہ قرضِ حسنہ دیا لیکن جب وصول کرنے پہنچے تو لوگوں نے ہنس کر ٹال دیا گویا ہم نے "قرضِ حسنہ" نہیں "قرض ہنسنا" دیا ہو۔ شہر بھر میں جتنے تعلیمی ادارے، انجمنیں اور کمیٹیاں تھیں ان کے نمائندوں نے غربت کدہ پر (آج ہم یہ محاورتاً استعمال کر رہے ہیں) ہلہ بول دیا۔ یا تو کوئی لوگ عموماً کامیاب رہتے ہیں۔ لوگ زیچ آکر ان کی مراد پوری کر دیتے ہیں اور خود کو دلدلِ گفتار سے نجات دلا لیتے ہیں۔ جب وہ اپنے ادارے کی کارکردگی سنانے بیٹھتے ہیں تو مانو دل بیٹھ جاتا ہے دل سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے مگر یہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ لوگ چیک بک پر خواہ کتنے ہی فیگر کیوں نہ لکھیں ان کے اخلاق و کردار کے چیک پر صفر ہی لکھا ہوتا ہے آدمی آج اپنی قوم کے بے اخلاق کردار اور پاس و لحاظ کی کتنی نچلی سطح پر اُتر رہا ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب علما کو اپنے عقیدے کے خلاف عقیدہ اغیار پر نہ صرف کاربند دیکھتے ہیں بلکہ یہ چاپلوسی ڈو غلاپن نہ خدا کو پسند ہے نہ خدا کے بندوں کو۔ ہم تو یک جہتی کے قائل ہیں نہ مفلسی دیکھ کر ایمان دیتے ہیں نہ دولت دیکھ کر کلمہ پڑھتے ہیں۔ غرض مولوی لوگ دنیا اور آخرت کی بشارتیں سُنا سُنا کر ہمیں لوٹ لیتے۔ ہماری مرضی کے بغیر آپ ہی اپنی رسید پر ہزاروں کی رقم لکھ لیتے اور سینکڑوں کی ممبر شپ پر ہمیں لٹکا دیتے۔ بعض تو ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کے اداروں میں ہم نے اجرتاً کام کیا تھا اور انھیں ماجور سے زیادہ مغرور پایا تھا۔ انسان کی حقیقی تعریف یا بیوی کر سکتی ہے یا ماتحت یہ دونوں حضرات، حضرات بے بدل ہوتے ہیں۔ یہ گھر کے بھیدی ہوتے ہیں لنکا ہی نہیں ہندوستان ڈھا دیتے ہیں۔ اس دور میں ہم غربت کا شکار اور یہ ہمارے شکاری تھے۔ کچھ دے کر بہت کچھ کر لیتے تھے! انھیں یہاں کے قانون کی پرواہ تھی نہ وہاں کے۔ خون چوس کر دولت کی اُلٹیاں کر رہے تھے۔ ہاتھ پتھر کے نیچے ہو تو آدمی محض بلبلانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے اور ہمارا بلبلانا ان کے لیے میاں کول راگ سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ قرار پاتا۔ وہ سونے سے کھیلتے اور ہم فاقے جھیلتے آج عہدِ امارت میں غربت کا ماضی شدید یاد آ رہا تھا صبر کی طرح کا ہوتا ہے ایک صبر یہ بھی ہے کہ آدمی اپنی امیری میں غریبی کے مظالم نظر انداز کر دے۔ مولانا دبرچیا آبادی جنھوں نے ہمارے گھر آنے کو اپنی ذلت و رسوائی کے مترادف سمجھتے ہوئے ہمارے عقدِ ثانی و عقدِ ثالث میں شرکت سے گریز کیا تھا ہمارے عقدِ رابع کے متمنی تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ ہمارے عقد پر ایک رنگین سہرا پڑھیں گے اور اپنے "ہینگنگ گارڈن" میں استقبالیہ دیں گے۔ اور ہم ان کے طمطراق پر ماتم کرتے اور یہ مصرع گنگنا اُٹھتے۔ ع بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ مولوی اخلاص جنھوں نے ہمیں کبھی ایک وقت کی روٹی کو نہ پوچھا تھا۔ بار بار اپنی فیکٹری میں ساجھے سے متعلق پوچھ رہے تھے۔ علامہ بے شک حیدر آبادی اپنا فارم ہمیں فروخت کرنا چاہتے تھے جہاں کی پُر تکلف دعوتوں میں کبھی ہمیں شریک ہونا نصیب نہ ہوا تھا۔ قیمت انھوں نے طے کر لی تھی اور ہم نے اس پر صاد بھی کر دیا تھا! عالی ظرفیوں میں سے ایک اعلیٰ ظرفی یہ بھی ہے کہ خلوص میں قیمت کو اہمیت نہ دی جائے۔ اب ہماری عین تمنا تھی کہ اس فارم میں ایک دعوت کریں جس میں امیروں کے ساتھ غریبوں کو بھی مدعو کریں تاکہ امیروں کے قصائد کے ساتھ غریبوں کی دُعائیں بھی نصیب ہوں۔

جب سے ہم رئیس ہو گئے ہیں مسجدوں کی صدارت ملنے لگی ہے۔ اجتماعی شادیوں میں ہمیں مہمانِ خصوصی

بنایا جارہا ہے ۔کئی کلبوں کے اعزازی صدر نشین اور کئی انجمنوں کے اعزازی سرپرست ہیں۔ شعراء و ادبا ہمارے ہاتھوں اپنی کتاب کی رسم اجراء کروانے لگے ہیں۔ اب ہماری رائے کو حطمی قرار دیتے ہیں۔ ناقد ہماری تنقید کو خوش دلی سے برداشت کرتے ہیں سرکاری افطار پارٹیوں میں اب ہمیں دانشوروں۔ عالموں ۔سیاست دانوں مذہبی دہشت گردوں اور غنڈوں کے ساتھ بلایا جانے لگا ہے ہم نے ایک افطار پارٹی ہی میں "ریوالور" کے حصول کا مسئلہ حل کرلیا ہے۔ وہ خواتین جنھوں نے ہمارے ارادوں کو محض ہماری غربت و افلاس کے طفیل اپنی اونچی ہیل کی سینڈلوں تلے پامال کردیا تھا۔ اور ہماری پُر اخلاص محبتوں کو ٹھکرا دیا تھا سراپا ندامت لگ رہی ہیں اب وہ ہمارے عقدِ نکاح میں آنے کو باعثِ اعزاز و وجہ مسرت خیال کر رہی ہیں انھیں کیا معلوم کہ اب ہم ماڈلس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے فلمی ستاروں کو دیکھ رہے ہیں اقبال نے کیا خوب کہا تھا۔ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، فلمی ستارے مدام شہرت کے پیچھے دوڑتے ہیں یا دولت کے پیچھے ۔ اور اگر کبھی دولت شہرت کو خریدے تو یہ دولت کے خریدار بن جاتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کے شوہر کی مزید کتنی بیویاں ہیں انھیں صرف اس سے غرض ہوتی ہے کہ کتنے بینکوں میں زبردست کھاتے ہیں۔ محبت کے سودے چونکہ دولت کے پرچم تلے طے ہوتے ہیں اس لیے ناپائیداری ان کا مقدر ہوتی ہے ۔اب ہم کوئی ایسے گبرو جوان ہیں جو چونچلوں کی پرواہ نہ کریں۔ ادھیڑپن ہی کو تو ان کے شباب سے بجرہ ور کرنا ہے ۔ زندگی خود مختصر ہے اور بہت مختصر رہ گئی ہے رہے نام اللہ کا۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے حکیموں نے الگ ہم پر جوانی کا بھوت چڑھا کر ضعیفی کے تقدس کو پامال کرنے کی ٹھان رکھی ہے ۔ ہم اس بات سے خوب واقف ہیں کہ اگر ہم ضعیف ہی رہنے کو ترجیح دیں تو کئی جوان جوانی میں ضعیف ہونے سے محفوظ رہیں۔ حکیموں کے بل دیکھ دیکھ کر ماتھے پر بَل پڑ گئے ہیں لیکن دل ہے کہ بلیوں اچھلنے سے گریز نہیں کرتا۔ نفس ہے کہ اسے ٹھگے جانے کی کوئی پرواہ نہیں ۔

کئی ڈائرکٹرس ہم سے فلمیں بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں ہمارے اشارے کو دیکھتے ہوئے وہ ہمیں ہی ہیرو بنانا چاہتے ہیں۔ قدو قامت ، آنکھ ناک، انداز و تیور، لہجہ و ادا کی تعریف کیئے بغیر نہیں رہتے ۔ان کا خیال ہے کہ ہالی ووڈ کی طرح بالی ووڈ میں بھی ہیروؤں کو بالغ نظر، ایکٹیو اور قدرے ادھیڑ ہونا چاہیئے۔ لونڈے لپاڈوں نے لڑکوں میں ہوائے چھچھورے پن کے سوا کیا ہے ہمارے اندر جو وضع داری اور بانکپن ہے وہ فلمی دنیا کے لیے ایک تحفے سے کم نہیں ـــ ہم سوچ رہے ہیں کہ کسی ہیروئن سے تعلق بڑھائیں گے تعلق خاطر پیدا کریں گے اور ہر بڑے اور عظیم فن کار کی طرح چپکے سے کورٹ میں میرج کرلیں گے ۔ اب ہم کوئی کھلاڑی تو ہیں نہیں کہ دوسری کو پانے کے لیے پہلی سے ہاتھ دھولیں اور نہ کوئی اداکار ہیں کہ پہلی کے لیے دوسری سے ہاتھ دھولیں ۔ ہم ایک شریف رئیس آدمی ہیں ہم اسے ڈرتے ہیں خدا کے بندوں سے نہیں ۔

چچا مرحوم کی دولت نے ہمارے دوستوں، قرابت داروں اور پڑوسیوں کو ہمارا دشمن بنادیا۔اب یہی لیجیۓ۔ چھوٹے بیٹے نے اپنے بنگلے کی تعمیر کے وقت ہمارے گھر کے سامنے تعمیر کا کل سامان رکھ چھوڑا تھا جس کے سبب ہمیں اپنی سیکل دفتر ہی پر چھوڑ آنی پڑتی تھی۔ قدم قدم پر مشورہ لیا کرتے تھے کہ بیت الخلاء میں آئینے لگوائے جائیں یا نہیں اور ہم نے دل کھول کر مشورہ دیا تھا کہ اگر بیت الخلاء میں آئینے نہ ہوں تو بیت الخلاء کا حسن غارت ہوجاتا ہے ۔اور آج جب

ہم نے لعل خاں اور سالونی بیگم سے سہ گنی قیمت دے کر ان کے مکانات خرید لئے ہیں اور انھیں تڑوا کر نئی کوٹھی تعمیر کروانا چاہتے ہیں تو چنو سیٹھ نے سونٹھ کی ناس لے رکھی ہے۔ اسے اس پر سخت اعتراض ہے کہ ہماری کوٹھی اس کے بنگلے سے اونچی ہو جائے گی تو "علانظری" ہوگی۔ جیسے ہم نے کبھی بڑی آپا کو نہیں دیکھا ہے اور پھر پچپن سالہ خاتون سے ہمیں کیا مطلب یہ بچپن کی باتیں لگتی ہیں۔ ہر کوئی بچے تو نہیں کہ عمر رسیدہ خاتون میں دلچسپی لیں۔ چنو کا مطلب صرف اس قدر تھا کہ ہم کوٹھی تعمیر نہ کروائیں لیکن ہمیں پولیس تاکے کی نوبت نہیں آئی مختار دادا نے نذرانہ قبول کر لیا تو اب کوئی مائی کا لعل تھا جو کوٹھی کی تعمیر میں اڑچن ڈالتا۔ البتہ محکمہ بلدیہ نے جو قانونی ہاتھ دکھائے ان کا ذکر فضول ہے۔

ہم یہ بات آج تک نہ سمجھ سکے کہ آخر یہ دولت آتے ہی نیند کیوں چلی جاتی ہے۔ شاید نیند کوئی عشق کی رشتہ دار ہے۔ غریبوں کو عاشقی میں نیند نہیں آتی اور امیروں کو دولت مندی میں۔ ہم غربت کے زمانے میں تان کر سویا کرتے تھے اور اب کھینچ تان کر سوتے ہیں۔ بیگم کے لاکھ اٹھانے کے باوجود سحری کو نہ اٹھنے تھے اور بن سحری ہی روزہ رکھ لیا کرتے تھے اور آج اُلو کی طرح راتوں کو دن بنائے بیٹھے ہیں۔ ملشیوں کی لوٹ، بازار کا بھاؤ اور ٹیکسوں کی فکر نے ہمیں کہیں کا رہنے نہ دیا ہے۔ اور تو اور دولت مند بننے کے بعد ہم سے دستر فرش سے اٹھے تو کرسیوں پر آدھمکے اور دستر کا مزہ دستر سے اٹھا تو پھر دکھائی ہی نہیں دیا۔ پتہ نہیں یہ آہ دل تھا، بوئے گل تھا یا دود چراغ محفل تھا۔ جو اس بزم غریباں سے پریشاں نکلا تو آج تک ترسا رہا ہے۔ نہ ریفریجریٹر میں تازگی کا لطف ہے نہ گیاس کے پکوان میں لکڑیوں کے پکوان کا لطف بلوریں برتنوں میں سیاہ ہانڈیوں کا مزہ کہاں آہ کیا مزے دار تھے وہ غربت کے دن۔ اب ہم سوپ پیتے ہیں مرغ و ماہی کھاتے ہیں لیکن قیمہ کھچڑی کو ترس رہے ہیں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ڈنر کرتے ہیں مگر احباب کے ساتھ دال روٹی کا مزہ کہاں۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ امارت میں آگ لگا کر غریبوں میں گھر پڑیں مگر شاید امیری وہ سیڑھی ہے جس پر کوئی ایک دفعہ چڑھ جاتا ہے تو اترتا نہیں بلکہ اتر سکتا نہیں۔ چند ہی دنوں میں ہمیں "ٹاٹا سوہو" کے طفیل اپنے محلہ کو ٹاٹا کہنا پڑا۔ جہاں بیسیوں میتوں میں شرکت کی تھی تو بیسیوں کا بیسواں اور چہلم کا کھانا کھا کر الحمد للہ کہا تھا اور سوچتے تھے کہ ہمیں دلیموں میں بلایا تو جاتا نہیں چہلم ہی ہوا کرے۔ امیروں کے محلوں میں قبرستانوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ کئی ایکڑ کی قبریں ہیں یہ ہندوستان کے اہرام ہیں۔ ہر طرف خاموشی۔ انکم ٹیکس آفیسروں لیڈروں اور نکسلائٹس کے علاوہ کسی کو کسی کا غم نہیں۔ فقیروں کی صدائیں کانوں میں رس گھولتی ہیں نہ مسکینوں کی دعائیں سکون بخشتی ہیں۔ آواز دو تو آدمی کی آواز نہیں آتی کتے بھونکتے ہیں احباب بھی ایک دوسرے سے اپائنٹمنٹ لیتے ہیں ہم نے بھی دو عدد "سنتری" رکھ چھوڑے ہیں۔ ایک سکریٹری محض اس لیے ہے کہ ہمیں ہوا کا رُخ بتاتا رہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے ہمیں لیس کرتا ہے ہم اپنے تمام معاملات دوسرے دولت مندوں کی طرح کلبوں میں طے کر لیتے ہیں۔ عموماً آدمی کلب میں موڈ میں رہتا ہے۔ اور موڈ ہو تو سمرقند و بخارا بخش دیئے جاتے ہیں۔ یہاں سب کو اپنی امارت پہ ناز ہوتا ہے کسی کو غربت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ دولت ہارتے ہیں لیکن ان کی دولت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دولت مند بن جانے کے بعد ایک غم ہے کہ یہ ڈھیر ساری دولت رہ جائے گی ہم رخصت ہو جائیں گے۔ لوگ ہمیں رئیس الدہ سا کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ہم دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ گویا واقعی ہم کروڑ پتی ہیں۔ یا محض پتی ہیں۔ ▲

ڈاکٹر حبیب ضیاء

اِک سوال میں کروں

ایک کہاوت ہے، نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایماں۔ یہ مخلوق دنیا کے ہر گوشے میں پائی جاتی ہے۔ اب [illegible] روزگار نے عام انسان سے جینے کا حق پوری طرح چھین لیا ہے اس مخلوق کا دھندا زوروں پر ہے۔ نیم حکیم لوگوں کی زندگیوں سے کھلواڑ کر رہے ہیں اور نیم ملانیاں جاہل خواتین کو اپنے گھیرے میں لیتے ہوئے ان کو دعا تعویذ [illegible] کر ان کی پریشانیوں میں اضافہ کر رہی ہیں ذکر بیماری کا ہو یا مالی پریشانی کا، وہ بہت ہی اطمینان سے کچھ بیویوں کی نشاندہی کر دیتی ہیں۔ لگانو نہ بجھائی تو لنکا کے مصداق ایک موٹی عورت اور دبلے آدمی کا ذکر کر دیتی ہیں، جنھوں نے جادو کر دیا ہے اور ایسا جوڑا ہر خاندان میں آسانی سے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ خواتین چوں کہ پکاتے پکاتے اچھا خاصا کھا لیتی ہیں اس لیے عموماً جوڑے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ موٹی عورت، دُبلا آدمی۔ بیماری تو اپنی جگہ برقرار رہتی ہے نازک رشتے البتہ دم توڑ دیتے ہیں۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ موت برحق ہے اس کا وقت معین ہے۔ یہ سانحہ سارے ماحول کو سوگوار کرتا ہے ایسے موقع پر بھی پیسہ بٹورنے والے کچھ نہ کچھ طریقے اپنا لیتے ہیں۔ ایک خاتون غسال کو ہم نے دیکھا، جنازہ کے قریب سرمہ دانی لے کر کھڑی، سب سے کہہ رہی تھی۔ دیدار کرو، سرمہ لگاؤ۔ پھر آہستہ سے کہتی "اُجالا رکھو"۔ بعض خواتین دس بیس روپے رکھتی جا رہی تھیں ہم نے دل ہی دل میں کہا جس گھر میں ایک فرد کے چلے جانے سے اندھیرا ہی اندھیرا ہے وہاں اُجالے کی بات کیسے کر رہی ہے۔ ایسے مواقع پر قرب و جوار میں رہنے والی بعض خواتین بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ ایک گھر میں ایک مرحومہ نہا دھو کر تیار تھیں، ایک صاحبہ جنھیں فیملی فرینڈ ہونے کا دعویٰ تھا، انھیں اور ان کے سرہانے کھڑی ہو کر تحکمانہ انداز میں کہنے لگیں "آیئے۔ جس جس کو دیدار کرنا ہو کر لیجیے"۔ غلطی سے ہمیں مرحومہ کی بہو سمجھ کر کہا، آیئے۔ معافی مانگ لیجیے۔ ہم نے فوری کہہ دیا "پہلے ان سے کہیے کہ معافی مانگیں"۔ اس خیال سے کہ کہیں ہماری زبان کی تاثیر سے واقعی مردہ معافی مانگنے نہ اُٹھ بیٹھے کئی خواتین آہستہ سے کھسک گئیں۔

ان موضوعات سے ہٹ کر آج کے معاشرے میں کئی دوسرے اہم مسائل حل طلب ہیں نگاہ، پردہ، محرم، ستر یہ ایسے الفاظ ہیں جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے خواتین کی مختلف تنظیمیں ان موضوعات پر کھل کر مباحث کا اہتمام کر رہی ہیں۔ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ خواتین کے ساتھ ساتھ حضرات کے لیے بھی پابندی ہے کہ نظروں کا غلط

جگہ جگہ گلدان، سنابیک، پنکھے، بنیر لیمپ ... مگر نہیں نوادرات آیا ہے ... یاد ... میں آگئی، ایک صاحبہ جنھیں نہ صرف ہم بہت قریب سے جانتے ہیں بلکہ ان کی رگ رگ سے واقف ہونے کا اعزاز بھی رکھتے ہیں ان کے گھر ہفتہ میں ایک بار محفل درس کا انعقاد ہوتا ہے جس میں مختلف مسائل نمٹائے جاتے ہیں۔ اصلاح معاشرہ پر گفتگو ہوتی ہے اللہ رسول کی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ زنانی محفل میں بھی وہ برقعہ نہیں اتارتیں۔ ان کی اس ماجرا کی وجہ ہمیں معلوم ہے وہ یہ کہ وہ کاہلوں کی سردارنی ہیں۔ ہمیشہ بنا استری کے کپڑے میلے ملبوس رہتی ہیں۔ وہ ہر ایک کو تلقین کرتی ہیں کہ ناک بھی چھپی رہنی چاہیئے خواہ وہ کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو۔ یہ تلقین بالواسطہ ہم جیسی خواتین کے لیے بھی ہوتی ہے۔ ہم نے انھیں سمجھایا۔ آپ اپنی لمبی ناک لے کر ہمیں مسائل نہ سمجھائیے، ہم شروع ہوجائیں گے تو آپ کا ناک میں دم کردیں گے۔ ناک پر کچھ نہ ہو تو ناک نہیں کٹتی۔ ہمیں تو لوگ خاندان کی ناک کہتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگیں۔ آپ راست مجھ پر تنقید کررہی ہیں میں تو ہمیشہ باہر نکلتے وقت مکمل پردے میں رہتی ہوں۔ کسی سے بھی پوچھ لیجیے۔ آ بیل مجھے مار والی بات ہوگئی۔ ان کا یہ للکارنا ہمارے جی کو لگ گیا۔ ہم اطمینان سے ان کے قریب بیٹھ گئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ان سے پوچھا ــــ وہ جو کل آپ کے باورچی خانے میں گوشت تل رہے تھے ــــ وہ کون تھے؟ انھوں نے دماغ پر مصنوعی زور ڈال کر کہا ــــ کون ــــ وہ ــــ چھوٹی داڑھی والے ــــ؟ وہ تو ان کے بچپن کے دوست ہیں۔ اور بڑی داڑھی والے؟ ــــ وہ تو ایک دم شریف آدمی ہیں گھر میں برکت کے لیے پڑھنے آتے ہیں ــــ کبھی کبھار کھانا کھا کر قیلولہ بھی کرلیتے ہیں۔ ہمیں پہلی بار اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ برکت کے بہانے گھر میں ڈیرا جمائے رکھنے والا نامحرم نہیں ہوتا۔ کچھ توقف کے بعد ہم نے ایک سوال اور ڈال دیا۔ اچھا ــــ وہ ــــ جن کے ساتھ آپ گزشتہ ہفتہ سر پر اوڑھے بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ جو آپ کے بنائے ہوئے دم کے گوشت کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے؟ انھوں نے لاپرواہی سے کہا لاحول ولا قوۃ۔ آپ بھی کیا لے کر بیٹھ گئیں ہیں۔ تو پریشان ہوگئی۔ وہ تو میری سہیلی کے شوہر ہیں۔ ہم نے زیر لب دہرایا شوہر کے دوست، سہیلی کے شوہر برکت والے حضرت ــــ اچھا ــــ آخری سوال ــــ وہ پانچ چھ نوجوان لڑکے؟ جو اکثر آپ کے گھر میں طوفان بدتمیزی مچاتے نظر آتے ہیں اور STAR PLUS کے پروگرام پر بے لاگ تبصرے بھی کرتے ہیں وہ کون ہیں؟ اب ملانی کے چہرے کا رنگ کچھ کچھ بدلنے لگا۔ خشک گلے پر قابو پاتے ہوئے انھوں نے کہا جی ــــ وہ ــــ وہ میرے بیٹے کے ہم جماعت ہیں بالکل میرے بچے جیسے۔ ہمیں ایسے لگا جیسے لعن طعن کرنے، دوسروں پر کیچڑ اچھالنے اور اپنی صفائی دینے کا سارا مسالا یکلخت کسی نے ان سے چھین لیا ہو۔ انھوں نے پہلو بدلا۔ لب بند پانی لانے کے بہانے وہاں سے رفوچکر ہوگئیں صحیح معنوں میں جسے پردہ کہا جاسکتا ہے وہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک ضعیف خاتون خاندان کے قریبی رشتہ داروں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ انھیں ستانے کے لیے خاندان کے بعض منچلے لڑکے سیدھے ان کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور پیٹ میں "مٹی" ڈالنے والا اسلام دن میں دو تین مرتبہ کرلیا کرتے ہیں اور وہ ہر دفعہ ہائیں ہائیں کہہ کر اپنا گورا سا چہرہ ڈھانک لیتی ہیں۔ جو عثمانیہ بسکٹ کی طرح خستہ ہوچکا ہے۔ بسکٹ تو چھونے سے ٹوٹتے ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ نامحرم کے تصور ہی سے پورا پورا ہوجاتی ہیں۔

ہمیں ایسی خواتین سخت ناپسند ہیں جو کہتی کچھ ہیں اور کرتی کچھ۔ جن کے قول اور فعل میں زبردست تضاد پایا جاتا ہے ان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔

استعمال نہ کریں۔ ایک صاحب اپنی پاک نگاہی کا ذکر ایک مولوی صاحب سے یوں کر رہے تھے۔ کسی نامحرم خاتون پر غلطی سے پہلی مرتبہ نظر پڑ جائے تو میں دوسری نظر کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے بہت اچھی صفت ہے یہ۔ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو پسند فرماتا ہے۔ کچھ رک کر انھوں نے پوچھا۔ دوسری نظر نہ پڑنے کا نسخہ مجھے بھی بتا دیجئے۔ انجانے میں کبھی خوبصورت لڑکیوں پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ گناہ سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہوں۔ وہ صاحب کہنے لگے۔ "بہت آسان ہے۔ پہلی نظر کو مستقل بنائے رکھیے۔" اس سلسلے میں بعض خواتین سے بڑی دلچسپ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے آپ کو دور ماضی میں لے چلتے ہیں جب خواتین پردہ لگے سیکل رکشہ میں سفر کرتی تھیں۔ ایک صاحبہ ان میں سفر کر رہی تھیں۔ پردہ تو تھا ہی، لیکن چہرہ باہر رکھ کر رکشے کے پردے کو گردن تک لگائی ہوئی مسلسل باہر دیکھ رہی تھیں۔ گھر آ کر راہرو کی شکایت اس طرح کر رہی تھیں "منحوس پڑوسی میرے کو ایچ گھور رہا تھا" اب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مٹی راہرو کی آنکھوں پر ڈالی جائے یا محترمہ کی عقل پر۔ کیونکہ گھورنے کا موقع دینے یا گھورنے میں وہ برابر کی شریک تھیں۔

شریکِ حیات کا ساتھ زندگی کے ہر موڑ ہر قدم پر ضروری ہے اس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ انتہائی مجبوری کی صورت میں کسی نامحرم سے عموماً مدد لی جاتی ہے۔ بحری جہاز میں حاجیوں کے ایک قافلے میں ایک خاتون کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ پتہ نہیں انھوں نے محرم کا انتظام کیوں نہیں کیا تھا۔ بیچ پانی میں انھیں ایک مولوی نے ڈرا دیا کہ محرم کے بغیر تو حج کا تصور ہی نہیں۔ خواتون نے پریشان ہو کر ان سے پوچھا۔ فتویٰ ملا واپس چلی جائیے۔ یا پھر — خاتون نے بے چینی سے پوچھا۔ یا پھر — دوسرا راستہ ہے۔ میرے نکاح میں آ جائیے۔ مولوی نے اطمینان سے ہنستے ہوئے کہا۔ — جہاز میں ایجاب و قبول کے دو بول ہوئے انجن نے شادیانے بجائے، لہروں نے گواہی دی۔ آن کی آن میں نامحرم محرم بن گیا۔ مصیبت کے وقت کام آنے والوں کو اللہ تعالیٰ کسی طرح بھیج ہی دیتا ہے۔

ہمارے شہر حیدرآباد میں اصلاحِ معاشرہ کی محفلیں کثرت سے منعقد ہو رہی ہیں جوڑے کی رقم اور جہیز کا مطالبہ کرنے والوں پر بھرے جلسے میں لعنت بھیج کر کئی بن جمعے ہزاروں روپے لے کر اپنے لڑکے کو فروخت کرنے والی خواتین اس شہر میں ہر محلے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرنے لگے ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں منعقد کی جانے والی محفلوں میں ہمیں بھی کچھ کہنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔ اس اصلاح میں ہم کتنے کامیاب ہوتے ہیں اس پر ان جلسوں میں حاضر خواتین ہی صحیح ڈھنگ سے روشنی ڈال سکتی ہیں ایسی ہی ایک محفل تھی۔ شہر کی کئی معزز خواتین سروں پر شال اوڑھے ڈائس پر بیٹھی تھیں۔ ایک کم عمر لڑکی جس کا نام مقررین کی فہرست میں نہیں تھا پانچ منٹ کے لیے مخاطب کرنے کی اجازت مانگ کر مائیک پر آئی تالیوں کے بیچ کر بیٹھی گئی۔ اس طالبہ کی معلومات ادھوری اور عقیدہ کچا تھا۔ اس نے آتے ہی کہہ دیا "مہمانانِ خصوصی مکمل ستر میں نہیں ہیں"۔ دراصل وہ "سنٹر" کے نام پر جلسے کو "سنٹرل" کرنا چاہتی تھی۔ خاص بات یہ کہ اس ہال میں فوٹو کشی یا مائیک کی دیکھ بھال کے بہانے بھی کوئی مرد قدم نہیں رکھ سکتا تھا بکافی لے دے ہوئی۔ مہمانانِ خصوصی نے بھی اس کی خبر لی۔ بعد میں ہم نے اس لڑکی سے سوال کیا۔ ہال میں کوئی مرد ہے نہ امرد۔ پھر آپ مہمانانِ خصوصی کو نشانۂ ملامت بنانے پر کیوں تلی ہوئی تھیں۔ اس لڑکی نے جو ناک پر کپڑا لگائے ہوئے تھی پھر پھڑا کر گننا شروع کیا۔ کاغذ، قلم،

سنجیدگی سے اپنی روزمرہ زندگی اور اپنے معمولات کا جائزہ لیں۔ پردے کی اُس آخری قسم کو اپنائیں جس کا ذکر ابھی ہم نے کیا ہے۔ شوہر کے دوست، سہیلیوں کے شوہر، بیٹے کے دوست، دوکاندار، الکٹریشن جوہری، دھوبی واچ مین، پوسٹ مین، آٹو والے ان سب کو مردوں کے زمرے ہی میں رکھیں۔ ناک کی پھالی کا استعمال صرف دکھاوے کے لیے نہ کریں تب ہم اُن کے پردے کو مانیں گے۔ ورنہ —— اصلاح ہم اُن کی کریں گے، بیوٹی پارلر کی قینچی سے نہیں۔ اپنے دس روپے والے بال پن سے۔ ▲▼

فضل جاوید (حیدرآباد)

مرزا جی

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ اپنے منہ سے اپنی بڑائی کرکے دوسروں کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔ خود ستائی یوں بھی اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ ایسے لوگوں کو قریب آتا دیکھ کر لوگ راستہ بدل لیتے ہیں۔ غلطی سے کبھی سامنا ہو جائے تو بہانے بنا کر جلد سے جلد چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے ایک واقف کار مرزا جی ہیں۔ انہیں اپنی قابلیت کا سکہ دوسروں پر جما کر اُن سے داد وصول کرنے کے گُر خوب آتے ہیں۔ ان کی زنبیل میں ہر موضوع پر مواد موجود رہتا ہے جسے وہ ہر ضرورت مند کو فراخدلی سے بانٹتے ہیں۔ اخباروں سے تو روز استفادہ کرتے ہی ہیں لیکن ٹی۔ وی نے ان کی معلومات میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ یوں تو ہر چینل دیکھتے ہیں لیکن "ڈسکوری" چینل باقاعدگی سے دیکھتے ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ عصرِ حاضر کی گتھیاں وہ چٹکی بجا کر حل کر لیتے ہیں۔ اپنے اطراف و اکناف میں کیا کیا ہو رہا ہے اس پر بھی ان کی نگاہ رہتی ہے۔ اب تو انہیں اپنی قابلیت جھاڑنے کے لیے مواقع تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لوگ انہیں اپنے آپ گھیر لیتے ہیں۔ ان کی ہر دل عزیزی کا ایک اور سبب بھی ہے۔ کوئی مسئلہ حل کرنے کے لیے زبانی قابلیت کے ساتھ ساتھ اپنی جیب بھی ہلکی کر لیتے ہیں۔

ایک دفعہ وہ جھونپڑ پٹی کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ کچھ کم عمر بچوں کو گولیاں کھیلتے ہوئے دیکھ کر طیش میں آ گئے (انھیں) اس کھیل سے بچپن ہی سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے فوراً بچوں کے ماں باپ کے پاس گئے تعلیم کی افادیت پر بہت دیر تک بولتے رہے۔ لیکن اُن لوگوں نے کان نہ دھرا اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ ایک بوڑھا شخص بڑے غور سے مرزا جی کو سُن رہا تھا۔ وہ بولا۔ "بابوجی! ہم مجبوری کہنے والوں کے بچے بھی مجبوری ہی کرتے ہیں۔ ان کو پڑھانے کو ہمارے پاس پیسہ بھی نہیں۔" یہ سنتے ہی مرزا جی کی رگِ قابلیت پھڑکی۔ اخبار ٹی وی اور ریڈیو سے حاصل کی ہوئی معلومات کو کچھ اس انداز میں ان غریبوں کے آگے پیش کیا کہ سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ جب ان ناداروں کو معلوم ہوا کہ حکومت ان کے بچوں کو مفت کتابیں دے گی، فیس بھی نہیں لے گی اور ایک وقت کا کھانا بھی مہیا کرے گی تو سب اپنے بچوں کو پڑھانے پر راضی ہو گئے۔ لیکن اسکول میں داخلے کی ذمہ داری مرزا جی پر ڈال دی گئی۔ مرزا جی نے اپنی قابلیت تو جھاڑ دی لیکن وہ عملی طور پر کبھی کسی اسکول میں داخلے کی غرض سے نہیں گئے تھے۔ دوسرے دن ہمیشہ کی طرح دوہرا جوڑی دار پیجامہ، شیروانی، ترکی ٹوپی، سلیم شاہی جوتے پہنے، ہاتھ میں کتاب نما پاندان تھامے، ننگ دھڑنگ بچوں کی قطار لئے ضلع پریشد اسکول کے

ہیڈ ماسٹر سے ملنے گئے۔ حکومت کی پالیسیوں پر اتنی جامع تقریر کر ڈالی کہ ہیڈ ماسٹر کبھی ان کی شخصیت سے مرعوب ہوتا تو کبھی ان کے جذبۂ خدمتِ خلق سے۔ آخر سب بچوں کو مفت تعلیم کے ذمے میں داخلہ مل گیا۔ جب جھگی جھونپڑیوں سے بچوں کا جمگھٹا کتابوں سے لدے جھولے اٹھائے اسکول کی طرف چلتا تو ہر طرف مرزا جی کی قابلیت کا ڈنکا بجنے لگتا۔

مرزا جی کا معمول تھا کہ ہفتہ میں دو دن وہ شہر کے ہسپتالوں کا خیرسگالی دورہ کرتے۔ مریضوں سے پوچھ کر ان کے لیے ایسے ایسے نسخے تجویز کرتے کہ ڈاکٹر بھی ششدر رہ جاتے انہی کے غیر معتبر ذرائع کے مطابق نوے فیصد مریض انہی کی تشخیص سے صحت یاب ہو کر گھر واپس جاتے تھے۔ السر کے مریض کو یہ یقین دلا کر ہی چھوڑتے کہ اس کا علاج آپریشن نہیں ہے۔ اُسے تلقین کرتے کہ دوسروں کی خوشیوں سے جلنا چھوڑ دو۔ حسد کی آگ سے بچو۔ جو مل رہا ہے اس پر قناعت کرو کھانا کھاتے وقت نہ خود پر کڑھو اور نہ دوسروں پر ۔ آج سے یہ سب باتیں چھوڑ دو السر خود بخود سوکھ جائیگا۔ ڈاکٹر آلات جراحی لیے تیار اور ادھر مریض ہسپتال سے فرار ۔ ایسے ہی ایک خیرسگالی دورے پر ہم بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک مریض کے گلوکوز کی بوتل چڑھی ہوئی تھی۔ پوچھ تاچھ سے معلوم ہوا کہ اسے بھوک نہیں لگتی، پیٹ میں ایک طرف درد رہتا ہے اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے بہت سے ٹسٹ کر ڈالے لیکن ابھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ مرزا جی نے نبض دیکھی مریض کی آنکھوں میں جھانکا اور فیصلہ صادر کیا کہ اسے صرف یرقان ہوا ہے۔ فوراً ڈاکٹر صبرا نیم کے پاس حدا کالونی لے جاؤ۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ یرقان ہی کا مریض تھا اور صبرا نیم کی کیلے میں رکھ کر دی ہوئی دو ہی خوراک دوا سے بالکل ٹھیک ہو گیا۔

بات سے بات نکال کر اپنے مطلب کے موضوع پر آجانا بھی ایک فن ہے اور مرزا جی اس فن میں یکتا ہیں۔ ایک محفل میں خاص طور پر خربوزے کی افادیت پر اپنی قابلیت جھاڑنے کی پوری تیاری کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ یہ ایک ادبی نشست تھی۔ کسی نے ان سے مومن کی حیات و شاعری پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کی۔ مرزا جی بھلا اپنی کم مائیگی کا اعتراف کس طرح کرتے۔ بس شروع ہو گئے اور بولتے چلے گئے۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ــــ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا ــــ مومن کی شاعری کی ساری عمارت اس شعر کی بنیاد پر کھڑی کر دی۔ ان کی رنگین مزاجی اور پہلوانی دو متضاد خصوصیتوں کا بھرپور موازنہ کرتے ہوئے ان کی مرغوب غذاؤں اور پھل پھلاری پر آئے۔ وہیں انہیں اُن کا خربوزہ مل گیا۔ کہنے لگے مومن کو خربوزہ بہت پسند تھا۔ اب کیا تھا۔ خربوزے کی افادیت پر اپنی بیش بہا معلومات کا خزانہ لٹاتے رہے۔ خربوزے کو آخر میں حکیم لقمان سے جوڑتے ہوئے فرمایا کہ خربوزے کو چاندنی رات میں اس طرح کھلا چھوڑ دیا جائے کہ رات بھر اس پر اوس پڑتی رہے۔ صبح اگر اس کو نہار منہ کھالیا جائے تو سر کا درد چاہے کتنا پرانا کیوں نہ ہو ہمیشہ کے لیے جاتا رہے گا۔ محفل میں موجود دو تین اصحاب سر درد کے دائمی مریض تھے۔ انھیں اس نسخہ کے استعمال سے کامل شفاء ہوئی۔ مومن اور خربوزے میں غالب اور آم کی سی مناسبت ہو نہ ہو لیکن مرزا جی نے اپنی قابلیت جھاڑتے ہوئے نہ صرف مومن کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچایا بلکہ دردِ سر کے مریضوں کے لیے ایک نسخہ بھی تجویز فرمایا۔

کوئی موضوع ایسا نہیں جو مرزا جی کی دسترس سے باہر ہو۔ سیاست میں بھی وہ دور کی کوڑی لاتے تھے۔ ایک وقت تھا جب ملک کے سامنے ایک گمبھیر سوال تھا ــــ "نہرو کے بعد کون" ؟ بڑے بڑے سیاسی پہلوان اِس

سوال کو حل نہیں کر پا رہے تھے لیکن مرزا جی نے نہرو جی کی زندگی ہی میں یہ سوال چٹکی بجاتے حل کر دیا تھا۔ لال بہادر شاستری نہرو جی کے آخری دنوں میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ایک عوامی جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے اچانک نہرو جی کو کیا سوجھی کہ انھوں نے اپنی شال اتار کر شاستری جی کو اوڑھادی۔ مرزا جی نے اس خبر کو بنیاد بنا کر گلی گلی محلہ محلہ اور پورے شہر میں کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا کہ شاستری جی کو اپنی شال اوڑھانے کا مقصد اس کے سواء کچھ نہیں کہ نہرو جی انھیں اپنا جانشین بنانا چاہتے ہیں ۔۔۔ اور ہوا بھی یہی۔ پنڈت نہرو جی کے بعد لال بہادر شاستری ہی ان کے جانشین بنے۔

چند سال قبل ساری دنیا کی نظریں امریکہ کے صدر کے چناؤ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مرزا جی کو اپنی سیاسی سوجھ بوجھ دکھانے کا اس سے اچھا موقع اور کب مل سکتا تھا۔ بین الاقوامی سیاست پر لکچر ہونے لگے۔ دنیا بھر کے لیڈروں کی قیاس آرائیاں ایک طرف اور مرزا جی کا فیصلہ ایک طرف ۔۔۔ انھوں نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ بل کلنٹن امریکہ کے صدر ہوں گے اور جارج بش کو بہرحال ہارنا ہی ہے۔ آگے فرمانے لگے جو شخص روسی اتحاد کا دشمن ہو اور صدام حسین جیسے مرد مجاہد کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی ایٹمی طاقت کے استعمال سے لاکھوں افراد کا خون اپنی گردن پر لے سکتا ہو اس کی شکست لازمی ہے۔ کیوں کہ امریکی عوام کافی ہوشیار ہیں اور دوغلی پالیسیوں کو ناپسند کرنے لگے ہیں ۔۔ چاہے ان کی ان دلیلوں میں سیاسی شعور کی بجائے ان کے اپنے ذاتی جذبات ہی کیوں نہ شامل ہوں پر ہوا وہی جو مرزا جی چاہتے تھے۔

مرزا جی میں ایک خاص بات اور ہے۔ وہ بلا کے مزاج شناس ہیں۔ دوستوں کی دکھتی رگوں سے واقف ہیں۔ اپنے مخاطب کی قابلیت اور دلچسپیوں کے بارے میں پورے معلومات سے لیس ہو کر ہی وہ اس پر حملہ آور ہوتے تھے۔ انھیں علم تھا کہ ہم کبھی پیروڈی پر کام کر چکے ہیں۔ ہم پر اپنی قابلیت جھاڑنے کا انھیں ایک نادر موقع مل گیا۔ لائبریریوں کے چکر لگا لگا کر انھوں نے اس موضوع پر اچھا خاصہ مواد جمع کر لیا۔ ایک ادبی نشست میں ہم پر حملہ آور ہوئے۔

"بھئی جاوید صاحب! سنا ہے آپ نے اردو پیروڈی پر مقالہ لکھا ہے۔ اس موضوع پر آج تک کوئی مستقل کتاب موجود نہیں ہے۔ آپ کو کافی محنت کرنا پڑی ہوگی۔ چونکہ پیروڈی انگریزی زبان سے دوسری زبانوں میں منتقل ہوئی ہے اس لیے آپ کو غالباً پیروڈی سے ملتی جلتی صنف BURLESQUE کے بارے میں تو معلوم ہوگا۔ کیا آپ نے ان دونوں کے فرق کو اپنے مقالے میں واضح کیا ہے۔" انھوں نے فاتحانہ انداز سے اپنی دانست میں ہمیں چاروں خانے چت سمجھتے ہوئے ہماری آنکھوں میں جھانکا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کی وضاحت کرتے خود ہی آگے بولنا شروع کیا "دراصل کسی سنجیدہ تحریر کو کسی آسان طریقے سے سنجیدہ انداز ہی میں بیان کر دینے کو "برلسک" کہتے ہیں جب کہ پیروڈی میں سنجیدہ تحریر کو مزاحیہ انداز سے کسی اور موضوع میں بدل دیا جاتا ہے اور سنجیدہ تحریر کی پرچھائیں اس کے پس پردہ ابھرتی ہے"۔

حاضرین ہم بخود مرزا جی کی قابلیت پر ان کی بھرپور ستائش کرنے لگے۔ ہم بھی اس عزیب الدیار صنف پر ان کی معلومات پر واہ واہ کئے بغیر نہ رہے۔ لیکن موصوف نے ایک دفعہ بھی ہمیں موقع نہیں دیا کہ کچھ اور سوال کر کے ان کی قابلیت کی قلعی کھول سکیں ۔۔ ان میں ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اپنی دکھتی رگ پر کسی کو ہاتھ رکھنے نہیں دیتے بشرطیکہ یہ کام ان کی بیگم بخوبی انجام دیتی ہیں۔ مرزا جی جب گھر لوٹتے ہیں تو اپنی قابلیت کا پٹارہ دہلیز کے باہر رکھ کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اپنے سے زیادہ قابل اور طاقتور حریف کے سامنے ہتھیار ڈال دینا انکے نزدیک عقلمندی کی نشانی ہے۔

اقبال شانہ
حائل سعودی عرب

کیا ضرورت ہے

قبر دانی کی کیا ضرورت ہے　　چائے پانی کی کیا ضرورت ہے
عقد میں آپ سوٹ سلوائیں　　شیروانی کی کیا ضرورت ہے
لُوٹ لو ہم کو پیار سے یارو　　پہلوانی کی کیا ضرورت ہے
اتنا سُرمہ ہے تیری آنکھوں میں　　سُرمہ دانی کی کیا ضرورت ہے
بھینس چرتی ہے باغ میں اُن کے　　باغبانی کی کیا ضرورت ہے
چل رہے ہیں ہوا کے رُخ پر ہم　　بادبانی کی کیا ضرورت ہے
آگئے وہ میری عیادت کو　　زندگانی کی کیا ضرورت ہے
کھائیے آپ، آپ کا گھر ہے　　میزبانی کی کیا ضرورت ہے
وہ ملے بھی تو کب ملے شانہ　　اب جوانی کی کیا ضرورت ہے

ٹھیک

مالی حالت اپنی ٹھیک　　اُن کی ہے جسمانی ٹھیک
ان کے دیکھے سے اپنی　　ہو جائے بیماری ٹھیک
ہم کو بیوی سے یارو　　اب لگتا ہے ٹی۔وی ٹھیک
میرا ہر اک شعر غلط　　غزلیں اُن کی ساری ٹھیک
میرے پیار کے جادو سے　　ہو جائے دیوانی ٹھیک
تجھ کو کردے گی شانہ　　اک دن تیری بیوی ٹھیک

جھاڑو پھر گئی

نام اور شہرت پہ جھاڑو پھر گئی　　عشق میں عزّت پہ جھاڑو پھر گئی
دیکھ کر جھاڑو تمھارے ہاتھ میں　　لو مری ہمّت پہ جھاڑو پھر گئی
ہوگیا میک اپ پسینے میں خراب　　یار کی صورت پہ جھاڑو پھر گئی
پھیر لی جب سے نظر اک شخص نے　　میری شخصیت پہ جھاڑو پھر گئی
اس قدر آزاد نظمیں ہوگئیں　　شعر و شعریت پہ جھاڑو پھر گئی
ہم وطن میں بے وطن لگنے لگے　　اپنی شہریت پہ جھاڑو پھر گئی
ایسے بیگم نے سدھارا ہے ہمیں　　ہر بُری عادت پہ جھاڑو پھر گئی
رات نیتا جی کے گھر چوری ہوئی　　لوٹ کی دولت پہ جھاڑو پھر گئی
کیا ہوا شانہ تجھے شادی کے بعد　　کیوں تری صورت پہ جھاڑو پھر گئی

علیم خان فلکی (جدہ)

"خدا کسی کو ایڈیٹر نہ بنائے"

"ہماری دُعا ہے کہ خدا کسی کو ایڈیٹر نہ بنائے" ایڈیٹروں کے حق میں ہمارے موقف میں اچانک یہ رحمدلانہ تبدیلی پہ ہمارے احباب کو اسی طرح حیرانی ہوگی جس طرح تلگو دیشم کے بی جے پی سے مل جانے پر ہوئی ہوگی ورنہ وہی ہم تھے کہ مضمون چھپنے کے کربِ انتظار میں انھیں بے نقاب کرتے اور انھیں "حق پسندوں کے دشمن، سفارش پسند اقرباء نواز، اپنے مضامین خودہی فرضی ناموں سے چھاپ لینے والے مالکوں کے اشارے پر ناچنے والے" جیسے خطابات سے نوازتے رہتے تھے۔

سچ فرمایا رسول خداؐ نے کہ جب کوئی بندہ بلاتحقیق کسی پہ تہمت لگائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس بندے سے وہی عمل کرواکر ذلیل کرے گا لہٰذا ہماری شامتِ اعمال رنگ لائی۔ ہوایوں کہ احباب نے حرکت برائے حرکت کے طور پر ایک عدد مشاعرہ اور اس موقعہ پر ایک عدد سوونیر کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ مقصد وہی گھسا پٹا جسے بڑے بڑے حرفوں میں شائع ہونا تھا کہ اردو کی ترقی ادب کی خدمت، فروغِ ذوقِ مطالعہ وغیرہ۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد احباب نے سوونیر کی ایڈیٹری کا قرعہ فال ہمارے نام نکال دیا۔ ہم نے لاکھ سمجھایا کہ ہمیں صدر یا سرپرست وغیرہ منتخب کرلیں لیکن پتہ چلا کہ صدر کے لیے پانچ ہزار ریال اور باقی عہدوں کے لیے دو ہزار ریال کا چندہ دینا لازمی ہے۔ ہمارا جذبۂ تعاون تو اس سخاوت کے لیے تیار ہوگیا۔ لیکن ہمارے ذوقِ شہرت نے ویٹو کردیا، سوونیر میں ایک سوٹ والی تصویر چھپوانے کی اتنی زیادہ قیمت احمقانہ۔ سو اتنی دہ بھی ایسے میگزین میں جسے صرف شاعر اور مضمون نگار یا پھر وہی اصحاب پڑھیں گے جن کی تصاویر چھپیں گی۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ کسی اخبار میں اپنی تصویر کے ساتھ اشتہار شائع کرواکے سوونیر کی اشاعت پر مُبارکباد کا پیام دیا جائے۔ ہزاروں دیکھ لیں گے سینکڑوں اتفاقیہ پڑھ بھی لیں گے۔ سوونیر نکلے نہ نکلے کم از کم اپنے سرمایہ کا فائدہ تو نکل آئے گا۔ اسی لیے تو بے شمار تہنیتی و تعزیتی جلسوں مشاعروں اور دستار بندیوں کی ایسی تصویریں بھی اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں جو نشستیں فی الواقع وقوع پذیر بھی نہیں ہوتیں ان گروپ فوٹوز میں شریک ہونے کے لیے لوگ ایسے ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے کسی تدفین کے وقت قُل تک کے ڈھیلے دیئے جاتے ہیں۔

خیر صاحب تو ہم ایڈیٹر بن گئے۔ اگلے دن سے ہی غزلوں اور مضامین کی آمد شروع ہوئی ایک ہی ہفتہ میں پچاس ساٹھ غزلیں جمع ہوگئیں جو تمام اُن شعراء کی تھیں جن سے بچنے کے لیے ہم مشاعروں میں خاص طور پر ایسے وقت داخل

ہونے کا اہتمام کرتے ہیں جب وہ سب سُنا چکے ہوں جس کا ظالموں نے ہم سے خوب انتقام لیا۔ ہر ایک نے اپنی تین تین چار چار غزلیں نوازدیں اور انتخاب کی ذمہ داری ہمارے سر تھوپ دی ظاہر ہے ہر شاعر کو اپنی ہر غزل چاہے وہ کتنی ہی گھسی پٹی کیوں نہ ہو اپنے بچے کی طرح پیاری ہوتی ہے اس لیے شاعروں میں اُس کا بس چلے تو سارے بچوں کو پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ بلکہ بشیر بدر کی طرح شعر پیش کرنے سے پہلے ہاتھ جوڑ جوڑ کر داد کی اپیل اس طرح کرے گا جیسے کوئی کسی مسکین کی میت کے لیے چندے کی اپیل کر رہا ہو

ہم ایڈیٹر کی ذمہ داری بس اتنی سے سمجھتے تھے کہ مواد جمع کرے اور کاتب کے حوالے کردے لیکن اب پتہ چلا کہ غزلوں اور مضامین کے ڈھیر سے انتخاب کرنا گویا کسی کچرے کے ڈھیر میں کھوئی ہوئی چابی تلاش کرنا ہے۔ ایک دوسرا راستہ بھی تھا کہ تمام تخلیقات کو ہمعصر تخلیق کاروں میں بانٹ دیا جائے اور ان سے "ایمانداری" کے ساتھ تنقیدی جائزہ لینے کی قسم لے لیں تو ہمیں یقین ہے نہ کوئی غزل لائق اشاعت ہوگی نہ کوئی مضمون!

سچ کہا خامہ بگوش نے کہ اللہ تعالیٰ ان تخلیق کاروں کو یہ سزا دے گا کہ ان کی تخلیقات ان ہی سے پڑھوائے گا نہ تو ہم ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کی طرح اتنے باہمت ہیں کہ سارے مضامین پڑھتے بیٹھیں اور نہ ہم اطہر ہاشمی کی طرح اتنے بے مروت ہو سکتے ہیں کہ مضامین کے پیراگراف ہی نہیں بعض وقت تو پورا مضمون حذف کر ڈالتے ہیں اور سینہ زوری کا یہ عالم کہ ملتے ہیں تو نہ مسکراہٹ میں کوئی کمی آنے دیتے ہیں نہ تعلقات میں۔

خیر ــــ غزلوں کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوا کسی مفکر کا قول ہے کوئی دو مضامین پڑھ کر تیسرا مضمون لکھا جا سکتا ہے بلکہ دلیپ سنگھ مرحوم نے کہا تھا کہ پرانی ایک دو ساڑیوں کو پھاڑ کر ان سے جو نئے شرٹ شلوار بنائے جاتے ہیں وہ پُرانی ساڑی سے زیادہ خوبصورت بھی ہوتے ہیں اور مفت بھی تیار ہوتے ہیں۔ ہمارے کرم فرما مصلح الدین سعدی صاحب ہیں کہ ایک مضمون کے لیے کئی کتابیں پڑھوا دیتے ہیں لیکن آج کی "ادب خواری" کے لیے ان سب بکھیڑوں کی ضرورت نہیں دو چار مضامین کا کٹر لو سے ایک دو مضمون نکل ہی آتے ہیں

ایک صاحب نے جدید فلمی شاعری "پر کان ریزی" کی کیوں کہ اس شاعری پر تحقیق کے لیے عرق ریزی کی نہیں کان ریزی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ ثابت کیا کہ فلمی شاعری نہ ہوتی تو اردو شاعری ختم ہو چکی ہوتی۔ ہمارا خیال تھا کہ فلمی شاعری کو پیدا کرنے اردو شاعری کا خاتمہ ناگزیر تھا۔ جیسے

ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو　؛　ہاتھ سے چھو کے اسے رشتوں کا الزام نہ دو

ہمیں ہندوستان چھوڑے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ کسطرح اردو کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے لوگوں نے اسے اس کے استعاروں، علامتوں، تشبیہات وغیرہ کے ساتھ پاگل خانے میں شریک کردیا۔ آنکھوں سے چمک کے بجائے مہک پھوٹنے لگی مہک بھی ایسی کہ اسے سونگھنے یا محسوس کرنے بجائے دیکھا جانے لگا۔ ستم بالائے ستم "اس مہک کو چھوا جانے لگا" اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس مہک کو چھونے سے رشتوں کا الزام بھی آ سکتا ہے اور افسوسناک پہلو یہ کہ بین السطور میں ناجائز رشتوں کا الزام ــــ اگر اس قسم کی شاعری سے اردو کا مستقبل روشن ہوتا تو ہم شاعری ہی نہیں اردو زبان سے آج سے ہی لاتعلقی کا اعلان کر دیتے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مضمون نگار حضرت فلمی اور ٹی وی حلقوں میں کافی اثر رکھتے تھے ہمارے ہندوستان منتقل ہونے سے پہلے ہمیں فلموں اور ٹی وی ڈراموں

میں لکھنے کا کام دلانے کا وعدہ کر چکے تھے اب اردو کے مستقبل کی خاطر ہم اپنا مستقبل تو داؤ پر لگانے سے رہے اس لیے ہم نے خوشی خوشی اُن کا مضمون قبول کر لیا۔

ایک اور صاحب نے ایک مضمون "ادب میں ترقی پسندوں کا حصہ" اس خصوصی ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ "خیال رہے ترقی پسند ادب کو خصوصی جگہ ملنی چاہیئے" ترقی پسند ہونے کے لیے لکھنا بھی ضروری ہے یہ ہمیں آج معلوم ہوا ہم تو بس یہ جانتے تھے کہ اس کے لیے بس باغی ہونا ضروری ہے مثلاً کیفی اعظمی صاحب جو اپنی آپ بیتی میں کہتے ہیں کہ انھیں عالم دین بننے کے لیے مدرسے میں شریک کر دیا گیا لیکن کسی مولوی کی ایک بچے کے ساتھ ناشائستہ حرکت دیکھ کر انھوں نے مدرسے ہی سے نہیں دین سے بھی بغاوت کر دی اور بمبئی بھاگ آئے لیکن یہ واضح نہیں ہوا کہ وہ بچہ تھا کون ؟ "ادب میں ترقی پسندوں کا حصہ" عنوان ہمیں ایسا لگا جیسے ایک دیوالیہ بیٹا باپ سے "وراثت میں حصہ" طلب کر رہا ہو حالانکہ حصہ تو وہ کب کا لے چکا مزدوروں اور کسانوں کو فروخت بھی کر چکا ٹریکٹر کے ترقی یافتہ دور میں درانتی چلا کر نہ کھیت کی حفاظت کر سکا نہ فصل کی۔

ترقی پسندوں پر ہمارے کئی اعتراض ہیں ۔۔ لیکن اقدار پسندی جب اُن کا مسئلہ ہی نہیں ہے تو ہم کیوں انہیں مورد الزام ٹھہرائیں اس لیے ہم نے سارے اعتراضات۔ واپس لے لیے اور مضمون قبول کر لیا کیوں کہ مصنف کے روس سے بہت اچھے تعلقات تھے انھوں نے وعدہ فرمایا کہ ذرا روس کے حالات ٹھیک ہو جائیں وہ ہمیں روس یا پھر کیوبا کمبوڈیا سربیا یا کم از کم آسٹریا ضرور بھیجیں گے۔

ایک اور صاحب ہیں ناقد لکھنوی۔ سنا ہے کہ ایک عرصے سے "تنقید لکھ رہے ہیں لیکن ادبی حلقوں نے ان کو جب تنقید نگار کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو مجبوراً انھوں نے اپنا نام ناقد رکھ لیا۔ سووینیر کے لیے انھوں نے جو مضمون عنایت فرمایا وہ ان کے فن کی معراج تھی۔ عنوان تھا "شعر جدید کا خالق ــــ فلکی" سرِ عنوان دیکھتے ہی اچھل پڑے۔ خدا گواہ ہے کہ ہم کو آج تک شعرِ جدید و شعرِ قدیم کا فرق بھی نہیں معلوم۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ شعرِ قدیم عروض بحر ردیف قافیہ اور پتہ نہیں کیا کیا کا پابند ہوتا ہے اور شعر جدید نہ صرف ان تمام پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے بلکہ معنے و مقصد سے بھی۔ پتہ نہیں ہمارے کس شعر نے اِن کی بارگاہِ سخن میں سعادتِ قبولیت حاصل فرمائی کہ ہم کو شعرِ جدید کے خالق ہونے کا اعزاز عطا کر دیا گیا۔ غالب اور اقبال کے بعد اگر کسی نے شاعری کی تھی تو وہ ہماری ذات تھی۔ غالب اور اقبال تو یوں ہی احتراماً شاملِ ذکر ہیں ورنہ مضمون کی رو سے ہم تو انگریزی میں بھی شعر کہہ لینے کی بنا پر غالب سے آگے تھے۔ اور ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے تجربے میں اقبال سے آگے۔ ہمیں یقین تھا کہ اب ہم سفرِ جدید کے خالق ہی نہیں خاتم بھی کہلائیں گے کیوں کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد ظاہر ہے کہ ہمعصروں کی کوئی محفل نہ ہمارے شایانِ شان رہے گی نہ ہمیں کوئی آنے دے گا۔

ناقد صاحب ہمارے جلسوں اور مشاعروں کے لیے خاطر خواہ تعداد میں حاضرین فراہم کرنے کے کام آتے ہیں اس لیے ان کا مضمون از راہِ تبرک شامل کرنا ضروری تھا لیکن اگلے ہی ہفتے ان کی شریکِ حیات نے ایک مضمون عنایت فرمایا "تنقیدِ جدید کا خالق ــــ ناقد" جب ناقد صاحب کے کہنے پر ہم نے اپنے آپ کو شعرِ جدید کا خالق تسلیم کر لیا ان کی بیگم نے "بزبانِ ناتوان کی بیگم کے" کہنے پر ان کے شوہر کو تنقیدِ جدید کا خالق

چھپنے پر ہم کو بُرا ماننے کا بھی حق نہیں رہا۔ خواتین کو جہاں پارلیمنٹ میں ۳۳٪ حصہ دینے کی بات ہو رہی ہے وہیں سو و نمبر میں ایک آدھ مضمون کی جگہ تو ملنی ہی چاہیئے اس لیے یہ مضمون بھی طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑا۔

مضامین کی کثرت کی وجہ سے جب منتظمین کی تصاویر والے صفحات کو خارج کر دینے کی نوبت آئی تو مجبوراً ہم نے یہ اعلان کروا دیا کہ بغیر اشتہار کے کوئی تخلیق شائع نہیں کیجائے گی۔ صرف اشتہارات بغیر کسی مضمون یا غزل کے چھاپ کر بھی ادب کی خدمت کی جا سکتی ہے بلکہ دورِ حاضر میں کی جا رہی ہے لیکن بغیر اشتہار کے ادب کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ غزلیں اور مضامین تو کسی رسالے میں بس یونہی اس طرح شامل کر دیئے جاتے ہیں جس طرح دولہا کے ساتھ چند باراتیوں کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

ہماری اشتہار پالیسی کامیاب رہی ایک حکیم صاحب نے اپنے ایجاد کردہ نسخۂ قوت مردانہ کا اشتہار اسی عنوان سے متعلق ایک عدد مضمون کے ساتھ عنایت فرمایا۔ پھر "ضرورت رشتہ" کے دفاتر "روحانی علاج" کے ماہرین وغیرہ سبھی جوش میں آگئے نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو پھر کسی مضمون کو ایڈیٹ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مُشتہر ادب کے ان بے غرض خدمت گزاروں کی طرح تھوڑی ہوتا ہے جو خونِ جگر سے ایک ایک لفظ لکھنے میں راتوں کی نیندیں برباد کرتے ہیں اور بغیر کسی معاوضے کے ایڈیٹروں کے وہ سارے نخرے اُٹھاتے ہیں یعنی "صفحے کے ایک ہی طرف لکھیئے، صاف اور خوش خط لکھیئے، جوابی اسٹامپ کے ساتھ مضمون بھیجیئے"۔۔۔ وغیرہ وغیرہ اور ادب کے یہ سچے محسن مضمون کی اشاعت کے انتظار میں یوں راہ دیکھتے ہیں جیسے ایڈیٹران پر احسان کرنے والا ہو۔

مجرم رہ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

قطعات

جعفر رضوی
واشنگٹن یو ایس اے

اپنی آزادی کو انسان یونہی کھوتا ہے
عقد بھی کرتا ہے خود آپ ہی پھر روتا ہے
یہ عجب بات کہ ازدواج سے ہم مردوں کو
خوف تو ہوتا ہے پر عشق نہیں ہوتا ہے

مذہب کی خوبیاں آسے قائل نہ کرسکیں
بس ایک ہی اصول پہ قربان ہوگیا
جوں ہی سُنا کہ چار بھی جائز ہیں بیویاں
فوراً وہ کلمہ پڑھ کے مسلمان ہوگیا

کتنی ویک اینڈز کی ڈیٹوں سے گزر سکتا تھا
فیس دو چار سیمسٹرس کی بھی بھر سکتا تھا
ٹول[1] کے نام سے سسروں نے جو چھینی تھی رقم
شادی اتنے میں تو ایک اور میں کر سکتا تھا

1 Toll 2 WEEKENDS

بیوی شاعر کو گر سگھڑ مل جائے
سب مسائل سدھرتے جاتے ہیں
کوئی پھوہڑ اگر ہو قسمت میں
پھر تو دیوان بھرتے جاتے ہیں

ایک دلہن نے یہ روتے ہوئے دلہا سے کہا
دیدہ اک آنکھ کا سرتاج مرا نقلی ہے
ہنس کے دولہا نے کہا غم کی کوئی بات نہیں
ہیرا انگلی میں تمہارا بھی کہاں اصلی ہے

کیوں ٹریفک میں پھنسایا ہے مجھے عید کے دن
دے مجھے قوتِ پرواز میں طائر ہو جاؤں
سال میں پڑھتا ہوں میں صرف یہی ایک نماز
وہ بھی کیا چھوڑ کے میں پورا ہی کافر ہو جاؤں

تابش خانزادہ
(امریکہ)

جوانی اب پرانی ہوگئی ہے
بڑی لمبی کہانی ہوگئی ہے
وہ جس سے عشق فرمایا تھا ہم نے
کئی بچوں کی نانی ہوگئی ہے

وہ سراپائے یاس بیٹھی ہے
آج بیگم اداس بیٹھی ہے
بات اس کے سوا کچھ اور نہیں
سامنے اُس کے ساس بیٹھی ہے

رؤف رحیم
حیدرآباد

غزل

جوکر ہوں میں دلوں کو لُبھانے کے واسطے
میں رو رہا ہوں سب کو ہنسانے کے واسطے

کُل چھرے میں اڑاتا ہوں اب ہو کے بے خطر
بیوی قطر گئی ہے کمانے کے واسطے

SUN BATH لینے چھت پہ ہوں ننگا کھڑا ہوا
پانی نہیں ہے گھر میں نہانے کے واسطے

نکلا ہے سامنے کہیں گھونسہ نہ مار دے
ڈرتا ہوں اپنی ناک کھجانے کے واسطے

چوہلے کی طرح میں نے سنگ کر سُنائے شعر
محفل میں اپنی دال گلانے کے واسطے

احباب کو سناتا میں تازہ غزل مگر
پیسے نہیں ہیں چائے پلانے کے واسطے

کرنے لگے ہیں شوق وہ اب نثری نظم کا
بے وزن شاعری کو نبھانے کے واسطے

سب مرچکے رقیب مگر ہم ہی رہ گئے
اک بے وفا کے ناز اٹھانے کے واسطے

چکر ہے اپنے پاؤں میں کچھ ایسا ان دنوں
فرصت نہیں ہے سر بھی کھجانے کے واسطے

شاعر سے جب بھی سامنا میرا ہوا کہیں
لاحول پڑھ لیا ہے بھگانے کے واسطے

روٹھے ہوئے ہیں وہ تو رحیم اپنا قلب زار
اُلٹا لٹک گیا ہے منانے کے واسطے

اقبال ہاشمی
حیدرآباد

طبیب حاذق

میری آنکھیں دکھ رہی تھیں، میں بہت بے چین تھا
میری حالت دیکھ کر سب نے دیا یہ مشورہ

اپنے گھر کے پاس ہی موجود ہے حاذق طبیب
ماہرانِ چشم ہیں سب دور اور یہ ہے قریب

اس سے فوراً مشورہ کرلو، شفا پا جاؤ گے
روتے روتے جا رہے ہو، ہنستے ہنستے آؤ گے

درد کا مارا تھا میں فوراً وہاں حاضر ہوا
میری قسمت سے طبیب معتبر تنہا ملا

ایک جانب میز کے بیٹھی ہوئی تھیں مکھیاں
دوسری جانب پڑی تھیں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں

اک سرے پر میز کے بیٹھا تھا وہ حاذق طبیب
اور اس کے روبرو تھا یہ تنِ تنہا غریب

اس نے پوچھا کیا مرض لاحق ہوا ہے آپ کو
میں نے بتلایا، نظر آتی ہے ہر شے مجھ کو دو

پہلے اس نے غور سے دیکھا مجھے اور پھر کہا
سوچتا ہوں دیر سے کھلتا نہیں یہ ماجرا

میری الجھن بڑھ رہی ہے آپ ہی سلجھائیے
آپ چاروں میں کسے تکلیف ہے بتلائیے

ڈاکٹر ظفر کمالی
(سیوان)

اُردو نثر میں ظرافت کے مختلف رُجحانات

(پہلی قسط)

اردو کے پہلے ظریف نثر نگار میر جعفر زٹلی ہیں. میر صاحب نے اورنگ زیب عالم گیر اور فرخ سیر تک کا زمانہ پایا اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں مغلوں کے جاہ و جلال کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رہا لیکن اس کے انتقال کے ساتھ ہی اس آفتاب کو گہن لگ گیا. یکے بعد دیگرے نااہل نکمّے اور عیش پرست حکمرانوں کی تخت نشینی کی وجہ سے مغل سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں مرہٹوں کی شورش اور نادر شاہی حملے نے مرے پر سو دُرّے کا کام کیا اور اس عظیم سلطنت کے مینار اور کنگرے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے. نتیجہ یہ ہوا کہ پورا معاشرہ اخلاقی بحران، معاشی ابتری اور بدنظمی کا شکار ہو کر رہ گیا. ان تمام چیزوں کی جھلک جعفر زٹلی کے یہاں ملتی ہے.
میر صاحب کے یہاں ظرافت کے جو نمونے ملتے ہیں ان پر فارسی کے اثرات بہت گہرے ہیں ان کا عام انداز فارسی کے طنز سے متاثر ہے اور طنز میں ذاتیات پر زور دیتے ہیں. یہ فحش گوئی دشنام اور زٹل کی حد تک پہنچ جاتا ہے لیکن ادبی لحاظ سے جو رُجحان اہم ہے وہ تحریف نگاری کی غیر معمولی قوت ہے. رقعہ نویسی اور قدیم مضمون نویسی کے نمونوں میں جو اُنھوں نے "گفتگو نامہ" کی شکل میں پیش کیے ہیں یا "در حسب حال زمانہ می گوید" کے عنوان سے پیش کردہ رقعہ میں یہ صورت دیکھی جاسکتی ہے پیروڈیوں میں ان کی وہ تحریریں بھی شامل ہیں جو ترکاریوں، پھلوں اور میوہ جات کی خدمات میں لکھی گئی ہیں. اِن کے علاوہ "ضمانت نامہ"، "شرح ضامنی"، "شرح نکاح نامہ"، "نسخۂ چورن امساک و ہاضم طعام"، "درباره شرارت" اور شرح بعض اصطلاح احوال می گوید" وغیرہ بھی ان کی تحریفات کے اچھے نمونے ہیں مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے :

> " بعد دعائے گوش و ہوش منتہیاں خدا پہچان و خداوندان کھچڑی و چھپر و چھاون پوشیدہ و مخفی نماند . . . . مثل لکھنؤ بندر یا جا بے پان اڑگئ چٹیا رہ گئے کان (کلیات میر جعفر زٹلی مرتبہ محمد فرحت اللہ بلند شہری. اشاعت ۱۹۲۵ء ص ۱۷).

پرانے زمانے میں مکتب میں استاد شاگردوں کو رقعات اور مضامین لکھنے کی مشق کراتے تھے. جعفر نے "در شکوۂ موسم برسات نوسیع بود" کے موضوع پر رقعہ لکھا اور قلم توڑ دیا لکھتے ہیں :

— — —

"التماس فقیر حقیر نکہدر چکنا چور ساختہ ۔ ۔ ۔ یعنی میر جعفر چرغ چوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
سلامت جوں گڑ گڑاہٹ الرعد وکڑکڑاہٹ البرق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و ہنگام گھٹا گھور صبح و
شام سور دارد ۔ موسم لونڈا باند موسلا دھار بھیگا بھاگ بندہ گود بھاند یلے یار"۔ (ایضاً ص ۲۳)

ضمانت نامے کی تحریف میں "شرح ضامن" کا نمونہ دیکھیے:

"گواہ شد بدنیت ولد بدخواہ، گواہ شد بہ خود ولد بدکردار" (ایضاً ص ۳۱) اسی طرح نکاح نامے اور حکیم کے نسخے کی تحریف اور دربار کا روز نامچہ ہے جن میں فحش وزٹل کے ساتھ سنجیدہ مزاحیہ بیانات بھی ہیں اردو ظرافت کے یہ ابتدائی نمونے ہیں۔ نثر میں جہاں یہ ایک طرف تاریخی اور لسانی اہمیت کے حامل ہیں وہاں تحریف کے حیرت انگیز نمونوں کے ساتھ ساتھ ان میں بے مثال ذہانت کی کار فرمائی بھی نظر آتی ہے۔ جعفر زٹلی کا انداز بیان مضحک ہے۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت وغیرہ سے کام لیا گیا ہے۔ طنز کا دار جہاں فرد پر ہے وہاں سماجی برائیاں بھی زد پر ہیں لیکن اس ابتدائی نثری ظرافت کا رجحان کثیف اور سوقیانہ ہے۔ یہی صورت حال شاہ حاتم دہلوی کے "نسخہ مفرح الضحک معتدل" میں نظر آتی ہے جو جعفر زٹلی کے نسخہ حیرت کا ناقص چربہ ہے۔

نثری ظرافت کے اس رجحان میں کچھ تبدیلی داستانوں کے دور میں آتی ہے۔ "طلسم ہوش ربا"، "داستان امیر حمزہ" "ہزار داستان" اور بوستان خیال وغیرہ میں ہنسنے ہنسانے کے لیے لفظی بازی گری کے بجائے غیر متوازن صورت حال اور مضحک حلیے سے مزاح پیدا کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء اور مزاحیہ کردار پیدا کرنے کی ابتدائی کوششیں انہی داستانوں میں نظر آتی ہیں جس سے نثری ظرافت کا میدان وسیع ہوتا ہے اور ترقی کے آثار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ظرافت کے اعتبار سے ہماری داستانیں ایک ایسا خزانہ کہی جا سکتی ہیں جسے ابھی کھنگالا نہیں گیا ہے۔ ان میں ظرافت کے بازاری اور پست نمونے بھی ملتے ہیں لیکن کہیں کہیں بہت ہی اعلیٰ درجے کی خالص ظرافت بھی ملتی ہے جو مزاحیہ صورت حال سے پیدا ہوتی ہے خاص طور پر عمرو عیار جن کا لقب "ریش تراشندۂ کافراں و سر برندۂ جادوگراں" ہے، کی عیاریوں میں۔

غدر کے بعد کے ہندوستان پر ان ہی داستانوں کا مزاج حاوی نظر آتا ہے جس سے ظرافت میں کوئی خاص کام نہیں لیا گیا۔ اس کی حیثیت مزاحیہ کردار نگاری کو چھوڑ کر بیش تر مزاح برائے مزاح کی ہے اور بعد میں لکھی گئی بعض مختصر داستانوں مثلاً "باغ و بہار" سے "فسانۂ عجائب" تک اردو مزاح کی یہی کیفیت اور صورت و حیثیت نہ صرف برقرار رہتی ہے بلکہ رفتہ رفتہ تقلید اور تکرار کی وجہ سے اپنی اہمیت کھونے لگتی ہے۔ یکسانیت کی بے لطفی سے ظرافت کا رنگ و آہنگ مجروح ہونے لگتا ہے۔

غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ "عود ہندی" ۱۸۶۸ء میں طبع ہوا۔ ان خطوط میں غالب کی ظرافت کے نمونے پہلی بار تحریری شکل میں سامنے آتے ہیں گرچہ ان کی اشاعت سے پہلے ہی غالب کی ذہانت اور ظرافت کی دھوم مچ چکی تھی۔ ان کے یہاں نئی تبدیلیوں، مغرب کی برکتوں اور رہزنوں سے متاثر ہونے کا رجحان ہے۔ عام طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا نصب العین خالص ظرافت ہے اور وہ ہنسنے ہنسانے کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتے لیکن ان کی ظرافت میں کبھی کبھی دردمندی اور شکوے کا رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خطوط غالب میں جو

بے ساختہ شوخی اور ظرافت ہے اس کی مثال اردو نثر اور ظرافت کی ترقی کے باوجود نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ان خطوط میں بلند ادبی معیار کے ساتھ ساتھ غالب کی ذہانت، رنگینی اور بے ساختگی اپنی سادہ مگر پرکار انشاء میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اپنی پریشانیوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں کہ لو غالب کو ایک اور جوتی پڑی، بہت اِتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔"

(اردوئے معلیٰ۔ غالب مرتبہ سیّد عبدالسلام اشاعت ۱۲۸۶ھ ص ۲۶۷ ۔ ۶۸) غالب میں افسانہ نگاری، نقشہ گوئی اور ڈرامائی بیان کی بڑی قوت ہے وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور شوخی اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے خطوطِ غالب سے اردو کی نثری ظرافت، میں معاشرہ نگاری کا ایک نیا رُجحان سامنے آتا ہے۔ وہ محفل کے ساتھ ساتھ زمانے پر بھی چھینٹے اُڑاتے چلتے ہیں۔

غالب کے بعد اردو نثر میں ظرافت کا ایک عظیم الشان خزانہ ہمیں منشی سجاد حسین کا کوروی کے "اودھ پنچ" لکھنؤ میں ملتا ہے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں پورے ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ مغربی اور مشرقی تہذیب میں زوردار ٹکر ہوئی جس میں مشرقی تہذیب مغرب کے ریلے کو برداشت نہ کرسکی اور اس کے پانو اکھڑ گئے اور بقول ڈاکٹر اعجاز حسین ہندوستانیوں کو صاف نظر آنے لگا کہ دنیا بدل گئی ہے پُرانے طرزِ زندگی سے کام نہ چلے گا، نئے اصول مرتب کرنے پڑیں گے۔ وضع قطع، ادب سب کو تبدیل کرنا پڑے گا (نئے ادب رجحانات اشاعت ۱۹۵۱ء ص ۳۹) لیکن اس زمانے میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو بنیادی طور پر روایت پسند اور مشرق پرست ہونے کے باوجود ایک انفرادی نقطۂ نظر رکھتے تھے ایسے لوگوں میں ایک منشی سجاد حسین بھی تھے جنھوں نے انگریزی تہذیب کے مضر اثرات سے لڑنے کے لیے تیر و تلوار کے بجائے طنز و ظرافت کے حربے سے کام لیا۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "اودھ پنچ" کا اجرا کیا اور اس طرح سے مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ نثری ظرافت میں سیاسی، معاشرتی اور سماجی حقیقتوں کی پرخلوص عکاسی کا رجحان سامنے آیا "اودھ پنچ" کا مقصد ملکی معاملات، سیاست، تہذیب و تمدن، ثقافت اور معاشرت کی ترجمانی کرنا تھا۔ اس کے علاوہ مشرق کی پاسداری حاکم طبقہ یا انگریز کے سامنے رعایا کے حقوق کی ترجمانی حکومت کی نکتہ چینی کرنا، والیان ریاست کی خوشامد خوری کا مذاق اڑانا، رؤسا اور حاکم طبقے کے طرفداروں کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرنا، سیاسی معاملات میں اپنی رائے دینا اور ہر قسم کے معاشی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی استحصال کا مقابلہ کرنا اس کا خاص نصب العین تھا۔ منشی سجاد حسین پکے قوم پرور کانگریسی اور آزادی کے پرستار تھے انھوں نے "اودھ پنچ" میں ادبی معرکوں کے علاوہ کسی مخصوص فرد کو براہِ راست نشانہ بنانے سے حتی الامکان گریز کیا۔ ظرافت کو ذاتیات اور ہجو گوئی کی دلدل سے نکالا۔ اسے وسیع بنیادوں اور مغرب کے انداز پر ترقی دینے اور اس سے بڑے کام لینے کی کوشش کی سجاد حسین کا بنیادی مقصد قومی ترجمانی اور معاشرتی عکاسی کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور بیدار کرنا اور بہ حیثیت مجموعی اصلاح کرنا تھا۔ اسی لیے "اودھ پنچ" میں اصلاح پسندی، حب الوطنی، قوم پرستی، قوم بیداری اور غلامی کے خلاف احتجاج کا رُجحان نمایاں نظر آتا ہے۔

منشی سجاد حسین اصلاح اور معاشرتی ترجمانی کے لیے "موافقت لماشاء اللہ" "لوکل" کے کالم میں ملکی و مقامی مسائل پر نشتر زنی کرتے تھے۔ وہ مغرب کے نہیں بلکہ مغرب کی بے جا تقلید کے خلاف تھے۔ انھوں نے البرٹ بل، الحاق اودھ اور انکم ٹیکس کی سخت مخالفت کی۔ اپنے مختلف سیاسی مضامین جیسے "ٹیکس کی دم"، "یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے"، "امیر کابل اور سرکار انگلشیہ" اور "پروفیسر اودھ پنچ کی پولیٹیکل اقلیدس" وغیرہ کے ذریعہ حکومت وقت کی کمزوریوں کو اجاگر کیا اور ظرافت کے پردے میں حکومت پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے سرسید تحریک کی بھی سخت مخالفت کی چونکہ منشی سجاد حسین یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی اصلاح کے پردے میں سرسید ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر ضربیں لگا رہے ہیں اسی لیے انھوں نے سرسید کو "پیر نیچر" کے خطاب سے نواز کر ان کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔ انھوں نے عورتوں کی آزادی اور بے حجابی پر بھی انگشت نمائی کی اور اس سلسلے میں آزادیٔ نسواں کے حامی افراد کا خوب مذاق اڑایا۔ اودھ پنچ نے "بے نمک مرچ کے سالن" اور "ابالی کھچڑی" کے خلاف بھی احتجاج کیا تھا جو دراصل سرسید تحریک کی مقصدیت سے پیدا ہونے والی خشکی کے خلاف احتجاج کا رجحان تھا۔

اسی دور میں انگریزی ایسے کے اثر سے مزاحیہ مضامین لکھنے کا رجحان سامنے آیا ساتھ ہی مزاحیہ ناول نگاری کا رجحان بھی پیدا ہونے لگا۔ ان ناولوں میں معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی نہایت خوبصورتی کے ساتھ کی گئی۔ ایسے ناول نگاروں میں منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین نے "پک وک پیپرز" کے انداز میں "حاجی بغلول" پیش کیا اس کے علاوہ "میٹھی چھری"، "کایا پلیٹ"، "احمق الذین" اور "فانوس" وغیرہ لکھی اس طرح انھوں نے اردو میں مزاحیہ صحافت کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ناول نگاری کے رجحان کو بھی تقویت پہنچائی۔ نذیر احمد جیسے واعظِ خشک نے بھی اپنے ناولوں میں ظرافت کے خوبصورت نمونے پیش کیے۔ ان کا نشانہ عام طور پر مولوی اور سرکاری حکام بنے "مرزا ظاہر دار بیگ" کا کردار معاشرتی طنز کا اچھا نمونہ ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے مضمون نگاری کے علاوہ "فسانۂ آزاد" چار ضخیم جلدوں میں لکھی اور اس میں خوجی جیسا لازوال مزاحیہ کردار پیش کیا۔ ان کے دوسرے ناول "سیر کہسار"، "جام سرشار"، "کامنی" اور چھوٹے ناول "کرم دھم"، "ہشو" اور "پی کہاں" ہیں۔ سرشار تہذیب و معاشرت کے بہت بڑے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طبقے کے کرداروں کی ایک بھیڑ ہے سرشار کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اصلاحی جذبے کے تحت اودھ میں نوابوں کے زوال سے پیدا ہونے والے کھوکھلے پن کا بھرپور مذاق اڑایا۔ "فسانۂ آزاد" کے علاوہ "سیر کہسار" میں بھی لکھنوی معاشرت کے مرقع بھرپور انداز میں موجود ہیں۔ سرشار نے اس معاشرے کی کمزوریوں کو مبالغے کا سہارا لے کر نمایاں کیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنوی نواب زادے دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے باوجود تعلیمی اعتبار سے کس قدر پس ماندہ تھے۔ گفتگو نواب محمد عسکری اور میاں نور کے درمیان ہو رہی ہے:

"نواب عسکری: یہ پہاڑ کیا شے ہے؟ پہاڑ کا نام تو برسوں سے سنتے آئے ہیں مگر کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پہاڑ کوئی وزنی شے ہے۔

نور: وزن تو ضرور ہوگا مگر آخر وزن کی بھی کوئی انتہا ہے۔ بہت وزن ہوگا تو کوئی چھ من کا ہوگا۔

نواب عسکری: نہیں چھ من تو کیا ہوگا اگر واقعی چھ من ہوتا ہے تو لاحول ولاقوۃ. کوئی ایسی وزنی شئے نہیں ہے. لوگ تو ہاتھی اتنے بڑے جانور کو دم پکڑ کر روک لیتے ہیں. ہاتھی اب چھ من سے بھی کم کیا ہوگا؟

لور: کیوں جناب! یہ پہاڑ آخر کوئی پتھر ہے یا سیسہ ہے یا اینٹ کا بنا ہوا ہے یا روئی کا گٹھڑ ہے، یہ ہے کیا؟

نواب عسکری: (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) بھی کوئی بڑی وزنی شئے ہے گو ہم نے پہاڑ کبھی آج تک نہیں دیکھے مگر اونچے اونچے ٹیلے البتہ دیکھے ہیں پہاڑ ان ٹیلوں سے کوئی چوگنے ہوتے ہوں گے، انتہا دس گنے سہی.

لور: جی ہاں بس انتہا ہے، اور کیا کوئی میل بھر کے ہوں گے. لاحول ولاقوۃ." (سیر کہسار جلد اول ص ۳۰، ۱۹۱ء ص ۲۰)

فیض احمد فیض نے سرشار کے فن سے بحث کرتے ہوئے بڑی سچی بات کہی ہے کہ "یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی اس پر رونق اور رنگین محفل کے پاس ہی کہیں پس پردہ موت کی مسلسل اور سفاک ڈگڈگی بج رہی ہے بعینہ یہی تصویر سرشار نے کھینچی ہے." (میزان ص ۱۶۹) اس سلسلے میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، ترمعون ناتھ ہجر اور منشی جوالا پرشاد برق بھی اہمیت کے حامل ہیں.

"اودھ پنچ" کا دوسرا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک جاری رہا جس میں کچھ نئے اور پرانے لکھنے والوں نے ظرافت کے اس رجحان کو نثر میں آگے بڑھایا مگر دوسرا دور پہلے دور کے رنگ کو نبھا نہ سکا. اس کے ایڈیٹر حکیم ممتاز حسین عثمانی خود "منطق آرا بیگم" کے فرضی نام سے لکھنے لگے جس سے یہ نقصان ہوا کہ بجائے صالح ظرافت کے نثر تک میں ریختی کا زور بڑھنے لگا. پہلا دور قوم پرست اور کانگریس کا پرستار تھا دوسرے دور میں مسلم لیگ کی سرپرستی اور رجواڑوں کی خوشامد تھی اختلاف مسلک سے کہیں کہیں تعصب اور تنگ نظری بھی جھلک پڑتی. دوسرے دور میں پہلے دور کی چیزیں بھی اکثر نقل ہوتی رہتیں اس لیے دوسرے دور کا مزاحیہ رجحان ہیں ترقی معکوس کی شکل میں نظر آتا ہے لیکن ان کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود اس دور کے ظرافت نگار ملک کے سماجی سیاسی حالات سے بے خبر نہیں رہے بلکہ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد متوسط طبقے میں پیدا ہونے والی مایوسیوں اور محرومیوں کو بھی اپنا موضوع بنایا. ظرافت کے پردے میں کالے اور گورے کی تفریق پر برہمی کا اظہار کیا. قوم پرستی کی تحریکوں کی حمایت کی. قدیم بندھنوں سے نجات کی ترغیب دی اور تدبر صالح سماجی اقدار کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیا. اس رجحان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ظرافت نگار اصلاح معاشرہ کی شکل میں ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش کررہے تھے.

اسی دور میں اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری یعنی مقصدیت کے خلاف ردِ عمل کے طور پر رومانیت کے رجحان نے جنم لیا جس کے اثرات ہم عظیم بیگ چغتائی کے افسانوں اور ناولوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے کردار اپنی دنیا میں مست ہیں انھیں مقصدیت یا معاشرے کی ترجمانی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں. مرزا غالب کے بعد پہلے پہل خالص ظرافت کا رجحان ہمیں عظیم بیگ چغتائی کے یہاں ہی نظر آتا ہے. انھوں نے مسلم متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کی بڑی دل چسپ ترجمانی کی انھوں نے اپنے "مل بوٹ"، "شریر بیوی"، "کولتار"، "مرزا جنگی"، "کھرپا بہادر" اور "خطوط کی سنتم ظریفی" وغیرہ کے ذریعے قاری کو دل کھول کر ہنسایا. اس ہنسی میں شوخی اور معصومیت کے ساتھ ساتھ فنکاری بھی ہے لیکن ان کا فن اس قدر سادہ اور پرکار ہے کہ اس کی تقلید نہایت مشکل ہے. مزاح کے اس رجحان کو آگے چل کر شوکت تھانوی اور پطرس بخاری نے پروان چڑھایا.

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہمارے ظرافت نگار پہلی جنگِ عظیم کے بعد رونما ہونے والے سیاسی اور سماجی حالات سے بے خبر نہیں رہے جنگِ عظیم کے دوران ہی ہوم رول کی تحریک چھڑی جس سے عوام کی بے داری اور متوسط طبقے کی بے چینیوں کا اندازہ ہوتا ہے ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے نتیجے میں وہاں شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا۔ اس وقت انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہو گیا جس سے مسلمان انگریزوں سے بالکل متنفر ہوگئے۔ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد بے روزگاری میں زبردست اضافہ ہوا۔ روزمرہ کی اشیاء کی قیمتیں خطرناک حد تک بڑھ گئیں جس سے نچلے طبقے کے لوگوں کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ ۱۹۱۹ء میں جلیان والا باغ کا حادثہ رونما ہوا۔ ان تمام وجوہات سے کیا ہندو کیا مسلمان سبھی ایک ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ترک موالات کی زبردست تحریک چھڑ گئی اور ہندوستانیوں نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں آزادی کا مطالبہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی مخالفت میں ہڑتالوں کا بازار گرم ہو گیا اور سب نے مل کر غلامی کا لباس اتار پھینکنے کی پوری کوشش کی ان تمام تحریکات اور رجحانات کا اثر اردو کی نثری ظرافت پر بھی پڑا ۱۹۳۲ء میں "انگارے" شائع ہوا جس نے افسانوں کی دنیا میں ہل چل مچا دی۔ اس میں طنز، استہزا سب کچھ سماجی تنقید کی شکل میں ہے بقول احمد جمال پاشاہ " اس طنز میں جھلّاہٹ ہے۔ اِس کے ذریعہ اخلاقی، قانونی، معاشرتی اور تہذیبی استحصال اور کھوکھلے پن کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ وطن اور قوم پرستی کے سوانگ کا مذاق اڑایا گیا ہے اِس طنز کی حیثیت باغیانہ ادب کے سنگِ بنیاد کی ہے"۔ (مشمولہ "ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر۔ مرتبہ قمر رئیس، سیدعاشور کاظمی ص ۵۲۹) اس کے بعد پریم چند نے اپنے طنز کے شاہکار "کفن" کی تخلیق کی شوکت تھانوی نے "سودیشی ریل" میں ہندوستانی ماحول پر تنقید کے لیے طنز سے کام لیا۔ رشید احمد صدیقی پطرس فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی اور شوکت تھانوی مختلف سماجی رجحانات کی ترجمانی اپنے مضامین اور افسانوں میں کر رہے تھے۔ اس دور کی نثری ظرافت کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بہ یک وقت مختلف طرح کے رُجحانات سامنے آرہے تھے۔ طنز، مزاح اور ہجو کی مروّج اصطلاحوں سے ذرا ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو کہیں جھلّاہٹ ہے، کہیں ہنس ہنس کر مضحکہ اڑانے کی عادت اور کہیں اصلاحِ معاشرہ کی منظم کوشش۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کا جب حکومتِ برطانیہ نے اعلان کیا تو کانگریس نے چند صوبوں میں اپنی وزارت کی تشکیل کی لیکن سیاسی خداؤں کی ناسمجھی کی وجہ سے ہندو مسلم تفریق کی نئی بنیاد بھی پڑ گئی جس کا نتیجہ مسلم لیگ کی طرف سے تقسیم ملک کے مطالبے کی شکل میں سامنے آیا ۱۹۴۲ء میں "بھارت چھوڑو تحریک" کا نعرہ بلند ہوا۔ ۱۹۴۳۔۴۴ء کے قحطِ بنگال نے ہندوستانی باشندوں کو ہلا کر رکھ دیا قومی زندگی پر دوسری جنگِ عظیم کے نہایت ہولناک اثرات مرتب ہوئے۔ بے روزگاری، رشوت خوری، چوربازاری نے اپنے پنجے تیز کر لیے۔ آزاد ہند فوج کا قیام اور ہندوستانی بحریہ کی بغاوت بھی اس دَور کے اہم واقعات ہیں۔ اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات نے ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھایا۔ ان تمام حالات سے متاثر ہو کر سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی کنھیا لال کپور، اور فکر تونسوی وغیرہ نے اپنے افسانوں، مضامین اور کالموں میں سماجی بے چینی، سماجی استحصال، غریبی بھوک غلامی، طبقاتی کشمکش، سیاسی انتشار، سخت گیری، تنگ نظری، تعصب، فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکیوں، جنسی گندگی اور جنسی گھٹن کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ شفیق الرحمن کے یہاں ان کے مزاحیہ افسانوں اور تحریفوں میں یہ سب کچھ ہے مگر بین السطور میں ہے اردو ظرافت میں یہ بالکل نیا رجحان تھا۔

جہاں قدر چغتائی (بھوپال)

کالا برقعہ نیلے پٹے

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم بھیڑ بھرے بازار کی سڑک سے گزر رہے تھے۔ ایک اندھا فقیر ہمارے پاس سے گزرا۔ وہ آواز لگا رہا تھا۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا۔ اس فقیر کی آواز جب ہمارے کان میں پہنچی تو ہماری آنکھیں کھل گئیں اور ہمارے سامنے بے شمار آنکھیں آگئیں۔ شربتی آنکھیں، شرابی آنکھیں، شرمیلی آنکھیں، شبنمی آنکھیں، شربتی آنکھیں، خشمگیں آنکھیں، چلبلی آنکھیں، شرمسار آنکھیں، شرمگیں آنکھیں، سرمگیں آنکھیں، سرمئی آنکھیں نرگسی آنکھیں، جادوئی آنکھیں، شاندار آنکھیں، جاندار آنکھیں، شریر آنکھیں، شیطان آنکھیں، شرپسند آنکھیں، برہم آنکھیں، پرآشوب آنکھیں، چبھتی آنکھیں، بے تاب آنکھیں، ڈبڈبائی آنکھیں، بے چین آنکھیں، پتھرائی آنکھیں، شہ زور آنکھیں، شہ باز آنکھیں، شاطر آنکھیں، شکی آنکھیں، ساز باز آنکھیں، سرشار آنکھیں، بھرائی آنکھیں، دلبر آنکھیں، دلنواز آنکھیں، دل فگار آنکھیں، دلکش آنکھیں، دلگداز آنکھیں، دشمن دل آنکھیں، دشمن جاں آنکھیں، بے زباں آنکھیں، بے جان آنکھیں، بے مروت آنکھیں، دشمن جان آنکھیں، بے زبانی آنکھیں، بے نیاز آنکھیں، لجائی آنکھیں، جھلملائی آنکھیں، معصوم آنکھیں، گنہگار آنکھیں، خاموش آنکھیں، بے قرار آنکھیں، چنچل آنکھیں، چالباز آنکھیں، دوربیں آنکھیں، دل نشیں آنکھیں، بے حیا آنکھیں، بے حجاب آنکھیں، بے مثال آنکھیں، لرزتی آنکھیں، گاتی آنکھیں، تیر و کمان آنکھیں، مسکراتی آنکھیں، منہ چڑاتی آنکھیں، غزالی آنکھیں، فلانی آنکھیں، بیمار آنکھیں، پراسرار آنکھیں، خمار آلود آنکھیں، گھبرائی آنکھیں، بھرآئی آنکھیں، خونی آنکھیں، خونخوار آنکھیں، بھیگی آنکھیں، نیلی آنکھیں بادامی آنکھیں، چمکتی آنکھیں، جھپکتی آنکھیں، چغل خور آنکھیں، چڑچڑائی آنکھیں۔ کہاں تک نام گنوائے جائیں۔ ان سب سے سوا، سب سے پرانی میر تقی میر والی نیم باز آنکھیں اور پھر اس فقیر کی بے نور آنکھیں ... آنکھوں کی فہرست یہاں ختم نہیں ہوتی ہے۔ ہم نے ساری دنیا کی آنکھیں تو دیکھی نہیں ہیں سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہماری آدھی سے زیادہ اچھی ساتھی کی وہ دو آنکھیں جو ہماری نگرانی کرتی رہتی ہیں وہ اس اوپر درج شدہ مختصر فہرست سے بالکل الگ ہیں۔ شاید دنیا والے ہماری بیگم کی آنکھوں کا نام دھرنا ہی بھول گئے۔ مگر ہم ان کو بہت اپنا۔ سے نیلی پیلی آنکھوں والی بیگم کہتے ہیں۔ اور اب جب ذکر آگیا ہے بیگم کا تو بات پہنچے گی اب بڑھاپے تک۔ یہاں ایک بات کہنا ہم ذرا ضروری

لگیں تو ہم پر خفا ہوئیں۔ کہتے بھی نہیں کہ بغیر برقعہ کے گاڑی میں بیٹھی جارہی ہیں۔ پھر دروازے سے گھر کے اندر، پھر دروازے پر، غرض کالا برقعہ پہن کر دھم سے ٹیکسی میں ہم کھڑے دیکھتے رہے کہ ہوم ڈور ریس ختم ہو تو ہم گاڑی میں بیٹھیں۔ اتنے میں ٹیکسی سے آواز آئی اب بیٹھو بھی ورنہ ہمیشہ کی طرح مجھ پر دیر کرنے کا الزام لگاؤگے اور تم تعذیہ برقعے کہاں دیکھا ہوگا۔ چھوٹی بھابی میرے لیے حج سے واپسی پر عرب سے لے کر آئی تھیں دو دن پہلے ہی دے گئیں۔ خدا سب کو میرے جیسی بھابی دے۔ دنیا میں وہ پہلی بھاوج ہے جو نند سے اتنا پیار کرتی ہے۔ ہم خاموش پاس بیٹھے ان کے عربی اسٹائل کے سیاہ برقعہ پر نظر جمائے رہے۔ نظر نیچی کی تو آنکھوں میں نند راہبن کی نیلے پٹے والی ہوائی چپل کے پٹے چمکنے لگے۔ اسپتال پہنچے تو یہ کالا اور نیلا رنگ آنکھوں میں بس چکا تھا۔ ڈاکٹر کے کمرے کے آگے کا یہ عالم کہ کالی گھٹا جو اس دن چھائی ہوئی تھی اس کا کوئی ٹکڑا ٹوٹ کر ڈاکٹر کے کمرے کے سامنے گر گیا ہو۔ شور و غوغا، چیخ پکار۔ کسی کی گود میں بچہ بلبلاتا ہوا تو کوئی پیڑھ موڑ کے بچی کو دودھ پلاتی ہوئی۔ ایک ہی صف میں نظر آئیں یہ بیچاریاں ساری۔ بیگم بھی سڑک سے اتر کر اس گھٹا میں جا ملیں آسمان پر جب گھٹاؤں سے ٹکڑے آپس میں مل جاتے ہیں تو ان میں امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ انتظار یار میں عاشق عمریں گزار چکے ہیں مگر ہمارا معاملہ دنیا میں پہلا تھا۔ یہ تھا انتظار ہمراہ یار والا کیس ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ انتظار یار ہو یا یار کے ساتھ انتظار ہو اصل میں دونوں ایک ہیں۔ کافی انتظار کے بعد کسی نے ہمارا نام پکارا۔ ہم دوڑتے ہوئے ڈاکٹر کے کمرے میں چلے گئے۔ ڈاکٹر کے کمرے سے جو نکلے تو آنکھوں کا یہ عالم کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ ڈاکٹر نے ایسی دوا آنکھوں میں ڈال کر جانچ کی کہ ہماری پتلیاں پھیل گئیں۔ ہم گھٹاؤں سے ذرا دور جا بیٹھے۔ کوئی پچیس منٹ بعد ہمیں ایسا لگا کہ کوئی دلہن برقعہ میں سر جھکائے ہماری راہ دیکھ رہی ہے۔ بھوک الگ لگ رہی تھی۔ ہم نے لپک کر دلہن کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور سڑک پر آ کھڑے ہوئے۔ اور ایک گزرتی ٹیکسی والے کو آواز دی وہ رکا نہیں۔ اتنے میں اس کالے برقعہ اور نیلے پٹے نے کہا۔ بیٹا پاس ہی تو گھر ہے پیدل آئے ہیں پیدل ہی چلے جائیں گے۔ وہی چھوٹی بھابی والا کالا برقعہ۔ وہی نیلے پٹے والی عذرا بہن کی ہوائی چپل۔ سوچا ڈاکٹر نے کہیں دماغ والی دوا تو ان کی آنکھوں میں نہیں ڈال دی جس نے رشتوں کا احساس ہی ذہن سے زائل کر دیا۔ اتنے میں ایک نو سال کا بچہ دوڑا ہوا آیا اور بہت غصے میں بولا۔ نانی یہ بڈھا تمہیں پکڑ کر کہاں لے جا رہا ہے اور اپنی نانی کی کلائی چھڑا کر کہیں چلا گیا۔ ہم حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے کہ دوسری آواز نے ہمارا دل دہلا کر رکھ دیا۔ وہ کب کی چاہنے والی تھی جس کی کلائی بڑے پیار سے پکڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہاں تم کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔ میرے نانا جان ٹھیک ہی کہتے تھے کہ اگر مرد بہت بوڑھا ہو جائے تو وہ اور ندیدہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جام محبت میں بہت نازک وقت میں بال آگیا۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے حق میں صحیح فیصلہ کریں گے۔ ہمارے ذہن میں آج بھی اس فقیر کی آواز تازہ ہے۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا۔

غزلیں

منہ پھٹ ناگپوری

سیر و تفریح نہ شاپنگ نہ پکچر وکچر
جیب خالی ہو تو چاہت کا مزا مت پوچھو

اپنے شاگرد بھی کترا کے گزر جاتے ہیں
چائے اور پان کی عادت کا مزا مت پوچھو

بے بلائے ہوئے مہمان چلے آتے ہیں
آنے والوں کی ضیافت کا مزا مت پوچھو

قوم کی قوم زمیں بوس ہوئی جاتی ہے
ایک جاہل کی قیادت کا مزا مت پوچھو

"ہم کسی کے نہ ہوئے، کوئی ہمارا نہ ہوا"
منہ پھٹ اپنی بھی حماقت کا مزا مت پوچھو

تجھ کو خبر بھی ہے کہ ترے انتظار میں
گھنگھرو سے بج رہے ہیں دلِ بے قرار میں

موٹرس کا شمار ہے سائیکل سوار میں
جس کو دیا تھا جن کے وہ پھرتا ہے کار میں

اب اس کا سارا گھر ہے دھوئیں کے حصار میں
ساری کمائی پھونک دی جس نے سگار میں

لوگوں نے میرے فوٹو لگائے مکاں مکاں
اور میری ہڈیاں بھی نہیں ہیں مزار میں

دولت ملی تو پاؤں زمیں پر نہیں رہے
بے اختیار ہو گئے وہ اختیار میں

منہ پھٹ اب احتیاط ضروری ہے آج کل
لوگوں نے باندھ رکھی ہے بارود ہار میں

●

افتخار وصی بیتیا (بہار)

دل میں ڈر اللہ کا یوں بھی بسانا چاہیئے
پڑھ کے بسم اللہ پیمانہ اٹھانا چاہیئے

عشق فرمانے کی خاطر لازمی ہے تجربہ
بال جب پکنے لگے چکر چلانا چاہیئے

نوکری کے واسطے اب ڈگریوں کی کیا غرض
نوکری کے واسطے روپیئے دکھانا چاہیئے

کالجوں میں پڑھنے سے بہتر ہے سڑکیں ناپنا
طالبانِ علم کو یہ گُر سکھانا چاہیئے

فوج میں بھرتی کی خاطر نونہالوں کو یہاں
تاڑ کا شربت بلاناغہ پلانا چاہیئے

بزم شعری میں برائے واہ واہی افتخار
شعر غیروں کا کھلے بندوں سنانا چاہیئے

●

روشن علی کرنل کریم نگر

اب سمجھ میں آگیا کیونکر ملا اتنا جہیز
اونٹ کا قد، رنگ کالا منہ پہ داغاں دیکھ کر

چار بیوی، نوکری نئیں، عمر لمبی بھوت ہے
کہہ دیا پامسٹ اپنا ہاتھ بایاں دیکھ کر

وہ تو ماہر ہو گیئں جوڈو کراٹے کھیل میں
کانپتا ہے دل میرا اب اُن کے شاناں دیکھ کر

آپ تو لے جا رہے تھے جام کھانے باغ میں
اُڑ گیا کرنل وہاں سینہ بھی کرچھاتاں دیکھ کر

فاطمہ تاج
(حیدرآباد)

"حبیب ضیاء اور ہم"

دل نے چاہا کہ "ہنس کی چال" چل کر دیکھ لیں شاید ہم کامیاب ہو جائیں کیوں کہ کامیابی جب "کوے کے کالے پر" چوم سکتی ہے تو کیا ہمارے قدم نہیں چوم سکتی . . . . ؟ اب ہم آگے بڑھتے ہیں بالکل ہنس کی طرح . . . . کیوں کہ ذکر "اس پری وش" کا ہے جس کے طنز و مزاح سے بھرپور مضامین پڑھتے ہوئے، سنتے ہوئے ہم ہندوستان کی "گولڈن جوبلی" کی سرحد پر پہنچ چکے ہیں۔ سب سے پہلے محفلِ خواتین کے ایک ادبی اجلاس میں (جب ہم شاید دوسری یا تیسری دفعہ شریک ہوئے تھے) اعلان ہوا کہ . . . . آج حبیب ضیاء کا مضمون ہوگا . . . . ہم سوچنے لگے کہ محفل خواتین میں یہ کون صاحب ہیں جو شرکت کے ساتھ ساتھ مضمون بھی پڑھیں گے، اُس وقت تک ہمارا شمار اُن کے شناساؤں میں نہیں تھا۔ ایک صاحب کو دیکھا تو ہم یہ سمجھے یہ ہیں شائد حبیب ضیاء . . . . لیکن بعد میں راز آشکار ہوا کہ یہ مقامی چوکیدار ہے . . . . ہم اپنی اضطرابی کیفیت کو اپنے اندر دبائے سکون سے بیٹھے رہے اور جب حبیب ضیاء کی رونمائی ہوئی تو چونک پڑے اپنی ذات میں شرمندگی کا احساس بم کی طرح پھوٹ گیا کہ ہم ناحق اتنی سادہ لوح معصوم شخصیت کو خواہ مخواہ خاتون کے بجائے "صاحب" بنا بیٹھے۔ اور پھر ہم اُن کی سنجیدگی پر غور کرنے لگے۔ خواتین کی محفل میں نقرئی قہقہے گونج رہے تھے لیکن صاحبِ مضمون کے چہرے پر مسکراہٹ کا شائبہ بھی نہیں جب کہ ہم ہنسنے کے نہ صرف ماہر ہیں بلکہ شرط لگائے بغیر بھی ہنستے رہتے ہیں، عمرِ دراز کی طرح لمبی سی چوٹی خالص ہندوستانی انداز میں گوندھی ہوئی اور ہندوستانی سوت کی قیمتی ساڑی میں ملبوس ہیں یہ محترمہ بڑی اچھی لگیں (وہ ہیں آج بھی اُسی طرح اچھی لگتی ہیں) ان کی سنجیدگی ہمیں بار بار جھنجھوڑتی رہی مضمون کیا تھا ایک ہدایت نامہ تھا میزبانی کے فرائض انجام دینے والوں کے لیے۔ عنوان تو یاد نہیں بہرحال بن بلائے مہمانوں کا ذکر تھا مضمون میں "بلائے جان" سے نجات پانے کے کچھ نسخے تجویز کئے گئے تھے۔ ہنس تو ہم بھی رہے تھے لیکن اُن کے مزاح میں چھپے ہوئے اُس اصلاحی انداز کو اپنے اندر گھونٹ گھونٹ اُتار رہے تھے ہمارا خیال ہے کہ محترمہ نے اصلاحِ معاشرہ کے لیے اپنے اس سلجھے ہوئے ادبی انداز کو اپناتے ہوئے اس مہم کو خاموشی سے جاری رکھا ہے جسے لوگ تنظیموں میں بٹ کر، کرسیوں سے ہٹ کر، میدانِ جنگ میں کٹ کر بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔

ہم مختلف جلسوں میں اُنھیں سُن کر، مختلف رسالوں و اخبارات میں پڑھ کر ہنستے رہے ہیں "دلِ ناداں" ان کی دانائی کا معترف ہے۔ (اسی لیے تو ہم یہ مضمون لکھ رہے ہیں)۔

"نام رکھائی" کے قابلِ اعتراض طریقوں پر انھوں نے بڑے ہی پُرمزاح انداز میں احتجاج کیا ہے۔ مثلاً بچواس، ساٹھ سالہ خاتون کی عرفیت "بے بی" اور کم سن لڑکوں کی عرفیت "بابا" اور اسی کے ساتھ مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ کا اشارہ بھی دعوتِ فکر دیتا ہے۔

"لاڈ بازار" میں دلربا انداز میں دکانداروں کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چوڑیاں پہننے والی "کم عقل" خواتین کے شرمناک واقعات پر انھوں نے قلم سے بہت تیر چلائے، بہت تیر چلائے خدا کرے یہ تیر نشانے پر لگ جائیں۔ . . . .

"بچہ باہر گیا ہے" میں باہر جانے والے "بچے" اور اندر رہنے والے "بڑوں" کی اصراف سے بھرپور خوشیاں بھی شاندار طریقے پر نذرِ قلم کی گئی ہیں۔ فلیٹس میں رہنے والے لوگوں کے مسائل و احساسات کا ذاتی تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو منظر نامہ پیش کیا ہم تو عش عش کرتے رہ گئے۔ عید کے موقع پر خاتونِ خانہ کی، شیر خرمہ کی، اور باہر سے آنے والے "حقوں" کی عکاسی بھی قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مولوی، مُلا، تعویذ، گنڈے اور سماج کے روایتی رشتوں میں جکڑی رہنے والی خواتین کو بھی انھوں نے نہیں بخشا، مشترکہ جلسوں کی روداد تو اس قدر تفصیل سے لکھی ہے کہ ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

آج کل کھانے کی دعوتوں کے مظاہرے تہذیب کا دامن کس طرح داغدار کر رہے ہیں یہ بات بھی محترمہ نے کئی کھانے کی پُرتکلف دعوتوں میں شریک ہونے کے بعد بڑی بےتکلفی سے اپنے ایک مضمون میں کہی ہے اور ان کا یہ مضمون ہمیں اس وقت یاد آجاتا ہے جب ہم بھی کسی کھانے کی دعوت میں شریک ہوتے ہیں اور بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔

حبیب ضیاء نام ہے اُس انجمن کا جس کی ذات میں زندگی کے مختلف شعبوں میں کلبلانے والا انتشار، مفکروں، دانشوروں کے ذہنوں میں زلزلے پیدا کر دیتا ہے۔ ہم نے کئی بار چاہا ان کا آنچل خواہ سوتی ہو یا ریشمی تھام کر ہم بھی اُن پُرخار راستوں پر اُن کے ساتھ چلیں جہاں اصلاحی انداز لیے ہوئے ان کا قلم معاشرہ کی رہنمائی کرتا ہے پُرمزاح انداز میں طنز کے تیر چلانا اور سماجی برائیوں کی نشاندہی کرنا یقیناً خاموش انقلاب کی تحریک کی ضمانت ہے۔

ہم نے بہت سوں سے یہ دعا سنی ہے بلکہ کئی لوگوں کو دُعا بھی دی ہے اللہ توفیق دے ان دعاؤں کی قبولیت کا ایک بے مثال ثبوت "صاحبِ توفیق" یعنی حبیب ضیاء کی ذات ہے جہاں ان کے ہمسفرِ حیات توفیق صاحب نہ صرف ان کے ہمقدم ہیں بلکہ ہر لمحہ ان کے معاون بھی۔ خوش نصیب حبیب ضیاء کے خوش کر دینے والے مضامین ان کی خوش اسلوبی اور خوش مزاجی کی غمازی کرتے ہیں۔ ہمیں تنہائی میں جب اُداسی کی پرچھائیاں زیادہ نظر آنے لگتی ہیں تو ہم یا تو ان کا کوئی مضمون پڑھ لیتے ہیں یا انھیں یاد کر لیتے ہیں، کچھ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں کہنا سننا اچھا لگتا ہے، ہے نا ؟؟؟

۵۷

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم (جگتیال)

آم تو آم گٹھلیوں کے بھی دام

آم پھلوں کا بادشاہ ہے۔ اس لیے رعایا اسے شوق سے کھاتی ہے اور سر آنکھوں پر لگاتی ہے۔ آم نہ صرف بادشاہ ہے بلکہ بادشاہ گر ہونے کی تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور موسمی صلاحیتیں اس میں موجود ہیں۔ تبھی تو یہ عوام میں یکساں لذیذ ہے۔ ہر مذہب، ہر زبان اور ہر علاقے کے لوگ اسے قومی میوہ سمجھ کر کھاتے ہیں اور گٹھلیوں کو قوم کے نام معنون کرتے ہوئے انہیں سڑکوں، بازاروں اور گھروں [illegible] ہر طرف بکھیر دیتے ہیں۔

مرکزی حکومت کے داخلی انتشار، ریاستی سطح کے سیاسی تناؤ اور بین الاقوامی سطح پر نیوکلیر دھماکوں کا اثر کسی پہ ہو نہ ہو مگر آم کی فصل پر اس کا اثر ضرور ہوا ہے۔ اور یہ امر طے ہے کہ آم اب عام نہیں رہے بلکہ خواص الخاص ہو گئے ہیں۔ موسم کے ابتدائی دنوں میں آم کی قیمت پر ایسا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ لوگ تلملا اُٹھے۔ کچھ لوگوں نے گھروں میں صرف آم کی تصویر رکھنے پر اکتفا کیا ہے اگر بچے آم کے لیے ضد کریں تو انہیں کم از کم آم کی تصویر دکھائی جائے تاکہ وہ اپنا [illegible] نہ دیکھ سکیں۔ کچھ مقامات پر تو آم رمضان کے چاند کی طرح متنازعہ ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس نے آج آم دیکھا ہے تو دوسرے نے اس کی تردید کر دی کہ بھلا اتنا آسانی سے آم کیسے دکھائی دیں گے۔ وہی اختلاف جو رمضان کی عید کے چاند کے سلسلہ میں رونما ہوتا ہے۔

ہم نے ایک تاجر سے آم کے بھاؤ یوں ہی دریافت کیے تو اس نے ہمیں سر سے پیر تک گھورا اور بڑی بے پروائی سے جواب دیا کہ ایک روپیہ، دو روپے اور دس روپے ـــــ! تاجر کا ٹیلیگرافک پیام ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ ہم نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے آم کو دیکھنے کا ایک روپیہ، سونگھنے کے دو روپے اور خریدار نے [illegible] دس روپے وصول کیے جائیں گے۔ آم کے سائز کی ذمہ داری تاجر پہ عاید نہ ہوگی بلکہ خریدار کی قسمت پہ منحصر ہوگی۔ اگر آپ نے آم خرید لیا ہے تو پھر آپ اس کے مختارِ کل ہو جائیں گے۔ اسے دیکھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں اور حسبِ منشا کھا کر باقی آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ بھی کر سکتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

کبھی زمانے میں لوگ صرف آم سے مطلب رکھتے تھے۔ پیڑ گننے سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا چوری چھپے باغ میں جا کر آم کھانا اس کے مزے کو دوآتشہ بنا دیتا تھا۔ اس دور میں گٹھلیوں کے دام لیے جاتے تھے اور آم بالکل مفت سربراہ کیا جاتا تھا تاکہ تجارت کا بھرم قائم رہے اور بین الاقوامی مارکٹ میں آم کی ساکھ ملک کی کرنسی کی

طرح متاثر نہ ہو جائے تبھی تو لوگ آم نہ صرف کھاتے تھے بلکہ چوستے بھی تھے اور ناشتہ میں روٹی کے ساتھ آم کھانے کا رواج مجرد ہچکا تھا۔ یہ سب باتیں اب قصۂ پارینہ ہوگئی ہیں۔

آم کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ (ان میں لنگڑا آم بہت مشہور ہے) آم کھانے اور چوسنے کے بھی ہوتے ہیں جس ملک میں آم نہیں ہوتے وہاں کے حکمراں عوام کو چوستے ہیں۔ کچے اور کھٹے آم کا آچار بنایا جاتا ہے تاکہ بدمزہ کھانوں کی تلافی ہو سکے اور صحت متاثر نہ ہونے پائے۔ آم کا شربت اور آئسکریم کا کوئی جواب نہیں ہے بعد کی گرمی دور کرنے کے لیے آم سے آب شورا تیار کیا جاتا ہے جو دھواں دھار ہوتا ہے آم زیادہ کھانے سے بیت الخلا سے رشتہ استوار ہوتا ہے اور آدمی نہایت خشوع و خضوع سے رفع حاجت کا عمل دہراتا رہتا ہے اسی خاصیت کی وجہ سے انگریز آم کو MANGO کہتے ہیں اس ایک لفظ میں دو لفظ جڑے ہوئے ہیں اور یہ دو لفظ آم کے کثرت استعمال کے نتیجہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں!

غالب کو جام کے ساتھ ساتھ آم بہت مرغوب تھے۔ پینے کے لیے جام اور کھانے کے لیے آم مخصوص تھے۔ اس لیے غالب کو کھاتے پیتے شاعر مانا جاتا تھا اسی لیے ان کی شاعری میں جام کی تلخی اور آم کی مٹھاس پوشیدہ ہے۔ جام اُٹھا کر اور آم کھا کر شاعری کرنا کوئی غالب ہی سے سیکھے تبھی تو ان کا اندازِ بیاں دیگر سخنورانِ ادب سے کچھ اور ہی ہے۔ غالب کی پوری شاعری جام اور آم کے گرد ہی گھومتی ہے۔ ریسرچ اسکالرز کے لیے یہ بہترین موضوع ہے جس پر کئی ایک مقالے کمپیوٹرائزڈ کروائے جا سکتے ہیں۔

غالب کے زمانے میں گدھے آم نہیں کھاتے تھے بلکہ صرف گلگلے کھاتے تھے لیکن آج کل گدھے آم کھانے لگے ہیں۔ گلگلوں کا رواج کم ہوگیا ہے۔ آم کی قلت کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ چوں کہ غالب کا تعلق اقلیتی طبقے سے اور ان کی شاعری اقلیتی زبان میں ہے اس لیے مخالف اقلیت گروہ نے منصوبہ بند طریقے سے غالب کے دو سو سالہ جشنِ پیدائش کے موقع پر آم کی فصل کو بری طرح نقصان پہنچایا ہے تاکہ طرف دارانِ غالب اپنے محبوب شاعر کی دو سو سالہ برتھ ڈے کے موقع پر ان کے پسندیدہ میوے سے محروم رہیں۔ اس سلسلے میں اعلیٰ سطح پر تحقیقات کر کے خاطیوں کو سخت سے سخت سزا دلوائی جانی چاہیئے کیا غالب اکیڈمی اپنے طور پر یہ چھوٹا کام بھی مکمل نہیں کر سکتی ہے؟

غزلیں

ایک شاعر کے تخلص سے تقدس ٹوٹتا
ماں، بہن، بیٹی بھی کہتی اُسے شوہر دیکھو

غیر تو لوٹ گئے لُوٹ کے بھارت میرا
لُوٹتا ہے اب اُسے اس کا ہی لیڈر دیکھو

ہے دواخانہ کا یہ دستور نرالا کتنا
کہنا پڑتا ہے یہاں بیوی کو سسٹر دیکھو

اُن کی آنکھوں سے مجھے پینے کی جو عادت ہے
دل کو بہلاتا نہیں کوئی بھی ساغر دیکھو

ساری دنیا کو دیا درس منزہ نے، مگر
اُس کی اَن پڑھ رہی اولاد سراسر دیکھو

از ڈاکٹر ہادی منزہ

رہنماؤں کے دماغوں پر لگا جو زنگ ہے
دیکھ کر کرتوت ان کے قوم ساری دنگ ہے

کل تلک جن کو سمجھتا تھا، ہے دشمن قوم کا
آج شامل وہ حکومت میں انہیں کے سنگ ہے

بانٹ لینے میں وزارت، کچھ کمی جو ہو گئی
چھڑ گئی اک دوسرے سے دیکھئے گا جنگ ہے

ایک ہے آواز ان کی ساز نہ تو ایک ہے
کوئی دھیڑا ہے بجاتا کوئی تو مردنگ ہے

دل کروڑوں توڑ ڈالے، توڑ کر مسجد کو اک
اس سبب سے ہو گیا وہ موجبِ صد ننگ ہے

تم معافی چاہتے ہو چھ ڈسمبر کی تو کیا
تھا جو حاکم چپ ہے اب تک دل جو اس کا سنگ ہے

جھوٹے وعدوں پر نہ ان کے قوم دھوکے کھائے گی
لیڈروں کی چال بازی سے ہوئی جو تنگ ہے

جلد ہی پھر اک الکشن ہم پہ لادا جائے گا
بن کے ہو آئی ہے سنسد کیونکہ یہ بھی ہنگ ہے

خون دینے والوں سے پوچھی وفاداری گئی
یہ حکومت کرنے کا ان کا عجب ہی ڈھنگ ہے

●

فرید سحر
نرساپور

جنتا کے دل میں خود کو بسانا ہے دوستو
وعدوں سے جھوٹے اس کو لبھانا ہے دوستو

استاد بھی شریک ہیں محفل میں کیا کروں
اُن کی غزل ان ہی کو سنانا ہے دوستو

چشمہ لگا کے بیٹھا ہے آنکھوں کا ڈاکٹر
آنکھیں اُسی کو اپنی دکھانا ہے دوستو

چوروں کو اپنا نیتا بنانا ہے دوستو
مسند پہ لا کے ان کو بٹھانا ہے دوستو

کیا عجیب دور ہے اب کیا بتائیں ہم
کاکا گدھے کو کہہ کے بُلانا ہے دوستو

خطرے میں اپنی پڑ گئی ہے شاعری سحر
شعروں کے بدلے جوک سنانا ہے دوستو
Joke

بی کرشنا مورتی
انگریزی سے ترجمہ:
ڈاکٹر میر گوہر علیخاں

سِتارے کیا کہتے ہیں؟

علم نجوم پر دیوانگی کی حد تک میرا ایمان ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ہماری زندگی میں ہونے والے واقعات پر ستارے سیارے ضرور بہ ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے میں اہم معاملات "راملو جسیار" سے مشورہ لیے بغیر انجام نہیں دیتا۔ میں تو کیا قصبہ پودو کنائی کے سارے لوگ ان کے علم نجوم کے تبلائے ہوئے حساب پر ہی چلتے ہیں۔ اور ان کی شہرت عوام و خواص سب میں ہے۔

ان کے انتقال کے بعد چند مہینوں میں میں نے گریجویشن کی تکمیل کرلی۔ اور ایک خانگی ملازمت کے لیے مدراس آبسا۔ اب راملو جسیار کے نہ ہونے سے ہمارے خاندانی معاملات کے طے ہونے میں بڑی دقتیں پیش آنے لگیں۔ ایک خلا سا پیدا ہوگیا لیکن بہت جلد ہماری ماتاجی نے اس کا حل ڈھونڈ ہی نکالا۔ اب کسی کام کے کرنے میں اڑچن پڑتی تو ماتاجی مجھ سے کہتیں کہ میں دو چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر "ہاں" یا "نہ" لکھ دوں۔ ان پرچیوں کو سلیقہ سے موڑ کر ہمارے چھوٹے لڑکے کے سامنے رکھ دیا جاتا کہ "بیٹا۔ ان میں سے کوئی ایک پرچی اٹھالو"۔ اب وہ کام انجام دیا جاتا جس کا حکم اس پرچی کے ذریعہ ملتا۔ کچھ دنوں تک تو یوں ہی دم چلتا رہا۔

شہر مدراس میں روزناموں، ہفتہ وار پرچوں اور ماہ واری رسالوں کی کیا کمی؟ اور سب سے بڑی خوبی ان پرچوں میں یہ ہے کہ ان میں قسمت اور ستاروں کے بارے میں کالم ضرور مل جاتے ہیں۔ اب مختلف قسم کے انگریزی اور تامل پرچے میرے گھر میں جمع ہونے لگے۔ ان کے ہفتہ وار کالموں میں کی گئی پیشن گوئیوں پر میں بڑی ایمانداری سے عمل پیرا ہونے لگا۔ اگر یہ پیشن گوئی ہوتی کہ اس ہفتہ موٹر چلانے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے تو میں اپنے آفس کو بذریعہ بس یا پیدل ہی چلا جاتا۔ کبھی یہ ہدایت ملتی کہ بیماری سے بچنے کے لیے مسالہ دار کھانے نہ کھائے جائیں تو سارا ہفتہ میں سادی غذا ہی کھاتا رہتا۔ بلکہ اکثر "اپاسوں" سے کام چلا لیتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ہم CANCERANIAN کو جوتشی جی متنبہ کرتے ہمسایہ سے یا بیوی سے جھگڑا ہونے کا احتمال ہے تو احتیاطاً میں "مون برت" رکھ لیتا جب تک کہ ہفتہ مکمل نہیں ہو جاتا۔ ادھر ہماری شریمتی جی مجھے تکتی رہتیں کہ۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں۔

الغرض میرے پسندیدہ پرچے VARA MALAR نے مجھے آنے والے حادثات سے بہت سنبھال رکھا تھا۔

ایک دفعہ اس ماہ نامے نے میرے بارے میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ دوشنبہ کے دن کسی عورت کے ذریعہ مجھے کچھ رقم ملنے والی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ تپاجی کی ایک پھوپھی زاد بہن ہیں۔ وہ ایک مالدار گھرانے میں بیاہی گئی ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے پتی ساس اور سسر کا یکے بعد دیگرے تھوڑے ہی عرصے میں دیہانت ہو گیا۔ اب یہ تنہا کئی مکانات، زمینات اور دو دکانات کی مالک بن گئیں۔ ہیں تو عورت ذات مگر قابل اتنی کہ بڑی عمدگی سے یہ سارا کاروبار سنبھال رکھا ہے۔ میرا خیال فوراً ان کی طرف گیا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی رہتی ہیں "بیٹا! تمہارے سوا اب میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ میرے بعد تم ہی اس ساری جائیداد کے مالک ہونے والے ہو۔ میرا ذرا خیال رکھنا۔" کبھی کبھار مجھے اور میری شریمتی جی کو قیمتی تحفے تحائف بھی بھیجا کرتی ہیں۔ گزشتہ سال جب میں ان سے ملنے گیا تھا تو کہہ رہی تھیں "بیٹا! آج کل میری طبیعت اچھی نہیں رہتی۔"

پیر کی صبح آفس جانے سے پہلے میں نے اپنی شریمتی جی سے کہا "شاید آج شام مجھے اپنی موسی کے گاؤں جانا پڑے۔ تم ذرا تیار رہنا۔" مجھے یقین تھا کہ دن کے کسی حصے میں بھی ان کے دیہانت ہو جانے کا ٹیلیگرام آسکتا ہے۔ ایسے بُرے خیالات دل میں لانے پر میں نے اپنے آپ پر ملامت کی۔ لیکن پھر سوچا کہ انسان جب پیدا ہوا ہے تو موت ناگزیر ہے۔ کبھی نہ کبھی اسے پرلوک سدھارنا پڑتا ہی ہے۔ اگر آج موسی کے ساتھ ایسا ہو جائے تو میں کروڑوں کا مالک بن جاؤں گا

آفس سے لوٹتے ہوئے میں نے کیلیشور کے مندر کے قریب سے جو میلاپور میں ہے اپنی بیوی کے لیے موتیا کا ایک گجرہ خریدا۔ بیس روپے کی نوٹ اپنی جیب سے نکالی اور پھول والی کو دے دی جو ریزگاری اس نے واپس کی اپنی جیب میں رکھ لی اور سیدھا گھر کی راہ لی۔ مکان میں داخل ہوتے ہی شریمتی جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی موسی گاؤں سے آئی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ اب ان کی صحت بالکل اچھی ہے۔ لیکن تنہا رہتے رہتے اکتا گئی ہیں۔ اب چند دن یہاں اپنے ساتھ رہیں گی۔ مدراس کے مندروں میں پوجا کریں گی اور تروپتی جانے کا ارادہ بھی رکھتی ہیں آج وہ اُپواس سے ہیں۔ فوراً ان کے لیے تازہ کیلے لے آیئے۔"

اُلٹے قدم پھر بازار گیا۔ تازہ کیلے خریدنے۔ کیلے والے سے بھاؤ پوچھا۔ جواب ملا "پندرہ روپیہ درجن" ایک درجن کیلے خریدے۔ پھول والی نے جو ریزگاری واپس کی تھی اس میں سے اس ٹھیلے والے کا حساب چکتا کرنے جب جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو ہاتھ لگے دس روپیہ کی ایک اور پانچ روپیہ کے دو نوٹ!

چلیئے نجومی کی بات تو سچ نکلی۔ ایک خاتون ہی کے ذریعہ مبلغ پانچ روپیہ سکہ ہند میرے ہاتھ لگے۔ موسی نہ سہی پھول والی ہی سہی!!

قلمی معاونین سے التماس

اپنے مضامین صاف اور خوش خط صفحے کے ایک جانب لکھیں۔

ہر تخلیق پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

پیکرانِ بے سخن

کلی کا کھلنا

ایک محفل میں صدیق مجیبی نے بتایا "ایک پروفیسر صاحب کلاس میں یہ مصرعہ پڑھاتے تھے ؎

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

کئی بار شکایتیں ملیں، تو ایک مرتبہ میں نے جان بوجھ کر ان سے اس مصرعہ پر گفتگو کی ٹھانی۔ میرے سامنے بھی وہ اس مصرعہ کو اسی طرح پڑھ گئے۔ میں نے جل بھن کر کہا "جی ہاں، کھلنا ڈھاکہ کے قریب ہے"۔

صاحب سلام میرا

پروفیسر مظفر اقبال، ڈاکٹر ناز قادری، ڈاکٹر ابو عبیدہ ابدالی، ڈاکٹر آفتاب عالم، ڈاکٹر عزیز الرحمٰن، پروفیسر جلیل احمد اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ابدالی نے بتایا "ایک بار عزیز الرحمٰن صاحب دیوار پھاندتے ہوئے پکڑے گئے تھے"۔

سبھی لوگ ہنسنے لگے تو پروفیسر مظفر اقبال نے کہا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ پہلے مقصد کا علم ہونا چاہیئے۔ کہیں اس شعر والی بات نکل آئی تو ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھوگے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

جغرافیہ ساز

پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر مظفر اقبال، ڈاکٹر شمیم افزا قمر، ڈاکٹر ناز قادری، مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرے لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پروفیسر شمیم احمد نے بتایا کہ جب مشرقی پاکستان پر قبضہ ہوگیا اور نیا ملک بنگلہ دیش بنا تو بہت سارے لوگ اندرا گاندھی کو مبارکباد دینے پہنچے۔ شمیم احمد شمیم ممبر پارلیمنٹ نے بالکل نئے انداز سے مبارکباد دیتے ہوئے کہا "آج تک میں نے تاریخ ساز شخصیتوں کے بارے میں سنا تھا لیکن آج جغرافیہ ساز شخصیت کو دیکھ رہا ہوں جنھوں نے ایک نئے ملک کو جنم دیا ہے"۔

غیر معیاری

سری نگر میں مظہر امام کے یہاں کھانے پر باتیں ہو رہی تھیں۔ فیاض رفعت، مبینہ امام، مناظر عاشق ہرگانوی، شہیر امام اور کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بات فیاض رفعت کی صاف گوئی پر ہونے لگی تو مظہر امام نے بتایا "یہاں سری نگر سے ایک رسالہ "لا" نکلا ہے۔ پہلے شمارہ کا اجرا حامدی کاشمیری کے یہاں تھا۔ زبیر رضوی نے تقریر کرتے ہوئے نوجوان ایڈیٹروں سے کہا "یہ پہلا شمارہ ہے، اس میں آپ نے بعض ایسی چیزیں شائع کی ہیں، جو غیر معیاری ہیں۔ آئندہ سے معیار کا خیال رکھئے گا۔ خواہ بڑے نام ہی کیوں نہ ہوں"۔

"ہاں" اگلے شمارہ سے ان کی چیز مت چھاپنا۔ اس بار تو چھاپ ہی دی ہے"۔
فیاض رفعت نے برجستہ کہا۔

لنگڑے پر بہار

اسی محفل میں شہیر امام نے بتایا "جب "علی گڑھ آبزرور" کے نگران فیاض رفعت تھے تو انھوں نے ایک بار سرخی لگائی "لنگڑے پر بہار ہے"۔
اور خبر میں یہ مضمون دیا "راہی معصوم رضا صاحب بھی شمشاد مارکٹ سے گزرتے ہیں۔ ایک آم فروش یہ آوازیں لگاتا ہے "لنگڑے پر بہار ہے"۔

گلشن کا کاروبار

اسی محفل میں فیاض رفعت نے بتایا "فیض احمد فیض اپنی دو غزلیں سنا چکے تو ان سے گلوں میں رنگ بھرے کی فرمائش کی گئی۔ فیض نے غزل شروع کی ؎

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے ؛ چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

سامعین نے ہانک لگائی "یہ گلشن کہاں کاروبار کرتی ہے؟ پتہ بتلا دیجئے"۔

یوسف ناظم نے افتتاح کیا، مشتاق احمد یوسفی مہمانِ خصوصی، ملک گیر سطح کے مستند شعراء و ادباء کی شرکت

مالیگاؤں میں اردو اکاڈیمی کا ادبِ اطفال پر عظیم الشان سیمی نار

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکاڈیمی کے زیرِ اہتمام مالیگاؤں میں پہلی بار ریاستی سطح پر ادبِ اطفال سیمی نار بیحد کامیابی سے منعقد کیا گیا۔ اس باوقار عظیم الشان سہ روزہ سیمی نار کا افتتاح جناب یوسف ناظم نے کیا۔ اس سلسلہ کا آغاز ۲۲ مئی کی صبح ۱۱ بجے مہاراشٹرا ٹاؤن ہال (مالیگاؤں) میں بچوں کے مختلف ثقافتی مقابلوں سے ہوا۔ اسکولوں میں تعطیلات کے باوجود اس پروگرام میں سینکڑوں طلباء و اساتذہ کے علاوہ خواتین اور عمائدین شہر نے شرکت کی اور بچوں کے نظم خوانی، تحت اللفظ، کوئز اور لطیفہ گوئی کے مقابلوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ ان مقابلوں میں جج کے فرائض ظہیر قدسی، صالح ابن تابش اور حسین عاجز نے انجام دیئے۔ مہمان کی حیثیت سے جناب قاسم باؤلا (رکن اکاڈیمی جالنہ) شریک ہوئے، جناب ابراہیم سیٹھ (نیشنل ٹریولیس) نے اس پروگرام کی صدارت فرمائی اور حامد اقبال صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ابتداء میں ڈاکٹر یامین اختر فاروقی (ممبر سکریٹری اردو اکاڈیمی) نے اساتذہ اور بچوں کا خیر مقدم کیا۔

۲۳ مئی کی صبح ۱۰ بجے سیمی نار کے آغاز پر اے ٹی ٹی ہائی اسکول کے گراؤنڈ میں اسکولی طلباء نے بینڈ باجے کے ساتھ سلامی دیتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اردو کا پرچم جناب یوسف ناظم نے لہرایا۔ امن کی علامت کبوتر اڑائے گئے اور رنگین غبارے بھی فضاؤں میں چھوڑے گئے۔ دوسرا مرحلہ تھا بچوں کے کتب رسائل کی نمائش کا، جناب شمیم طارق نے اس وسیع نمائش کا افتتاح کیا۔ ادبِ اطفال سے متعلق نادر و نایاب کتابوں، رسائل اور تصاویر کی نمائش نے اس سیمی نار کی آب و تاب میں اضافہ کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب یوسف ناظم نے کی، عثمان غنی انصاری نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور ڈاکٹر یامین اختر فاروقی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اور سیمی نار کی غرض و غایت بیان کی۔ جناب ہارون (مدیر بیباک) نے شمع روشن کرنے کی رسم ادا کی۔ افتتاحی اجلاس میں سلام بن رزاق، ساجد رشید، شمیم طارق، اقبال نیازی، وکیل نجیب، حیدر بیابانی، مسرت بانو شیخ، حامد اقبال صدیقی، معین الدین عثمانی، رشید قاسمی، صغیر احمد، خیال انصاری، یوسف انصاری، سلیم شہزاد، اسحق صغیر، رفیع احمد، مجید انور، عبدالحفیظ انصاری، حاجی ابراہیم سیٹھ وغیرہ نے شرکت کی۔ جناب شمیم طارق نے بچوں کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو میں ناصحانہ اندازِ تحریر کے ساتھ تو بچوں کا ادب ہے لیکن بچوں کی نفسیات کے پیشِ نظر ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے۔ "نیا ورق" کے ایڈیٹر مشہور صحافی جناب ساجد رشید نے بچوں کے ادبی ذخائر کے اضافہ میں مالیگاؤں کے ادباء و شعراء کی کاوشوں کا ذکر خصوصی طور پر کیا جناب ہارون نے کہا کہ اردو میں کم داموں پر خوبصورت جاذبِ نظر کتابیں اور رسائل بچوں کو مہیا نہیں۔ صدرِ جلسہ جناب یوسف ناظم نے اپنی طنز و مزاح سے پُر تقریر سے محفل کو زعفران زار بنادیا انھوں نے کہا بچوں کے ادب پر کام کم ہوا ہے اس کا اظہار بار بار کیا جاتا ہے اور ہم صرف افسوس جتاتے رہتے ہیں جبکہ بچوں کے ادب پر بہت کام ہوا ہے لیکن نہ جانے کیوں ہم احتجاجی لہجہ میں ہر بار کمی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جناب یوسف ناظم نے خصوصی طور پر اس بات پر زور دے کر کہا کہ اردو میں بچوں کے ادب پر جس قدر سرمایہ مہیا ہے پہلے ہم ٹھیک سے اُسے تو پڑھ لیں اور شکر ادا کریں، بار بار شکوہ ہمیں زیب نہیں دیتا۔"

شام ۴ بجے سیمی نار کے پہلے اجلاس کا آغاز ہوا۔ صدارت فرمائی جناب سلام بن رزاق نے اور مقالے پڑھے گئے۔ نجیبہ (بچوں کی کہانیاں) اشفاق جنید (ادبِ اطفال میں نظم کا حصہ) حیدر بیابانی (بچوں کی نظمیں) مسرت بانو شیخ (اردو مدارس میں بچوں کی علمی ادبی سرگرمیاں) جناب سید عارف، ساجد رشید، شمیم طارق، احمد عثمانی، اقبال نیازی، حامد اقبال، ایم یوسف انصاری اقبال برکی، ابراہیم شیخ وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا۔ نظامت کے فرائض صغیر احمد نے انجام دیئے۔ جناب سلام بن رزاق نے صدارتی تقریر کی۔ ۲۴ مئی کی صبح اس سیمی نار کا دوسرا اجلاس سابق پرنسپل پروفیسر عبدالحفیظ انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس سیشن میں چھ مقالے پڑھے گئے۔ ایم یوسف انصاری (داستانِ ادبِ اطفال اور تاریخ) خیال انصاری (مالیگاؤں میں ادبِ اطفال کی سرگرمیاں) معین الدین عثمانی (اردو مدارس میں علمی ادبی سرگرمیاں) رشید قاسمی (بچوں کے اخبارات و رسائل) آفتاب حسنین (بچوں کا ادب اور ادیبوں کے مسائل) اور اقبال نیازی (بچوں کے ڈرامے) بحث میں جناب سلام بن رزاق، ساجد رشید، شمیم طارق، احمد عثمانی، سراج دلار، اقبال برکی، حامد اقبال، شکیل کیفی، عبدالرشید صدیقی وغیرہ نے حصہ لیا۔ صدرِ جلسہ پروفیسر عبدالحفیظ انصاری نے پیش کردہ مقالات کا جائزہ لیا۔ اس اجلاس کی نظامت حامد اقبال اقبال صدیقی نے کی۔ شام میں ۶ بجے اس سیمی نار کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا زیرِ صدارت جناب یوسف ناظم۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب مشتاق انتولے نے شرکت کی۔ ڈاکٹر یامین فاروقی نے مہمانِ خصوصی اور دیگر مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ بعد ازاں ادبِ اطفال کی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے گرانقدر خدمات کے عوض مالیگاؤں کے چار ادیبوں اور شاعروں کو جناب مختار عدیل جناب خیال انصاری، جناب ایم یوسف انصاری اور جناب رفیع احمد کو اعزاز دیا گیا۔ اس سے قبل جناب سلیم شہزاد نے سیمینار کے تمام اجلاس میں پڑھے گئے مقالات کا جائزہ پیش کیا۔ جناب مشتاق انتولے نے اپنی تقریر میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ مالیگاؤں کی خواتین بھی تعلیم اور ادب کے معاملے میں بیدار ہیں۔ آپ نے خصوصی طور پر حضرت ادیب مالیگانوی کا ذکر کرتے ہوئے مالیگاؤں کے شعراء و ادباء سے بچپن سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا اور کہا کہ بمبئی کے بعد مالیگاؤں میں اردو زبان و ادب کی بہت خدمت ہو رہی ہے۔ ایم ایل سی جناب مشتاق انتولے جو اردو اکاڈیمی کے رکن بھی ہیں نے ممبر سکریٹری ڈاکٹر یامین اختر فاروقی کی سرگرمیوں کی تعریف کی۔

صدرِ جلسہ جناب یوسف ناظم نے بھی اردو زبان و ادب کے لیے مالیگاؤں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس سہ روزہ ادبِ اطفال سیمی نار کو انتہائی کامیاب قرار دیا۔ سیمی نار میں ہر طرح کی معاونت کے لیے جناب ابراہیم سیٹھ کو توصیفی سند اور بشیر سر اور دیگر اساتذہ کے ساتھ مالیگاؤں آرٹس اینڈ کامرس کے صدر جناب سراج دلار کو بھی توصیفی اسناد پیش کی گئیں۔ ڈاکٹر یامین فاروقی نے شکریہ ادا کیا۔ اور اہلیانِ مالیگاؤں کی جانب سے ڈاکٹر یامین اختر فاروقی کی کاوشوں کا اعتراف پروفیسر اسماء شیخ نے کیا اور انھیں تہنیتی گل پیش کیے۔ اس موقع پر رسالہ "پاسبانِ تعلیم" نے سیمی نار پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اور ۲۴ مئی کی شب ۸ بجے اس عظیم الشان سہ روزہ ادبِ اطفال سیمی نار کا باوقار اختتام ہوا۔

اداریہ

ممتاز مزاح نگار مسیح انجم ۔ مختصر علالت کے بعد ۳۰ مئی ۹۸ کو انتقال کر گئے۔ موتیا بند کے باعث کوئی چار ماہ قبل ان کی ایک آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ آپریشن کے بعد انھیں چند ہفتے شہر کے مضافات میں واقع ان کے مکان میں آرام کرنا پڑا۔ ہر روز گھر سے نکل پڑنے، کام کے اوقات کے بعد احباب کے ساتھ وقت گزارنے کے عادی مسیح انجم کے ذہن و دل پر اس آرام کا اُلٹا اثر ہوا۔ معمولات کے ساتھ غذا میں بھی فرق آگیا تھا۔ اور وہ ذہنی تناؤ و نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو گئے۔ انھیں رہ رہ کے دفتر شگوفہ اور احباب یاد آتے تھے۔ فون کرتے اور شگوفہ پر سارا دن گزارنے کی آرزو کرتے۔ لیکن ضعف و کمزوری مانع رہی۔ اس کے باوجود ایک دن صبح اپنے لڑکے کے ہمراہ مجرد گاہ کی تیسری منزل پر واقع شگوفہ کے آفس پہنچ گئے۔ اور رات دیر گئے گھر لوٹے۔ وہ اکثر اپنے صاحبزادوں سے کہا کرتے کہ مجھے دفتر شگوفہ لے چلو۔ احباب نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ صحت ـــــ کی یہ خرابی ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کا پیش خیمہ ہے مگر خود مسیح انجم انجام سے بے خبر نہیں تھے۔ ان کی گفتگو اور فرمائشوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ فرشتہ اجل کے قدموں کی چاپ سن رہے ہیں۔ لیکن ہم اس انداز کو بھی ذہنی تناؤ کا سلسلہ سمجھتے رہے ۔ ۳۰ مئی کو مسیح انجم کے صاحبزادے سمیع الدین نے فون پر بتایا کہ بگڑتی ہوئی صحت کے پیش نظر مسیح انجم کو سی ڈی آر ہاسپٹل میں شریک کیا جا رہا ہے۔ میں دوپہر میں دواخانہ پہنچا۔ نحیف و نزار مسیح انجم موت و زیست کی کشمکش سے دو چار تھے۔ میرا نام سنتے ہی جسم میں ارتعاش پیدا ہوا۔ ہاتھ پیر تیزی سے حرکت میں آ گئے لیکن نہ زبان کھلی اور نہ آنکھ۔ اسی رات ۸ بجے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنا للہ واِنا الیہ راجعون۔

شگوفہ اور مدیر شگوفہ سے محبت، اخلاص، اور تعلق خاطر کا ایک باب ختم ہوا۔ وہ ہمارے فرد خاندان کی طرح تھے۔ ان سے پہلی ملاقات ۱۹۶۷ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں روزنامہ رہنمائے دکن کے ادبی صفحہ کی ادارت میرے ذمہ تھی۔ مسیح انجم اپنے ساتھ روایتی انداز کے چند افسانے لے آئے تھے۔ میں نے انھیں مزاحیہ مضامین لکھنے کا مشورہ دیا۔ چند دن بعد ایک طنزیہ و مزاحیہ مضمون لے آئے۔ مضمون اچھا خاصا تھا۔ رہنما میں شائع شدہ سگریٹ کے اشتہاروں کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ مصلحتاً وہ مضمون "ملاپ" میں شائع کروا لیا گیا۔ لیکن اس کے بعد مسیح انجم نے مستقلاً طنز و مزاح سے رشتہ قائم کر لیا۔ ان کے مضامین ابتداء میں رہنمائے دکن اور پھر شگوفہ کے اجرا کے بعد اس رسالہ میں شائع ہونے لگے۔

شگوفہ میں وہ مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۱ء تک شگوفہ کی مجلس ادارت کے فعال رکن رہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کی مجلس عاملہ کے رکن اور پھر برسوں نائب معتمد رہے۔ معتمد عمومی کے عہدہ کی ذمہ داری بھی دو سال نبھائی۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاسوں میں ان کے مضامین بے حد پسند کئے جاتے رہے ہیں۔ ادبی اجلاسوں کے وہ کنوینر بھی رہے۔ سادگی، انکساری، وفاداری اور دیانت داری مسیح انجم کی خاص صفات تھیں۔ شگوفہ، اور زندہ دلان سے انھیں جذباتی لگاؤ تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ مدرس تھے ۔ مخلص و ایماندار، جن کے سینکڑوں شاگرد اور بے شمار قاری آج اشکبار ہیں۔ ان کا انتقال میرا نجی نقصان تو ہے ہی حیدرآباد میں طنز و مزاح کی روایت کو بھی سخت دھکا لگا۔

خدا سے دُعا ہے کہ مرحوم کو اپنی اعلیٰ رحمتوں سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔ آمین

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

۲۵ سالہ نثری اِنتخاب (حصّہ دوم)

جلد ۳۱ ——— جولائی ۱۹۹۸ء ——— شمارہ : ۷

ایڈیٹر : ڈاکٹر سیّد مصطفےٰ کمال • مہمان مدیر : سکندر علی خاں

ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد مُعز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی :

حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدّہ)
مسعود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمٰن سلیم (ریاض)
اختر عالم (یو۔کے)

سرورق :
سعادت علی خاں

کمپوزنگ : گلریز محسن مہدی

طباعت :
اسپیڈ پریس برائے دائرہ پریس چھتہ بازار

مجلس مشاورت :
زیندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
محمد علی رفعت آئی اے ایس
حمایت اللہ

مجلس ادارت :
مصطفیٰ مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیّر
رحیم الدین توفیق

قیمت فی پرچہ : ۱۵ روپے
زرِ سالانہ : ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱ فون (آفس) 595116 (رہائش) 4576064

ہیڈ آفس: 22-7-387/4, پرانی حویلی حیدر آباد

حیدر آباد سے ابھرنے والا ایک درخشندہ ستارہ

* کوآپریٹیو سیکٹر میں واحد بینک جو صدر نشین **عالیجناب سید علمدار حسین سجاد آغا**

کی حرکیاتی اور فعال قیادت میں ترقی کی منازل طئے کرتا جارہا ہے۔
حیدر آباد اور سکندر آباد میں 16 برانچس کے علاوہ نظام آباد اور محبوب نگر میں بھی برانچس موجود۔

تمام برانچس پر NRE اکاؤنٹس کی سہولت

گولڈ لون کی صرف دس منٹ میں اجرائی

بچت کی منفرد اور منفعت بخش اسکیمیں

ڈولی
آپ کی لاڈلی کی
شادی کیلئے

باب العلم
آپ کی اولاد کی
تعلیم کیلئے

آشیانہ
مکان کی تعمیر یا
خریدی کیلئے

امانت
آپ کی چھوٹی بچت پر
منافع کیلئے

این آر آئیز کیلئے پرکشش منافع کا پیشکش

TERM DEPOSITS (DOMESTIC)

◆ 30 Days to One year	13.5%
◆ 1 Year to 3 Years	14.0%
◆ 3 Years & above	15.0%

NRE (ACCOUNTS)

◆ 6 Months to 2 Years	[illegible]
◆ 2 Years & above Non Resident	14.0%
◆ Non-Repatriable	
6 Months to 3 Years	[illegible]

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مہمان اداریہ

”ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا“

”میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے“ شگوفہ کا تسلسل کچھ اسی طرح کا ہے، اللہ کرے زور شگوفہ اور ہو زیادہ، قارئین کرام ناچیز بندہ، بے دام ہے یعنی ”مہمان مدیر“ جب ہمارے کرم فرما بلکہ شگوفہ ”کے کرم فرما ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کا حکم ہوا کہ میں ”مہمان مدیر“ کی حیثیت سے اس ” **۲۵ سالہ نثری انتخاب** “ کو مرتب کروں تو مجھے پرانی کہاوت یاد آگئی ”بھینس کے آگے بین بجانا اور پھر یہاں ریاض میں ہمارے یار وفادار ڈاکٹر عابد معز نے ہماری زندگی کے کم ہونے کا ڈر بٹھایا اور کہا کہ ”شگوفہ“ سے وابستہ رہوگے تو ہنسوگے، مسکراؤگے اور یہی عمر کے طویل ہونے میں کام آے گا (لوگ آج کل ڈاکٹروں سے دوستی نہیں رکھتے کیونکہ وہ ہمیشہ زندگی کے کم ہونے کا ڈر بٹھا کے عمر لمبی ہونے کی دوائیں دینے کی کوشش میں زندگی اور کم کردیتے ہیں)

خیر جناب ”مرتا کیا نہ کرتا“ اس طرح ہم نے یہ گراں بار ذمہ داری اپنی زندگی کی خوش آئند طوالت کی آرزو میں قبول کرلی۔

حیدرآبادی تہذیب میں مہمان سے کچھ کام نہیں لیا جاتا بلکہ گھر بٹھا کر کھلایا پلایا جاتا ہے۔ ہم سمجھے کہ شاید یہاں بھی وہی طریقہ ہے مگر معلوم ہوا یہ تو SELF SERVICE والا معاملہ ہے۔ اور یہ ”خود خدمتی“ ہم سے کبھی نہ ہوئی، بہرحال اگر ڈاکٹر عابد معز ہمارے ”کفیل“ نہ بنتے تو کچھ نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے شکر کے بعد ہم عابد معز کے احسان مند ہیں کہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اور پھر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کا بھی ”کمال“ کہ کس خوبی سے نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہر ماہ یہ بازی جیت لیا کرتے ہیں۔

۲۵ سالہ نثری انتخاب کو تو بہت ضخیم ہونا چاہیئے تھا مگر ”ہائے رے مجبوری ...“ گذشتہ ۲۵ برس سے ”شگوفہ“ میں لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان ادیبوں کا جتنا تعاون ”شگوفہ“ کو ملا ہے شاید ہی کسی اور طنز و مزاح کے رسالہ کو ملا ہوگا پھر طرہ یہ کہ ہند و پاک کے چوٹی کے (اور داڑھی کے بھی) مزاح نگاروں نے ہمیشہ اس رسالہ کی زینت بڑھائی ہے ایک چیز ہو تو گناؤں ”لہٰذا ان تمام قلمکاروں کا حسب مراتب شکریہ، آداب سلام اور نمستے!! ”دیر آید درست آید“ کے مصداق امید ہیکہ ”شگوفہ“ کے ۲۵ سالہ نثری انتخاب کا یہ دوسرا حصہ یقیناً آپ کی نظروں میں ”درست“ ہی ثابت ہوگا۔ آخری بات!! اگر کسی شہرہ آفاق شہرہ زیر زمین طنز و مزاح نگار کی تخلیق اس انتخاب میں شامل دکھائی نہ دے تو سمجھئے کہ محض یہ ”تنگیٔ داماں“ کی بات ہے اور کچھ نہیں جس کے لئے ”پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

”شکایات“ کے لئے براہ کرم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال سے رجوع کریں۔

صحبت باقی۔ خدا حافظ

سکندر (ریاض، سعودی عرب)

ابن انشاء

کچھ قصہ دودھ کا کچھ پانی کا

کراچی میں آج کل دودھ کا مسئلہ چل رہا ہے، یوں تو آٹے کا مسئلہ بھی ہے لیکن وہ ایسا تشویشناک نہیں کیونکہ لوگوں کو روٹی نہ ملے تو کیک کھا سکتے ہیں۔ دودھ کی بات اور ہے یہ ہمارے ملک کے لوگوں کی مرغوب غذا ہے۔ بچوں کی تخصیص نہیں ہمارے ملک کے بڑے بڑے سیاستدان بھی جب بات کرتے ہیں تو یہی لگتا ہے جیسے دودھ پیتے بچے بول رہے ہوں۔ خیر سیاست دانوں کا کیا ہے۔ پیسے والے لوگ ہوتے ہیں دودھ نہ ملے تو گرائپ واٹر پی سکتے ہیں لیکن عوام الناس کی دودھ کی ضروریات تو دودھ ہی سے پوری ہو سکتی ہیں اتنا گرائپ واٹر کہاں سے آئے گا۔

دو تین دن جو دودھ کا کال پڑا۔ ہم اتفاق سے یہاں نہیں تھے لاہور میں تھے ـــــ اس لئے اپنا ذاتی تجربہ نہیں رکھتے ہمارے ایک ہم قلم نے البتہ جو پتا لکھی ہے وہ دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں چوری چھپے دودھ سپلائی کرنے والے گوالوں کی تلاش میں میں نے اپنے ایک بھائی کو کورنگی دوڑایا دوسرے کو نیو کراچی بھیجا اور خود نارتھ ناظم آباد کی سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ دیکھا کہ ایک شخص پراسرار حالات میں لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا کچھ دامن میں چھپائے لئے جارہا ہے میں سمجھ گیا کہ دودھ کی بوتل ہوگی پس اس کے پیچھے بھاگا۔ مجھے بھاگتا دیکھ کر لوگ میرے پیچھے بھاگنے لگے لین ڈور بندھ گئی جب اس شخص نے دیکھا کہ اب میں پکڑا جاؤں گا تو بو[...] گھماکر پاس کے ایک تالاب میں پھینک دی ڈھکنا کھل گیا [...] تالاب میں مل گیا۔ وہ جو پانی کا تالاب تھا کراچی والوں کے [...] سے دودھ کا تالاب بن گیا کیونکہ اس میں دودھ اور پانی کا [...] عین وہی تھا جس کے کراچی والے عادی تھے لوگ گھروں [...] گئے اور بالٹیاں بھرنا شروع کردیں دیکھتے ہی دیکھتے [...] ہوگیا۔

ممکن ہے ... نظر والوں کو اس واقعے میں کسی [...]

ابن انشا

نام: شیر محمد خاں
قلمی نام: ابن انشا
تصانیف: چلتے ہو تو چین کو چلئے، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، نگری نگری پھرا مسافر (سفرنامے) خمار گندم (مضامین) اس بستی کے اک کوچے میں (شاعری)

کی بو آئے لیکن یہ بات ایک موقر کالم نگار نے لکھی ہے اور ہمارے نزدیک اس کی صداقت پر کسی قسم کا شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

خبر الگلے روز کراچی کی انتظامیہ نے دودھ کی قیمت مقرر کردی جو دودھ کی بلیک مارکیٹ قیمت سے چنداں زیادہ نہ تھی عام شہریوں کو دودھ روپے سیر ملا کرتا تھا کہیں کہیں سوا روپے سیر اور بند بوتل میں بہت ہی خالص چاہیئے تو ڈیڑھ روپے سیر لیکن حکام وقت نے شہریوں اور گوالوں سے کہا کہ ہم انصاف کرتے ہیں نہ تمہارا مطالبہ منظور کہ دودھ روپے سیر ملا کرے، نہ گوالوں کی بات قبول کہ نرخ ڈیڑھ روپے کیا جائے، ہم ایک روپیہ دس آنے قیمت مقرر کرتے ہیں شادیانے بجنے لگے، لوگ بھنگڑا ناچنے لگے ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی لوگ گھی کے چراغ جلانے کے لئے بناسپتی گھی کی دکانوں پر پل پڑے۔

یہاں سے پھر ہمارے انہی دوست کا قصہ شروع ہوتا ہے کہ اگلے روز گوالا علی الصبح آیا ہمارے دروازے پر دستک دی اور جب ہم گئے تو آدھ سیر دودھ ہمیں تھما دیا، ہم نے کہا بھیا ہم تو سیر دودھ لیا کرتے تھے بولا صاحب! آج کل حکومت سختی کر رہی ہے اور لوگ بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں یہاں تو میں اتنا ہی دے سکتا ہوں باقی ضروریات کے لئے عقبی دروازے پر جایئے" ہم نے عقبی دروازہ کھولا وہاں گوالے کا بھائی کھڑا تھا اس نے ڈول میں سے آدھ سیر پانی کا ڈونگا ہمیں بھر کر دیا اور یوں سیر بھر دودھ بنا۔ صاحب مضمون فرماتے ہیں از راہ انصاف اتنا کہوں گا کہ اس طرح جو دودھ بنا وہ اس دودھ سے کسی قدر گاڑھا تھا جس کی بالٹیاں ہم نے پہلے روز تالاب سے بھری تھیں، یہ بات کچھ کچھ ہمارے بھی جی کو لگتی ہے۔

ہم نے چیزوں کی قیمتیں اوپر چڑھتی تو دیکھی ہیں، اترتی کبھی نہیں دیکھیں جب ٹیکسی اور رکشا والے اپنے پیسے بڑھواتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ اب ہم خوش ہمارا خدا خوش" اب ہم اپنے میٹروں میں قطعی گڑبڑ نہ کریں گے اور بقیہ عمر ہنسی خوشی، ایمان داری میں گزاریں گے گوالوں کے پیسے بھی یہ کہہ کر بڑھائے گئے ہیں کہ اب دودھ خالص ملا کرے گا ممکن ہے ایک آدھ روز خالص ملے بھی لیکن گوالا تالاب کے پاس سے گزرتا ہے پائل کو دیکھتا ہے۔۔۔ تو

اٹھ ہی جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے۔

آخر عمر بھر کی عادت ہے کیسے جا سکتی ہے اب رہی یہ بات کہ حکومت نے اسمگلنگ کے انسداد کے لئے کمیٹی بنادی ہے ملاوٹ کی روک تھام کے لئے کمیشن مقرر کر دیا ہے اور گرانی کے انسداد کے لئے نئی وزارت قائم کردی ہے ان باتوں کے درمیان ہمیں کوئی خاص رشتہ نظر ںآتا کمیٹی اپنی جگہ بیٹھی رہتی ہے گرانی اور ملاوٹ اپنی جگہ ترقی کرتی رہتی ہے کسی نے رمضان شریف میں دوپہر کو ایک مولانا کا ازہ کھٹکھٹایا مولانا نے کھولا اس شخص نے کہا۔ "یا حضرت! آپ کی داڑھی میں چاول اٹکا ہے۔ آپ دوسروں کو روزہ رکھنے کی تلقین تے ہیں اور خود آپ کا یہ حال ہے۔

جنت میں گئے شیخ تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

نے کہا اے بے وقوف! کیوں بدگمانی کرتا ہے روزہ اپنی جگہ ہے چاول اپنی جگہ۔

سستا ہوتا ہے تو آدمی آٹے کو کھاتا ہے اور جب مہنگا ہوتا ہے تو آٹا آدمی کو کھاتا ہے اور گیہوں کی طرح نہیں گھن کی طرح

کھاتا ہے یہی حال دودھ کا جانئیے۔ حضرت مولانا روم نے اپنی طرف تو تجنیس خطی کا کمال دکھایا تھا جو لکھا تھا

آں یکے شیرے کہ مردم می خورد
آں یکے شیرے کہ مردم می خورد

یعنی ایک شیر وہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو کھاتا ہے اور ایک شیر وہ ہوتا ہے جسے لوگ کھاتے ہیں یا پی جاتے ہیں۔ مولانا نے پہلے سے شاید جنگل کا بادشاہ مراد لیا تھا اور دوسرے سے دودھ لیکن سچ پوچھئے تو ہمیں دونوں جگہ دودھ کا مضمون نظر آتا ہے۔ صحیح مطلب محقق لوگ ہی جانیں جن کا کام ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہوتا ہے۔

(شگوفہ، جون ۹۷۹)

اداریہ (مطبوعہ دیڑھ ماہی "شگوفہ" اکتوبر/نومبر ۱۹۷۰ء)

قارئین شگوفہ کی خدمت میں ہم بلا تخصیص عید کی پر خلوص مبارک باد پیش کرتے ہیں بلا تخصیص اس لیئے کہ ہم نے عید الفطر یا عید رمضان کہہ کر ان لوگوں کو مبارک باد سے محروم کرنے کی کوشش نہیں کی جنھوں نے نہ فطرہ دیا اور نہ رمضان کا اہتمام کیا سچ بات تو یہ ہے کہ آج اکثریت کی گرہ میں مال ہی نہیں کہ فطرہ دیں اور کچھ لوگوں کے ہاں مال و دولت ہے بھی تو اسے کچھ ایسا مصروف کر دیا ہے کہ زکواۃ کا کوئی قانون اس پر لاگو نہیں ہوتا۔! رہا روزے رمضان کا معاملہ، جنھیں خدا نے تین وقت کھانے کو دیا ہے وہ کیوں کفران نعمت کا الزام اپنے سر لیتے چنانچہ روزہ نہیں رکھا لیکن انھیں ماہ رمضان روزہ داروں سے زیادہ پسند ہے کیونکہ اس مہینے ہر شام بازاروں میں رونق ہوتی ہے چٹ پٹی چیزیں مسجدوں کے سامنے چوراہوں اور ہوٹلوں میں بنتی ہیں اور وقت تراویح بازاروں میں میلہ سا لگا رہتا ہے دوکانیں سجی سجائی راستے روشن دراصل سارا مہینہ عید کی طرح گزر جاتا ہے اور عید کا دن تو خوشی کے ساتھ ہلکے سے غم کا بھی دن ہوتا ہے کہ اب بازاروں میں ویسی رونق نہ ہوگی سر شام کھانے کے لئے چٹ پٹی اور گرما گرم (کیونکہ اب کی رمضان سرد موسم میں آیا ہے) چیزیں نہ ملیں گی۔

رمضان کا مہینہ تو کھانے اور صحت بنانے کا مہینہ ہوتا ہے صبح ہوئی دوسرے تو سب روزہ ہیں اکیلے آدمی کے لئے کوئی اچھی سی نئی ذایقہ دار چیز بنالی گھی میں پراٹے تل لئے اور شکم سیر ہو کر ناشتہ کر لیا دوپہر گھر سے باہر گزرتی ہے روزہ داروں کو تکلیف دینا مقصود نہیں اس لئے شہر کی تیس ویجیٹیرین و نان ویجیٹیرین ہوٹلوں کا انتخاب کر لیا گیا ہر روز ایک نئی ہوٹل میں لنچ پانچ بجتے ہی گھر لوٹے پان کی دھڑی ہونٹوں سے مٹاڈالی سوکھا منھ بنائے رمضانی، دوپلی ٹوپی سر پر ڈال لی اور افطار کے انتظام و انتظار میں مصروف ہوگئے جی کے بہلانے کو افطار کی اشیاء میں سے ایک ایک چیز چکھتے رہے افطار کے ساتھ ہی کھانا کھایا اور نکل کھڑے ہوئے یار دوستوں کے ساتھ بارونق شہر کی پدیاترا کے لئے سارا مہینہ قسط وار کچھ نہ کچھ خریدتے رہے رات دیر گئے تھک کر گھر پہونچتے ہیں تاکہ سحر میں کھنکنے والے برتنوں کی آواز سے نیند میں خلل نہ پڑے۔ اللہ اللہ کتنی برکتوں والا مہینہ گزر گیا!! لیکن برکتوں والے مہینے کے اختتام پر عید منانے کا حکم ہے اس لئے عرض ہے۔ عید شیر خورمہ مبارک

راجندر سنگھ بیدی

بیوی یا بیماری
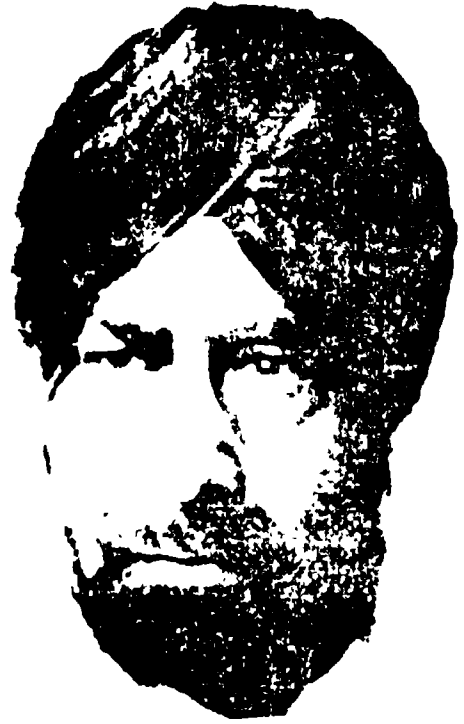
نام: راجندر سنگھ بیدی
تاریخ پیدائش یکم ستمبر ۱۹۱۵ء لاہور
تعلیم ایف اے
ابتدائی ملازمت پوسٹ آفس (نو سال) ریڈیو
افسانہ نگاری آغاز ۱۹۳۰ء
تصانیف: افسانے۔ کوکھ جلی، گرہن، دانہ و دام،
ڈرامے: بے جان چیز، سات کھیل۔ ناول۔ ایک چادر میلی سی
انتقال: نومبر ۱۹۸۴ء

جب سے دنیا بنی ہے بیویاں بیمار ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ میرے حصہ میں جو بیوی آئی وہ بھی بیمار تھی۔ بے ا بیویاں اپنی بیماری کی سب سے بڑی وجہ اپنے شوہر کو بتاتی ہیں ورنہ مائیکے میں وہ بھلی چنگی تھیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ البتہ بیچ بیچ میں اس بات پر بھی مچلتی تھیں کہ ذرا بیمار ہو کر دیکھا جائے۔ چنانچہ اسی امید اور خوشی میں ڈھول دھماکوں کے ساتھ ریشمی کپڑے پہنے اور جڑاؤ زیوروں سے آراستہ سسرال کی چوکھٹ پر پیر رکھتی ہیں تھوڑی دیر کے بعد بیماری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نوآموز (شوہر) دولہا دلہن کے آتے ہی اسے تشنج میں دیکھ کر سخت گھبراتا ہے اور بھاگا ہوا بھابی یا ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جو اس کے پھوہڑپنے پہ خوب ہنستی ہیں۔ چونکہ اسے کسی دوسرے کا منہ تو ملتا نہیں اس لئے اپنا سا منہ لے کر لوٹ آتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی چند دنوں میں میاں کو پکا کرنے کے لئے بیوی تندرستی کے دن یعنی کنوارپنے اور میکے کو یاد کر کے رونے لگتی ہے۔ جہاں وہ اپنی نیند سوتی اور اپنی نیند جاگتی تھی اور اب یہاں اسے پرائی نیند سونا پڑ رہا ہے اور پرائی ہی نیند جاگنا۔ البتہ آنسو خالص اس کے اپنے ہوتے ہیں اور وہ۔ کبھی دولھا کے آنسو نہیں روتی۔

پھر وہ دن آجاتے ہیں جب وہ واقعی طبی نقطہ نظر سے CLINICALLY بیمار ہوتی ہے۔ میاں ایک کی جگہ دس دوائیں لاتا ہے اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے جو بیوی سے کچھ سوال کرتے ہوئے ضمناً میاں سے بھی کر جاتا ہے اور اسے سخت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیوی کی بیماری ڈاکٹر کو نبض دکھانے یا اسے دوائیں لا کر دینے سے نہیں جاتی وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک میاں دوا اپنے ہاتھ سے نہیں پلاتا۔ وہ روٹھتی ہے برے برے منہ بناتی ہے میاں پیار کا دھوکا دیتا ہے یا دھوکے میں پیار کر جاتا ہے۔ یہ تھو تھو کرتی ہیں وہ فو فو کرتا ہے۔ آخر آدھی دوا اندر جاتی ہے آدھی باہر گرتی ہے اور کچھ دیر کے بعد جناب بیوی کا ذائقہ ٹھیک ہوتا ہے تو میاں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے۔ "اے تمہارے

ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی لوں۔" اور میں یہاں اپنے شوہر بھائیوں کو مشورہ دونگا کہ بیوی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی
سفید، کالا، یا ہرے رنگ کا جھوٹ سمجھیں، ورنہ پھانسی ہو جائے گی۔

اگر بیویاں آس پاس نہ ہوں، یا ہوں تو ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات میں مصروف کسی دوسرے کی نہ سنیں تو میں آپ کو بتاؤں۔
بیویاں دراصل بیمار نہیں ہوتیں وہ یونہی تھوڑے سے نوٹس پر بیمار ہو کر دکھا دیتی ہیں۔ اس بات کو جاننے کے لئے کہ ان کی بیماری
کے ساتھ ان کا ہوتا سوتا کتنا بیمار دکھائی دیتا ہے۔ کتنے دکھ اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے جو فعل بیویوں کی لغت میں محبت کا دوسرا نام
ہے اگر میاں کے چہرے پر بیوی کی بیماری کے کوئی آثار دکھائی نہ دیں تو وہ اسے نہایت کمینہ اور رذیل آدمی سمجھتی ہیں۔ لیکن دل میں
خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں۔ "مرد ہے!" اگر وہ کہیں ہمدردی کا اظہار کرے، کروٹ کروٹ ساتھ مرے تو یوں دیکھنے میں خوش نظر آئیں
گے، لیکن اندر سے کہیں گی۔ "زنخا ہے موا۔"

میں بڑی بیماری کی بات نہیں کرتا جو کہ بیوی خود ہوتی ہے ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا ذکر کر رہا ہوں جو دراصل کوئی وجو
نہیں رکھتیں اور جو مرد کو اکسانے کے لئے بیوی دن رات پیدا کرتی رہتی ہے۔ خالص بیوی ہوگی تو روز سویرے اٹھ کر شکایت کرے گ
"آج میرا سر کچھ بھاری بھاری ہے۔" پھر وہ ناک سکیڑے گی۔ ہاتھ کنپٹیوں پر رکھے گی اور اس کی یہی بات آپ کو پیاری لگے گی۔ آپ
خود بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ اس کی وجہ آپ خود ہیں آپ بڑی محبت، جو لفظ اردو میں لکھتے وقت جھت معلوم ہونے لگتا ہے، ـ
ساتھ کہیں گے۔ "اوہو اسپرین ہے گھر میں؟" چنانچہ اسپرین ہوگی کوڈا پائرین بھی ہوگی۔ مگر وہ کھائیں گی نہیں۔" آپ سوچنے لگیں گے
ان کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے۔ سر نہیں تو پیر ہی سہی۔ پھر بیوی کے بدن میں ایک حصہ ہوتا ہے جسے وہ کمر کہنے پر مصر ہوتی ہے۔
رہے۔ یہ عورت کے بدن کا وہ حصہ ہے جس پر ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور تعلی کے مضمون میں ا
نازک پتلا ہونا تو کیا نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔ مگر بیوی کے سلسلے میں وہی کمر حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ان شعروں کو ا
بیوی کی کمر کو ساتھ رکھ کے دیکھا جائے تو وہی چیز اچھا خاصا کرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ ہوتا یا ہوتی تو بدن ہی کے ساتھ ہے مگر آپ کو ا
ٹوٹا ہوا تصور کرنا پڑتا ہے۔ بیویاں اتنی سادہ سی حقیقت نہیں جانتیں کہ میاں کو ان کے بدن کے ہر حصے سے ہمدردی اور پیار ہوتا ہے
مگر کمر سے نہیں کیوں کہ مرد کی فطرت اسے معدوم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ بہرحال بیوی کی ٹوٹی ہوئی کمر پہ کوئی لیپ، کوئی انٹی فلاجسٹین اثر نہ
کرتا اور نہ درد شلتیہ و عصابہ (NERVOLGIA) دور کرنے والی گولیاں۔ لیکن چونکہ اب تک آپ بھی خالص میاں ہو چکے ہو
ہیں، اس لئے اسی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہتے ہیں۔ "بنو آج تو تم بڑی حسین لگ رہی ہو۔" پھر کہاں کی کمر اور کہاں کا درد؟ حقیقت یہ
کہ کمر درد کے لئے اس سے بہتر دوا آج تک سائنس ایجاد نہ کر پائی!

میں جانتا ہوں کہ کسی بھی معاشرے میں بیوی کی بیماری پر ہنسنا اچھی بات نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ وہ رونے بھی تو نہ
دیتیں۔ جیسے ان کا میاں کوئی جیوتشی ہے۔ رمال ہے یا ولی اللہ۔ اور جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ بیوی کی بیماری کے ایام
میاں جنت اور دوزخ کے بیچ عالم برزخ میں کہیں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ چہرہ دیکھو تو غم کے گھٹاٹوپ بادل چھائے ہیں دل کو کریدو تو ایک
اس کان سے اُس کان تک پھلجھڑی جا رہی ہے اور منہ سے ناف تک زبردست جھٹکے دے رہی ہے۔

یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ کائنات میں مادہ، نر سے زیادہ سخت جان ہوتی ہے اور اس سے زیادہ لمبی عمر کی متوقع۔ یہی وجہ
مسکت بیوی نہایت بے فکری کے عالم میں دن کو تیئس تیس مرتبہ تو ضرور کہتی ہے۔ "ہائے میں مر گئی" لیکن یہی بات اپنے میاں کو

کہنے دیتی ہے کہ اگر اس نے کہا۔ "میں مر گیا۔" تو وہ سچ مچ مرجائے گا جلدی یا آسانی سے مرجانے کی سزا قدرت نے مرد کو شاید اسی لئے دی ہے کہ اس کا جنسی نظام ،عورت کے پر پیچ جنسی سلسلے کی بہ نسبت بہت سیدھا اور سادہ ہے۔ غالباً اسی لئے بیویاں میاں کی مسلسل تندرستی کی حاسد ہوجاتی ہیں۔ کیوں کہ ان مردوں کو تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں۔ حالانکہ اس بے چارے کا قصور ہے تو صرف اتنا کہ پہلے وہ مرد بنا اور دوسرے ان کا شوہر وہ میاں کو دیکھ دیکھ کر یونہی کباب ہوتی رہتی ہیں اور کسی طرح اس کا بھلا نہیں چاہتیں۔ اسی لئے وہ مرد کے رنڈوا ہوجانے کو اپنے بیوہ ہوجانے سے اچھا سمجھتی ہیں۔

بیویوں کی بہت سی بیماریوں میں سے کچھ کہنے کے لائق ہوتی ہیں اور کچھ نہ کہنے کے لائق۔ میاں کو اس بات کی سمجھ بہت دیر کے بعد آتی ہے اور اس کی سمجھ کا سلسلہ معمول کی سیدھی سادی آزمائش اور غلطی ،بلکہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی سادگی میں بیوی سے براہ راست سوال پوچھ بیٹھتا ہے اور پھر اسی وقت ڈانٹ کھا کر سامنے سیڑھیوں پر جا بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی زبان اگر وہ بے حد خفا نہ ہوں تو بالواسطہ ہوتی ہے۔ وہ تشبیہ اور اشارے کی جان ہے۔ مثلاً حال ہی کی بات ہے۔ میرے ایک دوست نے وطن میں اپنی بیوی کو لکھ بھیجا "اب کے مہینے رہ گئے ؟" تو بیوی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف خط کے ایک طرف تین چھوٹے چھوٹے دائرے بنادیئے۔ گویا عورتوں کی زبان میں اس لہجہ کا کوئی دخل نہیں جسے ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اگر اس لہجہ کو جانتی بھی ہوں گی تو اسے استعمال کرنا اپنی شان کے شایان نہ سمجھیں گی ان کی زبان اب تک قدیم مصری خط تصویر (HIEROGLYPHICS) سے ملتی جلتی ہے جسے مصر کے لوگ تو کب کے چھوڑ چکے مگر ہماری بیویاں اب تک کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں اور ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

ہمارے ہندوستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جس کی شکل بیوی ہی کی طرح ہوتی ہے مگر خصلت ایک دم الگ۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں۔ جس کی بیماری اور بھی ٹیڑھی اور ناقابل علاج ہوتی ہے مثلاً آپ پوچھتے ہیں۔ "کیسی طبیعت ہے گھر میں؟"

"اب تو اچھی ہے بھگوان کی دیا سے"

"کیا تکلیف تھی؟" اس پر وہ دوسرے کی بیوی کا میاں یا دوسرے میاں کی بیوی آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں ،جیسے آپ کوئی گھنٹہ گھر ہیں اور شہر کی چوک میں نصب ہیں۔ دوسرے کی بیوی ہونٹوں کے بیچ مسکراتی ہوئی منہ پرے کر لیتی ہے اور اس عمل میں اپنی بیوی سے بھی پیاری لگتی ہے۔ البتہ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتا ہے۔ "زنانہ" تکلیف۔۔۔" مطلب یہ کہ اس کے بعد بکواس بند کیجئے۔ آپ کی سٹی گم ہوجاتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی بیماری شاید بیوی سے الگ کوئی چیز ہے۔ مگر اس وقت تک آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے اور جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کا نام تجویز کر کے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دہلیز ،ہمیشہ کی طرح ایک فٹ اوپر اٹھ کر آپ کو ٹھوکر لگاتی ہے۔ مگر آپ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھ کر سنبھل جاتے ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہیں تو خیال آتا ہے۔ مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام لینا چاہیئے تھا۔ چنانچہ تصحیح کی غرض سے آپ لوٹتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو "بکواس بند کر" کہتے ہوئے کسی اور واقف کار کے ہاں چل دیتے ہیں ،جہاں خوش قسمتی سے کوئی میاں بیمار ہے۔

شاذ ہی کوئی بیوی ہوگی جو مہینے میں چند دن بیمار نہ ہوتی ہو۔ اس میں میری بیوی یا آپ کی بیوی کی بات نہیں۔ دنیا جہاں کی ، جملہ بیوی جات کا قصہ ہے۔ ان ایام میں وہ کچھ یوں لیٹی ہوں گی جیسے انھیں ہیضہ ہوگیا ہو۔ وہ عاشق کی طرح زرد اور معشوق کی طرح

دھان پان نظر آرہی ہیں ۔ چڑچڑی اس قدر کہ بات بات پر میاں کو کاٹنے دوڑتی ہیں ۔ حالانکہ اس غریب کا قصور نہیں گری گدھے پر سے ہیں اور غصہ کمہار پر اتار رہی ہیں جو میاں اب تک شکل سے دکھائی دینے لگا ہے ، اپنے سڑی پن میں بیویاں بھول جاتی ہیں کہ اس بیماری ہی میں انکی صحت ہے ۔ اگر کسی مہینے یہ چھوٹی بیماری نہ آئی تو بڑی آئے گی ۔ پھر کھٹی کھٹی ڈکاریں آئیں گی ۔ سر چکرائے گا ابکائیاں آئیں گی ۔ ایک طرف اس بیماری پر غصہ آئے گا ۔ دوسری طرف پورے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ دوڑ جائے گی ۔ میاں پوچھے گا ، مگر کبھی نہیں بتائیں گی ۔ اشارے سے یہی کہیں گی کہ بس سمجھ جاؤ ۔ میاں ایک طرف مجرمانہ اور دوسری طرف فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف متوجہ ہوگا اور تلافئی مافات کے سلسلے میں بازار سے سیب اور ناشپاتیاں قلاقند اور امرتیاں لاکر دے گا ۔ جنھیں لے کر بیوی خوش تو ہوگی مگر بیماری سے اپنا ازلی رشتہ قائم رکھنے کے لئے بڑے سلیقے سے ان سب چیزوں کو طاق پر رکھ دے گی جو لکڑی کا نہیں نسیان کا بنا ہوتا ہے ۔ وہ شربت روح افزا کی جگہ جل جیرے کی فرمائش کرے گی ۔ گلاب جامن کی جگہ گول گپے اور آم شریفے کی جگہ چولھے کی مٹی کھائے گی ۔ مرد کو جب بری بات کہنا ہوتی ہے تو وہ خاکم بدہن سے شروع کرتا ہے لیکن بیوی ہے کہ اچھی خبر سنانے سے پہلے منہ میں خاک جھونک لے گی ، اگر میاں خفا ہو کر کوئی بات کہہ دے تو یہ بیٹھی بیٹھی کھری بولی میں صلواتیں سنائے گی ۔

بیوی کی ماہانہ بیماری کی نوعیت الگ ہے اور سالانہ کی الگ ۔ پہلی قسم کی بیماری میں پھر میاں کے لئے تھوڑی سی تسکین کی گنجائش ہے لیکن دوسری میں یکسر نہیں ۔ اسے سال بھر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ بڑے افسر نے کہیں اس کے کیریکٹر شیٹ پر الٹا سلٹا ریمارک لکھ دیا یا وطن سے باہر اس کا ٹرانسفر کر دیا اب ایک گھر یہاں ہے ۔ دوسرا باہر بنانا پڑے گا ۔ مہنگائی کا زمانہ ۔ ان دو گھروں کا خرچ کہاں سے لائے گا ۔ آخر وہ اپنے افسر کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کچھ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے اور پھر وہ دن آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو زچہ خانے کے باہر ٹہلتا ہوا پاتا ہے ۔ سگریٹ پہ سگریٹ پیتا ہے نہ اٹھ سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے اور بیویاں ہیں کہ اپنی جسمانی تکلیف کے سامنے میاں کی روحانی تکلیف کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتیں ۔ میاں کے لئے یہی تکلیف کیا کم ہے کہ زچہ خانے کے باہر وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا گدھا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کے پاس ہی اور بھی بہت سے گھوم رہے ہوتے ہیں لیکن احساس کا بیوی کے نزدیک کوئی مول نہیں ؟ بیوی جو مزے سے ایک بچہ پیدا کر رہی ہوتی ہے ۔

آخر عزرائیل کی بہن نرس لیبر روم سے تھوتھنی نکالتی ہے اور میاں سے مختصر سا خطاب کرتی ہے " IT,S A BOY " اور میاں اپنی گھبراہٹ میں نرس سے کہتا ہے " CONGRATULATIONS " اس سے پہلے کہ میاں بیوی کی حالت پوچھ سکے نرس جا چکی ہوتی ہے ۔

اب میاں ہمت کرتا ہوا اندر جاتا ہے اور بیوی کو اس جانکاہی کے بعد آرام سے سوتا ہوا دیکھتا ہے ۔ اس کا سارا اندر ابل کر باہر آجاتا ہے مگر وہ یہ نہیں جان پاتا کہ اب کیا کرے ؟ ہنسے یا روئے ؟ وہ ہنس اس لئے نہیں سکتا کہ خدا اور عورت کے درمیان عظیم سازش کا ایک اور شکار چلا آرہا ہے ۔ اور رو اس لئے نہیں سکتا کہ اس کی اپنی طرح کا ایک اور گدھا پیدا ہو گیا ۔ جو بڑا ہو کر ضرور مصیبت میں مبتلا ہوگا اور پھر شادی کر کے زندگی بھر دوائیں ڈھولائے گا چنانچہ اس وقت میاں کو بھی ڈاکٹر پرچی پر کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہے اور میاں بیوی کو کسی چچی یا پھوپی کی تحویل میں دے کر خود بازار سے دوائیں خریدنے نکل جاتا ہے ۔ لوٹتا ہے تو بیوی جاگ رہی ہوتی ہے وہ شکوہ شکایت کی نظر سے میاں کی طرف دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو ۔ " اس دکھ کی دنیا میں کوئی دوا ہے " ۔ لیکن میاں اب تک جان چکا ہوتا ہے ۔ اس لئے دواؤں کا بنڈل کھولنے کی بجائے وہ کوئی اور ہی پیکٹ کھولتا ہے جس میں سے گلابی رنگ کی نہایت خوب صورت ساڑی

نکلتی ہے اس کے بعد ایک اور ڈبیا جس میں سے طلائی گھڑی برآمد ہوتی ہے اور میاں آنکھ میں محبت اور تاسف کے آنسو لیئے ایک الٹی رکشا بندھن کی شکل میں گھڑی بیوی کی کلائی پہ باندھ دیتا ہے اور ساڑی اس کے قدموں پہ نثار کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"بنو یہ رشوت ہے، مول نہیں۔"

اور بیوی کے چہرے پہ پھر سے ایک دل کش مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ جو ارگنٹ اور لانسول وغیرہ کبھی نہیں لاسکیتں۔

یہ ہم شوہر بھائیوں ہی کی ہمت ہے کہ بیماریوں کے اس پٹارے سے جسے بیوی کہتے ہیں، محبت کرتے چلے جاتے ہیں اس سلسلے میں مجھے منشی پریم چند کا ایک افسانہ یاد آتا ہے جس میں ایک بیوی اپنے نکّے، نکھٹو اور سادہ لوح میاں کا رونا روتی ہے اور آخر میں اس بات پر حیران ہوتی ہے کہ اس کی سب ایسی باتوں کے باوجود وہ کہیں آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جائے تو اس کی ساری کائنات الٹ جاتی ہے۔ عینہ یہ بات میں اپنی بیوی کے سلسلے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سارے لڑائی جھگڑے فساد اور گوناگوں بیماریوں کے باوجود میں سرشام اپنے آپ کو اس کی تحویل میں پاتا ہوں اور پھر میرے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو مرزا اسد اللہ خان غالب کے ساتھ ہوا تھا۔

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

(شگوفہ جنوری ۱۹۸۵ء)

فلمی زندگی اور چنا جور گرم

ابراہیم جلیس

تاریخ پیدائش ۲۲/ستمبر ۱۹۲۳ء گلبرگہ
تعلیم بی اے (علی گڑھ)
ہجرت ۱۹۴۸ء پاکستان
آخری مصروفیت: مدیر روزنامہ انجام
تصانیف زرد چہرے، چور بازار (ناول) چالیس کروڑ بھکاری، تکونا دیس، کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں، دو ملک ایک کہانی، پبلک سیفٹی ریزر، ترنگے کی چھاؤں میں، اجالے سے پہلے (ڈرامہ) ہنسے تو پھنسے، او پر شیروانی اندر پریشانی، شگفتہ شگفتہ
انتقال ۲۶/اکتوبر ۱۹۷۷ء

مجھے اس آب و گل کی دنیا، سیاسی دنیا، ادبی دنیا اور علمی دنیا سے زیادہ فلمی دنیا بہت پسند ہے ۔ اگرچہ مجھے اداکار بننے کا کبھی بھی شوق پیدا نہیں ہوا لیکن میرا جی چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہے (آخر جی ہی ٹھہرا کچھ نہ کچھ چاہے گا ضرور) کہ میں کم از کم فلمی افسانہ نگار کی حیثیت سے اس روزمرہ کی دنیا میں اپنا نام پیدا کروں

چنانچہ خاصی بڑی عمر میں یعنی تقریباً بائیس سال کی عمر میں ایک دن میں گھر سے فرار ہوگیا ۔ ان دنوں بمبئی کو "بھگوڑوں کی جنت" کہا جاتا تھا، بمبئی میں میرا ایک شاعر دوست ساحر لدھیانوی رہتا تھا ۔ جو ان دنوں فلمی شاعر بننے کی دھن میں شعر لکھنے سے زیادہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، وکٹوریہ ٹرمینس عرف بوری بندر اسٹیشن سے میں اس کے پاس پہونچا تا کہ سر چھپانے کو نہ سہی کم از کم اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھنے کی جگہ مل جائے ۔

ساحر لدھیانوی نے مجھے علمی دنیا سے نکل کر فلمی دنیا میں آنے پر مبارکباد دی اور بھنے ہوئے چنے پیش کئے کہ اس کی عادت پہلے دن سے ہی ڈالنی چاہئے کیونکہ ہندوستانی فلمی صنعت اور نخود بریاں یعنی بھنے ہوئے چنوں کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے میں نے بھونے ہوئے چنے کھاتے ہوئے پوچھا:

"فلمی دنیا میں نام پیدا کرنے کے لئے مجھے کیا کیا کرنا پڑے گا؟"

ساحر لدھیانوی نے چنے جتنا مختصر جواب دیا ۔

"کچھ نہیں، چنے چبانا پڑے گا پہلے پہلے بھونے ہوئے چنے، بعد میں لوہے کے چنے"

چنے کھانے کی عادت ڈالو، یہ فلمی دنیا کی مخصوص غذا ہے، آج فلمی دنیا کے جتنے بھی باشندے ستارے بن کر چمک رہے ہیں وہ سب پہلے چنے کے دانے تھے ۔"

میں گھبرا گیا اور بولا.

اگر یہ بات ہے تو میں فلمی دنیا سے پھر علمی دنیا میں لوٹ جاؤں گا۔

ساحر لدھیانوی ہنسا اور بولا:

"بس ابھی سے گھبرا گئے صرف چنوں سے ڈر گئے، ارے میاں اب تو لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔ ہمت سے کام لو میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔"

ساحر لدھیانوی کی رفاقت کے تصور نے ہمت بندھائی اور مٹھی بھر چنے منہ میں ڈال گھوڑے کی طرح ہنہنا کر ہنسا اور بولا اچھا، ہرچہ باداباد۔۔۔ میں چنے کھانے کے لئے تیار ہوں اور لوہے کے چنے چبانے سے بھی نہیں ہچکچاؤں گا۔

ساحر لدھیانوی نے میری پیٹھ ٹھونکی اور ہم بس میں سوار ہو کر دادر پہونچے، دادر ایک اعتبار سے بمبئی بلکہ ہندوستان کی فلمی دنیا کا مرکز ہے وہاں آپ کو پانچ چھ اسٹوڈیوز بے شمار، فلم کمپنیوں کے دفتران گنت اکسٹرا ایکٹریسیں اور لاتعداد دلے نظر آئیں گے۔ ساحر لدھیانوی، میرا وہاں کی ایک مشہور فلم کمپنی کے مشہور فلم ساز سے تعارف کرانا چاہتا تھا مجھ پر اس مشہور فلم کمپنی اور مشہور فلم ساز دونوں کا بڑا غائبانہ رعب تھا، میں جی ہی جی میں بڑا خوش ہوا کہ اگر اس مشہور فلم ساز سے میرا تعارف ہو گیا اور اس مشہور فلم کمپنی میں مجھے کام مل گیا تو پھر ترقی کے لئے مجھے زیادہ دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑے گی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس مشہور فلم کمپنی کا کوئی اتنا بڑا دفتر ہو گا جتنا کسی بادشاہ کا محل ہوتا ہے لیکن ایک لانڈری اور ایک ایرانی ہوٹل کے درمیان ایک تنگ سے زینے کے پاس پہونچ کر ساحر نے کہا

"لو اب تیار ہو جاؤ، کہیں اس مشہور فلم کمپنی اور فلم ساز سے مرعوب نہ ہو جانا بلکہ ہر ممکن طریقہ سے انھیں مرعوب کرنے کی کوشش کرنا۔"

میں نے نکٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔ سر کے جمے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے بگاڑ کر بے ترتیب کر دیا اس طرح کہ بڑا بے نیاز قسم کا ادیب نظر آؤں جو اسی عالم بے نیازی سے ملکہ الزبتھ کے سامنے بھی چلا جائے، یہ مشہور فلم ساز کیا حقیقت رکھتا ہے؟

زینہ طے کر کے ہم ایک تنگ سے کمرے میں داخل ہوئے جس میں دو میزیں آمنے سامنے رکھی ہوئی تھیں جس کے ایک طرف ایک بھاری بھرکم سیاہ فام چیچک رو آدمی سیاہ رنگ کے گیبرڈین کی ایک پتلون اور میلی سفید قمیص پہنے بیٹھا تھا۔ سامنے دو فالتو قسم کے آدمی بیٹھے تھے اور دیوار کے ساتھ ایک صوفے پر تین نوجوان لڑکیاں بے تحاشہ پاؤڈر سرخی تھوپے اور لپ اسٹک لگائے بیٹھی ہوئی تھیں، تینوں لڑکیاں خوب صورت کم اور خوب جسم زیادہ تھیں، ہمارے داخل ہوتے ہی بھاری بھرکم سیاہ فام چیچک رو آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا

"آؤ جی اپنا شاعر صاحب! تم سالا بڑے ٹائم کے بعد ادھر میں آیا ہے۔"

ساحر نے مسکراتے ہوئے بڑے نیاز مندانہ انداز میں اس سے ہاتھ ملایا۔

میں بڑا حیران ہوا کہ اس بدتمیز آدمی نے ساحر کو سالا کہدیا اور ساحر ہے کہ اس طرح نیاز مندانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر خلوص کا مظاہرہ کر رہا ہے، لیکن اس وقت ساحر نے کہا:

"سیٹھ جی، میں آپ کو اردو کے ایک بہت بڑے ادیب سے ملانے لایا ہوں، ان سے ملئے: یہ مسٹر ابراہیم جلیس موجودہ دور کے چوٹی کے

ادیب ۔"

سیٹھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"آئی سا (آیسا) ؟ ابھی سالا ہم تم سے مل کر بہت خوش ہوا" سیٹھ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھادیا لیکن یہ سالا ؟ میں نے طوہاً وکرہاً ہاتھ ملالیا اور پھر ہم سب بیٹھ گئے سیٹھ نے کچھ میری طرف اور کچھ ساحر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"ابی آپ لوگ کیا لینگا سوڈا لینگا یا چائے لینگا"

ساحر نے کہدیا "چائے لینگا سیٹھ"

سیٹھ نے نوکر کو آواز دی

"ارے رام مراٹھے! باہر والے کو سات پونے بول"

میں دل میں سوچنے لگا کہ کیا یہ وہی مشہور فلم ساز ہے جس نے وہ پانچ ہندوستان گیر شہرت رکھنے والی فلمیں بنائی ہیں جن کے نام میں یہاں مصلحتاً نہیں بتاسکتا! یا پھر ساحر لدھیانوی میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں، یہ سیٹھ بلکہ یہ سیٹھ سالا ایسی پھٹیچر حالت میں یہاں بیٹھا ہے ۔ کپڑے میلے، دو کمروں پر مشتمل فلم کمپنی کا دفتر اور رام مراٹھے اور باہر والا اور تین خوب جسم عورتیں کیا یہی ہے فلمی دنیا؟ ۔۔ میں تو کیا کیا تصورات لے کے آیا تھا، سوچتا رہتا تھا کہ فلمی دنیا اس عملی دنیا سے کتنی مختلف اور کتنی شاندار ہوگی! لیکن قریب آنے پر یہ کتنی بھیانک نظر آرہی ہے میں یہی سوچ رہا تھا کہ سیٹھ نے اپنی جیب سے بھونے ہوئے چنے نکال کر میز پر بکھیر دیئے اور بولا:

"لو جی منسی جی ۔۔۔ چائے آنے تک ذرا منہ چلاؤ"

پھر بھونے ہوئے چنے چباتے ہوئے سیٹھ نے ساحر سے پوچھا ۔ "ابھی آپ نے وہ ہمارا گیت لکھ لیا ہے تو فرسناؤ نا"

گیت کی سچوشین یہ تھی کہ ہیرو اور ہیروئن کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہیں لیکن ہیروئن کی ہمراز سہیلی اس غلط فہمی سے واقف ہے اور وہ بذریعہ گیت دونوں کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہے ، ساحر نے ایک میٹر آف فیکٹ قسم کا گیت سنایا لیکن سیٹھ نے پسند نہیں کیا اور بولا:

"اپنا شاعر صاحب اس کو تم ذرا مجیدار (مزیدار) بناؤ ۔ اس گیت میں عورت کا جو بن ہونا چاہئیے ہم اس میں پنچھی لوگ اڑنا مانگتا ہے ۔ ذرا پریم کی بات بھی منگتا ہے ۔"

ساحر نے مسخرے پن سے جواب دیا:

"سیٹھ تم فکر نہ کرو ۔ ہم اس میں عورت کا جو بن بھی بڑا مجیدار دکھائے گا اور ہر مصرع میں دو پنچھی لوگ اڑائے گا اور سارے گیت میں پریم تو کوٹ کوٹ کر بھر دیگا ۔ اچھا ۔ اب اڈوانس ایک پانچ سو روپیہ تو دلادو ۔ ہمارا دوست آیا ہے ہم اس کو بمبئی کی سیر کرانا منگتا ہے اور ہم تم کو اس سے بھی ایک زوردار اسٹوری لکھا دے گا ۔"

سیٹھ نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور میں حیران رہ گیا کہ یہ میلی پتلون، ہزاروں لاکھوں اعلیٰ پتلونوں سے زیادہ قیمتی تھی کیونکہ ایک مٹھی میں اس پتلون سے کوئی دو تین ہزار روپیہ نکل آیا اور اس میں سے پانچ سو روپیہ بغیر کسی رسید کے سیٹھ نے ساحر کو دیدیا

اور بولا

"ہاں جی رائٹر۔۔۔آپ کے مائنڈ میں کوئی فس کلاس اسٹوری کا آئیڈیا ہوئینگا تو ہم کو پہلے دکھادو تو ہم تم سے کانٹریکٹ کرینگا۔"
اس کے بعد ہم باہر نکلے۔۔۔میں نے ساحر سے پوچھا

"یار ساحر عجیب آدمی ہے یہ۔ اس کی جیب میں اتنا بہت سارو پیہ ہے اور یہ اتنا نامور آدمی ہے لیکن پھر بھی چنے کھاتا ہے۔"

ساحر نے کہا: یار تم نہیں جانتے اب سے سولہ سال پہلے جب یہ مس کجّن کے عشق میں مبتلا گھر سے بھاگ کر بمبئی آیا تھا تو اس وقت اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اور وہ بمبئی کی سڑکوں پر دن دن بھر چنے کھا کر گھوما کرتا تھا۔ اب لکھ پتی ہے لیکن اس زمانہ میں بھی وہ چنوں کو نہیں بھولنا چاہتا پھر ساحر نے مجھے ایک اور فلم پروڈیوسر کا قصہ سنایا جو مفلسی سے متمول تک چنے کھاتا رہا۔ لیکن دولت مند ہونے کے بعد وہ ان چنوں کو بھول گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جبکہ اس کی ساری فلمیں فیل ہوگئی ہیں اور اسے کہیں کام نہیں ملتا، آج وہ دادر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے جبکہ اس کی جیب میں چنے کھانے تک کے لئے پیسے نہیں ہیں۔

اس کے بعد میں دانہ، نخود بریاں پر ایمان لے آیا اور فلمی کہانی لکھنے میں مصروف ہوگیا اور اس کے بعد دو سال تک میں نے مسلسل چھ سات فلمی کہانیاں لکھیں لیکن ایک فلمی کہانی بھی نہ پسند کی گئی اور نہ فروخت ہوسکی، ناچار مجھے تینوں وقت چنے کھا کھا کر اپنا پیٹ بھرنا پڑا۔ ایک دن تنگ آکر میں نے فلمی دنیا سے متعلق ایک فلمی کہانی لکھی جس کا نام تھا "چناجور گرم" اس میں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ فلم ساز، فلم ڈائرکٹر، ہیرو، ہیروئن، ویلن اور کامیڈین پھر اسٹوری رائٹر، شاعر وغیرہ کس طرح چنے کھاتے ہیں، کیوں کھاتے ہیں؟ ایک دانہ، بریاں پر، ہیروئن ہیرو کی طرف کس طرح راغب ہوتی ہے اور ایک دانہ، بریاں کی خاطر ویلن اور کامیڈین کو کیا حرکاتِ ناہنجار کرنی پڑتی ہیں جب میں نے یہ فلمی کہانی ایک پروڈیوسر، ایک ڈائرکٹر، ایک ہیرو اور ایک ہیروئن، ایک ویلن اور ایک کامیڈین کی موجودگی میں سنائی تو سب کے سب پھڑک اٹھے اور منہ مانگے داموں، وہ فلمی کہانی خریدلی۔ اس کے بعد جب پروڈیوسر نے مجھ سے اسی قسم کی "بے دار" کہانی لکھنے کی دعوت دی اور اڈوانس رقم بھی دینا چاہا تو میں نے آنکھوں میں آنسو لاکر ہاتھ جوڑ کر ان سے کہا

"اب تو میں سیدھا اپنے وطن جاؤں گا۔ اپنے معدے کا علاج کرواونگا اور جب پھر سے میرا معدہ چنے کھانے کے قابل ہوجائے گا تو پھر میں بمبئی کا رخ کروں گا۔ اب تو کان پکڑتا ہوں۔

اس کے دوسرے ہی روز میں اپنا بوریہ بستر سمیٹ حیدرآباد دکن بھاگ گیا۔ اور گھر پہونچکر اپنی والدہ کے قدموں میں مبلغ پانچہزار روپے اور مٹھی بھر چنے رکھ کر بولا:

"ماں فلمی دنیا سے میں دو نادر تحفے تیرے لئے لایا ہوں، میری ماں نے چنے پھانک کر روپے گننے شروع کردیئے۔

بات پرانی ہوگئی ہے لیکن اب جب کبھی میں کسی خوش پوش آدمی کو سڑک پر سے چنے کھاتا ہوا گذرتا دیکھتا ہوں تو فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ یہ ضرور فلمی دنیا کا آدمی ہے آپ کو بھی جب کوئی خوش پوش شخص سڑک پر سے چنے کھاتا ہوا گذرتا نظر آئے تو آپ بغیر کسی جھجک کے روک کر اس سے پوچھئے کہ آپ کس فلم میں کام کر رہے ہیں تو وہ آپ کو بغیر کسی تکلف کے اس فلم کا نام بتادے گا

(شگوفہ، ابراھیم جلیس نمبر مئی ۱۹۷۸ء)

—

مخلص بھوپالی

غالب کا غیر مطبوعہ خط

نام، عبد الاحد خاں
قلمی نام، مخلص بھوپالی
تاریخ پیدائش، ۱۹۱۸ء
تعلیم، میٹرک
مصروفیات، ٹیلرنگ، موٹر پارٹس، امپورٹ اکسپورٹ وغیرہ
کتابیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ، پاندان والی خالہ (تین حصے) غفور میاں،
شیطان جاگ اٹھا ادارت بھوپال پنچ، ہفتہ وار (جون ۱۹۶۰ء تا نومبر ۱۹۶۲ء)
وفات، ۱۹۷۷ء

سن میری جان --- مکتوب ملا --- مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غم تنہائی بھلا دیا - وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا بلاشبہ میرانیس پڑھ پائیں تو اکبرالہ آبادی بن جائیں ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو - ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو میں خوشامدی نہیں جو منہ دیکھی کہوں - ہنوز تمہارا منہ دیکھا نہیں دیکھنے کی آرزو ہے - غالب کی تعریف کرنا کیا عیب ہے - خدا تمہیں دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے اور اس فراوانی سے کہ محنت سے جی چرانے والے نکمے لوگ سوشلزم کے نعرے لگاکر اس میں حصہ دار بن جائیں اچھا اب سنو احوال واقعی ایک خط تمہارا شفا گوالیاری لائے دوسرا اب تمہارے شہر کے ایک وکیل حبیب احمد لائے - ایک قرینہ سے معلوم ہوا کہ تمہاری عمر اور صحت پابہ رکاب ہے پھر کیا حجاب ہے یہاں آنے میں کیا دیر ہے - موت جیسے عظیم فرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کیوں ؟ معلوم ہوتا ہے کسی سیاسی جماعت کے رکن ہو کہ موت سے بھی فریب کھیل رہے ہو اللہ تمہیں توفیق عطا کرے تو میری شکایت دور ہو -

اور سنو میاں! ایک نئی افتاد آپڑی بیکنٹھ سے ہر گوپال تفتہ خالص محبت میں مجھ سے ملنے آئے - پروانہ راہداری (پاسپورٹ) ملا نہیں آؤ دیکھا نہ تاؤ - کھوکرا پار کیا اور آدھمکے فرشتوں نے سچ نہیں کیا کھا پکڑ لئے گئے **قالوا ان اللہ وانا الیہ راجعون** پاؤں میں بیڑی ہاتھ میں ہتھکڑی چولہے میں جائے ایسی محبت جو ایک مخلص کو حوالات پہونچا دے! تمہارے حبیب احمد نے جو یہ قیس اور قفس کی بات سنی تو فی الفور صدر الصدور کی عدالت میں تفتہ کی طرف سے وکالت نامہ داغ دیا - دلائل پیش کئے - مخبر نہ جاسوس - رہائی نصیب ہوئی کیا غالب کہاں کا غالب - غالب پے لعنت بھیجی - راتوں رات پھر بیکنٹھ جا پہونچا - اب ذلت کا احساس رفع ہو تو پھر میرا خلوص زور مارے تو ملنا نصیب ہو - دیکھو اللہ کب ملاتا

ہے ۔ ویسے بھگوان کی مرضی کو بھی دخل ہے سو بھگوان تک سفارش لیجانے کی سکت نہ ہمت ۔ خدا اور بھگوان میں احتجاجی مراسلے چوبیس برسوں سے آجار ہے ہیں دونوں اپنی جگہ پر نامطمئن دعا کرو خدا اور بھگوان میں مصالحت کی کوئی صورت نکلے تو شرفاء کو پناہ ملے ۔ انسانیت کو امان!

جب تمارے حبیب احمد شروع شروع آئے تو سخت پریشان اور بیزار رہے ۔ شب و روز دنیا کو یاد کر کے زار و قطار روتے تھے ۔ ہمہ وقت کی گریہ وزاری نے خستہ حال کر دیا تھا ۔ جب فرشتوں نے فرد جرم کا ایک دفتر سامنے لاکر رکھا تو ہوش کھو بیٹھے ۔ رونا دھونا بھول گئے ۔ گناہوں کی فہرست بہ طریق گناہ ہائے کبیرہ و صغیرہ طویل ہے ابھی تک مجھے صرف ایک گناہ کا پتہ چلا ہے کہ موصوف نے دنیا میں رہ کر بہت سارے قاتلوں کو سزا اور قضا سے کیوں بچایا ۔ جواب دیا کہ یہ فرد جرم قبل از وقت ہے ۔ ایسے تمام مفروضہ قاتلوں کو عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ ان کے روبرو اس باب کا آغاز ہو ۔ درخواست منظور الله الله اس ذہانت کا کوئی جواب ہے ۔ آج تک کسی گناہ کا اقرار کیا، نہ ہی اپنے پر ذمہ داری لی ۔ بلکہ جواباً عرض کیا کہ کراماً کاتبین کو طلب کیا جائے ۔ تاکہ ان سے جرح بحث کرنے کا موقع مل سکے دیکھو عدالت سے کیا اب حکم ہوتا ہے ۔ کراماً کاتبین کا حاضر ہونا ممکن نہیں، ہمہ وقت مصروف! اس عرض داشت پر جدید گناہ گاروں میں خاصی چہل پہل ہے ۔

برادرم حبیب احمد کے پاس کوئی منشی نہ اہل پیش دامن نہ پیش دست تن تنہا مصروف ہیں کہتے ہیں ایسے وقت پر اگر لاڈلی سرن سنہا وکیل آپہونچے تو کام ذرا آسان ہو ۔ یہ کون سنہا ہیں ان کو مرحوم کا پیغام پہونچا دو ۔ تاکید جانو ۔ لوگوں نے کہا یہاں ہندو نہیں آسکتا حبیب نے کہا وہ ہندو ہے نہ مسلمان ۔ بیک وقت دنوں کا ہونا وہ ثابت کرسکتا ہے الله الله کیسے کیسے بزرگ آج بھی دنیا میں ہیں جو ہندوؤں میں ہندو اور مسلمانوں میں مسلمان ۔ میرے زمانہ اور زندگی میں ایسی سیکولر مخلوق کہاں تھی ۔

اور کیا لکھوں، روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ خوف و دہشت نہ پولیس کا ڈر نہ کوئی مخبر، نہ کوئی جاسوس، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے نہ کپڑا خریدنا پڑے ۔ نہ گوشت منگاؤں نہ روٹی پکاؤں، نہ مئے نہ ساغر نہ تبرید ۔ نہ قرضدار بس عالم نور سراسر سرور! اگر باز پرس اور ختم ہولے تو پھر کیا ہے نور علی نور ۔ اچھا بس سب کو سلام کہو ۔ رہا میرا تو میں ۔ یکے مردہ شخصم، مردی رواں ۔ الله بس باقی ہوس ۔ نجات کا طالب ۔ غالب ۔

(شگوفہ تخلص بھوپالی نمبر نومبر ۱۹۷۷ء)

سلمیٰ صدیقی

بُرا نہ مانیں

نام سلمیٰ صدیقی
تاریخ پیدائش ۱۸ / جون ۱۹۳۰ء بمقام بنارس
تعلیم: ایم اے اردو
ابتدائی ملازمت، لکچرر اردو (چار سال)
تصانیف: سکندر نامہ
مصروفیات: سماجی و ادبی خدمات
رہائش: بمبئی

ہمارے دیش میں مہنگائی کے ساتھ ساتھ برا ماننے والوں کی تعداد اتنی بڑھتی جارہی ہے کہ اچھا ماننے والے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے ۔۔ پہلے زمانے میں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا تھا ۔ لیکن اسمگلنگ کے نئے نئے طریقے ڈھونڈلینے کی کوشش میں اب انسانوں نے خدا کو ڈھونڈنے سے ہاتھ اٹھالیا ہے ۔ اسی لئے تو بھی اور ہاتھ کی صفائی دکھانے والوں کو یہ دنیا دن بہ دن راس آرہی ہے ۔

پہلے زمانے میں " برا نہ مانیں " کا فقرہ ایک محاورے یا معذرت کے طور پر بولا جاتا تھا ، آج کل اس فقرے کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر اگر بیٹا باپ کو اس کے حق سے ہٹانا چاہے تو اس کے لئے کسی دوڑ بھاگ یا سازش کی ضرورت نہیں ہے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ابا جان ، آپ برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ آپ نہایت احمق ہیں ۔ اس فقرے پر ابا جان چاہے کتنے ہی سٹپٹا جائیں ، صاحبزادے کی سعادت مندی پہ کسی طرح کا شبہ نہیں کر سکیں گے اس لئے کہ فقرے کے ساتھ برا نہ مانیں کا دم چھلا لگا ہوا تھا ۔

بیٹی کا جی چاہے تو بڑی خوشی اور اطمینان سے ماں سے کہہ سکتی ہے ، کہ اماں جان آپ برا نہ مانیں تو میں آج رات کو اپنے پڑوسی کے ساتھ بھاگ جاؤں ۔ پہلے زمانے کی اماں جان ہوتیں تو یہ فقرہ سننے کے لئے زندہ ہی نہ رہتیں ۔ لیکن آج کل کی امائیں چونکہ صرف یہی فقرہ سننے کے لئے زندہ رہتی ہیں ۔ اس لئے وہ صاحبزادی کے اس فیصلے پر اگر خوشی کا اظہار نہ کرنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں ۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہیں ۔ کہ بیٹی اگر برا نہ مانو تو رات کے بجائے دن کو بھاگنا ، تاکہ میری نیند میں خلل نہ پڑے ۔ یوں بھی آج کل لڑکیوں کا بھاگنا اور لڑکوں کا بھگانا بہت " OUT OF DATE " ہوگیا ہے ۔ برسہا برس سے لڑکے لڑکیوں کو بھگاتے بھگاتے اب اس فعل سے اس قدر اکتا گئے ہیں کہ لڑکیوں کے

لاکھ اکسانے پر بھی ان کے ساتھ بھاگنے پہ تیار نہیں ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ بلکہ بمبئی میں کئی دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی بلڈنگ میں ایک لڑکا رہتا تھا، رہتا تو پر وہ کیا تھا یہ سمجھئے کہ کبھی کبھی اس بلڈنگ میں اسی طرح جس طرح کبھی کبھی کالج میں، ریس کورس میں لڑکیوں کی باہوں میں یا کسی نشے میں پایا جاتا تھا ماں کی درخواست یہ تھی کہ بیٹا برا نہ مانو تو کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آجایا کرو تاکہ چور اچکے یا انشورنس والے ہمیں لاوارث نہ سمجھ لیں۔ ہاں تو وہ لڑکا جس بلڈنگ میں رہتا تھا۔ اس کی سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا تھا۔ کچھ دن تک تو چاند کا ٹکڑا اور دھرتی کا ٹکڑا ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے۔ اور اس امید پہ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے کہ ایک نہ ایک دن تو ظالم سماج ان کے بیچ آکھڑا ہوگا اور ان کو عشق کی بوریت سے بچالے گا۔ لیکن ظالم سماج نے بھی چونکہ اب اپنے پرانے رول سے بور ہو کے اپنا کیرکٹر بدل لیا ہے۔ اس لئے لڑکی اور لڑکے کے ملنے ملانے پہ پابندی لگانے کے بجائے جب "ظالم سماج" نے دونوں کی ملاقاتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو لڑکی اور لڑکے کے غصے اور بوریت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اور ایک دن جب لڑکی نے لڑکے سے بھاگ چلنے کی فرمائش کی تو لڑکا بھڑک کے بولا۔

" کمال کرتی ہو تم بھی اچھے بھلے آرام سے بیٹھے ہیں بھلا اس موسم میں جب صرف چلنے سے ہی پسینہ آجاتا ہے۔ مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے جو بھاگ جاؤں ۔۔؟" لڑکی نے کہا۔۔" مجھے خود کون سا بھاگنے کا شوق ہے لیکن بات اصل میں یہ ہے کہ وہ جو تمہارا دوست ہے نا اڈی اس نے کہا ہے کہ میں آج کل کچھ موٹی ہونے لگی ہوں۔ تو میں نے سوچا کہ اپنی اور تمہاری خاطر نہیں تو کم از کم تمہارے دوست اڈی کی خاطر ہی بھاگ بھاگ کے اپنا وزن کچھ تو کم کر لوں ۔۔۔" لڑکا بہت خوش ہو کے بولا ۔۔" بھئی اڈی نے ہمیشہ مصیبت میں میرا ساتھ دیا ہے مجھے بھی اس کے ساتھ کچھ نیک سلوک کرنا چاہیئے اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ بھاگنے کا ارادہ ترک کر کے اڈی کو تمہارے سنگ بھاگنے کا موقع دوں۔"

"ارے نہیں نہیں۔ ایسا نہ کرنا ۔۔۔" لڑکی بولی "اڈی میرے ساتھ تو کیا اپنی منگیتر تک کے ساتھ بھاگنے پر تیار نہیں ہوگا بڑا کاہل ہے وہ تو سوچو تو جو لڑکا بارہ بجے دن کو سو کے اٹھتا ہو وہ میرے ساتھ کیوں بھاگنے لگا ہاں تم برا نہ مانو تو تم ضرور میرے ساتھ بھاگ سکتے ہو۔"

لڑکے نے لمبی سی جمائی لے کے کہا ۔۔" بھئی کل رات رانی کے ساتھ ڈانس کرنے میں میرے پاؤں میں تو موچ آگئی ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ آج کیا آنے والے کئی دن تک میں نہیں بھاگ سکوں گا۔"

لڑکی بولی ۔۔۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھاگنے میں میری مدد نہیں کروگے کیا یہی صلہ ہے ہمارے اتنے پرانے پیار کا ۔۔۔؟"

لڑکا بولا ۔۔" اس میں شک نہیں کہ ہمارا تمہارا پیار اب آٹھ ہفتے پرانا ضرور ہو چکا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ آج کے زمانے کا یہ تقریباً سب سے پرانا عشق ہوگا کیوں کہ اس سے پہلے میں نے تم نے اور اڈی نے غالباً چار ہفتے سے پرانا عشق کبھی نہیں کیا۔ پھر بھی میں بھاگنے کے بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔"

لڑکی نے پوچھا ۔۔۔" لیکن آخر تم کیوں نہیں بھاگنا چاہتے ہو ۔؟"

لڑکے نے کہا ۔۔۔" پہلی بات تو یہ کہ بھاگنے کا موڈ نہیں ۔۔۔ دوسری بات یہ کہ عنقریب کرکٹ کا ٹسٹ میچ ہونے والا ہے، بھلا اس زمانے میں کون بھاگنا پسند کرے گا۔ اس کے بعد میری ممی کی ایک سہیلی کی بیٹی نیروبی سے آنے والی ہے، بلکہ وہاں سے بھاگنے

والی ہے، فوٹو سے پتہ چلتا ہے کہ چھوکری میں جان ہے۔ اس لئے میری جان اگر تم برا نہ مانو تو مجھے مت بھگاؤ۔"

لڑکی نے کہا۔۔۔ "مگر ڈارلنگ میں کیا کروں۔ مجھ پہ تو آج کل بھاگنے کا موڈ بری طرح سوار ہے۔ بچاری میں! جانے کس زمانے میں پیدا ہو گئی ہوں۔ کیسے کیسے بور لڑکوں کا زمانہ آگیا ہے۔ کہ کوئی لڑکی کو بھگاتا ہی نہیں ہے۔"

لڑکے نے کہا:۔۔ "تم ذرا جونی کو فون کر کے دیکھو وہ بھی آج کل بہت بور ہو رہا ہے کیوں کہ اس کو اپنے باپ کی دوکان پہ بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ پوچھ دیکھو شاید وہ بھاگنے پہ راضی ہو جائے۔"

لڑکی بھڑک کے بولی۔۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں نے جونی کو "CONTACT" نہیں کیا اب تک؟ ارے جونی کو۔۔ کوکو۔ بلو پپو۔ گلو، سب سے تو کہہ کہہ کے ہار گئی ہوں۔ کوئی بھی تو بھاگنے پہ راضی نہیں ہوتا ہے۔ سب سے مایوس ہو کر تمھارے پاس آئی تھی۔۔۔ مگر تم ہو کہ اپنی نیروبی والی گیسٹ کے انتظار میں ہو اور اس کے آنے میں تو ابھی ایک ہفتہ ہے۔ بیکار کا نخرہ کر رہے ہو۔ اس وقت تک تم چاہو تو بڑی آسانی سے کئی بار بھاگ سکتے ہو۔ میں پرومس (PROMISE) کرتی ہوں آٹھ دن سے زیادہ تم کو میرے ساتھ نہیں بھاگنا پڑے گا۔۔" ڈارلنگ۔۔۔ پلیز۔۔۔

لڑکی نے لڑکے کی لاکھ خوشامد کی مگر لڑکا برابر یہ کہتا رہا کہ برا نہ مانو تو کسی دوسرے لڑکے کا انتخاب کر لو جو بھاگنے میں تمہاری مدد کر سکے میں تو ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں کہ جب اس کا جی چاہے اکیلی ہی بھاگ جایا کرے۔!

(شگوفہ جنوری ۱۹۷۵ء)

عطاء الحق قاسمی
(پاکستان)

نام میں کیا رکھا ہے

نام: عطاء الحق قاسمی
پاکستان کے نامور کالم نگار ہیں ان دنوں ناروے میں پاکستان کے سفیر ہیں
تصانیف: روزن دیوار، قند مکرر، اور سفرنامہ

ایمسٹرڈیم کے بارونق سٹیشن پر پیرس جانے کے لئے گول مول سی چھت، مٹیالے رنگ اور بڑے بڑے شیشوں والی ٹرین میری منتظر تھی۔ یہاں آنکھیں وہی منظر دیکھ رہی تھیں جو دنیا کے کسی بھی ریلوے سٹیشن پر نظر آسکتا ہے، وہی مسافروں کا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنا، چہروں پر قدرے گھبراہٹ کے آثار، مناسب بوگی کی تلاش اور اس تلاش میں کامیابی پر سامان محفوظ جگہ پر رکھنے کے بعد یوں اطمینان سے سر سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بیٹھنا گویا ابھی ابھی بچہ جننے کے عمل سے فارغ ہوئے ہوں۔ ہوٹل سے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے میرے سوٹ کیس کی "مٹھ" ٹوٹ گئی تھی، چنانچہ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ میں ایک بھاری بھرکم بیگ لٹکایا ہوا تھا، ٹوٹی ہوئی "مٹھ" والا سوٹ کیس کاندھے پر تھا اور یوں میں چلتے وقت اس پتنگ کی طرح "کنی" کھا رہا تھا، جس کی "تڑانویں" صحیح نہ ڈالی گئی ہوں۔ دوسری طرف ایسی چال چلنے کے باعث میرے لئے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا چنانچہ چلتے وقت ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس بار بار میری ٹانگ سے ٹکراتا، جس سے مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا میں پنجاب کے کسی میلے میں رسے پر چلنے کے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوں اور نیچے کوئی بچہ جمورا کھڑا ہے جو مسلسل "ڈھول" بجانے میں مشغول ہے۔ اگر وطن عزیز میں مجھے کوئی اس ہیئت کذائی میں دیکھ لیتا تو میرا نام معززین کی فہرست سے ہمیشہ کے لئے خارج ہو جاتا، مگر یہاں تو ایسے معاملات میں راوی "ہتے ای خیراں" لکھتا ہے۔ چنانچہ میں ارد گرد سے بے نیاز مناسب بوگی کی تلاش میں افتاں و خیزاں آگے بڑھتا ہی چلا گیا اور بالآخر ایک جگہ پائیدان پر پاؤں رکھ کر ٹرین کی راہداری میں داخل ہو گیا۔ یہ راہداری والی بات یوں ہے کہ یورپ میں چلنے والی ٹرینوں میں شروع سے آخر تک ایک طویل راہداری کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کمپارٹمنٹ بنے ہوتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں یہ سسٹم ایئر کنڈیشنڈ یا فرسٹ کلاس کی

دگیوں میں نافذ ہے۔بہرحال میں کچھ دیر راہداری میں چلنے کے بعد بائیں جانب ایک ڈبے میں داخل ہوگیا۔یہ یقیناً ایک اپسٹر کمپارٹمنٹ
تھا کیوں کہ اس میں گنتی کے چند لوگ تھے سو، میں نے اپنا سامان سامان کے لئے مخصوص جگہ پہ رکھا اور دوسرے لوگوں کی نسبت کچھ زیادہ
ہی اطمینان کا سانس لے کر سر کو سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔جیسے میں ایک نہیں، بیک وقت دو بچوں کو جنم
دے کر فارغ ہوا ہوں!

سگریٹ کا ایک طویل کش لگانے کے بعد میں نے ارد گرد نظر دوڑائی تو اپنے ہاں کے کسی خوش ذوق شخص کے ڈرائنگ روم
جیسے صاف و شفاف اور خوبصورت کمپارٹمنٹ میں ایک بوڑھا، اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا گول مٹول سا بچہ، دو نوجوان اور ایک
خاتون بیٹھے نظر آئے تاہم ان میں سے دو افراد بالکل خاموش تھے ان میں سے ایک میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا جس نے ایک اخبار نہ
صرف یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پوری مضبوطی سے تھاما ہوا تھا بلکہ اسے اتنی بلندی پر رکھا تھا کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا دوسری اسی
سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون تھی جس کی گردن کھڑکی کی جانب تھی اور اس کا منہ اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے بند کیا ہوا تھا
انجن نے وسل دی تو اس کے ساتھ بیٹھا ہنڈسم ڈچ نوجوان اٹھا اور راہداری کو تیزی سے عبور کرکے نیچے پلیٹ فارم پر آگیا۔دوشیزہ اپنے
کمپارٹمنٹ کے باہر بڑے شیشوں والی کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے کھڑی تھی۔چند ہی لمحوں میں ٹرین کے تمام بیرونی دروازے خود بخود
بند ہوگئے اور پھر ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔اس پر پلیٹ فارم پر کھڑے ڈچ نوجوان نے آہستہ آہستہ گاڑی کے ساتھ رینگنا شروع
کردیا۔دوسری طرف میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص اسی انہماک کے ساتھ اخبار کے دونوں سروں پر اپنے پنجے گاڑے اور اپنا چہرہ اس کے
پیچھے چھپائے بیٹھا تھا۔یہ مقامی اخبار تھا اور یوں اس میں درج عبارت میری سمجھ سے بالا تھی مگر اچانک میری نظر ایک تصویر پر پڑی اور
اس کے ساتھ ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی کیونکہ اس نے اخبار الٹا پکڑا ہوا تھا اس پر میرے دل میں اس عجوبہ روزگار شخص کو
دیکھنے کے لئے پیدا شدہ تجسس میں اضافہ ہوگیا گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی تھی اور پلیٹ فارم پر ڈچ نوجوان ایک جگہ کھڑا ہوگیا تھا اور اب
وہ رومال ہلا رہا تھا۔خاتون اسی طرح اپنی ناک شیشے سے چپکائے جھکی ہوئی تھی اور جب رومال کے ساتھ اس نوجوان کا چہرہ بھی نظروں سے
اوجھل ہوگیا تو یہ خاتون سیدھی کھڑی ہوگئی اور پھر مضمحل قدموں اور اداس اداس چہرے کے ساتھ واپس اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی اس
کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور اب پرس میں سے رومال نکال رہی تھی اس کے برابر والا مسافر اسی طرح الٹے اخبار کو تھامے چہرہ چھپائے
بیٹھا تھا اور اب مجھے اس پر جیمز بانڈ کا شبہ ہونے لگا تھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے!!!" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بچپن سے ذہن پر نقش یہ کلمات عادتاً ادا کئے "ہیں جی!!!" سامنے
والے مسافر نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں یکدم اخبار چہرے سے نیچے کرتے ہوئے یہ لفظ خالص پنجابی لہجے میں ادا کئے، اس پر میری نظر
فوراً اس کے چہرے پر گئی۔یہ ایک پاکستانی شکل و صورت تھی۔اس نے بھی میری طرف دیکھا اور پھر فرط مسرت سے اپنا ہاتھ میری
طرف بڑھاتے ہوئے لاہوری لہجے میں "ساما لیکم" کہا اور خیر خیریت پوچھتے ہوئے کہنے لگا۔"بھاجی۔تسی دی اپنے لاہور دے باسی لگدے او"
(بھائی جان۔آپ بھی اپنے لاہور ہی کے باسی لگتے ہیں) جب میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے
کمال بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے ایک ہاتھ میری بغل میں دیا اور پھر قدرے اوپر اٹھا کر بھینچ لیا۔اس پر میں نے گھبرا کر کنکھیوں سے

اپنے ہم سفروں کی طرف دیکھا جو یہ "فحش" منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے چنانچہ میں نے خود کو اپنے اس پر خلوص ہم وطن کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی جو نہیں جانتا تھا کہ یورپ میں عورت اور مرد تو پوری آزادی کے ساتھ شارع عام پر گلے مل سکتے ہیں مگر یہاں مرد کا مرد کے ساتھ یوں معانقہ کرنا "قابل دست اندازی پولس" جرم ہے اور ایسے جوڑوں کو "شارع عام پر فحش حرکات" کے الزام میں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ اس اثنا میں میرے ہم وطن نے معانقے کے "دو پھیرے" مکمل کر لیئے تھے اور پھر اس نے تیسرا پھیرا مکمل کر کے مجھے بازو سے کھینچ کر سیٹ پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے برابر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر وہ محبت اور مسرت تھی جو کسی ہمدم دیرینہ کو مل کر محسوس ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے رویے میں کچھ خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی تھی، جیسے وہ محسوس کر رہا ہو کہ وہ اب اکیلا نہیں اس کا کوئی رفیق بھی اس کے ساتھ ہے :

"میرا نام رشید بٹ ہے اور میں کوچہ حیدر پہلوان میں رہتا ہوں۔" اس سرخ و سفید اور صحت مند نوجوان نے نام کے ساتھ "بٹ" کے اضافے سے کشمیری نژاد ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ میں بھی کشمیری نژاد ہوں، تمہاری رنگت اور نقوش دیکھ کر پہلے ہی اندازہ ہوا تھا کہ تم اپنی ہی برادری سے تعلق رکھتے ہو۔" میرے اندر کی اس عصبیت نے سر اٹھایا جو انسان کو ایک وسیع برادری کا فرد ہوتے ہوئے بھی خود کو چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ کر نجانے کیوں تسکین پاتی ہے میں نے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے "تم" سے مخاطب کر کے بے تکلفی کا رویہ بھی اپنا لیا تھا۔

"واقعی" ؟ اس نے مسرت سے سیٹ پر سے اچھلتے ہوئے کہا" پھر تو ہماری نانی بھی ایک ہو گی۔" "بے جی" کہا کرتی ہیں کہ کشمیریوں کی نانی ایک ہوتی ہے۔"

"تم چہرے کو اخبار سے کیوں چھپائے بیٹھے تھے ؟" میں نے اس کی بات سے لطف اندوز ہونے کے باوجود گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔ یہ الجھن مجھے مسلسل تنگ کر رہی تھی اور میں اسے، بہر حال رفع کرنا چاہتا تھا۔

"اوجی، بات یہ ہے کہ میرے ماموں جان نے چلتے ہوئے سمجھایا تھا کہ ٹرین میں کسی سے بات نہ کرنا اور چہرہ بھی چھپائے رکھنا

"مگر کیوں ؟" اس کی اس وضاحت سے میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

"جی اور اصل بات یہ ہے کہ میرے ماموں ایمسٹرڈیم میں آباد ہیں میں نے لاہور سے انہیں کئی خط لکھے کہ وہ میرے لئے ورک پرمٹ کا بندوبست کریں تاکہ میں بھی یہاں آسکوں، مگر وہ مجھے ٹرخاتے رہے پھر ایک دن میں گھر والوں کی اجازت سے خود ان کے پاس پہنچ گیا انھوں نے دو مہینے مجھے اپنے پاس رکھا۔ پھر کہا کہ تمہارے لئے یہاں نوکری کا انتظام نہیں ہو سکتا پیرس جا کر قسمت آزمائی کرو لہذا اب میں پیرس جا رہا ہوں۔۔۔"!

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے اخبار سے اپنا چہرہ کیوں چھپایا ہوا تھا" ؟ میں نے اپنا سوال دہرایا۔"

"اوجی، ماموں جان نے بتایا تھا کہ ایمسٹرڈیم میں قیام کے لئے تمہارا ویزا صرف ایک ماہ کا تھا، جب کہ تم نے یہاں دو مہینے قیام کیا ہے، لہذا رستے میں کسی سے فری نہ ہونا کوئی پاسپورٹ چیک کرنے آئے تو چہرے پر پریشانی ظاہر نہ ہونے دینا اور اس کے لئے یہ ہے کہ کوئی

اخبار وغیرہ سامنے رکھ لینا ۔ چنانچہ ڈبے میں داخل ہوتے ہی میں نے اخبار تھام لیا تھا کہ خدا جانے کب کوئی آجائے ! " بائیس تیئیس برس کے اس صحت مند ، خوبرو مگر سادہ لوح نوجوان نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور اس پر ضبط کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی ۔

" تمہیں علم ہے کہ تم نے اخبار الٹا پکڑا ہوا تھا ؟ "

" تو کیا فرق پڑتا ہے جی ، سیدھا بھی پکڑا ہوتا تو کون سا پڑھا جانا تھا ، وہ تو بس یونہی تھا جی ۔ " اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا ۔

" لاہور میں تمہارا کیا شغل تھا " " میں نے خالص پاکستانی ہونے کا ثبوت دینے کے لئے ایک خالص ذاتی سوال پوچھا ۔ ! گرمیوں میں شربت لگاتا تھا اور سردیوں میں ریوڑیاں بیچتا تھا ۔ " یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک بار پھر ندامت کے آثار نمودار ہوئے ، جیسے اس کا پیشہ محنت نہیں راتوں کو نقب لگانا تھا ۔

" بہت خوب ! " میں نے بھی منافقت سے کام لیتے ہوئے اس طرح سر ہلایا گویا اس کے پیشے کی بابت سن کر میرے دل میں اس کی قدر بڑھ گئی ہے ۔ حالانکہ ہم انسانی محنت کو تحقیر کی نظروں سے دیکھنے والے جس معاشرے کے فرد ہیں ، وہاں اس صحتمند رویے کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تاہم میرے دل میں اس نوجوان کے لئے ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی اور یہ غالباً اس کے بھولے پن کی وجہ سے تھی !

تم بہت بھولے ہو اور مجھے بہت اچھے لگتے ہو ، عیار لوگ مجھے زہر لگتے ہیں ! " میں نے دلی جذبات اس تک پہنچائے میری خواہش تھی کہ اس نوجوان میں کچھ خود اعتمادی پیدا ہو ۔

" جی " مجھے گھر میں اور باہر سب ہی بھولا ہی کہتے ہیں ، رشید بٹ کے نام سے تو کوئی جانتا ہی نہیں ، یہ تو میں یونہی آپ پر رعب ڈال رہا تھا ! آپ کا کیا نام ہے ؟ " اس نے کچھ بے ساختگی سے یہ بات کہی کہ میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی " " گھر والے " شہزادہ " کہتے ہیں ۔ باہر لوگ قاسمی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں ۔ "

" لیکن میں آپ کو بھاجی کہوں گا "

" جو جی چاہے کہو " میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا ،

" بھاجی بھاجی " اچانک اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے مجھے کہنی سے متوجہ کرتے ہوئے کہا ، " وہ لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے ! " میں نے کنکھیوں سے سامنے والی سیٹ پر دیکھا تو وہ پرس میں سے رومال نکال کر اپنی چشم تر کو دھیرے دھیرے پونچھ رہی تھی ۔ اس کا چہرہ ابھی تک حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا اور لگتا تھا اس کا محبوب اس کی آنکھوں سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی عکس بن کر اس " پانی کے گھر " میں رہتا ہے ۔ "

" بھولے ، بیوقوف بنا رہے ہو ۔ " میں نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا ۔

" نہیں ، بھاجی ، خدا کی قسم وہ ابھی آپ کو دیکھ رہی تھی ۔ "

" دیکھو بھولے ، ۔ ۔ ۔ "

" جی ، میں آپ کی بات کاٹنا اچھا تو نہیں لگتا ، لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں ۔ "

" ایسی کون سی بات ہے جس کا میں برا مانوں گا " میں نے حیرت سے پوچھا ۔

"جی، وہ بات یہ ہے کہ آپ میرے بڑے بھائیوں جیسے ہیں، آپ مجھے مار بھی لیں تو میں آنکھ نہیں اٹھا سکتا لیکن جی ایک بات کا ذرا خیال رکھیں۔"!

"وہ کیا؟" میری حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

"وہ جی جب پاسپورٹ والا آئے تو اس کے سامنے مجھے بھولانہ کہیں، "بٹ صاحب" کہیں۔ عزت کا معاملہ ہے!" یہ سن کر میرے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اس پر بھولے نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھرے۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنے رویئے پر شرمندگی سی محسوس ہوئی اور میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" بھولے میں معافی چاہتا ہوں، میرا مقصد تیرا دل دکھانا نہیں تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ پاسپورٹ والے کے سامنے اگر میں تمہیں" بٹ صاحب" بھی کہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ وہ ہماری زبان نہیں جانتا۔"

"آپ کی بات درست ہے!" میری وضاحت پر اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا اور اس نے سر جھکا لیا۔ لوگ اگر مجھے بھولا کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہیں۔"!

اس دوران شام ہوچکی تھی اور کمپارٹمنٹ میں بجلی کے قمقمے جل اٹھے تھے۔ بھولے کے برابر والے مسافر نے اپنے بیگ میں سے سینڈوچ نکالے اور ضرورت سے زائد ایک سینڈوچ یورپین بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے بھولے کی طرف بڑھایا اور کھانے کی دعوت دی بھولے کے چہرے پر ممنونیت کے آثار نمایاں ہوئے اور پھر اس نے بے ساختہ کہا" بس جی بسم اللہ کرو" اور اس کے ساتھ ہی اپنی غلطی کا احساس ہونے پر عجیب رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ باقی مسافر غالباً خاصے تھکے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے ابھی سے آنکھیں موندلی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے سر ایک دوسرے کے شانوں سے جالگتے تھے۔ سامنے والی دوشیزہ اب خاصی پرسکون نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک کتاب کھولی ہوئی تھی اور خاصے انہماک سے محو مطالعہ تھی لگتا تھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے بلکہ اس کے چہرے پر طمانیت کی لہریں یہ ظاہر کرتی تھیں گویا کچھ دیر پہلے کی جذباتی کیفیت یکسر ختم ہوگئی ہے اور اب وہ قطعی نارمل ہے میں نے گردن پھیر کر بھولے کی طرف دیکھا جو نیند بھری آنکھوں کے ساتھ سامنے بیٹھے ہوئے تیرہ چودہ سالہ لڑکے کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیکھنے کے بعد آنکھیں موند لیتا تھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سونا تو چاہتا ہے مگر تکلفاً ایسا نہیں کر رہا، تب میں نے اسے کہا کہ اگر نیند آئی ہوئی ہے تو سو جاؤ میں ابھی کچھ دیر بعد سوؤں گا۔ یہ سن کر وہ اٹھا سوتے ہوئے لڑکے پر ایک نگاہ ڈالی اور ٹائلٹ کی طرف چل پڑا کچھ دیر بعد وہ لوٹا تو اس نے پینٹ قمیص کی بجائے کرتا اور دھوتی پہنی ہوئی تھی اور دھوتی کا پلو ایک ہاتھ سے اسی طرح اٹھایا ہوا تھا جس طرح اسے اٹھایا جانا چاہیئے یا یوں کہہ لیں کہ جس طرح ہمارے ہاں ارد گرد سے آنکھیں بند کرکے اٹھایا جاتا ہے۔ دوغلے اخلاقی معیاروں کے حامل یورپی معاشرے میں یہ لباس فحاشی کی ذیل میں آتا ہے اور میں بھولے کو یونہی لوگوں کی چبھتی نظروں کا نشانہ بنتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اس کی حساس طبیعت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی بات کسی اور طریقے سے کہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" تمہیں دھوتی میں نیند آجاتی ہے"؟

"کیا مطلب جی، مجھے تو نیند ہی دھوتی میں آتی ہے۔" اس نے حیرت سے جواب دیا" اگر آپ کو بھی ضرورت ہو تو لادوں میرے

پاس دو تین ہیں۔"

"نہیں یار، مجھے اس کی عادت نہیں" میں نے کہا "ایک بار دھوتی پہن کر سویا تھا، صبح جب آنکھ کھلی تو دیکھا او پر لی ہوئی تھی

"ہاہاہا" بھولے نے پہلی بار کھل کر بے تکلفی سے قہقہہ لگایا "اس لباس میں بہت سہولت ہے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر دیکھو یہاں ایک بی بی بھی بیٹھی ہوئی ہے نیند میں آدمی آدھا مرا ہوا ہوتا ہے سو اگر تمہارے پاس کوئی شلوار ہو تو پہن لو۔"

وہ یہ سن کر بولا "بھاجی آپ ٹھیک کہتے ہیں، بہنیں اور بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں!" پھر وہ شلوار پہننے کے لئے چلا گیا۔ میں نے بھی کپڑے تبدیل کئے اور پیر ٹانگیں پھیلا کر اپنی ایک کٹر مذہبی ذہن کی امریکی گرل فرینڈ لوری کی تحفتاً دی ہوئی بائبل کھول کر بیٹھ گیا جو اس نے مجھے آخری DATE کے موقع پر دی تھی اور جس پر اس نے لکھا تھا "ATA, THE ONLY THING- I CAN GIVE YOU IS THIS BIBLE" بھولا کچھ ہی دیر بعد خراٹے لینے لگا تھا اور خدا جانے خراٹوں کی یہ کونسی قسم تھی؟ سامنے والی دوشیزہ نے اس دوران کتاب بند کر کے اپنے پہلو میں رکھی اور پھر سونے کی نیت سے اپنا سر کھڑکی کے ساتھ ٹکادیا۔ مگر لگتا تھا کہ بلب کی روشنی میں وہ سونے کی عادی نہیں ہے، کیوں کہ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی دو ایک بار اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا بھی مگر میں "پملا" بن گیا، کیوں کہ مجھے اس وقت تک نیند نہیں آتی جب تک کسی کتاب کے کچھ صفحے نہ پڑھ لوں یا کم از کم سونگھ نہ لوں۔

"ایکسکیوزمی" بالآخر اس نے مجھ سے براہ راست مذاکرات کا آغاز کیا "اگر تم برا نہ مانو تو بتی گل کردوں؟" اس کا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔

"ضرور ضرور" میں نے اس کے لہجے سے حوصلہ پاکر شرارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری موجودگی میں کتاب پڑھنے کے لئے میں بلب کی روشنی کا محتاج نہیں ہوں!"

میں جانتا تھا کہ یہ فلیٹرنگ ریمارکس دنیا کے کسی بھی حصے کی خاتون کا خانہ خراب کرنے کے لئے کافی ہیں، چنانچہ اس نے خوش دلی سے چہکتے ہوئے کہا "واقعی"؟

"ہاں" میں نے ہاتھ والی کتاب پرے دھرتے ہوئے سامنے والی کتاب پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا "بلکہ خوبصورت چہروں کی روشنی میں مطالعہ کرنے سے بینائی بھی درست رہتی ہے، ورنہ میں جتنا کتابوں کا کیڑا رہا ہوں، ابھی تک میرے چہرے پر کئی عینکیں چڑھی ہوتیں، مگر دیکھ لو ایک بھی نہیں ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خاصے پروفیشنل قسم کے مطالعہ کرنے والے ہو۔" اس نے اپنے گھٹنوں پر دونوں کہنیاں جماتے ہوئے آگے کی طرف جھک کر کہا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "البتہ کفرانِ نعمت کا کبھی مرتکب نہیں ہوا۔"

"تم خاصے کی چیز ہو، کہاں سے آرہے ہو"؟ اس نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں سے تم آرہی ہو "!

میں تو امریکہ سے آرہی ہوں ، تم بھی ادھری سے ۔ ۔ ۔ "

"ہاں ۔ میں بھی ادھری سے آرہا ہوں اور اب اپنے وطن کو واپسی ہے ۔ "

" تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں امریکی ہوں ؟ "

جس طرح ہر احمق شخص کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے کہ حضرات امیں احمق ہوں ، اسی طرح ہر امریکی اپنے امریکی ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے ۔ "

" تو تمہارا کیا خیال ہے ، امریکی احمق ہوتے ہیں " ؟ اس نے مصنوعی غصے سے پوچھا ۔

" نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ، بعض نہیں بھی ہوتے ۔ ویسے اگر تم چاہو تو میں تمہارا نام بھی بتا سکتا ہوں ۔ "

"سچ مچ ۔ " ؟ اس نے حیرت سے کہا " اگر تم میرا نام بتادو تو میں تمھیں مان جاؤں !"

" یہ کون سی مشکل بات ہے " میں نے کہا " تمہارا نام لنڈا ، شیری ، ڈیبرا ، بار برا ، نینسی اور میری وغیرہ کی پیٹنٹ فہرست سے باہر نہیں ہو سکتا ۔ "

" اوہ خدایا ! " اس نے قہقہے کو ضبط کرتے ہوئے کہا " میرا نام واقعی نینسی ہے ! "

" اب اگر تم کہو تو اس کا نام بھی بتادوں ، جو تمہیں اسٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا " میں نے صورت حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک نیا شوشہ چھوڑا ۔

" کیا تم اب کے بھی مذاق تو نہیں کر رہے " ؟ نینسی کے چہرے سے جوش وخروش جھلکنے لگا ۔

" ارے نہیں " یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ "

" تو پھر جلدی سے اس کا نام بتلایئے " نینسی نے بے تابی سے کہا ۔

" تو پھر سنو! اس کا نام " بی " (B) سے شروع ہوتا ہے ! " میں نے یہ سوچ کر تکا لگایا کہ اگر تیر نشانے پر بیٹھا تو اپنی " ولایت " پکی ہے ورنہ کہہ دوں گا کہ پامسٹری میں بڑے بڑے ماہر بھی ٹھوکر کھاجاتے ہیں ، کیوں کہ غیب کا علم صرف خدا کو ہے ! لیکن ہوا یوں کہ " بی " کا لفظ سن کر اس ڈبل بی (بی بی) کے منہ سے " اوئی اللہ قسم کی چیخ برآمد ہوئی اور وہ جوش جذبات میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے اور بھولے کے درمیان تنگ سی جگہ پر آکر بیٹھ گئی " ۔ اس کا نام اووے بجمن ہے ، تم نے کافی حد تک ٹھیک بتایا ہے ، تم ۔ تم پامسٹری کے پروفیسر تو نہیں ہو " ؟

" ہاں ، میں پامسٹری کا پروفیسر ہوں " میں نے گڑ بڑا کر کہا " اور سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پر طوطے سے توپ میں ہی چلاتا ہوں ! " " وہ بہت سویٹ ہے " نینسی نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا " میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں فنونِ لطیفہ کی طالبہ ہوں ، اپنے تھیسز کی تکمیل کے لئے ایمسٹراڈیم آئی تھی اور اب اسی سلسلے میں ایک روز کے لئے پیرس جارہی ہوں ، مجھے اسی روز واپس ایمسٹراڈیم پہنچنا ہے کیوں کہ وہاں ابھی میرا کام باقی ہے ۔ میری اس سے ملاقات دو روز قبل ایمسٹراڈیم کی آرٹ گیلری میں ہوئی تھی ہم ! اس ، قلیل عرصے ہی میں ایک

دوسرے کو بہت چاہنے لگے ہیں، مجھے اس کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"
"میں اس کے بارے میں مزید کچھ نہیں جانتا۔" میں نے خود پر نرم نرم سا دباؤ محسوس کرتے ہوئے قدرے سرک جانے میں عافیت سمجھی اور پھر کہا "البتہ تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔"
میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے بے تابی سے اپنا سنہری ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیا اور میرے سرکنے سے جو تھوڑی سی جگہ پیدا ہوئی تھی، اس نے گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس خلا کو پُر کر دیا بلکہ میں نے خود کو پہلے سے زیادہ " آرام دہ تکلیف " میں پایا۔
"پہلی بات یہ ہے کہ۔۔۔" میں نے دماغ کو ایک جھٹکا دیا اور پھر پورے اعتماد سے کہا۔ "تم بہت جذباتی ہو۔ فیصلے بہت عجلت میں کرتی ہو۔"
"بالکل ٹھیک ہے، میری ماں شروع سے مجھے اس پر ٹوکتی آئی ہے۔"
"دوسری بات یہ ہے کہ تم ایک بہت مخلص لڑکی ہو اور پیار کرنا تمہاری زندگی ہے۔"
"او خدایا! تم تو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو، مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے" اس نے اک ادائے خاص سے مجھے قریباً انہی نظروں سے دیکھا، جن کی تاب لانے کے لئے خاصے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔
"ابھی تو کچھ بھی نہیں، اور سنو" میں نے میدان صاف پاکر پیش قدمی کرتے ہوئے کہا" تم آج تک جس شہزادے کو ڈھونڈتی رہی ہو، اب اسے بہت جلد پالوگی اور اس کے لئے تمہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا کیوں کہ میرا نام شہزادہ ہے!"
"تم بہت شریر ہو۔" اس نے نزاکت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "جب تم کتاب پڑھ رہے تھے، اس وقت تو اتنے خطرناک نہیں لگتے تھے۔"
"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بھولا ٹھیک ہی کہتا تھا"
"یہ بھولا کون ہے اور وہ کیا کہتا تھا"؟ نینسی نے پوچھا۔
"بھولا وہ ہے، جو اس وقت تمہارے کاندھوں پر سر رکھے سو رہا ہے اور وہ کہتا تھا کہ تم اس خاکسار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی ہو"!
"ایسی تو کوئی بات نہیں" نینسی نے ایک زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا" میں نے تو تمہیں یونہی ایک سرسری سی نظر دیکھا تھا اور اس قسم کی نظر تو میں نے بھولے کے ساتھ والے بوڑھے پر بھی ڈالی تھی، جو اس وقت اپنے ساتھی کے کاندھوں پر سر رکھے یوں سو رہا ہے جیسے برسوں سے اس کے ساتھ رومانس چل رہا ہو۔"

ان کی بات چھوڑو میں نے ہنستے ہوئے کہا" یہ بتاؤ اب اس خاکسار کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے"؟
"فیصلہ یہ کیا ہے کہ کل شام کی ٹرین سے مجھے واپس ایمسٹرڈیم جانا ہے، اتنا عرصہ ہم اکٹھے پیرس میں گھومیں پھریں گے۔ اور دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ اب سو یا جائے کیوں کہ ایک بجنے کو ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی ایسا کرنے سے بھولا لڑھک کر مجھ پر آن گرا کیوں کہ ابھی تک اس کا سر نینسی ہی کے کاندھوں پر تھا۔ اس نے نیند کے عالم میں ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجسم

شباب نینسی کو اپنے بالکل قریب پاکر گھبراہٹ کے عالم میں قمیص گھٹنوں تک سرکالی میں نے اس دوران نینسی کو الوداع کہا تو بھولے نے نیم خوابی کے عالم میں پوچھا "بھاجی، بھاجی، پیرس آگیا ہے۔"؟

"نہیں لیکن یہ سمجھو کہ ہم پیرس ہی میں ہیں" میں نے مسکراکر اسے تھپکی دیتے ہوئے جواب دیا اور کچھ ہی دیر بعد اس کے خراٹوں کا کارواں پھر سے بادہ پیما ہوگیا۔ ٹرین رات کی خموشی اور ظلمتوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور بوگیوں سے نکلنے والی روشنیوں میں درختوں کے جھنڈ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نمودار ہوتے تھے اور آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے تھے!

اگلے روز صبح پانچ بجے، ہم پیرس کے اسٹیشن پر تھے۔ ہم نے اپنا سامان اسٹیشن کے لاکر میں محفوظ کرکے چابیاں جیب میں ڈالیں اور باہر نکل گئے۔ بھولے کو اس کے ماموں نے اپنے کسی دوست کا ایڈرس دیا تھا۔ چنانچہ وہ سٹیشن ہی سے، ہم سے رخصت ہوگیا۔ اس نے اپنا ایڈرس اور ٹیلیفون نمبر مجھے لکھ دیا تھا۔ نینسی اپنے تعلیمی فرائض کے سلسلے میں کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھ مجھے بھی ان مقامات پر کھینچتی پھری، جن سے مجھے دلچسپی نہیں تھی، البتہ بقیہ وقت باہمی دلچسپی کے امور پر "مذاکرات" میں صرف ہوا، اور پھر شام کو میں اسے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں گاڑی چلنے کے انتظار میں اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور اس کے ہونٹوں پر وہی پرانی خاموشی کی "مہر" ثبت تھی۔ اور اس دانے پر یہ "مہر" اس دفعہ میری تھی۔ سامنے والی سیٹ پر دو معمر خواتین بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ایک نوجوان فرانسیسی تھا، جس نے کتاب کھولی ہوئی تھی۔ انجن نے وسل دی تو میں سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیچے پلیٹ فارم پر آگیا اور پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی۔ نینسی راہداری میں کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ناک چپکائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر اُداسی کی لکیریں نمایاں تھیں اور وہ اپنے پرس میں سے رومال نکال کر آنکھوں کو تھپتھپارہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے رومال نکال کر ہلانا شروع کردیا اور پھر رفتہ رفتہ اس کا خوبصورت چہرہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اسے الوداع کرتے وقت مجھے یہ ہدایت کرنا یاد نہ رہا کہ ایک تو اس سفر کے دوران سامنے والے فرانسیسی نوجوان سے بتی گل کرنے کو نہ کہنا اور دوسرے اس سے میرا نام جاننے کی کوشش نہ کرنا شکسپیئر نے کہا ہے نام میں کیا رکھا ہے؟

(شگوفہ فروری ۱۹۸۵ء)

وجاہت علی سندیلوی

وقت کی بات

نام وجاہت علی سندیلوی
پیدائش. سندیلہ ضلع ہردوی
تعلیم: بی اے (ایل-ایل-بی)
مشاغل. وکالت سیاست اور ادب
تصانیف: نئی زندگی، طشت از بام (افسانے)
بے ساختہ و بے ضابطہ (مزاحیہ افسانے)
رقص تماشائی (مزاح)

بچوں کے لئے کتابیں
انتقال نومبر ۱۹۹۶ء

سنتے ہیں کہ کسی دانشور کا مقولہ ہے کہ دنیا کی سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ وقت! یہی وقت جو ہر لحظہ ٹک ٹک کرتی گھڑیوں کے ذریعے اڑتا بھاگتا ہے۔ ہمارے خیال میں جن صاحب کا یہ مقولہ ہوگا وہ دانشور کم اور لال بجھکڑ زیادہ تھے تب ہی تو انھوں نے ایسی باون تولہ پاؤرتی کی بات کہ جیم کے پیٹ میں نقطہ ہوتا ہے۔ بلا سوچے سمجھے بے دھڑک کہہ دی تھی ۔۔۔ لیکن اب یہاں یہ بتانا ضروری ہوگیا کہ لال بجھکڑ کس قماش کا جانور ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے نئے جوتے خریدے ان کی نمائش کرنے کا بہترین طریقہ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ ان کو پہن کر نماز پڑھنے کے بہانے مسجد جائے چنانچہ گیا لیکن جب نماز پڑھ کر وہ باہر نکلنے لگا تو اس نے دیکھا کہ ایک صاحب اس کے جوتوں میں زبردستی اپنے پیر ٹھونس رہے ہیں اس نے ایک دل دوز نعرہ مستانہ لگایا جس کو سنتے ہی وہ صاحب نو دو گیارہ ہوگئے۔ "ہائے میرے نئے جوتے۔" چیختے ہوئے جوتوں کا مالک کسی شکاری کتے کی طرح جھپٹا۔ ابھی پہلی ہی قلانچ لگائی تھی کہ درمیان میں ایک بزرگ آگئے اور انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "چھوڑئے مجھے میرے نئے جوتے جارہے ہیں۔" بزرگ نے کہ جنھیں آپ پہچان گئے ہوں گے کہ لال بجھکڑ تھے، فرمایا "فکر کس بات کی، میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ تمہارے جوتے چرانے والا کون ہے۔؟ میرے ساتھ آؤ!"

مرتا کیا نہ کرتا وہ بیچارہ ساتھ ہولیا۔ کافی دور تک اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے بعد لال بجھکڑ نے بڑے اہتمام سے اپنی جیب سے پانوں کی ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر اس میں سے ایک گلوری برآمد کر کے منھ میں رکھی۔ پھر اس ڈبیا کو جیب میں واپس ڈال کر دوسری جیب سے ایک چھوٹی ڈبیا نکالی اور اس میں سے کئی چٹکیاں تمبا کو نکال کر ہتھیلی پر رکھی پھر اس کو کئی مرتبہ کم و بیش کر کے پھانک لیا

پھر تیسری جیب سے ایک بہت ہی چھوٹی ڈبیا برآمد کی اور اس کو بڑی مشکل سے کھولا اور اس میں سے ذرا سا چونا نکال کر چاٹا منھ چلایا بہت ناپ تول کر پیک تھوکی اس سے کچھ زیادہ تسلی نہ ہوئی تو پھر مُھ چلایا اور پیک کی ایک دوسری پچکاری چھوڑی اور پھر یوں گویا ہوئے تو پھر بتاہی دوں کہ تمہارا جوتا کون لے گیا۔"

جوتے کے بیمار نے تقریباً کیا بالکل روتے ہوئے کہا، ضرور ضرور!! بتادیجئے، لیکن جی ہاں ذرا جلدی اتنی دیر میں تو میرا جوتا نخاس میں نیلام بھی ہو چکا ہوگا۔ تھوڑے وقفے کے بعد لال بُھکڑ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور تیسری پیک کو باہر تھوکنے کے بجائے اندر نگلتے ہوئے یہ الہامی جواب دیا" تمہارا جوتا لے جانے والا کوئی چور معلوم پڑتا ہے" کتنے پتے کی بات تھی اور پھر سو میں سو ایسی سچی کہ اس کے سننے کے بعد جوتا کھونے والا اپنے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھا۔ غالباً یہ ایک غیر متعلق اور ناقابل ذکر بات ہے کہ کچھ عرصے کے بعد پتا چلا کہ جوتا لے جانے والا لال بُھکڑ کا سالا تھا۔

لیکن یہاں بات تو وقت کی ہو رہی تھی اوقت اگر واقعی اتنا قیمتی ہوتا جتنا کہ اس بیچارے کو بدنام کیا جاتا ہے تو یقیناً سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ دنیا کا سب سے دولت مند ملک ہوتا کیونکہ وقت کی جو افراط اور اسی وجہ سے ناقدری یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے ملک میں ممکن ہی نہیں ہو سکتی یہاں شاید ہی کوئی ایسا بدقسمت ہو جس کو وقت کی کمی کا شکوہ ہو ورنہ ہمیں تو جو بھی ملا اس میں سے کسی نے شکایت کی کہ دن کاٹے نہیں کٹتا اور کسی نے فریاد کی کہ رات کاٹنے کو دوڑتی ہے انتظار، فراق اور فرصت کے ایسے رات دن کہ جب بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے ہماری شاعری کے ایسے مرغوب موضوعات ہیں جن پر معشوق کی کم سنی رقیب کے پاجی پن اور زاہد کی خفیہ مے نوشی کے بعد ہمارے شاعروں نے سب سے زیادہ دیوان سیاہ کئے ہیں۔

ہم ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ ہم وقت کے لئے نہیں بلکہ وقت ہمارے لئے بنا ہے۔ تحمل حسین خاں عیش کے لیے نہیں بلکہ بنا ہے عیش تحمل حسین خاں کے لئے وقت کو ہمارا پابند ہونا چاہیئے نہ کہ ہم کو وقت کا ہمارے ایک رشتے کے چچا کے ہم زلف پارلیمنٹری سکریٹری ہوگئے چچا نے انھیں ٹیلیفون سے مبارک باد دی اور کہا کسی روز میں تم سے ملنے تمہارے دفتر آدوں گا انھوں نے کہیں غلطی سے کہہ دیا کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی آپ کل ۱۱بجے دن میں تشریف لائیے۔ اس پر چچا آپے سے باہر ہوگئے اور ٹیلیفون کا چونگا ہاتھ سے پھینکتے ہوئے بولے اللہ اللہ اب یہ دماغ کہ ہماری ملاقات کے لئے تاریخ اور وقت مقرر کیا جاتا ہے گویا کہ ہم بھی دفتر کے کوئی منشی ہیں کہ گھڑی دیکھ کر صاحب کے پاس جاکر اپنی حاضری لکھائیں۔ لعنت ہزار لعنت اس پارلیمنٹری سکریٹری کے بچے پر۔"

ہمارے انھیں چچا نے ایک دفعہ ہمیں مخصوص اس کام سے دہلی بلوایا تھا کہ وہ ہم کو اپنے ایک ملاقاتی افسر سے ملوا دیں گے اور یقین مانئے گا کہ میرے دہلی کے ایک ہفتہ قیام کے دوران مجھے لے کر ہر روز چچا ان صاحب سے ملانے کے لئے بہت سویرے گھر سے روانہ ہو جاتے لیکن راستے میں ان کو ایسی غیر متوقع مصروفیتیں پیش آجاتیں کہ وہ کبھی ان صاحب تک نہ پہونچ پاتے کبھی شمبھو دیال کے یہاں بیٹھ کر وہ ان کی بھینسوں کی خیریت پوچھنے لگتے۔ کبھی منے صاحب کے یہاں رک کر وہ ان کے مقدمے کا حال سننے لگتے کبھی کسی کے منھ کسی دوست کی علالت سن کر اس کے یہاں عیادت کے لئے چلے جاتے۔ کبھی جمنا کی باڑھ دیکھنے لال ڈگی پہونچ جاتے۔ سڑک پر کسی سائیکل اور راہ گیر کی ٹکر ہو جاتی تو یہ پہلے تماشائی پھر گواہ اور پھر مجسٹریٹ بن جاتے۔ سائیکل والا اور راہ گیر اپنے کپڑے جھاڑ کر چلے بھی جاتے لیکن یہ کھڑے پورے حادثے کی پوری تفصیلات اپنے گرد جمع تماشائیوں کو سنایا کرتے دن کا کھانا اور شام کی چائے جہاں موقع ملتا

کھاپی لیتے اور آدھی رات کو جب تھکے ہارے وہ مجھے لے کر گھر پہونچتے تو حتمی وعدہ کرلیتے کہ کل سویرے وہ پہلا کام یہ کریں گے اور مجھے لے جاکر اپنے لنگوٹیا یار سے ملوادیں گے سات دن تک تو میں کسی آوارہ کتے کی طرح چچا کی آوارہ گردی میں شریک رہا لیکن آٹھویں دن باحسرت و یاس استعفیٰ دے کر میں بھاگ نکلا۔ چچا کی رفاقت میں کسی کام کو پورا کرنے کے لئے عمر نوح بھی ناکافی ہوتی۔

کانپور میں ہمارے مکان کے قریب ایک صاحب رہا کرتے تھے جن کا بھلا سا نام تھا نام تو اس وقت یاد نہیں آتا البتہ وہ اپنی غیر معمولی بڑی بڑی مونچھوں کی وجہ سے زیادہ تر لوگوں کی زبان پر چھچھوندر بابو کے لقب سے چڑھے ہوئے تھے۔ وقت کے متعلق ان کے کچھ اپنے خود ساختہ اصول تھے اور ان پر وہ بڑی شدت سے کاربند رہتے مثلاً اگر وہ کسی تقریب میں دس بجے بلائے جاتے تو وہ بارہ بجے سے پیشتر کبھی نہیں پہونچتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ وقت کی پابندی صرف ابن الوقت اور احساس کمتری کا شکار لوگ کرتے ہیں وہ ریلوے اسٹیشن بھی ٹرینوں کے ٹائم ٹیبل میں درج اوقات سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد جایا کرتے اور ان کا کہنا تھا کہ شاید کبھی مشکل ہی سے ان کی کوئی ٹرین چھوٹی ہو۔ ان کے قول کے بموجب انھوں نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ٹرین کو بالکل صحیح وقت پر آتے دیکھا تھا اور اس کی شان نزول یہ تھی کہ وہ پورے چوبیس گھنٹے لیٹ تھی۔۔۔

مغرب کے دانشوروں نے تو اب معلوم کیا ہے کہ وقت محض ایک اضافی قیاس ہے اور فی الواقع اس کی کوئی حقیقت نہیں لیکن ہمارے قصبے کے ایک بزرگ نے اس نکتے کو بہت پہلے کھوج نکالا تھا۔ سنا ہے کہ وہ بزرگ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ طوعاً و کرہاً ریلوے اسٹیشن ایک ٹرین پر سفر کرنے کی غرض سے جارہے تھے۔ ساتھی نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا "ٹرین پانچ بجے چھوٹتی ہے پانچ بجنے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں آئیے ذرا تیز چلیں۔" بزرگ نے اپنی گھڑی دیکھ کر فرمایا "میری گھڑی میں تو پانچ بج بھی چکے تھے تو اب ٹرین مل نہیں سکتی تم دوڑ جاؤ، تمہاری گھڑی میں ابھی دس منٹ باقی ہیں۔"

وقت کی بے پایاں افراط کا ایک واقعہ میرے علم میں ہے قصبے کے دو حضرات جو دو مختلف زمین دار خاندانوں سے تعلق رکھتے کم و بیش چالیس سال تک قریب قریب روزانہ پانچ چھ گھنٹوں کے لئے جمع ہوتے اور لپنے لپنے آبا و اجداد کے من گھڑت معرکے، لطیفے، بہادری اور امارت کے قصے سخاوت اور دریا دلی کی داستانیں ایک دوسرے کو سنایا کرتے اور لطف یہ تھا کہ وہ دونوں خود بھی جانتے اور سمجھتے کہ وہ لوگ سراسر جھوٹ اور مبالغے سے کام لے رہے ہیں ان کی چرب زبانی کا اصلیت سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں کاش کہ وہ دونوں حضرات کوئی دوسرا مفید کام نہ پاکر مریخ تک پہونچنے کے لئے پیدل ہی سفر پر روانہ ہوجاتے

میں نے اپنی زندگی میں وقت کا واقعی پابند صرف ایک شخص کو دیکھا اور وہ تھے بدرالدین ریٹائرڈ اسٹیشن ماسٹر جن کو ان کے بھتیجوں کی دیکھا دیکھی سارے محلے کے لڑکے لڑکیاں بھورے چچا کہتے۔ ان کی وقت کی پابندی کے متعلق بہت سے واقعے لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔

مشہور تھا کہ ایک دفعہ جب بھورے چچا کسی بڑے اسٹیشن پر تعینات تھے انھوں نے ایک منسٹر کے لئے آدھا منٹ کیا چند سکنڈ کے لئے بھی گاڑی روک دینے سے انکار کر دیا تھا۔ منسٹر صاحب اسٹیشن پر اترنے والے تھے۔ اور انکے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر ایک ہجوم بھی موجود تھا۔ ان کا سامان وغیرہ سب اتارا جاچکا تھا۔ صرف وہ خود غسل خانے سے نکلنے کے بعد کپڑے بدل رہے تھے لیکن بھورے چچا نے منسٹر صاحب کے لواحقین کی ضد اور اصرار کے باوجود صحیح وقت پر گاڑی چھوڑ دی۔ منسٹر صاحب اس صورت حال کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ چنانچہ لپنے جوتے اور پاجامے کا صرف ایک پائنچہ پیر میں اٹکے ہوئے اور دوسرا ہاتھ میں لئے انھیں لپنے ڈبے سے کود

اس انداز سے کودنا پڑا تھا کہ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔

ایک بار ان کے کسی دوست نے انھیں آٹھ بجے رات میں کھانے پر بلایا وہ سات بج کر پچپن ہی منٹ پر اس کے دروازے پہونچ گئے اتفاق سے اسی وقت بارش شروع ہوگی۔ معتبر راوی کا بیان ہے کہ وہ پانچ منٹ تک بارش میں بھیگتے رہے لیکن آٹھ بجے سے پہلے اپنے دوست کے گھر کی کنڈی نہیں کھٹکھٹائی۔

یہ واقعہ خود میرا دیکھا ہوا ہے کہ دعوت ولیمہ میں دوسرے مہمانوں کے ساتھ بھورے چچا بھی مدعو تھے۔ دعوت کا وقت دو بجے دن رکھا گیا تھا وہ ٹھیک وقت پر پہونچ گئے تو معلوم ہوا کہ میزبان اور بکرے فروخت کرنے والے میں ابھی بکروں ہی کی بابت مول تول ہو رہا ہے اور جو منتظم بازار چاول اور گھی لینے گئے ہیں وہ ابھی لوٹ کر نہیں آئے ہیں۔ پھر کیا تھا بھورے چچا گرجے تڑپے بلکہ برے منتظم کے انھوں نے کئی بید بھی رسید کردیئے کہ بالآخر بیچارے میزبان کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہر مہمان سے معافی مانگنی پڑی اور دعوت وقت ملتوی کرکے دس بجے رات رکھنا پڑا اور اس وقت بڑی پابندی سے کھانا ہوگیا۔

بھورے چچا نے خود اپنے لڑکے کی شادی کی تو بہت پر لطف تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ نکاح کا وقت ۹ بجے صبح مقرر تھا وہ بالکل ٹھیک وقت پر بارات لے کر پہونچ گئے اس وقت تک دلہن والے کے وہاں فرش بھی نہیں بچھا تھا لیکن انھوں نے وہ دھوم مچایا کہ دوا کا منہ زبانی یعنی کھڑے ہی کھڑے نکاح ہوگیا کھانے کا وقت ۱۲ بجے مقرر تھا لیکن چونکہ کھانا اس وقت تک تیار نہیں تھا اور غالباً چچا پہلے سے جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے باراتیوں کو اپنے ہی گھر سے کھانا منگوا کر صحیح وقت پر کھلوادیا اور پھر قریب قریب جو دلہن کو مقررہ وقت پر رخصت کیا اغوا کرالے گئے ان تمام مرحلوں سے گذرتے وقت انھیں کیسے کیسے ہفت خواں سر کرنے پڑے ان اب بیان کرنے سے کیا حاصل۔ بہر کیف نکاح ہونے سے قبل ہی قطع تعلق ہوجانے اور نکاح کے بعد تو فوراً قدم قدم پر رشتہ منا کحہ ٹوٹ جانے کی نوبت آگئی تھی لیکن شاید دولہا دولہن کی قسمت میں رہائی تھی ہی نہیں جو ایک کیا بیسیوں طوفانوں اور منجدھاروں سے اا کی ڈگمگاتی کشتی غرقاب ہوئے بغیر نکل گئی۔ اور پالا بھورے چچا کے ہاتھ رہا۔

خود بھورے چچا کے یہاں دعوت ولیمہ ہوا تو انھوں نے ۱۱ بجے ٹھیک وقت مقررہ پر دسترخوان بچھوادیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک مہمان آئے ان کو تک انھوں نے کھانے پر بٹھایا وہ کھاکر جاچکے تو انھوں نے اپنے گھر کے دروازے بند کرادیئے اور بچا ہوا کھانا یتیم خانے بھجوادیا

قصبے میں ایک نیتاجی آنے والے تھے بڑی تیاریاں کی گئیں پھاٹک اور پنڈال سب ہی آراستہ تھے ان کے آنے کا وقت ۴ بجے مقرر تھا سوا چار بجے تک نہیں آئے تو منتظمین کی جانب سے روکے جانے کے باوجود بھورے چچا نے تقریر شروع کردی اور ساڑھے چار بجے جب نیتاجی پنڈال میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو مجمع بھورے چچا کی قیادت میں پنڈال سے باہر جا رہا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ بھورے چچا کی وجہ سے جتنی گھڑیاں لوگوں نے خریدی ہوں گی اتنی شاید کسی دوسرے ہندوستانی کی وجہ سے نہیں لیکن افسوس کہ خود بھورے چچا اس دنیا سے بہت قبل از وقت چلے گئے اور ان کے ورثا نے ان کی تجہیز و تکفین میں جب وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھا تو وہ بہت یاد آئے۔

(جنوری ۱۹۷۸ء شگوفہ)

عاتق شاہ

ناک کے

نام شیر محمد شاہ خاں
قلمی نام عاتق شاہ
تاریخ پیدائش ۱۹۲۳ء حیدرآباد
تعلیم یم اے اردو (عثمانیہ)
ملازمت لکچرار اردو سردار پٹیل کالج (موظف)
تصانیف افسانے ۔ فٹ پاتھ کی شہزادی، ایک وقت کا کھانا، مائی ڈیر شگفتلا، ہم جنم جنم کے ساتھی، راستے کی کہانی، دومنٹ کی خاموشی (رپورتاژ) عابد روڈ سے، خالی ہاتھ (تمثیل) میں کتھا سناتا ہوں (سوانح) میں چیخوں گا
طنز و مزاح: چالیس قدم، انڈین کاجو، ماموں کی بکریاں

میں نے قسم قسم کی ناکیں دیکھی ہیں ۔ آپ نے بھی دیکھی ہوں گی ۔ اونچی، کھڑی، بیٹھی چپٹی، موٹی، دبلی، پتلی، پھیلی اور بعض اوقات تو ناک کی بجائے صرف دو نتھنے ۔ ویسے وہاں ناک ضرور ہوتی ہے ۔ دراصل ناک کو چہرے سے الگ کرکے دیکھا نہیں جاسکتا اور نہ دیکھنا چاہیئے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ کچھ ایسی ہی کوشش کرتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ سوائے مایوسی کے کچھ نہیں نکلتا ۔ ناک کسی بھی فرد کی ہو وہ اسی کے چہرے پر ہی فٹ ہوگی ۔ دوسرے کے چہرے پر نہیں ویسے بعض حضرات یا خواتین کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش ان کی ناکیں ذرا بڑی ہوتیں یا چھوٹی ہوتیں یا کسی طرح یہ لوگ آپس میں ادل بدل کرلیتے ۔

ناک کے بغیر کسی چہرے کا تصور ممکن نہیں ۔ خواہ وہ انسانی چہرہ ہو یا جانور کا ۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گھر بغیر دروازے کے ہو ۔

واہ تمہاری ناک بھی ہے جو تم اتنا اکڑ کر بات کر رہی ہو؟ کسی محفل میں کسی کا فقرہ گونجتا ہے ۔ یا نجی ملاقات میں کوئی ایک دوسرے سے کہتا ہے اور سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے، یہ بات جس سے کہی گئی ہے اس میں ضرور کچھ گڑ بڑ ہے ۔

اس کا مطلب ہے کہ یقیناً اس عورت نے یا لڑکی نے اس اعتماد کو ضرور دھکا پہنچایا ہوگا جو کسی نے اس پر کیا تھا اس لیئے وہ پوچھتا ہے کہ کس ناک سے بات کر رہی ہو تم!

ناک کٹنے کا ڈر کسے نہیں؟

ہر ایک اپنی اپنی ناک کو بچانا چاہتا ہے ۔ ناک خواہ وہ مرد کی ہو یا عورت کی، ناک ناک ہے، لیکن ہر ایک کی ناک کو ایک ہی فیتے سے ناپا نہیں جاسکتا ۔ ناک بلحاظ پوزیشن بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے ۔ لیکن یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ اس سماج میں صرف اس کی ناک زیادہ اونچی ہے جو امپالہ کار کا مالک ہے ۔ خواہ وہ کار اسمگلنگ کے کالے دھندے سے ہی کیوں نہ حاصل کی گئی ہو!

اس کے برخلاف میں نے ایسے کئی ایمان دار اور سچے لوگوں کو دیکھا ہے جو بھوکوں مرجانا پسند کرتے ہیں لیکن کسی کے

سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ۔ محض اس لئے کہ ان کی ناک نہ کٹ جائے ۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان شرفاء کی ناک چوروں کی ناک کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی ہے ۔ ویسے ان دونوں کی ناکوں میں فرق کرنا مشکل ہے البتہ شریف اور رذیل میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں اپنی اپنی ناکوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ شریف تو شریف ہی ہے رذیل کسی دوسرے رذیل کو اپنے میدان میں آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ۔ کیوں کہ یہ اس کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے!

کیا شریف ، کیا رذیل یہ بات سب کے بارے میں کہی جا سکتی ہے ، چنانچہ ادیب ، شاعر، لیڈر، پروفیسر، ڈاکٹر، فلم ایکٹر اور ایکٹریس سب ہی اسی تعریف میں آتے ہیں اور ہر ایک اپنی ناک کو اونچا کرنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے ۔

سچ پوچھئے تو ناک جسم کے صرف ایک عضو کا نام نہیں بلکہ ایک سمبل ہے فرد کی انا کا ۔ اور کبھی یہ انا بڑھ کر گھر کی اور پھر خاندان کی انا بن جاتی ہے ۔ تب یوں ہوتا ہے کہ خاندان کا ہر چھوٹا بڑا اس کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھنے لگتا ہے مثال کے طور پر محمد لیسین کی لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور بھاگنا ظاہر ہے بُری بات ہے لیکن ایک دور کے رشتہ دار پر دل کا دورہ پڑتا ہے ۔ اگر آپ مزاج پرسی کے لئے ان صاحب کے یہاں جائیں اور ان سے پوچھیں تو وہ نہایت سنجیدگی سے کہیں گے ۔

بھائی تکلیف کیسے نہ ہو ؟ خاندان کی لڑکی ہے ۔ اب ہم اتنی اخلاقی جرأت کہاں سے لائیں کہ کسی کی آنکھ میں آنکھ ملاکر بات کر سکیں ۔ ناک جو کٹوا دی ہے اس چڑیل نے

اور بالکل اسی طرح اگر اس واقعہ کو کسی محلے کے وقار کا مسئلہ بنایا جائے یا بن جائے تو پھر محلے کی ناک خطرے میں پڑ جاتی ہے ۔ اسی طرح یہ خطرہ اپنے بلدیاتی حدود طے کرکے کسی شہر اور صوبے کی ناک کے لئے پیدا ہو جاتا ہے اور کوئی محلہ یا صوبہ یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی ناک کٹ جائے ، کیوں کہ ناک صرف افراد کی نہیں ہوتی بلکہ شہروں اور ملکوں کی بھی ہوتی ہے ۔

آج اقوام عالم میں امریکہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی ناک سب سے اونچی ہے ۔ روس کو یہ شیخی پسند نہیں ۔ ظاہر ہے وہ بھی اس دعوے میں برابر کا حصہ دار ہے ۔ چین کی تو ناک ہی کہاں تھی ۔ اور اگر تھی بھی تو چپٹی چپٹی ، بیٹھی بیٹھی ۔ لیکن دنیا کا کوئی ملک راہ راست اس کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آنے کے لئے تیار نہیں سب ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی ناک کو مٹی نہ لگ جائے ۔ ویسے ہر بڑے چھوٹے ملک کی ناک کے تحفظ کے لئے یونائیٹڈ نیشنز کا قیام عمل میں آیا ہے ۔ لیکن یہ ناک کٹنے کے بعد اس کی مرہم پٹی کا انتظام کرتا ہے ۔ سنا ہے کہ دنیا جہاں میں امبولنس کاریں جتنی اس ادارے کے یہاں ہیں اتنی کہیں نہیں!

اور یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی ملک یا فرد اپنے امیج کو یعنی ناک کو محفوظ رکھنے کے لئے خود کشی کر لیتا ہے اور کبھی کوئی جہالت ، تعصب ، فرقہ واریت ، ذات پات اور نفرت کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے ۔ ورنہ جو ملک خود کشی نہیں کرتے وہ قاتل بن کر دوسروں کو قتل کرتے ہیں ۔ دنیا جہاں کی فوجیں ، ٹینکس ، جہاز ، دبابے اور ایٹم بم سے لیکر ہائیڈروجن بم تک محض اس لئے کہ ایک ملک اپنی ناک کو اونچا کرنے کے لئے دوسرے چھوٹے ملک یا کمزور ملک کے ہزاروں انسانوں کی قبریں بنا دیتا ہے ۔ اور جو ملک یا فرد اپنی ناک کٹنے کی پرواہ نہیں کرتا اس میں زندہ رہنے کا حوصلہ ہوتا ہے ۔ اور سب سے زیادہ بہادر وہ ہے جو اپنی ناک کے کٹ جانے کے بعد مسکراتا ہوا دوسروں کی ناکوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وہ سب نقلی ہیں ۔

فضل جاوید

عید کی نماز

نام: سید فضل اللہ

قلمی نام: فضل جاوید
تاریخ پیدائش ۵ / نومبر ۱۹۳۶ء
مقام پیدائش: ہمکنڈہ ضلع ورنگل
پیشہ: بی ایچ ای ایل سے وظیفہ پر سبکدوش
تصانیف: مختلف رسائل میں انشائیے، ڈرامے اور مزاحیہ مضامین کی اشاعت شگوفہ کے پیروڈی نمبر کا مہمان مدیر

(قرآن اور حدیث کی روشنی میں اسلام کو بہت سی بدعتوں سے پاک و صاف رکھنے کی سعی کی جارہی ہے لیکن اب بھی کئی شہروں میں جہالت سے معمور رسومات زندہ ہیں تو پھر گاؤں کی حالت کیا ہوگی۔ زیرِ نظر طنزیہ و مزاحیہ میری اختراع نہیں بلکہ بھوپال سے بہت دور ادا کی گئی عید کی نماز کا احوال ہے۔۔۔ اور اہل اسلام کے لئے دعوت فکر۔ فضل جاوید)

ہر سال عید کی نماز اپنے شہر کی عید گاہ میں پڑھتے اور ایک ہی امام صاحب کا خطبہ سنتے سنتے جب ہمارا دل کچھ آب و ہوا کی تبدیلی کا خواہشمند ہوا تو عقل کو بالائے طاق رکھ کر ہم نے دل کی بات مان لی اور دور دراز کے ایک شہر کے لئے رخت سفر باندھا۔ ویسے کہیں پڑھا بھی تھا اور بزرگوں سے سنا بھی تھا کہ عید کی نماز جائے رہائش سے جس قدر دور جاکر ادا کی جائے اتنا ہی زیادہ ثواب ہے۔۔۔

عید جس دن متوقع تھی اس دن ایک نئے شہر میں وارد ہو کر ایک ہوٹل میں سکونت اختیار کی۔ بعد غسل عید کی پوشاک زیب تن کی اور سوئے عید گاہ روانہ ہوئے، راستہ میں طبعیت پر ایک قسم کا سرور چھایا رہا کیونکہ ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس نئے شہر میں امام صاحب کا جو تصور ہم نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا وہ یقیناً ہمارے امام شہر سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ تھا۔۔۔

عید گاہ کے احاطہ میں قدم رکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا پوری عید گاہ پہلے ہی سے بھر چکی تھی۔ تل دھرنے کو کہیں جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ شامیانے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے بڑی مشکل سے ہمیں پہلی کچھ صفوں میں کہیں کہیں تھوڑی سی جگہ دکھائی دی۔ بہ ہزار دقت ہم وہاں تک پہنچ پائے۔ جوں ہی بیٹھنے کے لئے کچھ خمیدہ ہوئے دائیں اور بائیں بازو کے کچھ افراد نے ہمارے بازوؤں کو تھام کر ہمیں ایستادہ کر دیا۔ ہم حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے ایک نے کہا "یہ جگہ شبن میاں کی ہے"۔ ہم نے دریافت کیا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ ان میں سے ایک نے کہا "شاید نئے آئے ہو۔ شبن میاں امام صاحب کے سالے ہیں۔ ہمیشہ اسی جگہ نماز پڑھتے ہیں ہم

غریب الدیار تھے خاموش ہو کر پچھلی صف پر نظر دوڑائی ۔ ان ہی صاحب نے فوراً ہمارا ارادہ بھانپ کر فرمایا ۔ "آپ کو پنڈال کے نیچے جو جو جگہ خالی نظر آرہی ہیں وہ سب پہلے سے ہی ریزرو ہو چکی ہیں ۔ وہ امام صاحب کے چچازاد بھائی کی ہے وہ جگہ ان کے خسر معظم اور وہ ۔ ۔ ۔ "
وہ صاحب تو ریزرویشن چارٹ کی تفصیل ہمارے سامنے بیان فرمار ہے تھے ۔ اور ہم دل ہی دل میں سید محمد جعفری کو یاد کر رہے تھے جنہوں نے "وزیروں کی نماز" لکھی تھی اگر آج وہ ہمارے ساتھ ہوتے تو یقیناً ان کی فکر کے گھوڑے امام صاحب کے حسب و نسب کی تلاش میں نکل پڑتے جن کی ہمیں عید گاہ پر اجارہ داری نظر آرہی تھی، ہم مایوس ہو کر واک آوٹ کر ہی رہے تھے کہ ایک فرشتہ صفت بزرگ نے ہمارا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا ۔ ہم لڑکھڑا کر ان کی گود میں گرتے گرتے بچے ۔ انہوں نے سرگوشی فرمائی کہ پہلی صف میں جو پہلوان نما آدمی نظر آرہا ہے اسے مبلغ پچیس ۲۵ روپے عید گاہ کا چندہ دے دو تو ثواب کا ثواب اور جگہ کی جگہ ۔ ہم بہت خوش ہوئے اور پہلوان کے قریب پہنچ کر سب سے پہلے ریزرویشن فیس ادا کی اور جگہ کے طالب ہوئے ۔ پہلوان کے کرخت چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے پہلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو اٹھا کر اس کی جگہ ہمیں دے دی ۔ تھوڑی دیر بعد ایک مریل قسم کا لڑکا گیندے اور سیوتی کے پھولوں کی مالا لے کر ہمارے قریب آیا ۔ ہم نے سوچا شائد کسی اور کے دھوکے میں وہ ہمارے پاس آیا ہے کیوں کہ ہم اتنی بڑی شخصیت تو نہیں تھے کہ ایک انجان شہر میں کوئی ہمارا اس طرح استقبال کرتا ۔ لیکن وہ لڑکا بضد تھا کہ ہار ہم لے ہی لیں اسی پہلوان نے ہماری مشکل آسان کرتے ہوئے اپنی جگہ سے ہانک لگائی ۔ رکھ لو بھیا ڈھائی روپے اس کو دیدو نماز کے بعد یہ ہار امام صاحب کے گلے میں ڈال دینا ہمیں تعمیل کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا ۔ امام صاحب کی تقریر اس اثناء میں شروع ہو چکی تھی ۔ نہ خطیب کا انداز تھا نہ واعظ کا ۔ اگر اس تقریر کا عنوان تجویز کرنے کا اعلان ہوتا تو لوگ اس کا عنوان "چندہ" تجویز کرتے ۔ ہر جملہ کے بعد چندے کا ضرور ذکر آتا ۔ اور چندے کے فوائد پر تبصرہ ۔ ۔ ۔ کچھ جملے ہمارے ذہن سے چپک کر رہ گئے ہیں سنئے "خدائے تعالیٰ چندہ دینے والوں کو محبوب رکھتا ہے ۔ یہ عید گاہ جہاں دور دراز سے لوگ آکر نماز عید ادا کرتے ہیں آپ ہی کے دم سے قائم ہے میرا مطلب آپ کے چندے سے قائم ہے ۔ اگر آپ چندہ نہ دیں تو اس کی تعمیر و توسیع رک جائیگی ۔ اس لئے اسے رنگ و روغن سے نہلا کر عطر میں ڈبو دیجئے ۔ کیوں کہ یہ اللہ کا گھر ہے اللہ کے گھر کو زندہ رکھنے کے لئے دل کھول کر چندہ دیجئے ۔ چندہ دینے میں بخل یا شرم سے کام نہ لیں ۔ کالا دھن جسے لوگوں نے چھپا رکھا ہے اسے اچھے کاموں میں لگا کر سفید کر لینا چاہیئے ۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو اللہ محبوب رکھتا ہے اس لئے عید گاہ کے لئے چندہ دے کر ثواب دارین حاصل کریں ورنہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"

اس قسم کی غیر معمولی طویل اور بور قسم کی تقریر کے دوران کچھ لوگ صفوں سے نکل کر اپنی اپنی ٹوپیاں اور رومال لے کر ہر ایک کے سامنے سے گزرنے لگے ۔ ہم نے سوچا کہ معقول چندہ تو پہلے دے دیا ہے لیکن ایک رومال ہمارے آگے سے ہٹتا ہی نہ تھا ۔ آس پاس کے لوگ ہمیں گھور کر دیکھنے لگے ۔ فوراً ہمارا ہاتھ جیب میں گیا اور پانچ کا نوٹ رومال میں گرا جب امام صاحب کی تقریر کا عملی مظاہرہ ختم ہوا تو امام صاحب نے مائک سے آواز لگائی "کیا چندہ پورا ہو چکا ۔ چاروں طرف سے جواب آئے "ہاں ہو چکا نماز شروع کیجئے" تب امام صاحب نماز کے لئے کھڑے ہوئے ۔

ہم نے دیکھا کہ صفیں تک سیدھی نہیں ہیں ۔ اور نہ ہی کسی نے ہدایت ہی دی اپنے دائیں طرف ایک بزرگ کو، ہم نے تھوڑا سا پیچھے کیا تو انہوں نے ہمارا ہاتھ جھٹک دیا کہ دخل اندازی کی بالکل ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ہمیں چپ رہنے میں ہی عافیت نظر آئی ۔ آخر نماز

شروع ہوئی ۔ امام صاحب کی قرات نے بالکل متاثر نہیں کیا ۔ ہمیں رہ رہ کر ہمارے شہر کے امام صاحب یاد آرہے تھے ، جنکی قرآت راست دل میں گھر کرلیتی تھی ۔ کیا انداز ہوتا تھا انکا ۔۔ اللہ اللہ کرکے نماز ختم ہوئی اور خطبہ کے لئے جوں ہی امام صاحب کھڑے ہوئے کچھ پہلوانوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا ۔ اور پھر رسم گلپوشی شروع ہوئی حیرت سے یہ سب ہم دیکھ رہے تھے ۔ نماز اور خطبہ کے درمیان کا یہ بیش قیمت حصہ اس فضول کی رسم کی نظر ہورہا تھا ایک کرکے نحیف ناتوان جسم کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا ۔ امام صاحب کا بالشت بھر سینہ خوشی سے گز بھر کا ہوچکا تھا اور چہرہ گلنار ۔۔۔ ہم دم بہ خود یہ نظارہ دیکھ ہی رہے تھے کہ اسی پہلوان نے ہمارا بازو پکڑ کر امام کی گلپوشی کا اشارہ کیا طوعاً وکرہاً پاس پڑے ہوئے اس ہار کو لے کر ہم بھی کھڑے ہوگئے پندرہ منٹ بعد ہمارا نمبر آیا امام صاحب شاہد گلوں کے شیدائی تھے کیوں کہ ان کا چہرہ تو کہیں سے نظر نہیں آرہا تھا اور وہ ایک پھولوں کا ڈھیر لگ رہے تھے ۔
انہوں نے ایک بھی ہار کو اپنے ناتواں جسم سے جدا ہونے نہ دیا اور اسی وزن کو لئے لئے خطبہ کی شروعات کردی ۔۔۔ خطبہ تو عربی میں تھا لیکن اس کے بعد اس کا منظوم ترجمہ بھی سنایا گیا ۔ وہ ترنم سے پڑھ رہے تھے جہاں عبرت کا مقام تھا وہاں بھی مجمع سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہورہی تھی ۔۔۔
خطبہ کے بعد دعا کا وقت ہوا ۔ دعا کیا تھی ایک اچھا خاصا شکرانہ تھا خدائے عزوجل کا نہیں بلکہ اس کے حقیر بندوں کا ۔۔۔ جہاں آمین کی ضرورت نہیں وہاں بھی آمین ہورہی تھی ۔ جب تک عربی میں دعا ہوتی رہی بہت کم صدائیں آمین سے گونج رہی تھیں لیکن جوں ہی اردو میں دعا شروع ہوئی تو ساری عیدگاہ میں آمین کی صداؤں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی دعا کے کچھ نمونے اس طرح ہیں ۔
" اے اللہ ہم پاپی ہیں (آمین) اے اللہ ہم گنہگار ہیں (آمین) ہماری مغفرت فرما اور ہمارے اہل و عیال جو بے روزگار ہیں (آمین انہیں روزگار دلا (آمین) تو اگر چاہے تو ہمیں کوڑوں سے مار سکتا ہے (آمین) تو زلزلے اور طوفان لاسکتا ہے (آمین) تو ہمیں تباہ و تاراج کرسکتا ہے (آمین) لیکن اے اللہ تو ارحم الراحمین ہے (آمین) جنہوں نے دل و جان سے چندہ دیا (آمین) انہیں اور دینے کی توفیق عطا فرما (آمین) جنہوں نے گلپوشی کی (آمین ۔ آمین) ان کا میں شکر گزار ہوں (آمین) اور بارگاہ) رب العزت میں آپ کے اہل و عیال کی درازئ عمر کی دعا کرونگا (آمین)

شاید امام صاحب کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کا تخاطب خدائے تعالیٰ سے ہٹ کر ان لوگوں کی طرف ہوگیا ہے جنہوں نے ان کا استقبال کیا تھا ۔ فوراً ایک عربی آیت پڑھ کر دعا ختم کی اور فوراً فرمایا " حضرات میں بہت ضعیف ہوچکا ہوں مجھ سے دور ہی سے گلے مل لیجئے گا ۔۔۔

امام صاحب کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہوسکی کیوں کہ ان کے مداحوں نے انہیں گلے سے لگاکر اس قدر بھینچا کہ وہ لوگوں کے سروں سے گز گز بھر اوپر اچھلتے رہے میں نے فوراً وہاں سے جانا ہی مناسب سمجھا کیوں کہ پہلوانوں سے گلے ملنا اپنی ہڈی پسلی تڑوانے کے مصداق ہوتا ۔

فیروز حیدر

تخلیق کا کرب

نام محمود پاشا قادری ولد محمد صالح قادری مرحوم
قلمی نام فیروز حیدر
تاریخ پیدائش: ۱۹۵۶ء
وطن حیدرآباد
تعلیم بی ایس سی (عثمانیہ)
مصروفیت. پارسنز میاپکو اسٹرکچرل فوم پرائیوٹ لمیٹڈ
مزاح نگاری. ۱۹۷۲ء سے مزاح لکھ رہے ہیں شگوفہ کے علاوہ مختلف رسائل اور اخبارات میں مضامین شائع ہوتے رہے ہیں

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مرزا لاغر واقعی بہت خوبیوں کے مالک ہوتے ۔ اگر ان کی شخصیت میں سے شاعری نکال لی جائے ۔ حالانکہ مرزا تھوڑے بہت شریف آدمی تھے، لیکن وہ انسان سے زیادہ شاعر تھے ۔ گویا وہ صرف شاعر تھے ۔ کیونکہ شاعروں اور انسانوں میں تو بہت بڑا فرق ہوتا ہے مرزا میرے ان دوستوں میں تھے جن سے ملکر مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی تھی ۔ مرزا کا کلام سن کر اچھے خاصے لوگ دیکھتے ہی دیکھتے اختلاج میں مبتلا ہو جاتے ۔ مرزا کا ترنم سنکر لوگ ممکنہ حد تک دور بھاگ جاتے اور آس پاس کے جانور گھاس چرنا چھوڑ کر ان کے قریب جمع ہو جاتے ۔ مرزا جب بھی مجھ سے ملتے شاعری کی فضیلت بیان کرتے اور میں نخوست ۔ اور میری اس شاعر دشمنی سے تنگ آکر ایک روز مرزا نے کہا ۔ "میاں تم کیا جانو شاعری کیا ہوتی ہے ۔ یہ تو وہی جانتا ہے جو تخلیق کا کرب جانتا ہو ۔ " میں نے کہا خدا نہ کرے کہ مجھے تخلیق کا کرب برداشت کرنا پڑے ۔ یہ تو عورتوں کا حصہ ہے ۔ مرزا نے کہا " دنیا میں اگر عورتوں کے بعد کوئی اور تخلیق کا کرب برداشت کرتا ہے تو وہ ہے شاعر ۔ یہ بھی سر کا درد، پیٹ کا درد، گردوں کا درد، اور پیر کے درد کی طرح ایک بیماری ہوتی ہے جو صرف شاعروں کو لاحق ہوتی ہے ۔ یعنی ہر شاعر غزل یا نظم لکھنے کے لئے کئی تکلیف دہ مرحلوں سے گزرتا ہے ۔ جس طرح مرزا غالب جب تک لوگوں سے قرض مانگ کر شراب نہ پیتے اور اپنے ازار بند کو زور زور سے نہ مروڑتے شعر نہیں کہہ سکتے تھے اسی طرح مختلف شعرا مہلک عادتوں کے مریض ہوتے ہیں ۔ ا

ایک نواب صاحب رکشہ میں بیٹھ کر فکر سخن کے عادی تھے ۔ وہ ہر روز صبح رکشہ منگواتے اور بیٹھ کر نکل جاتے ۔ چنانچہ اس رکشہ والے کو کرایہ ادا کرتے ہوئے ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ اب وہ خود رکشہ چلاتے ہیں ۔

اسی طرح مرزا بھی ایک خطرناک عادت کے شکار تھے ۔ یعنی وہ پیدل چلتے ہوئے شعر کہتے تھے ۔ ایک بار جب وہ چارمینار سے گزر رہے تھے تو فوراً ایک مصرعہ تولد ہو گیا ۔ اور اس مصرعہ کو مکمل

غزل میں تبدیل کرنے کے لئے مرزا بے خودی میں جو چلتے رہے تو کئی دن تک چلتے رہے اور جب غزل ختم ہوئی تو وہ نظام آباد پہنچ چکے تھے وہاں سے انہوں نے اپنی بیوی کو تار دیا کہ میں ایک غزل کے سلسلہ میں نظام آباد پہنچ گیا ہوں۔ دوسری غزل سے حیدرآباد واپس آجاؤں گا "جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو میں نے کہا" ارے یار مرزا تمہاری یہ عادت بہت خطرناک ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تمہاری غزل نظام آباد میں ختم ہو گئی ورنہ اگر تم یونہی چلتے رہتے تو آگے دریائے گوداوری تھا اور پھر۔۔ہم سب کو مجبوراً تمہارا مرثیہ لکھنا پڑتا" یہ بات مرزا کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے کہا کہ جب لوگ مذہب تبدیل کر سکتے ہیں تو کیا میں عادت تبدیل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انہوں نے یہ عادت تو بدل ڈالی لیکن دوسری عادت میں مبتلا ہو گئے وہ یہ کہ جب بھی ان پر غزل لکھنے کا موڈ سوار ہوتا ہے منھ دھونا اور پانی نہانا بند کر دیتے۔ جس کی وجہ سے ان کے جسم سے ایک خاص بو آنے لگی تھی۔ اور یہ بو ان کے جسم سے تمام سال آتی تھی کیونکہ ان پر سال تمام غزل لکھنے کا موڈ طاری رہتا۔ اور بعد میں یہی بو ان کے شعروں سے آنے لگی اور میں سونگھ کر پہچاننے لگا کہ کون سا شعر مرزا کا ہے اور کونسا نہیں۔ مرزا کی اس بدبودار شاعری کے باوجود ایک عطر فروش نے ان کا دیوان شائع کر دیا اور سنتے ہیں کہ جس کاتب نے ان کے مجموعہ کی کتابت کی تھی آخر میں اس کے سونگھنے کی قوت زائل ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے میں جب بھی مرزا کا دیوان پڑھنا چاہتا ہوں پہلے اس پر خوب "Dettol" چھڑک لیتا ہوں تاکہ مجھے نقصان نہ پہنچے!

اس کے بعد مرزا جب بھی مجھ سے ملتے دوسرے شاعروں کی عادتیں بیان کرنا شروع کر دیتے۔ ایک محترمہ کے متعلق کہا کہ وہ باورچی خانہ میں بیٹھ کر فکر سخن کرتی ہیں۔ یعنے کھانا پکا رہی ہیں غزل ہو گئی اور سالن بھون رہی ہیں نظم ہو گئی۔ اسی وجہ سے ان کے بعض شعر مرچ کی طرح تلخ، بعض نمکین اور بعض پھیکے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے شعروں سے داغ کی بو بھی آتی ہے اور عموماً ان کے مقطعوں پر کھرچن کا گمان ہوتا ہے۔

ایک اور شاعرہ کپڑے دھوتے وقت شعر کہتی تھیں اور ان کی یہ عادت اس قدر اہمیت اختیار کر گئی کہ اب انہیں شہر کی سب سے پہلی دھوبن شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ایک روز میں مرزا کے ایک شاعر ڈاکٹر دوست کے مکان پر پہنچا۔ ان کا دواخانہ مکان کے اندر ہی تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ان کا سارا خاندان پریشانی کے عالم میں آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھا ہوا ہے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد، تھیٹر کا دروازہ کھول کر نرس چیختی ہوئی باہر آئی۔ "مبارک ہو! مبارک ہو! غزل ہوئی ہے" یہ سنکر میں حیران ہو گیا۔ لیکن ان کی بیگم صاحبہ رنجیدہ ہو گئیں اور کہا۔ "اس بار بھی غزل ہوئی ہے۔ میں سمجھتی تھی نظم ہوگی۔" تب مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی غزلیں آپریشن تھیٹر میں نازل ہوتی ہیں میں نے ڈاکٹر صاحب کو غزل کی مبارکباد دی جس پر انہوں نے فوراً نومولد غزل ہمارے گود میں ڈالدی۔ جس کو سن کر اچانک ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارا سر گھوم رہا ہے اور ہم آسمان پر اڑ رہے ہیں اور پھر اچانک دواخانے میں ایک محترمہ سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ شرمندگی سے ان کا یہ عالم تھا کہ بس زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا" ڈاکٹر صاحب میں پانچ مہینوں سے ایک شعر لکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن ہر بار مصرعہ ساقط ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"
ڈاکٹر صاحب نے کہا" آپ میرا دیوان لے جائیے۔ اور ہر روز صبح دوپہر اور شام غذا کے بعد پڑھا کیجئے انشاء اللہ ایک ہفتہ میں آپ وزن میں کہنے کے قابل ہو جائیں گی۔

ایک روز میں مرزا کا انتظار کرتے ہوئے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک میری میز پر آغا صاحب آکر بیٹھ گئے اور زبردستی باتیں

کرنے لگے ۔ منھ سے جھاگ نکلنے لگا۔ چہرے پر قبض کی کیفیات طاری ہوگئیں ۔ میں سمجھا کہ ضرور انہیں مرگی کا دورہ پڑا ہے ۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ ٹھیک ہوگئے اور جیب سے بیاض نکال کر لکھنے لگے ۔ میں نے غصہ سے کہا ۔ "اجی جناب یہ کیا بدتمیزی تھی ؟" کہنے لگے " بدتمیزی نہیں بلکہ تخلیق کا کرب تھا ۔ جب شعر اترتے ہیں تو میری ایسی ہی حالت ہوتی ہے ۔" انہوں نے بتایا کہ ان کے بڑے بھائی جب بھی غزل لکھنا چاہتے ہیں تو رات کا کھانا کھا کر کمرہ کا دروازہ بند کر کے ناچنا شروع کرتے ہیں اور جب ناچ کود کر تھک جاتے ہیں تو فوراً لکھنا شروع کر دیتے ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ عموماً قوالیاں اور ٹھمریاں ہی لکھ پاتے ہیں ۔

ایک اور شاعر کے متعلق مرزا نے کہا تھا کہ وہ تارے گنتے ہوئے شعر کہنے کے عادی تھے ۔ جس کی وجہ سے ان کی ساری عمر چھت پر گزر رہی تھی ۔ ایک روز وہ حسب معمول چھت پر فکرِ سخن کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے چیخیں مارنا شروع کر دیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے ۔ سب نے پریشانی سے پوچھا "آخر ہوا کیا ہے ؟" کہنے لگے میری غزل خراب ہوگئی ۔ کل کے مشاعرہ میں مجھ پر ہوٹنگ ہوگی "ایک نے پوچھا آخر ہوا کیا؟" کہنے لگے " ۔ میں نے جھاڑو تارہ دیکھ لیا ہے ۔"

ایک اور شاعر کو میں بہت دنوں تک قبرستان میں بیٹھا ہوا دیکھتا تھا ۔ کئی روز تک میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ قبرستان میں آگر ان شاعروں کی قبروں پر پھول چڑھا کر معافی مانگتے ہوں گے جن کا کلام وہ چراتے ہیں ۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قبرستان میں بیٹھ کر فکر سخن کرنے کے عادی ہیں ۔

اور بالآخر اسی تخلیق کے کرب نے مرزا کی جان لے لی ۔ ہوا یوں کہ ان پر آزاد نظم لکھنے کی دھن سوار ہوگئی اور بس مرزا بے چین رہنے لگے ۔ کھانا پینا چھوٹ گیا ۔ آنکھیں حلقوں کے اندر دھنس گئیں اور ایک روز جب کہ وہ ایک آزاد شاعر کی نظموں کا مجموعہ پڑھ رہے تھے ۔ اچانک انہوں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا ۔ اور لوگوں کو کاٹنے دوڑنے لگے ۔ اور اسی عالم میں مرزا کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہوگئی جس پر جتنی بھی خوشی کا اظہار کیا جائے کم ہے ۔

(شگوفہ اکتوبر ۔ ۱۹۷۴ء)

سید نصرت

جاکی کی وگ

نام سید نصرت
وطن حیدرآباد
پیشہ آرکیٹکٹ
حال مقیم ابوظبی
گذشتہ ربع صدی سے مزاحیہ مضامین لکھ رہے ہیں جو شگوفہ کے علاوہ رابطہ اور دیگر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں

جاکی اب کی بار جب بمبئی سے لوٹے تو ان میں کئی حیرت انگیز تبدیلیاں آچکی تھیں۔ جاکی کے لئے یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں تھا کہ وہ بمبئی سے واپسی پر اپنا حلیہ بدل آئے ہیں بلکہ جب سے جاکی نے ہوش سنبھالا ہے وہ ہر سال بڑی پابندی سے بمبئی جاتے ہیں اور وہاں سے کچھ نہ کچھ نئے فیشن کو اپنائے واپس ہوتے ہیں اور ہر بدلتے ہوئے فیشن کو وہ بڑی تیزی سے اپناتے ہیں لیکن ادھر جب سے نوجوانوں میں اپنے سر کے بالوں کو بڑھانے اور دونوں کانوں کے بازو "مردانہ کاکل" گچھوں کی شکل میں رکھنے کا شوق سرعت سے پھیلتا جارہا تھا جاکی اتنی ہی سرعت سے اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہے تھے کیوں کہ بال بڑھانے اور سائیڈ لاکس رکھنے کے تعلق سے وہ بالکل ہی بے بس تھے لے دے کے ان کے سر پر صرف چند بال ہی رہ گئے ہیں اور ہم اکثر بڑی محبت سے انہیں گن کر جاکی کو ان کی صحیح تعداد بتادیا کرتے ہیں ایک بار جاکی کے بال گننے کا ہم تمام دوستوں میں مقابلہ ہوا ہم نے انتہائی نفاست اور ہوشیاری سے بالوں کی صحیح صحیح، تعداد بتادی یعنی فل سائز بال ۲۵ عدد۔ آدھے بال گردن کی طرف جھکے ہوئے ۴۰ عدد اور ادھ موے بال جو گرنے کے قریب تھے ۷۱ عدد واحد جکے کو ہماری گنتی سے اختلاف تھا اور وہ فل سائیز بالوں کی تعداد ۲۶ بتارہے تھے بڑی حجت اور تکرار کے بعد طے پایا کہ جاکی کے سر کے تمام بال کسی معقول حجام سے نہایت ہوشیاری سے نکلوالئے جائیں اور A.G آفس کے کسی قابل آڈیٹر سے گنتی کروائی جائے۔ جاکی اس بات پر کسی بھی طرح راضی نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اپنے ہر دل عزیز بالوں کو اپنے سر سے ہرگز جدا نہ کروں گا۔ ہم لوگوں نے بھی ان کے سر پر رحم کھا کر ان کے بالوں کو ان کے سر پر چھوڑدیا۔ اگر نوبت ایسی آجاتی کہ وہ بال نکلوانے پر راضی ہوجاتے تو ہمارے لئے پھر ایک نئی پریشانی یہ اٹھ کھڑی ہوتی کہ ہم تمام دوستوں کو اس بات کا بالکل پتہ نہ چل پاتا کہ ان کا سر کہاں ہے۔ ویسے بھی ان کے سر کو دیکھ کر گلی کے تمام بچے چلاتے ہیں "مرغابی کا انڈہ" "ابلا آلو" "پھسلبنڈہ" وغیرہ وغیرہ لیکن

جاکی ان تمام خطابات کو سر سے سنتے ہیں اور مسکراتے ہوئے اسے یوں پھسلا دیتے ہیں گویا ان کا سر واقعی "کوئی پھسلبنڈا ہو۔

سائیڈ لاکس کے لئے ان کا ترسنا بالکل واجبی ہی تھا۔ سینکڑوں بار وہ بال اگانے کے نت نئے طریقے آزما چکے ہیں اور ہر بار نتیجتاً ان کی تالو چکنی سے چکنی تر ہوتی چلی گئی۔ مختلف قسم کی ۔۔۔ ادویات سے ہٹ کر جاکی نے اپنے سر میں بال اگوانے کے لئے جادو ٹونے اور منتروں کا بھی سہارا لیا اور اپنے سر پر مختلف سادھوں کی عطا کی ہوئی راکھ بھی مل کر دیکھ لی لیکن ان کی چندھیا صاف رہی۔ گذشتہ دنوں انہیں کسی نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ نمائش مصنوعاتِ ملکی سے تیار سائیڈ لاکس خرید کر اپنے کانوں کے قریب چسپاں کرلیں تاکہ اس طرح ان کی شخصیت پرکشش اور جاذب نظر دکھائی دے تو انہوں نے اس مشورے پر بھی عمل کر کے دیکھ لیا۔ اور دوسرے ہی دن نمائش سے دو گچھے دار سائیڈ لاکس خرید کر انہیں مناسب مقام پر جڑ دیا۔ اب کیفیت یہ تھی کہ وہ جب ایک کروٹ سو رہے ہوتے تو انہیں دیکھ کر " ایک کوا پیاسا تھا" والی کہانی بے اختیار یاد آنے لگتی اور ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے کان کے قریب ایک پیاسا کوا بیٹھا پانی کے حصول کے لیئے سعی مسلسل کئے جا رہا ہو اور چونچ میں کنکر بھر بھر کر کان کے راستے گھڑے میں ڈال رہا ہو۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ اس طرح وہ بجائے پرکشش نظر آنے کے لوگوں کی ہنسی کا سبب بن رہے ہیں اور صنفِ نازک انہیں " بلا" کے خطاب سے نواز رہی ہیں تو ۔۔ وہ ان سائیڈ لاکس کو کانوں کے قریب سے نکال کر اسے دوسرے طریقے سے استعمال کرنے لگے۔ وہ اس طرح سے کہ جاکی کہیں سے ایک گول ٹوپی خرید لائے اور اسے سر پر جما کر سر کے بالکل سامنے پیشانی پر سائیڈ لاکس کو اس طرح سے جما دیا کہ سائیڈ لاکس آدھے ٹوپی کے اندر رہیں اور آدھے پیشانی پر جمے رہیں اور دیکھنے والوں کو یہ گمان گذرے کہ جاکی کے اتنے گھنے بال ہیں کہ ٹوپی پہننے پر بھی وہ ٹوپی کے باہر تک نکل آتے ہیں۔ جاکی کا یہ آئیڈیا بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا کیوں کہ جاکی نے ایک بار بے خیالی میں تالاب میں نہانے کے لئے جو ڈبکی لگائی تو سائیڈ لاکس ان کی پیشانی سے نکل کر تالاب کی تہہ میں جا بیٹھے۔

جاکی ایک بار پھر نئے سرے سے بال اگانے کی کھوج میں لگ گئے۔ ایک بار ہم تمام دوست پکنک منا رہے تھے۔ جاکی بہت موڈ میں تھے اور لہک لہک کر کسی کی غزل گا رہے تھے تیرے کوچے میں چلا آؤں گا میں سر کے بل، ہم نے کہا "اس طرح سے تو آپ پھسل پڑیں گے۔ واحد بکے نے اپنی دانست میں بڑے پتے کی بات کہی " بھئی آپ کا سر کوئی اسکیٹنگ کا ویل نہیں ہے جو آپ سر کے بل چل پڑیں گے جاکی کا موڈ ہمارے ان ریمارکس سے بگڑ گیا اور وہ منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ اچانک پٹ کی سی ایک آواز آئی۔ اور ہم سب نے دیکھا کہ کوئی رقیق سی سفید چیز جاکی کے سر سے پھسل کر بڑی تیزی سے ان کی پیشانی سے اتر رہی ہے۔ ہماری نظر اوپر جا پڑی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ درخت کی ٹہنی سے ایک چیل رفعِ حاجت سے فراغت کے بعد اپنے پر پھڑپھڑاتی ہوئی اڑ رہی ہے۔

ہندوستان کے نوے فیصد نوجوانوں کی طرح جاکی بھی اپنی ایک عدد محبوبہ رکھتے تھے اور یہ محبوبہ ۸۰ فیصد محبوباؤں کی طرح شادی شدہ تھی۔ جاکی کے دل پر جب غم کے بادل چھاتے تو وہ اپنی چندھیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے بیتے ہوئے سنہری دنوں کو یاد کرتے اور کہا کرتے کہ " اسی چندھیا کی بدولت میں نے اپنی محبوبہ سے ہاتھ دھویا ہے اگر میرے سر پر بھی گھنے بال ہوتے تو میری بھی تمنائیں پوری ہوتیں۔ بعض اوقات اپنی محبوبہ کے دونوں بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ " کاش میں ان بچوں کا قانونی باپ ہوتا " مگر برا ہو میرے سر کا میں تو اس چندھیا کی بدولت ان معصوموں کا دادا لگتا ہوں۔" جاکی جس زمانے کو اپنا عین نوجوانی کا زمانہ بتاتے ہیں وہ بقول واحد بکے کے ان کا مغرب و عشاء کے بیچ کا زمانہ ہے۔ واحد بکے بھی اپنے وقت کے بڑے دانا شخص واقع ہوئے ہیں انہوں نے انسان کی عمر کو ۵ اسٹیجوں میں تقسیم کر رکھا ہے فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء بچپن کے زمانے کو وہ فجر سے الھڑپن کو ظہر سے، جوانی کو عصر سے ڈھلتی جوانی کو

مغرب اور بڑھاپے کو عشاء سے تعبیر کرتے ہیں۔ بقول موٹے یہ بس اپنے بالوں سے مار کھاگئے اگر جاکی کی طرح بکے کا سر بھی بالوں کی قید و بند سے آزاد ہوتا تو یہ بھی ایک بہت بڑے فلاسفر نظر آتے۔ لیکن جاکی کا سراب کی بار بالوں کی قید و بند سے کہاں آزاد تھا۔ اب تو بمبئی سے واپسی پر ان کے تمام سر پر نہایت ہی گھنے بال اُگ آئے تھے اور جاکی انہیں بالکل کسی ہندوستانی ہیرو کی طرح اسٹائل سے جمائے ہمارے سامنے کھڑے تھے اور ہم بشمول واحد بکے اور موٹے کے سمندر ہائے حیرت و استعجاب میں گیس ماس لگائے بار بار غوطے لگارہے تھے۔

جاکی ایک انداز بے نیازی سے مسکراتے ہوئے ہماری بدحواسیوں سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ موٹے نے کہیں دور سے آتی ہوئی آواز میں کہا "آٹھواں عجوبہ" مگر ہم اپنی جگہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہورہے تھے کہ جاکی نے کس طرح اپنا گنجا سر کاٹ کر اس کی جگہ کمال ہوشیاری سے ایک گھنے بالوں والا سر جڑدیا ہوگا۔ وہ تو یہاں سے اچھے بھلے گئے تھے اور ان کے سر پر وہی ٹینس کورٹ کا میدان تاحد نظر پھیلا ہوا تھا لیکن اب لوٹے ہیں تو سر پر بالوں کی ایک لہلہاتی کھیتی اُگ آئی ہے۔ اور وہ بڑے مزے سے مسکرا مسکرا کر ہم سب کی جانب دیکھے جارہے ہیں۔ خیال گذرا کہ جاکی ہی سے ان کی اس حیرت انگیز تبدیلی کا راز پوچھ لیں مگر اس طرح ہم سب کی سبکی کا خطرہ تھا۔ جاکی بلاشبہ ہم سب کو بیوقوف گردانتے۔ آخر کار جب ہم سب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تو جاکی نے خود ہی سکوت توڑا اور اپنے سر کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے "اسے وگ کہتے ہیں وگ سمجھے" اور میں نے اسے پورے ۵۰۰ روپیوں میں خریدا ہے۔ ہم نے اپنی دانست میں وگ کے معنی یہی سمجھے کہ وہ اپنے مصنوعی سر کو جو وہ کسی سے بدل آئے ہیں انگریزی میں وگ کہہ رہے ہوں گے واحد بکے نے کہا" وگ، یہ وگ کیا بلا ہوتی ہے۔" جاکی نے کمال ہوشیاری سے اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دونوں ہاتھوں کو ایک مخصوص زاویئے پر لاکر کنپٹیوں سے تھوڑا سا اوپر کیا ہی تھا کہ جاکی کے دونوں ہاتھوں میں وگ سمٹ آئی اور اسی لمحے ان کا سر اپنی اصلی حالت میں آگیا۔ اور پھچاتی سفید ہنڈیا اپنی پوری آب و تاب سے جگمگانے لگی۔ ہمیں فوراً اپنی رائے بدلنی پڑی کہ بالوں والا سر جاکی کا نہیں بلکہ، کسی اور کا ہے۔ اب جاکی نے وگ کی تاریخ، اس کا جغرافیہ، اور سائنس سب کچھ بیان کرنا شروع کردیا۔ جاکی نے بتایا کہ تاریخ میں ہمیں کئی ایک ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ بڑے بڑے باشاد ہوں اور راجاؤں نے وقتاً فوقتاً وگ استعمال کی ہے۔ ہم نے ثبوت مانگا تو کہنے لگے میں نے جس دوکان سے یہ وگ خریدی ہے اس کے مالک کا یہ حلفیہ بیان ہے کہ وہ صدیوں سے یہی کاروبار کرتا آیا ہے اور اس نے اب تک بے شمار بڑے لوگوں کی وگیں تیار کی ہیں چنانچہ اس کی دوکان میں بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر اور لارڈ کلائیو تک کی تصویریں ٹانگی ہوئی ہیں جن کے گھنے بالوں کو وہ اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی وگیں بتاتا ہے۔ وگ کی سائنس پر روشنی ڈالتے ہوئے جاکی وگ کی بنوائی اور صفائی کا طریقہ بیان کرنے لگے۔ موٹے نے تمام تفصیلات سن کر جاکی سے استفسار کیا" جاکی بھائی یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے اور وگ ہے تو خوب چیز لیکن اس کی قیمت ذرا زیادہ ہے۔ اگر قیمت کچھ کم ہوتی یا کوئی سیکنڈ ہینڈ وگ مل جاتی تو میں بھی اپنے آدھے پھسلینڈے پر اسے جمادیتا بکے نے فوراً کہا سکنڈ ہینڈ وگ کے لئے کسی غسال سے ربط پیدا کرکے دیکھئے شاید وہ آپ کو کم قیمت پر وگ بنادے۔" وگ آنے کے بعد جاکی نے داڑھی بھی پال لی۔ اس طرح اب جاکی کے سر سے تھوڑی تک سوائے ناک ہونٹ کان اور آنکھ کے صرف بال ہی بال نظر آنے لگے۔

ہم نے اس سے پہلے کئی بار جاکی سے کہا تھا کہ بھی داڑھی تمہیں بہت بھلی معلوم دے گی۔ پال لو تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ میاں سر کھجانے کی بھی فرصت میسر نہیں ہے اور تم کہتے ہو کہ داڑھی پال لو۔ اب یہ اور بات ہے کہ انہیں شاذ و نادر ہی سر کھجانے کی حاجت ہوتی جب سر پر بال ہی نہ ہوں تو اس میں جوئیں کہاں سے پڑیں گی اور جاکی کیسے کھجائیں گے۔ لیکن اب اس بات کی جاکی کیلئے پوری گنجائش ہے کہ وقت بے وقت وہ اپنے سر کو کھجا سکیں چنانچہ اس سہولت سے فائدہ اٹھاکر انہوں نے داڑھی بھی رکھ لی ہے اور اس کی تراش خراش پر

کافی توجہ دینے لگے ہیں جاکی جب وگ زیب سر کرتے ہیں تو وگ کے سائیڈ لاکس داڑھی کے بالوں میں شیر و شکر کی طرح مدغم ہو جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے داڑھی ان کے گالوں سے آگے بڑھتی ہوئی کسی جنگلی بیل کی طرح ان کے سر کے سپاٹ میدانی منڈوے پر پھیل گئی ہو ۔ جاکی نے اپنی زندگی میں (جب سے بال سے ہاتھ دھوئے تھے) کبھی کسی ہیر کٹنگ سیلون کا رخ نہیں کیا اور اب وگ کے آجانے کے بعد بھی انہیں اس کی کوئی حاجت نہیں ہے ۔ واحد بکے نے ایک بار حساب نکال کر بتایا کہ جاکی کو ۲۸ سال بعد ان کی وگ کی قیمت وصول ہو جائے گی ۔ ہم نے پوچھا "کس طرح" ؟ تو کہنے لگے کہ "اگر جاکی کے سر پر بال ہوتے اور وہ ہماری تمہاری طرح باقاعدہ ہر ماہ اس کی تراش خراش پر توجہ دیتے تو اس طرح انہیں سالانہ ۱۸ روپے کا خرچہ ہوتا اور ۲۸ سال بعد یہ رقم ۵۰۰ روپیوں تک جا پہنچتی اس طرح ۲۸ برس بعد انہیں وگ مفت پڑے گی ۔ ہم بکے کی ذہانت کے کئی بار قائل ہو چکے ہیں سوچا ایک بار اور قائل ہونے میں کیا قباحت ہے ۔

جاکی کی وگ خریدنے کی خبر جب فساد کی خبروں کی طرح تمام محلہ میں پھیل چکی تو لوگ جوق در جوق دیکھنے آنے لگے اور جاکی سے وگ کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات کرنے لگے کسی نے پوچھا "کیا اصلی بالوں کی طرح وگ کے بال بھی بڑھتے ہیں" ؟ کسی نے سوال کیا "اس میں تیل کون ساڈالا جاتا ہے ؟" کھوپرے کا یا کسی اور مخصوص کمپنی کا" ؟ کسی مولانا نے کہا "اگر یہ وگ کسی حسینہ کے زلفوں سے بنائی گئی ہے تو اس کا استعمال کرنے والا گنہگار ہوگا ۔" ہم نے کہا "سچ ہے مولانا اس طرح واقعی اگر یہ کسی حسینہ کی زلفوں سے بنائی گئی ہے تو کئی دل پھینک نوجوانوں کے دل آآکر جاکی کے سر میں اٹکا کریں گے ۔" کسی کو اس بات کی فکر تھی کہ کہیں حکومت کے کانوں میں اگر وگ کی بات پڑ گئی تو وہ جاکی سے تفریحی ٹیکس وصول نہ کرے ۔ بہرحال ہر شخص اپنے اپنے طور پر وگ کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہا ہے ۔

ویسے تو جاکی کے خد و خال کافی دلکش ہیں ہی پھر وگ کے آجانے اور داڑھی کے بڑھا لینے سے اور بھی اسمارٹ ہو گئے ۔ چنانچہ دوستوں کے اصرار پر انہوں نے کئی ایک زاویوں سے اپنی تصویریں بھی کھنچوائیں ۔ ایک تصویر میں جاکی نے تکنک دکھائی کہ وہ اپنا سائیڈ پوز دینے بیٹھے ہیں اور روشنی صرف ان کی پیشانی اور ناک پر پڑ رہی ہے ۔ اس تصویر کا پرنٹ کسی نقاب پوش ڈاکو کی تصویر معلوم ہونے لگا ۔ ایک تصویر میں جاکی نے اس بات کا دعویٰ کر کے ایسا پوز دیا کہ وہ خوشی اور مسرت کے تاثرات چہرے پر پیش کر رہے ہیں اور ہمیں لگا جیسے جاکی کسی کو ڈرا دھمکا رہے ہیں چنانچہ ہم نے جاکی سے یہ تصویر مانگ لی تا کہ وقتاً فوقتاً اپنے بچوں کو ڈرایا دھمکایا کریں ایک تصویر جو کسی قدر اچھی نکل آئی تھی اس پر جاکی کی رفیق حیات نے قبضہ جمالیا اور اتفاق کی بات دیکھئے کہ ان کے ابا جان نے وہ تصویر دیکھ لی اور جاکی کی بیوی پر برس پڑے " بیٹی تمہیں شرم آنی چاہیئے جو تم ایک موٹے لفنگے کی تصویر ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہو اگر جاکی نے دیکھ لیا تو نہ معلوم کیا ہوگا ۔ جاکی کی بیوی نے اپنے ابا کو سمجھایا " ابا جان یہ کسی کا فوٹو نہیں بلکہ یہ تو " وہ " ہی ہیں تو ابا جان کسی بھی قیمت پر اپنی بیٹی کی بات ماننے تیار نہ ہوئے ۔

تھوڑے ہی عرصے میں جاکی کی وگ نے کافی مقبولیت حاصل کر لی اور جاکی کے قریب ترین دوست احباب جو جاکی کی ہر شئے کو استعمال کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے وگ پر بھی اپنا حق جتانے لگے ۔ مثلاً سلیم میاں کو کرکٹ میچ کھیلنا ہے تو وگ مانگی جارہی ہے ۔ منور خان کو اپنی محبوبہ سے ملنے جانا ہے تو وگ کے لئے اصرار ہو رہا ہے جاکی صاحب بھی دوستوں کا دل رکھنے کے لئے کبھی کبھار اپنی وگ سے انہیں مستفید ہونے کا موقعہ دیا کرتے ہیں ۔ ایک بار ایک ۷۰ برس کے بوڑھے میاں جاکی کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے " بھائی صاحب میں نے سنا ہے آپ کے پاس ایک ایسی شئے ہے جسے سر پر لگانے سے تمام بال کالے اور گھنے نظر آتے ہیں " جاکی نے کہا " ہاں ہے تو "

"مگر آپ سے مطلب" کہنے لگے آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن کچھ عرصہ کے لئے مجھے مرحمت فرمائے۔ بات یہ ہے کہ آج شام کچھ لوگ میرے رشتے کے سلسلے میں مجھے دیکھنے آرہے ہیں۔" جاکی نے حصول کار ثواب کی خاطر اپنی وگ انہیں دے دی۔ چند دنوں تک وہ اپنی وگ کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن وگ کو واپس آنا تھا نہ آئی۔ لوگوں سے اس سلسلے میں پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ بڑے میاں نے شادی کے کچھ دن تو وگ کے سہارے اچھے گذارے لیکن ایک دن جب انہیں ان کی پرانی کھانسی نے آدبوچا تو وہ کھانستے کھانستے اس دارِفانی سے کوچ کرگئے۔ ظاہر ہے کہ جاکی کی وگ بھی بڑے میاں کے ساتھ درگور ہوگئی۔

جاکی اب نہایت حسرت سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور ایک درد بھری آہ بھر کر کہتے ہیں "یارو میں تو زندہ ہوں لیکن میرا سر قبرستان کے بیکراں سناٹے میں آرام کی نیند سو رہا ہے"

(شگوفہ مارچ ۱۹۷۴ء)

رشید الدین

پرانے کپڑے نئے برتن

نام: قاضی محمد رشید الدین
وطن ناگاپور (ضلع اورنگ آباد دکن)
تاریخ پیدائش: ۸ دسمبر، ۱۹۳
تصانیف (چار) ۔علامہ حیرت بدایونی ۔ حیات اور ادبی خدمات
۔خواہ مخواہ (مزاحیہ)
ذکر رفتگاں (مرحوم شعراء و ادبا پر مضامین)
خیالی پلاؤ (بچوں کے لئے)
انجمنوں سے وابستگی: صدر کل ہند اردو سکالرس کونسل
جوائنٹ سیکرٹری زندہ دلان حیدرآباد
ملازمت: ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) محکمہ ترجمہ
آندھراپردیش ۔ حیدرآباد

ہماری نصف بہتر بھی عام بیویوں سے کچھ الگ نہیں ۔ انھیں بھی گھر سجانے اور اسے ساز و سامان سے لادنے کا بہت شوق ہے لیکن صاحب! یہ شوق یوں ہی پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے نقد نرائن کی ضرورت ہوتی ہے، ہم بھی عام شوہروں سے کچھ الگ نہیں جو کچھ کماتے ہیں گھر میں لاکر دے دیتے ہیں لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل گرانی کا زمانہ ہے کتنا ہی کماؤ کافی نہیں ہوتا پہلے زمانے میں سنا ہے ہمارے ہندوستان جنت نشان میں ہر چیز میسر تھی اور ایک آدمی کماتا تھا تو سارا گھر کھاتا تھا جو دس سے کم افراد پر مشتمل نہیں ہوتا تھا ۔ لیکن آج کل تو اس ملک میں کچھ بھی کافی نہیں ہوتا اور دس آدمی کمانے پر بھی ایک گھر اچھی طرح نہیں چل سکتا اور پھر ستم یہ کہ چیزیں اصلی بھی نہیں ملتیں جو بھی ہے نقلی ہے، ناقص ہے، غیر معیاری ہے ایسے میں کوئی کرے تو کیا کرے ۔

اس لیے ہماری اہلیہ محترمہ نے یہ ترکیب نکالی کہ ٹری کاٹ کے پرانے کپڑے دیئے جائیں اور اس کے بدلے پھیری لگانے والی عورتوں سے نئے اسٹین لیس اسٹیل کے برتن خریدے جائیں زمانۂ طالب علمی میں درسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک جادوگر نئے چراغ دے کر پرانے چراغ خریدنے کے لیے نکلا تھا اور علاء الدین کی ماں نے اپنا پرانا چراغ (جو اصل میں جادوئی چراغ تھا) جادوگر کو دے کر خوشی خوشی اس سے نیا چراغ خریدا تھا اور علاء الدین نے گھر آکر اپنی ماں کی نادانی پر (جسے وہ دانائی سمجھ رہی تھی) سر پیٹ لیا تھا ۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے لیکن منظر بدل گیا ہے اب لوگ الماری میں اپنی اچھی خاصی پتلون نہ پاکر سر پیٹتے ہیں جنھیں عورتیں اپنی دانائی سمجھ کر کپڑے والیوں کو دیتی ہیں اور اپنی دانست میں پرانی چیز کے عوض نئے برتن حاصل کر رہی ہیں ۔

آپ نے اپنے شہر میں دیکھا ہوگا کہ صبح ہوتے ہی کچھ عورتیں گھروں سے نکل پڑتی ہیں ان کے سروں پر اسٹین لیس اسٹیل کے

برتنوں کے ٹوکرے ہوتے ہیں اور پیٹھ پر پرانے کپڑوں کی پوٹلیاں سر اور پیٹھ کے علاوہ ان کی گود بھی بھاری ہوتی ہے مطلب یہ کہ اس میں ایک عدد چھوٹا بچہ ہوتا ہے۔ یہ عورتیں گلی گلی آوازیں لگاتی پھرتی ہیں اور گھریلو کاموں میں مصروف اچھی خاصی عورتوں کو ورغلاتی ہیں کہ آؤ اور ہم سے سودا کرو سودا بھی کیا خوب ہے پرانے کپڑے کے بدلے نئے برتن۔ورغلانے والی بھی عورت اور ورغلانے میں جو آجائے سو وہ بھی عورت ایسے میں ہم بے چارے مرد کیا کر سکتے ہیں۔

تو صاحب بات چل رہی تھی ان عورتوں کی جو نئے برتن دے کر پرانے کپڑے خریدتی ہیں۔ہماری اہلیہ محترمہ کی فراخدلی دیکھ کر ان عورتوں کا عالم یہ ہے کہ صبح ہوئی نہیں کہ ہمارے گھر کے اطراف چکر کاٹنے شروع کر دیتی ہیں تاکہ جوں ہی ہم دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلیں، یہ ہمارے گھر کے ورانڈے میں ڈیرہ جمائیں ہماری دختر نیک اختر کی بھی ان عورتوں کو دیکھ کر باچھیں کھل جاتی ہیں یعنی بڑی بی ماشاء اللہ تو چھوٹی بی سبحان اللہ۔آتے ہی ان عورتوں کو ٹھنڈا پانی پیش کیا جاتا ہے اور ان کی گودیوں میں سسکتے بچوں کو روٹی کے ٹکڑے دے کر بہلایا جاتا ہے (کھلونے نہیں!)

پھر ہماری اہلیہ محترمہ ہمارے کپڑوں کی الماری کی طرف رجوع ہوتی ہیں بے چارے اس بشرٹ کا نمبر آتا ہے جسے سلائے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا ہے پھر نیلی پتلون نکالی جاتی ہے۔یہ بھی اس کے ساتھ سلائی گئی تھی ایک سفید شرٹ بھی نکالا جاتا ہے اس کا قصور یہ ہے کہ جلد میلا ہو جاتا ہے اس لیے بار بار دھونا پڑتا ہے پھر صاحبزادے کی الماری کی طرف نظر کرم جاتی ہے کوئی پتلون ان کی دانست میں چھوٹی ہے تو کسی کا رنگ اڑ جاتا ہے کسی قمیص کی کالر پھٹ جاتی ہے تو کسی کے بٹن ٹوٹ جاتے ہیں کسی کا کچھ نہیں ہوتا تو یہ تاویل پیش کی جاتی ہے کہ پہننے کے بعد یہ جسم پر کچھ جچتی نہیں چنانچہ سارے کپڑے ہینگروں سے نکل نکل کر ان عورتوں کی پوٹلیوں میں چلے جاتے ہیں اور کچھ برتن اسٹین لیس اسٹیل کے پتیلے اور لچلچے کچھ ہی دن میں کالے پڑ جانے والے ہمارے باورچی خانے میں منتقل ہو جاتے ہیں اور ہماری اہلیہ محترمہ اور دختر نیک اختر انھیں دیکھ دیکھ کر مارے خوشی کے پھولی نہیں سماتیں۔

یہاں تک تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن ایک بار جو ہم رمضان کی عید کے کپڑوں کی خریدی کے لیے اپنی فیملی کے ساتھ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلہ پر ایک محترمہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ہم فوراً تاڑ گئے کہ ہو نہ ہو یہ وہی ٹوکری اور پوٹلی والی صاحبہ ہیں ہمارا شبہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب کہ وہ ہماری اہلیہ محترمہ کو کپڑوں کی خریدی میں کچھ مشورے دینے لگیں کہ یہ رنگ ٹھیک رہے گا یہ کپڑا اچھا ہے یہ بوسیدہ ہے وغیرہ وغیرہ واپسی میں وہ صاحبہ غائب ہو گئیں جس پر ہم نے اپنی اہلیہ سے پوچھا "کہ آپ کی وہ سہیلی کہاں گئیں" اس پر وہ مصنوعی انداز میں چونک کر بولیں "کون سہیلی" "ہم نے کہا" وہی جو آپ کو کپڑوں کی خریدی میں مشورے دے رہی تھیں۔" اس پر تنک کر بولیں آپ تو بس حد کرتے ہیں وہ میری سہیلی کیوں ہونے لگی وہ بھی ہماری طرح کچھ کپڑے خریدنے آئی تھی اب کچھ مشورہ دے دیا کیا برا کیا؟ یہ سن کر ہمیں خاموش رہتے ہی بنی اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ہم نے بھی بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا ایک تو رمضان کا مہینہ تھا پھر دوسرے عید قریب تھی خواہ مخواہ کی ناچاقی ہو جاتی البتہ ایک چیز ہم ضرور تاڑ گئے کہ ہمارے یہ نئے کپڑے بہت جلد اس پوٹلی والی کی نذر ہونے والے ہیں۔

مزہ تو اسی وقت آتا ہے جب ہم اپنی ایک پتلون ہینگر سے نکالے سارے گھر میں گھومتے ہیں کہ اس کے ساتھ کا شرٹ کہاں ہے اب

شرٹ ہو تو ہمیں کوئی دے دے وہ تو اسٹین لیس اسٹیل کی ایک عدد کٹوری میں تبدیل ہو جاتا ہے ایسے موقع پر ہماری اہلیہ محترمہ باورچی خانہ میں دال کو اس زور سے بگھارتیں ہیں کہ ہم اس بگھار کی تاب نہ لاکر کوئی بھی شرٹ پہن کر دفتر سدھارتے ہیں اور ہماری اہلیہ تھوڑی دیر بعد باورچی خانہ سے نکل کر ہماری دختر نیک اختر سے پوچھتی ہیں " بیٹا تمہارے بابا آفس چلے گئے " اس وقت دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے پر ایسی خوشگوار مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے جو کسی ڈینٹل کریم کے اشتہار ہی میں نظر آتی ہے ۔

اس کامیڈی کا سب سے المناک منظر اس وقت سامنے آیا جب کہ ایک صبح سو کر اٹھنے پر تمام گھر کو پتہ چلا کہ رات باورچی خانہ کا پچھلا دروازہ کھلا ہی رہ گیا تھا اور چور صاحب آکر اسٹین لیس اسٹیل کے ان سارے برتنوں پر ہاتھ صاف کر گئے جو برسوں کی کاوش کے بعد بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہمارے ۔۔ کپڑے بیچ بیچ کر جمع کیئے گئے تھے اس وقت ہمیں وہ منظر یاد آگیا جب دونوں ماں بیٹیاں بڑے فخرو انبساط کے ساتھ قطار میں لگے ان برتنوں کو دیکھا کرتی تھیں یہ شور سن کر ہم بھی دیوان خانے سے اخبار پڑھتے اٹھ کر باورچی خانہ میں گئے دونوں کی صورتیں دیکھنے کے لائق تھیں جیسے ان کی ساری زندگی کی کمائی لٹ گئی ہو ۔ انھیں دیکھ کر واقعی ہمیں بھی رحم آگیا اور ہم جو لاپرواہی برتنے پر انھیں ڈانٹنے آئے تھے خود بھی ان کے غم میں شریک ہوگئے ۔

بات یہیں تک محدود رہتی تو کچھ نہیں تھا کھانے کی میز پر سب کو چپ چپ دیکھ کر ہماری رگ پدری پھڑک اٹھی اور ہم نے دفتر جاتے ہوئے دونوں ماں بیٹیوں کو بلا کر کہا " اب جو ہوا اسے بھول جاؤ یہ پیسے لے جاؤ اور بازار سے دوسرے برتن خرید کر لے آو ۔ " ہماری جانب سے اس فراخ دلی کے مظاہرہ پر دونوں جواباً کچھ کہنے کے بجائے ہمیں ستائشی نظروں سے دیکھنے لگیں ایسے موقعہ پر کسی مرد کو کتنے فخر کا احساس ہوتا ہے یہ وہی جان سکتے ہیں جو مرد ہوں اور کماؤ ہوں، ہم نے پیسے اپنی صاحبزادی کے ہاتھ پر رکھے اور دفتر کے لیے روانہ ہوگئے گھر کی سیڑھیاں اترتے اترتے ہمارے کانوں میں، ہماری اہلیہ کے یہ الفاظ گونجے جو وہ اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھیں:

" ہم ان پیسوں کے برتن خریدنے کی بجائے کیوں نہ تمہارے بابا اور بھیا کے لیے نئے کپڑے خرید لیں بے چارے باپ بیٹوں نے کئی مہینوں سے نئے کپڑے نہیں بنائے

(شگوفہ دسمبر ۱۹۸۸ء)

سلیم مقصود

ایک شب کا شاعر

نام سلیم مقصود
مصروفیت سب ایڈیٹر روزنامہ منصف حیدرآباد
شگوفہ اور دوسرے رسائل و اخبارات میں کوئی ۲۵ سال سے
مضامین شائع ہو رہے ہیں

" جب ایک بہشتی ایک دن کا بادشاہ بن سکتا ہے تو ہمارے ایک پہلوان دوست زمان بھائی کیوں ایک شب کا شاعر نہیں بن سکتے۔ ؟ " ہم نے سوچا

زماں بھائی میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو آج کل کے شعراء میں پائی جاتی ہیں ۔ فرق صرف ڈیل ڈول کا تھا ۔ ان کا ڈیل ڈول ہاتھی اور اونٹ کے درمیان والی کسی شئے جیسا تھا ۔ غرض ہم نے اس خیال کے آتے ہی زماں بھائی کی مرضی جاننے کے لئے ان سے کہا " زماں بھائی! آج کے مشاعرے میں آپ بھی حصہ لیں گے! " زماں بھائی ہنس کر بولے " مشاعرہ ہے! اکھاڑا ہوتا تو بے شک ہم بھی برابر حصہ لیتے! " ہم نے جوابدیا " آج کل کے مشاعرے بھی اکھاڑوں سے کم نہیں ۔ اگر آپ چل نکلے تو کامیاب شاعر بن جائیں گے! " انھوں نے حیرت سے پوچھا " کیا آج کل مشاعروں میں شاعر سے شاعر کی کشتی کروائی جاتی ہے ؟ آخر کیا معاملہ ہے کہ ہمارے بھی چل نکلنے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں ۔ " ہم نے انھیں سمجھایا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہم انھیں نقلی یا (DUPLICATE) شاعر بنادیں گے ۔ وہ بے چارے تیار ہوگئے ۔ ہم نے ان سے کہا کہ یہ کام ابھی اور اسی وقت ہونا چاہیئے ۔ فوراً ہم نے اخبار میں مقامی خبروں کے کالم پر نظر ڈالی ۔ اسی شب " بزم جاہلان ادب " کے زیر اہتمام ، ایک مشاعرہ تھا ہم لوگ بڑی تیاری کے ساتھ اس جگہ پہنچے مشاعرہ شروع ہوچکا تھا ۔ ہم نے زماں بھائی المتخلص " شہ زور " کا نام بھی شاعروں کی فہرست میں شامل کروادیا ۔ وہاں شاعر گردنیں اکڑائے یوں بیٹھے تھے جیسے ریس کے گھوڑے دوڑنے سے پہلے میدان میں کھڑے رہتے ہیں ۔ زماں بھائی کا نام پکارا گیا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے ۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے:

" کمبخت نے ہمارے نام کے ساتھ " پہلوان " کے اسم توصیفی کا اضافہ نہیں کیا ۔ ہم پہلوان پہلے ہیں اور شاعر بعد میں ۔ ہم

نے فوراً معتمد مشاعرہ کی توجہ اس خطرناک غلطی کی طرف مبذول کروائی تب ں کا نام ان کے توصیفی اسم کے ساتھ دوبارہ پکارا گیا۔ زماں بھائی نے ڈائس پر جاکر اپنی شیروانی کی جیبیں ٹٹولنی شروع کیں لیکن ان جیبوں سے کچھ برآمد نہ ہوسکا انھوں نے جھنجھلاکر ڈائس سے ہانک لگائی۔ "مرزا بھائی! دوسری غزل بھیجتا وہ غزل سالی تو کہیں گم ہوگئی۔" ہم سٹپٹا گئے ہم نے آہستہ سے زماں بھائی کے قریبی و واحد شاگرد رشید کے کان میں کہا کہ پہلوان نے غزل تو لنگوٹ میں لگا رکھی تھی۔

شاگرد رشید نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے چھلانگ لگائی اور استاد کے قدموں میں گرتے ہوئے استاد کو غزل کا اتا پتا بتلایا۔ زماں بھائی نے فوراً سامعین کی طرف پیٹھ کر دی اور فوراً لنگوٹ میں سے مڑا تڑا کاغذ کا ٹکڑا نکالا جس پر غزل لکھی ہوئی تھی اور تحت اللفظ غزل سنانی شروع کی جس پر کمزور دل سامعین ہال سے اٹھ کر باہر آگئے اور جب باقی غزل انھوں نے ترنم سے شروع کی تو تمام لوگوں نے گھبراکر اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لئے تاکہ چھت گرنے پر اسے اپنے ہاتھوں پر تھام سکیں صرف ڈائس پر بیٹھے ہوئے شاعروں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ زماں بھائی کو اس دہشت و افراتفری میں کسی نے داد نہیں دی۔ ان کے اندر کا پہلوان فوراً جاگ اٹھا۔ انھوں نے غزل کا آخری شعر پڑھنے کے بعد سامعین سے اور پھر شاعروں سے مخاطب ہوکر یوں وارننگ دی۔ "مجھے کسی نے بھی داد نہیں دی۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ دوسروں کو کیسے داد ملتی ہے؟" بس وہ ایک غزل ختم کرکے ڈائس کی سیدھی جانب کھڑے ہوگئے۔ انھیں وہاں سے ہٹانے کی لاکھ کوششیں کی گئیں لیکن اس میں کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ زماں بھائی کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ اکھاڑے میں زمین پر اگر گر جاتے تو بغیر چت ہوئے نہیں اٹھتے تھے آج دوسری خصوصیت کا ہمیں پتہ چلا کہ وہ اگر ضد پر آجائیں تو گھنٹوں "دھوبی پاٹ مارنے" کے انداز میں کھڑے رہتے ہیں اور کوئی انھیں ہلا تک نہ سکتا۔ لوگ زماں بھائی کے قریب جانے سے ڈرنے لگے کہ کہیں وہ انھیں دھوبی پاٹ نہ ماردیں۔ تھوڑی دیر تک تو لوگوں نے ان سے ڈر کر داد نہ دی لیکن اس کے بعد "زباں نہیں تو کھلے گی رگ زماں صیاد" والا معاملہ ہوگیا۔ نظروں کے اشارے، ابرؤں کے خم سے داد دی جانے لگی۔ اس کے بعد انگلیوں کے اشاروں سے پھر بعض دل والوں نے جو دل کرکے کھلے بندوں داد دینی شروع کی تو سب نے اس حق کا استعمال جائز اور ناجائز ہر طرح سے کرنا شروع کردیا اور مشاعرہ گاہ داد کے جگر خراش نعروں سے گونجنے لگی زماں بھائی نے فوراً نشست گاہ پر ہلہ بول دیا بھاگ دوڑ مچ گئی مشاعرہ سیاسی جلسہ میں تبدیل ہوگیا۔ کئی لوگ زخمی ہوگئے۔ کئی دہشت سے بے ہوش ہوگئے۔ پولیس آگئی زخمیوں کو فوراً طبی امداد پہنچائی گئی جو لوگ شدید طور پر زخمی ہوگئے تھے انہیں ہسپتال پہونچایا گیا۔ زماں بھائی گرفتار کرلئے گئے توڑ پھوڑ دنگا فساد مچانے کے الزام میں انھیں تین ماہ کی قید بامشقت اور کچھ جرمانہ ہوگیا۔ ہمارے (۳) ماہ بڑی مصیبت سے کٹے ہر وقت یہی سوچ لگی رہتی کہ پہلوان کے باہر آنے کے بعد کیا ہوگا؟ عدالت میں انہوں نے ہمیں ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ڈاکو مان سنگھ نے اپنے گرفتار کرنے والوں کو دیکھا ہوگا۔ بار بار وہ اپنی خوں بار آنکھوں سے کہہ رہے تھے "قید سے آزاد ہونے کے بعد تیرا نام و نشان مٹادونگا۔ اصل فساد کی جڑ تو تو ہی تھا۔ نہ تو غزل پڑھنے کو اکساتا نہ یہ سب ہوتا۔ ہمیں اپنا نام و نشان دونوں دھندلے پڑتے نظر آئے۔ نام کے مٹنے میں دیری کتنی لگتی؟ نام بھی مختصر نشان بھی مختصر۔ داد نہ دینے والوں کا جب اتنا برا حشر ہوا تھا تو وہ شخص جو اس فساد کا بانی تھا اس کا حشر معلوم! بہرحال ان دنوں ہمارا بڑا براحال تھا۔ پانچوں حواسوں میں تین حواس تو تقریباً معطل ہوچکے تھے۔ البتہ باقی دو حواس "دو گنی حس والے" ہوگئے تھے جو چیز موٹی یا بے ڈیل ڈول دکھائی پڑتی اس پر فوراً زماں بھائی پہلوان کا گمان ہوتا

کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اچانک سامنے آکھڑے ہوں۔

ایک دن ہمارے کمرے کا دروازہ دھماکے سے آنکڑوں سمیت ہم پر آن پڑا۔ فلموں میں ایسے منظر ہمیں بہت بھاتے تھے لیکن حقیقی زندگی میں ہم اس منظر کو ایک لمحہ برداشت نہ کرسکے۔ زماں بھائی نے ہم پر سے دروازہ اٹھایا اور پھر ہمیں بھی زمین سے کالر پکڑ کر اٹھاکر کھڑا کیا اور کہنے لگے۔ " پیارے! تیری غزل تو تھی بہت اچھی۔ ہمارے پڑھنے کا انداز بالکل بیٹ نسل کے شور مچانے والوں جیسا تھا اس لئے وہ ہنگامہ ہوگیا۔ تیرا قصور یہ تھا کہ تو نے ہمیں شعر پڑھنے کا طریقہ نہیں بتلایا اور جیل میں ہمیں اس بات پر بھی کوفت ہوتی رہی کہ تو نے بھی تو حوالہ نہیں دی تھی تیرا بھی تو کچھ نہ کچھ انجام ہونا چاہئیے تھا۔ تیرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے تو کونسی سزا میں اضافہ ہوجاتا لیکن اب ہم نے تجھے معاف کردیا۔" ہم نے پوچھا " لیکن آپ نے یہ باتیں کس سے سیکھیں؟" ہنس کر بولے " اپنے ساتھ ایک شاعر بھی جیل بھگت رہا تھا اس نے یہ باتیں بتلائیں۔" ہم نے زماں بھائی کو اچھے موڈ میں دیکھ کر مزید کہا۔ "آپ شاعر تو نہ بن سکے چلئے آپ کو نثر نگار بناتے ہیں۔" انھوں نے ہنس کر ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔ " بھیا اب کے کتنے مہینوں کے لئے اندر بھجوانے کا ارادہ ہے؟" ہم اس دفعہ نہایت ہی سنجیدگی سے انھیں نثر نگار بنانے کے سلسلہ میں سوچ رہے تھے ان کے اس جواب پر ہمیں بہت غصہ آیا۔ دل میں آیا کہ ان کی گھڑے دار گردن فوراً توڑ پھوڑ دیں مگر ہمارا یہ خیال ان کی رانا پرتابی مونچھوں اور زندہ طلسماتی ڈیل ڈول میں الجھ کر رہ گیا۔

(شگوفہ، فبروری ۱۹۷۸ء)

رؤف خوشتر

دیوانے آم

نام (وہی جو والدین نے رکھا) عبدالرؤف
تاریخ پیدائش: (وہی جو لکر تو نقل کی تھی) ۷ اکتوبر ۱۹۴۴ء
وطن، (وہی جو عادل شاہوں کا پایہ تخت تھا) بیجاپور
ملازمت (وہی جو کنہیالال کپور کی تھی) پرنسپال (گورنمنٹ ڈگری کالج بیدر)
تعداد کتب (وہی جو پطرس بخاری کی مزاحیہ تصانیف کی تھی) ایک (غبارِ حاضر)
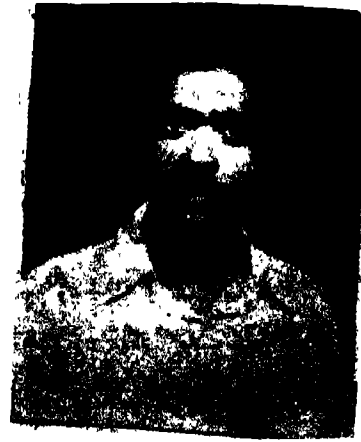
جنت نشاں اور راحت فزاں
ہندوستان میں جتنے فرقے اتنے تہوار، اور جتنے تہوار اتنی تعطیلات ہیں۔ ہمارے غیر محتاط اندازے کے مطابق یہاں ہر چوتھا دن تعطیل کا دن ہوتا ہے۔ بقیہ دن ہم اپنے طور پر تعطیلات مناتے رہتے ہیں، اونگھتے ہوئے، چائے سگریٹ پیتے ہوئے اور گپ بازی کرتے ہوئے۔ عام تعطیلات سے ہمارا نہ جی بھرتا ہے نہ پیٹ۔ مگر گرمائی لمبی تعطیلات عام سی نہیں آم کی تعطیلات ہوتی ہیں جبکہ جی بھی بھرتا ہے اور پیٹ بھی۔

خطا معاف ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کرکٹ کو کھیل کا بادشاہ اور آم کو پھلوں کا بادشاہ مان کر تعظیم کے پیش نظر صرف دو چار رن بنانے اور دو چار آم کھانے پر ہی اکتفا کرلیں۔

کرکٹ میں ہم سنچری بنائیں یا نہ بنائیں ہماری مرضی بلکہ اب تو سنچری بنانا بلے بازوں سے زیادہ ایمپائر کی مرضی بلکہ انگلی پر منحصر ہے۔ شہادت کی انگلی سے وہ بلے باز کو ۹۹ رن پر بھی شہید قرار دے سکتا ہے۔ لیکن آم کے موسم میں اگر ہمارے صحن میں بکھری ہوئی گٹھلیوں کو گنا جائے تو یقیناً ہمارا اسکور اظہرالدین کے اسکور سے زیادہ ہوگا۔

محکمۂ تعلیمات اب محکمۂ تعطیلات بن کر رہ گیا ہے، سرکاری تعطیلات کے علاوہ اساتذہ اپنے طور پر آرام کرتے رہتے ہیں چنانچہ ہمارے ایک پروفیسر دوست جو اتوار رات بھر سفر کرکے جب پیر کو کالج پہنچتے ہیں تو اسٹاف روم میں خراٹے بھرتے ہیں۔ ہم نے انہیں ٹوکا، کہا کہ آپ اسٹاف روم میں ہی کیوں سوتے ہیں؟ یہ بھی کوئی سونے کی جگہ ہے؟ کہا کہ پھر کہاں سوؤں؟ ہم نے کہا کہ کلاس روم کا رخ کیجئے کالج کے اساتذہ کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی تعریف یوں ہوتی ہے، لکچرار وہ جو پڑھتا ہے اور پڑھاتا ہے۔ ریڈر وہ جو کبھی کبھی پڑھتا ہے اور کبھی کبھی پڑھاتا ہے۔ پروفیسر وہ جو نہ پڑھتا ہے اور نہ پڑھاتا ہے۔ خیر محکمۂ تعلیمات کے پیش نظر گرمائی تعطیلات کا مقصد کچھ اور ہوتا ہوگا لیکن فی زمانہ ان لمبی تعطیلات کا

مصرف صرف اور صرف آم کھانا اور گٹھلیوں سے کھیلنا ہوکر رہ گیا
ہے ۔ طلبا پڑھیں یا نہ پڑھیں ، کامیاب ہوں یا فیل ہو جائیں ،
اساتذہ پڑھیں یا ٹیوشن چلائیں اس موسم میں ہر ایک کو آم نصیب
ہو جاتے ہیں ۔

آمدم بر سرآم ۔ آموں کو اب تک لال مٹی اور کالے لوگ بھاتے تھے ، مگر اب معاملہ بدل گیا ہے ۔ آموں کو اب سرد ممالک اور گورے لوگ پسند آرہے ہیں ۔

جی ہاں ۔ آموں کو شاید ہندوستان کی گرم اور فرقہ وارانہ ہوا راس نہیں آرہی ہے ۔ اس لئے وہ یوروپ اور امریکہ کا رخ کر رہے ہیں ۔ اب تو آم اور خاص لوگ ہی باہر جارہے ہیں ۔ سنا ہے باہر کے لوگ ہندوستانی آم کو ہاتھوں ہاتھ اور ہندوستانی عوام کو آڑے ہاتھ لے رہے ہیں ۔ ہمارے ایک آم فروش دوست باذوق اور حاضر جواب واقع ہوئے ہیں ۔ وہ ہمیشہ سے مہنگے اور اعلیٰ قسم کے آم فروخت کرتے ہیں ۔ اب ان کی شکایت ہیکہ کوئی ان کے آم نہیں خرید رہا ہے چنانچہ وہ " یہ دنیا یہ محفل میرے آم کی نہیں " کہتے ہوئے اپنے آم بیرونی ممالک کو بھیج رہے ہیں ۔

بقول حالی دلی کے اور بقول قاضی امراؤ بیگم کے نوشہ مرزا غالب نے جہاں اردو دنیا کو پرانی شراب ، جدید خطوط نگاری ، آسان چوسربازی اور مشکل شاعری سے روشناس کیا' وہیں انہوں نے آموں کی خوبیوں کو اتنے اچھوتے انداز میں پیش کیا کہ اس موضوع پر دوسروں کیلئے کہنے کو کچھ نہ رہا ۔ ایک آم ہی کیا غالب نے ایسا کچھ لکھا اور کہا ہے کہ اکثر شاعر اور نثرنگار حضرات نے غالب کی شاعری اور خطوط نویسی کے مطالعہ کے بعد اپنے قلم رکھ دیئے ۔ اور آموں کی طرف متوجہ ہوئے ۔ ان کی اس شعر و سخن سے کام و دہن کی طرف منتقلی کو شعر و ادب کی بڑی خدمت قرار دیا گیا ۔ البتہ آموں کو خطرہ لاحق ہو گیا ۔

اس دور کی ایک علت ہر چیز کی قلت ہے ، اسی لئے آج کل ہر کوئی مرزا غالب کی طرح یہ آرزو کرتا ہے کہ آم بہت ، اور میٹھے ہوں ، لیکن ہمارے بچپن ، لڑکپن اور انیس سو پچپن کے وقت قلت نام کی کوئی چیز نہیں تھی ۔ ہمیں یاد ہے کہ اس وقت بھائی جان صحن میں ہر وقت پھلوں کے بھرے بھرے ٹوکرے رکھتے اور چھت پر کھڑے ہوکر طارزن کی طرح زور زور سے پکارتے ہوئے ہمیں بلاتے تھے ۔
آجا ۔۔۔ آجا ۔۔۔ رے ۔۔۔ کل جامن کا ڈھیر ملا تھا ، اب آموں کا ڈھیر پکارے ۔۔۔! اور ہم طارزن کے سدھائے ہوئے جانور کی طرح یہ کہتے ہوئے دوڑ پڑتے " ہم کو آنا پڑے گا آموں کو کھانا پڑے گا ۔ "

کثرت میں وحدت کے مصداق آم تو ہر جگہ مل جاتے ہیں ، مگر الگ الگ ناموں سے ، جیسے قلمی آم ، فلمی آم (وہ آم جو فلموں میں رکھے ہوتے ہیں) لنگڑا ، دسہری ، چوسہ ، فضلی ، ثمر بہشت ، گلاب ، خاصی ، سفیدہ ، ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ ۔ جنوبی ہند میں ایک عام ہوتا ہے آپوس یہ اتنا میٹھا ہوتا ہے جیسے کہہ رہا ہو آچوس ۔ "

پہلے آم صرف آم کی شکل ہی میں ملتے تھے ۔ اب آم جام کی شکل میں مل جاتے ہیں ۔ آم کا جام ، آم کی جیلی ، آم کا مشروب ۔ جب لوگ ایک چہرے پر کئی چہروں کے نقاب لگاسکتے ہیں تو پھر موجودہ دور کے آم بھی کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں ۔ سو وہ بھی بدلی ہوئی شکلوں کے ساتھ آرہے ہیں ۔ آم کی خوبی یہ ہے کہ یہ خربوزے کی طرح رنگ نہیں بدلتے ۔ آم کے چھلکے کیلے کے چھلکوں کی طرح کسی کو گراتے نہیں ہیں ۔
آم کا پودا خواص کا پودا ہے ۔ عام درختوں کے ساتھ نہیں اگتا ۔ ہمارے ایک دوست کے باغ میں ہر قسم کے پھل کے درخت ہیں

جب انہوں نے آم کے درخت لگوائے تو ہم نے کہا "جناب یہاں آم کے درخت نہیں اگ سکتے" تو انہوں نے جواب دیا" بادام ہوئے تو کیا آم نہ ہوگا۔" موجودہ دور میں بڑے ملک ایک دوسرے کو ہتھیار، بم دیتے رہتے ہیں، اس لئے ہم کہتے ہیں " اے میرے دل کہیں اور چل، ہم کی دنیا سے دل بھر گیا" ہندوستان چونکہ صدیوں سے امن پسند ملک رہا ہے، اس لئے وہ خلوص و محبت کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کو آم بانٹتا ہے۔ بلکہ کئی ممالک کے مہمان تو محض آموں کی خاطر اپنے دورے آم کے موسم میں مقرر کرلیتے ہیں اس طرح ان کے ہندوستان کے ساتھ میٹھے، شیریں تعلقات بنے رہتے ہیں اور آم بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔ ایسے دوروں کو وہ ہر لحاظ سے ثمرآور دورہ کہتے ہیں۔ اس عالمی سیاست کو "آم کے آم گٹھلیوں کے دام" کہتے ہیں۔

اس طرح موجودہ دور میں جو کام ہوشیار اور قابل سفیر نہیں کرپاتے وہ کام میٹھے آم خاموشی سے کرلیتے ہیں۔ ظاہر ہے جب کوئی میٹھے آم کھائے گا تو وہ جنگ، تشدد، اور نفرت کی باتیں نہیں کرپائے گا۔ اس لئے ہمارا مشورہ ہے کہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں مندوبین کے ہاتھوں میں آم تھمادینا چاہیئے۔ ظاہر ہے وہ جارحانہ باتیں چھوڑ کر آم چوسنے میں لگ جائیں گے۔ اس طرح تیسری عالمگیر جنگ ٹل جائے گی۔ اور مندوبین کی تقریروں میں مٹھاس آئے گی۔ جوہری لڑائی دور مار مزآئیل، جنگ سے، نزدیک مار گٹھلی جنگ بہتر ہے۔ کیچڑ اچھالنے سے آم کا رس اُچھالنا اچھا ہے

آموں کی بات ہو رہی ہو اور بوم الدولہ کا ذکر نہ ہو کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم آم چوس رہے تھے کہ دبے پاؤں آکر پکے ہوئے آموں کی طرح آم کی ٹوکری پر گر پڑے۔ اور کہنے لگے "اماں یار ہماری جمہوریت کا حال بھی اب آم کے درخت جیسا ہوگیا ہے۔ آم کا درخت بونے اور نگرانی کرنے والوں کو پتھر مل رہے ہیں اور پتھر مارنے والوں کو آم۔" گویا" جو بڑھ کے تھام لے آم اسی کا ہے۔ "اچھا ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو پردہ نشین خواتین کی طرح خود کو چھپائے رکھتے ہیں اور شریر بچوں کے ہوس زدہ پتھروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ہم نے کہا ایسے آموں کو سیانے آم کہیں گے۔ تب بوم الدولہ نے ایک اور سوال داغ دیا اور ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو جدید نسل کی فیشن ایبل خواتین کی طرح خود کو آشکار کرتے رہتے ہیں۔ اور یوں وہ آوارہ اور شریر بچوں کے پتھروں کا نشانہ بن بن کر ان کی گودہی میں آگرتے ہیں؟

ہمارا جواب تھا۔۔۔ "دیوانے آم"۔

(شگوفہ مئی ۱۹۸۲ء)

بابو آر۔ کے

کرکٹ اور ہم

نام بابو آر کے
اچلپور ضلع امراوتی (مہاراشٹرا) سے تعلق ہے عرصہ سے مزاح لکھ رہے ہیں

کرکٹ کمنٹری سننا، کرکٹ دیکھنا اور اس پر بحث کرنا اس پوری دہائی میں، ہم ہندوستانیوں کے رگ و ریشے میں رچ بس گیا ہے --- پہلے پہل ہمیں اس کھیل کی بے جا طوالت اور جان لیوا اکتاہٹ، انتظار جاناں اور شب ہجراں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے لگتے تھے۔ اسی لیے ایک زمانے تک ہم اس کھیل سے بے نیازی برتتے رہے لیکن جب آہستہ آہستہ یہ کھیل، ہماری بھارتیہ سنسکرتی میں پڑاؤ ڈالتا گیا اور ہماری سبھیتا کا ایک انگ بن گیا تب --- ایسی صورت میں اس کھیل سے نابلد رہنے کی تہمت اپنے سر لیے پھرنا ہمارے لیے ناممکن ٹھہرا گویا ہمیں ماڈرن دور کے جدید تقاضے کرکٹ کے بغیر آدھے ادھورے محسوس ہوئے۔ اور پھر --- اس کھیل کی مقبولیت نے آپ ہی آپ ہمیں یہ باور کرا دیا کہ فی زمانہ اگر ہم کرکٹ پر گہرائی کے ساتھ گفتگو نہیں کرسکے تو --- ہم جیسا غیر مہذب اور دنیا بیزار آدمی دوسرا کوئی نہیں ہوگا۔ یوں بھی موجودہ دور میں کسی اچھے بھلے آدمی کا معزز شہری سمجھا جانا بس اسی پہ منحصر رہ گیا ہے کہ وہ کرکٹ کو کتنا اور کہاں تک جانتا ہے؟

اس کھیل میں بے شمار خامیوں کے ساتھ چند ایک خوبیاں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ جو خوبی ہمیں سب سے زیادہ پسند آئی وہ ہے اس کھیل کے اصول اور ضابطے۔ اسی لیے صدر پاکستان نے وہاں کی اپوزیشن پارٹیوں سے کہا کہ وہ سیاست کو کرکٹ کی طرح اصول و ضابطے سے مزین کریں اور ہاکی کی طرح اسے ہاہاکار اور مارا ماری کی آماجگاہ نہ بننے دیں۔ اسی طرح اس کھیل کی جو نمایاں خوبی ہے وہ ہے اس کے ریکارڈس حقیقتاً کرکٹ کے ریکارڈس کے آگے نزدل کے ریکارڈ آف رائٹس بھی WRONG معلوم ہوتے ہیں اور H.M.V کے ریکارڈس بھی بے سرے ہو جاتے ہیں۔ اکثر آسمانی صحیفوں میں تک تحریف و اضافہ ہوا ہے تاریخ مسخ کی گئی ملکوں کے آئین، آئینی اور غیر آئینی طریقوں سے بدلے گئے۔ لیکن کرکٹ کے

ریکارڈس میں تبدیلی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ویسے بھی یہ کرکٹ کے ریکارڈس کوئی سرکاری یا نیم سرکاری محکموں کے ریکارڈس تو ہیں نہیں کہ جس میں الٹ پھیر یا کم دبیشی کی گنجائش رہے۔ نیتا۔ ابھینیتا۔ کرکٹ اور گرگٹ یہ سب رنگ بدلنے کے معاملہ میں ایک دوسرے کے سنگی ساتھی رہے ہیں۔۔ اور انھیں نیرنگیوں سے کرکٹ کی رنگارنگی میں اضافہ ہوا ہے۔۔۔ پہلے پہل سرد ممالک میں یہ کھیل دھوپ سینکنے کے لیے SUN BATH کھیلا گیا اور شاید ایسا اس لیے بھی ہوا کہ نقل کو عقل سے کبھی علاقہ ہوتا ہے نہ واسطہ۔ اس کھیل میں بیٹنگ اور بولنگ دو شعبے ہوتے ہیں۔ بیٹسمین چھاپہ مار نیتی کے قائل ہوتے ہیں۔ مارو اور بھاگو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے رن کبھی کبھار ہی بنا پاتے ہیں جبکہ زیادہ تر حالتوں میں گیند خود بلے سے لگ کر ادھر ادھر ہو جاتی ہے اور خود رن بٹور لیتی ہے۔ سرکش ندیوں کے کنارے ہوں یا کرکٹ بیٹ کے کنارے دونوں ہی خطرناک ہوتے ہیں ایک بستیاں ڈبوتے ہیں تو دوسرے بیٹسمن کی لٹیا۔

اس کھیل میں بولنگ کی دو مخصوص قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک فاسٹ اور دوسری اسپن فاسٹ باولر اور اسپن باولر کی تعریف اگر کوئی ہم سے جاننا چاہے تو ہم اپنے مشاہدے کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ فاسٹ بولر ذرا نفاست پسند ہوتا ہے۔ یعنی جہاں یہ پسینے و لعابِ دہن وغیرہ سے گیند گندی کرتا ہے وہیں اسے صاف رکھنے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتا ہے جب کہ اسپن بولر یہ تو سرے سے ہی گیند کو میلی کرنے کی روٹی کھاتا ہے۔ دنیا کے سارے ہی فاسٹ اور اسپن بولر کو بولنگ کرتے ہوئے دیکھنے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خارش کی وباء تبدیلی جگہ کے ساتھ دونوں قسم کے بولرس میں پائی جاتی ہے یعنی ایک کی ران میں تو دوسرے کی ہتھیلی میں۔ اسی لیے تو فاسٹ بولر اپنی ران کی کھجلی گیند سے رگڑ رگڑ کر مٹاتا ہے اور اسپن بولر گیند گھما پھرا کر اپنی ہتھیلیوں کی خارش کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ اور شاید یہی جان لیوا عارضہ گیند بازوں کو زیادہ عرصہ تک کرکٹ میں ٹکنے نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے اپنی ساری کرکٹ لائف میں کھجا کھجا کر جی ہلکان کر لیتے ہیں اور پھر ریٹائرمنٹ کا اعلان کر جاتے ہیں

بہت جلد SHAPELESS ہو جانے کی ریکارڈ خصوصیت ہندوستانی بیویوں کی طرح ہی کرکٹ کے بال میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہم لوگ بھلے ہی ٹینک اور میزائیل بنالیں لیکن عمدہ کوالٹی کی گیند بنانا آج بھی ہمارے لیے چیلنج سے کم نہیں۔ یوں تو ہر کھیل میں کھلاڑی کو مار لگتی ہے لیکن صرف کرکٹ کا کھیل ہی وہ کھیل ہے جس میں معمولی چوٹ بھی خطرناک صورت حال اختیار کر جاتی ہے۔ چونکہ یہ کھیل لارڈز وں اور وائسراؤں کا رہا ہے اس لیے تھوڑے کو زیادہ اور معمولی سمجھنا اس کھیل کی روایت میں شامل ہے دوسرے کھیلوں میں کھلاڑی کو آئی بڑی سے بڑی چوٹ بھی نظرانداز کر دی جاتی ہے جبکہ کرکٹ کھلاڑی پر اگر سنگترے کا چھلکا بھی اچھال دیا جائے تو وہ اس کی نازک چمڑی کے لیے ایسڈ کا کام کرنے لگتا ہے اور ایسا ہونا اس لیے بھی واجبی ہے کہ واقعی سنگترے میں ایسڈ ہوتا ہے اس لیے کرکٹ کا کھلاڑی اگر تلملا جائے تو اس میں بھلا اس بے چارے کا کیا قصور؟ جتنا نازک اور آبگینوں سا تن کرکٹ کے کھلاڑی کا ہوتا ہے اس سے سوا نازک مزاج اس کھیل کی پچ بھی رکھتی ہے۔ مدتوں اس کی حفاظت کتنے ہی جتن سے کیوں نہ کی جائے پھر بھی اس میں کھڈ نکل آتے ہیں یا درستگی کی طالب یہ ہمیشہ ہی رہتی ہے اب یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سڑکوں اور قومی شاہراؤں کے کچے پن کے معاملے میں ہمارا محکمہ P.W.D خواہ مخواہ ہی بدنام ہوتا آیا ہے جبکہ اپنے دیش کی مٹی کا مزاج ہی بگڑا ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کرکٹ پچوں کی اتنی ناز برداری کے باوجود ان کی اتنی مٹی پلید نہ ہوتی۔ اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کو حادثات کی یا محکمہ ریلوے کو تاخیرِ وقت کی جو ضد ہے بس ویسی

ہی ضد ان بچوں کو بھیگ جانے کی ہوا کرتی ہے۔ یہ معمولی پانی سے بھی بچا بچ ہو جاتی ہیں اسی لیے انھیں بچ کہا جاتا ہے۔ ویسے تو شائقین ہر کھیل کے ہوا کرتے ہیں لیکن کرکٹ کے شائقین کی شان جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کھیل کے رسیاؤں کا سلسلہ گود سے شروع ہو کر گور تک جاتا ہے۔ کرکٹ دیکھتے وقت بچے جوان بوڑھے عورت مرد سب ہی آپے سے باہر ہوتے ہیں۔ بیٹسمن کے اچھے اسٹروک پر جہاں بچے تالیاں بجاتے اور جوان چیختے چلاتے ہیں وہیں بڑے بوڑھے اپنے پوپلے منہ سے چوکہ گرنے تک بیٹ سے نکلے چوکے کی تعریف کرتے نہیں چوکتے۔ ہر میچ کی طرح اس کھیل میں بھی امپائر کی موجودگی ضروری ہوتی ہے دیگر کھیلوں کے امپائر WHISTLE کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی کبھی چیخ چلا کر بھی اپنا کام چلا لیتے ہیں جب کہ کرکٹ کا امپائر PIN DROP SILENCE کا قائل ہوتا ہے۔ اور اردو غزل کے معشوق کی طرح اشاروں کنایوں میں امپائرنگ کا فرض انجام دیتا ہے۔ امپائروں کے ناز و انداز اور ان کا اٹھلانا بل کھانا بھی دیدنی ہوتا ہے۔ امپائر کا چوکے کا اشارہ اور بھارت ناٹیم کا نظارہ یکساں ہوتا ہے۔ کرکٹ کے امپائر کی ساری جان اور توانائی بلکہ قوت گویائی بھی اس کی کلمے کی انگلی میں سمٹی رہتی ہے۔ نو بال کے وقت بھی یہی انگلی سگنل دیتی ہے اور چھکے کے وقت بھی۔ وکٹ گرانے کے لیے بھی یہی انگلی فضاء میں لہرائی جاتی ہے تو ثابت یہ ہوا کہ کرکٹ کا امپائر بننے کے لئے جسم میں دوسرے اعضاء بھلے ہی نہ ہوں لیکن ہاتھ کے پنجے میں کلمہ کی انگلی بہت ضروری ہوا کرتی ہے۔ ایک اور خصوصیت کرکٹ امپائر کی یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ بیٹسمن اور گیند باز کی دی ہوئی ہر چیز کا بوجھ اپنے اوپر بلا تامل ڈال لیتا ہے اور یہ بھی اتنی خوبی کے ساتھ کہ کتنی ہی چیزیں دی جائیں تب بھی اس کے دونوں ہاتھ خالی ہی رہتے ہیں۔ امپائر کی کوٹ کی جیب کی وسعت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ گیند باز کا دیا ہوا الحیم شحیم سوئٹر ان کی جیب کے کسی گوشے میں مخنی سی دستی کی طرح سما جاتا ہے اور گیند باز کو اسے لوٹاتے وقت جیب کے اندر بہت دیر اور بہت دور تک تلاش و کھوج درکار ہوتی ہے۔

اس کھیل سے لوگوں کا شغف دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگا ہے۔ ہمارے ملک کے کتنے ہی ماں باپ اپنے نونہالوں کو کرکٹ کھلاڑی دیکھنا پسند کرتے ہیں اسی لیے تو وہ اپنے بچوں کے ہاتھ میں قلم کتاب دیکھ کر جل بھن جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں گیند بلا دیکھ کر سو جان سے وارے جاتے ہیں ۔۔۔ اور ہم ۔۔ کرکٹ کی اس ہر دلعزیزی کے پس منظر میں یہ سوچ سوچ کر اپنا خون پانی کر رہے ہیں کہ اس کھیل کے ساتھ ساتھ کہیں ہماری بے اصولی زندگیوں میں اس کا ڈسپلن بھی رواج نہ پالے ۔۔!! (شگوفہ، ستمبر ۱۹۸۷ء)
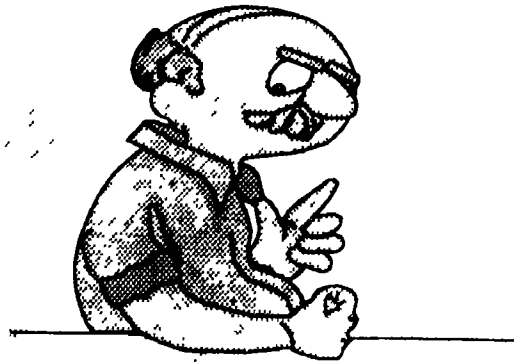
ڈاکٹر ظفر کمالی
(سیوان)

اُردو نثر میں ظرافت کے مختلف رجحانات

(دوسری و آخری قسط)

نام ظفراللہ
قلمی نام ظفر کمالی
تاریخ پیدائش ۳/ اگست ۱۹۵۹ء (میٹرک کی سند کے مطابق)
مقام پیدائش۔ موضع رانی پور پوسٹ آفس بڑہریا ضلع سیوان (بہار)
تعلیم ایم۔ اے (اردو، فارسی) بی۔ ایڈ، پی ایچ ڈی (اردو) پٹنہ یونیورسٹی
ملازمت: لکچرر شعبہ فارسی زیڈ۔ اے اسلامیہ کالج سیوان بہار ۲۲/ اپریل ۱۹۹۰ء سے
تصنیف: مکاتیب بدیا صیہ (۱۹۸۶ء)

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس آزادی کے ساتھ ساتھ قتل و غارت گری، دہشت پسندی، معصوم لڑکیوں اور عورتوں کی آبرو ریزی، لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ جبر و استبداد اور ظلم و ستم کے عفریت نے آزادی کو لہولہان کر دیا۔ ہندوستانی باشندوں کی امنگیں اور آرزوئیں خاک میں مل گئیں اس پر آشوب دور کی پر درد اور بھیانک تصویریں ہم کرشن چندر، کنھیالال کپور اور منٹو کے یہاں بخوبی دیکھ سکتے ہیں جو ظلم اور فرقہ واریت کے خلاف کھل کر لکھتے ہیں اور ہر قسم کے تعصب، تنگ نظری اور استحصال کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان تحریروں میں فرقہ واریت کے خلاف طنز کا رجحان سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔

جن ظرافت نگاروں نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا ان میں کنھیالال کپور، کرشن چندر، منٹو اور فکر تونسوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں عزیز احمد لکھتے ہیں۔

" ترقی پسند تحریک نے صرف ایک اچھا ظریف اور مضحکہ نگار پیدا کیا ہے، کنھیالال کپور " (ترقی پسند ادب ص/ ۱۶۱)

عزیز احمد کے " صرف ایک " سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اپنے ہم عصروں میں اس تحریک سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے کپور ہی ہیں۔ وہ ایوانِ ادب میں پیروڈی نگار کی حیثیت سے داخل ہوئے ان کے مضامین میں معاشرے کا کرب شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ وہ سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور ادبی سبھی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تقسیم عظیم کے بعد انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں طنز کی لے کافی تیز ہے۔ " جانشیں " کا ایک اقتباس دیکھیے جس میں کپور نے گاندھی جی کے جانشینوں کے چہروں سے نقاب اٹھایا ہے وزیر خوراک بھوکوں کے نرغے میں ہیں۔ نارد منی وہاں بھیس بدل کر آتے ہیں اور پھر

" نارد۔ روٹی اردوٹی!!

وزیر خوراک: " اور اناج اگاؤ مہم " کے کامیاب ہونے کے

بعد تمھیں روٹی ضرور ملے گی

نارد. اس وقت کیا کھائیں؟

وزیرِخوراک. اس وقت "ہفتے میں سات دن فاقہ کرو" مہم پر عمل کرو۔

نارد. ہم بھوکوں مر جائیں گے۔

وزیرِخوراک تمھیں موت سے بچانے کے لیے میں زیادہ سے زیادہ درخت اگا رہا ہوں۔

نارد کیا درختوں پر روٹیاں اگیں گی؟

وزیرِخوراک روٹیاں نہیں تو پتے ضرور اُگیں گے۔ تم درختوں کے پتے کھا کر اپنا پیٹ بھر سکتے ہو۔

نارد کیا ہم حیوان ہیں؟ آپ خود پتے کیوں نہیں کھاتے؟

وزیرِخوراک کیا میں اسی لیے وزیرِخوراک بنا ہوں کہ درختوں کے پتے کھاؤں؟

نارد کیا ہم نے آپ کو اس لیے وزیرِخوراک بنایا ہے کہ آپ ہمیں درختوں کے پتے کھلائیں؟

وزیرِخوراک تم بہت گستاخ ہو۔

نارد آپ بڑے ستم ظریف ہیں

وزیرِخوراک بھاگ جاؤ۔ تمھیں کھانے کو پتے بھی نہیں ملیں گے۔" (بال و پر۔ ص ۷۴-۷۵)

"ہجرت کے فائدے" "غنڈے" "پارلیامنٹ میں ایک اہم تقریر"، "برج بانو" اور "آزادی کی قسم" جیسے مضامین میں وہ ایک جارح ظرافت نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ کپور نے مختلف تنظیموں اور اداروں پر بھی طنز کیا ہے یہاں تک کہ ترقی پسند تحریک کو بھی نہیں بخشا۔ اپنے کئی مضامین مثلاً "حالی ترقی پسند شعراء کی محفل میں"، "ترقی پسند افسانے" اور "ترقی پسند دوست کے نام" میں اس تحریک کی بے اعتدالیوں کی جانب اشارے کیے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جارحانہ پن ضرور ہے لیکن عامیانہ اور سوقیانہ پن نہیں کپور کے یہاں طنز کا جو بلند و بانگ، کڑوا مگر کامیاب لہجہ ملتا ہے ویسا رجحان ان سے پہلے کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔

کرشن چندر افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ تقریباً سو کتابوں کے مصنف کی ادبی زندگی کا آغاز مزاح نگاری سے ہوا (پروفیسر بلیکی) اور اپنی زندگی کا آخری مضمون "ایک لڑکی نکھارتی ہے دال" کے عنوان سے قلم بند کیا جو ظرافت سے ہی تعلق رکھتا ہے ظرافت کرشن چندر کے مزاج کا لازمی جزو ہے اسی لیے وہ افسانہ لکھیں یا ناول یا کوئی اور چیز وہ قدم قدم پر قاری کو سیاسی اور سماجی طنز کے نشتر لگاتے ہوئے چلتے ہیں۔ یوں تو تقسیمِ ہند کے فوری بعد جو افسانے لکھے گئے ان میں بیش تر میں فطری طور پر طنزیہ لہجے کی کارفرمائی ملتی ہے مگر کرشن چندر کے یہاں یہ رنگ کچھ زیادہ ہی ہے۔ ان کے مجموعے "ہوائی قلعے" اور "کبوتر کے خطوط" میں جو ظریفانہ مضامین ہیں وہ ظرافت کے اچھے نمونے ہیں مگر وہ ان میں چہرکوں، چٹکیوں اور گدگدیوں سے آگے نہیں بڑھتے لیکن افسانوں میں طنزیہ لہجہ بہت واضح اور نمایاں ہے۔ "مردہ زندہ ہو گیا"، "عورتوں کا عطر"، "لال باغ"، "اندھے"، "دل کا چراغ"، "بے رنگ و بو"، "ایک طوائف کا خط"، "جامن کا پیڑ"، "خونی ناچ"، "سمندر دور ہے"، "دو فرلانگ" اور "پیشاور ایکسپریس" وغیرہ افسانوں میں طنز کی نشتریت بہت زیادہ ہے۔ ناولوں اور ڈراموں میں بھی ان کا مخصوص طنز جاری و ساری نظر آتا ہے۔ "ہم سب غلیظ ہیں"، "کتاب کا کفن"، "فلمی قاعدہ"، "دادر پل کے بچے"، "باون پتے"، "گدھے کی واپسی"، "ایک گدھا نیفا میں" اور "ایک گدھے کی

لذشت " میں ان کا قلم طنز کے موتی لٹاتا نظر آتا ہے ۔ " ایک گدھے کی سرگذشت " اور " دادر پل کے بچے " طنزیہ ناولوں میں انفرادیت
، حامل ہیں " گدھے کی سرگذشت " میں نظام حکومت ، دفتری کاروائیوں نئی نسل کی گمراہی ، اونچ نیچ کا فرق ، مقابلۃً حسن اور جنگ کی
توں کے خلاف احتجاج کا رنگ نمایاں ہے ۔ " دادر پل کے بچے " میں بھگوان مصنف کے ساتھ بچہ بن کر شہر بمبئی کے مختلف نگار خانوں
سیر کرتا ہے اور معصوم بچوں پر ہونے والے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے ۔ بھگوان بھکاری بچوں کی ٹولی میں شامل ہوجاتا ہے
. غنڈے ، جب اسے اندھا کرنے کے لیے دہکتے ہوئے انگارے کی طرح سرخ سلاخ کو الاؤ سے باہر نکالتے ہیں تو وہ چیخ مار کر کہہ اٹھتا ہے
ں نے دیکھ لیا ۔ ۔ ۔ میں نے دیکھ لیا ۔ ۔ ۔ ! " یہاں کرشن چندر نے مبالغے کا سہارا لیے بغیر ایک تلخ حقیقت کو فنی پیرائے میں پیش کر دیا
، کڑوی سماجی اور معاشرتی حقیقتوں کو بیان کرنے کا یہ اچھا انداز ہے ۔

اردو ظرافت کو نیا رجحان بخشنے اور نئی شاہراہ عطا کرنے والوں میں سعادت حسن منٹو کا نام بہت اہم ہے " چغد " ، " نمرود کی خدائی " ،
ر قعے " ، " سڑک کے کنارے " ، " سرکنڈوں کے پیچھے " ، " دھواں " ، " لذت سنگ " ، " گنجے فرشتے " ، " ، شکاری عورتیں " اور " سیاہ حاشیئے
، علاوہ " چچا سام کے نام خطوط " میں جا بجا ان کا طنز اپنے شباب پر نظر آتا ہے منٹو کا خاص اور محبوب موضوع عورت ہے اور عورتوں میں
سوصاً طوائفیں جن کا نام سن کر لوگ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں منٹو نے ان کا بیان ڈنکے کی چوٹ پر کیا ہے اس کی عقابی آنکھیں سات پردوں
ں چھپی سماجی برائیوں کا سراغ آسانی سے لگالیتی ہیں اس نے اپنی دور رس نگاہوں سے معاشرے اور انسانی تہذیب کے کھوکھلے پن کا
ابدہ کیا اور جو کچھ دیکھا اسے فن کے دائرے میں پیش کر دیا بقول ابو اللیث صدیقی

" اس کے کردار اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کی طرح اپنے منہ پر نقلی چہرے چڑھائے نظر نہیں آتے بلکہ وہ تو اپنے جسم پر
ہ لباس بھی اتار پھینکتے ہیں کہ ہم ان کے خد و خال ، ان کے دلاویز خطوط اور ابھار یا ابھرنا سور اور سڑتے ہوئے زخم بھی دیکھ لیں " ۔
نقوش لاہور ۔ منٹو نمبر ص ۲۹۱) " بلاؤز " ، " پھاہا " ، " ہتک " ، " موذیل " ، " خوشیا " اور " پہچان " اس کی اہم مثالیں ہیں ۔ منٹو چٹکیاں نہیں
ا ، اس کا طنز سانپ کی پھنکار ہے جو دشمن کو ڈسنے کے لیے ہمہ دم اپنا پھن اٹھائے رکھتا ہے اس کے طنز کا خنجر سیدھے دل میں اتر تا
سوس ہوتا ہے ۔ " کھول دو " کا یہ اقتباس دیکھیے .

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا ، اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا ۔ کھڑکی کھول دو ،
سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی ۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکادی ۔ بوڑھا سراج الدین
. شی سے چلایا ۔ " زندہ ہے میری بیٹی زندہ ہے ۔ ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہوگیا ۔ " (منٹو کے نمائندے افسانے ۔ مرتبہ اطہر
پرویز ص ۱۷۶)

منٹو کے طنز میں بھی دل ہلا دینے والی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ محمد یوسف ٹینک نے اپنے مقالے " سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری
ں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں ۔ ان کے مطابق " کھول دو کے اختتام کی تین سطریں تین علامتیں بن گئی ہیں ۔ جنس کی کج روی کے ارد
د تین مختلف رد عمل ایک شفیق باپ جو غیرت و حمیت کے رسمی لمحات میں اپنی بیٹی کا گلا گھونٹ دیتا اپنی غمزدگی کے صحرا میں بھٹکنے سے
ند ساری ظاہر داریوں کی کینچلی اتار چکا ہے اور اپنی بیٹی کو زندہ دیکھ کر حسیاتی مسرت محسوس کرتا ہے اس کا ملاحظہ کرنے والا ڈاکٹر جو
کینہ کی اتری ہوئی شلوار دیکھ کر جنسی طور پر بیدار نہیں ہوتا بلکہ انفعال کے پسینے میں سر سے پیر تک غرق ہوجاتا ہے اور سکینہ ۔ سکینہ
یک فرد کی حیثیت سے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہے ۔ کھول دو ، کے الفاظ پر وہ صرف ایک ہی رد عمل کا غیر شعوری طور پر

اظہار کرتی ہے ۔ یہ ہیبت ناک تصویر جنس کے نشاط کی نہیں بلکہ روح کے المیے کا اظہار ہے ۔ یہ جنس زدگی یا فحاشی کا اشتہار نہیں، انسان کی اصلیت اور اس کی جبلت کی آئینہ دار ہے " ۔ (اردو افسانہ روایت اور مسائل ۔مرتبہ گوپی چند نارنگ ص ۲۷۵-۲۷۶) ۔ منٹو صرف نشتر ہی نہیں چبھوتا، اچانک شاک بھی لگاتا ہے جس میں رحم و کرم کا کوئی دخل نہیں ۔ اس کا طنز قاری کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے لگتا ہے جیسے کسی نے اسے شارع عام پر ننگا کر دیا ہو ۔ منٹو نے چابک دستی اور سفاکی کے ساتھ معاشرے کی ریاکاریوں کا پردا فاش کیا ہے ۔ اردو ظرافت کو طنز کا یہ انوکھا رجحان منٹو کی دین ہے ۔ یہ خصوصیت صرف اسی کی ذات سے عبارت ہو کر رہ گئی ۔

فکر تونسوی کی ظرافت کی ابتدا ۱۹۵۱ء سے ہوتی ہے لیکن ظرافت نگار کی حیثیت سے ان کی اصل شہرت روز نامہ "ملاپ" (دہلی) کے کالم "پیاز کے چھلکے" سے ہوئی ۔ فکر تونسوی نے اپنے کالموں، مضامین اور ناولوں میں بھوک، غربت، افلاس، فرقہ واریت، بے روز گاری، رشوت خوری اور چور بازاری کے خلاف جس انداز میں آواز اٹھائی وہ بالکل نیا لہجہ ہے ۔ بچپن سے جوانی تک پر مشقت زندگی اور پھر تقسیم ہند کے بعد ہجرت کا المیہ، ان چیزوں نے ان کے تجربات اور شعور کو جلا بخشی اور جب انھوں نے ظرافت نگاری شروع کی تو یہی تجربات شعلۂ جوالہ بن کر طنز کے سانچے میں ڈھلنے لگے ۔ فکر کی بیش تر تحریروں میں برہمی اور جھلاہٹ کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی محرومی اور بے قراری کا احساس ہوتا ہے ۔ ایسی بے قراری اور محرومی جو غم زدہ ماحول میں گھر جانے کے سبب ہوتی ہے ۔ اس کے باوجود ان کے یہاں گھبراہٹ کا عنصر شامل نہیں ۔ انھیں تو غموں سے مقابلہ کرنے میں لطف آتا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

" جو لذت غم سے مقابلہ کرنے اور پھر اس پر فتح پانے میں ملتی ہے اس کے کبھی کبھار گھونٹ پی لینا میری عادت بن چکی ہے ۔ اگر چہ بعض اوقات اس تجربہ میں شکست کھا کر منہ کے بل گرنا پڑجاتا ہے لیکن (میں) یہ سمجھتا ہوں کہ منہ کے بل گرنے میں بھی کچھ کم لذت تو نہیں ۔ " (خد و خال ص ۱۵)

غموں کے گھونٹ پی کر فکر تونسوی منہ بنانے کے بجائے مسکرانے کے قائل ہیں لیکن اس عمل میں ان کی جبیں کی شکن چھپائے نہیں چھپتی "معرکے کی بات" کہنے میں ان کا کوئی حریف نہیں ۔ انھیں سوجھتی ہے اور دور کی سوجھتی ہے ۔ کسی بھی معاملے کی تہہ تک وہ فوراً پہنچ جاتے ہیں ۔ آج کل سماجی شعور کا لفظ اس طرح دہرایا جاتا ہے کہ یہ اپنی معنویت کھو چکا ہے لیکن فکر تونسوی کے متعلق اگر کہا جائے کہ ان کا سماجی اور سیاسی شعور بہت بالیدہ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا ۔ دو مختصر مثالیں دیکھیے ۔

" ایک متنازعہ، قطعہ زمین پر پانچ سو ہندو مسلم شہید ہوگئے کیوں کہ ایک مورخ نے اپنی تازہ کتاب میں لکھا تھا کہ جس قطعہ زمین پر اب ایک مندر بنا ہوا ہے پانچ سو برس پہلے یہاں ایک مسجد تھی ۔ اور وہ مورخ خدا کی ہستی سے منکر تھا چاہے وہ خدا مندر کا ہو یا مسجد کا" (فکریات ص ۴۷-۴۸)

" چند دن ہوئے محلہ میں کیرتن کرانے کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا تھا ۔ میں نہیں جانتا کہ اس کیرتن سے محلہ میں کتنے فی صدی روحانی جذبات پیدا ہوئے مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ کیرتن کے بعد پولیس آئی اور ہمارے محلہ کے لالہ کانشی رام جی کو لوہے کی بلیک کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی ۔ حالانکہ لالہ جی نے کیرتن کے لیے سب سے زیادہ چندہ دیا تھا" ۔ (بدنام کتاب ۔ ص ۶۲)

فکر دو راز کار تشبیہات و استعارات سے بہت کم کام لیتے ہیں ۔ وہ نزدیک سے وار کرنے کے قائل ہیں ۔ ان کی خدا لگتی باتوں میں بے باکی اور بے باکی میں تلخی ہے لیکن ایسی تلخی نہیں جو کپور کے یہاں پائی جاتی ہے ان کے طنز میں ترشی اور تیکھا پن پایا جاتا ہے اور لطیف مزاحیہ رو سے مزید نوکیلا بنا دیتی ہے ۔ " پروفیسر بدھو "، " وارنٹ گرفتاری "، " تیر نیم کش " اور " تواریخ دہلی کا آخری باب " وغیرہ

ان کے فن کے بہترین نمونے ہیں فکر تونسوی اپنا ایک واضح اسلوب پیدا کر کے فن کی جس بلندی پر جا پہنچے ہیں وہ ان کی عظمت کا ثبوت ہے۔

آزادی کے بعد کے ظرافت نگاروں میں مولانا عامر عثمانی کا نام بھی اہم ہے جو "ملا ابن العرب مکی" کے قلمی نام سے ماہنامہ تجلی (دیوبند) میں ایک مستقل کالم "مسجد سے میخانے تک" لکھا کرتے تھے مولانا عثمانی نے اردو ظرافت کو مذہبی طنز کا نیا رجحان عطا کیا۔ وہ اپنی نوعیت کے واحد طنز نگار ہیں۔ مذہب اسلام میں جو بدعتیں رواج پا گئی ہیں ملا نے ان کے خلاف طنز و مزاح کے سہارے قلمی جہاد کیا۔ ان کے طنز کا نشانہ ایسے صوفی، پیر فقیر اور عالم ہیں جو جنید و بایزید کے لباس میں معصوم عوام کو لوٹتے ہیں اور یہ گندم نما جو فروش اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مذہب اور شریعت کا نام بھی بدنام کرنے سے نہیں چوکتے یہ اقتباس دیکھیے

"دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شاہی مست قلندر ہیں نوے سال پیران پیر دستگیر کے مزار پر چلا کھینچ کر آئے ہیں اور اتنے ہی دنوں ابھی ہمالیہ کی گپھاؤں میں عبادت کریں گے۔ خدمتِ خلق کی خاطر سال میں ایک مہینہ کی چھٹی کرتے ہیں۔ ساڑھے پانچ روپے میں لڑکی اور سوا دس روپے میں لڑکا دیتے ہیں لاعلاج مریضوں کا تعویذ کل تک سوا سات روپے میں دے رہے تھے آج کمیشن کر کے ڈھائی آنے میں کر دیا ہے آؤ چلو بہتی گنگا ہے جی بھر کر ہاتھ دھو لو"۔ (مسجد سے میخانے تک ص ۱۸۲)

ملا ابن العرب اپنے مضامین کی ابتدا نہایت شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔ ابتدا ہی سے مسکراہٹوں اور بیچ بیچ میں قہقہوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ مسکراہٹیں اور قہقہے آخری منزل تک ان کا ساتھ نہیں دیتے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ ملا ہیں۔ انھیں فن سے زیادہ اپنا مسلک عزیز ہے لہذا کہیں کہیں وہ فن کو مسلک پر قربان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ جابجا شگفتہ بیان کو ترک کر کے تقریر کرنے لگتے ہیں جس سے لہجے میں احتجاجی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "دیوبند کا آل انڈیا مشاعرہ" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ "رموزِ طریقت اور فری اسٹائل مناظرہ" میں ایک خاص عقیدے کے لوگوں کا مذاق اڑایا گیا ہے اور ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ مذکورہ دونوں مضامین ہجو کی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔ بعض جگہوں پر اپنے مخالفین کا مذاق اڑانے کے چکر میں ابتذال کی حد تک جا پہنچے ہیں جیسے "قصہ ایک میلاد کا" میں لیکن جہاں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور جذبات سے مغلوب نہیں ہوئے وہاں بہت ہی کامیاب نظر آتے ہیں "مہذب دنیا کا ماڈل اسکول" اور "یہ مسائل تصوف" ان کا شاہکار ہیں۔ اپنے دائرے میں ملا نے جو کچھ تخلیق کیا اور مسجد سے میخانے تک کی دوڑ میں جتنے کارہائے نمایاں انجام دیے وہ انھیں اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں ایک منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔ ملا نے اردو ظرافت کو ایک نیا رجحان دیا ہے اور ان گوشوں تک جا پہنچے ہیں جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔

اردو ظرافت کو نیا رجحان عطا کرنے والوں میں ایک معتبر نام احمد جمال پاشا کا ہے ان کی ظرافت نگاری کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ "اندیشہ شہر"، "ستم ایجاد"، "لذت آزار"، "مضامین پاشا"، "چشم حیراں" اور "پتیوں پر چھڑکاؤ" ان کے ظریفانہ مجموعے ہیں پاشا صاحب نے جو طنزیہ مضامین لکھے ہیں ان میں انھوں نے اپنے طنز کا نشانہ ادبی بدعنوانیوں، نقادوں کی زمانہ سازی، سیاست دانوں کی بے عملی اور بے علمی، ادبی کھوکھلا پن، ادبی گروہ بندیوں، ناکارہ نظام تعلیم، لال فیتہ شاہی، دفتری بے ضابطگی، سماجی ناہمواریوں اور اپنے ماحول کی بے اعتدالیوں کو بنایا ہے۔ ان کا طنز ایک آہ کے مانند ہے جسے وہ سینے میں دباتے ہیں یہاں تک کہ وہ گلزار ابراہیم کی صورت اختیار کر لیتی ہے وہ معاشرتی کمزوریوں پر کڑھتے ہیں لیکن اپنی خفگی اور ناپسندیدگی کا اظہار "انقلاب زندہ باد" یا "ہائے ہائے" کی صورت میں بالعموم نہیں کرتے بلکہ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں ان

کی بہترین ظرافت کا بیش تر حصہ وہ ہے جس کا مواد دنیائے ادب سے لیا گیا ہے ادبی دنیا میں جو داؤں پیچ، سیاست و سازش، گروہ بندیاں اور جوڑ توڑ دیکھنے کو ملتے ہیں ان پر احمد جمال پاشا نے بڑی خوبصورتی اور کامیابی سے قلم اٹھایا ہے۔ "ادب میں مارشل لا"، "تماشائے ادب"، "افلاطون کافی ہاؤس میں"، "میرے ادبی نظریے اور عقیدے"، "آموختہ خوانی میری"، "نثری شاعری"، "اردو ادب کے آخری رجحانات"، "غالب اینڈ کمپنی"، "اقبال کی تلاش میں"، "میر کا خط میریوں کے نام" جیسے مضامین اور پیروڈیوں میں ان کا طنز بڑا کاری ہے جو دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادبی موضوعات پر اتنی تفصیل اور اتنے موثر پیرائے میں آزادی کے بعد کسی دوسرے ظرافت نگار نے نہیں لکھا احمد جمال پاشا کے مزاحیہ نثری سہرے بھی ظرافت کے عمدہ نمونے ہیں نثر میں سہرا لکھنے کی روایت ان سے پہلے نہیں ملتی۔ یہ سہرے ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ظرافت میں احمد جمال پاشا کی اصل حیثیت ان کی پیروڈیوں کی وجہ سے ہے۔ ان کی پیروڈیوں میں گہرے مطالعے، مشاہدے، علم اور نظر کے ساتھ ساتھ فنی گہرائی، فکر اور شوخی و شگفتگی بھی ہوتی ہے "کنور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" میں وہ ممتاز تنقید نگاروں کے اسلوب کا خاکہ اڑاتے ہیں "چین و بنگال کا جادو"، "طلسمات الو" اور "تسخیر دل" میں سماجی توہمات کو نشانہ بنا کر اس طبقے پر طنز کرتے ہیں جو شگون، جھاڑ پھونک اور گنڈے تعویذ کے ذریعے لوگوں کو طرح طرح سے لوٹتا ہے۔ اس طبقے کو انھوں نے بڑی فن کاری کے ساتھ بے نقاب کیا ہے اور پیروڈی کے فن میں معاشرتی عکاسی کا ایک بالکل نیا رجحان پیدا کیا ہے ان کی ظرافت کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں

"نوے سال تک ہم نے اپنی قومی جڑوں کی سینچائی کی تو ترش ترشا کر ایک آزاد قوم کی شکل میں دنیا کے نقشے پر طلوع ہوئے مگر آزادی کے سورج کی روشنی صرف میزبانوں کے باورچی خانوں پر پڑی جمہوریت کا مطلع ابر آلود ہی رہا من کی دنیا تن کی دنیا میں بدلی تو ہم نے بجائے دماغ کے معدے سے سوچنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ قومی ضعف معدہ میں مبتلا ہوگئے۔ ہمارا قومی کردار اگر کوئی تھا بھی تو ان گنت مراد آباد اور جمشید پوروں نے چیچک زدہ کر دیا" (پتیوں پر چھڑکاؤ ص ۱۵)

"چلتے ہو تو چین کو چلیے"، "آوارہ گرد کی ڈائری"، "دنیا گول ہے" اور "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" جیسی کتابوں کے ذریعے محمد شیر خاں ابن انشا نے ظرافت کو مزاحیہ سفر ناموں کا رجحان عطا کیا۔ ان کے سفرنامے خشک واقعات کی کھتونی نہیں ہوتے بلکہ ان کے باغ و بہار قلم نے انھیں ادب اور تاریخ کا خوش گوار امتزاج بنا دیا ہے۔ سفر ناموں کو عام طور پر تخلیقی ادب کے خانے میں جگہ نہیں دی جاتی لیکن ابن انشا کے سفر ناموں میں ایک حیرت انگیز تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ "آوارہ گرد کی ڈائری" اور "نگری نگری پھرا مسافر" ان کے بہترین سفرنامے ہیں کتاب کے سب سے دلچسپ حصے وہ ہیں جہاں مصنف نے کسی ملک کی مخصوص خصوصیت کا اپنے ملک یا گھر سے موازنہ کیا ہے پیرس کے ہوٹل مالا بار کے بارے میں لکھتے ہیں

"یہاں ہمیں گھر کا سا آرام میسر ہے اس کے غسل خانے میں ہمارے گھر کی طرح پانی کم کم آتا ہے بلب کی روشنی خاص طور پر اس لیے دھیمی رکھی گئی ہے کہ کوئی راتوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں خراب نہ کرے باتھ روم ایسی تنگ نائے غزل ہے کہ ہم نے فوارہ کھول تو لیا لیکن بدن پر صابن نہ لگا سکے کیونکہ ہمارے قارئین میں سے جو صاحبان کبھی نہائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صابن لگانے کے لیے کہنیوں اور گھٹنوں کو حرکت دینی پڑتی ہے اور اس حمام باد گرد کی دیواریں اس قسم کی عیاشی اور خوش فعلی کی گنجائش نہیں رکھتیں۔" (آوارہ گرد کی ڈائری اشاعت ۱۹۸۴، ص ۱۳-۱۴) طنز کی ہلکی آمیزش اسی طرح پورے سفرنامے میں موجود ہے۔ "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" "اور چلتے ہو تو چین کو چلیے" کے آخری بیس پچیس صفحات کو چھوڑ کر بقیہ حصے میں یہی انداز تحریر کار فرما ہے البتہ "دنیا گول ہے" میں

مصنف کی عجلت پسندی نمایاں ہے۔ اسے مکمل طور پر مزاحیہ سفرنامہ نہیں کہا جاسکتا عام طور پر لہجہ اکھڑا اکھڑا محسوس ہوتا ہے مگر جہاں جہاں ابن انشا نے قلم سنبھال کر لکھا ہے ان کا وہی نرالا بانکپن دیکھنے کو ملتا ہے۔ طنز کا یہ رنگ دیکھئے۔

"خود ہمارے شہر میں ہزاروں ایسے لوگ ہوں گے کہ شام کو شراب پینے بیٹھتے ہیں تو اس کے ساتھ فقط ذبیحہ کھاتے ہیں۔ رشوت کا پیسہ بھی بغیر بسم اللہ کیے اپنی جیب میں نہیں رکھتے اور جوئے کا داؤں بھی دعائے قنوت پڑھے بغیر نہیں لگاتے۔ بے شک ایمان کسے عزیز نہیں ہوتا اپنی سی احتیاط تو کرنی ہی چاہئیے۔"

(دنیا گول ہے اشاعت ۱۹۸۵، ص ۲۲۵)

شگفتگی اور انداز بیان کی یہی سادگی ابن انشا کے سفرناموں کی جان ہے انھوں نے طنز کے حربے سے جو کام لیا ہے وہ بارِ خاطر نہیں ہوتا بلکہ درد کی میٹھی کسک بن کر دل و دماغ پر چھاجاتا ہے

کرنل محمد خاں "بجنگ آمد" کے ذریعے میدان ظرافت میں آئے اور اردو میں "فوجی مزاح" کی روایت قائم کی۔ فوج میں بھرتی ہونے، تربیت کی منزل سے گزرنے اور پھر مختلف محاذوں پر زور آزمائی کا بیان کرنل محمد خاں نے جس انداز اور سلیقے سے کیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے سنجیدہ مقامات اور خشک مواقع پر بھی انھوں نے جس طرح مضحک پہلوؤں کی تلاش کی ہے وہ حد درجہ قابل تعریف ہے "بجنگ آمد" کے علاوہ "بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" بھی کرنل محمد خاں کی دو بہترین ظریفانہ کتابیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اردو میں مزاحیہ سفرناموں کی روایت ابن انشا سے شروع ہوتی ہے لیکن ان کے سفرناموں میں اندازِ بیان کبھی کبھی سنجیدگی کے قریب جا پہنچا ہے لیکن کرنل محمد خاں نے "بسلامت روی" کی شکل میں جو سفرنامہ قلم بند کیا ہے وہ شروع سے آخر تک یکساں طور پر ظریفانہ رنگ میں ہے سچ تو یہ ہے کہ وہ اردو کا سب سے اچھا مزاحیہ سفرنامہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے چہرے کی مسکراہٹ کبھی دور نہیں ہوتی اور ہمہ دم مصنف کی خوش طبعی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ ایک مثال پیش خدمت ہے

"ہوسٹیس دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ارضی و سماوی ارضی یعنی گراؤنڈ ہوسٹیں نمازی شکل و صورت کی ہوتی ہیں یعنی نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں پرہیز گار لگتی ہیں ان سے بات کرتے ہوئے دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور ان کی صحبت میں ہوائی جہاز کی بجائے نزدیک ترین مسجد کو بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔" (بسلامت روی اشاعت ۱۹۸۱، ص ۳۳) "بزم آرائیاں" مضامین کا مجموعہ ہے اس میں" یہ نہ تھی ہماری قسمت"، "کار بکاؤ ہے"، "شرابی کبابی"، جیسے مضامین بہت دل چسپ ہیں اسی کتاب میں "مصنف بیتی" کے عنوان سے ایک طویل مضمون شامل ہے جس میں کرنل محمد خاں نے اپنے فن پر کیے گئے اعتراضات کا بڑی خوش مزاجی کے ساتھ جواب دیا ہے۔ اردو ظرافت کی تاریخ میں ایسی مثال کہیں اور نظر نہیں آئی

عہدِ حاضر میں اردو کے سب سے ممتاز ظرافت نگار مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ "چراغ تلے"، "خاکم بدہن" اور "آبِ گم" ان کی بہترین مزاحیہ کتابیں ہیں یوسفی کا ایک ایک جملہ گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ان کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ آورد میں بھی آمد کی شان پیدا کر دیتے ہیں جو لوگ اردو کے کلاسیکی ادب کا عرفان نہیں رکھتے وہ ان کی تخلیقات سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہوسکتے ہیں ان کے اشاروں اور کنایوں میں معنی کی دنیا آباد رہتی ہے۔ ان کے پھڑکتے ہوئے جملے ہمیں بیک وقت مسرت اور حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔ طنز اور مزاح کی آمیزش سے وہ ایسی فضا تیار کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے یہ نمونہ دیکھیے۔ "ایک بزرگ جو اسی سال کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک قبر و عاقبت کی باتیں کرتے رہے آتے ہی بہت سی دعائیں دیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری

عمر دے تاکہ ہیں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لیے زندہ رہوں اس کے بعد جانکنی اور فشار گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ غریب خانے پر گور غریباں کا گماں ہونے لگا۔عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں میں مبتلا تھا) یاد کر کے اس طرح آبدیدہ ہوگئے کہ میری بھی ہچکی بندھ گئی ۔ میرے لیے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انھیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا گیا تھا جو بن کھلے مرجھا گئے ۔"

(چراغ تلے اشاعت ۱۹۸۴ء ص ۲۹)

لیکن مشتاق احمد یوسفی کا شاہکار "زرگذشت" ہے یہ کتاب اپنی ہمہ جہت خوبیوں کی بنا پر کلاسک کا درجہ اختیار کر چکی ہے ۔ یوسفی نے اسے اپنی "سوانح نوعمری" کہا ہے ۔ یہ خود نوشت سوانح عمری کی مروجہ ڈگر سے ہٹ کر لکھی گئی ہے ۔ یوسفی نے اپنی ہجرت سے لے کر بینک کی ملازمت تک کے مختلف واقعات نہایت خوش اسلوبی سے تحریر کیے ہیں اس کتاب سے اردو میں ایک مزاحیہ کردار "اینڈرسن" کا اضافہ ہوتا ہے ۔ "زرگذشت" میں بیان کردہ واقعات کی بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب ہے ۔ یہاں المیہ اور طربیہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے ۔ قہقہوں اور آنسوؤں کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل گئی ہیں ان سطور پر نگاہ ڈلیے یوسفی اپنے والد کی موت کے بعد خاندان کے تئیں اپنے فرائض کا بیان یوں کرتے ہیں "اب اپنے خاندان ، بے روزگار بھائی اور اس کی بیوی بچے ، بہن اور اس کے کنبے اور ان کے گرد گھومنے والے طفیلی سیارے ان سب کی خورد و نوش کا انتظام بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ فاقہ کروانے کی اخلاقی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی تھی ایک دن یونہی خیال آیا تو مشقی سوال کے طور پر ہم نے اپنی تنخواہ کو کنبے کے لواحقین اور لواحقین کے متوسلین پر تقسیم کیا تو مقسوم ۲۳/ روپے پونے چار آنے نکلا کسی طرح یقین نہ آیا کہ ایک آدمی ۲۳/ روپے میں بسر اوقات کر سکتا ہے حساب میں یقیناً کوئی غلطی ہوگئی ۔ گھڑی کی زنجیر کے کمپوٹر پر چیک کر کے دیکھا تو وہی جواب آیا زندگی ہندسوں سے کہیں زیادہ لچک دار نکلی انسان بڑا سخت جان ہے ان اوصاف حمیدہ اور خصائل ستودہ کی زیادہ تشریح و تشہیر یہاں اس لیے بھی غیر ضروری ہے کہ سارا اردو لٹریچر ۔ از ولی دکنی تا ایں دم ۔ قناعت اور مفلسی کے فائدوں اور فضیلتوں سے بھرا پڑا ہے ۔" (زرگذشت اشاعت ۱۹۷۷ء ص ۸۰-۸۱) اس طرح خان سیف الملوک خاں کے کردار پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ ظریفانہ اور نہایت پر تاثیر ہے اسے ظرافت کی معراج کہا جا سکتا ہے ۔ پروفیسر قمر رئیس نے درست لکھا ہے کہ جن ادیبوں نے پطرس کے طنزآمیز ظریفانہ اسلوب کی کمیوں یا کمزوریوں سے دامن بچا کر اس کے فنی محاسن کو تخلیقی حسن کے ساتھ عصری بصیرت اور عصری مذاق و فکر سے آشنا کیا ہے ان میں مشتاق احمد یوسفی کا نام سرفہرست ہے ان کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ گذشتہ دو دہوں میں اردو نثر میں طنز و مزاح کا جو نشاۃ ثانیہ ہوا ہے مشتاق احمد یوسفی کے مضامین اس کا نقطۂ عروج ہیں ۔ (مشمولہ طنز و مزاح ، تاریخ و تنقید ۔ مرتبہ طاہر تونسوی اشاعت ۱۹۸۶ء ص ۸۶)

عصر حاضر میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نے اپنی فکر انگیز اور شستہ ظرافت سے سب کے دلوں کو مسحور کر رکھا ہے اُردو ظرافت کا کوئی بھی جائزہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا یوسف ناظم ذہین فن کار ہیں ان کی ظرافت میں بڑا تنوع ہے ۔ اردو میں عام طور پر ظرافت نگار اپنے گرد و پیش کے حالات و مسائل تک محدود رہے ہیں لیکن یوسف ناظم کے یہاں موضوعات کی وسعت اور نیرنگی کا بیک نظر احساس ہوتا ہے ۔ انھوں نے تعلیمی اداروں اور نظام تعلیم کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے اور سیاسی قلابازیوں کو بھی وہ تمام واقعات جو لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی دنیا میں صحافیوں ، دانشوروں یا سیاست دانوں کو متاثر کرتے ہیں وہ یوسف ناظم کو بھی تحریک دیتے ہیں ان کے مضامین

اور پیروڈیوں میں فنی مہارت اور پختگی کی جھلک ہر قدم پر دیکھنے کو ملتی ہے ۔ رشید احمد صدیقی کے بعد بات میں بات کرنے کا ہنر جیسا یوسف ناظم کے یہاں ملتا ہے وہ کسی اور کے یہاں موجود نہیں وہ رعایت لفظی سے بھی بہت کام لیتے ہیں ان کے یہاں پھبتیاں کسنے کا رجحان بھی ہے فکر تونسوی کی طرح وہ بھی بسیار نویس ہیں اور بسیار نویسی کے جو منفی اثرات ہوتے ہیں وہ ان کے یہاں بھی موجود ہیں اس کے باوجود انھوں نے اچھے مضامین بھی کافی تعداد میں لکھے ہیں انھیں توسینی ادیب بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا زیادہ تر طنز توسین کے درمیان ہی رہتا ہے یوسف ناظم کی ظرافت کی سب سے اہم خوبی ان کی بے ساختگی اور برجستگی ہے ان کے یہاں آمد اور روانی بھی غضب کی ہوتی ہے وہ صورت واقعہ سے کم اور خیال کے گھماؤ پھراؤ سے زیادہ مزاح پیدا کرتے ہیں

ان کی ایک خاص پہچان ان کا اسلوب بھی ہے جس میں نہ تو طنز کی شدید دھار ہوتی ہے نہ مزاح کی فراوانی ان کا فن دراصل چٹکیاں لینے کا فن ہے اس لیے ان کی چوٹ جس پر پڑتی ہے وہ بھی مسکرا کر رہ جاتا ہے یوسف ناظم ہر قدم پر یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ کارگہہ شیشہ گری بہت نازک ہے اور یہاں سانس بھی آہستہ لینی ہے مگر وہ ناصح مشفق بننے کی کبھی کوشش نہیں کرتے انھوں نے بڑے معرکے کے خاکے بھی لکھے ہیں باقر مہدی کا خاکہ ان کا شاہکار ہے ۔ "سائے اور ہمسائے " اور " ذکرِ خیر " کے خاکوں میں دردمندی کا پہلو بھی نمایاں ہے اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے دوسروں کی طرح خاکے اڑائے نہیں خاکے اتارے ہیں ان کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ اتنے عرصے سے لکھنے کے باوجود وہ ہنوز تازہ دم معلوم ہوتے ہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔

مجتبیٰ حسین اردو اور ہندی میں تقریباً یکساں طور پر مقبول ہیں ان کی ظرافت ان کے تربیت یافتہ ذہن کی غمازی کرتی ہے ان کے ہاں مضحک واقعات سے مزاح پیدا کرنے کی روش زیادہ ہے کہیں کہیں وہ لطیفوں کا بھی سہارا لیتے ہیں ۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً چہل قدمی ، کالونی میں رہنا ، کیلنڈر جمع کرنے والے ، مجرد زندگی ، انتخابی نعرے ، دھوبی ، تکیہ کلام ، مہمان اور ٹیلی فون وغیرہ کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور اپنی ذہانت کے زور پر اسے کامیابی کی منزل تک پہنچادیتے ہیں شمس الرحمن فاروقی نے ان کے متعلق درست کہا ہے کہ "ہنسی پیدا کرنے والے واقعات تو ہما شما سب نکال لیتے ہیں لیکن زبان کو اس طرح برتنا کہ تضاد ، تناسب ، توازن کے ذریعہ ہنسی والی بات بن جائے ہر ایک کا کام نہیں مجتبیٰ حسین ان تینوں طریقوں کو بہت خوبی سے برتتے ہیں (شگوفہ حیدرآباد مجتبیٰ حسین نمبر نومبر ۱۹۸۷ء ص ۴۲) "ڈائر کٹر کا کتا " ، "قصہ ڈاڑھ کے درد کا " اور " ریلوے منتری مسافر بن گئے" ان کی ظرافت کے خوبصورت نمونے ہیں ان کے مضامین کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ ان میں سے بعض کے اختتام پر حزنیہ لے کی کارفرمائی ملتی ہے ۔ المیہ سے مزاح پیدا کرنا دشوار ترین امر ہے جسے ظرافت کی معراج تصور کیا جاسکتا ہے مجتبیٰ حسین کے یہاں یہ چیز موجود ہے ۔ "میں نہیں آؤں گا " اور " یہ رکشا والے " اس کی عمدہ مثالیں ہیں ۔ " میں نہیں آؤں گا " ابتدا سے انتہا تک اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے " یہ رکشا والے "مزاحیہ مضمون ہے لیکن اس کے آخر میں مضمون نگار نے اپنے دوست حمید کے رکشا چلانے کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ قاری کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ۔ ان کے بعض خاکوں مثلاً سلیمان اریب کے خاکے میں بھی یہی رنگ موجود ہے ۔ ایسی مثالیں انجم مانپوری اور مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ کہیں اور مشکل سے ہی ملیں گی ۔

مضامین کے علاوہ خاکوں اور سفرناموں میں بھی انھوں نے اپنا خاص رنگ قائم رکھا ہے ۔ "آدمی نامہ " اور " سو ہے وہ بھی آدمی " کے خاکوں نے ان کے ادبی قد کو خاصا بلند کیا ہے " ۔ جاپان چلو جاپان چلو " اور " سفر لخت " کے ذریعے انھوں نے ابن انشا کی روایت کو خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے ۔

اردو کے مشہور محقق مشفق خواجہ جو "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھتے ہیں اور جس کا عنوان "سخن در سخن" ہے وہ اس دور کا سب سے مشہور ظریفانہ کالم ہے جس کا انتخاب مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ خامہ بگوش کا کالم صرف ادبی کتابوں، ادبی شخصیات اور ادبی اداروں کے مسائل تک محدود ہے "خامہ بگوش" سے پہلے اردو ادب میں کتابوں پر طنزیہ مزاحیہ تبصروں کی مثالیں ناپید نہیں ہیں۔ تمکین کاظمی کی کتاب "غنچہ" "تبسم" کے دیباچوں پر پطرس نے جو طنزیہ تبصرہ کیا تھا اس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے "اودھ پنچ" میں بھی وقتاً فوقتاً ایسی تحریریں دیکھنے کو مل جایا کرتی تھیں ظ۔ انصاری اور یوسف ناظم کے تبصروں میں اس کی جھلکیاں کہیں شوخ اور کہیں مدھم رنگ میں دکھائی دیتی ہیں لیکن خامہ بگوش نے ظریفانہ تبصرہ نگاری کو ایک نئی تب و تاب اور نیا رجحان بخشا ہے۔ یہ خدا لگتی کہتے ہیں ان کے شوخ و شنگ اور پھڑکتے کڑکتے فقرے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلتے جاتے ہیں۔ یہ مثالیں دیکھیے۔

"نقاد کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ایک نقاد وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے "ڈبویا مجھ کو ہونے نے" لیکن یہ اکیلے نہیں ڈوبتے اپنے ساتھ ادب کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ جس طرح بعض شاعر اپنے خون جگر سے لکھتے ہیں اور بعض دوسروں کا جگر خون کرنے کے لیے۔"

"گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں جو سفرنامے لکھے گئے ہیں، دوچار کو چھوڑ کر باقی سب ایسے ہیں کہ انھیں پڑھ کر دنیا سے سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

خامہ بگوش کے اس مشق ستم کا نشانہ نو عمر، جوان، بزرگ، دوست احباب ہر طرح کے ادیب و شاعر بنتے رہتے ہیں جہاں کہیں انھیں کوئی کمزور پہلو نظر آتا ہے وہ ہاتھ دکھانے اور آنکھ مارنے سے باز نہیں آتے۔ ان کی چٹکی اور چھیڑ خوانی میں اصلاح کا جذبہ پوری طرح موج زن رہتا ہے۔ اردو ظرافت میں یہ رجحان فال نیک ہے

مذکورہ بالا ظرافت نگاروں کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ، سید ضمیر جعفری، سید محمد حسنین، محمد خالد اختر، م احمد ایم۔اے، شفیقہ فرحت، نریندر لوتھر، مشکور حسین یاد، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، عطاء الحق قاسمی، شکیل اعجاز، نصرت ظہیر، اور اعجاز علی ارشد وغیرہ کی شکل میں اردو ظرافت کا قافلہ ترقی کی نئی منزلوں کی تلاش میں سرگرداں ہے چند کہ موجودہ ظرافت میں تقلید و تکرار سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اور زیادہ تر ظرافت نگار سہل پسندی کا شکار ہیں پھر بھی ایک طبقے نے موجودہ عہد کی پیچیدہ اور مشینی زندگی انسانی اقدار کی پامالی اور سائنسی ترقی سے معاشرے میں پیدا شدہ عدم توازن پر خاطر خواہ دھیان دیا ہے جس نے اردو ظرافت میں نئے رنگ و آہنگ اور ارتقا کے امکانات پیدا کر د۔

پھر ملیں گے --- (اداریہ)

پچیس سالہ نثری انتخاب کا دوسرا حصہ پیش ہے۔ اس انتخاب میں ڈرامے شامل نہیں کئے گئے ہیں ڈراموں کا انتخاب ع خصوصی نمبر کی صورت میں شائع ہوگا۔ ہم مہمان مدیر جناب سکندر علی خاں اور نامور آرٹسٹ سعادت علی خاں کے ممنون ہیں جن عملی تعاون کے باعث شگوفہ کی ۲۵ سالہ فائلوں پر مبنی نثری انتخاب کا پروجیکٹ پایہ تکمیل کو پہنچ سکا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۳۱ ـــــ اگست ۱۹۹۸ء ـــــ شمارہ ۸

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال •

ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی:

حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدہ)
مسعود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمٰن سلیم (ریاض)
اختر عالم (یو۔کے)

مجلس مشاورت:

نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
محمد علی رفعت آئی اے ایس
حمایت اللہ

طباعت:
دائرہ پریس چھتہ بازار

مجلس ادارت:

مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

قیمت فی پرچہ: ۱۲ روپے
زرِ سالانہ: ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

۱۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱ فون (آفس) 595711 (رہائش) - 4576064

شگوفہ کا آئندہ شمارہ

نامور مزاح نگار

مسیح انجم

کے نام وقف ہوگا

مسیح انجم کی شخصیت و فن پر خاکے

تنقیدی مضامین

اور مسیح انجم کے مضامین کا دلچسپ انتخاب

قیمت ۱۲ روپے

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

قسط وار مضامین

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

رپورتاژ

حق تو یہ ہے (ترجمہ)

چورن (منظومات)

مطبوعات، مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادیمی

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
مراٹھی آموز	ڈاکٹر عصمت جاوید	25 رو
ایک ہی پیالہ (ڈرامہ)	رام گنیش گڈکری مراٹھی سے ترجمہ / خلیل مظفر	20 رو
ناگپور میں اردو	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	50 رو
علم الامراض	ڈاکٹر کرنل محمد غفران	90 رو
چاند تارے	اسحاق خضر	15 رو
کمپیوٹر اور اس کی بیسک زبان	عبدالباری مومن	20 رو
تھور سنایت کار	بی آر دیودھر مراٹھی سے ترجمہ / دستگیر شباب	25 رو
امکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		40 ر
امکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		25 ر
امکان یک بابی ڈرامہ (خصوصی شمارہ)		10 ر
امکان سراج اورنگ آبادی (خصوصی شمارہ)		20 ر
امکان دلت سوانح (خصوصی شمارہ)		

ملنے کے پتے - مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادیمی / فون 2672703

اولڈ کسٹم ہاؤس-ڈی ڈی بلڈنگ ، شہید بھگت سنگھ مارگ، ممبئی

2-مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنس بلڈنگ جے جے اسپتال ، ممبئی 008 400

مجتبیٰ حسین

خوش فہمیاں

زندگی کے ساٹھ برس گزارنے کے بعد اب ہم اپنی ساٹھ سالہ زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اپنی زندگی خوش فہمی اور غلط فہمی کے بیچ لٹکے ہوئے پنڈولم کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ ہم یا تو ہمیشہ خوش فہمی میں مبتلا رہے یا پھر غلط فہمی کے شکار رہے۔ اسے آپ ہماری کج فہمی کہہ لیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فہم و فراست کے معاملے میں ہمارے ذہن کا ٹٹو کبھی سیدھا نہیں چل سکا۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ خوش فہمی نے جہاں ہمیں کبھی کبھی فائدہ پہنچایا وہیں غلط فہمی ہمارے لئے ہمیشہ نقصان کا سبب بنی۔ خوش فہمی ایک نعمت مترقبہ ہے جس کے بل بوتے پر ہم اپنے بل بوتے کو دھو کا دیتے ہیں۔ خوش فہمی نہ ہوتی تو ہم وہ نہ ہوتے جو آج دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت ہمیں ایک مشہور ادیب کی یاد آ رہی ہے جس نے پچاس سال تک ادب کی تخلیق کرنے کے بعد ایک دن اپنے ایک دوست سے کہا "پچیس سال تک ادب تخلیق کرنے کے بعد ایک دن مجھے پتہ چلا کہ مجھ میں ادیب بننے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے اور یہ کہ اتنے برس میں صرف خوش فہمی میں مبتلا رہا"

دوست نے پوچھا "اس خوش فہمی کا بھرم کھلنے کے بعد کیا تم نے ادب لکھنا چھوڑ دیا؟"

ادیب بولا "نہیں! میں اس وقت ادب سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ اس وقت تک میں صف اول کے ادیب کی حیثیت سے خاصا مشہور ہو چکا تھا"

آپ غور فرمائیں کہ اگر اس ادیب میں خوش فہمی کی صلاحیت نہ ہوتی تو وہ ادیب نہ بنتا۔ سچ پوچھو تو ہمارے ادب میں بہت سے اہل قلم کو صرف اس لئے شہرت ملی کہ ان میں صلاحیت کم اور خوش فہمی زیادہ تھی۔ ادب کی بات چھوڑیئے سماج میں بھی قدم قدم پر خوش فہمی آپ کا ساتھ دیتی ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں ہمیں یہ خوش فہمی تھی کہ ہم بڑے خوبرو نوجوان ہیں حالانکہ ان دنوں آئینہ بڑی پابندی سے دیکھا کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ آئینہ میں ہم وہ نہیں دیکھتے تھے جو آئینہ ہمیں دکھاتا تھا بلکہ وہ دیکھتے تھے جو ہماری خوش فہمی ہمیں دکھلانا چاہتی تھی۔ جب بھی آئینہ دیکھا ہم نظر نہیں آئے بلکہ ہماری خوش فہمی نظر آ گئی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی خوش فہمی کو سجایا سنوارا کرتے تھے۔ باہر نکلتے تو ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے دنیا بھر کی دوشیزاؤں کی نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ مانتے ہیں کہ اس زمانے میں کسی دوشیزہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کسی نے ہماری خیریت تک نہیں پوچھی۔ مگر اس کے باوجود ہم اپنے خوبرو ہونے کی خوش فہمی میں مگن رہے اور یہی سوچا کہ "حسن بے پروا" کو کسی تعریف یا توصیف کی کیا ضرورت ہے۔ جب نوجوانی کے چل چلاؤ کا زمانہ آیا تو ہمیں اچانک اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا۔ جیسے تیسے بزرگوں نے ہمیں اس خوش فہمی سے باہر کھینچ نکالا۔ ایک جگہ رشتہ کی بات چلائی تو پتہ چلا کہ جس حسینہ سے رشتہ کی بات چل رہی ہے اس کی خوش فہمی بس ابھی شروع ہوئی ہے۔ نوجوانی کی خوش فہمی میں یہی ہوتا ہے کہ لڑکا تو کسی شہزادی سے اور لڑکی کسی شہزادے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جمہوریت کا زمانہ آ گیا ہے خوش فہمی شہزادیوں اور شہزادوں کا انتظار کراتی ہے۔ اب یہ جو ہمارے گھر میں ایک موٹی اور بھدی سی خاتون نظر آتی ہیں کسی زمانے میں اپنی خوش فہمی کے بل بوتے پر خود ساختہ شہزادی بنی ہوئی تھیں اور آج ہماری بیوی بنی ہوئی ہیں۔ انہیں تو اب بھی یہ خوش فہمی ہے کہ وہ اصل میں کسی شہزادے کے لئے ہی پیدا ہوئی تھیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے حصے میں آ گئیں۔ لہٰذا اب وہ تخت پر بیٹھنے کے بجائے ہمارے گھر میں چٹائی پر بیٹھتی ہیں اور امور سلطنت کو سنبھالنے کے بجائے امور خانہ داری کو سنبھال رہی ہیں۔ کبھی کبھی ان کی خوش فہمی ان کے اندر دوبارہ جاگ اٹھتی ہے تو ہم انہیں بتاتے ہیں کہ ہم بھی اصل میں کسی شہزادی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ مگر والدین نے گڑبڑ کر دی ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

ماہ و سال کی گردش نے اب اگرچہ نوجوانی کی خوش فہمی کا بھرم توڑ دیا ہے لیکن ہمیں اب بھی وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے ۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے جب خوش فہمی ہمارے سیاہ رنگ کو سرخ و سپید بنا دیتی تھی ۔ ہماری بھدی آنکھوں میں ہرنی کی آنکھیں ڈال دیتی تھیں ۔ ہماری چال میں ہنس کی چال کی طلاوت کر دیتی تھی ۔ اب آئینہ دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف ہماری خوش فہمی تھی لیکن ذرا سوچیئے کہ یہ خوف فہمی کتنی انمول تھی اور اس نے کس طرح ہماری انا کو بے جا تسکین پہنچائی تھی

اب بھی ہمارے اندر خوش فہمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ چونکہ فطرتاً نیک آدمی واقع ہوئے ہیں اس لئے ہمارے خوش فہمیاں بھی بڑی بے ضرر سی ہیں ۔ مثلاً ہماری ایک خوش فہمی یہ ہے کہ ہمارے سارے دوست ہم پر جان دیتے ہیں اور وقت آنے پر ہمارے لئے "آتش نمرود" میں بھی کود پڑنے کو تیار رہتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ جب بھی ہم نے کسی دوست سے دس روپے بھی ادھار مانگے تو اس نے ملک کے معاشی نظام پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دینا شروع کر دیا ۔ اپنی کسمپرسی کا حال مثالوں کے ذریعہ واضح کیا کہ کس طرح منے کے اسکول کی فیس دو مہینے سے ادا نہیں ہوئی ہے ۔ اپنی چپل دکھائی کہ دیکھو اس کی کیا حالت ہو گئی ہے ۔ نئی چپل لینا چاہتا ہوں لے نہیں سکتا ۔ تمہاری بھابی دو مہینوں سے کوئی پکچر دیکھنا چاہتی ہیں مگر میں انہیں نہیں لے جا سکتا ۔ پھر اپنی جیب سے مونگ پھلی کا لفافہ نکال کر ہماری طرف بڑھا کر کہتے ہیں " میں تو دوپہر میں کھانا تک نہیں لے آتا ۔ مونگ پھلی پر گذارہ کر رہا ہوں ۔ بھئی لو مونگ پھلی تو کھالو " ۔ اصولاً ایسے وقت میں ہمیں دوستوں کے تعلق سے اپنی خوش فہمی سے کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے لیکن ہم اس خوش فہمی کو بڑے جتن کے ساتھ اپنے اندر سنبھال کر رکھتے ہیں اور دوست کے بیان کو سچ مان لیتے ہیں ۔ حد تو یہ ہے کہ مونگ پھلی تک نہیں کھاتے کہ کیوں بے چارے کے پیٹ پر لات ماریں ۔ آپ یقین کریں کہ ہمارے آڑے وقت میں آج تک کسی دوست نے ہماری مدد نہیں کی اور ہمیں یہ احساس دلایا کہ خود اس کے سامنے آڑا وقت کھڑا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ دوست ہی ہمارے لئے سب کچھ ہیں ۔

ایک اور خوش فہمی ہم میں یہ ہے کہ " ہم خاندانی آدمی ہیں ساری اچھی روایات کی پاسداری کا فرض ہم پر عائد ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی دوست ہمارے ہاں مہمان بن کر آتا ہے تو ہم ایسے اس کے آگے بچھ جاتے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں ۔ بیوی جب ہماری میزبانی پر اعتراض کرتی ہے تو ہم اسے اس کے خاندان کا حوالہ دے کر چپ کرا دیتے ہیں کہ تمہارے خاندان پر ایسی روایات کی پاسداری کا فرض عائد نہیں ہوتا ۔ لہٰذا اس معاملے میں خاموش رہو ۔ اس خوش فہمی نے ہمیں کتنا رسوا کیا ہے اس کا حال آپ سے کیا بیان کریں ۔

ادیب ہونے کے ناتے ہم اور بھی کئی خوش فہمیوں کے شکار ہیں ۔ ہمیں یہ خوش فہمی ہے کہ جہاں بھی ہم جاتے ہیں لوگ ہمیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ایک بار تو ایک ادبی محفل میں شرکت کے لئے ایک شہر میں گئے ۔ اسٹیشن پر اترے تو اس شہر کے ادب دوستوں نے ہمیں ہاروں سے لاد دیا ۔ ہم ان ہاروں میں ڈوبنے والے ہی تھے کہ کسی نے ہاروں کو ہٹا کر ہمارا چہرہ دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا " بھائیو ! جس نیتا کے استقبال کے لئے ہم آئے ہیں وہ یہ صاحب نہیں ہیں ۔ لہٰذا ان کے گلے سے ہار اتار لو " اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری خوش فہمی کو گلے میں سے اتارا جانے لگا ۔ وہ ہڑبونگ مچی کہ ہاروں کو ہمارے گلے میں سے اتارنے کی کوشش میں ہمارے کوٹ کے دو بٹن ٹوٹ گئے ۔ چہرے پر پانچ خراشیں آگئیں ۔ کچھ بال بھی اکھڑ گئے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم پھر اصلی حالت میں واپس آگئے ۔ مگر یہ سارا کھیل محض ہماری خوش فہمی کی وجہ سے ہوا تھا ۔ اگر ہم اپنے تعلق سے خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوتے تو استقبال کرنے والوں کو پہلے ہی بتا دیتے کہ بھائیو ! ہم اس کے اہل نہیں ہیں ۔ یہ بوجھ ہمارے کندھوں پر نہ ڈالئے ۔ دوسری طرف یہ احساس بھی ہوا کہ اگر خوش فہمی نہ ہوتی تو ہم زندگی میں بیک وقت اتنے سارے ہاروں کو پہننے کے تجربے سے محروم رہ جاتے ۔ ایسی ہی خوش فہمیاں انسان میں جینے کی امنگ پیدا کرتی ہیں ۔

سچ پوچھیئے تو ہر طرف خوش فہمیوں کا ہی دور دورہ ہے ۔ تاجر اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ گاہک کو بیوقوف بنا رہا ہے اور گاہک اس خوش فہمی کا شکار ہے کہ اس نے بھاؤ تاؤ کر کے تاجر کو بیوقوف بنایا ہے ۔ افسر کی خوش فہمی یہ رہتی ہے کہ اس کے ماتحتین اس سے بہت خوش ہیں اور ماتحتین اس خوش فہمی میں زندگی گزار رہے ہیں کہ وہ اپنے افسر کو بڑی خوش اسلوبی سے بے وقوف بنا رہے ہیں ۔ افراد

کی خوش فہمیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ کچھ ممالک بھی خوش فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کائنات کا مرکز سمجھتے ہیں۔
یہ جانتے ہوئے بھی کہ خوش فہمی کا بھرم ایک نہ ایک دن ٹوٹ جاتا ہے آدمی خوش فہمی میں مبتلا رہنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ایک شاعر دوست زندگی بھر اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ مشاعروں میں ان کا کلام پسند کیا جاتا ہے حالانکہ ان کے کلام میں ترنم کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لوگ ان کے ترنم کی داد دیتے ہیں تو گو وہ اسے کلام کی داد سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ اسی خوش فہمی میں وہ زندگی بھر مشاعروں میں گانا گاتے رہے۔ ان کا اصلی مقام کچھ اور تھا اور انہوں نے اپنی خوش فہمی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو ایک غلط مقام پر لٹکائے رکھا ہمارے ایک اور دوست ہیں جو ایک بیرونی ملک میں رہتے ہیں جب تک اپنے ملک میں تھے تو اچھی خاصی باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دن نہ جانے جی میں کیا آئی کہ اچھی زندگی کی تلاش میں ملک سے باہر چلے گئے۔ ان کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ وہ بفضل تعالی خیریت سے ہیں اور ایک ہوٹل میں بیرے کا کام کرتے ہیں۔ گاہکوں سے بخشش اور ہوٹل کے مالک سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ہر خط میں لکھا ہوتا ہے کہ زندگی میں بڑا عیش و آرام ہے۔ یہاں تو زندگی ہی الگ ہے۔ یہاں کا سورج الگ ہے۔ یہاں کا چاند الگ ہے۔ یہاں کی ندیاں اس طرح نہیں بہتیں جیسے اپنے ملک کی ندیاں بہتی ہیں۔ بڑی شائستہ اور مہذب ندیاں ہیں یہاں کے کوے اپنے کوؤں کی طرح منڈیروں پر بیٹھ کر کائیں کائیں نہیں کرتے۔ مہذب ملک کے کوے جو ٹھہرے یہاں کے جانور تک ہر کام وقت پر کرتے ہیں ہمارے جانوروں کی طرح بیٹھے صرف جگالی نہیں کرتے رہتے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے دوست کی خوش فہمی ہی ان سے ایسے جملے لکھواتی ہے۔ پچھلے خط میں تو انہوں نے ہمیں بھی مشورہ دیا ہے کہ ہم اپنا ملک چھوڑ کر آجائیں اور وہاں کے کوؤں اور جانوروں کے ساتھ بقیہ زندگی ہنسی خوشی گزاریں۔ لیکن ہم وہاں جانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ہماری بھی اپنی کچھ خوش فہمیاں ہیں آدمی سے اس کی خوش فہمیاں چھین لیجئے تو اس کا سانس لینا دوبھر ہو جائے۔
ایک بوڑھا شخص مر رہا تھا۔ بچنے کی امید نہ تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا" لو بھئی! تمہارا آخری وقت آپہنچا۔ تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بیان کرو"۔
مریض بولا" ڈاکٹر صاحب! میری آخری خواہش یہ ہے کہ آپ فوراً کسی اچھے ڈاکٹر کو بلالیں۔"
یہ مریض کی خوش فہمی ہی تھے جو جینے کی آرزو بن کر چمک اٹھی تھی۔ اسی لئے تو ہم نت نئی خوش فہمیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک خوش فہمی کا بھرم ٹوٹتا ہے تو دوسری خوش فہمی کو اپنی ذات میں سمالیتے ہیں۔

--*-*-*-*-*-*-*-*-*

یوسف ناظم

(آخری قسط)

ایک غیر مقیم ہندوستانی کا سفر نامۂ ہند

بہت ہو چکا۔ اب مجھے گھر واپس آجانا ہے۔ ترکِ وطن کے بعد اصلی وطن، وطن تو رہتا ہے لیکن متروک ہو جاتا ہے۔ وہاں کام کچھ ہے نہیں لیکن ایسا درخت کو آپ کیا کہیں گے جس کی جڑیں ایک جگہ ہوں اور شاخیں دوسری جگہ۔ مجھے اپنی ایک شاخ سے بلاوا آیا ہے۔ یوں بھی ممبئی میں کتنا رہوں گا۔ میرے میزبان ابھی مجھ سے اکتائے نہیں لیکن میزبان کے لواحقین بھی تو ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان لواحقین میں سے کسی کی طرف سے مجھے کوئی اشارہ ملا ہے (یہ سوءِ ظن کے قریب کی کوئی بات ہوگی) لیکن مہمان کے بھی تو کچھ فرائض ہوتے ہیں۔ مجھے یہی فرائض یاد آرہے ہیں جو اکثر و بیشتر مہمانوں کو بھولے سے بھی یاد نہیں آتے۔

میں حیدرآباد بھی جانا چاہتا تھا۔ سالار جنگ میوزیم گو کہ اب آثار قدیمہ کی تعریف میں آتا ہے لیکن اب بھی دیکھنے کی چیز ہے (اختر شیرانی کی نظم یاد آتی ہے کہ ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے) سالار جنگ کے بارے میں ہم نے کوئی ۵۰ سال پہلے حکایت سنی تھی کہ وہ حیدرآباد سے لندن گئے۔ کسی نے کوئی نوٹس نہیں لی۔ نوادرات کے شوروم میں بھی کسی نے انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس لیے کہتے ہیں انھوں نے ایک شوروم میں جان بوجھ کر ایک مجسمہ گرا دیا۔ مجسمہ کی جان تو نہیں نکلی کیونکہ جان اس میں تھی ہی نہیں۔ لیکن وہ ٹوٹ گیا۔ شوروم کے مالک، منیجر، منتظم مددگار سب کے سب ان کے گرد جمع ہوگئے اور اس سے پہلے کہ مالک اپنی زبان پر حرفِ شکایت لاتا سالار جنگ نے اپنی چیک بک سے ایک چیک چاک کیا اور شوروم کے مالک سے کہا کہ وہ رقم کا ہندسہ خود لکھ لے۔ سارے لندن میں دھوم مچ گئی کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے ایک نواب لندن آئے ہوئے ہیں — تشہیر میں یہ طاقت ہوتی ہے۔ اب یہ لطیفہ ہے یا واقعہ یہ آپ جانیں لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ سالار جنگ سے قدرت کو جو [illegible] اسی لیے کہا جاتا ہے قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔

میں کوئی خرد برد نہیں ہوتی ہے ـــــ حیدرآباد کے بے نشان آم بھی بہت یاد آتے ہیں۔ یہ اب ممبئی
میں بھی ملنے لگے ہیں لیکن وہاں کے آموں کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ یہاں جب بے نشان بادامی کے نام
سے ملتے ہیں وہ دارالترجمہ کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ اصلی آم نہیں ہوتے ـــــ حیدرآباد کے محلوں کے
نام بھی کچھ ذائقہ دار نہیں تھے۔ چنچل گوڑہ، سوماجی گوڑہ۔ امیر پیٹھ۔ بیگم پیٹھ۔ دگیان پیٹھ الوارڈ کا نام سن کر
پہلے پہل تو ہمیں شبہ ہوا کہ حیدرآباد میں اس نام کا محلہ شاید ہمارے یہاں سے جانے کے بعد تولد ہوا
ہو۔ وہاں ایک محلہ تھا کیچڑ ڈیلی۔ شاید اب بھی ہوگا۔ یہ صحیح واقعہ نگاری (ہمارے افسانہ نگاروں کو
واقعہ نگاری تو عوام سے سیکھنی چاہیے)۔ حیرت ہے یہ نام دوسرے شہروں میں کیوں نہیں
رائج ہوا۔ جہاں تک ناموں کا تعلق ہے ہمیں دلی شہر بھی پسند آیا تھا۔ وہاں تو مرد بھی اپنے نام کے
آگے جان لکھتے تھے۔ جان دیتے دوسروں پر تھے لیکن نام اپنا قاسم جان رکھتے تھے۔ یہ نام ہمیں اس
لیے یاد رہ گیا کہ اس گلی میں اسداللہ خاں غالب رہتے تھے۔ مکان ان کا ذاتی نہیں تھا لیکن اب پوری
گلی غالباً انہی کی ہو گئی ہے۔ قاسم جان کی گلی کی شہرت سن کر دلی کے کچھ مالک مکان اس فکر میں ہیں کہ ان
کی یا ان سات منزلہ عمارت کے کسی فلیٹ میں کوئی ایسا ادیب یا شاعر یا مصور کرایہ دار کی حیثیت سے
آکر (کرایہ دیئے بغیر) رہ جائے جس کی وفات کی سو ڈیڑھ سو سال بعد یہ عمارت عوام اور حکومت کی توجہ
کا مرکز بن جائے اور اس شہرت کی بنا پر عمارت کے مالک کا نام بھی اخباروں میں چھپنے لگے۔ (تشہیر
کی خاطر لوگ کیا کیا منصوبے نہیں بناتے)

ممبئی میں نظم و نسق (لا اینڈ آرڈر) کی صورت حال بہتر ہو گئی ہے۔ چند دنوں پہلے تک
روزآنہ دس یا بارہ قتل ضرور ہوتے تھے۔ اب ۸ یا ۹ ہو رہے ہیں لیکن سنا یہ جا رہا ہے کہ قاتلوں اور مقتولوں
میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایک مقتول اپنی وفات سے ایک دن پہلے ایک قتل کا سہرا اپنے سر بندھوا
چکا ہے۔ تب دوسرے دن اس کا اجر پاتا ہے۔ بالکل شمع کی زندگی گزارتا ہے۔ جس کے بارے میں
شاعر نے کہا ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات

اس طرح وفات پانے والے لوگ عوام نہیں ہیں کیونکہ عوام تو غریبی کی لکیر کے نیچے ابھی دنیا میں رہتے ہیں،
جب کہ یہ لوگ "انڈرورلڈ" کے باشندے ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ یعنی 'اے دو جہاں کے مالک' اپنے مع
کھو چکے ہیں یہ تیسری دنیا (تھرڈ ورلڈ) تو پیدا ہو ہی چکی تھی لیکن اس کی پیدائش سے قبل ہی ایک انڈر
ورلڈ بھی وجود میں آ چکی تھی۔ یہ زیر زمین ترکاری کے نمونے کی ہوتی ہے۔ جیسے مولی، گاجر، گڈا، گوبھ
وغیرہ وغیرہ۔ انڈرورلڈ کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ زمین ہی زمین پڑی ہوئی ہے۔ نہ کوئی حدبند
نہ ایف۔ ایس۔ آئی۔ اس زیر زمین دنیا کے مقبوضات ہر علاقے میں موجود ہیں لیکن یہ شہر یعنی ممبئی
اس کا خاص الخاص علاقہ ہے۔ جسے آپ صدر مقام بھی کہہ سکتے ہیں۔ زیر زمین مملکت پر بھی تسلط حا
... عام دنیا میں رائج ہیں۔ سب سے بڑی طاقت بننے اور اپنے

کو لیسپا کرنے یا کم سے کم زیر نگیں رکھنے کے مجرب نسخے زیر زمین بھی رائج ہیں۔ حریف کو نیست و نابود کرنے پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ شہر ممبئی کے کارونر سے متعلق یہ امر طے شدہ ہے کہ شہر کا مصروف ترین آدمی کارونر ہی ہے۔ کارونر دیانت دار بھی بہت ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے حجرۂ جراحت سے کوئی لاش اٹھ کر نہیں بھاگی ورنہ اسپتالوں اور عدالتوں کے احاطے سے پا بہ زنجیر اور دست بستہ افراد کے بھاگ جانے کے واقعات کے لیے بھی یہ شہر مشہور ہے۔ اس واردات کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بھاگتا ایک شخص ہے لیکن مزید ۳ افراد ہاتھ آتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی کارکردگی ہے۔

یہ شہر صحیح معنوں میں زندگی کی علامت ہے۔ جیسے جیسے مہنگائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے شہر کی رونق میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوتا ہے۔ سڑکوں پر گاڑیاں چلتی ہی رہتی ہیں۔ جن میں ہاتھ گاڑیاں بھی شامل ہیں اور الکٹرک بسیں بھی۔ گاڑیوں کے مسلسل چلتے رہنے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس شہر میں پارکنگ کی جگہ نہیں ہے۔ گاڑی کہیں ٹھیری نہیں کہ ٹرافک پولس حرکت میں آگئی۔ بعض صورتوں میں تو خود ٹرافک پولس ٹرافک کے جام کروانے کا کام کرتی ہے (ٹرافک کا جام ہونا ایک ایسی کیفیت ہے جس کا ترجمہ اور منظر کشی مشکل ہے۔ یہ کیفیت صرف اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب آدمی مکڑی کے جالے میں پھنس جاتے۔ اس وقت ٹرافک پولس صرف سیٹیاں بجاتی ہے۔ اور کبھی کبھی دشنام پر اتر آتی ہے۔ ایک آدھ کار کو کسی طرح بدقت تمام سڑک کے ایک کنارے معطل کر دیتی ہے اور بعد میں حساب کتاب کرتی ہے (حساب کا لفظ اہم ہے) اپنے قیام کے دوران دو مرتبہ میں بھی اس زندانی کیفیت سے گزر چکا ہوں۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ چھٹی کا دودھ کسے کہتے ہیں۔

ممبئی میں دوکانوں کے سامنے دوکانیں لگتی ہیں۔ کوئی گاہک دوکان میں جانا چاہے تو جا نہیں سکتا۔ یہ تو خیر کوئی بات نہیں لیکن خود اصلی دوکان دار بھی یا دوکان کا کوئی کارندہ بھی کسی کام سے باہر آنا چاہے تو آ نہیں سکتا۔ یہ کیفیت بھی مجھے پسند آئی۔ دوکانوں کے سامنے لگی یا لگائی ہوئی دوکانیں عارضی بھی ہیں اور مستقل بھی۔ انھیں آپ ہفتہ وار دوکانیں کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ یہ ہفتہ دینے والی دکانیں ہوتی ہیں۔ اصل دوکان کے مالک ہفتہ نہیں دیتے انھیں پروٹیکشن منی (protection money) دینی پڑتی ہے۔ یہ صرف ایک دستور یعنی رسم ہے۔ دوکان کی حفاظت دوکان دار ہی کو کرنی پڑتی ہے جو ایک مشکل مسئلہ ہے۔

ممبئی میں ہر بڑی دوکان شہرِ دلی کی طرح ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ 'دلی کئی مرتبہ لٹی اور اجڑی'۔ اس شہر میں قوت بھی ہے اور قوتِ برداشت بھی قوت لوٹنے کی اور قوت برداشت لوٹے جانے پر۔ ادھر ڈوبے ادھر نکلے کی ہمت رکھنے کی صلاحیت۔ یہاں رہنے کا مطلب صرف رہنا نہیں سہنا بھی ہے مجھے تو بھائی لوگ خوش و خرم بھی دکھائی دیئے۔ (زیادہ گہرائی میں جھانکنا نہیں چاہیے) یہاں صرف غریبی کی لکیر نہیں سلور لائن بھی ہے۔ سفرنامہ لکھنے کے شوقین لوگوں کو صرف سلور لائن پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس میں بھی بین السطور رہتے ہیں۔ کیبرے ڈانس کی شوٹنگ کے علاوہ بھی تو یہاں شوٹنگ ہوتی ہے۔ ممبئی کے باشندے اس بات کے قائل ہیں کہ مرنا ہی ہے تو گلیمر پر مرنا چاہیے۔ ممبئی میں ٹیلیویژن کے لیے سیریل بہت بننے لگے ہیں۔ جتنے سیریل میں نے دیکھے ان میں جوڑے بہت نظر آئے۔ اس سے ننانوے جوڑے غیر شادی شدہ پائے گئے۔ اس شہر میں شادی شدہ جوڑوں سے عنقریب راشن کارڈ واپس لے لیے جانے والے ہیں۔ میں آئندہ ہفتے اپنے وطن لا ثانی سے وطنِ ثانی کی طرف کوچ

ظفر کمالی
سیوان (بہار)

غزل

جو دیش واسیوں کو لُٹیا ڈبا رہے ہیں
ان کو ہی دیش واسی مالا پنہا رہے ہیں

کھا کر فریب ووٹر اب ہوگئے سیانے
کوئی بھی ووٹ مانگے اس کو بھگا رہے ہیں

سب سے بڑے فسادی خود ہی تھے جو مہاتما
بہر فساد زدگاں دھونی رما رہے ہیں

دھوتی پہ جچ رہی ہے کیا خوب شیروانی
تن من سے ایکتا کا جادو جگا رہے ہیں

چشم فلک نے دیکھا بھگوان کے پجاری
گھر توڑ کر اُسی کا ڈھولک بجا رہے ہیں

پگڑی کسی نے باندھی، مالا کسی نے پہنی
سب اپنے اپنے ڈھب سے روٹی کما رہے ہیں

آنکھیں اگر ہیں دیکھو بویا ببول جن نے
بھر بھر کے ٹوکروں میں وہ آم کھا رہے ہیں

اخلاق کا جنازہ تیار ہو گیا ہے
کالج کے نوجواں ہیں کاندھا لگا رہے ہیں

ابا نے کی اکٹھا دولت شرافتوں کی
بیٹے بڑے سخی ہیں اس کو لٹا رہے ہیں

اک قتل ہوگیا ہے تھانے کے کیمپس میں
سوئی ہوئی ہے پولس اس کو جگا رہے ہیں

جاکر کہاں رکے گی فتوؤں کی یہ سیاست
اندھے بھی آج کل کے رستہ بتا رہے ہیں

کوئی ہے دیوبندی، کوئی بریلوی ہے
اسلام کی ہے گردن چھریاں چلا رہے ہیں

شیعہ ہوں یا کہ سُنی دل سے خلوص رخصت
مذہب کو خوں کے آنسو دونوں رُلا رہے ہیں

حضرت کا بڑھ گیا ہے جب سے بلڈ پریشر
وہ مومنوں کو مشرک کافر بنا رہے ہیں

کب تک چلے گی ایسے مذہب کی ٹھیکے داری
ہے جوڑ کی ضرورت لیکن گھٹا رہے ہیں

اربوں کا ہے گھٹالا اس میں پھنسے ہوئے ہیں
آکر وطن پرستی ہم کو سکھا رہے ہیں

جب سے بہ طورِ لقمہ کرسی انھیں ملی ہے
دن رات بھونکتے تھے اب دُم ہلا رہے ہیں

اردو کی روٹیوں سے بھرتے ہیں پیٹ لیکن
بچوں کو پیٹ میں ہی انگلش پڑھا رہے ہیں

ہم ہیں بڑے مُبصر پڑھتے نہیں کتابیں
حکمت سے تبصرے کی گاڑی چلا رہے ہیں

آخر ظفرؔ لکھو گے کب اپنی پاپ بیتی
اردو میں کتنے کوّے گنگا نہا رہے ہیں

○

پرویز یداللہ مہدی

غالب کے نوحہ گر

عرفِ

ریسرچ اسکالر

غالب صدی تقاریب کے ہنگاموں نے اردو ادب کی کوئی اور خدمت بھلے ہی نہ کی ہو لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان ہنگاموں نے جہاں غالب شناسوں کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا (اشارہ یقیناً نام نہاد غالب شناسوں کی طرف ہے) وہیں مرزا غالب کی زندگی کے بھی ایسے ایسے گوشوں پر سے پردے اٹھا دیئے جو تاریکی میں تھے یا جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ ایک محقق جدید مرزا کی پیدائش کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ مرزا غالب دراصل حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے تھے لیکن کسی نامعلوم بیماری کے سبب پورے سال بھر تک آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس اثنا میں ان کے آبا حیدرآباد سے ہجرت کرکے آگرے چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی مرزا نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور چونکہ انسان جہاں آنکھ کھولتا ہے وہی اس کا مولد و مسکن کہلاتا ہے لہذا اس اعتبار سے مرزا غالب آگرے کے کہلائے لیکن ان کی موجودگی میں تاج محل کی شہرت چونکہ متاثر ہونے لگی تھی یعنی لوگ باگ آگرے پہنچ کر یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس تاریخی چیز کی زیارت پہلے کرنا چاہیے، تاج محل کی یا مرزا غالب کی کہ خود مرزا تاج محل کے حق میں دست بردار ہو گئے یعنی آگرے سے دلی چلے آئے اور یوں مرزا غالب دہلوی کہلانے لگے۔

اردو کے بیشتر محققوں اور نقادوں کو اگر جراحِ سخن کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ جراحِ سخن کسی شاعر یا ادیب کی قلمی کاوشوں کو یکسر نظر انداز کرکے اس کی نجی زندگی بلکہ اس کے متعلقین پر بھی رکیک حملے کر جاتے ہیں۔ کبھی شاعر کی محبوبہ کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی یہ دُور کی کوڑی لاتے ہیں کہ شاعر کی محبوبہ کوئی خاتون نہیں ایک کم سن لڑکا تھی بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ وہ لڑکا بھی نہیں تھی، بعض جراحِ سخن بیٹھے بیٹھے یہ فتنہ چھوڑ دیتے ہیں کہ فلاں دیوان فلاں شاعر کا ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ شاعر موصوف تو پیدائشی بلکہ پشتی جاہل تھے اور آخری دم تک اپنے آبا و اجداد کی طرح الف کو لٹھ اور لٹھ کو الف سمجھتے تھے اور جو کم عقل ایسا نہیں سمجھتے تھے انھیں بذریعہ لٹھ ایسا سمجھنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ جراحِ سخن حضرات میں غالباً اس ٹائپ کو کوئی انڈر گراؤنڈ قسم کا سمجھوتہ

ہوتا ہے کہ ایک نقاد اگر کسی شاعر یا ادیب کی تعریفوں کے پل باندھ کر اسے بانس پر چڑھائے تو دوسرا اس
بمری طرح اسکی ٹانگ پکڑ کر کھینچے کہ بے چارہ شاعر یا ادیب زندگی بھر لنگڑاتا رہ جائے۔ خود رو جھاڑیوں کی طرح پیدا
ہونے والے محققوں کی آسان پہچان یہ ہے کہ آئے دن یہ عجیب و غریب قسم کے بیانات جاری
کرتے رہتے ہیں، ایک نام نہاد محقق اگر یہ فرمائے کہ مرزا غالب کا نام ان کے کلام کی وجہ سے مشہور ہو
تو دوسرے محقق فوراً یہ بیان جاری کر دیتے ہیں کہ مرزا کا نام ان کے کلام کی وجہ سے نہیں، ان کا کلام
ان کے نام کی وجہ سے مقبول ہوا۔ برخلاف اس کے ایک محقق فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نام کا کوئی
شاعر گزرا ہی نہیں جبکہ ایک اور محقق اس بات کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نام کا
ایک شخص گزرا ضرور ہے لیکن وہ شاعر نہیں تھا کم سے کم اردو کا شاعر نہیں تھا، اتفاق سے اس کی
ملاقات ایک ایسے لاوارث شاعر سے ہو گئی جو قریب المرگ تھا اور اسد تخلص رکھتا تھا۔ اس نے اپنا سا
کلام اس نامی گرامی غالب کے حوالے کر کے داعیٔ اجل کو لبیک کہا کہ وہ اس کے کلام کو ملک کے کونے کونے
میں پھیلائیں۔ مرزا غالب نامی اس شخص نے از راہِ ہمدردی و خدا ترسی مرحوم اسد کے کلام کو ملک
کے طول و عرض میں پھیلایا ضرور لیکن تخلص کی تبدیلی کے ساتھ یعنی کہیں کہیں تو تخلص اسد ہی رہنے
دیا لیکن زیادہ تر مقطعوں میں اپنے تخلص یعنی غالب کو داخلِ شعر کر دیا۔

غالب نواز اور غالب خلاف یعنی اینٹی غالب دونوں طبقوں سے تعلق رکھنے والے محققین
نقاد حضرات کے خیالات، بیانات و مقالات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مرزا
کی شہرت بلکہ مشہوری میں اینٹی غالب حضرات ہی نے چار چاند لگائے ہیں جبکہ غالب نواز اصحاب
عقیدت میں اس حد تک غلو کر جاتے ہیں کہ چچا غالب کی شخصیت اگر چٹان کی طرح مضبوط نہ ہوتی
ان کے متعلق عوام کے خیالات آج قطعی مختلف ہوتے، غالب نواز حضرات کی غالب پرستی کے
نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ غالب پرستوں کی رائے میں چونکہ اچھے شعر صرف مرزا غالب ہی کہہ سکتے
اس لیے ہر اعلیٰ شعر کو مرزا کا بتاتے ہیں چاہے وہ کسی موجودہ شاعر کا ہو یا اساتذہ میں سے کسی کا
کے علاوہ ایسے تمام تر اعلیٰ شعر جو اکثر نامعلوم شعرا سے منسوب کیے جاتے ہیں، انھیں مرزا کے کھاتے
میں ڈال دیتے ہیں بلکہ طرح طرح کی الٹی سیدھی دلیلوں کے ساتھ انھیں مرزا کے شعر ثابت کر کے د
ہیں۔ مثلاً ایک غالب پرست نے میر کے اس مشہورِ زمانہ شعر:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کے بارے میں فرمایا کہ یہ شعر دراصل چچا غالب کا ہے اور یوں ہے:

سرہانے ذوق کے آہستہ بولو
ابھی غالب سے لڑ کے سو گیا ہے

غالب اور ذوق کی شاعرانہ چشمک زمانے بھر میں مشہور رہی۔ لہٰذا اسی بات کے پیشِ نظر اس کی تر

یوں فرمائی کہ غالب نے یہ شعر اس تصور کے ساتھ کہا ہے کہ ذوق ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں لیکن غالب سے بھلا ان کا کیا مقابلہ، پہلے ہی راؤنڈ میں "ناک آوٹ" ہو جاتے ہیں اور خفت اور جھینپ مٹانے کے لیے سونے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔

چچا غالب کی اس بے انتہا مقبولیت کے تعلق سے اینٹی غالب حضرات اور مخالف کیمپ کے شعرا کا خیال ہے کہ اس کی وجہ کلام غالب کی خوبی نہیں بلکہ ان پر ریسرچ کرنے والوں کی تعداد ہے جو اتنی زیادہ ہے کہ اگر اوسط نکالا جائے تو فی غزل بلکہ فی شعر ایک عدد محقق ضرور نظر آئے گا۔ کاش مرزا غالب آج کے دور میں ہوتے تو دیکھتے کہ کبھی جنھیں ایک عدد نوحہ گر نصیب نہیں تھا۔ آج ان کی ہر ایک غزل کے ایک ایک شعر کے پیچھے ایک ایک نوحہ گر عرف ریسرچ اسکالر موجود ہے اور ہر ایک شعر کے ہر لفظ کے نت نئے معنی و مطالب دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے اور مرزا ہی کے اس شعر کو صحیح ثابت کر رہا ہے:

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اوپر ہم نے مخالف کیمپ کا ذکر کیا ہے، مخالف کیمپ کے شعرا سے مراد صرف جدید شعرا نہیں بلکہ ہر وہ شاعر ہے جو اپنے کسی شعر پہ ملنے والی داد کی لذت سے پوری طرح محظوظ بھی نہیں ہو پاتا کہ باشعور سامع یہ احساس دلا کر اسکا سارا نشہ کافور کر دیتا ہے کہ یہ شعر تو مرزا غالب کے فلاں شعر کا چربہ ہے، اس بے داد گری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر مذکور چراغ پا ہو کر مخالف کیمپ میں پہنچ جاتا ہے اور دوسرے غالب دشمن عناصر کے ساتھ مل کر غالب کے خلاف کمربستہ ہو جاتا ہے حالاں کہ کمربستہ ہونے کے بجائے اسے تو کندھے سے بستہ لٹکائے کسی پرائمری اسکول کا رخ کرنا چاہیے کہ اس کے حق میں بہتر ہوتا۔

مرزا غالب کے بارے میں ریسرچ اسکالروں، سخن فہموں اور طرف داروں کے علاوہ بعض سکہ بند قسم کے شعرا و ادبا بھی وقفہ وقفہ سے مختلف قسم کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں، البتہ عام طور پر جو شوشہ اکثر کانوں میں پڑتا ہے وہ ان کی شاعرانہ زبان کے تعلق سے ہے، یعنی ایک الزام مرزا غالب پر یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے بالعموم اتنی ادق زبان استعمال کی ہے کہ معنی و مفہوم سمجھنے سمجھ میں تمام مروجہ لغتیں و ڈکشنریاں ناکام رہتی ہیں۔ اور جتنی پرانی فرہنگیں اور لغات ہیں ان کا یہ حال ہے کہ ان میں اور دیوانِ غالب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی زیراکس کاپی معلوم ہوتی ہیں۔ اس عام شکایت کے باوجود ہم نے مرزا غالب کے کئی مصرعے اور اشعار لوگوں کو موقع بے موقع گنگناتے، کوٹ کرتے دیکھا اور سنا ہے بلکہ رکشاؤں، لاریوں اور دیگر چلتی پھرتی سواریوں کی پشت پر جلی حرفوں میں لکھے ہوئے کلام غالب کے بے شمار نمونے بھی دیکھے ہیں یہ اور بات کہ ان اشعار اور مصرعوں میں ہر جگہ دو ایک لفظ نئے ضرور نظر آتے ہیں، کیوں نہ ہو خوش نویسوں، کاتبوں اور آرٹسٹوں، پینٹروں کو ایڈیٹنگ کا پورا پورا حق ہوتا ہے بلکہ اتنی بے دردی سے تو اردو رسالے کا کوئی مدیر کسی نو آموز شاعر کی بے بحر بے وزن شاعری کی ایڈیٹنگ بھی نہیں کرتا۔ یہاں نمونے کے طور پر مرزا غالب کے دوہ

تصحیح شدہ شعر پیش ہیں - پہلا ہم نے ایک عدد لاری کی پشت سے لیا ہے :

عقد کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دوسرا تصحیح شدہ شعر ہم نے ایک عدد سائیکل رکشا کی پشت پر زیورِ طبع بلکہ زیورِ تباہ سے آراستہ دیکھا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے :

قیدِ حیات و بند و غم اصل میں چاروں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں

اگر رکشہ والے کے جذبات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ شعر سو فی صد درست اور حسبِ حال معلوم ہوگا کیوں کہ نچلے اور متوسط طبقے کے حق میں قید، حیات، بند اور غم چاروں کسی با مشقت سزا سے کم نہیں۔

مرزا غالب کی عرفیت مرزا نوشہ بھی تھی اس لیے ان کی شاعری میں نوشہ کی سی آن بان شان اور زندگی کے پورے فورس اور تورنگ پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی شعر ہر مرض کی دوا زندہ طلسمات کی طرح ہر موقع پر چسپاں ہو جاتا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مرزا غالب نے ہو بہو ایسی ہی کسی سچویشن سے دوچار ہونے کے بعد ہی یہ شعر موزوں فرمایا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ مرزا غالب عرف مرزا نوشہ کی شاعری عشق، فلسفہ، سیاست، طبابت، تصوف، تاریخ جغرافیہ، کیمیا طبیعات، غرض تمام علوم و فنون بلکہ جنون کی آئینہ دار ہے، الیکشن میں ہارے ہوئے کسی لیڈر کا مذاق اڑانا ہو یا تسلی دینا ہو دونوں صورتوں میں مرزا غالب کا مندرجہ ذیل شعر چل سکتا بلکہ دوڑ سکتا ہے :

دیر نہیں، حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

یہی نہیں شادی بیاہ، چھلہ چھٹی، چاہے کوئی بھی تقریب پر تقریب ہو، دیوانِ غالب حاضر ہے۔ اگر کسی کی لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہو تو اخباروں میں بھگوڑی لڑکی کی تصویر کے ساتھ مرزا غالب کا کوئی موزوں و بر موقع شعر دے دیا جائے تو لڑکی کے لوٹ آنے کی توقع جا سکتی ہے۔ البتہ شعر کے انتخاب میں اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔ یعنی مفرور لڑکی کا لوٹ آنا ایک طرف گھر کی کسی دوسری دخترِ نیک اختر کے بھاگ جانے کا خطرہ کھڑا ہو سکتا ہے، اس میں مرزا غالب کا کوئی قصور نہیں کی شاعری کا بھی قصور نہیں بلکہ سارا قصور ہے تقدیر کا جس کا ذکر خود چچا غالب نے یوں کیا ہے :

تقدیر کا فسانہ جا کر کسے سنائیں
اس دل میں جل رہی ہیں ارماں کی چتائیں

آپ کہیں گے یہ مرزا غالب کا شعر نہیں بلکہ عامیانہ فلمی گانا ہے، مانا کہ یہ فلمی گانا ہے لیکن کیا آپ ... دیوانِ غالب سے اڑایا ہوا نہ ہو۔ مرزا غالب کے بعد جتنے بھی

ہوئے ہیں ان کی ایک بھی ایسی تخلیق کا حوالہ ملتے ہیں جو مرزا کے کسی خیال یا مضمون سے دانستہ یا نادانستہ نہ ٹکرائی ہو۔ مانا کہ ان شاعروں نے جا بجا غالب کی زمین میں شعر نہ کہے ہوں، ویسے بھی مرزا غالب کی زمین میں شعر کہنا لوہے کے چنے بلکہ گولے چبانے کے مترادف ہے، مرزا کی شاعرانہ زمین اور دیگر شعرا کی زمینوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ان شعرا کی زمینیں زیرِ فلک ہیں جبکہ مرزا غالب کی شاعرانہ زمیں وہ زمین ہے کہ فلک جس کے زیرِ سایہ ہے۔ اس بات کا مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں کس خوبی سے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

مسجد کے زیرِ سایہ ایک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

ایسی شاعرانہ زمین میں جو کہ آسمان کی بھی آسمان ہو شعر کہنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے جبکہ مرزا غالب کی کسی صبح کی شام اس وقت تک نہ ہوتی تھی جب تک کہ وہ کم از کم ایک عدد جوئے شیر نکال نہیں لاتے تھے۔ ہوتے ہوتے جوئے شیر نکال لانے میں مرزا اس قدر طاق ہو چکے تھے کہ فرہاد عرف کوہ کن کو اپنے آگے ہیچ سمجھنے لگے تھے کہ ان کی نظر میں وہ رسوم و قیود کا اسیر تھا چنانچہ فرماتے ہیں:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

●●

اقبال شانہ

فلمی دُعا

(علامہ اقبال کی روح سے معذرت کے ساتھ)

"لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری"
ہر طرف میرے تصوّر میں "اُرملا" ہو جائے
شب مری یاد میں تبّو کی بسر ہو یارب
ہو مرا کام مہیّا سے رفاقت کرنا
یاد میں ایشوریا رائے کی آہیں بھرنا
میرے مولا کبھی ریکھا سے مِلانا مجھ کو
میری بینائی بھی ہو جائے، کچھ اتنی روشن
مجھ کو درکار کوئی کار نہ بنگلہ کوٹھی
جب کبھی میں جاؤں سعودی سے کبھی کالی کٹ
جب بھی ممتا کو ہو کھانسی مجھے نزلہ ہو جائے

اہلیہ مادھوری ڈکشت ہو خدایا میری
شاہ زادی میرے سپنوں کی کرشمہ ہو جائے
جب میں کاجل کو دیکھوں تو سحر ہو یارب
واچ مین بن کے منیشا کی حفاظت کرنا
سشمتا سین سے اظہارِ محبت کرنا
ہیما مالینی کا دیدار کرانا مجھ کو
مجھ کو ہر سمت نظر آئے رویئنہ ٹنڈن
میرے سپنوں میں ہمیشہ رہے شلپا شیٹی
ہمسفر بن کے مرے ساتھ رہے پوجا بھٹ
چھینک دے عائشہ جھلکا مجھے صدمہ ہو جائے

اک عدد جوہی چاولہ سے ملا دے یارب
شاہ رخ خاں سا شانہ کو بنا دے یارب

چوڑیاں

اس نے پہنی ہیں جو بھاری چوڑیاں
جیسے خطرے کا الارم بج اُٹھے
ہاتھ رکھ دیتی ہے وہ سینے پہ جب
لگ رہی ہے چوڑیوں کی وہ دکاں
ناچتے ہیں مرد ان کے سامنے
آپ کی مرضی ہو جو کر لیں پسند
پیار سے گر تم جو پہناؤ مجھے

میرے سر ٹوٹیں گی ساری چوڑیاں
ایسے بجتی ہیں تمہاری چوڑیاں
دل پہ کرتی ہیں سواری چوڑیاں
اس نے پہنیں ڈھیر ساری چوڑیاں
جب نچاتی ہیں مداری چوڑیاں
لاؤں گا دو چار لاری چوڑیاں
میں پہن لوں گا تمہاری چوڑیاں

رات بھر شانہ مجھے سونے نہ دیں
آپ کی کم بخت ماری" چوڑیاں

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

(پہلی قسط)

غالبِ خستہ جاں
محبوبِ دلستاں
اور
رقیبِ روسیاہ

یوں تو معشوق کی عاشق سے بے التفاتیاں، دل آزاریاں اور بے وفائیاں اور رقیب کی ستم رانیاں ریشہ دوانی اور تنگ ظرفی اردو شاعری کا لازمی عنصر ہے۔ جس غزل میں محبوب کا شکوہ شکایت نہ ہو اس کے نخرو ادا، کج رخیوں کا تذکرہ نہ ہو اور رقیب کی ہجو اور دل کا بخار نہ نکالا گیا ہو۔ اس وقت تک غزل میں کیفیت ہی پیدا نہیں ہوتی اردو زبان کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کی غزل ان اصناف کے بغیر مقطع تک پہنچ پاتی ہو، ہر شاعر محبوب سے شاکی اور رقیب سے سرگراں ہی ہوگا مگر جناب نجم الدولہ، دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ میرزا غالب کا معاملہ ان سب سے سوا ہوا۔ عاشق سدا کے خود و مہجور معشوق تغافل کیش اور مغرور اور رقیب۔؟ وہ ہے سو نہایت کمینہ خصلت سفلہ مزاج، بدخو گویا راسپوتن (Rasputin) صورت سے لنگور......

جب راسپوتن کا نام آ ہی گیا تو پہلے ذرا اس کی کہانی بھی سن لیجیے۔!

وہی وحشی ارنا بھینسہ جو کچی پیاز کی ڈلیاں کترتا ہوا ماسکو کے کریملین پیلس کی غلام گردشوں میں "فوں فوں" کرتا ہوا دندناتا پھرا کرتا تھا مجال نہیں کہ محل کے نوکر اس کی طرف آنکھ بھی اٹھا دیکھیں۔ نوکر تو بے چارے نوکر ہی ہوئے۔ خود زارِ روس بھی اس کی بو پا کر کپکپاتا ہوا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اِس کمرے سے اُس میں اور اُس کمرے سے اس میں چھپتا پھرتا تھا۔

ایک روز یہ وحشی نژاد بلڈاگ صورت ایک ہاتھ میں پیاز لیے کتر کتر کر چباتا ہوا مست ہاتھی کی طرح ڈولتا پھر رہا تھا؛ تعفن ایسا پھیلا ہوا تھا جیسے ادھر سے کوئی دو چار ریشائیل بکرے گزر رہے ہوں۔ خدام اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھے کونوں میں دبکے ہوئے تھے کہ زارینہ کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور اس نے سر باہر

نکال کر جھانکا۔ جوں ہی راسپوتن پر نظر پڑی پیار کی ایک لہر چہرے پر عیاں ہوگئی اور وہ کھلتا رہا اور دروازہ کھول دیا۔ راسپوتن اندر گھس کر ایک صوفے پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور اپنے ایک ہاتھ کو آگے بڑھا کر زارینہ کو حکم دیا "چوسو" اور وہ تین بل کھا کر گھٹنوں کے بل جھک گئی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر میلے لمبے میل بھرے ناخنوں والی انگلیوں کو ٹافی کی طرح چوسنے اور چاٹنے لگی۔ "آنکھیں خمار آلود ہوگئیں، چہرہ فروغ مے سے گلستان ہوگیا"۔ راسپوتن نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور پیاز پر دانت مارنے لگا۔ زارینہ نے ایک خادم کی طرف دیکھا وہ اشارہ پاکر رجعت قہقری کرتا ہوا باہر نکل گیا اور کچھ دیر بعد ڈھیر ساری پیاز سے بھری ایک نقرئی کشتی لاکر راسپوتن کے آگے رکھ دی اور ایک طرف کو ہو کر مودب کھڑا ہوگیا۔ کشتی پر نظر پڑتے ہی خوشی سے راسپوتن کی باچھیں کھل گئیں۔ پیاز چباتے ہوئے لگاوٹ سے زارینہ کو دیکھنے لگا اور زارینہ لال لال ہوگئی۔

کچھ ہی دیر بعد خواب گاہ کا ایک اندرونی دروازہ ذرا سا کھلا اور اس میں زار سہما سہما یا ہوا چوہوں کی طرح جھانکتا نظر آیا۔ جیسے ہی راسپوتن کی نظر اس کی طرف اٹھی، سانپ سونگھ گیا ملتجیانہ نظروں سے زارینہ کی طرف دیکھنے لگا ...... زارینہ نے بہ نظر ترحم اس کو پھر راسپوتن کو دیکھا اس نے اجازت دے دی اور پھر زارینہ کا اشارہ پاکر تھر تھر کانپتا ہوا زار اندر داخل ہوکر ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ وہی زار تھا جس نے وسط ایشیا کے ملکوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی اور روس پانچوں ریاستوں کو ایک ایک کرکے ہڑپ کر رہا تھا ...... اور اب راسپوتن کے آگے مارے دہشت کے خود اس کا اپنا یہ حال تھا جیسے:

میر صاحب بھی اس کے ہاں تھے پر
جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

بلا ثبوت کوئی بات منہ سے نکالنے کے ہم قائل نہیں ذرا اس "برہان قاطع" کی روشنی میں ہمارے دعوے کو دیکھیے۔ ہر بات کی تائید ہو جائے گی کہ تورانی و سلجوقی سپاہی زادے کا رقیب، زارِ روس کے رقیب جیسے تمام اوصاف کا حامل تھا۔ جس کے تصور ہی سے آپ کے سارے وجود پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی ......

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں!

یعنی ایسی امیدوں کی ساعتیں امنگوں کے لمحوں میں رنگ کو بھنگ کرنے کے لیے کہیں رقیبِ روسیاہ بندر کی صورت "ہاتھی ہلا" نہ آدھمکے ......

محبوب کے آگے ریشہ خطمی ہو جانے کی بھی آخر ایک حد ہوا کرتی ہے ہر شے [illegible] پیدائش نرم ریشے کا ہوتا ہے مگر ادھر کی انکساریوں، لجاجتوں و زنقوں کا ملاحظہ کیجیے، سولیشت سے چلی آ [illegible]
[illegible] کے قدموں

سمجھوتہ کر لینے کے لیے ہاتھ جوڑ کر کیسے گھگیا گھگیا کر گویا بھیک مانگی جا رہی ہے:

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

جب بھی یہ شعر پڑھنے میں آتا ہے تو ہم کو فقیر کی یہ صدا یاد آجاتی ہے:

"جو دے اس کا بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا"

ایک طرف طبعِ نفاست پسند کی اعلیٰ ذوقی کا یہ عالم کہ فرمایا جاتا ہے:

آسودہ بادِ خاطرِ غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را!

(اے مغبچہ، پلیز! میرے پسندیدہ مشروب "اولڈ ٹام" کی تیزی کو کم کرنے کے لیے کڑوے کسالے بدمزہ سوڈے کے بجائے عرقِ گلاب ملا کر میرے لیے پیمانہ تیار کیا کرو۔)

اور دوسری طرف ذرا اس بدذوقی کا بھی ملاحظہ کیجیے:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانوں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کر باہر لگن کے پانوں!

یاد رکھیے شعر پڑھتے ہی اُبکائی آجاتی ہے اور جی مالش کرنے لگتا ہے۔ وہ پانوں سیم تن کے ہوں یا شیم تن کے کیا فرق پڑتا ہے، پانوں تو سب کے پانوں ہی ہوئے ...... نہ ہوئے ہمارے صاحب عزیمت بریگیڈیر توفیق علی اگر وہ ہوتے تو اس غمزے سے زچ ہو کر ٹانگ ہی اکھاڑ لے جاتے اور ریفریجریٹر میں محفوظ کر کے جب جی چاہتا دھو کر پی لیا کرتے۔ وہی بریگیڈیر توفیق علی جن کی زندہ دلیوں اور جوان جوان کارناموں پہ خوب صورت اور دل کش اردو لکھنے والے ادیب پروفیسر عزیز احمد ⊖ نے "ایسی بلندی ایسی پستی" ● نام ایک ناول ہی لکھ ڈالی معہذا حیدرآباد مرحوم کی دلآویز جھلکیوں کی بھی خوب سیر کرائی ہے۔ اسی ناول کا البیلا، بانکا جوان رعنا مرکزی کردار "کیپٹن نیازی" وہ یہی بریگیڈیر توفیق ہیں جن کے مردانہ حسن اور وجاہت کا شہر حیدرآباد میں کوئی ثانی نہ تھا اور ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی رعنائی کا یہ عالم تھا کہ کچی عمر کی لڑکیاں یہ طے نہیں کر پاتی تھیں کہ انھیں کس رشتے سے بلایا جائے۔

ایک دن ہم نے مزے لینے کی خاطر چٹکی لی" بریگیڈیر صاحب عزیز احمد کی ایک کتاب "ایسی بلندی ایسی پستی" پاکستان میں چھپی ہوئی آئی ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ سن کر لال بھبوکا ہوگئے بولے شریر جھوٹ بکتا ہے۔ طالب میاں! تم یقین نہ کرو اس کی باتوں پر۔ ہم نے کہا! آپ

⊖ پرائیوٹ سکریٹری ہز ہائینس پرنس آف برار، کنٹرولر بلا ویسٹا پیلس۔
● یہ کتاب نومبر ۱۹۴۸ء میں مکتبۂ جدید لاہور سے شائع ہوئی۔

فرماتے ہیں تو میرا بھی یہی خیال ہے۔
ہوا یہ کہ ایک مرتبہ جونیر پرنس شہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر کے محل" ہل فورٹ پیلیس"
میں جس کی آن بان اور شوکت و حشمت کی صدق جائسی نے اپنی کتاب" دربار دُربار" میں نہایت
دل کش تصویر پیش کی ہے جہاں کے مشاعروں اور شاہی ضیافتوں کو ملک گیر شہرت حاصل تھی۔
ایک رات مشاعرے کی محفل میں بریگیڈیر بھی سامع کی حیثیت سے شریک تھے۔ ڈنرکس
اور ڈنر کے بعد دربار ہال میں مشاعرے کا آغاز ہوا۔ شہزادہ والاشان شجیع کی غزل آداب شاہی کی اتباع
میں پہلے سنائی گئی۔ اور پھر دوسرے ملک کے نامور شعرائے کرام اپنا اپنا کلام پیش کرنے لگے۔ دربار
میں شاہی رعب و دبدبہ چھایا ہوا تھا تہذیب و شائستگی کا بے حد و نہایت بے مثال نمونہ۔ حاضرین
محفل توجہ اور انہماک سے کلام سن رہے تھے اور اچھے شعر پر شائستگی سے داد دے رہے تھے۔ مشاعرہ
رنگ پر آرہا تھا کہ شہزادہ والاشان کی نظر بریگیڈیر توفیق پر پڑی جو بجائے مشاعرہ سننے کے نہایت
بے کلی اور بے چینی سے پہلو بدل بدل کر بار بار کھلے دروازے میں سے برابر کے ہال میں دیکھے جارہے
تھے جہاں میزوں پر قرینے سے بادۂ ناب سے بھری ہوئی بوتلیں اور بلوریں ساغر رکھے ہوئے تھے۔
شہزادہ والاشان نے ٹوکا" توفیق! غزل سنو، اُدھر کیا دیکھ رہے ہو اور کیوں بے کل ہو،
کیا کانٹے چبھ رہے ہیں؟

توفیق صاحب دست بستہ عرض پرداز ہوئے سرکار! میں" فوجی بچہ" تیر و تفنگ سے
کھیلنے والا شعر و شاعری سے مجھے کیا واسطہ، میری سمجھ میں یہ کب آئے گی ۔۔۔؟ اگر حکم ہو تو ادھر جا کر بیٹھ
جاتا ہوں، تاکہ میری وجہ سے مشاعرہ بدمزہ نہ ہو ۔۔۔۔۔ فرمایا گیا! جاؤ، جاؤ، دفعان ہو جاؤ
میں سب سمجھتا ہوں ۔۔۔۔۔۔

اب یہاں سے بعد کی روداد خود توفیق صاحب کی زبانی سنیئے:
" اجازت مرحمت ہونے کے بعد میں اٹھا، کورنش بجالایا اور دوسرے ہال میں آکر
کاک اڑایا، شیشہ و گلاس سامنے رکھ کر خوب" ٹھونکنے لگا" اُدھر دروازے
میں سے مشاعرے کا سارا منظر نظر آرہا تھا اور غزلیں بھی صاف سنائی دے رہی
تھیں۔ دو چار شاعروں کے بعد ایک شاعر صاحب اپنی غزل پیش کرنے کے لیے
اٹھے اور بڑی خوب صورت غزل ترنم سے سنانے لگے ہر شعر پر خوب داد مل رہی تھی
شہزادہ والاشان بھی محظوظ ہو کر ہاتھ اور سر کے اشارے سے اپنی خوشنودی کا
اظہار فرمارہے تھے۔ جب داد کے ڈونگرے برسنے لگے تو شاعر صاحب ترنگ میں آگئے
اور اب لہک کر جو شعر سنایا گویا بیت الغزل تھا۔ کیفیت اور مفہوم کے لحاظ سے نہایت
دل پذیر اور اثر آفریں، وہ شعر تو اب مجھے یاد نہیں مگر اس کا مفہوم کچھ ایسا تھا: " میں۔
قدموں میں سر رکھ دیا، ہاتھ جوڑے، دامن تھام کر منتیں کیں مگر وہ ایک نہ ماننے اور

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے" کے مصداق دھکا دے کر چلے گئے"۔۔۔۔

میں اوٹ میں بیٹھا ہوا گلاس ہاتھ میں لیے سب سن اور دیکھ رہا تھا۔ یہ شعر سن کر بے ساختہ اٹھا اور میرے منہ سے بے اختیار، زور سے "واہ" نکل گئی اور شہزادہ والاشان کی سماعت سے جا ٹکرائی۔ فرمایا: "او فوجی بچے" ذرا ادھر آنا۔۔۔۔۔ الٰہی خیر ہو، مارے گئے۔

سہما سہما حضوری میں پہنچا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ پوچھا گیا! ابھی تم نے کہا تھا، میں فوجی بچہ ہوں شعر و شاعری میں مجھے درک نہیں لیکن اب اس اچھے شعر پر تم نے "واہ" کیوں کی؟ کیا سمجھے۔۔۔؟ گستاخی معاف، جان کی امان پاؤں تو عرض کروں ـــ بکو!۔۔۔۔۔

عرض کیا! سرکار مجھکو شعر و یر تو سمجھ آتا نہیں لیکن "واہ" میرے منہ اس لیے نکل گئی کہ یہ شاعر صاحب، دھان پان، منحنی جان، ناک پکڑنے سے دم نہیں جائے۔ آپ نے "معشوقہ" کے پانوں پڑتے ہاتھ جوڑے، اور فلم "صاحب بی بی۔ غلام کی بی بی جنم جلی برہ کی ماری مینا کماری کی طرح فلم کے صاحب" چوہدری رحمان" کا ہاتھ تھام کر گڑگڑائے "نہ جاؤ سئیاں، چھڑا کے بئیاں، قسم تمہاری میں رو پڑوں گی، میں رو پڑوں گی"۔۔۔۔۔ اس پر بھی آپ کا معشوق ذرا نہ پسیجا اور ہاتھ جھٹک کر چل دیا، آپ منہ بسورتے رہ گئے۔

ان کی بجائے اگر میں ہوتا۔۔۔۔۔۔ پوچھا گیا! تو کیا کرتے ـــ؟ عرض کیا چوٹی پکڑ کر ایک زور کا جھٹکا دیتا اور سامنے بٹھا کر پوچھتا، کہاں چلی ـــ؟ پہلے پورا حساب بے باق کر کے جا۔۔۔۔۔ سن کر شہزادے نے فرمایا، بدذوق فوجی کمندۂ ناتراش جاؤ تم وہیں مرو، شعر کی ساری شعریت کا ستیاناس کر ڈالا۔۔۔۔۔۔ وہ شاعر صاحب بے حد خفیف ہوئے محفل زعفران زار ہو گئی"۔۔۔۔۔

اسی بات پر ہم نے کہا تھا جب محبوب ضد سے پانوں لنگی سے باہر کھینچ کھینچ لیتا تھا تو کاش اس پر اس غریبلے کا سبق دینے کے لیے بجائے میرزا نوشہ کے بریگیڈیر توفیق ہوتے۔۔۔۔۔ سیم تن کو دن میں تارے نظر آجاتے۔۔۔۔۔۔ (جاری)

●●

ڈاکٹر ایم ولی الحق انصاری
(لکھنؤ)

بزمِ سخن

نئی باتیں ہوئیں معلوم بزمِ شعر خوانی میں
زباں سے بھی جو ناواقف تھے وہ اہلِ زباں نکلے

ترنم ریز تھے کچھ اور تحت اللفظ خواں کچھ تھے
الیتی و میر مونس کچھ تو کچھ فیاض خاں نکلے

ہوا معلوم کلو باڑھیے ہیں شاعرِ اعظم
فقیرے مستری اس فن کے استادِ زماں نکلے

گھسیٹے صرف گھسیارے نہیں، ہیں وہ عروضی بھی
امیر کاروانِ فن کے میرِ کارواں نکلے

میاں بدھو ڈھپالی کا سمجھ میں مرتبہ آیا
سعادت یار خاں قوال فخرِ شاعراں نکلے

رموزِ حکمت و عرفاں زباں پر آئے بدھو کے
جنھیں ندی سمجھتے تھے وہ بحرِ بیکراں نکلے

بقاتی یوں تو جاہل بھی ہیں اور بہکے بھی ہیں لیکن
غضب کے شعر گو نکلے بلا کے شعر خواں نکلے

سخن فہموں میں نمبر ایک پر تھے حضرت جمن
مداری بخش ناقد شیخ جمن نکتہ داں نکلے

گلستانِ سخن کا پھر تو ہے اللہ ہی حافظ
اگر اس علم کے پردے سے ایسے باغباں نکلے

کوثر صدیقی
(بھوپال)

غزل

ان کے کوچے میں کیوں ہوئی ہلچل
شاعروں کا نہ ہو کہیں دنگل

کوئی مجنوں نہیں ہے ہندی میں
اور اردو میں ہیں بہت پاگل

پس رہے ہیں عوام چکی میں
جنتا کو دل رہا ہے جنتا دل

میرے جوتے چلے نہ اک دن بھی
ان کے پیروں کی چل گئی چپل

دورِ شفافیت¹ کا آیا ہے
آج کل وہ پہنتے ہیں ململ

تجزیہ خوب ہے یہ ہوٹل کا
ہو (جو پیسہ تو آ، نہیں تو) ٹل

سائیکل بھی کہاں مقدر میں
تو مرے ساتھ ساتھ پیدل چل

شاعروں کے لئے بہت ہے یہ
چائے کے ساتھ بیڑی کا بنڈل

نیند میں کچھ پتہ نہیں چلتا
چوستے رہتے ہیں لہو کھٹمل

اب نہ گھنگرو نہ گھنگروؤں کی صدا
بک گئی ان کے پاؤں کی پایل

بن گئے پہلوان سب ایم۔ پی
پارلیمنٹ بن گئی دنگل

شہر ہوتے تھے پہلے جو کوثر
بن گئے کنکریٹ کے جنگل

¹ TRANSPARENCY

خامہ بگوش
(پاکستان)

ادبی لنکا کے باون گزے

مکتبہ جامعہ دہلی کے شاہد علی خاں اردو کے بڑے ناشرین میں سے ہیں اور ہندوستان میں تو ان جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے جسے اردو کی ہزار اعلیٰ کتابیں شائع کرنے کا تجربہ ہو۔ کتاب سازی میں اپنی بیمثال کامیابی سے خود ہی متاثر ہو کر انھوں نے ایک کارخانہ شخصیت سازی قائم کر دیا ہے جس میں ادیبوں کی رنگا رنگ شخصیتیں ڈھالنے کا کام نہایت خوش اسلوبی اور تیز رفتاری سے انجام دیا جا رہا ہے۔ اس کارخانے کی طرف سے ادیبوں کی شخصیات اور ادبی خدمات کے بارے میں دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کو اور ان کے ذریعہ ادیبوں کی شخصیات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اردو کی خاکستر میں کیسی کیسی چنگاریاں پوشیدہ ہیں۔

شخصیت سازی کا کام پاکستان میں بھی ہو رہا ہے مگر محدود پیمانے پر۔ یہاں چونکہ کسی ادبی صنعت کار نے کوئی کارخانہ نہیں لگایا، اس لیے فی الحال یہ کام انفرادی سطح پر ہو رہا ہے۔ شائقین کو خود ہی اپنی شخصیت ڈھونڈنی پڑتی ہے اور پھر خود ہی کتابیں بھی شائع کر دیتے ہیں۔ ہندوستان چونکہ بڑا ملک ہے۔ اس لیے وہاں یہ کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

مکتبہ جامعہ کے علاوہ ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں میں بھی شخصیت سازی کو مناسب اہمیت دی جا رہی ہے۔ نظیر صدیقی اور مظہر امام جیسے بڑے ادیبوں کی شخصیات اور ادبی خدمات پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور بزور تحقیق شخصیات اور خدمات کا سراغ اسی طرح لگایا گیا ہے جس طرح بزور تفتیش مال مسروقہ برآمد کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے درجنوں تحقیقی مقالوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں جن کاموں پر سزا ہو سکتی ہے انھیں کاموں پر بعض پسماندہ ایشیائی ممالک میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی جاتی ہے۔

جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح تمام ادبی شخصیات بھی خانہ ساز یا کارخانہ ساز نہیں ہوتیں، کچھ خدا ساز بھی ہوتی ہیں اور آج ایک ایسی ہی خدا ساز شخصیت ہمارے کالم کا موضوع ہے۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے " پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ شخصیت اور ادبی خدمات۔" اس کتاب کو شاعر شہریار اور نقاد ابوالکلام قاسمی نے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ خوش قسمت ہیں کہ ان کے بارے میں یہ کتاب اردو کے دو اہم ترین اہلِ قلم نے مرتب کی ہے اور ان دو اہم ترین اہلِ قلم کے خوش قسمت ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بالآخر انھوں نے ایک سلیقے کا کام کر ہی ڈالا۔ اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ ان دونوں نے اب تک سلیقے کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ شہریار نے جدید اردو شاعری کو اور ابوالکلام قاسمی نے جدید اردو تنقید کو باثر بنانے میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں مگر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر کتاب مرتب کرنا ذرا مختلف قسم کا کام ہے جسے شعر کہنے اور تنقید لکھنے کی طرح قلم برداشتہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ساختیات اور پس ساختیات وغیرہ کی گھاٹیاں عبور کرنی پڑتی ہیں۔ تب کہیں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ پس پردہ ساختیات خوش فعلیوں کی نوعیت کیا ہے۔

کتاب کی جو چیز سب سے پہلے متاثر کرتی ہے، وہ سرورق پر ڈاکٹر نارنگ کی تصویر ہے کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اردو کے کسی ادیب کے چہرے پر ایسی مردانہ وجاہت اور ایسا عالمانہ وقار بیک وقت شاید ہی نظر آئے۔ شاید یہ تصویر دہلی کے اسی مصور نے بنائی ہے جس سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا تھا:" آپ جب کسی مرد کا پورٹریٹ بناتے ہیں تو اس میں بے مثال مردانہ وجاہت پائی جاتی ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟" مصور نے جواب دیا تھا:"میں مردوں کے پورٹریٹ شیونگ برش سے بناتا ہوں۔"

ڈاکٹر نارنگ کی شخصی وجاہت کے ہم قتیل نہیں، جمیل الدین عالی اور سلیم احمد مرحوم کا شمار بھی زخم خوردگانِ نارنگ میں ہوتا ہے بلکہ اسی بنا پر عالی و سلیم میں رقابت بھی پیدا ہوگئی تھی جس کا ذکر سلیم احمد نے ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے، "ایک ادیب، نقاد اور محقق کی حیثیت سے میں ڈاکٹر نارنگ کو برسوں سے جانتا ہوں لیکن وہ اتنے خوب صورت انسان نکلیں گے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں تو پہلی ہی ملاقات میں انھیں دل دے بیٹھا اور مفت میں بیٹھے بٹھائے عالی سے رقابت ہوگئی۔ عالی کہتے ہیں، یار تم مسلمان آدمی ہو، اس کافر کے چکّر میں کہاں پڑ گئے۔ مسلمان تو خیر میں ہوں، بہرحال اب رقابت ہے تو رقابت سہی۔ وہ مغل بچے ہیں تو اپن بھی سید زادے ہیں۔ دیکھا جائے گا۔"

مختصر یہ کہ کتاب کے سرورق پر ڈاکٹر نارنگ کی تصویر اتنی جاذبِ نظر ہے کہ کتاب کے اندر کے صفحات اگر خالی ہوتے تو بھی کتاب کی قدر و قیمت میں فرق نہ آتا۔ لوگ محض اس تصویر کی وجہ سے کتاب کو سنبھال کر رکھتے اور خالی صفحات پر دھوبی کا حساب یا اپنے پسندیدہ اشعار لکھتے۔ خوشی کی بات ہے کہ بعض ...

خالی الذہن ہو کر لکھے گئے ہیں لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا کیوں کہ ساختیاتی تنقید کے اصولوں کے مطابق اور بقول ڈاکٹر نارنگ معنی کا سرچشمہ ذہن انسانی نہیں ہے۔ ساختیات کا ادب پر یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانی ذہن کو تخلیق ادب کی ذمہ داری سے آزاد کر دیا ہے۔

خیر یہ تو سب مزاق کی باتیں تھیں اب ہم ذرا سنجیدگی سے کتاب کے مندرجات پر گفتگو کریں گے اور اس سے بھی پہلے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ آج اردو دنیا میں ڈاکٹر نارنگ کا شمار ان معدودے چند ادیبوں میں ہوتا ہے جن کا ادبی ذوق مشرق و مغرب اور جدید و قدیم کی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتا۔ وہ ہر خطے اور ہر عہد کے ادب سے یکساں دل چسپی لیتے ہیں۔ اگر صرف اردو ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ جیسی دل چسپی انھیں پونے تین سو سال پہلے کی "کربل کتھا" سے ہے ویسی ہی دل چسپی انتظار حسین کے افسانوں سے بھی ہے۔ جس توجہ کے ساتھ انھوں نے میر و انیس کا مطالعہ کیا ہے ویسی ہی توجہ ساقی فاروقی، افتخار عارف اور شہریار پر صرف کی ہے۔ جس ذوق و شوق سے انھوں نے مثنوی غزل اور مرثیے جیسی اصناف سخن کو پرکھا ہے۔ اسی ذوق و شوق سے نثری نظم کے حسن و قبح پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ادب کے ساتھ ساتھ زبان کے اسرار و رموز سے بھی ان کی آگاہی بے مثال ہے۔ اردو کا کوئی جدید نقاد ان کی طرح لسانیات سے ماہرانہ واقفیت نہیں رکھتا۔ ان کی مادری زبان اگرچہ سرائیکی ہے لیکن دلی کی کرخنداری زبان پر وہ درجۂ استناد رکھتے ہیں اور اب گزشتہ چند برسوں سے وہ ساختیات اور پس ساختیات کے حوالے سے اردو تنقید کو فکر و نظر کی جن نئی جہتوں سے آشنا کر رہے ہیں اس نے انھیں ایک رجحان ساز نقاد کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان جیسی خوب صورت نثر لکھنے والے موجودہ دور میں کم بلکہ بہت کم ہیں۔ موضوع کیسا ہی ثقیل اور فنی نوعیت کا ہو، ان کی تحریر کی شگفتگی میں فرق نہیں آتا اور یہ شگفتگی کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ لکھنے والے کے اندر سے پھوٹتی ہے۔ گویا یہ چیز ان کی نثر کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے۔

ہمارے خیال میں اتنی تعریف کافی ہے ورنہ پڑھنے والے یہ سمجھیں گے کہ ہم کالم نہیں لکھ رہے کسی کتاب کا فلیپ لکھ رہے ہیں۔ لہذا اب ہم عنانِ مرکبِ توصیف کھینچتے ہوئے اصل موضوع یعنے کتاب کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔ اس میں علی جواد زیدی، حامدی کاشمیری، محمود ہاشمی، وہاب اشرفی، حنیف کیفی، رفعت سروش، شافع قدوائی اور بعض دوسرے اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں جن میں ڈاکٹر نارنگ کی شخصیت اور تنقیدی بصیرت کی داد دی گئی ہے۔ مضمون کیا ہیں اچھی خاصی طرحی غزلیں ہیں جن میں قصیدے کا شکوہ پایا جاتا ہے اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے کہ اس قسم کے مجموعوں میں یہی کچھ ہوتا ہے اور ہونا چاہیے ورنہ ان مجموعوں کی اشاعت بے جواز ٹھہرتی ہے۔

اس کتاب میں سب سے اچھا مضمون علی جواد زیدی کا ہے۔ زیدی صاحب ترقی پسندی کے آثار قدیمہ میں سے اور ان بزرگ ادیبوں میں سے ہیں جو اپنے خردوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتے ہیں لیکن ان کا تعریف کرنے کا انداز دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ڈاکٹر نارنگ کی شخصی خوبیاں

بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "۔ وہ اچھے دوست ہیں اور اچھے مخالف ہیں۔" اچھا دوست ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اچھا مخالف ہونا کیا۔ شاید زیدی صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر نارنگ اچھے دوست اس لیے ہیں کہ دوستوں کے کام آتے ہیں۔ اچھے مخالف اس لیے کہ ان کے مخالفین میدانِ جنگ میں کام آجاتے ہیں ——

" زیدی صاحب نے ایک ادبیات بڑے مزے کی کہی ہے۔ ادب کی لنکا میں سب ہی باون گز کے ہیں ۔ .... آج ادبی لنکا میں ان (ڈاکٹر نارنگ) کی قامت کسی سے کم نہیں بلکہ بہتوں سے نکلتی ہوئی نظر آئے گی۔" معلوم نہیں زیدی صاحب نے یہ جملہ عمداً لکھا ہے یا سہواً۔ اگر سہواً لکھا ہے تو اسے ہجو ملیح کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر عمداً لکھا ہے تو زیدی صاحب نے بڑا ظلم کیا ہے۔ کوئی بھی لغت اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ "لنکا میں سب ہی باون گز کے"۔ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی مقام کے بارے میں یہ بتانا مقصود ہو کہ وہاں سب کے سب فتنہ پرداز، لاف زن، مغرور اور مفسد ہیں۔ زیدی صاحب نے تمام ادیبوں کو ۵۲ گز سے کہہ کر اور ایک کو ۵۳ کا قرار دے کر جو لنکا ڈھائی ہے۔ اس کے تصور ہی سے ہم جیسے نیاز مندانِ نارنگ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کاش کتاب کے مرتبین نے زیدی صاحب کے مضمون کو غور سے پڑھ لیا ہوتا اور ایسے تمام جملے حذف کر دیئے ہوتے جن میں نیاز مندوں کی دل آزاری کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا ہے مگر اس صورت میں یہ مضمون، [illegible] کتاب کا سب سے عمدہ مضمون نہ رہتا۔

افسوس کہ اس مختصر کالم میں کتاب کے تمام مضامین کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک مضمون ایسا ہے کہ [illegible] کے تذکرے کے بغیر ہمارا کالم ادھورا رہ جائے گا۔ بالکل اسی طرح اگر یہ مضمون کتاب میں شامل نہ ہوتا تو کتاب نامکمل رہ جاتی۔ یہ مضمون سید منظور احمد صدر شعبہ اردو جے ایس کالج میسور کا ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر نارنگ کی شخصیت اور علمی کارناموں کے بارے میں بڑی نادر معلومات فراہم کی ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے ڈاکٹر نارنگ سے اپنے تعلقات کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ "دولت کدے و دانش کدے پر بھی شرفِ نیاز حاصل کیا ہے۔ ریڈیو پر سنا ہے۔ ٹی وی پر دیکھا ہے۔ ٹیلیفون پر گفتگو کی ہے۔ دلی اور میسور میں بھی قریب سے دیکھنے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں اور مختلف مسائل پر بحث کی ہے۔ اگر آپ کو اردو برادری کا مصروف ترین آدمی کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔"

ہمارا خیال ہے کہ جتنے مصروف ڈاکٹر نارنگ ہیں اس سے زیادہ مصروف تو مضمون نگار ہیں جو ڈاکٹر نارنگ کی ہر حرکت پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک کالج میں پڑھاتے بھی ہیں۔ اور پھر ڈاکٹر نارنگ پر مضمون لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں اور اس مضمون میں موضوع کی علمی خدمات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں "گوپی چند نارنگ کی مطبوعات نہ صرف مستند اور معیاری ہوتی ہیں بلکہ بہترین گیٹ اپ، عمدہ کتابت اعلا طباعت کے لیے کافی مشہور ہیں۔ ان کی دیدہ زیب، جاذبِ نظر اور خوب صورت تخلیقات دیکھ کر

خوشی ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔ آپ اور آپ کی اہلیہ محترمہ دونوں بڑے فیاض اور مہمان نواز ہیں لیکن کتابیں دوسروں کو دینے میں بڑے محتاط ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی اور قیمتی کتابیں سب کی نذر نہیں کی جاسکتیں۔ کتابوں کی تقسیم میں بخل سے کام لینے والوں کو فیاض کہنا خود کہنے والے کے فیاض ہونے کی دلیل ہے۔ آگے کا قصہ یہ ہے کہ جب سید منظور احمد کو یقین ہوگیا کہ ڈاکٹر نارنگ اپنی تصانیف تحفۃً عنایت نہیں فرمائیں گے تو انھوں نے خود ہی حاتم کی قبر پر لات مارنے کا ارادہ کیا اور ڈاکٹر صاحب کی کتاب اردو افسانہ، روایت اور مسائل، خریدنے پر کمر ہمت باندھ لی۔ آگے کا قصہ انھیں کی زبان میں یوں ہے:

"میں نے ناشر کو لکھا تو معلوم ہوا کہ اب اس کتاب کے نسخے تقریباً قریب الختم ہیں اور اس کی قیمت ۷۵ روپے سے ایک سو پچاس روپے کردی گئی ہے۔ علاوہ محصول ڈاک کے۔"

سید منظور احمد کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے ہم ڈاکٹر نارنگ سے گزارش کریں گے کہ انھوں نے اپنی مذکورہ کتاب کا جو نسخہ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو تحفۃً پیش کیا تھا، وہ ان سے واپس لیکر سید صاحب کی خدمت میں پیش کردیں۔ موصوف نے اپنے مضمون سے یہ ثابت کردیا کہ وہ مجتبیٰ حسین سے بہتر مزاح نگار ہیں، اس لیے تحفے میں ملنے والی کتاب کے ان سے زیادہ مستحق ہیں۔

اُلّو

محبوب مانبھومی
بلاسپور (مدھیہ پردیش)

(خواجہ حسن نظامی کے مضمون "اُلّو" سے متاثر ہو کر)

قدرتی شاہکار ہے اُلّو — شانِ پروردگار ہے اُلّو
سچ تو یہ ہے کہ دستِ قدرت کا — اک عجب شاہکار ہے اُلّو
دن کو رہتا ہے اونگتا اکثر — ہاں! شب زندہ دار ہے اُلّو
فقر و فاقہ سے اس کو نسبت ہے — کھنڈروں پر نثار ہے اُلّو
نعرہ اس کا ہے حق اللہ ھُو — بڑا پرہیزگار ہے اُلّو
عقل و دانش کا ہے حسیں پیکر — بزرگوں میں شمار ہے اُلّو
مفت منحوس لوگ کہتے ہیں — بے ضرر جاندار ہے اُلّو
ہے یہ اردو محاوروں کا امیں — وجہ صد افتخار ہے اُلّو
علمِ سفلی سے جن کو ہے نسبت — ان کی "جانِ بہار" ہے اُلّو
جادو ٹونے کی اس کو جاں کہیئے — جادوگر کا "وقار" ہے اُلّو
پاک کرنا ہے گندگی سے جہاں — جانِ لیل و نہار ہے اُلّو
پیٹ بھرتا ہے جانے کتنوں کا — وجہِ روزگار ہے اُلّو

الغرض ہے بڑے ہی کام کا یہ
کیا کہوں چیز کیا ہے یار اُلّو

○

غرورِ حسن

محمود شریف محمود
حیدرآباد

اپنے گھونگھٹ کو اُٹھا کر دیکھ اِدھر اُس نے کہا — پھر مجھے پھیکا لگے حسنِ قمر اُس نے کہا
میرے عاشق آئے گا اب کچھ محبت کا مزہ — شوخ نظروں سے کلیجہ کاٹ کر اُس نے کہا
میں جو بولا تیرے ہاتھوں پر نہیں رنگِ حنا — چاہیئے ان کو ترا خونِ جگر اُس نے کہا
نرم و نازک انگلیوں پر زندگی بھر ناچنا — ہے اگر مجھ کو بنانا ہم سفر اُس نے کہا
بول قاضی سے پڑھا کر اس کو جب اپنا لیا — اب مزہ آئے گا دیکھو عمر بھر اُس نے کہا
شاعری میں کس قدر تو کھو گیا ہے رات دن — مجھ سے کتنا ہو چکا ہے بے خبر اُس نے کہا

تیری یہ محمودؔ غزلیں میری سوکن ہو گئیں
ایک دن پھینکوں گی ان کو پھاڑ کر اُس نے کہا

★

ایس ایم معین قریشی
(کراچی)

چٹ منگنی، پٹ بیاہ، جھٹ بچے

ہمارے ایک سر پھرے دوست کا کہنا ہے . . . . کہ اگر بچے واقعی قوم کا سرمایہ ہیں تو پھر اس سرمائے کو ملک کے اندر آنے سے کیوں روکا جا رہا ہے ؟ ہم نے انھیں لاکھ سمجھایا کہ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے لیکن ان کی بس ایک ہی رٹ ہے . . . . یا تو بچوں کو سرمایہ نہ کہو یا پھر قوم کے بے لوث سرمایہ کاروں کے حوصلے پست نہ کرو۔ اب ملک میں ایک ہی تو سرمایہ کاری رہ گئی ہے۔ تم لوگ اس کے بھی پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ آخر کب تک ایم ایف زیور بہلتے رہو گے ؟

ہمارے ان دوست کا یہ بھی موقف ہے کہ ہر شخص ہر شئے کی کثرت سے نہیں گھبراتا اور پھر بچے تو یقین محکم اور اس سے بھی زیادہ "عمل پیہم" کی زندہ مثالیں ہیں۔ ثبوت کے طور پر وہ راس الخیمہ کے ایک شہری سلیم جمعہ مبارک کا نام لیتے ہیں۔ متحدہ عرب امارت کے اخبار "الاتحاد" میں شائع ہونے والی ایک حالیہ خبر کے مطابق چالیس سالہ مبارک کے ستائیس بچے ہیں اور ابھی اس کے حوصلے بلند ہیں وہ سینچری بنا کر "محبت فاتح عالم" کے پیغام کو مکمل کرنا چاہتا ہے۔ مبارک ایک مسجد میں موذن ہے اور اس کی مالی حیثیت بھی کمزور ہے لیکن وہ ایک عملی انسان ہے محض اذانوں پر گذارے کا قائل نہیں بلکہ ٹھوس کام کرتا ہے۔ اپنی "ملت بیضا" کو بیضہ مرغ کھلا کھلا کر پالتا ہے۔

ہمارے مذکورہ بالا دوست عین اسی دن یہ بے تکی باتیں کر رہے تھے۔ جب خدا کے بندے دنیا بھر میں خاندانی منصوبہ بندی کا دن منا رہے تھے۔ بیویوں کی تعداد کے مسئلے پر بھوا ہمارے اور ان کے نظریات میں ایک اور چار کا تضاد ہے۔ ہمارا کہنا ہے کہ آج کل ایک نہیں سنبھلتی۔ اچھے خاصے گھر کو "اڈیالہ جیل" میں تبدیل کر دیتی ہے پھر بھلا کون دوسری اور تیسری کے ہاتھوں کھلم کھلا دہشت گردی کو دعوت دے گا ؟

ہم نے دو سیاست دانوں کا ایک مکالمہ خود اپنے گنہگار کانوں سے سنا ہے۔ دونوں میں کسی اہم مسئلے پر جھڑپ ہو رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سچی سچی باتیں کہہ رہے تھے۔ غداری تک کے الزامات لگائے جا رہے تھے بالآخر ایک نے جھلا کر کہا "میں خوب جانتا ہوں تم کس کے اشارے پر ناچتے ہو"۔ اس پر دوسرے نے آنکھیں نکالتے ہوئے تنبیہ کی "دیکھو سیاست میں بیویوں کو مت گھسیٹو"!

واقعی یہ عورت کی حکمرانی کا دور ہے شوہر کتنا ہی با اختیار اور "زردار" کیوں نہ ہو، فرماں برداری سے بیوی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یہ فرماں برداری جتنی کم ہو بہتر ہے۔ تاہم ہمارے دوست اس سے اتفاق نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ جو بیویوں اور بچوں سے ڈرتا ہے اس کا ایمان کمزور ہے اور جس کا ایمان کمزور ہے...... وہ بس پورا کا پورا کمزور ہے۔ آخر راس الخیمہ کے موذن مبارک کے ساتھ یہ مسئلہ کیوں نہیں؟ اس نے بارہ سال کی عمر میں شادیوں کا مبارک سلسلہ شروع کیا تھا اور چالیس سال تک وہ گیارہ شادیاں کر چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک وقت میں اس نے صرف چار بیویوں پر قناعت کی لیکن وہ بڑی حسرت کے ساتھ اپنے اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اگر شرعی کوٹے میں اضافے کی گنجائش ہوتی تو وہ اس کے مطابق اپنا حق رائے دہی ضرور استعمال کرتا۔ نکاح پڑھواتے پڑھواتے اس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ سوتے میں بہکتا بھی ہے تو یہی کہتا ہے کہ "قبول کیا میں نے۔ قبول کیا میں نے!"

عربوں کے بارے میں ہمارے دوست کی رائے ہے کہ وہ بڑے وسیع القلب اور "عریض الحرم" ہوتے ہیں۔ بیویوں اور بچوں کو بار نہیں سمجھتے۔ اس لیے ان کی تعداد پر کسی بار (پابندی) کے روادار نہیں۔ بقول ہمارے دوست یہ اسی فراخ دلی کی برکت ہے کہ جب کبھی شیوخ کسی مغربی ملک کے دورے پر جاتے ہیں تو قافلہ حرم میں شمولیت کی خواہش مندان پر ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوتی ہیں۔ پھر ہمارے دوست نے پرجوش لہجے میں اقبال کا یہ شعر پڑھا:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ہم نے پوچھا کس کی تقدیریں؟ بولے بیویوں کی اور کس کی؟ ماضی کے ایک عرب حکمراں کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ ان کی بیگمات تو بے شمار تھیں لیکن اولادیں صرف پچاس تھیں۔ یہ اطلاع بہم پہنچا کر موصوف نے اس پر تبصرہ کیا۔ اس کثرت اولاد کے معاشی فیوض پر غور کرو۔ پچاس عدد بچوں کی خدمت پر کم از کم پانچ سو افراد تو ضرور ساموں ہوں گے۔ گویا شہزادے اور زادی نے دس غریبوں کو روزگار مہیا کیا۔ اگر بادشاہ سلامت خدانخواستہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کر لیتے تو روزگار کی یہ پانچ سو آسامیاں کہاں سے میسر آتیں؟ اور اگر امیروں کی دیکھا دیکھی کہیں غریب غربا بھی ضبطِ تولید کی غلطی کر بیٹھیں تو بے چارے صاحب حیثیت لوگوں کو اپنے بنگلوں، فیکٹریوں ملوں اور مربعوں کے لیے سستی افرادی قوت کہاں سے فراہم ہو گی؟ سب جانتے ہیں کہ اگر افرادی قوت مہنگی ہو گی تو اس کے نتیجے میں قیمتیں بڑھیں گی اور اس کا اثر بھی

آخرکار غریب غربا ہی پہ پڑے گا۔

پس ثابت ہوا کہ حرکت میں برکت ہے اور یوں بھی جو خود دنیا میں آچکا ہے اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے آنے والوں کی انٹری بینڈ کردے؟

اپنے دوست کے یہ عجیب و غریب ارشادات تمسخر آمیز طنز کے ساتھ سن کر ہم نے اعداد و شمار کا سہارا لیتے ہوئے انھیں بتایا کہ کینیا میں ہر عورت کے یہاں اوسطاً ۸ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں ۶ء۳، بھارت میں ۴ء۲ ، اور پاکستان میں ۶۔ اس وقت دنیا کی آبادی ۵ ارب ۷۵ کروڑ ہے اور اگر یہ اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو ۲۰۵۰ میں ۱۴ ارب تک پہنچ جائے گی۔ زمین پر تل دھرنے کو جگہ نہیں ملے گی۔ ہمارے دوست نے بات کاٹتے ہوئے کہا میاں مجھے افریقی اور ایشیائی عورتوں کی صلاحیتوں پر فخر ہے۔ جن کی بدولت ہم نہ صرف اپنے کام خود کر لیتے ہیں بلکہ باہر جاکر بھی چھوٹے موٹے کاموں میں بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ پھر علامہ اقبال یاد آگئے کیا خوب کہہ گئے ہیں: ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے ؛ آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اس کے بعد وہ بھی اعداد و شمار پر اتر آئے کہنے لگے "ریڈرز ڈائجسٹ" کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق اگر دنیا کے تمام انسانوں کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو وہ ایک دوسرے کو چھوئے بغیر صرف چار سو مربع میل جگہ میں آسانی سے سما سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آبادی کی وجہ سے اللہ کے بندوں پر اللہ کی زمین تنگ ہو رہی ہے۔

ہم نے کہا ٹھیک ہے کھڑے تو ہو گئے لیکن کھائیں گے کیا؟ بیویوں کے کوسنے؟ اتنی ملازمتیں آسمان سے ٹپکیں گی؟ بیماروں کا علاج کیسے ہوگا؟ اسی لیے تو ہماری حکومت کا نعرہ ہے کہ دو بچے ہی اچھے۔ یہ سن کر ہمارے دوست نے ہماری نرم و نازک ران پر ایک زوردار چپت رسید کرتے ہوئے پروفیسر اقبال عظیم کا یہ شعر پڑھا: تم نے پیغام کا مفہوم غلط سمجھا ہے ؛ مقصد صاحب پیغام کو الزام نہ دو

ہم نے ایک ران کو سہلاتے اور دوسری کو بچاتے ہوئے ان سے عرض کیا اچھا تو آپ ہی اس کا مفہوم سمجھا دیجیے۔

فرمایا اس کا سیدھا سادا مطلب یہ کہ ایک وقت میں آپ کے گلشن میں دو سے زیادہ پھول نہ کھلیں۔ بس اس حساب سے چلتا چاہیں دو کا پہاڑہ پڑھتے رہیں اور یہ دو بھی اس لیے کہے گئے کہ اگر ان میں سے ایک خدا نہ کرے دانشور نکل آئے تو دوسرا گھر کا خرچ چلا سکے۔ یہ نعرہ دانشوری اور میدانِ عمل کے درمیان توازن قائم کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اگر اس کا مطلب وہ ہے جو آپ کے تخریب کار ذہن میں ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہوا کہ جو ہمارے سیاہ و سفید کے مالک ہیں ان کی پرورش تو دو کے بعد بھی جاری ہے اور ہم جیسے خاک نشینوں کی گاڑی دو پر آکر رک جائے؟ اور آخری بات یہ ہے کہ بالفرض دو اچھے بچوں کے بارے میں آپ کی بات صحیح ہے تو مجھے ممتاز مزاحیہ شاعر (سعید آغا) کے اس سوال کا جواب دیجیے جو انھوں نے اپنے ایک قطعہ میں اس طرح کیا ہے کہ:

اک ایسا ایڈ دیکھا ہے مرے بچوں نے ٹی وی پہ
عجب تشویش میں ہوں میں کہ میرے چار بچے ہیں
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کون سے والے ہیں دو اچھے
حکومت کا ہے یہ نعرہ کہ دو بچے ہی اچھے ہیں

●

مرزا کھونچ
بیتیا (بہار)

غم زدہ ہوں میں

کھلاؤ اور پلاؤ کہ غم زدہ ہوں میں
مشاعرے میں بلاؤ کہ غم زدہ ہوں میں

کمائی کچھ نہیں اپنی یہی سہارا ہے
بہت امید سے میں نے تمہیں پکارا ہے
زیادہ اب نہ ستاؤ کہ غم زدہ ہوں میں
مشاعرے میں بلاؤ کہ غم زدہ ہوں میں

پچاس دے نہیں سکتے پچیس دے دینا
چلو ہٹاؤ تم اپنے ہو بیس دے دینا
ابھی تو بیڑی پلاؤ کہ غم زدہ ہوں میں
مشاعرے میں بلاؤ کہ غم زدہ ہوں میں

مشاعرے کا ترنم ہے میرا بالکل فٹ
مجھے یقین ہے ہو جاؤں گا میں سوپر ہٹ
بندھاؤ آس بندھاؤ کہ غم زدہ ہوں میں
مشاعرے میں بلاؤ کہ غم زدہ ہوں میں

زمیں پہ رہ کے فلک پر کمند رکھتا ہوں
میں اپنے ساتھ ہی گرگے بھی چند رکھتا ہوں
نہ مجھ پہ تاؤ دکھاؤ کہ غم زدہ ہوں میں
مشاعرے میں بلاؤ کہ غم زدہ ہوں میں

اسلم مرزا
اورنگ آباد

غزل

دوکان میں گھسا تھا وہ پوشاک مارنے
حلیہ بگاڑ ڈالا خطرناک مارنے

لکھتے ہیں کیا رقیب اسے خط میں، دیکھئے
چپکے سے ہے ٹپہ خانہ چلو ڈاک مارنے

پڑھنا پڑھانا کچھ نہیں مشہور ہے یہی
کالج وہ صرف جاتا ہے اب ٹاک مارنے

کیوں عاقبت کے خوف کی پرواہ کیجئے
پیدا ہوا ہوں وقف کی املاک مارنے

جب آنکھیں مار مار کے بینائی مرگئی
اس کی گلی میں جائیں گے ہم ناک مارنے

کیا چین سے گزارے کوئی زندگی میاں
افلاس سر پہ بیٹھا ہو جب خشاک مارنے

راکٹ تو جا چکے ہیں کئی سوئے ماہتاب
اب اس غزل کو بھیجئے افلاک مارنے

**

مشتاق مدنی
(پونا)

ٹی۔ وی۔ سیریلس

اوروں کو کیا الزام دیں، خود ہماری زندگی ٹی۔ وی سیریلس کے الیکٹرونک پنجوں میں اس طرح اسیر و محصور ہو کر رہ گئی ہے کہ پہلے ہماری جو مصروفیات و سائل و مسائل دنیا ترتیب دیتے تھے، اب ٹی وی سیریلس ترتیب دینے لگے ہیں۔ صبح دم دروازہ کھلنے سے لے کر شب آخر بستر پر جانے تک اگر واقعتاً کوئی ہماری زندگی کو بخیر و خوبی کنٹرول کر رہا ہے تو وہ ٹی وی سیریل ہے جو ہم سب کا جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں زندگیوں میں انگریز کی طرح بغرض تجارت داخل ہوا اور رفتہ رفتہ جسم و جاں کی سلطنت پر بغیر شرکت غیرے قابض ہو گیا۔ انگریز کے خلاف پہلی جنگ آزادی بری طرح ناکام ہوئی مگر یہاں تو سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ مجاہدین خود بھی مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑ رہے تھے۔ اب بہادر شاہ ظفر پر سیریل بنانے میں جٹ گئے۔ راویانِ کذب بیان کا کہنا ہے کہ ٹی وی سیریل ہماری انفرادی اور اجتماعی قومی زندگی میں ایک قدر مشترک اور جنسِ نایاب و ناگزیر کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح سنسر بورڈ کا ہر فرد پہلے خود کسی بھی فلم کے تمام فحش اور عریاں مناظر دیکھ لیتا ہے پھر رفاہِ عامہ کے تحت اس پر قینچی چلا دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح ٹی وی سیریل پر ریویو یا تبصرہ دیکھنے والا کمال باقاعدگی و پابندی سے سیریل کے سات ساڑھے سات سو Episodes پوری دل جمعی سے دیکھ لیتا ہے۔ پھر راقم ہوتا ہے کہ یہ سیریل قومی یکجہتی کے گھٹتے جذبے کو پارہ پارہ کر کے رکھ دے گا۔

برصغیر کے عوام کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ تفریح ان لوگوں کی زندگی میں عنقا کا حکم رکھتی ہے اور مسائل تاتاریوں اور چنگیزیوں کی طرح ہلہ بولتے رہتے ہیں مگر اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ جب تک مسائل کا انبار نہ ہو برصغیر کا آدمی خود کو خدا کے قریب نہیں سمجھتا۔ بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی اس کی پیشانی، جس پر ہمیشہ عرق انفعال کے قطرے چمکتے رہتے ہیں، سجدہ صبر و شکر سے لبریز رہتی ہے مگر جہاں کوئی چوتھی

موٹی خوشی چھن چھنا کر زندگی میں داخل ہوئی۔ وہ بوکھلا جاتا ہے۔ نیا زندانے کرتا ہے۔ پیروں فقیروں کے آستانوں پر حاضری دیتا ہے کہ کہیں یہ خوشی کسی بڑی مصیبت کی تمہید اور پیش خیمہ تو نہیں) ہے مگر تفریحی مسرت کے تمام پسٹی وی سیریلس نے عام اور شریف آدمی کو گھر میں مقید کر دیا تو، بھائی، لوگوں کو لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے نت نئے راستے اور طریقے بھی سکھا دیئے۔ ہندوستان کے شہروں پر بھائیوں کی کرم فرمائیاں ویسے ہی کیا کم تھیں مگر اب یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ شریف آدمی بن کر جینے سے کہیں سہل و بہتر "بھائی" بن کر جینا ہے۔ کئی ٹی وی سیریل تو اسی موضوع کو PROPAGATE کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ غالباً اس لیے بھی کہ ان سیریلس کے پروڈیوسر زبھی بھائی لوگ ہی ہیں۔ ظاہر ہے اپنے فن و پیشہ کی تشہیر ہر ایک کا پیدائشی حق ہے۔

ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ آجکل ٹی وی کے نت نئے سیریل ہماری زندگی کنٹرول کر رہے ہیں۔ ناشتہ ہمارا "شانتی" کے سے ہوتا ہے اور شانتی کی زندگی کے کسی نہ کسی المیہ کن موڑ پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم "دیوار" دیکھتے ہوئے تناول فرماتے ہیں۔ قیلولہ ہمارا ایک دیکھتے ہوئے انجام پاتا ہے۔ جو بظاہر آزادی پر مبنی سیریل ہے مگر اس میں ہمیں آزادی کا جذبہ کم اور آزادی کا جذبہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ رات کا کھانا بھی ہم "جے ہنومان" "شکتی مان" "اوم نموشیوان" وغیرہ دھارمک سیریل دیکھتے ہوئے ہی نوش جان کرتے ہیں۔ پہلے باہر کہیں جاتے تھے تو نماز کے اوقات کے مطابق ایڈجسٹمنٹ کر لیتے تھے۔ اب یہی سیریل کے اوقات ہماری آمدورفت کا ٹائم ٹیبل متعین کرتے ہیں

خوشی کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں خود ہمارے بچے ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ انہیں ٹی وی کے تمام سیریلس کے نام "دن" اوقات" اپنی سوڈ نمبر اسلی طرح منہ زبانی یاد ہیں جس طرح ہمیں قرض خواہوں کی رقمیں، سٹیکس، بل اور بینے کی بقایا رقم ہر لمحہ یاد رہتی ہے۔

ایک مرتبہ ہم نے ایک دوست سے کہا "تم سے ایک ضروری کام ہے، کسی وقت ہم گھر پر آئیں؟

وہ بولے "جنگ" کا وقت ٹھیک رہے گا"

ہم نے پوچھا "جنگ کس وقت شروع ہوتی ہے؟"

حیرانی سے بولے "تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم جے ہنومان کے بعد!"

"اور جے ہنومان؟"

وہ ترحم آمیز لہجے میں بولے "لگتا ہے تم MAIN STREAM سے الگ زندگی جی رہے ہو۔ مین اسٹریم میں شامل ہوتا ہے تو "جے ہنومان"، "اوم نموشیوان"، "شکتی مان" کو اپنی زندگی میں رچا بسا لینا ضروری ہے۔ اس کے بغیر تمہارا وجود نامکمل، حب الوطنی ادھوری اور شہریت مشکوک ہے۔

اور اگر "ان" کے قافیہ پر سیریلس میں ٹیپو سلطان کا اضافہ کر دیا جائے؟ ہم نے چٹکی لی۔

وہ لاپرواہی سے بولے تو پھر مصرعہ بحر سے خارج ہو جائے گا۔

یہ تو ہوا ان سیریلس کا حال احوال جو دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں مگر ہم ہندوستانیوں کو GLOBALISE کرتے کے لیے مغربی انسان نے کئی ایک ایسے چینلز بھی جاری کردیئے ہیں جو حب الوطنی کے علاوہ بھی کئی اسباق پڑھاتے ہیں۔ ان میں DISCOVERY CHANNEL ہمارے بچوں کو بہت پسند ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ علم حیوانات، علم نباتات، علم فلکیات، ارضیات کے علاوہ بھی بہت کچھ DISCOVER کرنا سیکھ گئے ہیں۔ ایک روز پروگرام سے پہلے جو اشتہار دیا گیا اسے دیکھنے کے بعد پڑوس کے ایک بچے نے جس کی عمر بمشکل ۱۲-۱۳ برس ہوگی، ہم سے پوچھا:

"انکل، اگر ان لوگوں کو کنڈوم کے ہی اشتہار دینا ہے تو "تکلفات" پر اتنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟"

بچے ہی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ ایڈز کی بیماری کا جنسی بے اعتدالیوں سے گہرا تعلق ہے۔ ہم نے بچے سے دست بستہ عرض کیا کہ "میاں! تمھاری عمر میں ہم جنسی بے اعتدالی تو کجا، جنس تک نہیں جانتے تھے اور تم ہو کہ جنسی بے اعتدالیوں پر سوچ اور بول لیتے ہو" بچے نے بڑے اعتماد سے جواب دیا "انکل آپ کے بچپن کو حالی اور شبلی نے مل کر ضائع کردیا۔ ہمارا بچپن سٹیلائٹ سجا سنوار رہا ہے۔"

ہم نے بچے کی بات پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ ہماری نسل نے آوارگی میں زمانے کی سیر ضرور کی مگر جنسی اور جنسیات کے علم نافع سے محروم ہی رہے بلکہ ہماری آوارگی نے تو مشرق وسطیٰ کے شہر کے شہر کھنگال دیئے اور ان شہروں کی ہوٹلوں میں رین بسیرا بھی کیا اور اس انتظار ہی میں رہے کہ خدارا ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کوئی واقعہ پیش آجائے جو مشہور مزاح نگار کرنل محمد خاں کے ساتھ برسوں پہلے مصر میں پیش آیا تھا کہ جب اس شوخ نے آکر کمرے کا دروازہ کھولا تو اس کے ہونٹوں پہ تو مسکراہٹ تھی مگر باقی جسم پر کچھ نہ تھا۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ ہماری زندگی میں وہ سنسنی، شوخی اور تھرل شروع سے ناپید رہی جیسے غالب نے یوں کہا ہے:

شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

یہ بہر حال حقیقت ہے کہ ٹی وی سیریلس کی قومی اور بین الاقوامی بھرمار نے غبی اور نکمے سمجھے جانے والے نئی نسل کے کئی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ٹی وی اسکرین پر چمکا دیا۔ حد یہ ہے کہ حقیقی زندگی میں یکسر منفی کردار رکھنے والے افراد ٹی وی کے پردے پر نہایت مثبت کردار میں نظر آنے لگے۔ ابھی سامنے کی بات ہے کہ ہماری کالونی میں رہنے والے ایک الھڑ لڑکے جس کی چشم دراز یوں سے کالونی کی لڑکیاں عاجز تھیں اور رچل ہٹ بدمعاش یا DAMN YOU کہہ کر ہمیشہ اسکی حوصلہ افزائی کرتی تھیں اچانک اسکی نگاہ کرم کی محتاج نظر آنے لگیں۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ ایک دھارمک سیریل میں اسے ہیروئن کی سب سے کمتر لونڈی کے باپ کا رول ملا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ وہ بدمعاش ہر وقت چہرے پر سفید داڑھی لگائے خوب صورت لڑکیوں سے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتا نظر آنے لگا۔ کئی ایک تو اس کے پیر تک چھونے لگ گئیں۔ اس آشیرواد کے عوض وہ کچھ۔ کچھ بھی دے آتا

ڈاکٹر شمیم ثریا
پرنسپل بی بی رضا کالج گلبرگہ

باتیں کچھ علیگڈھ کی

علی گڈھ کو ہم صرف اسی واسطے سے جانتے تھے کہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر بڑی جد و جہد سے یہاں ایک کالج قائم کیا تھا جو ابتدا میں تو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کہلایا لیکن بعد میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی بن گیا۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں تو ہماری ساری معلومات یا تو کتابوں سے ماخوذ تھیں یا پھر اخبارات کی ان خبروں پر مبنی تھیں جس میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کسی نہ کسی مسئلہ کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ تو بھلا ہو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا جس نے کالج کے اساتذہ کے لیے ریفریشر کورس میں شرکت لازمی کردی ہے اور ہر مضمون کا استاد اس بات پر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ ترقی یا تنخواہ میں اضافہ کے لیے اس شرط کو پورا کرے۔ ہم نے بھی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے اکیڈیمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر ایچ۔ اے۔ ایس جعفری کے نام ۹/مارچ سے ۴/اپریل ۱۹۹۸ء تک منعقد ہونے والے اردو ریفریشر کورس کے لیے درخواست بھیج دی۔ وسط مدتی انتخابات کی عنایت سے گلبرگہ یونیورسٹی کے سالانہ امتحانات کی تاریخ آگے بڑھ گئی تھی اس لیے ہمارا علی گڈھ جانے کا ارادہ پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ جس دن ہماری درخواست کی منظوری کی اطلاع ملی ہم ایک خوش گوار کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ ایک تاریخی یونیورسٹی کو دیکھنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ رہا تھا جو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ ڈائرکٹر کے مراسلے کے ساتھ جو بروشر Brochure ہمیں ملا اس میں اکیڈیمک اسٹاف کالج کا محل وقوع۔ اسٹیشن سے اس کے فاصلے وغیرہ کی تفصیلات درج تھیں جس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ کالج پہنچنا کوئی مشکل مرحلہ نہیں ہے۔

۷/مارچ کی صبح ہم کرناٹک اکسپریس سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے اور دوسرے دن دوپہر میں دہلی پہنچے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ دہلی سے علی گڈھ کے لیے دن بھر میں مختلف ٹرینیں چلتی ہیں اس لیے ریزرویشن

جیسے تکلف کی ضرورت نہیں ہے ۔ نئی دلی سے پرانی دلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو عوام کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ بکنگ کی کھڑکیوں کے آگے لمبی لمبی قطاریں موجود تھیں ۔ ٹکٹ نکالنا ایک جوکھم تھا۔ ایک خاتون سے ہم نے درخواست کی کہ وہ اپنے ساتھ ہمارا بھی ٹکٹ لیں ۔ کمپیوٹر سسٹم کی بدولت ایک ہی ٹکٹ پر تین نام درج ہوئے تیسرا اس خاتون کے شوہر کا تھا۔ تینوں کو ایک ہی ٹکٹ پر سفر کرنا تھا اس لیے ہم اس خاتون کا ہاتھ تھامے پلیٹ فارم پر چلے آئے جو اپنے شوہر کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ ٹرین کی آمد آمد تھی ۔ لوگ سر پر لوہے کے صندوق اور ہاتھوں میں بھاری بھرکم سامان لیے ٹرین کے آتے ہی ٹوٹ پڑے۔ لگتا تھا مہاجرین کی ٹرین آئی ہے ۔ وہ دھینگا مشتی مچی کہ ایک کانسٹیبل کو لاٹھی چارج کرنی پڑی۔ اس دھکا پیل میں خاتون کا ہاتھ ہم سے چھوٹ گیا۔ وہ ڈبے میں سوار ہوگئیں اور ہم پلیٹ فارم پر رہ گئے ۔ خدا کا شکر تھا کہ ہم صحیح سلامت موجود تھے ۔ یہ صورت حال دیکھ کر مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے جو ہمارے ساتھ موجود تھے یہ مشورہ دیا کہ پانچ بجے والی لوکل سے ہم علیگڈھ چلے جائیں ۔ لہٰذا ہم لوکل سے رات کوئی آٹھ بجے علی گڈھ پہنچے۔ اسٹیشن سے سائیکل رکشہ لیا۔ اور اسے اکیڈیمک اسٹاف کالج چلنے کہا۔ مطلوبہ مقام پر پہنچے تو برقی سربراہی مسدود تھی۔ اندھیرے میں ایک سنسان وقدیم عمارت نظر آئی جس کے پورچ میں دو سائے کھڑے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہمیں ان کے بھوت ہونے کا گمان تھا پھر بھی ہمت جٹا کر پوچھ ہی لیا کہ "کیا یہی اکیڈیمک اسٹاف کالج ہے۔ ایک بھوت نے اثبات میں جواب دیا۔ (بھلا بھوت ہاتھ آئے شکار کو چھوڑتے ہیں !!) ہم نے رکشہ سے اپنا سامان اٹھایا اور اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں ٹیبل پر بیٹھے ایک صاحب موم بتی کی روشنی میں نوواردان سے جوائننگ رپورٹ حاصل کر رہے تھے ۔ ایک چپراسی نے ہمارا سامان لیا اور اس پُراسرار عمارت کے عقبی حصے کی طرف ہمیں لے چلا۔ ہم آیت الکرسی کا ورد کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی غور کر رہے تھے کہ کہیں اس کے پاؤں کی انگلیاں پیچھے اور ایڑی سامنے تو نہیں۔ بائیں جانب گھومنے پر ایک زینہ تھا جس سے گزرنے پر ہمیں چند کمرے نظر آئے ۔ چپراسی نے ایک کمرے میں ہمارا سامان رکھا اور بتایا کہ ہمیں یہیں قیام کرنا ہے۔ کمرے میں ایک کمزور بجلی کا بلب اندھیرے سے نبرد آزما تھا اور ہر دم لگتا تھا کہ میدان چھوڑ دے گا۔ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو چند سلسلہ وار پلنگ ایک دوسرے کے مقابل نظر آئے ۔ ان میں سے ایک پر خاتون موجود تھیں ۔ جان میں جان آئی کہ کوئی ہم جنس بھی موجود ہے ۔ لیکن کیا معلوم کہ یہ بھی کوئی ...... ہمارے بدن میں جھرجھری آگئی ۔ ہم نے آزمانے کے لیے سلام کیا۔ جواب میں "وعلیکم السلام" کی آواز سن کر ڈھارس بندھی ۔ سفر کی تکان اور بھوک سے برا حال تھا ۔ میں نے ان خاتون سے کہا کہ کیا آپ میرے ساتھ کسی قریبی ہوٹل تک چل سکتی ہیں ؟ وہ آمادہ ہوگئیں بلکہ ہوٹل تک انھوں نے ہماری رہنمائی کی ۔ دال ، چپاتی ، آلو کی سبزی ہم نے گلے سے اتاری ۔ بدمزہ پانی پیا اور سوچنے لگے اگر اسی قسم کا کھانا ہمیں ملتا رہا تو شاید دو دن بعد ہی ہم اپنے گھر لوٹ جائیں گے۔ کھانے کے بعد ہم نے اپنے خیریت سے علیگڈھ پہنچنے کی اطلاع بذریعہ فون گھر والوں کو دی اور پھر مجتبیٰ حسین کو بھی جنھوں نے ٹرین پکڑنے کی مہم میں ہمارا

ساتھ دیا تھا۔

کمرے پر پہنچے تو بلب کی آنکھ مچولی جاری تھی اور پلنگوں پر موجود خواتین میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بلکہ جس پلنگ پر ہم نے اپنا سامان رکھا تھا اس پر بھی کسی اور نے قبضہ جمالیا تھا۔ قانون کی کتابوں میں "بے نامی" کی اصطلاح ایسی ہی زمین جائیداد کے لیے استعمال ہوتی ہوگی۔ ہم نے قبضہ خالی کروایا اور ثبوت میں اپنا سامان پیش کیا جو وہاں رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ خواتین زیادہ ہیں اور بستر کم۔ ہماری حالت اتنی خستہ تھی کہ آبادی کے اس مسئلہ کے حل کو دوسروں پر چھوڑ کر ہم نے آنکھیں موند لیں مگر یہ کیا؟ مچھروں نے ہمیں نہتا دیکھ کر یلغار کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ علی گڈھ آنے والے کیل کانٹے سے لیس ہو کر یعنی مچھر دان اور مچھر مار ٹکیہ کے ساتھ علیگڈھ آتے ہیں۔ اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ہم رات بھر اپنا خون مچھروں کو دان کرتے رہے۔ اپنے گھر سے دور، نرم و ملائم بستر سے محروم، علی گڈھ کی سرد رات ہم نے جوں توں کاٹی۔ پانچ بجے صبح غسل خانے میں داخل ہو گئے تاکہ مچھروں کے کاٹنے سے جو سوزش ہو رہی تھی اسے نہا کر دور کر لیں۔ نہا کر آئے تو ساتھی لکچررز بیدار ہو چکی تھیں۔ کمرے کی روشنی ٹھیک ہو چکی تھی آٹھ بجے سب کو نیچے موجود رہنا تھا جہاں اکیڈیمک اسٹاف کالج کی وین افتتاحی جلسے کے لیے تمام شرکاء کو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ تک لے جانے والی تھی۔ نیچے اترنے پر زاہد علی خاں اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈیمک اسٹاف کالج اور خورشید احمد کورس کوارڈینیٹر سے تعارف ہوا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے بیاچ میں جتنے اردو اساتذہ ہیں اس سے قبل کبھی اکٹھا نہیں ہوئے تھے۔ کوئی بائیس تو ریاست کرناٹک کی نمائندگی کر رہے تھے جنھیں دیکھ کر ایک احساس تفاخر دل میں جاگا کہ اردو شعبے بہت سارے کالجوں میں موجود ہیں۔

ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ میں ایچ۔ اے۔ ایس جعفری خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف ڈائرکٹر اکیڈیمک اسٹاف کالج ہیں بلکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار، کنٹرولر آف اکزامنیشن بھی ہیں۔ بالکل ٹھیک وقت پر انھوں نے پروگرام کا آغاز کر دیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ وقت کی پابندی اور ڈسپلن علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات حیرت ناک تھی۔ ہماری قوم تو سستی اور کاہلی کے خمیر سے بنی ہے۔ یہاں تک کہ سرسید کو کہنا پڑا تھا" ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا تو اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے۔

اساتذہ کی قوم جو برسوں پرانے نوٹس کئی نسلوں کو پڑھانے کے لیے بدنام ہے۔ علی گڈھ میں وہ بھی بڑی چاق و چوبند نظر آئی۔ ہر سینیر و جونیر استاد مطالعہ کے ساتھ ساتھ ادبی کاوشوں کو بھی جاری رکھتا ہے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں لگا کہ اردو شعر و ادب میں تجربے اور تحقیق کا کام اس لیے جاری ہے کہ علیگڈھ کے سے دانشور موجود ہیں اور دانش وروں کی یہ دلچسپی اس لیے برقرار ہے کہ ہم جیسے طفل مکتب ان کی طبع کو مہمیز لگانے کے لیے موجود ہیں۔ بھلا قاری و سامع کے بغیر کوئی ادبی کارنامہ اپنی اہمیت منوا سکتا ہے؟ جب بھی ہم کلاسوں سے فارغ ہوتے تو کچھ دیر آرام کے بعد علی گڈھ کی دریافت کے لیے نکل پڑتے

یہ مشغلہ اس لیے بھی جاری تھا کہ کوئی بھی سائیکل رکشہ ہمیں پانچ، چھ روپے کے عوض بخوشی بازار اور دیگر مقامات پہ جانے پہ آمادہ ہو جاتا۔ نہ یہاں آٹو رکشہ والوں کے ناز نخرے تھے نہ ہی کاروں، اسکوٹروں اور دیگر گاڑیوں کی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں۔ پیدل جائیے، سائیکل پہ جائیے یا پھر رکشہ سے جائیے آپ کی سماجی حیثیت پہ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کسی جلسہ میں مہمانِ خصوصی سائیکل رکشہ سے اتریے تو یہاں لوگ اسے نہ تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے اور نہ ہی استقبال یوں کریں گے جیسے کسی غلط آدمی کو مدعو کر لیا ہو۔ بلکہ یہاں تو رکشہ سے اترنا بھی ایک اعزاز ہی محسوس ہوتا ہے۔ علیگڈھ کی سائیکل رکشہ ہے بھی خوب چیز اس میں آپ دونوں پاؤں دراز کر کے پھسلواں سیٹ پہ آرام دہ پوزیشن میں ناہموار سڑکوں، گندے گلی کوچوں اور تنگ بازاروں سے بہ آسانی گزر سکتے ہیں۔ ریاستی حکومت نے بھی شاید سوچ رکھا ہے کہ یہاں رکشہ کی بجائے آٹو یا سٹی بسیں چلیں تو سڑکیں تعمیر کرنی پڑیں گی۔ ڈرینیج سسٹم درست کرنا ہوگا۔ اسٹریٹ لائٹس کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ چیزوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

علی گڈھ کی ایک اور قابلِ ذکر بات اس شہر کی دو واضح حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ وہ جس میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور اس سے متعلق آبادی ہے۔ یہاں علم ہے، دانش ہے، درسگاہیں ہیں، سکون ہے۔ دوسرا حصہ وہ جہاں کاروبارِ حیات کے سارے ہنگامے موجود ہیں۔ تجارت ہے، جہالت ہے۔ غربت ہے، مصیبت ہے۔ شہر کی یہ تقسیم بھی ویسی ہی محسوس ہوتی جیسی معاشیات میں خطِ غربت سے اوپر اور خطِ غربت سے نیچے کی ہوتی ہے اور یہ تقسیم ان دونوں حصوں کو ملانے والا اوور ہیڈ برج ہے۔ پل کے اس پار کی تہذیب پل کے اُس پار کی تہذیب سے کوئی میل نہیں کھاتی چونکہ ہمارا زیادہ تر تعلق پل کے اس پار یعنی علی گڈھ یونیورسٹی کیمپس سے رہا اس لیے یہاں کی کچھ اور اہم باتیں ہم آپ کو بتاتے چلیں۔ یونیورسٹی کے ڈسپلن کا ذکر تو ہم کر ہی چکے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال ہمارے سامنے ایسے آئی کہ حسنِ اتفاق سے ۲۷ر مارچ ۱۹۹۸ء کو سرسید احمد خاں کی سوویں برسی منائی گئی۔ ایک دن قبل یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ صبح نو تا دس کلاس میں شرکت کے بعد سرسید ہاؤس پہنچ جائیں جہاں جلسہ کا انعقاد عمل میں آئے گا۔ وقت کی پابندی کا اندازہ تو ہمیں تھا ہی لہٰذا ہم بروقت جلسہ گاہ پہنچے۔ دیکھا کہ تمام اساتذہ، طلباء و طالبات جوق در جوق چلے آ رہے ہیں۔ اس جلسہ میں اعلان ہوا کہ سرسید کی یاد میں محکمۂ ڈاک نے اسپیشل ٹکٹ اور لفافہ جاری کیا ہے۔ خواہشمند حضرات و خواتین اسی مقصد سے کھولے گئے کاؤنٹر سے اُسے حاصل کر سکتے ہیں۔ جلد ہی کاؤنٹر کے آگے لمبی قطار لگ گئی۔ استاد اور شاگرد ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ کئی ضعیف العمر پروفیسر بھی قطار میں کھڑے ہوئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کیا ان کا کوئی ریسرچ اسکالر نہیں ہے جو ٹکٹ لا دے؟ ہمارے پروفیسر تو ایسے چھوٹے موٹے کام اپنے ریسرچ اسکالر سے ہی لیا کرتے ہیں بلکہ ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ گائیڈ کے گھر کا سودا لانا بھی انھیں کے ذمہ ہوتا ہے۔ علی گڈھ کی یہ کایا پلٹ ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ جلسہ گاہ سے لوٹتے [illegible] کیا کہ آج سرسید کی سوویں برسی کا دن ہے۔ چھٹی ہوئی۔ خوب آرام کریں گے۔ لیکن ہم آنکھ بھر سوئے بھی [illegible] تھے کہ چپراسی کی پکار نے ہمیں جگا دیا۔

"اُٹھو !" کلاس ہو رہی ہے"...... آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے تو دیکھا دیگر ساتھی بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل رہے ہیں۔ موڈ نہ ہونے کے باوجود کلاس میں پہنچے۔ جہاں Resource Person موجود تھے۔ یونیورسٹی کو کوئی چھٹی نہ تھی۔ ہمارا ملک چھٹیاں منانے میں مشہور ہے۔ حساب کیا جائے تو ہر تعلیمی سال میں مہینہ بھر تو مختلف چھٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ اس دن علی گڈھ ہمیں ملک سے باہر لگا۔

ایسی ہی ایک غیر معمولی چیز ہم نے محسوس کی وہ تھی علی گڈھ میں لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ میل جول کا فقدان۔ گرلز کالج کی عمارت اور اس کی چہار دیواروں کی وہی شکل ہے جیسے عام طور پر ہمارے ہاں جیلوں کی ہوتی ہے۔ سخت سکیوریٹی موجود ہے۔ لڑکیوں کے ہاسٹل بھی لڑکوں کے ہاسٹل سے بالکل الگ تھلگ رکھے گئے ہیں۔ باہر سے یہ ہاسٹل کم اور گھر زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ جبکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ رہا ہے کہ لڑکیوں کا ہاسٹل باہر موجود لڑکوں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ لڑکے اپنی ٹو وہیلر زپر ہمیشہ "منتظر دیدار" ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کیمپس میں جب تک کینٹین اور درختوں کے سائے میں طالب علموں کے جوڑے "انتہائی اہم باتوں" میں مصروف نہ دکھائی دیں کیمپس کو کیمپس ہی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی روکھی پھیکی یونیورسٹی ہم نے پہلی بار دیکھی۔

تقریباً ایک ماہ کا عرصہ علی گڈھ میں گزار کر ہم اپنے مقام پر کچھ کھٹی اور کچھ میٹھی یادوں کے ساتھ لوٹے تو یہ احساس ہوا کہ ریفریشر کورس کی معلومات اپنی جگہ لیکن جس کلچر کی معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں وہ کسی دریافت سے کم نہیں اور جب تک یہ کلچر ہمارے ملک کے کسی ایک گوشہ میں باقی ہے۔ ہندوستان کی شناخت بھی باقی ہے ●●

محمد اسد اللہ
(ناگپور)

ادب برائے ریڈیو

ادب اور ریڈیو کا تعلق ریڈیو سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ یہاں ریڈیو سے مراد ہمارا وہ پرانا ریڈیو ہرگز نہیں جو جنگلو ریڈیو میکنک کی دکان میں جلاوطنی کے پانچ سال گزار کر لوٹا ہے اور اب حشرات الارض کا بسیرا ہے۔ جس میں ایک ہی مقام پر دو اسٹیشنوں کی جدید و قدیم آوازوں کا سنگم نشر ہوتا ہے۔ کہیں کی نظم اور کہیں کی نثر مل کر نثری نظم کا لطف پیدا ہو جاتا ہے اور جسے ڈھولک کی طرح تھاپ دی جائے تو ہوش میں آکر جوش کے ساتھ کچھ آوازیں اپنے زندہ ہونے کے ثبوت میں اگل دیتا ہے اور پھر دھیرے سے کچھ اس طرح کوما میں چلا جاتا ہے جیسے زندگی سے معنویت رخصت ہو گئی ہو۔

دراصل ریڈیو سے ادب کے تعلقات اس زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ جب ریڈیو پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ یعنی وہ ابتدائی زمانہ جب ادب لکھنے کی نہیں بلکہ سننے کی چیز ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں بھی ادب عورتوں کی تخلیقی سرگرمیوں میں شامل نہیں تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ادب کا رشتہ آواز سے ٹوٹا اور کاغذ و قلم سے جڑ گیا۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی رہی تب کہیں کسی ستم ایجاد نے ریڈیو ایجاد کیا تاکہ لوگوں کے بگڑے ہوئے ذوق کی اصلاح ہو سکے۔

یوں تو ریڈیو فلمی گیت اور خبریں سننے کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس سے ادبی پروگرام بھی گاہے بگاہے نشر کیے جاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے اگر اس کے موجد کو اس بات کا اندازہ ہوتا تو وہ ہرگز ریڈیو ریڈیو ایجاد کرنے کی جرأت نہ کرتا کیوں کہ ریڈیو کے بغیر بھی ادب کی اپنی ایک آواز ہے۔ اس آواز میں آواز ملانے والا یعنی ریڈیو مل گیا تو یہ دو آتشہ نہ جانے کیا ستم ڈھائے گا۔ فی الحال ہماری بحث کا دائرہ اس ادب تک محدود ہے جو ریڈیو پر پیش کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔

ریڈیو نہ صرف ادب کی بلکہ ادیبوں کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ادب کی تاریخ

ہیں مختلف تحریکات کا ذکر سنتے آئے ہیں۔ مثلاً ترقی پسند تحریک ، جدیدیت کی تحریک وغیرہ۔ لیکن ہمارا خیال ہے اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک "ریڈیو" ہے جو ان ادیبوں سے بھی لکھواتا ہے جو لکھنے سے توبہ کر چکے تھے اور پڑھنے والے بھی ان کی تخلیقات پڑھنے سے توبہ کر چکے تھے۔ بعض لوگ مثال کے طور پر ہم ان دنوں اس لیے لکھتے ہیں کہ ریڈیو والے ہمیں کوئی عنوان پیش کر دیتے ہیں کہ اس پر آپ کو لکھنا اور بولنا ہے۔ ورنہ ہمیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر ادب میں طبع آزمائی نہ کی گئی ہو۔ یہ بات واضح کر دیں کہ ریڈیو پر کسی موضوع کے تحت لکھنا پڑتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اس وقت زیادہ اچھی طرح لکھ سکتا ہے جب اس کے پاس نہ کوئی موضوع ہو نہ کوئی خیال۔ بہر حال ریڈیو ان سے بھی لکھواتا ہے جو ادب میں بوریا بستر لپیٹنے کی فکر میں ہوں ، یہ ان سے بھی شاعری کرواتا ہے جن سے ایام شباب میں غلطیوں کی طرح کچھ غزلیں ، نظمیں سرزد ہو گئی تھیں مگر اب بیچارے اپنی پروفیسری کا بھرم باقی رکھنے کے لیے تنقیدی جائزہ لیتے رہتے ہیں - ریڈیو ان سے بھی تنقیدی مضامین اور معلوماتی مضامین اگلواتا ہے جن سے یہ دونوں اصناف پناہ مانگتی ہیں۔ ریڈیو مجھ جیسے ادیب سے طنز و مزاح لکھواتا ہے - جس کی موجودگی میں لطیفہ سنایا جائے تو وہ زریں قول بن جاتا ہے۔ ریڈیو والوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اب بھی ریڈیو کے لیے لکھا جاتا ہے۔ ریڈیو کے لیے پڑھا جاتا ہے اور ریڈیو کے لیے سنا بھی جاتا ہے یعنی لوگ انھیں صرف اس لیے سنتے ہیں کہ ریڈیو مدتوں بند پڑا رہے تو کہیں اس میں چوہے آکر رہنا شروع نہ کر دیں - اس لیے وہ ریڈیو اور ادب کی آواز کو زندہ رکھ کر اپنے صاحب ذوق ہونے کا ثبوت دیتے ہیں - ریڈیو سے نشر ہونے والے اسی قسم کے ادب کو ادب برائے ریڈیو کہا جاتا ہے ۔

ادب برائے ریڈیو کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ یہ لکھا نہیں جاتا لکھوایا جاتا ہے - پڑھا نہیں پڑھوایا جاتا ہے ، نہ یہ ادب برائے ادب ہے نہ ادب برائے زندگی - یہ ادب برائے سامعین ہے - سامعین اسے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں - سنتے سنتے جب درد سر سر اٹھاتا ہے تو ریڈیو کا بٹن آف کر دیتے ہیں - یہ اس ادب کا سب سے اہم افادی پہلو ہے - اسے تعمیری ادب میں بھی شمار کیا جاتا ہے کہ یہ تعمیر قوم کا فریضہ انجام دیتا ہے اور آج کل ہونے والے تمام تعمیری کاموں کی طرح مرزا غالب کا یہ مصرعہ اس پر بھی چسپاں کیا جا سکتا ہے :

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اس ادب کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ بجلی سے چلتا ہے اسی لیے برق رفتار واقع ہوا ہے - ہوا کے دوش پر آتا ہے اور اسی تیزی سے ہوا ہو جاتا ہے - شاید اسی لیے یہ جلد لکھوایا جاتا ہے - گزشتہ دنوں ایک ریڈیو انچارج نے ہمیں فون کیا - کہنے لگے کیا آپ کو ہمارا لیٹر نہیں ملا "ہم نے جوابًا کہا" جی نہیں "۔ اس پر وہ فرمانے لگے - خیر کوئی بات نہیں - آج کل تو ہم سب اس کے عادی ہو گئے ہیں - بہر حال آپ کل ۳ بجے ریڈیو اسٹیشن آکر ریڈیو ٹاک ریکارڈ کروا دیجئے

[illegible]

معاف کیجیے یہ ذرا جلدی میں ہو رہا اور عنوان رکھ دیا گیا ـــ اگلے دن ہم نے اسی موضوع پر ریڈیو اسٹیشن جا کر اظہارِ خیال کیا۔

اگر آپ ریڈیو کے لیے لکھتے ہیں تو اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ ریڈیو سے پیش کیے جانے والے ادبی پروگراموں میں آپ کو نہ خالی ہاتھ مدعو کیا جاتا ہے اور نہ خالی ہاتھ رخصت کیا جاتا ہے ایک عدد عنوان ضرور دیا جاتا ہے شاعر البتہ بلا عنوان ہوا کرتی ہے نثر نگاروں کو عنوان سے باندھ کر لکھوانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہوگا کہ ان کے لکھے پر اعتبار نہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمارا امتحان لینے کی غرض سے یہ عنوانات تجویز کیے جاتے ہیں۔ لیکن تجربات نے ہم کو بتایا کہ یہ اہتمام دراصل سامعین کے صبر کا امتحان لینے کے لیے ہے۔

یہ مجوزہ عنوانات کس قدر عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا ئیے کہ چند برسوں پہلے جب ہماری ایک عدد دکان ہوا کرتی تھی اور ہم با قاعدہ تاجروں میں شمار ہوتے تھے ایک ریڈیو اسٹیشن پر ہمیں بحیثیت مزاح نگار مدعو کیا گیا۔ مزاحیہ بات چیت کا عنوان تھا۔

"صارفین کے حقوق"

عنوان پڑھ کر ہمیں محسوس ہوا گو یا گاندھی جی سے گزارش کی جا رہی ہے کہ وہ اہنسا کی مذمت میں تقریر کریں یا کسی دہشت گرد کو اہنسا کی موافقت میں اظہار خیال کے لیے بلایا گیا ہو۔

ریڈیو سے پیش کیے جانے والے اس قسم کے پروگراموں کو عام طور پر فرمائشی پروگراموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شاید اسی لیے ان میں آورد کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ البتہ ہمارے لیے تو ریڈیو پروگراموں میں آمد یعنی انکم کا پہلو ہمیشہ نمایاں اور ہمارے پیش نظر رہا ہے۔

ریڈیو سے متعلق ہمارے گوں ناگوں تجربات میں یہ بھی شامل ہے کہ ریڈیو والوں سے ملاقات ہو تو بات چیت میں احتیاط لازم ہے۔ اگر آپ اپنی تعریف کریں تو وہ اس وہم یا یقین میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ یہ شخص مزید ریڈیو پروگرام حاصل کرنا چاہتا ہے، آپ غلطی سے اپنی بیوی کے ادبی ذوق کا تذکرہ کر بیٹھیں تو وہ یہ خیال کریں گے کہ آپ اسے بھی ادیبہ بنا کر ریڈیو پر پیش کرنے کے لیے جال بچھا رہے ہیں حتیٰ کہ آپ اپنے کتے کی بھی تعریف کریں تو احتیاط سے کام لیں۔ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسے بھی کسی فیچر پروگرام میں آواز کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔!

●●

بابو آر کے
(اچلپور)

گرمی نامہ

گرمیاں آگئیں، اچھے اچھوں کو پسینے چھوٹے۔ ٹھنڈے مشروبات کی دوکانیں اور خوانچے لب سڑک انسانوں پر چڑھ دوڑے۔ ککڑیوں، خربوزوں اور تربوزوں کے بطن میں بھری خنکی کی للک نے ہر کسی کو للچایا۔ پانی کی ان گھاگھروں کو لوگ گھرے جانے لگے۔ ماضی بعید میں ککڑیوں کی مقبولیت میں لیلیٰ کی انگلیوں اور مجنوں کی پسلیوں کو کافی دخل تھا اور واقعی یہ ککڑیاں ان دنوں پتلی نازک لطیف و ملیّن ہوا بھی کرتی تھیں۔ اسی لیے تو ایک شاعر نے کہا تھا کہ :

کیا خوب ککڑیاں ہیں کیا خوب ککڑیاں ہیں
لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں

لیکن آج کل فرٹیلائیزر نے ککڑیوں کو جسیم جسامت دے کر ان سے لیلیٰ مجنوں کے اعضا میں تھوڑا رد و بدل کروالیا ہے اور اب یہ پوزیشن ہے کہ لیلیٰ کی انگلیوں اور مجنوں کی پسلیوں سے تجاوز کر کے یہ ککڑیاں لیلیٰ کی پنڈلیوں اور مجنوں کے بازوؤں میں ڈھل گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو ککڑیاں پہلے صرف ہونٹوں سے کھائی جاتی تھیں اب انھیں چبانے کے لیے داڑھ بلکہ پوری بتیسی بھی ناکافی ہوا کرتی ہے۔ خربوزہ، تربوز یہ دونوں گرمیوں کے پھل ہیں جو اصلاً پھل کم اور قافیے زیادہ لگتے ہیں اور گمان غالب ہے کہ تربوز، خربوزے کے باعث ہی اردو شاعری میں قافیوں کا رواج زور پکڑا ہوگا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے یہ کہہ کر ایک زمانے سے بے چارے خربوزوں کو خواہ مخواہ ہی بدنام کیا گیا ہے جبکہ رنگ بدلنے کے معاملے میں ہم آدم زادوں سے زیادہ رنگیں اور رنگیلی شئے کوئی ہے ہی نہیں۔ گزشتہ زمانے میں شاید زیادہ تر انسان اور خربوزے نجیب الطرفین ہوا کرتے تھے۔ اس لیے خوشبوؤں کا ذرا زیادہ ہی بول بالا تھا۔ یہاں تک کہ آدمی کے گھر سے نکلتے ہی خلوص کی مہک پڑوسی تک جایا کرتی تھی اور خربوزوں کی خوشبو گاہک کو اپنی جانب کھینچ کر اس کی ناک کو اپنے اوپر بٹھا لیا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گزشتہ زمانے میں خربوزہ

خریدنے سے قبل اس قدر سونگھے جاتے تھے کہ ان دنوں ناکیں انسانی چہروں پر کم اور خربوزوں پر زیادہ نظر آتی تھیں اور اکثر گاہک تو خربوزے کی خوشبو سے مسحور ہو کر خربوزے کو بجائے منہ کے ناک سے کھا لیا کرتے تھے۔ اسی طرح گرمیوں کے موسم کا مشہور پھل آم بھی ہوا کرتا ہے جس طرح شاعری نے غالب کو ہر دل عزیز خاص و عام بنایا، اسی طرح غالب نے آم کو شہرتِ دوام بخشنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ یوں تو غالب صاحب آم کے ساتھ ساتھ سیتا پھل اور رام پھل کو بھی پسند کر سکتے تھے کیوں کہ آم ہی کی طرح یہ دونوں پھل بھی شرارت سے پُر ہوتے ہیں۔ یعنی ان تینوں پھلوں کا کھانا اور منہ چڑھانا ایک ہی عمل کے دو نام ہیں۔ ان پھلوں کو کھانے کے لیے اچھے بھلے آدمی کو شرارت پہ اتر آنا پڑتا ہے۔ آڑے ٹیڑھے منہ بنانا پڑتا ہے۔ بہرکیف گرمیوں کے موسم میں آم چوسنا غالب صاحب کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آم کے ذائقہ جیسی ہی ترشی اور مٹھاس ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

اسی لیے اکثر شعرا گرمیوں کے دنوں میں اچھے شعر کہنے کے نام پر بے تحاشا آم چوسے جاتے ہیں ان کے لیے یہی اعزاز کیا کم ہے کہ وہ بھلے ہی شاعری میں غالب کے ہم پلّہ نہ ہوں لیکن آم کھانے کے معاملہ میں وہ غالب کے ہم سر ضرور ہیں۔ آم کے تعلق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آم ہی وہ پھل ہے جو کھیلنے اور کھانے دونوں کے کام آتا ہے۔ آم چوسنے سے قبل اسے ماچا جاتا ہے اور ماچنے کے لیے اسے خوب گھمایا پھرایا دبایا۔۔ بسلا اور بھینچا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہم سمجھتے ہیں کہ کرکٹ کے سپن گیند بازوں نے اسپین گیند بازی کے تمام تر "action" آم ماچنے کے اسی عمل سے مستعار لیے ہیں اگر آم گرمیوں کا پھل نہیں ہوتا تو ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ برصغیر ہندو پاک کے باشندے گرمیوں کو ہرگز ہرگز جھیل نہیں پاتے۔۔۔۔۔ وہ تو آم ہی ہے جسے کھاتے کھاتے اور جس سے کھیلتے کھیلتے ہم لوگ گرمی کی شدت کو بھول جایا کرتے ہیں۔ امسال ہم لوگ گرمیوں کے موسم کو برداشت نہیں کر سکے ہیں۔ کیونکہ اس مرتبہ ملک میں ہر طرف دیگر فصلوں کے علاوہ آم کی فصل بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئی ہے۔ ان دنوں تو بس ایک ہی فصل کا بول بالا ہے اور وہ ہے بموں کی فصل۔ بہرحال ہم اپنے ملک کے سائنس دانوں اور انجینئروں کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ جو انھوں نے گرمیوں کے اس موسم میں آموں کی کمی بموں سے پوری کر دی۔

گرمیوں سے لڑنے کا ایک ہتھیار دھوپ کا سیاہ چشمہ بھی ہوتا ہے جس کے استعمال سے واقعی آنکھوں کو واقعی ٹھنڈک ملتی ہے اور یہ ٹھنڈک ہوتی ہے سڑک پہ چلتے پھرتے حسین منظروں کی۔ اس چشمہ کا مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اسے استعمال کرنے کے بعد آدمی باحیا بھلے ہی نہ ہو لیکن باکردار ضرور کہلاتا ہے کیوں کہ اسے آنکھوں پہ چڑھا لینے کے بعد کسی بھی جاہل دل فریب پہ بھرپور نظریں ڈالی جا سکتی ہیں اور اچھی شئے کو دیکھنے کے لیے بلا خوف و خطر ٹکٹکی باندھی جا سکتی ہے۔ الغرض صاحب چشمہ کی تمام نظر بازیاں اس چشمہ میں، چشمہ بند رہتی ہیں اور کسی دوسرے کو اس کی دیدہ دلیری کی خبر

بھی نہیں ہوتی۔ یعنی آدمی رند کا رند بھی رہتا ہے اور ہاتھ سے جنت بھی نہیں جاتی۔

انہی گرمیوں کے موسم میں مشہور زمانہ گرمیوں کی تعطیلات بھی نمودار ہوتی ہیں۔ ان دنوں میں زیادہ تر لوگ بنجارے بن کر اپنے پیروں میں چکر باندھ لیتے ہیں۔ اور معہ اہل و عیال قرابت دار کے گھر بیس نکالے جانے تک ڈیرہ جمائے رہتے ہیں۔ اسی موسم میں گدھے اپنی صحت بنالیا کرتے ہیں اسی لیے صحت مندی کے باوجود سمجھ دار لوگ خود کو لاغر کہلانا پسند کرتے ہیں۔ گدھوں کی طرح ہی یہ موسم شادیوں کو بھی بھاتا ہے۔ جدھر نظر ڈالو شادی کا منڈپ یا شادی کی بارات نظر آنے لگتی ہے۔ شادیوں کی بہتات کے باعث دوران سفر اکثر باراتیں گڈ مڈ ہو جاتی ہیں جس سے باراتی ہی ادھر ادھر نہیں ہوتے بلکہ دلھا دلہن بھی آسانی سے بدل جاتے ہیں باہر گاؤں یا شہر سے اپنی لیلی کا جوڑا لانے کے لیے جانے والے نوشہ میاں کی کیفیت بھی دیدنی ہوا کرتی ہے۔ دوران سفر گرمی، پسینے اور پریشانی کے باعث یہ بے حال نظر آتے ہیں اوران کی حالت زار اور صورت بیزار سے باور ہوتا ہے کہ جیسے میاں نوشہ شادی کا رشتہ جوڑنے نہیں بلکہ توڑنے جا رہے ہوں۔ ●●

دلیپ سنگھ

(انگریزی سے ترجمہ)

ڈاکٹر گوہر علی خاں

عائشہ سے مت پوچھیے

(عرب ممالک میں کام کرنے والے اپنے ہندوستانی دوستوں و رشتہ داروں کے لیے اکثر ایسے تحفے لاتے ہیں جو ہندوستان ہی میں تیار ہوتے اور عرب ممالک میں کبھی فرضی لیبل کیساتھ اور کبھی اکسپورٹ کوالٹی کے عنوان سے فروخت ہوتے

قارئین شگوفہ کے لیے ڈاکٹر گوہر علی خاں نے اس قبیل کا ایک مضمون عنایت کیا ہے ——— مدیر

میری پہلی ملازمت تھی۔ اردو کے ایک جریدے کی خدمت کرنا اس ہفتہ وار کا کل اسٹاف تھا۔ ——— ایک ایڈیٹر و پروپرائٹر ہیں اور ایک کاتب۔ یہ ہفتہ وار حسب معمول ملکی و غیر ملکی سیاست پر مضامین، عورتوں اور بچوں کے صفحات اور اسپورٹس کے کالم پر مشتمل تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ قارئین کے لیے ایک کالم مختص تھا جس میں ان کے نفسیاتی سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے۔ ایک سوال جو ہمیں وصول ہوا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

سوال: میں ایک پچیس سالہ نوجوان ہوں۔ میرے ہمسایہ کی بڑی لڑکی سے میرا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ مگر حال ہی میں مجھے پتہ چلا کہ اس کی چھوٹی بہن اس سے زیادہ حسین و دل کش ہے۔ اب میں اس کی طرف زیادہ مائل ہو رہا ہوں اور اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری اس حرکت سے میرے والدین سخت ناراض ہوں گے اور وہ لڑکی خود عجیب الجھن میں مبتلا ہو جائے گی۔ اگر میں اپنے والدین کو خوش کرنے کے ! ان کی مرضی کے آگے جھک جاتا ہوں تو یقیناً مجھے عمر بھر سکون و چین میسر نہیں آئے گا۔ مجھے مشورہ سے نوازیئے کہ اب میں کیا کروں؟ خصوصاً جبکہ مجھے یہ بھی پوری طرح سے علم نہیں ہے کہ میری منگیتر کی چھوٹی بہن مجھے چاہتی بھی ہے کہ نہیں۔"

جواب، آپ کے جواب کے لیے ہم قارئین سے رجوع ہو رہے ہیں۔ اس اردو ویکلی میں ایک اور صفحہ ایسا بھی تھا جس میں وصول ہونے والے سوالات کے جوابات "عائشہ سے پوچھیے" کے عنوان کے تحت دیئے جاتے تھے۔ عائشہ ایک مشہور و معروف ماہر نفسیات تھیں جنھیں میں نے کبھی بھی آفس میں دیکھا نہیں پایا تھا مگر ہر ہفتہ اس کالم کے کئی سوالات اور ان کے جواب بذریعہ ایڈیٹر مجھ تک پہنچ جاتے تھے تاکہ میں انھیں کاتب کے حوالے کردوں۔

ایک دن ایڈیٹر نے مجھے ان کے کمرے میں بلایا اور پوچھا کہ کیا میں یہ کالم "عائشہ سے پوچھیے" کے جوابات دینے کی ذمہ داری قبول کرسکتا ہوں۔ چونکہ وہ لمبی چھٹی پر گئی ہوئی ہیں۔ میں تھوڑی سی سوچ میں پڑ گیا۔ جب مردوں کے نفسیاتی مسائل کے حل خ میری ہتھیلی میں پڑے رہتے ہیں تو صنفِ نازک کے مسائل تو یوں چٹکی بجاتے ہی حل کر لیے جاسکتے ہیں۔ اور یوں بھی کون میرے جوابات پر مجھے کسی عدالت میں گھسیٹے گا۔ میں نے ایڈیٹر سے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب۔ آپ ہر ہفتہ سوالات میرے پاس بھیج دیا کریں۔

"سوالات۔ کون سے سوالات؟ ہمیں کوئی سوال وصول نہیں ہوتا۔ ہم خود ہی سوالات بناتے ہیں۔"

اس انکشاف پر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یا میرے خدا۔ جوابات تو دینا آسان سی بات ہے مگر خود ہی کس طرح۔ طرح طرح کے نفسیاتی سوالات بنائیں۔ میں پھر دوبارہ سوچ میں غرق ہوگیا۔ جب اس سوچ کے اندھیارے سے باہر نکلا تو میرے شعور نے کہا۔ "آپ بہ ذاتِ خود بے شمار نفسیاتی مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان ہی مسائل کو سوالات کے سکوں میں ڈھالتے رہیے۔ کام چل جائے گا۔"

——— اور سچ مچ کام چل گیا۔

پہلے ہفتے کے لیے میں نے حسبِ ذیل سوال بنائے۔

سوال، میرے مکان کی سڑک کے سامنے سے ہر روز ایک چھریرے بدن کی حسین سی لڑکی تانگہ میں بیٹھی اپنے کالج جاتی ہے۔ میرا جی بہت چاہتا ہے کہ اس تانگے کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس سے اپنے عشق کا اظہار کردوں مگر ہمت نہیں ہوتی کہ میں ایسا کس طرح سے کرسکوں گا۔ جب کہ اس کے تانگے کا گھوڑا بہت پھرتی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

جواب: آپ ہمت نہ ہاریں۔ اپنی تعلیمی قابلیت بڑھائیے۔ اچھی سی ملازمت تلاش کیجیے اور اپنی پہلی تنخواہ سے ایک اچھا سا تانگہ خرید یئے یا کم از کم کرائے پر لے لیجیے۔ اب اپنے تانگے کو اس حسینہ کے تانگے کے برابر لے جاکر اس لڑکی کے کان میں اپنے دل کی بات کہہ دیجیے۔ انشاءاللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

اب یہ دلچسپ سلسلہ یوں ہی مزے میں چلتا رہا۔ چند میرے پرانے مسائل

رہے اور ہمارے ہفتہ وار کی بکری بھی خوب ہونے لگی۔ ایک دن یہی "عائشہ سے پوچھو" کا سلسلہ چل رہا تھا۔ کچھ نئے بنائے ہوئے سوالات اور ان کے جوابات دیئے جا چکے تھے۔

آخری سوال میں نے اپنی ذات کے بارے میں کیا تھا اور وہ تھا ـــــ

سوال: میں آج کل ایسے دفتر میں کام کر رہا ہوں جہاں پر میرا ایڈیٹر و پیرو پرائٹر ہر روز مجھے زائد کام سے لاد دیتا ہے مگر میری تنخواہ بڑھانے کے سلسلے میں کبھی بھی انھوں نے ازراہ ہمدردی اپنی زبان نہیں کھولی ہے کیا ان تک میری اس استدعا کا پہنچانا ٹھیک رہے گا اور کیا وہ میری تنخواہ بڑھانے پر رضا مند ہو جائیں گے ؟"

اس سے قبل کہ میں اس کا جواب بھی خود ہی لکھ دیتا ایڈیٹر میرے کمرے میں گھس آئے اور پوچھا کہ کام ختم ہوا کہ نہیں۔ میں نے جواب دیا۔" ابھی ختم ہوا چاہتا ہے۔"

" ہیں۔ اب کی بار آپ نے بہت دیر لگادی۔"

وہ جھپٹ کر کاغذات میری میز سے لے اڑے کہ اس دفعہ وہ خود ہی اس کے جواب دیں گے۔

دوسرے روز جب اس ہفتہ وار کی کاپی میرے ہاتھ لگی تو سب سے پہلے میں نے "عائشہ سے پوچھو" کا کالم پڑھ ڈالا۔ میرے مسئلے کا حل تھا ـــــ

آپ اپنے باس سے بھول کر بھی اس کا تذکرہ مت کیجیے۔ آج کل وہ کسی کی بھی تنخواہ بڑھانے کے موڈ میں نہیں ہے۔" (انڈین اکسپریس)

●●

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

مولانا محمد علی جوہر کی ظرافت

مولانا محمد علی جوہر بے باک سیاسی رہنما، آزاد قلم صحافی، شعلہ بیان مقرر، سلجھے ہوئے شاعر، اردو اور انگریزی کے صاحبِ طرز انشا پرداز ہونے کے ساتھ ہی ایک زندہ دل انسان بھی تھے۔ اس ضمن میں ان کے بچپن کے دوست اور خاص ساتھی میر محفوظ علی رقم طراز ہیں "محمد علی خوش مزاج اور ظریف بھی بہت تھے۔ سنجیدہ ہونے کے باوجود مزاج میں شوخی بھی تھی۔ بات میں بات پیدا کرنا اور مذاق کرنا ان کی عادت تھی۔ لفظ بچے کی جمع بچوں کی بجائے وہ مذاقاً "بچا چیچ" کہتے تھے۔ حضرت داغ دہلوی سے اپنی پہلی ملاقات اور تعلقات محمد علی جوہر بڑے ہی پُرلطف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے حقیقی بھائی ذوالفقار خان داغ کے شاگرد تھے۔ جب کبھی استاد سے ملنے جاتے تو انھیں بھی ساتھ لے جاتے، ان کا بچپن کا زمانہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "داغ نے پہلے دن پوچھا "کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں؟" میری عمر بہت کم تھی لیکن بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے جنھیں میں بہت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے ان ہی کے چند شعر انھیں سنا دیئے، سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ "اس بچے کو ضرور لایا کرو۔" جناب والا! اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بڑھ چڑھ کر ہے، سینے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی اور گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو شعر و سخن کی شان میں میں نے نہ کی ہو۔"

اپنی ابتدائی شعر گوئی سے متعلق محمد علی جوہر کے یہ فقرے بھی دیکھیے: "میں نے دس برس عمر ہی میں بہت سے لغو و فضول شعر کہے تھے۔ اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری آفلت بایوگرافی یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ امت کی طرف سے لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت ا

کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتش دان کی نذر کیا جائے یا سیرت پیشوائے قوم وملک میں جگہ دی جائے ؟" ان کے خطوط سے ماخوذ یہ دل چسپ اور پر مغز فقرے بھی دیکھیے۔

"ہماری نجات خدا کے سوا اگر کسی کے ہاتھ میں ہے تو وہ ہم خود ہیں۔ اوپر خدا اور نیچے خود۔"

"دنیا کی کامیابی کا راز نرمی اور سختی دونوں کے موقعہ موقعہ سے استعمال کرنے میں مضمر ہے۔"

ان کی شاعری میں بھی کہیں کہیں شوخی وشرارت کی پھلجھڑیاں پھوٹ پڑتی ہیں حکومت برطانیہ سے چھیڑ خانی دیکھیے

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہوں اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر ہم پر تو ہے وفا کا تقاضہ جفا کے بعد

مستحقِ دار کو حکم نظر بندی ملا کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

معشوق کو چڑانے کی کوشش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تیری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

اپنا مذاق آپ اڑانے کی یہ ادا بھی دیکھیے:

میں تیرا گھر سمجھ کر سرِ راہ گر پڑا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو اپنے آپ کو ذمہ داریوں کا شدت سے احساس دلانے کے لیے اور مزید سرگرم عمل رکھنے کے لیے کہہ بیٹھے:

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمھیں جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

اسی طرح سے خود اپنا محاسبہ کرنے کا ظرف بھی کتنے لوگوں میں ہوتا ہے؟ مولانا محمد علی جوہر کی شوخیٔ طبع ان واقعات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہمدرد کو سنسر کے لیے بھیجنے سے پہلے حاکموں

کو آزمانے اور لطف لینے کے لیے چڑیا چرونٹے کی کہانی بھی درج کر دی۔ سنسر کرنے پر جو صاحب حکومت کی طرف سے مقرر تھے انھوں نے چڑیا چرونٹے کی کہانی بھی خارج کر دی۔ ان سے پوچھا گیا کہ اس میں کیا بات ہے؟ تو ان صاحب نے کہا "بھائی! ہے تو چڑیا چرونٹے کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم انھوں میں کچھ زہر بھر دیا ہو اور جواب دہی ہمارے سر آپڑے۔" اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت پر مولانا کے قلم کی کتنی دھاک تھی۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کا وفد لے کر یورپ گئے۔ لندن میں ایک جلسے میں مشکل سے پانچ منٹ بولنے کی اجازت ملی۔ گویا ہوئے:

"حضرات میں آرہا ہوں چھ ہزار میل سے اور ترجمانی کرنا ہے مجھے ۳۰ کروڑ انسانوں کے خیالات کی اب آپ حساب خود لگا لیجیے کہ فی منٹ نہیں فی سکنڈ بھی نہیں ہر سکنڈ کی کسر میں کتنوں کے خیالات وجذبات آپ تک پہنچاؤں گا۔"

آوازیں آنے لگیں کہے جائیے، کہے جائیے اور ہر پانچ منٹ کے بعد پانچ منٹ بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ پورے بیس منٹ ہوگئے۔

کراچی کا تاریخی مقدمہ (۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء) چل رہا تھا۔ محمد علی جوہر، گاندھی جی اور دوسرے چند رہنماؤں پر دو الزامات عائد کیے گئے تھے۔ ایک تو عوام کو تشدد کی ترغیب دینے کا، دوسرے بغاوت پیدا کرانے کا۔ کہتے ہیں کہ ایک گواہ جب گواہی دے چکا تو مجسٹریٹ نے مولانا محمد علی سے پوچھا کہ "کیا وہ جرح کرنا چاہتے ہیں؟" مولانا گواہوں سے جرح کو فضول سمجھتے تھے لیکن اس بار وہ کھڑے ہوئے۔ لوگ بڑی توجہ سے مولانا کو دیکھنے لگے۔ مولانا نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ سے اس کے مزاج پوچھے اور بیٹھ گئے۔ یہ مولانا کی زندہ دلی اور ظرافت تھی کہ وہ ایسے سخت مقدمہ میں پھنسے ہونے کے باوجود اور ایسے نازک وقت میں بھی مذاق سے نہیں چوکے۔

بذلہ سنجی اور حاضر جوابی مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک مرتبہ کسی محفل میں گاندھی جی نے مولانا کو چھیڑتے ہوئے کہا "آپ جوہر ہیں اور آپ کے بھائی ذوالفقار علی گوہر ہیں۔ آپ کے تیسرے بھائی شوکت علی بھی شاعر ہوتے تو ہم انھیں کیا کہتے؟" مولانا نے مسکرا کر جواب دیا "آپ انھیں شوہر کہتے۔"

مولانا ایک جلسے میں عربی لباس پہن کر تشریف لے گئے۔ انھیں اس لباس میں دیکھ کر ایک انگریز دوست نے کہا "واہ مولانا آپ تو پہچانے بھی نہیں جاتے، میں سمجھا کوئی عرب آرہا ہے!" مولانا نے برجستہ کہا "میں سوٹ پہن کر آیا ہوں تو آپ نے مجھے کبھی انگریز نہیں سمجھا"۔ انگریز دوست بغلیں جھانکنے لگا۔

ایک مرتبہ مولانا شملہ میں اپنے روایتی لباس میں کسی دعوت میں مدعو تھے اور گفتگو اردو زبان

یں کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں کسی مسئلے پر ذرا برافروختہ ہوئے بعد پھر انگریزی زبان میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہنے لگے۔ ان کے قریب ہی کوئی ہندو رانی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ان کو اتنی اعلیٰ پائے کی انگریزی بولتے دیکھ کر ششدر ہوئی۔ اس نے پوچھا! مولانا آپ نے اتنی خوب صورت زبان کہاں سے سیکھی۔ مولانا بولے "ایک معمولی قصبے سے" اس پر رانی کی حیرانی میں مزید اضافہ ہوا، بولی اس قصبے کا نام کیا ہے"۔ مولانا نے انتہائی متانت سے جواب دیا اسے "آکسفورڈ" کہتے ہیں۔ مولانا کا یہ کہنا تھا کہ محفل زعفران زار ہو گئی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، حکیم اجمل خاں نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کی ضیافت تربوز سے کی سب لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ مولانا نے اپنے ایک پنجابی دوست کی طرف اشارہ کر کے کہا " لیکن پنجاب کے "خربوزے" بھی بہت اچھے ہوتے ہیں"۔

اس مضمون کو ان ہی کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جو ان کی شخصیت کی طرح تہہ دار ہے اس میں شاعرانہ تعلی ہے۔ ان کے مزاج کی فطری سادگی اور خاکساری اس سے جھلکتی ہے اور ان کی ظرافت بھی۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

●●

نئے شاعر کی شاعری

شبنم کارواری
کاروار (کرناٹک)

نہ ردیف ہے نہ تو قافیہ — بے ربط ہے جغرافیہ
نہ خیال کی کوئی چاشنی — بے سُر کی بے ڈھب راگنی
نہ وزن ہے اس میں نہ بحر ہے — نہ تو سَر ہے اس کا نہ پیر ہے
کوئیل نہیں، کاگا ہے یہ — اُلجھا ہوا دھاگا ہے یہ
ہر شعر ہے چھوٹا بڑا — مصرع سے مصرع لڑ پڑا
ایسی غزل کیا دے مزا — ہر شعر جس کا بے مزا
نو مشق کی طرزِ سخن — گڈ مڈ ہے سب فکرِ سخن
نہیں شعر کا کوئی وطن — ہے زاغ کے گھر میں زغن
ہے اونٹ جیسی ہر غزل — سیدھی نہیں ہے کوئی کل
نہ تو ربط ہے نہ تو سلسلہ — ہر خیال ہے کوئی بُلبلہ
ہاں شعر تو موجود ہے — معنی مگر مفقود ہے
ہر شعر مطلب سے پرے — جیسے گدھا سبزہ چرے
شاعر بنے ۔ پکڑا قلم — کی شعر پر مشقِ ستم
سرِ شام یا وقتِ صبح — کرتے رہے مصرع ذبح
نہیں جانتے فنِ شاعری — لکھ لکھ کے بھردی ڈائری
اشعار پر بیداد کی — رکھی توقع داد کی
بنے صاحبِ دیوان بھی — دل میں ہے یہ ارمان بھی
جو کچھ لکھا چھپتا رہے — قاری اُسے پڑھتا رہے
ہو جائے مجموعہ طبع — گھر سے وبا ہو یہ دفع
اوروں کے سر جائے بلا — چلتا رہے یہ سلسلہ

یہ شاعری بس چل پڑے
شبنم تخلص چل پڑے

★

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

بہ یادِ مسیح انجم

جلد ۳۱ —— ستمبر ۱۹۹۸ء —— شمارہ : ۹

قیمت فی پرچہ : ۱۲ روپے
زر سالانہ : ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱ فون (آفس) 595711 (رہائش) - 4576064

فہرست

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

★★★

منظوم خراج عقیدت

انتخاب مسیح انجم

★★★

پروفیسر شمیم جیراج پوری پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں رجسٹرار پروفیسر سلیمان صد
اور مسٹر آگیہ چاری دیکھے جاسکتے ہیں

اردو یونیورسٹی میں فاصلاتی تعلیم کے ذریعہ جاریہ سال بی اے میں داخلے

ٹرانسلیشن ڈیویژن کا قیام ۔ وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراج پوری کی پریس کانفرنس

حیدرآباد ۔ ۲۔ ستمبر وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری نے
یونیورسٹی میں جاریہ تعلیمی سال ۹۹ -۱۹۹۸ء سے فاصلاتی طریقہ تعلیم سے بی اے سال اول کا آغاز کیا جارہا
کورس کے لئے درکار نصابی کتب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے تعاون سے تیار کر لئے گئے ہیں۔ اس کورس کے
آزمائش اور تجربہ ہے اردو داں حلقوں میں نظام تعلیم کا کس طرح خیر مقدم کیا جاتا ہے اور دوران
مراحل سے گذرنا پڑے گا ۔ یہ تمام باتیں رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے پیش نظر آئیں گی۔ پروفیسر شمیم جیر
گولکنڈہ میں صحافتی کانفرنس کو خاطب کررہے تھے ۔ انہوں نے یونیورسٹی کے قیام کی وجوہات اور اس کے
تفصیلی روشنی [illegible] یونیورسٹی ہے [illegible] اردو یونیورسٹی ہوگی [illegible]

مدتک محدود نہیں رہے گی بلکہ دیگر زبانوں کی مدد سے روایتی کورسس کے علاوہ کامرس ، مینجمنٹ ، کمپیوٹر ، جرنلزم ، فوڈ
بنڈ نیوٹریشن ، سیاحت ، ماحولیات ، انفارمیشن ، ٹکنالوجی جیسے پیشہ ورانہ کورسیس کا آغاز کیا جائے گا ۔ تاکہ نوجوانوں کو روزگار
سے مربوط کیا جاسکے ۔ اس سلسلہ میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے ۔ توقع ہے کہ آئندہ تعلیمی سال سے بعض سرٹیفکٹ ،
پلوما اور ڈگری کورسس بی کام ، بی ایس سی بھی شروع کئے جائیں گے ۔

انہوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ مرکوز کرے گی ۔ اس سلسلہ میں کچھ عرصہ قبل حیدرآباد میں ایک
سمپوزیم کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا جس میں مختلف ماہرین تعلیم نے متعدد سودمند کورسیس جیسے کمپیوٹر اپلیکیشن میڈیکل ٹکنالوجی ، سیاحت ، اغذیہ
صحت و تعلیم ، مینجمنٹ ، ہوٹل مینجمنٹ اور ٹیچرس ٹریننگ کورسس کی نشاندہی کی ہے جس کا آئندہ تعلیمی سال سے آغاز کیا جائے گا
پروفیسر شمیم جیراج پوری نے بتایا کہ جب جنوری ۹۸ء میں وائس چانسلر کے عہدہ کا جائزہ حاصل کیا ۔ یونیورسٹی کا کوئی انفراسٹرکچر یا
دسرا فرد نہیں تھا ۔ تاہم گذشتہ ۸ ۔ ماہ کے عرصہ میں ہم نے مختلف ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور ٹولی چوکی کے علاقہ میں یونیورسٹی کا عارضی دفتر
ائم کیا ۔ انہوں نے بتایا کہ اردو یونیورسٹی دو طریقوں سے پروان چڑھ سکتی ہے ۔ اول تو یہ کہ تمام مضامین اردو میں ہوں گے ۔ دوسرے یہ کہ یہ
یونیورسٹی بہت سی یونیورسٹیوں کا مرکب ہوگی ۔ یونیورسٹی اندرون ملک کے علاوہ بیرونی ممالک میں قائم اردو تعلیمی ادارے اگر مولانا آزاد
یونیورسٹی سے اپنا الحاق چاہتے ہیں تو انہیں اس کی اجازت دی جائے گی تو انہیں اس کی اجازت دی جائے گی مولانا آزاد یونیورسٹی دنیا کی واحد
یونیورسٹی ہوگی جہاں راویتی اور فاصلاتی نظام تعلیم اردو زبان میں رائج ہوگا ۔ حیدرآباد میں مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق
پروفیسر شمیم جیراج پوری نے کہا کہ یہاں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم کا کامیاب تجربہ ہوچکا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں
حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی بھی ہے ، اس کے علاوہ کئی ایسے تعلیمی ادارے ہیں جو اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے سرگرم عمل ہیں ۔ اردو یونیورسٹی
کے لئے ۲۰۰ ۔ ایکڑ اراضی فراہم کئے جانے پر جناب شمیم جیراج پوری نے چیف منسٹر مسٹر این چندرا بابو کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے یونیورسٹی
کے قیام کے لئے قیمتی اراضی الاٹ کی ہے ۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے مکمل قیام کے لئے ۔ ۱۰۰
کروڑ روپئے درکار ہیں اس سلسلہ میں حکومت ہند کو تجاویز روانہ کی جاچکی ہیں تاہم انہیں توقع ہے کہ پہلے مرحلے میں ۔ ۲۵ ۔ کروڑ روپئے حاصل
ہوں گے جن سے ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ اور اس کے تحت شعبہ جات کی تعمیر اور انفراسٹرکچر کے اخراجات کی تکمیل ہوگی ۔ لیکن ابتداء میں ہم چاہتے
ہیں کہ یونیورسٹی کی اراضی پر باونڈری وال (حصاربندی) تعمیر کی جائے جس کے لئے ایک کروڑ روپئے کا تخمینہ کیا گیا ہے ۔ یونیورسٹی رجسٹرار
پروفیسر محمد سلیمان صدیقی نے بتایا کہ ابتداء میں یونیورسٹی میں فاصلاتی تعلیم کا مرکز ، انفارمیشن گائیڈنس ، ٹرانسلیشن ڈیویژن کا قیام عمل میں لایا
گیا ہے ۔ لائبریری کے لئے انفراسٹرکچر حاصل کیا گیا ہے انگریزی کتب کے اردو زبان میں ترجمہ کے لئے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں ۔
یونیورسٹی میں دارالترجمہ کو خاص اہمیت حاصل ہے جدید آلات کے ذریعہ ترجمہ کی کوشش بھی کی جائے گی ۔ انہوں نے بتایا کہ بی اے سال
اول نان ڈیٹیل کے نصاب میں تین نئے مضامین شامل کئے گئے ہیں ۔ انہوں نے اس موقع پر مرتب کردہ نصابی کتب کا مشاہدہ کروایا ۔ پروفیسر
[illegible] نے مزید بتایا کہ نئی دہلی ، پٹنہ اور بنگلور میں یونیورسٹی کے علاقائی مراکز قائم کئے گئے ہیں ۔ جہاں بی اے سال اول میں داخلوں کی مساعی کا
[illegible] ہے ۔ مزید مراکز مختلف شہروں میں قائم کئے جائیں گے ۔

۱۹۸۰ء کا ایک یادگار گروپ :

(دائیں سے بائیں) محترمہ ناز صدیقی، ڈاکٹر مغنی تبسم، مسیح انجم، مجتبیٰ حسین، رئیس اختر، منیر احمد شیخ (پاکستان) فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ، ہاشم علی اختر، مسز ہاشم علی اختر، رشید قریشی، دہاب عندلیب، (پچھلی صف میں) سراج الدین، محمد منظور احمد اور وقار خلیل۔

مسیح انجم کی کتاب در پردہ کی ر ۱۰ بر ۱۹۷۷ء کے موقع پر
جناب نریندر لوتھر، جناب بھارت چند کھنہ اور ولی تنویر
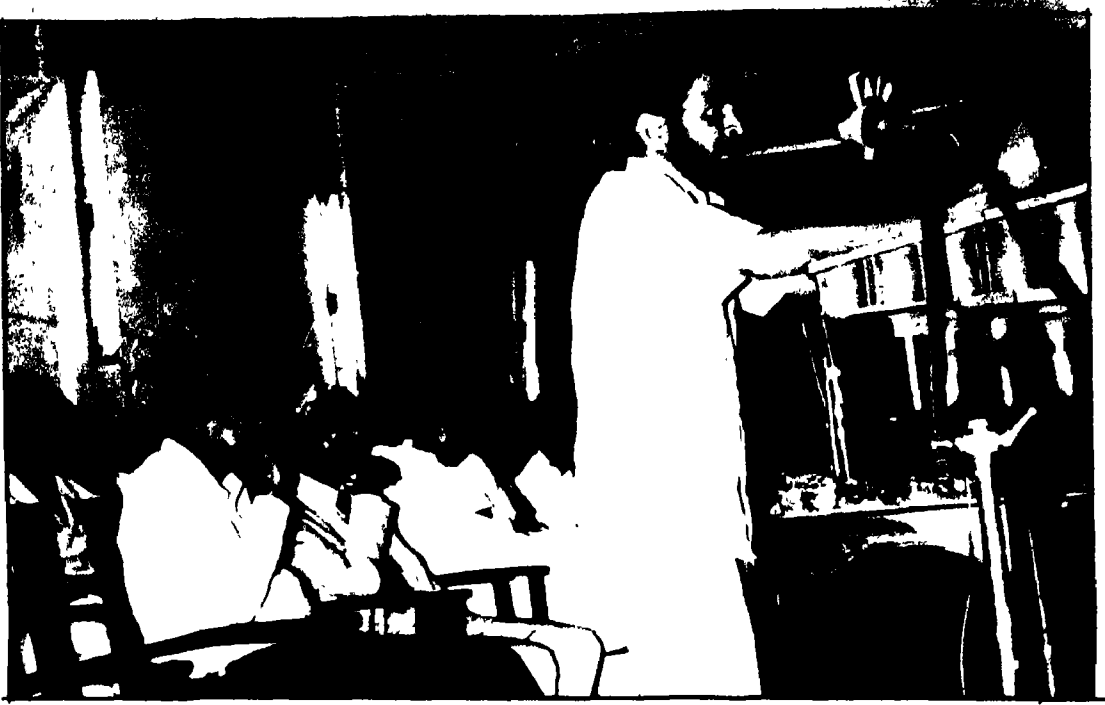
ادبی اجلاس ۔ زندہ دلان حیدرآباد کا ادبی اجلاس (۱۹۸۱ء) مائک پر مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، مجتبیٰ حسین، رشید قریشی، یم باگاریڈی اور نریندر لوتھر دیکھے جاسکتے ہیں۔

زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس ۱۹۷۷ء میں مسیح انجم مضمون پڑھتے ہوئے۔
(دائیں سے بائیں) نریندر لوتھر، بھارت چند کھنہ خواجہ عبدالغفور، مجتبیٰ حسین، رشید قریشی،
(پچھلی صف میں) برھان حسین، پرویز یداللہ مہدی

پرویز یداللہ مہدی

قبلِ مسیح کے قبلہ مسیح

(خاکہ — بیادِ مسیح انجم)

آدمی کا بچہ جب اس دنیا میں آتا ہے تو روتا ہوا آتا ہے اور جب جاتا ہے تو دوسروں کو رلا کر جاتا ہے۔ مزاح نگار بھی چونکہ آدمی ہوتا ہے اس لیے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ چنانچہ محمد مسیح الدین جو ادبی حلقوں میں مسیح انجم کے نام سے جانے پہچانے اور مانے جاتے تھے برسوں تک طنز و مزاح کے گل بوٹے کھلانے، زندہ دلانِ حیدرآباد کے دامن کو قہقہوں سے مالامال کرنے کے بعد ۳۰ رمئی ۱۹۹۸ء کی شام زندہ دلوں سے ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑ کر اپنے مداحوں کو روتا چھوڑ کر زندہ دلوں کی محفل سدا کے لیے سونی کر گئے۔ میرے لیے یہ سوا اس واسطے بھی دو چند ہے کہ ان سے میرا یارانہ دو چار دنوں کا نہیں برسوں پرانا تھا، سفر میں، حضر میں، صبح میں، دوپہر میں، شام میں، ہر پہر، ہر گجر ہم نے ایک دوسرے کو ہر روپ، ہر رنگ میں، دکھ میں سکھ میں، خوشی میں، غم میں، غرض یہ کہ ہر عالم میں دیکھا بھالا تھا، بھگتا بھی تھا۔

کہانی اگرچہ ختم ہو چکی ہے لیکن یادیں کبھی ختم نہیں ہوتیں چنانچہ اس وقت مجھے یاد آرہا ہے وہ زمانہ جب اردو کے واحد مزاحیہ رسالے شگوفہ کی اشاعت کا ابتدائی دور تھا، مدیرِ شگوفہ محترم سید مصطفیٰ کمال کے ڈاکٹر بننے میں ابھی دیر تھی۔ ان سے میرا بھی مراسم کا سلسلہ ابھی نیا نیا تھا۔ اپنے وطنِ ثانی بمبئی سے جب کبھی میں اپنے وطنِ مالوف حیدرآباد آتا، دفترِ شگوفہ یا مدیرِ شگوفہ کے گھر پر حاضری ضرور دیا کرتا۔ وہ ایک ایسی ہی شام تھی جب میں مدیرِ شگوفہ سے ملنے ان کے گھر گیا تو دیوان خانے میں پہلے ہی سے ایک عدد منحنی الجثہ باریش نوجوان کو کسی سعادت مند شاگرد کی طرح کرسی پر باادب باملاحظہ پوزیشن میں بیٹھے ہوئے پایا، نوجوان کا ناک نقشہ حلیہ بشرہ انہی دنوں شائع شدہ شگوفہ کے ڈیڑھ سالہ نمبر میں چھپی ہوئی نوآموز

مزاح نگار مسیح انجم کی تصویر سے ہو بہو ملتا جلتا تھا۔ حتیٰ کہ داڑھی تک مشابہ تھی اور یہ کیوں نہ ہوتی وہ داڑھی بھی مسیح انجم کی تھی اور شخصیت بھی مسیح انجم اصلی کی تھی۔ ہم دونوں مدیر شگوفہ کے گھر کے اندر سے برآمد ہونے تک چپ چاپ بیٹھے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔ ان دو انگریزوں کی طرح جو از خود تعارف کروانے کو انگریزی تہذیب کے منافی سمجھتے ہیں اور اس وقت تک ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے جب تک کہ کوئی تیسرا شخص آن کر انھیں آپس میں متعارف نہیں کروا دیتا۔ البتہ ہم دونوں چونکہ ولایت کے خالص انگریز نہیں ہندوستان کے "خالص انگریز" تھے۔ لہٰذا کنکھیوں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔ مسیح صاحب بھی یقیناً شگوفہ کے ڈیڑھ سالہ نمبر میں شائع شدہ میری تصویر سے مجھے ملانے کی کوشش کر رہے تھے کیوں ان کی آنکھوں میں بھی شناسائی کا ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں انگریزی آداب کو بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے سے بقلم خود متعارف ہوتے مدیر شگوفہ تشریف لے آئے اور ہمیں آپس میں متعارف کروا دیا اور یوں انگریزی آدابِ تعارف کی ایسی تیسی ہوتے ہوتے رہ گئی۔۔۔۔!

تعارف سے پہلے مسیح صاحب جس قدر اجنبی، بلکہ انجان بنے ہوئے تھے۔ تعارف کے بعد اتنے ہی کھل گئے۔ یہی نہیں اگلی دو چار ملاقاتوں میں خاصے گھل مل بھی گئے بلکہ اس قدر گھل مل گئے کہ دفتر شگوفہ اور مدیر شگوفہ کے گھر کے علاوہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا شروع ہو گیا اور ہمارے مراسم کا یہ سلسلہ ان کے دم آخر تک برقرار رہا بلکہ ان کے شہر کے مضافات میں نقل مکانی کے بعد شہر میں کسی مشاعرے، کسی تقریب میں شرکت کی علت کے نتیجے میں انھیں دیر ہو جاتی تو وہ یا تو دفتر شگوفہ پر رات بتاتے یا پھر میرے غریب خانے کو یہ اعزاز بخشتے۔

مسیح صاحب سے ملاقات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد میں نے بھی اپنے چہرے پر داڑھی کا کور (cover) چڑھا لیا اور یوں ہم دونوں ہم عصر، ہم قلم، ہم مزاج، ہم نوالہ، ہم پیالہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہم ریش بھی بن گئے۔ البتہ میں نے ابتداً سر کے اڑتے ہوئے بالوں کی تلافی کی خاطر داڑھی رکھ لی تھی جبکہ مسیح صاحب اپنی داڑھی کے سلسلے میں یہ جواز پیش کیا کرتے تھے کہ پیشے کے اعتبار سے مدرس ہونے کے باوجود اپنے محدود و مختصر قد و قامت اور کاٹھی کے باعث وہ مدرسہ سے زیادہ طالب علم دکھائی دیتے ہیں اور اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے اپنے اور اپنے شاگردوں کے بیچ ایک خط فاصل کھینچنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ نتیجتاً انھوں نے داڑھی رکھ لی، گویا ان کی داڑھی، داڑھی نہیں، استاد اور شاگردوں کے بیچ ایک خط فاصل تھی۔

جہاں تک مسیح صاحب کے نام کے ساتھ انجم کے لاحقے کا تعلق ہے بعض احباب اسے ان کے عہد جوانی کے کسی ناکام معاشقہ کی نشانی عرف دم چھلہ تصور کر کے اکثر اشاروں اشاروں میں یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ:

کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

دانا مسیح صاحب نے اس پردہ کو کبھی نہیں اٹھایا شاید اس کے پیچھے لوگوں کا بھرم قائم رکھنے کا جذبہ کارفرما رہا ہو، بہرحال اگر وہ یہ پردہ اٹھا بھی تو لوگوں کو یقیناً مایوسی ہوتی اور مسیح صاحب سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن اپنے خیر خواہوں اور مداحوں کو مایوس نہیں دیکھ سکتے تھے، وہ سبھی میں پیار، محبت اور خوشی بانٹنا چاہتے تھے، وہ آدمی تھے ہی خلیق، خلق خدا سے پیار کرنے والے اگر اردو ادب میں پہلے ہی سے ایک عدد خلیق انجم ترقی اردو والے موجود نہ ہوتے تو مسیح انجم کو خلیق انجم کے نام سے پکارتا۔

طنز و مزاح کے علاوہ مسیح صاحب کو اچھا اور لذیذ کھانا بھی بے حد عزیز تھا جو اس محرومی کا نتیجہ تھا جس سے وہ اپنے بچپن اور اوائل جوانی میں محض غربت کے باعث ہمیشہ دوچار رہے تھے۔ بقول خود ان کے، برس کے بارہ مہینے موٹے چاول کا خشکہ اور کچا کھٹا ہی انھیں نصیب ہوا کرتا تھا۔ گوشت ان کے حق میں کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا اور یہ نعمت غیر مترقبہ صرف بقرعید کے بقرعید انھیں میسر آیا کرتی چنانچہ اس نعمت غیر مترقبہ کو زیادہ مدت کے لیے استعمال کرنے کی نیت سے اس کے کباب بنا لیے جاتے اور یوں اس کا عرصۂ حیات بڑھا لیا جاتا، برسوں تک اس محرومی کو سہنے کے بعد اوپر والے نے جیسے ہی ان کی معاشیات کے گراف کو اوپر اٹھایا مسیح صاحب بقول شاعر،

میں کہاں رکتا ہوں عرش اور فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت آگے حد پرواز سے

کے مصداق لذت کام و دہن کا سامان مہیا کرنے والے جتنے بھی ریسٹورنٹ یا ہوٹل ٹھکانے بنام مدینہ، پرواز، نایاب، شاداب، آداب، آگرہ، نیا گھر، راستے میں پڑتے وہاں وہاں مسیح صاحب لنچ یا ڈنر کے اوقات میں پڑاؤ ڈالتے اور بچپن کی محرومی کا پوری طرح ازالہ کرتے، یہاں تک کہ مچھلی اور مرغ کے ذبح یا تلی ٹھیلوں کو بھی نہیں بخشتے تھے، وہاں بھی کھڑے کھڑے مچھلیوں اور مرغیوں کے گوشتوں کے پشتے لگا دیتے۔ شکم سیری کے ان محاذوں پر مسیح صاحب اکیلے ہی شب خوں نہیں مارتے، اپنے خاص یاروں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر وہاب قیصر اور ناچیز کو مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں بالخصوص اپنے ساتھ ہم طعامی کا شرف ضرور بخشتے اور چونکہ مہینے کی آخری تاریخوں میں جو کہ ملازمت پیشہ افراد کے حق میں نحس تاریخیں ہوتی ہیں، ہم سے جبراً دعوتیں وصول کرتے، دعوتوں کے اس چکر نے ایک زمانے میں ایک چین (CHAIN) کی صورت اختیار کر لی تھی جس کے نتیجے میں ہم میں سے ہر ایک کو باری باری میزبانی کے فرائض انجام دینے پڑتے، اتفاق سے ایک مرتبہ اس چین میں منتظر مجاز اور ڈاکٹر یوسف کمال بھی پھنس گئے۔ نتیجتاً ہر دو حضرات کا وہی حال ہوا جو بغیر گیر کیس کی سائیکل کی چین میں پھنسے ہوئے پتلون کے پائنچے کا ہوتا ہے۔

جو شخص یار باشیوں، شب باشیوں اور ہوٹل بازیوں میں گلے گلے ڈوبا ہوا ہو، اس کے پاس گھر اور گھر والوں کے لیے وقت ہی کہاں ہوتا ہے لیکن مسیح صاحب پتہ نہیں کس طرح گھر والوں کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ حالانکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ مملکت شعر و ادب پر راج کرنے والے فن کار اہل دقلم کا رہ، کی اکثریت کے گھروں میں بے ادبی، بدنظمی کا راج ہوتا ہے مگر مسیح صاحب نے اپنی گھریلو

خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور ادارۂ ہذا کو بھی فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ جب کہ مسیح صاحب نہ موقع پرست تھے نہ ابن الوقت وہ سیاسی توڑ جوڑ اور ہتھکنڈوں سے قطعی ناواقف تھے۔

مسیح صاحب کے چند بہی خواہوں کا خیال ہے کہ طنز و مزاح کے میدان میں انھیں جتنا پھیلنا چاہیے تھا اتنا نہیں پھیلے، شہرت کی جس بلندی پر انھیں فائز ہونا چاہیے تھا اس سے انھیں محروم رکھا گیا اس سلسلے میں ان کے کچھ بہی خواہ، خود مسیح صاحب کی اپنی لاپرواہی اور کوتاہی کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو کچھ ادب کے بڑے بھائی لوگوں کی تنگ نظری کا نتیجہ گردانتے ہیں جبکہ میری نظر میں سچائی کچھ اور ہے، اصل میں مسیح صاحب کے تعلق سے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے اس پس منظر کو نہیں بھولنا چاہیے جس کی کہ مسیح صاحب دین ہیں۔ انھوں نے ایک چھوٹے سے دیہات میں آنکھ کھولی تھی جہاں آنکھ کھولنے والا ہر منظر ہر چیز کو کم از کم اب سے ساٹھ پینسٹھ برس پہلے محدود زاویۂ نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی ہر خواہش چھوٹی ہوا کرتی۔ ہر تمنا چھوٹی ہوا کرتی، ہر آرزو چھوٹی ہوا کرتی، وہ آدھی روٹی، ایک لنگوٹی ایک کوٹھری میں، نہ صرف یہ کہ خوش رہتا، اپنے پالنہار کا شکر بھی بجالاتا، ایسے ماحول سے نکل کر محمد مسیح الدین میٹرک کی سند لے کر شہر آگئے۔ ٹیچرز ٹریننگ مکمل کی، محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہوئے نوکری کرتے ہوئے خانگی طور پر انٹر، بی اے اور پھر بی ایڈ کی تکمیل کی تحتانیہ اسکول سے وسطانیہ وسطانیہ سے فوقانیہ اور فوقانیہ سے ترقی کرتے جونیر کالج تک پہنچے اور وہیں سے باعزت طور پر تدریسی خدمت سے سبک دوش ہوئے۔ اسی طرح ادب میں افسانہ نگاری کے راستے سے مسیح انجم کے قلمی نام سے داخل ہوئے پھر اس سے پہلے کہ افسانہ نگاری کے بحر ذخار میں قطرے کی صورت شامل ہو کر عشرت قطرہ سے دریا میں فنا ہو جانا، کہہ کر فنا فی الافسانہ ہو جاتے مصطفےٰ کمال جیسی صورت مسیح انجم کی مسیحائی کو پہنچے، انھیں افسانہ نگاری کے بحر ذخار میں ڈوبنے سے بچایا اور طنز و مزاح کی ڈگر پر انگلی پکڑ کر تھوڑی دور تک چلایا۔ مسیح صاحب کو چونکہ طنز و مزاح سے فطری لگاؤ تھا لہٰذا اس ڈگر پر ان کے قدم بھی چل پڑے اور قلم بھی چل پڑا، مزاحیہ مضامین قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ اجلاسوں میں مضامین پڑھنے کی مشق بھی بہم پہنچائی جو بعد ازاں ان کے اس قدر کام آئی کہ سامعین کی کثیر تعداد ان کے مضامین پڑھنے سے زیادہ ان کی زبانی سن کر لطف اٹھانے لگی۔ مسیح صاحب کے اندر کراماً کاتبین قلم بند کرنے والے فرشتوں کے علاوہ ایک عدد دیہاتی بھی تا عمر بیٹھا رہا جس نے انھیں مکمل شہری نہیں بننے دیا۔ کبھی وہ ان کے خیالات میں در آتا تو کبھی ان کے سوچنے کے انداز میں ہوتا کبھی ان کے اعصاب پر سوار ہو جاتا تو کبھی ان کے لب و لہجے اور طرز [illegible] بسا اوقات تو یہ دیہاتی ان سے ایسی ایسی حرکتیں سرزد کروا تا کہ اچھے [illegible] کے آدمی [illegible] ہی دیکھیے آپ کے خلاف

آسانی سے بس میں سیٹ مل جاتی، اس طرح الٹا سفر انھیں دوبارہ شہری
پھر وایس وہ شہر کی بلدی حدود کی طرف مراجعت کرتے اور یوں لوٹ کر بدھو گھر کو پہنچتا۔

صاحب کے پیاروں کی فہرست میں شامل ہونے کا شرف مجھے بھی حاصل تھا۔ میرے علاوہ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین بھی انھیں بے حد پیارے تھے بلکہ اس پیارے کے تو وہ مداح بھی تھے حالانکہ یوسف صاحب عمر میں مجتبیٰ سے بڑے تھے لیکن طنز و مزاح کے حوالے سے مجتبیٰ کو وہ اپنے سے بڑا مزاح نگار مانتے تھے۔ انھیں مجتبیٰ کے ادبی مرتبے کا بے حد پاس و لحاظ تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اب سے کوئی دس بارہ برس پہلے آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے زیر اہتمام کل ہند جشن ظرافت منایا گیا تھا ملک کے سارے ہی نامور طنز و مزاح نگاروں نے اس میں بہ نفس نفیس حصہ لیا تھا۔ اتفاق سے کنوینر جلسہ نے یوسف صاحب کو مجتبیٰ حسین کے بعد مضمون سنانے کی زحمت دی۔ اس پر دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ یوسف صاحب کے مضمون کو مدعو سامعین و حاضرین جلسہ نے دل کھول کر سراہا اور یوں ان کا مضمون حاصل جشن قرار پایا۔ یہ بات کسی بھی مزاح نگار کے لیے مسرت و فخر کا باعث ہوتی لیکن یوسف صاحب مسرور ہونے کے بجائے ملول ہو گئے۔ یہی سوچ کر کہ انھیں مجتبیٰ کے بعد کیوں پڑھایا گیا اور مجتبیٰ سے زیادہ داد انھیں کیوں دی گئی۔ اصل میں مجتبیٰ کے تئیں ان کی عقیدت مجتبیٰ حسین کے آگے کسی اور مزاح نگار کا حتیٰ کہ خود ان کا اپنا چراغ بھی جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اور غلطی سے خود ان سے یہ غلطی سرزد ہو گئی تھی جس کا انھیں کافی عرصہ تک ملال رہا۔ اس بات کو لے کر وہ کافی دنوں تک دل گرفتہ اور اداس رہے۔ مذکورہ واقعہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کی فطرت میں رشک و رقابت کا جذبہ نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ مزاجاً ایک شریف النفس آدمی تھے۔ ان کا مزاح بھی ان کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ خالص طنز کو وہ گالی سمجھتے تھے۔ وہ خالص مزاح کے قائل تھے۔ لوک کتھاؤں اور لوک گیتوں کی طرح ان کے مزاح میں لوک رنگ نمایاں تھا۔ دیہات کی کچی مٹی کی بو باس ان کی تحریروں میں رچی بسی تھی۔ مزاحیہ مضامین کے علاوہ یوسف صاحب نے بے شمار خاکے بھی لکھے اور ان میں بھی اپنی فطری شریف النفسی کا دامن نہیں چھوڑا۔ خاکے کو خاکہ ہی رہنے دیا۔ خاکہ اڑا کر خاک ڈالنے کی دانستہ کوشش نہیں کی۔ ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے جس میں ان کے پندرہ پیاروں کے خاکے شامل ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کا نام انھوں نے پندرہ پیارے رکھا ہے، البتہ وہ چونکہ ایک پیارے انسان تھے اس لیے پندرہ پیارے کی اشاعت سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مزاح ہو یا عملی زندگی دونوں مورچوں پر وہ تاعمر سائیڈ سے چلتے رہے۔ اپنی تحریروں میں یہاں وہاں طنز کا ایک آدھ نشتر چلاتے بھی تو در پردہ، چنانچہ اپنی آخری تصنیف طرفہ تماشا میں بھی انھوں نے سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے تماشہ کوئی کرتب نہیں دکھایا۔ ویسے بھی وہ تماشا دکھا کر بھیڑ اکٹھا کرنے والوں میں نہیں تھے اپنی اولین تصنیف سائیڈ سے چلیے سے آخری تصنیف طرفہ تماشا تک سائیڈ سے چلتے رہے۔ کسی کی دل آزاری ان کی فطرت میں نہیں تھی [illegible] احسان کی یہی ایک ادا ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آ گیا کہ وہ چپ چاپ [illegible]
[illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] جوار رحمت میں پناہ دے دے۔ آمین ●●

عابد معز (ریاض)

مشفق دوست

مسیح انجم سے پہلی ملاقات میرے ایک دوست افضال محمود جاوید نے کروائی تھی۔ جاوید مسیح انجم کے شاگرد ہیں اور اخیدہ میں رہتے ہیں۔ جاوید کو پتہ تھا کہ میں مزاحیہ مضامین لکھتا ہوں اور انھیں چھپا کر رکھ لیتا ہوں کسی رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجتا۔ ایک دن جاوید نے کہا کہ ہم کسی صبح مسیح انجم صاحب سے ملنے چلیں گے۔ میں نے سوال کیا، شام میں کیوں نہیں۔ جواب ملا، وہ شام میں نہیں ملتے۔ اس سے پہلے کہ میں مسیح انجم کی شاموں کے بارے میں غلط اندازے قائم کرتا، جاوید نے وضاحت کر دی کہ شام میں مسیح انجم صاحب اخبار رہنمائے دکن، ماہنامہ شگوفہ اور دیگر ادبی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کی ایک صبح میں جاوید کے ہمراہ پہلی مرتبہ کسی مزاح نگار سے مل رہا تھا۔ میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ ان میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ میانہ قد، نہ لمبے اور نہ ہی پستہ قد، دبلے اور نہ ہی موٹے، درمیانی جسامت اور کالے اور نہ ہی گورے، سانولا رنگ لیکن ایک منفرد بات میں نے یہ محسوس کی کہ موصوف کا چہرہ کم اور سر اور داڑھی کے بال زیادہ تھے۔ ان میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہونے کے باوجود ایک کشش تھی جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ جاوید نے میرا تعارف کروایا۔ صاحب یہ میرے دوست ہیں جو مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں۔ میں دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے انھیں آپ کے پاس لایا ہوں۔ مسیح انجم نے مجھ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر سوال کیا، کیا کرتے ہو، میں نے جواب دیا، مزاح نگاری کے علاوہ میں ایم بی بی ایس کے چوتھے سال کا طالب علم ہوں۔ مسیح انجم نے خوب کھل کر اپنا مخصوص قہقہہ لگایا اور جاوید سے کہا، جاوید تم وکالت پڑھ رہے ہو اور یہ طب کے طالب علم ہیں۔ تم دونوں میں دوستی ہے۔ تمھارے دوست مزاح لکھتے ہیں اور تم انھیں لے کر میرے پاس آئے ہو۔ یہی اتفاقات مزاح ہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک مضمون مسیح انجم کی رائے جاننے کے لیے دیا۔ سرسری طور پر دیکھنے کے بعد انھوں نے بعد میں ملنے کے لیے کہا۔ میں نے جاوید سے "بعد میں ملنے" کا مطلب پوچھا تو موصوف نے بتایا کہ اس میں کوئی پوشیدہ پیام نہیں ہے۔ آپ پندرہ دن بعد صاحب سے مل لیں۔ مجھے پندرہ دن انتظار کرنے کی زحمت پیش نہیں آئی۔ اسی ہفتہ 'رہنمائے دکن' کے نوجوانوں کے صفحہ پر مسیح انجم نے میرا مضمون شائع کر دیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے دوسری صبح میں تنہا مسیح انجم کے گھر پہنچا۔ رائے جاننا چاہی تو انھوں نے بتایا کہ قارئین کے خطوط اتنی جلد نہیں آتے۔ میں نے اپنا دوسرا مضمون مسیح انجم کی نذر کیا اور ان کے مضامین کا مجموعہ "سائیڈ سے چلیے"۔ پر آٹوگراف لے کر واپس چلا آیا۔

دوسرے مضمون کو بھی مسیح انجم نے جلد ہی شامل اشاعت کر لیا۔ اس دوران میں نے ان کی کتاب پڑھ لی۔ مجھے اپنی "سائیڈ" کا عرفان حاصل ہوا۔ میں نے مزاح نگاری کو فائنل امتحان تک ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا اور سنجیدگی سے پڑھائی میں جٹ گیا۔ فائنل امتحان کے بعد جب مجھے باوثوق ذرائع سے پتہ چلا کہ میں کامیاب ہو چکا ہوں تو میں پھر ایک صبح مسیح انجم سے ملنے ان کے گھر گیا۔ مسیح انجم نے طویل عرصہ تک غائب رہنے کی شکایت کی اور مزاح نگاری کے میدان میں ثابت قدم رکھنے کے لیے ایک شام دفتر شگوفہ لے گئے۔ میرا تعارف ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، ایڈیٹر شگوفہ سے کروایا۔ میرا تیسرا مضمون تقریباً تین سال کے وقفہ کے بعد شگوفہ میں چھپا اور پھر اشاعت کا یہ سلسلہ رسالوں اور اخباروں میں جاری رہا۔ یوں مسیح انجم کے توسط سے میرے مضامین چھپنے لگے اور میرا تعارف شگوفہ اور حیدرآباد کے زندہ دلوں سے ہوا۔

مسیح انجم سے صبح کے بجائے شام میں ملاقاتیں ہونے لگیں اب میرے لیے وہ دوست کے استاد نہیں رہے۔ صرف دوست تھے لیکن ہماری دوستی کے درمیان عمر کے فرق کا لحاظ ہر دم رہا۔ وہ مجھ سے شفقت سے پیش آتے اور میں ان کا احترام کرتا۔ مسیح انجم بہت بھولے اور سیدھے سادے انسان تھے جس کی وجہ سے وہ ہر کسی کے پرخلوص اور سچے دوست ثابت ہوئے۔ ایسی تعلقات بھی خواہ کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ بیوی بچوں اور احباب کی خیریت ضرور دریافت کرتے تھے اس قدر سادہ لوح تھے کہ تنخواہ اور آمدنی تک پوچھ بیٹھتے۔

مسیح انجم زندہ دلان حیدرآباد کے سرگرم رکن رہے ہیں۔ مختصر عرصے کے لیے سب سے جونیئر ممبر کی حیثیت سے میں بھی زندہ دلوں کی اس ٹولی میں شامل رہا۔ زندہ دلان کی خوبی یہ ہے کہ ممبران ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں اور مل جل کر کام کرتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء کی سالانہ تقریبات کے کنوینر مسیح انجم تھے اور میں صرف نثری اجلاس کا کنوینر تھا۔ ایک مزاح نگار کو نثری اجلاس میں

نہ کرنے پر سخت نا راض تھے۔ ان کا نزلہ دھمکیوں کی طرح مجھ پر اُترنے لگا۔ انھوں نے میرے نام دل جسپ خطوط لکھے اور ہر خط میں مجھے عابد معز کے بجائے عابد محض لکھا۔ وہ لطف اندوز ہوتے اور مجھے اپنا بگڑا نام دیکھ کر غصّہ آتا۔ تب مسیح انجم سمجھاتے۔ مزاح نگار کو کبھی غصّہ نہیں آنا چاہیے بعد میں بھی اکثر مسیح انجم اپنے مخصوص انداز میں اس واقعہ کا ذکر کرتے اور مجھے عابد محض کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔

مسیح انجم گاؤں سے شہر آئے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگ عموماً تنہا ہجرت کرتے ہیں۔ اپنے ماحول کو بہت پیچھے چھوڑ آتے ہیں لیکن مسیح انجم کی یہ انفرادیت تھی کہ وہ گاؤں کو اپنے ساتھ لیے آئے تھے۔ شہر میں مسیح انجم کے ساتھ گاؤں بھی رہتا اور بستا تھا۔ وہ اکثر دوستوں کو اپنے گاؤں کے واقعات سنایا کرتے۔ انھوں نے اپنے وطن کے بارے میں اس قدر اور اتنا بتایا کہ ان کے گاؤں کے بارے میں ہمیں خاصی معلومات حاصل ہوگئیں۔ آج بھی مجھے ان کے گاؤں کا نام وِیلکٹور یاد ہے جہاں پر عقل داڑھ کے درد کا علاج "انبور" نامی پھل سے کیا جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ پھل کیسا ہوتا ہے۔ مسیح انجم نے یقیناً اس کی تفصیل سنائی ہوگی لیکن مجھے اب یاد نہیں ہے ایسے ہی کئی واقعات اور گاؤں کی زندگی کے تعلق سے معلومات مسیح انجم نے اپنے مضامین میں دراہم کی ہیں۔ ان کے ایک مضمون سے مجھے علم ہوا کہ بیل بنڈی میں جوتے جانے والے دو بیل ایک دوسرے سے کس طرح مختلف ہوتے ہیں۔ ایک دایاں اور دوسرا بایاں ہوتا ہے۔ ان کے نام گلشن اور ریخ ہوتے ہیں۔ کسی صورت وہ ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتے۔ ایک اور مضمون میں مسیح انجم نے گاؤں کی بوریا تھیٹر میں فلم دیکھنے کی روداد پر اپنا زورِ بیان صرف کیا ہے۔

میں نے چند مہینے گاؤں کے پرائمری ہیلتھ سنٹر پر کام کیا ہے۔ اس دوران بوریا تھیٹر میں فلم دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ مجھے بیٹھنے کے لیے بوریے کے بجائے کرسی پیش کی گئی تھی۔ فلم سے زیادہ میں مسیح انجم کے مضمون کے پس منظر میں ماحول سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اپنے ماحول اور اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنا ایک ادیب کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ مسیح انجم کو یہ فن خوب آتا تھا اور وہ ایک کامیاب مزاح نگار تھے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد نے عوامی مقبولیت کے کامیاب ادبی اجلاس منعقد کرکے نثر نگاروں کو شاعروں کی طرح اسٹیج فراہم کرنے کی روایت ڈالی ہے۔ ضمیر جعفری قبلہ نے اس مخصوص ادبی اجلاس کو نثری مشاعرے کا نام دیا ہے۔ شاعر کے ترنم کی طرح مزاح نگار کے پڑھنے کا انداز کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ اس فن میں رشید قریشی یکتا و دانا تھا۔ مسیح انجم کا بھی اپنا ایک مخصوص اور منفرد انداز تھا جس کی وجہ سے وہ ادبی اجلاسوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔

مسیح انجم صحت کے تعلق سے بیمار ہونے کی حد تک فکرمند رہتے تھے۔ مختلف موضوعات پر سوالات کرنے کے لیے میرے کلینک آتے تھے۔ کلینک میں گھنٹہ دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد ملاقات کا موقع ملتا۔ جتنا زیادہ انتظار ہوتا، اتنا ہی وہ خوش ہوتے تھے۔ خوش ہو کر کہتے کہ لگتا ہے تمہارے ہاتھ میں شفا بھی ہے۔ کسی مریض کے آنے سے پہلے یہ بتلاؤ کہ بلڈ پریشر کیوں بڑھتا ہے۔ مریض کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔ مرض ذیابیطس کی علامات کیا ہیں۔ کیا ملیریا کا علاج جڑی بوٹیوں سے ممکن ہے۔ مسیح انجم مریضوں کے ڈر سے کئی سوالات ایک ساتھ پوچھ لیتے۔ میں ان سے کہتا کہ کلینک آنے اور انتظار کی زحمت کیوں کرتے ہیں۔ ایسے استفسارات دفتر شگوفہ پر ہی کر لیا کیجیے جواب دیتے کہ بات کرنے کے لیے مناسب مقام اور وقت کا ہونا ضروری ہے۔ دفتر شگوفہ میں طنز و مزاح اور ادب پر گفتگو ہونی چاہیے اور پھر تم دفتر شگوفہ میں ڈاکٹر کہاں ہوتے ہو۔ ایک مزاح نگار بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ مسیح انجم سے بحث کیے بغیر میں ان کے سوالوں کے جوابات دے دیتا۔ جوابات سن کر مسیح انجم وقتی طور پر مطمئن ہو جاتے لیکن تصدیق کے لیے اپنے ایک شاگرد ڈاکٹر سے بھی پوچھ لیا کرتے تھے۔

چھٹی پر حیدرآباد جانے کی پیشگی اطلاع میں احباب شگوفہ کو دیتا ہوں۔ ہم سبھی کو ملاقات کا انتظار رہتا ہے لیکن اس مرتبہ جب چھٹی پر جاؤں گا تو مسیح انجم نہ ہوں گے۔ اس خیال سے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے —— اور یہ احساس کرب میں مبتلا کرتا ہے کہ " میں اپنے ایک شفیق دوست اور ایک منفرد مزاح نگار سے محروم ہو چکا ہوں !"

مسیح انجم

شگوفہ کی عدالت میں

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میں سرکاری طور پر قسمیں کھانے پر مامور تھا۔ دن بھر میں کوئی پچیس تیس یا بس یہی ایک قسم کی قسم کھاتا:

"خدا کی قسم صحیح صحیح ترجمہ کروں گا۔"

ہر بار قسم کھاتے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک نان ویجیٹیرین کے سامنے بار بار اڈلی سانبر کی ڈش پیش کی جا رہی ہو۔ یہ بھی کوئی قسم ہوئی؟ نہ ندرت، نہ ورائٹی! ندرت اور ورائٹی ہو تو قسم ہی کیا، گالیاں کھانے میں بھی مزہ آجائے)۔

جب میں قسم کھا لیتا تو اس کے فوری بعد گواہ کو بھی قسم کھلاتا کہ "کہو، خدا کی قسم جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔!

اس طرح قسم کھانے اور کھلانے کا مجھے معاوضہ بھی ملتا تھا۔ مہینے کے ختم پر جب میں "معاوضہ" اور "محنت" کا موازنہ کرتا تو بہت ساری قسمیں "فری" میں پڑتی تھیں۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے جب مجھے میٹرک کامیاب کیے ہوئے تین چار دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن تایا جان نے حکم دیا کہ جاؤ، عدالت جا کر میری رخصت کی درخواست دے آؤ! (والد کو تایا جان اور والدہ کو تائی ماں کہنے کا سبق مجھے بچپن ہی میں پڑھایا گیا تھا) میرے تایا جان عدالت منصفی سدی پیٹھ میں صیغہ فوجداری میں نقل نویس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ چناں چہ ان کے حکم کی تعمیل میں عدالت پہنچا اور ان کی درخواست پیش کر دی۔ اتنے میں ایک شناسا نے یہ بتایا کہ عدالت میں COPYIST کی ایک اسامی خالی ہے۔ درخواست دے دو، تقرر ہو جائے گا۔

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً درخواست دے دی۔ خدا کی دین کا حال ہم سے پوچھیے کہ

کر دینے گئے تھے رخصت کی درخواست تایا جان کی لیکن واپس لوٹے تو COPYST (بروزن TYPIST) کا
دم چھلہ ساتھ لگا ہوا تھا ۔ دوسرے ہی دن نقل نویسی پر مامور ہو گئے ۔ پہلے روز ہی یہ عقدہ کھلا کہ نقل
نویسی میں عقل کی قطعی ضرورت نہیں ۔

چند ہی دنوں میں ہماری تلگو دانی اور انگریزی دانی کے چرچے چہار دانگ عدالت میں پھیل
گئے ۔ البتہ ہماری اردو دانی کو کوئی بھی خاطر میں نہ لاتا تھا کیوں کہ وہاں کے عملے میں کئی ایک جید اور
خرانٹ قسم کے منشی کامیاب اہلکار تھے ۔ جن کے آگے ہماری اردو دانی کا دیا جلتا نہ تھا ۔ البتہ
ہماری تلگو دانی اور انگریزی دانی کا سکہ خوب چلتا تھا ۔ وہ بھی محض اس لیے کہ پورے عملے میں ہم
دوسرے شخص تھے جو میٹرک پاس تھے ۔

نقل نویسی پر مامور ہوتے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز عدالت کے اجلاس پر محکمہ
آب کاری کی طرف سے گانجے کا مقدمہ پیش ہوا ۔ فاضل مجسٹریٹ گواہوں کے بیانات کی سماعت
فرما رہے تھے اور مترجم صاحب گواہوں کے تلگو بیانات کا اردو ترجمہ مجسٹریٹ تک پہنچا رہے تھے ۔
ایک گواہ نے اپنے بیان کے دوران یہ بتایا کہ ملزمین نے گانجے کے درخت " بنتی چیٹلو " (گیندے کے پودے)
کے درمیان بوئے تھے ۔ (چونکہ گانجے کی پتیاں گیندے کی پتیوں سے مشابہ ہوتی ہیں اس لیے غیر
قانونی کاروبار کرنے والے گانجے کے پودوں کو گیندے کے پودوں کے درمیان بوتے ہیں) اب جو مترجم
صاحب " بنتی چیٹلو " کے ترجمہ پر پہنچے تو بغلیں جھانکنے لگے ۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو فوراً لفظی ترجمہ کر ڈالا ۔
گولے کے درخت ۔ فاضل مجسٹریٹ جو تلگو سے ناواقف تھے ، حیران کہ یہ گولے کے درخت کیا ہوتے ہیں ۔ ؟
پتہ نہیں اجلاس پر مجسٹریٹ کو کس نے بتایا کہ ان کے ماتحتین میں ایک ایسا رنگروٹ بھی ہے جو یہ
مشکل آسان کر سکتا ہے (اس وقت تک ہماری تلگو دانی کی مجسٹریٹ کو خبر نہ تھی) اجلاس پر
ہماری طلبی ہوئی ۔ ہم حیران کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے ؟ اور ہم سے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا ہے
کہ اجلاس پر طلبی ہوئی ہے ۔ ہم نے اپنے شرٹ کو جو پتلون سے باہر ہوا جا رہا تھا ، اچھی طرح ان
(IN) کیا ۔ بال ٹھیک سے جمائے چہرے پر " یادحشت کے آثار لیے وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ
مَنْ تَشَاءُ کا ورد کرتے ہوئے تھر تھر کانپتے اور لڑکھڑاتے قدموں سے اجلاس پر حاضر ہوئے اور فوراً
" YOUR HONOUR " اور " MY LORD " کہتے ہوئے دھڑا دھڑ دو تین فرشی آداب بجا لائے ۔ فاضل
مجسٹریٹ نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے پوچھا " ہاں تو جناب یہ بنتی چیٹلو کیا ہوتا ہے ؟"
اس آسان لفظ پر ہمارے اوسان جو خطا ہو رہے تھے فوراً بحال ہو گئے ۔ کیوں کہ ہم ان درختوں
کو نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ کئی بار ان درختوں میں آنکھ مچولی بھی کھیلی تھی ۔ بلا جھجک ترجمہ کر دیا :
" گیندے کے درخت "
مجسٹریٹ صاحب بہت خوش ہوئے ۔ ترسیل کا المیہ ختم ہو گیا اور گواہ کی جان چھوٹی ۔ اسی وقت
مجسٹریٹ نے مترجم کو حکم دیا کہ جاؤ تم اپنے سیکشن میں کام کرو ۔ ادھر خاکسار کو حکم دیا کہ کرسی پر بیٹھو

اور قسم کھاؤ کہ خدا کی قسم صحیح صحیح ترجمہ کروں گا۔ پھر تو ہم مترجم کی کرسی پر براجمان ہوگئے۔

ہائے! وہ بھی کیا دن تھے جب ہم فاضل مجسٹریٹ کی سیدھی جانب کرسی پر بیٹھے مترجم کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ مہینہ بھر قسمیں ہم کھاتے اور اس کا معاوضہ تنخواہ کی شکل میں کوئی "کھوررخت" والے مترجم صاحب پاتے۔ اس وقت ہماری عمر ۱۸، ۱۹ سال کی تھی لیکن دیکھنے میں بالکل "لونڈا" نظر آتے تھے۔ چہرے پر دور دور تک سبزے کا پتہ نہ تھا۔ ویسے ہمارے بالغ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس کو کیا کیجیے کہ داڑھی اور مونچھوں کو ہمارے بالغ ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی ہم جب تک عدالت میں رہے مترجم رہ کر بھی (COPYIST) کے (COPYIST) ہی رہے۔ ہمیں اس بات کا شدید ملال ملا کہ "گیندا" اور "گولہ" میں جو نازک فرق ہوتا ہے، اس کے بتلانے کا معاوضہ نہیں ملا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے حصے میں پولس کے جوانوں، جمعداروں اور سب انسپکٹروں کے سیلوٹس آئے جن کا کوئی شمار ہی نہیں لیکن سیلوٹس سے انسانی ضروریات وخواہشات کی تکمیل تو ہو نہیں پاتی۔ بالآخر ۱۹۵۶ء میں عدالت کو خیرباد کہا اور حیدرآباد چلے آئے۔ ہمیں اگست کا مہینہ دو طرح سے عزیز ہے۔ ایک تو اس لیے کہ ہمارے ملک کو اسی مہینے میں انگریزوں سے نجات ملی۔ دوسرے، اس لیے کہ ہم کو اسی مہینے میں قسمیں کھانے سے چھٹکارا حاصل ہوا۔

جہاں تک میرے دیگر احوال کا تعلق ہے، وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ آندھرا پردیش کے نقشہ میں ایک حقیر سا نکتہ ہے، جس کا نام ہے ویلکٹور۔ یہی میرا پیدائشی گاؤں ہے۔ میٹرک کی سند میں تاریخ پیدائش ۶ ر اکتوبر ۱۹۳۳ء لکھی ہوئی ہے۔ میرے پیدا ہوتے ہی والدین نے مجھے اپنی چچی کی گود میں ڈال دیا کہ "جاؤ بیٹا! تم اپنے چچا کا گھر روشن کرو" کیونکہ میرے چچا کے گھر میں کوئی "چراغ" نہیں تھا جو ان کا گھر روشن کرتا۔ البتہ ہمارے گھر میں بہت سے "چراغ" روشن تھے جن کی موجودگی میں میرا وجود ایک فاضل چراغ کا سا ہوگیا تھا۔ چناں چہ بچپن ہی میں مجھے یہ سبق پڑھایا گیا کہ میں والد کو تایا جان اور والدہ کو تائی ماں اور چچا کو ابا جان اور چچی کو امی جان کہوں گویا یوں سمجھیے کہ میری مزاح نگاری کا آغاز یہی ہے۔ اسی لیے بچپن میں بعض عزیز و اقارب مجھے چھیڑنے کی خاطر ازراہ مذاق کہا کرتے "ارے یہ لونڈا اپنے باپ کو باپ نہیں بولا۔ پڑوسی کو چچا کیا بولے گا؟"

میری ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی جہاں ایک چاوڑی کو مدرسہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہ مدرسہ بھی ایسا تھا جہاں نہ تو بجلی کا انتظام تھا اور نہ فرنیچر کا، لڑکے خود بلا لحاظ مذہب وملت باری باری روزانہ مدرسہ میں جھاڑو لگاتے اور اپنی نشستوں کا آپ انتظام کرلیا کرتے تھے ہر لڑکا اپنی بغل میں بستہ کے ساتھ ساتھ چٹائی یا ٹاٹ دبائے اسکول کو چلا آتا۔ ہمارے استاد خود بھی بوریے پر تشریف فرما ہوتے۔ وہ ذات کے برہمن تھے۔ تلگو تو خیر ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ لیکن اردو پر بھی خاصا عبور تھا۔ املا نویسی کے لکھنے میں ایسے ادق اور مشکل الفاظ لکھواتے کہ بس پھریری سی آجاتی۔ وہ کچھ اس قسم کے الفاظ کا املا لکھواتے جن میں طلبا کے پٹنے کا خاصا

اہتمام رکھا گیا ہو۔ جیسے حتی الامکان قسطنطنیہ اور استنبول وغیرہ اس قسم کے الفاظ سے جماعت دوم ہی میں پالا پڑا تھا۔

میں نے سدی پیٹھ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔ یہاں میں نے پریم چند کے افسانے پڑھے اور کافی متاثر ہوا۔ انہی دنوں میرے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ میں بھی کچھ لکھوں لیکن روزانہ مدرسے کو آٹھ میل پیدل جانے اور آنے کی مسافت اس جذبہ کو کچل دیتی تھی اور پھر دوسری بات یہ کہ ادبی ماحول کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔

میری عملی زندگی کا آغاز شہر حیدرآباد سے ہوتا ہے۔ یہیں میں نے محکمۂ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی اور یہیں عثمانیہ یونیورسٹی سے خانگی امیدوار کی حیثیت سے بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات کامیاب کیے یہیں میری ملاقات ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے ہوئی اور پھر یہ ملاقات رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ اب تو میں اپنے آپ کو ان ہی کے خاندان کا ایک فرد تصور کرتا ہوں۔ میری حوصلہ افزائی کرنے میں مجتبیٰ حسین کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین جتنے اچھے مزاح نگار ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ سادگی پسند ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ آیا مجھے ان کے مضامین زیادہ پسند ہیں یا ان کی سادگی۔

میں نے افسانے سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۶۶ء میں روزنامہ "ملاپ" میں شائع ہوا۔ مجھے افسانے کے قفسوں سے نکال کر طنز و مزاح کے ہماری دار تلوار میں چلنے کے لیے اکسانے والے میرے عزیز دوست مصطفیٰ کمال ہیں۔ انھوں نے میرا پہلا مزاحیہ مضمون روزنامہ "رہنمائے دکن" میں شائع کیا۔ (یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ کمال صاحب "رہنمائے دکن" کا ادبی صفحہ ترتیب دیا کرتے تھے) اس کے بعد کمال صاحب نے ماہنامہ "شگوفہ" میں میرے اتنے مضامین شائع کیے کہ "شگوفہ اور زندہ دلانِ حیدرآباد" میری کمزوری بن گئے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے مجھے "شگوفہ" کی مجلسِ ادارت میں شامل کر کے میری عزت بڑھائی۔

یوں تو میرا نام محمد مسیح الدین ہے لیکن مسیح انجم کے نام سے مزاح نگاری کرتا ہوں۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے میں خالص طنز کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ خالص طنز گالی کے قریب پہنچتا ہے کہ رذیل کو رذیل کہنا ادب نہیں گالی ہے اور بات بڑھ کر فوجداری تک پہنچتی ہے۔ مزاح نگاری کے لیے اعلیٰ ظرفی اولین شرط ہے اور اس شرط پر وہی مزاح نگار کھرا اترتا ہے جس نے ساری انسانیت سے ٹوٹ کر پیار کیا ہو اور جس میں غم و آلام کو پی جانے کا حوصلہ ہو۔

میں دوستوں کی محفلوں میں مزاح کے نام پر اوچھے فقرے کسنے سے بھی بہت گھبراتا ہوں اور فیشن آج کل بہت عام ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ جو بھی کہو بزبانِ قلم کہو، اس میں ہر دو ادیب او قاری کی پوزیشن بالکل محفوظ رہتی ہے اور پھر آج کا المیہ یہ ہے کہ آپ چوٹ تو کسی اور پر کرتے ہیں لیکن آستہ

کوئی اور جڑھاتا ہے۔

میں اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مزاح لکھتا ہوں۔ میری مزاح نگاری نے کسی اور کو نہ سہی کم از کم میری ذات کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ اب مجھ میں وہ حماقتیں باقی نہ رہیں جو اکثر ادیبوں اور شاعروں کی ذات میں سرایت کر جاتی ہیں۔ مثلاً فوٹو اسٹوڈیو کے کوٹ اور ٹائی پر اپنی تصویر کھنچوانا اور رسالوں میں چھپوانے کے لیے بھجوانا۔ اب میں بالکل ہی ایک سیدھا سادا انسان ہوں لیکن اس کے باوجود ہر نیا ملنے والا مجھ سے کچھ گھبرا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی واحد وجہ صرف میری داڑھی ہے۔ میں نے داڑھی محض اس لیے چھوڑ رکھی ہے کہ مجھ میں اور طلبا میں کچھ تو امتیاز رہے۔ لوگ اپنی عمروں کو چھپانے کے لیے داڑھی منڈواتے ہیں اور میں محض اس لیے داڑھی بڑھاتا ہوں کہ لوگوں کو میری عمر کا صحیح اندازہ ہو اور وہ میری بزرگی کا احترام کریں۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنی عمر سے کوئی دس بارہ سال پیچھے نظر آتا ہوں۔ اس میں نہ تو آئینہ کا قصور ہے اور نہ میری بینائی کا۔ بلکہ دوستوں اور ڈاکٹروں کی یہی رائے ہے۔ جس روز میرے دوست احباب میری صحیح عمر پہچاننے لگ جائیں گے تو میں اس وقت داڑھی رکھنے کے فیصلے پر نظر ثانی کر دوں گا۔ مجھے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ میری داڑھی پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔ اب تو یہ داڑھی میری شناخت کا واحد ذریعہ بن گئی ہے۔ چناں چہ میرے افسانہ نگار دوست جناب عاتق شاہ جب کبھی میرے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو یہی پوچھتے ہیں کہ "داڑھی ہے"؟ "داڑھی کدھر گئی"؟

مصطفیٰ کمال بھی جب مجھ پر مہربان ہو جاتے ہیں تو اپنی مادری زبان کی بجائے سرکاری زبان تلگو کو زحمت دیتے ہیں۔

مثلاً: ایکا ڈا آنا وگڈ یوانا؟ (کہاں ہیں داڑھی والے بھائی)؟

جب داڑھی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں اپنا بچا کھچا خاکہ بھی کھینچ دوں۔ ویسے یہ کام ایسا ہی ہے جیسے ایک سرجن خود اپنے دستِ مبارک سے اپنا آپریشن کرتے بیٹھا ہو۔

رنگ ذ گورا نہ کالا۔ جوانی میں چہرا اتنا بُرا بھی نہیں تھا کہ حسن کی بھیک ہی نہ ملتی۔ زندگی میں تین چار مواقع ایسے بھی آئے کہ بالکل یہی سچویشن پیدا ہو گئی تھی۔

حسن جب ملتفت ہو تو کیا کیجیے
عشق کی مغفرت کی دعا کیجیے

قد: محکمہ پولس میں بھرتی کے لیے جو معیار مقرر کیا گیا ہے اس سے ایک انچ کم۔

سینہ ۳۴ انچ اور کمر ۳۶ انچ۔ اگر پتلون میں بیلٹ نہ لگاؤں تو چلتے وقت دونوں ہاتھوں کو مصروف رکھنے کی نوبت آجائے۔

بصر: سر سید احمد خاں کا پایا ہے لیکن دماغ سر سید احمد کا نہیں۔ البتہ اس کے صحت مند

ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ورنہ کیا عجب کہ جدیدیت کے نام پر اوٹ پٹانگ قسم کے افسانے لکھنے لگ جاتا۔ بال بہت گھنے لیکن نائی کی غفلت سے جب کبھی سائز میں چھوٹے ہو جاتے ہیں تو سر کے پچھلے حصے کے کچھ بال AERIAL (ایریل) کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے نائی کی خوشامد اس لیے کرتا ہوں کہ وہ میرے سر میں ایریل کا جواز نہ پیدا کرے۔

جسم

پاؤں : لیڈیز سائز (LADY'S SIZE) کی تعریف میں آتے ہیں۔ غفلت سے کبھی بیوی کے چپل پہن لوں تو کام نکل جائے۔

وزن : ابھی وہ نوبت ہی نہیں آئی کہ ڈاکٹر گھٹانے کا مشورہ دیں۔ یوں بھی میں ڈاکٹر اور ''وزن'' دونوں سے بے حد گھبراتا ہوں

کمزوری : آج کا کام کل پر ٹالنا۔ شاگردوں کے خوف سے ہوٹلوں اور سڑکوں پر کھاتے اور پیتے (سگریٹ) گھبرانا۔

تصانیف : ''تساہیڈ سے چلیے'' ''در پردہ'' ''چنانچہ'' ان میں سے دو تصانیف کو اتر پردیش۔ اردو اکیڈیمی اور آندھرا پردیش، اردو اکیڈیمی سے انعامات ملے۔

اولاد : تصانیف کی دگنی۔

شگوفہ کی عدالت میں میرا غیر حلفیہ بیان ادھورا سمجھا جائے گا اگر میں اپنے افسانہ نگار دوست جناب نعیم زبیری اور ممتاز ادیب جناب داؤد اشرف کا ذکر نہ کروں۔ ان دو حضرات نے میری طرزِ نگارش کو پسندیدگی کی سند اس وقت بخشی جب کہ کوئی چارہ ڈالتا نہ تھا۔ اگر میرے مضامین میں مزاح کی جھلکیاں ملتی ہوں تو اس کی داد مجھے دیجیے قبول کر لوں گا اور اگر نہ ہوں تو مجھے دوش مت دیجیے بلکہ ان دو حضرات ہی سے باز پرس کیجیے کہ کیوں ایک معصوم کو خواہ مخواہ گمراہ کیا !؟

●●

(شگوفہ ہندوستانی مزاح نمبر کے لیے لکھی گئی خود نوشت)

مسیح انجم

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا×

(اس انشائیہ کے صرف کردار اور نام فرضی ہیں)

اس کو آپ ہماری کمزوری سمجھیے یا بزدلی ہم کسی بھی مقابلے کے قائل نہیں۔ ہم بچپن ہی سے امن کے پیروؤں میں سے ہیں۔ یہاں ہم یہ بات صاف طور پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس امن پسندی کے پیچھے ہماری جسمانی ساخت کو (بڑا) دخل ہے۔ اس لیے جب کبھی بھی مقابلہ کا نام آجاتا ہے تو ہماری روح بری طرح لرز جاتی ہے اور ساتھ ہی ہماری آنکھوں کے سامنے وہ تصویر ایک فلم کی طرح گھوم جاتی ہے جب ہم نے میل کے میدانوں اور سیاسی دنگلوں میں ایک سے ایک شاطر کھلاڑی کو اسٹریچر کے ذریعے سے امبولنس کار میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وسیع ترین مشاہدہ کے باوجود ہماری جو شامت آئی تو ہم نے راکٹ سگریٹ کے انعامی مقابلے میں شرکت کی ٹھان لی۔

ہوا یوں کہ ہم ایک دن ہوٹل میں بیٹھے ہوئے اخبار کے مطالعہ میں مصروف تھے کہ ہماری نظر ایک اشتہار پر جمی رہ گئی۔ اشتہار بالکل جلی حروف میں تھا۔ "راکٹ سگریٹ کے انعامی مقابلے میں حصہ لیجیے اور پچیس ہزار روپیوں کا انعام حاصل کیجیے۔"

سنتے آئے ہیں کہ لالچ بہت بری بلا ہے۔ پچیس ہزار روپیوں کے آفر کو دیکھتے ہی ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ حالانکہ ہمارا پچھلا تجربہ شاہد ہے کہ ہم کئی دفعہ معمہ بازی میں بڑی سے بڑی زک اٹھا چکے تھے۔ جوں ہی ہم نے مقابلے کی شرائط کو پڑھا تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم ہی لاکھ کے چوتھائی حصے کے مالک، بلا شرکت غیرے بنائے جا کر "پاؤ لکھ پتی" کے لقب سے نوازے جانے والے ہیں۔ اس وقت ہم سے ایک غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی۔ ہم نے ہوٹل کے مالک کی نظروں سے بچ بچا کر اشتہار کے اس حصے کو اخبار سے الگ کیا جس طرح

× مسیح انجم کا پہلا مزاحیہ مضمون

بے روزگار نوجوان پانی پینے کے بہانے ہوٹل میں داخل ہو کر اخبار سے "WANTED" کالم کو الگ کر کے جیب میں اتار لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم بڑی ہی شان سے ہوٹل سے نکل پڑتے۔ شرائط کو پورا کرنے کے لیے حاتم طائی کی طرح۔

شرط نمبر ۱ کی رو سے "راکٹ سگریٹ" کے پچاس خالی پیکٹس کمپنی کو روانہ کرنی تھیں۔ لیکن ان دنوں خالی ڈبیہ کا پڑا ہوا ملنا محال تھا۔ ہم نے ان کی تلاش میں فٹ پاتھوں اور سڑکوں کے علاوہ کچرے کی کنڈیوں تک کے طواف کر ڈالے مگر بے سود۔ اس ناکامی کے بعد ہمیں ایک ترکیب سوجھی کیوں نہ سگریٹ پینے والوں کا تعاقب کیا جائے؟ بس پھر کیا تھا۔ اب ہمارا روز کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جہاں کہیں کوئی شخص سگریٹ کی ڈبیا نکالتا ہوا نظر آتا تو ہم خود وہاں پہنچ جاتے اور دیکھتے کہ وہ کونسی سگریٹ پی رہا ہے۔ اگر وہ راکٹ سگریٹ پیتا نظر آتا تو ہمیں فکر دامنگیر ہوتی کہ وہ پیکٹ خالی کر کے کب پھینک دے گا۔ کئی دفعہ ہم خالی پیکٹ کے پھینکے جانے کے انتظار میں اس شخص کا پیچھا کرتے ہوئے نکلے جیسے کوئی پاکٹ ملیر ایک بڑی رقم پر ہاتھ مارنے کے لیے پیچھا کر رہا ہو۔ دو تین مرتبہ تو ہم شبہ کے الزام میں گرفتار ہوتے ہوتے بچے لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ہم اپنے مشن میں بری طرح ناکام رہے۔ یقین مانیے اگر ہم کو ہمیں شیر مارنے کے لیے کہا جاتا تو ہم تین سو ساٹھ چوٹے شیر بہا دیتے۔ اگر ہمیں مجنوں بننے کے لیے کہا جاتا تو ہم پورے صحرا کی خاک چھان ڈالتے لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ راکٹ سگریٹ کی خالی ڈبیا کا مسئلہ معشوق سے بھی زیادہ بڑھ چکا تھا۔ جب ہم نے اس شرط کے پس منظر کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ کمپنی اس شرط کی آڑ میں ملک کے بھولے بھالے نوجوانوں کو راکٹ سگریٹ کے دام میں پھنسا کر اپنا بنک بیلنس ٹھیک کرنا چاہتی ہے۔ آخر وہی ہوا جو کمپنی چاہتی تھی اور ہم بھی دھواں بازوں میں شریک ہو گئے۔ اب ہم پچاس کیا پچاس لاکھ خالی پیکٹس کمپنی کو روانہ کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔

شرط نمبر ایک کے بعد شرط نمبر دو کی باری آئی۔ اس شرط کے تحت مسکراہٹوں کو دیکھ کر دس فلمی ستاروں کے نام بتانے تھے لیکن اس شرط کا سب سے مشکل پہلو یہ تھا کہ چہرہ کو پوری طرح غائب کر دے کر صرف مسکراہٹ کو نمایاں کیا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر شرط نمبر ۲ کیا تھی۔ بس فلم دیکھنے والوں کے لیے ایک زبردست چیلنج تھا۔ ہم نے جب ان مسکراتے چہروں پر ایک سرسری نظر ڈالی تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہماری ہی کامیابی پر مسکرا کر مبارک باد دے رہے ہوں لیکن ہم نے جوں ہی داخلہ فارم کی خانہ پری کے لیے مسکراہٹ نمبر ۱ کا بہ نظر غائر جائزہ لیا تو ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ مسکراہٹ کو دیکھ کر کبھی ہیرو کا گمان ہوتا تو کبھی ہیروئن کا۔

مسکراہٹ نمبر ۱ کے بعد مسکراہٹ نمبر ۲ کی باری آئی۔ وہاں بھی وہی عالم تھا۔ اس کے بعد ہم نے یکے بعد دیگرے دس مسکراہٹوں کا جائزہ لیا۔ تمام کے تمام "صفا چٹ" واقع ہوئے تھے۔ ہیرو، ہیروئن میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کم از کم ایک عدد مونچھ والے ہیرو کی تصویر چھاپ دی جاتی تو حساب کی رو سے ہماری

(ایک بٹا دس) مشکل آسان ہو جاتی ۔ اس کے علاوہ ہماری سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہماری فلمی معلومات بہت محدود قسم کی واقع ہوئی تھیں ۔ ہم نے اپنی زندگی بھر میں جو آٹھ دس فلمیں دیکھی تھیں وہ سب ٹریجیڈی قسم کی واقع ہوئی تھیں ۔ ان فلموں میں ہیرو اور ہیروئن کو یا تو بالکل اداس یا پھر انھیں روتے ہوئے دکھایا گیا تھا ۔ اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ ہمارے لیے ان مسکراہٹوں کو پہچاننا کتنا مشکل کام تھا ۔ چنانچہ ہمیں یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ فلمیں دیکھیں اور فلمی ستاروں کی مسکراتی تصویریں جمع کریں ۔ دوسرے دن جب ہم دفتر پہنچے تو ہمارے ساتھ ایک ماہ کی رخصت کی درخواست "بیافت نصف" موجود تھی ۔ درخواست کو دیکھتے ہی "باس" نے پوچھا "کیوں جناب خیریت ؟ ہم نے قدرے شرماتے ہوئے کہا "جی ہاں خیریت ہے ۔" آج کل ملکی (COMPETATIVE EXAMINATION) کی تیاریاں کر رہا ہوں ۔ اس پر انھوں نے ہمیں تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ "بہت خوب ! اس میں شرمانے کی کیا بات ہے ؟ ہونہار نوجوان ایسے ہی ہوا کرتے ہیں ۔"

اس کے بعد انھوں نے رخصت منظور کر دی ۔ وہ بھلا ہمارے پلان کو کیا خاک سمجھتے ۔ اب ہمارا روز کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہم گھر سے ناشتہ کرکے نکلتے اور جلد چار شو دیکھ کر بھوکے پیاسے رات کے دو بجے مکان لوٹتے ۔ درمیان میں جو تھوڑا بہت فالتو وقت مل جاتا وہ فلمی ستاروں کی مسکراتی تصویریں خریدنے میں صرف ہو جاتا ۔ اس طرح سنیماؤں کے گیٹ کیپرس اور فٹ پاتھ پر فلمی تصویریں بیچنے والے ہمارے ہم راز بن گئے ۔ جب ہم کافی تعداد میں مسکراتی تصویریں جمع کر چکے اور فلمیں دیکھ کر فلمی ستاروں کی کافی اسٹڈی کر چکے تو پھر سے ان مسکراہٹوں کو خریدی ہوئی تصویروں کی مسکراہٹوں سے مقابلہ کیا تو پتہ چلا کہ ایک نہیں کئی فلمی ستارے ایک ہی اسٹائل سے مسکرا چکے ہیں ۔ چنانچہ ہم رات دن اس فکر میں ڈوبے رہتے کہ کون سی مسکراہٹ کس ہیرو یا ہیروئن کی ہے ۔ اس دن رات کی فکر میں مسکراہٹوں کا پتہ تو نہیں چلا البتہ مکان میں ہماری بیگم صاحبہ کا مسکراتا چہرہ غضب ناک صورت اختیار کر گیا ۔ وہ اس معاملے میں حق بجانب ہی تو تھیں کیونکہ ہمارا اوڑھنا بچھونا سب کچھ فلمی تصویریں بن گئی تھیں اس لیے وہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ ہمیں "فلمی مالیخولیا" ہو گیا ہے ۔ ہم نے انھیں بارہا سمجھایا کہ دیکھو بیگم صاحبہ ! اگر میں ہیروینوں کی محبت میں گرفتار ہوتا تو میرے پاس ہیروز کے فوٹو کیوں ہوتے ؟ یہ سننا ہی تھا کہ فوراً بول اٹھیں آج کل کے نوجوانوں کا کیا اعتبار وہ تو نئے نئے روپ دھارتے ہیں کیا عجب کہ ہیرو کے آڑ میں ہیروئن سے محبت کر بیٹھیں ۔" جب ہم نے کافی سمجھایا اور ثبوت کے طور پر انعامی اشتہار پیش کیا تو انھیں تھوڑا سا یقین آیا اور وہ یہ سمجھ کر چپ ہو گئیں کہ چلو انعام ملتے ہی مقدر بدل جائے گا ۔ بیگم صاحبہ سے گلو خلاصی پانے کے بعد ہم نے ان مسکراہٹوں کو اپنوں، سمروں اور ملی میٹروں میں ناپ کر خریدی ہوئی تصویروں کی مسکراہٹوں سے مقابلہ کرکے فارم کی خانہ پری کر دی اور فارم کو معہ پچاس حالی پیکٹس ڈاک کے حوالے کیا ۔

انتظار کی گھڑیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں اس وقت محسوس ہوا، جیسے جیسے نتیجہ کی تاریخ قریب آرہی تھی، ہمیں اپنی کامیابی پر صدفی صد امید تھی کیوں کہ ہم نے محنت جو کی تھی، خدا خدا کرکے وہ دن بھی آیا جب کہ نتیجہ کا اعلان مقامی روزنامہ میں کیا گیا۔ ہم نے اس دن کا روزنامہ خرید کر جوں ہی نتیجہ پر نظر ڈالی، سر چکرا گیا اور دھڑام سے گر پڑے۔ ہمیں جس وقت ہوش آیا تو پتہ چلا کہ ہم دواخانہ میں پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہماری بالیں پر بیگم صاحبہ بیٹھیں تخلیقہ سنگھا رہی ہیں۔ جب ذرا مزاج سنبھل گیا تو ہم نے پھر سے اس روزنامہ کو منگوا کر نتیجہ دیکھا تو پتہ چلا کہ ہم بمشکل تمام سات مسکراہٹوں کو پہچان چکے ہیں۔ البتہ تین مسکراہٹیں جن پر ہمیں کافی اعتماد تھا دغا دے گئیں۔ جس آٹھویں مسکراہٹ کو ہم نے دلیپ کمار کی مسکراہٹ سمجھا تھا وہ کسی نئے اداکار کی مسکراہٹ تھی جو ہو بہو دلیپ کمار کی مسکراہٹ کی نقل کیا کرتا تھا۔ ممکن تھا اس کی نقل کو بھی پہچان لیتے مگر مشکل یہ آپڑی تھی کہ وہ فلم ابھی ہمارے شہر میں ریلز نہیں ہوئی تھی مسکراہٹ نمبر ۹ کو ہم مینا کماری کی مسکراہٹ سمجھ بیٹھے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وہ مسکراہٹ تو کسی ایکٹرس کی تھی جس نے کسی فلم میں عورت کا پارٹ ادا کیا تھا۔ مسکراہٹ نمبر ۱۰ جو ہمیں خاص طور سے دغا دے گئی تھی، جان وادٹیا کمپنی کے دور کے کوئی مرحوم ایکٹر کی تھی جس نے ہمیں انعام سے محروم کردیا تھا۔ اس نتیجہ کے بعد ہماری حالت ایک پاگل کی سی ہے۔ گھر میں ہم کوئی مقام نہیں ہے۔ ہمیشہ ہمارے جیب میں "راکٹ سگریٹ" کی ڈبیا پڑی رہتی ہے۔ اکثر اوقات بیٹھے بیٹھے دل سے ایک آہ سی نکل جاتی ہے۔ اس وقت فوراً راکٹ سگریٹ سلگاتے ہیں اور دھواں چھوڑتے ہوئے میر کا یہ مصرعہ دہراتے ہیں :

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا !

(سائیڈ سے چلیے)

مسیح انجم

مشترکہ مکان

موجودہ دور میں غمِ روزگار کے بعد اگر کوئی غم ہے تو وہ ہے غمِ مکان۔ ایک حد تک غمِ روزگار کا پھر بھی مداوا ہو سکتا ہے اگر آپ واقعی بے روزگار ہیں اور محنت مزدوری سے جی چراتے ہیں تو کسی چوراہے پر اپنے رومال کو پھیلا کر کھڑے ہو جائیں اور "مائی باپ، ایک پیسہ ــــ !" کی رٹ لگائیں تو کچھ ہی دیر میں سو پچاس جھڑکیوں اور گالیوں کے ساتھ ساتھ بیس پچیس پیسے مل ہی جائیں گے یا ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ روزانہ پورے شہر کا ایک جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہاں کہاں شامیانے لگے ہیں اور کس مکان سے دھواں اٹھ رہا ہے مگر کبھی کبھی یہ دھواں دھوکا بھی دے جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں پیٹ کی آگ بجھانے کی بجائے گھر کی آگ بجھانے کی نوبت آجاتی ہے لیکن ایسا واقعہ شاذ و نادر ہی پیش آتا ہے۔ جب اس طرح کے سروے میں جہاں کہیں شامیانے لگے ہوئے نظر آئیں تو فوراً بن بلایا مہمان بن کر اندر گھس جائیں اور خوب "ڈٹ کر" کھائیں، اگر "موقعِ واردات" پر میزبان پکڑ لے تو فوراً جھڑک دیں "ــــــ آپ کو دسترخوان کے آداب کا کچھ لحاظ ہے"؟ ظاہر ہے اس حربہ کی تاب نہ لاکر میزبان وہیں ڈھیر ہو جائے گا اور الٹا معذرت چاہ لے گا، کیا عجب کہ ساتھ ہی مزید کچھ اچھے کھانوں سے آپ کی ضیافت کرنے پر اتر آئے لیکن مکان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر آپ مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے نڈھال ہو جائیں اور رات ہونے پر کسی مکان میں گھس جائیں تو مالکِ مکان آپ کو حوالات کے حوالے کر کے ہی اطمینان کا سانس لے گا۔ اگر آپ اس وقت آداب و روایات کا حوالہ دیں تو وہ دو چار زبردست گھونسے جڑ کر کہے گا "یہ بھی روایات میں داخل ہے!" اس طرح روزگار سے کہیں زیادہ مکان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیوں کہ فٹ پاتھ پر سونے سے تو رہے۔ وہاں داداؤں سے سابقہ پڑتا ہے۔ گلی کوچوں کے چبوتروں پر سوئیں تو پولس کے دھر لینے کا خوف۔ مسجد میں موذن کا اقتدار، مندر میں پجاری کا اجارہ۔ ان حالات

میں ایک انسان سوائے مکان کے کہیں اور نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر ہم نے مکان کی تلاش میں کوچہ نوردی شروع کی تو جوتوں کے پھٹنے
کا ایک اور غم شاملِ حال ہو گیا۔ قبل اس کے کہ ہم غموں کے بوجھ تلے دب کر کوبڑے بن جاتے، شاید خدا کو رحم آیا
اور ایک دوست کی سفارش سے سر چھپانے کے لیے ایک مشترکہ مکان میں ایک کمرہ مل گیا ہے مگر اس
مکان میں کمرہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں کئی پاپڑ بیلنے پڑے۔ سب سے پہلے ہمیں شادی کر کے ایک اور
مصیبت اپنے گلے ڈال لینی پڑی کیوں کہ مشترکہ مکان میں کنواروں کا داخلہ ممنوع ہے۔ نہ صرف ہمیں
شادی کرنی پڑی بلکہ مالکِ مکان کے بے حد اصرار پر ان کے آگے "سیہ نامہ" پیش کرنا پڑا تاکہ
شادی کے "بوگس" ہونے کا شبہ رفع ہو جائے۔ یہی نہیں ہمارے کیریکٹر اور تنخواہ وغیرہ کے بارے میں
اتنی ساری پوچھ گچھ کی گئی کہ ہمارے سسرالی رشتہ دار ہمارے تعلق سے عجیب و غریب شک و شبہات میں
مبتلا ہو گئے۔ ہم نے ان کے شبہات کو دور کرنا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ وہ ہمارا کر ہی کیا لیں گے۔ بہت ہی
ہوا تو یہی نا کہ وہ اپنی لڑکی کو لے جانے کی دھمکی دیں گے۔ ٹھیک ہے آج کے دور میں لڑکی تو آسانی سے مل سکتی
ہے مگر مکان نہیں مل سکتا چنانچہ ہم نے مالک مکان کے سامنے پوری سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ تب کہیں
جا کر سر چھپانے کو جگہ ملی۔

ہم جس مشترکہ مکان میں مقیم ہیں وہ کل دو کمروں، ایک چھوٹے سے دالان اور ایک دیوان
خانے پر مشتمل ہے۔ ایک کمرے میں تو ہم مع اپنے اہل و عیال کے مقیم ہیں، دوسرے کمرے میں خود مالک
مکان اپنی ایک ضعیف ماں، ایک بیوی، دو بیٹوں، تین بیٹیوں اور ایک شیر خوار بچے کے ساتھ رہتے
ہیں۔ یوں تو کہنے کو مشترکہ دیوان خانہ ہے ضرور لیکن اس پر مکمل طور پر مالک مکان کا غاصبانہ قبضہ ہے
جب کبھی ہم اس دیوان خانہ پر اپنا حق جتاتے ہیں تو مالک مکان فوراً بازو والی ہوٹل کی نشان دہی کرتے
ہیں کہ ہم وہاں فرصت کے لمحات گزار کر محظوظ ہو جائیں۔ اسی طرح مشترکہ دالان بھی پورے طور
ان ہی کے تصرف میں ہے۔ اگر مالکِ مکان کا بس چلے تو وہ اس دالان کو بھی کرایہ پر اٹھا دیں۔

ہم جس کمرے میں مقیم ہیں اس کے "باب الداخلہ" کا چوکھٹا اس قدر چھوٹا ہے کہ ہم جیسے مختصر آدمی
تن کر چل نہیں سکتے۔ شاید مالک مکان نے یہ چوکھٹا اس لیے چھوٹا بنوایا ہے کہ کوئی بھی کرایہ دار ان کے
آگے تن کر نہ چل سکے۔ اب تک تو آپ نے "چھت ٹپکتی ہے" محاورہ سنا ہے لیکن ہمارے کمرے کو ملاحظہ
فرمانے کے بعد "چھت جھڑتی ہے" کہنا پڑے گا۔ چنانچہ ہم نے کبھی چھت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے
ہمت نہیں کی کیونکہ کسی وقت بھی چھت کے جھڑنے سے آنکھوں میں مٹی گر سکتی ہے۔ اس کو آنکھ
دھول جھونکنا کہتے ہیں۔ ہمارے اسی محتاط رویئے نے ہماری گردن اس حد تک جھکا دی ہے کہ ہم
اٹھا کر مالک مکان سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ خیر گفتگو تو الگ رہی ہم اپنے کمرے میں [illegible] لیٹ کر سو نہیں
ویسے کمرے میں آرام سے سونے کا اہتمام ہی کہاں ہے؟ ہمیشہ "ٹو (ملاو) اِن" کر سونا پڑتا ہے۔ اگر

'الف' بن کر سونے کی کوشش کریں تو ٹانگیں مالکِ مکان کے کمرے کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہیں اور کسی وقت بھی "مداخلتِ بے جا بہ خانۂ دیگر" کا الزام ہمارے سر تھونپا جا سکتا ہے۔ اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ چھت کی طرف ٹانگیں اٹھا کر سو جائیں۔

مشترکہ مکان میں صبح اٹھتے سے جو مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے وہ مشترکہ دالان کی صفائی کے تعلق سے ہوتا ہے اور یہ مسئلہ راست خواتین کی ذاتِ بابرکات سے متعلق ہے۔ ہر خاتون اپنے کمرے کی حد تک تو جھاڑو لگاتی ہے لیکن دالان میں قدم رکھتے ہی اس کی بھویں تن جاتی ہیں گویا اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کون کس حد تک جھاڑو لگائے۔ چنانچہ روزانہ کی اس جھک جھک سے بیزار ہو کر ہم لوگوں نے مکان کے دالان میں کوئلہ کی لکیروں سے سرحدوں کا تعین کر لیا ہے۔ کیا مجال کہ جھاڑو لگاتے وقت کوئی خاتون ایک ملی میٹر کی خلاف ورزی کرے۔ اتنی سختی سے پابندی کرتے ہوئے ہم نے خدا کو کسی اور معاملہ میں نہیں دیکھا ہے۔

مشترکہ مکان میں رہ کر ایک کرایہ دار بالکل ہی بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب دیکھیے بھی ناکہ ہم گھر میں رہ کر بھی بالکل بے گھر سے ہیں۔ نل پر نہانا تو کجا منہ ہاتھ تک دھو نہیں سکتے۔ اگر ہم گھر کے نل پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے اپنی باری کا انتظار کریں تو دفتر میں لیٹ ہو کر ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس لیے نہانے اور دھونے کے کاروبار پبلک نل پر انجام پاتے ہیں۔ اگر پبلک نل پر بھی کبھی کیو لمبی ہو جاتی ہے تو ہم مسجد کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب ہم رفتہ رفتہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ تو بوقتِ حشر ہی پتہ چلے گا کہ ہماری نمازیں آیا قبول ہوئیں یا نہیں کہنے کو مکان میں ایک مشترکہ بیت الخلا بھی ہے لیکن ہم اس کے تمام متعلقہ امور سے باہر ہی نجات حاصل کر لیتے ہیں اسی وجہ سے ہم گھر پر کبھی جلاب کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ پیچش کا نام سنتے ہی ہم یوں بدکتے ہیں جیسے کسی نے دیوانے کتے کی آمد کی اطلاع دی ہو۔

یہ تو صرف ہماری ایک ذات کی حد تک کی مجبوریاں تھیں۔ اب آپ ہماری دوسری مجبوریاں سنیں گے تو ہم پر لعنت و ملامت شروع کر دیں گے اور کہیں گے کہ اس شخص میں اخلاقی جراءت نام کو نہیں۔ کیا کریں۔ زمانہ ہی کچھ ایسا آ گیا ہے کہ ایک انسان مشترکہ مکان میں رہ کر اخلاقی جراءت کا مظاہرہ کرے تو الٹا اسے لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ مالکِ مکان نے اپنی بیوی کی تائید میں اپنی بوڑھی ماں کو بری طرح زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری پہلے ہی سے بخار کی بھٹی میں جھلسی جا رہی تھی اور مالک مکان کی زد و کوب "مرے پر سو دُرّے" کے مصداق تھی۔ یہ دیکھ کر ہماری رگِ انسانیت بھڑک اٹھی۔ ہم نے اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں اپنی رگِ انسانیت کو پھڑکنے سے روکنا بہت چاہا لیکن اخلاقی جراءت کا غلبہ اس قدر تھا کہ اس کے آگے ہماری ایک نہ چل سکی۔ ہم عدمِ تشدد کا پرچم اٹھائے آگے بڑھے۔ مالکِ مکان نے ہمیں دیکھتے ہی بُری طرح جھڑک دیا۔ آپ کو ہمارے خانگی

معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں!" ہم نے قدرے غصیلی آواز میں کہا۔ "ارے واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی ہم تو پڑوسی ہیں۔ یہ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔"

مالکِ مکان نے ہمارے اس جملے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: "اگر آپ واقعی ہمارے پڑوسی ہیں اور ہم سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو بڑھیا کے علاج کے لیے دو سو روپے دیجیے۔" یہ سنتے ہی ہماری اخلاقی جرأت پوری کی پوری منجمد ہوگئی اور ہم بارِ ندامت سے سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلے آئے۔

مخلوط وزارت اور مشترکہ مکان میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح ایک سیاستداں یا نجومی یہ حکم نہیں لگا سکتا کہ مخلوط وزارت کب ٹوٹے گی؟ بالکل اسی طرح یہ کوئی بھی دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ "مکان خالی کرو" کی دھمکی کب دی جائے گی۔ بہ الفاظ دیگر "مکان خالی کرو" کی ننگی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ اب ان دو واقعات سے آپ کو پتہ چلے گا کہ کس طرح مالکِ مکان نے ایک بے سر و پا موضوع کو مکان کے تخلیہ کا موضوع بنایا تھا۔ ایک دن ہمارے یہاں مرغ کا سالن پکایا جا رہا تھا۔ سارے کا سارا مکان اس کی مہک سے معطر ہو رہا تھا۔ عین اسی وقت مالکِ مکان اپنے کمرے سے دندناتے ہوئے آئے اور آتے ہی وارننگ دی ـــ "مکان خالی کرو" ہم نے پوچھا "حضور ہمارا قصور؟" انھوں نے ترش روی سے جواب دیا "قصور وصور کچھ نہیں، بس مکان خالی کرو۔ آپ کی وجہ سے ہمارے گھر والے تمام کے تمام چٹورے بنتے جا رہے ہیں۔" ہم فوراً بات کی تہہ کو پہنچ گئے اور بغیر کسی حجت کے معذرت چاہ لی اور سالن تیار ہوتے ہی ایک کٹورا سالن مالک مکان کے ہاں بھجوا دیا۔ اب تو ہمارا یہ اصول سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی ہمارے گھر میں کوئی اچھا سالن پکایا جاتا ہے تو ہم فوراً ایک کٹورا سالن مالک مکان کے خراج کے طور پر بھجوا دیتے ہیں جسے آپ آج کی اصطلاح میں "معمول" کہہ سکتے ہیں۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک بار پھر وہ اسی طرح دندناتے ہوئے آئے اور آتے ہی مکان خالی کرنے کی دھمکی دی۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اب آپ کو ہم لوگوں سے کیا شکایت ہے؟ بولے "آپ کی بیوی بہت زیادہ فیشن کرتی ہیں جس کی وجہ سے میری بیوی آپ کی بیوی کے حوالے سے طعنے دیا کرتی ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ مکان خالی کر دیجیے تاکہ ......!" ابھی وہ "پالش اور پاؤڈر" کا حوالہ دینے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے جھٹ کہا...... "ٹھیک ہے قبلہ! آئندہ سے میری بیوی [illegible] استعمال کرے گی چہرے پر خاک اور دھول اڑائے گی آپ مطمئن رہیں۔!" ہماری یہ عادت بھی ہے کہ ہم کبھی کبھی کوئی اچھی فلم ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم سکنڈ شو دیکھ کر مکان لوٹ رہے تھے کہ "مین گیٹ" پہ مالک [illegible] سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ برس پڑے۔

جناب آپ کی اس آوارگی اور فلم بینی کی عادت کی وجہ سے ہمارے لڑکے شہدے بنتے جا رہے ہیں۔!" دیکھا آپ نے۔ انھوں نے راست اپنے لڑکوں کو گالی نہیں دی تھی بلکہ اُن کے توسط سے ہماری عزت پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت جی چاہا کہ فوراً زبان کھینچ لیں اور چہرہ نوچ ڈالیں مگر تخلیہ مکان

تصور سے لرز کر رہ گئے۔

ان تمام حالات نے اور مکان کی گھٹن نے ہمیں قبل از وقت بوڑھا بنا دیا ہے، ہمارے قویٰ مضمحل ہوگئے ہیں اور اعضا میں اعتدال نہیں ہے، ہمیشہ ہمارے چہرے پر وحشت برستی رہتی ہے۔ مختصر یہ کہ غالب کا یہ شعر ہم پر پوری طرح صادق آتا ہے:

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

چنانچہ ایک دن جب ہمارے ایک بچپن کے ساتھی سے ایک طویل عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تو اس نے تعجب سے پوچھا "ارے یار! یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے کیا تم کسی موذی مرض میں مبتلا ہوگئے ہو؟" ہم نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا۔ "نہیں یار! میں کسی مرض ورض میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ میں مشترکہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہوں!"

"درپردہ"
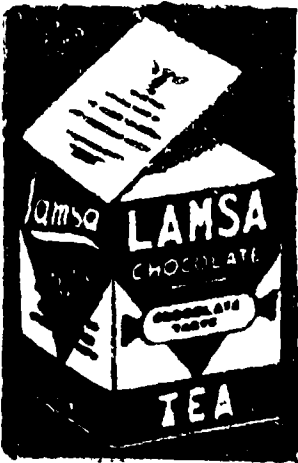
مسیح انجم

قصّۂ "درس"

سناتے ہیں.....!

اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے کس سال، کس مہینے، کس تاریخ اور کتنے بج کر کتنے منٹ پر پہلی کلاس لی تھی؟ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ پہلی کلاس لیتے وقت دل میں تارے نظر نہ آرہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلاس ہم نے نہیں لی تھی۔ سچ تو یہ ہے کلاس ہم نے نہیں لی تھی بلکہ ہماری کلاس خود طلبا نے لی تھی —— یہاں یہ وضاحت غیر ضروری نہ ہوگی کہ ہم نے اپنی ملازمت کے لیے پیشۂ تدریس کا انتخاب کیا تھا۔ کیوں کہ ہمیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ اگر عاقبت میں عافیت چاہتے ہو اور حور و غلمان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کی خواہش رکھتے ہو تو پیشۂ تدریس اختیار کرو۔ اس کے علاوہ ہم نے پیشۂ تدریس کی عظمت کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ نظر بندی کے زمانے میں جب شاہ جہاں سے یہ پوچھا گیا کہ وہ اپنی تنہائی اور بوریت کو کس طرح کاٹنا پسند کرے گا۔؟ —— تو ہز مجسٹی نے فرمایا تھا کہ "چند لڑکوں کا انتظام کردو، میں انھیں پڑھایا کروں گا۔" تاریخ خاموش ہے کہ شاہ جہاں کی اس فرمائش کی تعمیل کردی گئی تھی یا نہیں؟ —— البتہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ شاہ جہاں سے سوال کرنے والے کوئی اور نہیں ان کے لائق و فائق فرزند اورنگ زیب تھے جن کے تعلق سے ابن انشا کا یہ تبصرہ بھی خوب ہے:

"اس نے کوئی نماز قضا نہ کی اور کسی بھائی کو زندہ نہ چھوڑا۔"

پیشۂ تدریس کی عظمت کے بارے میں ہم نے یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ خلیفہ ہارون رشید کے لڑکے اپنے استاد کی جوتیاں کو اٹھانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ چناں چہ پیشۂ تدریس کے انتخاب کے وقت ہم بھی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے کہ لڑکے ہمارے آگے پیچھے سر (Sir) سر (Sir) صاحب صاحب کہتے پھریں گے اور ہماری جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے آپس میں اس حد تک لڑیں گے نقضِ امن کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ اور پولیس کو لاٹھی چارج

[illegible]

لڑیں گے کہ ہماری جوتیاں ہی پھاڑ دیں گے اور مدرس کو منگنے پاؤں فرار ہونے کی نوبت آجائے گی۔

موجودہ دور میں ایک شخص کو پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے اور ٹیچر کے عہدے پر فائض ہونے کے لیے ٹی۔ ٹی۔ سی یا بی ایڈ کا امتحان کامیاب کرنا پڑتا ہے اور اس کورس کی تکمیل کے دوران ایک رنگ روٹ کو مختلف مضامین کے عملی اسباق سے گزار کر ٹیچر کے روپ میں ڈھالا جاتا ہے۔ اب یہ ٹریننگ والے پر منحصر ہے کہ آگے چل کر وہ آئیڈیل ٹیچر بنے یا سکسیس فل (SUCCESSFUL TEACHER) کا لقب دھارے۔ آئیڈیل ٹیچر وہ ہے جس کی محدود آمدنی اور محتاط زندگی کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی اسے اپنا داماد بنانے پر راضی نہ ہو۔ سکسیس فل ٹیچر (SUCCESSFUL TEACHER) وہ ہے جو مدرسے میں حاضر رہ کر بھی غیر حاضر رہے۔ فرائض منصبی سے دور بھاگے۔ فرصت کے گھنٹے میں اسٹاف روم میں رمی[1] کھیلے اور پڑھانے کے گھنٹے میں لڑکوں کو دیگر از نصاب سرگرمیوں میں مصروف رکھ کر کرسی پر دراز ہو جائے۔ (اگر کرسی نہ ہو تو پورے پر لیٹ جائے) امتحانات کے زمانے میں لڑکوں کو نقل کے نت نئے طریقوں سے واقف کرائے اور پیروی کر کے بسٹ ٹیچر (BEST TEACHER) کا ایوارڈ حاصل کرے۔

جب میں اپنے حافظے کے اوراق الٹ پلٹ کرتا ہوں تو مجھے ان اوراق میں اپنے زمانۂ طالب علمی کے ایک ٹیچر کا مرقع جھانکتا نظر آتا ہے جو سکسیس فل ٹیچر کے زمرے میں آتے ہیں۔ ذرا ان کا حلیہ ملاحظہ فرمایئے۔ شیروانی پہنتے تھے۔ (بھلا اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے) لیکن سینے پر تین چار بٹنوں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے تاکہ پتہ چلے کہ شیروانی کے نیچے کیا ہے اور وہاں کس قسم کے زلزلے پرورش پاتے ہیں۔ پنجابی سینڈل پہنتے تھے لیکن تسمے کو کھلا چھوڑ دیتے تھے جیسے بل ڈاگ کو بھونکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ چنانچہ چلتے وقت بکل کے ہلنے سے چھن چھن کی آوازیں آتیں۔ یوں لگتا گویا پاؤں میں گھنگرو بندھا اونٹ' اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی کے مصداق اپنے پاؤں پھینکتا چلا آرہا ہو۔ کلاس روم میں پہلے چھن چھن کی آوازیں داخل ہوتیں اور پھر تمام طلبا کو متنبہ کرتیں کہ خبردار سرکس کے رنگ ماسٹر تشریف لا رہے ہیں۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ پھر اس کے بعد موصوف معہ اپنی نحوست کے داخل ہوتے اور ایک گمبھیر "ہوں" کے ساتھ لڑکوں کی طرف متوجہ ہوتے ریاضی پڑھانے پر مامور تھے۔ راتوں میں فرائض غیر منصبی اور فرائض غیر ازدواجی میں مصروف رہتے اور مضمون ریاضی کی مناسبت سے راتوں میں کلب میں برج[2] کھیلتے تھے۔ صبح جب کلاس روم میں داخل ہوتے تو ان کے چہرے پر "برج بھاشا" برستی رہتی تھی۔ باتوں کا سارا غصہ لڑکوں پر نکالتے تھے اور اس کار خیر کے لیے نت نئے بہانے تلاشتے تھے۔ البتہ ہوشیاری یہ کرتے کہ خرگوش قسم کا ڈرپوک لڑکا پیٹے اور

---

[1] تاش کا ایک مشہور کھیل

[2] تاش کا ایک کھیل

اس کی وضع کی اور پٹائی کو دیکھ کر باغی قسم کے لونڈے مرعوب ہوں۔ ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ ریاضی کا پورا پیریڈ پڑھائی کے بجائے پٹائی کے لیے وقف کیا اور ایک ڈبو قسم کے لڑکے سے ایک عجیب وغریب سوال پوچھا:

"کبھی کبھی میں جھوٹ بولتوں نہیں"؟

اب لڑکا حیران کہ جواب دے تو کیا دے؟ یہ کوئی درسی سوال تو تھا نہیں کہ لڑکا "ہاں" یا "نہیں" میں جواب دے کر حسب استطاعت پٹتا، یہ تو اونٹ کی خصلت والے ٹیچر کے وقار کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ دو چار سکنڈ سوچ کر اس لڑکے نے نیک نیتی سے جواب دیا:

"نہیں صاحب! آپ جھوٹ نئیں (نہیں) بولتے۔"

تڑ سے ایک چانٹا رسید کرتے ہوئے فرمایا:

"میں کوئی ولی ہوں جو جھوٹ نہ بولوں۔"

یہ سنتے ہی لاکھ ضبط کے باوجود ہمارے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ پھر کیا تھا۔ شامت ہمارے آگئی۔ پوچھا۔ پوچھا کیا، وہی سوال دہرایا۔

"کیوں رے کبھی کبھی میں جھوٹ بولتوں نہیں!"

ہم نے سوچا کہ ٹیچر کے احترام پر مبنی مبالغے پر جب ایک طالب کی پٹائی ہو سکتی ہے تو کیوں نہ حق بات کا برملا اظہار کر کے پٹیں۔ چنانچہ ہم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بیٹاغ سے جواب دیا۔

"جی ہو صاب، آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے فرمایا:

"کیوں رے لونڈے میں جھوٹا ہوں؟"

اور پھر جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

"استاد کا مار کھایا ہے تو جنت میں ضرور جائے گا۔"

اس چنگیزی سلوک کی اطلاع ہیڈ ماسٹر کو ملی تو انھوں نے ان کا ٹائم ٹیبل بدل کر ریاضی کی بجائے اردو پڑھانے پر مقرر کیا ——— دوسرے روز اردو کے گھنٹے میں کمرۂ جماعت میں داخل ہوتے لڑکوں کو تین چار ساٹھ بیٹھ کروا کر کہا:

"چلو آج غالب کی غزل پڑھتے ہیں!"

پھر ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"پڑھو غالب کی غزل میں، ذرا آپ لوگوں کا تلفظ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اور پھر بڑی حقارت سے فرمایا:

"پتہ نہیں سابقہ ٹیچر نے آپ کو کیا غیر غلط پڑھایا ہے۔"
لڑکے نے مطلع پڑھا:

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

بہت اچھے! ہاں تو دوسرا شعر پڑھو۔"
لڑکے نے کہا:
"سر! پہلے شعر کا مطلب؟"
مولوی صاحب نے جواب دیا۔
مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھو"!
لڑکے نے دوسرا شعر پڑھا اور پھر پوچھا۔
"سر! مطلب؟"
مولوی صاحب نے کہا:
"مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھو!"
لڑکے نے ایک اور شعر پڑھا:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس سے پہلے کہ لڑکا پوچھتا کہ "سر! اس شعر کا مطلب؟" مولوی صاحب نے ہمیں اونگھتے دیکھ لیا جو ان کی افہام و تفہیم سے بیزار اور غالب سے بے نیاز ہو کر کہیں غرق ہو گئے تھے۔ اسی اختلاطِ عقیل حالت میں ہمیں پاکر اب کی بار مولوی صاحب نے اپنی توپ کا رخ ہماری طرف پھیر دیا۔
بتاؤ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟"
چونک کر کتاب پر جو نظر ڈالی تو شعر میں ایک نہیں دو "حق" موجود تھے۔ یعنی کہ رُشنگ گراں پینے کے ڈبل چانسس .... گویا ڈبل پروموشن۔ روتی صورت بنا کر مری آواز میں جواب دیا۔
"سر! مطلب بالکل صاف ہے آگے بڑھیے۔"
(یعنی کہ بیٹھیے، اور پھر جنت کی بشارت دے کر ثوابِ دارین پائیے!)

○

تو عرض کرنا یہ ہے کہ زمانہ کبھی SUCCESSFUL TEACHERS سے خالی نہیں رہا۔ فی زمانہ تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں بلکہ ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف تھوڑا سا وقت نکال کر اسکول کے معائنہ

کے لیے جانا کافی ہے۔ آپ کا دل بھی بہل جائے گا اور سکسس فل ٹیچروں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ خدا خیرات ندیم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ جب کبھی تعلیمی مسائل اور مدرس کے رول کا ذکر چھڑتا تو وہ اپنے وطنِ مالوف کے حوالے سے ایک واقعہ کو لطیفہ بنا کر سنا دیتے تھے اور پھر اپنی دائیں ران پر ہاتھ مار کر ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنسی میں شامل کر لیتے تھے۔ وہ لطیفہ نما واقعہ آپ بھی سن لیجیے:

ایک دن ایک انسپکٹر آف اسکولز دیہات کے ایک اسکول کے معائنے کے لیے جیپ میں نکلے۔ کچھ دور جانے کے بعد ان کو جیپ سے اتر جانا پڑا کیونکہ آگے راستہ ناقابلِ عبور تھا۔ انھوں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی معقول سا آدمی مل جائے تو راستہ دریافت کریں۔ اتفاق سے ایک نہیں تین چار معقول آدمی نظر آئے جو قریب والے تالاب میں بیٹھے جھک مار رہے تھے یعنی مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ (بے کار وقت گزارنے کو جھک مارنا بھی کہتے ہیں) اس موقعہ کو غنیمت جان کر انسپکٹر آف اسکولز ان کے پاس جا پہنچے اور راستہ کے بارے میں تفصیلات دریافت کیں لیکن ان شکاریوں کا راستہ بتانے کا انداز کچھ اتنا زیادہ پیچیدہ تھا کہ ساری تفصیلات بغیر آپریشن کے دماغ میں نہیں گھس سکتی تھیں۔ چنانچہ انسپکٹر آف اسکولز نے ان سے درخواست کی کہ وہ چل کر جیپ میں تشریف رکھیں اور گائیڈ (GUIDE) کے فرائض انجام دیں۔ مختصر یہ کہ شکاریوں کی سرکردگی میں جیپ منزلِ مقصود کو پہنچ گئی۔ جیپ جب گاؤں میں داخل ہوئی تو اس کی آواز پر سرپنچ اور راپا سرپنچ دوڑے دوڑے جیپ کے پاس آئے۔ ان کی آمد سے فائدہ اٹھا کر انسپکٹر آف اسکولز نے پوچھا:

"یہاں اسکول کہاں ہے اور کتنے ٹیچر کام کرتے ہیں؟"

سرپنچ نے جیپ کے اندر والی سیٹوں کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا:

"یہ ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟ یہ آپ اپنے ٹیچروں سے ہی پوچھ لیجیے جو آپ کی جیپ میں بیٹھے ہیں۔"

○

ہم نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ ایک شخص کو پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے کے لیے بی۔ٹی۔سی یا بی ایڈ کا امتحان کامیاب کرنا پڑتا ہے اور اس کورس کی تکمیل کے دوران ٹریننگ کالج میں لکچررز سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں اپنی ٹریننگ کے زمانے کے ایک لکچرر یاد آتے ہیں جن کا وجود کالج میں ایک بھرتی کے شعر کے مماثل تھا۔ وہ سینیرز کا حق مار کر پروموشن پر تشریف لائے تھے۔ زبردست PERSONALITY کے حامل تھے لیکن ان کی PERSONALITY میں ہمارے شہر کی پوری MUNICIPALITY آباد تھی۔ ان کو ایک ایم ایل اے کا آشیرواد حاصل تھا جو ایک حفاظتی باڑن کر ان کی پروموشن کا تحفظ کرتا رہتا۔ "CURRENT PROBLEMS" پڑھانے پر مامور تھے۔ لیکن ان کو

آتا جاتا کچھ نہیں تھا۔ سوائے پرابلم کھڑا کرنے کے۔ چنانچہ ان کا پیریڈ پرابلم سے شروع ہو کر پرابلم پر ختم ہوتا تھا۔ جہاں کوئی بات بن نہ پڑتی تو جھٹ کہہ دیتے :

"THIS IS THE CURRENT PROBLEM"

ان کے کرنٹ پرابلموں سے تنگ آکر یار لوگوں نے ان کا نام ہی کرنٹ پرابلم رکھ دیا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جن دنوں کرنٹ پرابلم والے لکچرر ترقی پر کالج میں تشریف لائے تھے تو انہی دنوں گریڈ اور گرانی الاؤنس کے بڑھنے کے سلسلے میں ملازمین کے نمائندوں اور حکومت کے درمیان مذاکرات نہ معلوم کیوں جاری تھے۔ اس طرح موصوف کے ہاتھ ایک نیا موضوع آ گیا تھا جو ایک ہفتہ تک وقت گزاری کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ جب ایک دن کلاس روم میں داخل ہوئے تو گریڈ اور گرانی الاؤنس کا پرابلم ان کے ساتھ تھا۔ کرسی پر براجمان ہونے سے پہلے کھڑے کھڑے فرمایا :

" آج کا سب سے بڑا گمبھیر مسئلہ بڑھتی ہوئی گرانی ہے۔ حکومت کے پاس پیسہ ہے لیکن وزیر خزانہ قارون بنا بیٹھا ہے "

پھر اس کے بعد وزیر خزانہ اور قارون کے حوالے سے ایک تلمیح طلب مصرعہ جو پتہ نہیں کہاں سے اڑا لائے تھے ؟ طلبا کی طرف اچھال دیا۔

بن کے بیٹھا ہے ثانیٔ قارون

اس پر ایک طالب علم نے دکنی میں گرہ لگائی :

اس کی ماں کا خلیل خاں مارون

پھر تو پورا پیریڈ تک بندی اور جگل بندی میں گزر گیا :

بن کے بیٹھا ہے ثانیٔ قارون
اس کی ماں کا خلیل خاں مارون

حق تنقید کے جوش میں ہم یہ بتانا بھول گئے کہ مصرعہ ثانی میں جہاں "خلیل خاں" استعمال ہوا ہے وہ ہماری تحریف کا نتیجہ ہے، ورنہ اصل مصرعہ میں تو خلیل خاں کی جگہ "حلال کا" متضاد لفظ استعمال ہوا تھا۔

دوسرے دن طلبا نے گذارش کی کہ "سر! کچھ نوٹس لکھوائیے"۔ تو موصوف نے سوشیالوجی کو کرنٹ پرابلمس سے جوڑنے کی کوشش کی تھی :

"Socialogy is concidered to be the mother root of other social sciences"

اس رٹے رٹائے جملے کے بعد ان کی گاڑی نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارا علمی سرمایہ پھونک کر رکھ دیا گیا ہے۔ چنانچہ گاڑی کو دھکا دینے کے لیے ایک طالب علم نے پوچھا :

" سر سوشیالوجی کا کرنٹ پرابلمس سے کیا تعلق ؟ اور پھر یہ "مدر روٹ" کیا ہے ؟ "

جواب ملا "مدر روٹ؟ یعنی ماں کا روٹ۔"
لڑکے نے حیرت سے کہا:
"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"
جواب سے سرفراز کیا گیا:
"میں اینگلو اردو میں فرما رہا ہوں۔"
اب ہم کہاں تک ذکر کریں۔ یہ تو صرف ان کے دو تین پیریڈ کا ٹریلر تھا۔

المختصر یہ کہ اس قسم کے ارشادات سے وہ طلبا کی نالج میں فارغ پیدا کیا کرتے تھے چونکہ عملی اسباق کے مارکس اور ریمارکس ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی طالب علم ان کے آگے دم نہیں مارتا تھا۔ جو ٹرینی گاؤں کا اصلی گھی، اصلی شہد اور چٹ پٹا اچار پچھلے دروازے سے ان کی خدمت میں پیش کرتا اس کے عملی اسباق کے ریمارکس سبق دیکھے بغیر ہی شاندار لکھ دیتے اور جو بے چارہ ان چیزوں کا متحمل نہ ہوتا اس کے حصے میں عجیب و غریب ریمارکس آتے مثلاً ایک ٹرینی کو جس نے گھی نہیں پیش کیا تھا یوں ریمارک کیا تھا:

"بورڈ پر لکھتے وقت مدرس کے چاک کی آواز سماعت پر گراں گزرتی ہے چاک کو یوں نہیں یوں پکڑنا چاہیے تھا۔ جب موصوف نے عملی مظاہرے کے طور پر بورڈ پر چاک سے لکھ کر بتانے کی کوشش کی تو چاک چاک نہ رہی تھی، بلکہ چاک چاک ہوگئی تھی۔"

تاریخ کے ایک سبق میں سکندر اور پورس کے ریمارکس یوں لکھے تھے:
"سکندر اور پورس کے قصے کو مدرس اگر کٹ پتلیوں کے ذریعہ پیش کرتا تو سبق انتہائی دلچسپ ہوتا۔"

جانوروں سے متعلق ایک سبق میں تو انھوں نے حد ہی کر دی تھی:
"مدرس صاحب گدھے کو کلاس روم میں بہ نفس نفیس پیش کرتے تو لڑکے بڑی آسانی سے گدھے کا سبق سمجھ پاتے۔"

یہ تو صرف مدرسین سے متعلق تھا جو ذکور کی تعریف میں آتے تھے۔ اب ذرا اناث کی طرف آیئے جو لیڈی ٹیچران کے اجلاس پر حاضری دیتیں ان کے سبق کے ریمارکس بڑے شاندار لکھ دیئے جاتے اور جو لیڈی ٹیچر اپنے کام سے کام رکھتیں ان کے ریمارکس کچھ اس طرح ہوتے:

"ٹیچر کو چاہیے کہ وہ گہری اور شوخ رنگ کی لپ اسٹک استعمال نہ کریں۔ گہری لپ اسٹک کی وجہ سے طلبا کی نظریں ٹیچر کے ہونٹوں پر ہی مرکوز رہیں اور وہ سبق میں دلچسپی نہ لے سکے۔"

"ٹیچر کو یہ نہیں چاہیے کہ دوران سبق اپنے آنچل کو گھڑی گھڑی ٹھیک کریں۔ اس عمل

سے طلبا کی توجہ میں خلل پڑتا ہے۔"

"ٹیچر بالکل سیدھے سادے انداز میں کلاس روم میں داخل ہو۔"

یعنی کہ اس کے چہرے پر خاک اڑتی رہے اور وہ صورت سے بالکل چڑیل دکھائی دے!

"نظم کو تحت میں پڑھانے کے بجائے ترنم سے پڑھائیں اور تھوڑی سی ادائیں بھی دکھائیں تو سبق انتہائی کامیاب ہوتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ ایسے خرانٹ قسم کے ممتحن کی موجودگی میں ہمیں پہلی کلاس لینی تھی اور آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ٹریننگ کے دوران ایک مدرس کو مختلف مضامین کے عملی اسباق سے گزار کر پرکھا جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کس حد تک کامیاب مدرس ثابت ہوگا۔ چونکہ عملی اسباق کے نمبرات بھی مقرر ہوتے ہیں اس لیے ہر مدرس کو کلاس لینی پڑتی ہے جبکہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ تھیوری کی حد تک تو آپ کچھ نہ کچھ پڑھ کر یا کم حسب استطاعت نقل کرکے امتحان پاس کر سکتے ہیں لیکن عملی اسباق کی کامیابی کا سارا دار و مدار ممتحن کے ہاتھ کے ریمارکس پر ہوتا ہے۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ کرنٹ پرابلم والے جیسے خرانٹ قسم کے ممتحن کی موجودگی میں ہمیں کلاس لینی پڑی تھی اور اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ ہمیں جس جماعت کے طلبا الاٹ کیے گئے تھے وہ سارے کے سارے مشقی مدرسے (PRACTICING SCHOOL) سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تختۂ مشق بنتے بنتے وہ اس حد تک قیافہ شناس ہو گئے تھے کہ ٹیچر کے چہرے اور چال ڈھال پر نظر پڑتے ہی بھانپ لیتے کہ وہ کتنے پانی میں ہے؟ اور اس کو جواب کے لیے کس حد تک ترسایا جا سکتا ہے؟ وہ اس راز سے بھی واقف تھے کہ ٹیچر کے سبق کی کامیابی کا دار و مدار ان کے جوابات پر ہے ورنہ ٹیچر کو نااہل، ناکام و ناکارہ قرار دیا جائے گا۔ وہ اس وقت تک ٹیچر کے سوال کا جواب نہ دیتے۔ جواب دینا تو دور کی بات ہوتی، رسماً ہاتھ تک نہ اٹھاتے، جب تک انھیں چاکلیٹ کی پیشکش کا لالچ نہ دیا جاتا (اس طرح طلبا کی عادتوں کو بگاڑنے میں سکسس فل ٹیچرز کا ہاتھ تھا) چونکہ ہمیں اس راز سے بہت بعد میں واقفیت حاصل ہوئی تھی اس لیے ہم نے پہلی کلاس کے موقع پر چاکلیٹ وغیرہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی بلکہ سبق کو بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ (آئیڈیل ٹیچر جو بننا تھا۔) ہم نے سبق کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی حتیٰ کہ ILLUSTRATIONS (توضیحات) تک اپنے مبارک ہاتھوں سے بنائے تھے۔ توضیحات کے ضمن میں سبق کی مناسبت سے ایک ایسی تصویر بھی بنائی تھی جس میں ایک فقیر کو بھیک مانگتا ہوا بتایا گیا تھا۔ ہم نے اس تصویر کو بنانے میں اپنی توانائیاں اس حد تک صرف کر دی تھیں کہ تصویر کو دیکھتے ہی یوں لگتا تھا جیسے فقر و فاقہ کا خاتمہ بس اس پر ہو رہا ہو۔ ہم نے تصویر کے اوپر خفی حروف میں فقیر لکھ دیا تھا اور تصویر کے نیچے "تیار کردہ مسیح انجم" ذرا جلی حروف میں لکھ دیا تھا کہ لڑکوں پر مدرس کا رعب پڑے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ ان کو پڑھانے والا کوئی معمولی مدرس نہیں بلکہ ایک بہت بڑا آرٹسٹ بھی ہے۔ خیر جناب، ہم پوری طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر مقررہ وقت پر، مقررہ پیریڈ میں پہلی کلاس لینے کے لیے جماعت میں داخل ہوئے۔ لڑکوں پر ایک اچٹتی سی نظر

دو اور ا ڈ نڈ (STAND) اٹ (SIT) کروایا، اور پھر درس و تدریس کے اصول کے مطابق سبق سے متعلق تمہیدی سوالات کیے لیکن جواب کے لیے نہ تو کسی لڑکے کا ہاتھ اٹھا اور نہ کسی لڑکے کے ہونٹ ہلے ۔ بالکل سناٹا جیسے لڑکوں نے اپنے ہونٹ سی لیے ہوں (ا حساس سناٹے کو صرف چار آنے والے چاکلیٹ ہی توڑ سکتے تھے) بہر حال کچھ ہو" اب سبق کو کسی نہ کسی طرح آگے بڑھانا ہی تھا چنانچہ ہم نے سبق کی مناسبت سے فقیر کی تصویر کو بلیک بورڈ پر آویزاں کر کے نہایت ہی آسان سا سوال پوچھا :

"بچو ! بتاؤ اس تصویر میں کون ہے ؟"

بڑا آسان سا جواب تھا "فقیر" لیکن کسی مائی کے لال نے نہ تو جواب کے لیے ہاتھ اٹھایا اور نہ ہی جواب دیا ۔ تب ہم نے پھر وہی سوال دہراتے ہوئے کہا :

"بچو ! بڑا آسان سا سوال ہے ۔ ذرا غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ اس تصویر میں کون ہے ؟"

پھر بھی سناٹا چھایا رہا اور ایسا سناٹا جیسے شہر خموشاں ! ابھی ہم آگے کے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک لڑکے نے ہاتھ اٹھایا :

"سر ! میں بتاتا ہوں !"

ہم نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا :

"شاباش بیٹے ! بتاؤ اس تصویر میں کون ہے ؟"

تڑ سے جواب دیا "مسیح انجم"

اس جواب کے ساتھ ہی جماعت کے مختلف گوشوں سے ہنسی کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں ۔ جی میں آئی کہ بدتمیز لونڈے کو تڑا تڑا پیٹ دیں لیکن ٹریننگ کے اصول کے مطابق لڑکوں کو پیٹنے کا مدرس کو حق نہیں ہے ۔ اب مارتے تو کیوں کر ؟ اور دوسری بات یہ کہ کلاس کے ایک گوشے میں وہی "پرابلم والے" ممتحن بیٹھے ہمارے سبق کو ملاحظہ فرما رہے تھے ۔ گویا ایک نہ شد دو شد والا معاملہ تھا ۔ تب ہم نے سوچا کہ لڑکوں کو تھوڑا سا اشارہ دے کر سوال کریں تو شاید صحیح جواب ملے ۔ چنانچہ ہم نے تھوڑی سی وضاحت کے ساتھ وہی سوال دہرایا ۔

"بچو ! تصویر کے اوپر والی تحریر پڑھ کر بتاؤ کہ یہ تصویر کس کی ہے ؟"

لڑکوں نے اوپر کی تحریر کی بجائے تصویر کے نیچے والی تحریر پڑھ کر کورس میں جواب دیا "مسیح انجم"

اب ہمارے پاس چاکلیٹ تو تھے نہیں جو لڑکوں کو پیش کر کے صحیح جواب لیتے ۔ بالآخر مایوس ہو کر پہلے لڑکے سے جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا تھا ، اس کا نام پوچھا :

"بابا ! تمھارا نام کیا ہے ؟"

"بلال مبشر !"

ہم نے پوچھا "تم شر ہو یا شیر ؟"

جناب ملا "شُرشرا!"

اس طرح سبق کی تمہید ہی میں کوئی بیس پچیس منٹ نکل گئے۔ گھڑی جو دیکھی تو پیریڈ کے ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ تھے اور پندرہ منٹ میں سبق کو ختم کرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا پھر تو ہم پر زلزلہ سا طاری ہوگیا۔ یہ دیکھ کر پرابلم والے ممتحن نے قریب آکر پوچھا:

"کیا ہوا؟"

ہم نے لڑکھڑاتی ... زبان میں جواب دیا:

"وہی ہوا جو لڑکوں کو منظور تھا!"

(طرفہ تماشہ)

مسیح انجم

پرانی ٹاکیز
پرانی فلم

میں پرانی فلمیں دیکھنا قطعاً پسند نہیں کرتا اور میں یہ بات اپنی عمر کا ایک بیشتر حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گزارنے کے بعد کہہ رہا ہوں ۔ جب آدمی کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا تو وہ صرف مشورے دیا کرتا ہے ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے اکثر دانشور و سیاست داں یہی کچھ تو کیا کرتے ہیں ۔ جب وہ اپنی تین چوتھائی زندگی لغویات میں ، ناقابل علاج کی حد تک گزار لیتے ہیں تو وہ دوسروں کو ناقابل عمل مشورے دیا کرتے ہیں تو ہمارا ناقابل عمل مشورہ یہ ہے کہ آپ پرانی فلم ہرگز نہ دیکھیں ۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ پرانی فلم کسی پرانی محبوبہ کی طرح بور کرتی ہے بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ پرانی فلم دیکھتے ہوئے ایک فلم بین کو پھر ایک بار اپنے زمانۂ طالب علمی کو آواز دینا پڑتا ہے ۔ ان پڑھ اور جاہل فلم بین فلم آپریٹر کو آواز دیتے ہیں — "ابے ساؤنڈ کھول ا —— پنکھے کھول !"

آپ یقین کریں یا نہ کریں ، مجھے پرانی فلمیں دیکھتے ہوئے بارہا شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں فلم نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ آئی ۔ اے ۔ ایس کیڈر کے ایک مسابقتی امتحان میں حصہ لے رہا ہوں اور مجھے آبجکٹیو پیپر حاصل کرنا ہے ۔ ادھر جیسے ہی پردۂ سیمیں پر ہیرو یا ہیروئن کے مکالمے کٹے ، ادھر میں نے فوراً اپنی پچھلی یادداشت کو کام میں لاکر خانہ پری کرلی ۔ اب آپ ہی بتائیے یہ آبجکٹیو پیپر نہیں تو پھر اور کیا ہے ؟ پرسوں ہی کی بات ہے کہ پرانے شہر کی ایک پرانی ٹاکیز میں ایک بہت ہی پرانی فلم لگی تھی ۔ یوں بھی پرانے شہر میں چند پرانی تاریخی عمارتیں اور چند پرانی ٹاکیزوں کے سوا رہ ہی کیا گیا ہے ۔ اگر اتفاق سے کوئی نئی ٹاکیز تعمیر ہوئی تو اس کی خیر نہیں ۔ وہ اس علاقے کے فلمی شائقین کو ایک نظر نہیں بھاتی جب تک کہ وہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اپنے اپنے گھروں کو [illegible] نہیں لے جاتے ۔

یہاں ٹکٹ خریدنا گویا ایک مہم سر کرنا ہے ۔ یہ مہم وہی حضرات سر کر سکتے ہیں جو گھونسہ پروف

لات پروف، شاک پروف اور واٹر پروف قسم کے ہوں۔ ورنہ کس شریف آدمی کو یہ پڑی ہے کہ وہ اپنا ٹرین یا لاری کا ٹکٹ کا پیسہ صرف ایک معمولی ٹکٹ کے لیے تار تار کرلے یا اپنے جسم کے کسی اہم عضو کو ناکارہ بنا لے۔ یہاں جو کوئی قاعدے اور قانون کی بات کرتا ہے، وہ مارا جاتا ہے۔

سینما ہال میں داخل ہوتے وقت دروازوں سے احتجاجی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں لیکن ان احتجاجی صداؤں کو سینما گھروں کے مالکین یوں نظر انداز کردیتے ہیں جس طرح فسادات کے وقت اقلیتوں کی چیخ و پکار۔ یہاں کی سیٹیں بھی کچھ کم تاریخی نہیں ہوتیں۔ یہ آپ کو آداب نشست و برخاست سکھاتی ہیں۔ جیسے ہی آپ نے اونگھنا شروع کیا یا بے ڈھنگے پن کا ثبوت دیا تو ایسی سمجھیے کہ تحت الثریٰ پہنچ گئے بعض سیٹیں تو بالکل کشتی نما ڈولنے لگتی ہیں۔ ان سیٹوں پر بیٹھ کر "تن ڈولے من ڈولے" صحیح معنی میں اٹھایا جاسکتا ہے اور بعض سیٹوں سے چوں چوں، چرکھٹ کی یوں آوازیں آنے لگتی ہیں جیسے مرڈر سین کے وقت خوف ناک قسم کا آرکسٹرا بج رہا ہو۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد ہر شخص کو یہ آزادی حاصل رہتی ہے کہ وہ یا تو پردہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے یا پھر پلٹ کر بیٹھ جائے تاکہ عورتوں کو گھور سکے۔

ان ٹاکیزوں میں جب کبھی کوئی فلم زیادہ رش لیتی ہے تو زاید ٹکٹ جاری کیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سینما ہال کی دیواریں ربر کی ہوتی ہیں کہ جتنا چاہو وسعت دے لو بلکہ طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بنچ اور ٹیبل رکھ دیے جاتے ہیں جو دیر سے آنے والوں کے لیے سنا کا کام دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا تو انھیں ہال کی دیواروں کے سہارے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر یا مرغا بن کر یا پھر دروازوں کے پردوں سے لٹک کر اپنے شوق دید کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ اب ہم آپ سے کیا چھپائیں، ہم نے بھی ایک بار اسٹیج کے پردے کے قریب لیٹ کر فلم دیکھی تھی۔
ان ٹاکیزوں میں فلم دیکھنے والوں کے اعصاب کافی مضبوط ہوتے ہیں۔ ان پر نہ تو سردی کا اثر ہوتا ہے اور نہ گرمی کا۔ خیر سردی تو انھیں کیا ستائے گی۔ البتہ جب گرمی بہت ہی ستانے لگتی ہے تو وہ قمیص اور بشرٹ اتار دیتے ہیں۔ شکر یہ ہے کہ بات اس سے آگے بڑھنے نہیں پاتی۔

انھیں کھٹملوں اور مچھروں کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ تو ان کی باضابطہ پرورش کرتے ہیں۔ ان کے فلم دیکھنے کے انداز بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ جب وہ موڈ میں آجاتے ہیں تو سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ کبھی کبھار رقص بھی کرنے لگتے ہیں۔ ان کے لیے "smoking prohibited" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اس تھیٹر کے نئے فلم بینوں کو بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔ اگر کسی نئے فلم بین نے گرمی کی تاب نہ لاکر ہش ہش شروع کی یا کھٹملوں کے کاٹنے پر پہلو بدلنے شروع کیے تو فوراً کوئی نہ کوئی یہ جملہ کس دے گا:

"ارے کوئی نیا ملبل آگیا!"

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پرانے شہر کی ایک پرانی ٹاکیز میں پرانی فلم لگی تھی۔ یہ وہی فلم تھی جس میں نے اپنے

زمانۂ طالب علمی میں پانی پینے کے بہانے کلاس سے نکل کر اور والد بزرگوار کی جیب سے اڈوانس منگنی کے شو میں دیکھی تھی۔ یہی وہ شہرۂ آفاق فلم تھی جس کے انتظار میں شائقین سینما نے دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام کرلی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ فلم ہمارے شہر میں ریلیز ہوئی تھی تو شائقین سینما نے پہلا شو دیکھنے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے رات ہی سے کیو میں اپنے بستر لگا دیئے تھے اور دوسرے دن کے ناشتے کا بھی انتظام کرلیا تھا۔ یہی نہیں، ایک دو خواتین کی گودیں کیو میں ہی ہری ہوگئی تھیں۔ بھلا ایسی معرکۃ الآرا فلم مجھ سے کیسے چھوٹ سکتی تھی۔ جب تک یہ فلم ہمارے شہر میں دکھائی جاتی رہی میں نے ہر روز ہر شو دیکھا۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے دن کے پہلے ہی شو کے دوران فلم کی ہیروئن نے میرے دل میں محبت کا بیج بو دیا تھا جو رفتہ رفتہ ہر شو کے ساتھ ساتھ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا۔ جی میں آتا تھا کہ میں اس فلم کا Representative بن کر فلم کے ڈبے کے ساتھ ساتھ شہر شہر گھوموں اور بالآخر بمبئی پہنچ کر ہیروئن کے قدموں پر گر کر گڑگڑاؤں کہ اے! پردۂ سیمیں کی ہیروئن! مجھ سے یہ فراق کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ مہربانی کرکے تو مجھے اپنے فلیٹ کا دربان بنالے۔

اب جب کہ دوبارہ یہاں نے شہر کے پرانے سینما گھر میں "بالکل نئی کاپی" کے عنوان سے اس فلم کی "بالکل پرانی کاپی" دکھائی جارہی تھی تو بھلا مجھ سے کیسے چپ رہا جاتا۔ کیوں کہ محبت نے پھر ایک بار انگڑائی لی تھی۔ ناچار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور ایک دوست سے پیسے ادھار لے کر سینما گھر کا رخ کیا ہی تھا کہ راستے میں ایک پرانے قرض خواہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کی خاطر فوراً بلدیہ کے ایک Urinal کا رخ کیا اور اس کے دوسرے راستہ سے چکمہ دے کر سینما گھر کی جانب روانہ ہوا۔ میرے پہنچنے تک کافی دیر ہوچکی تھی اور بکنگ بھی بند ہوگئی تھی۔ لہذا بلاک خریدنا پڑا۔ جب میں سینما ہال میں داخل ہوا تو گھپ اندھیرا تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے ایک سیٹ کو خالی جان کر بیٹھنا چاہا تو کسی نے اس زور سے دھکا دیا کہ میں ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچا اور دھپ سے فرش پر گر پڑا۔ پھر دوسرے ہی لمحہ میں ساتوں طبق روشن ہوگئے تھے۔ تب کہیں پتہ چلا کہ ہال بالکل بھرا ہوا ہے۔ اب جو میں اٹھنا چاہا تو پیچھے سے آوازیں آئیں۔

"ارے بیٹھو! ارے ہٹ!"

فوراً خاک نشینی اختیار کرنی پڑی۔ اتنے میں پبلک کی سیٹیوں کی آواز گونج میں اشتہارات کے سلائیڈس، پردہ پر نظر آنے لگے۔ پھر نیوز ریل شروع ہوئی پھر کسی آنے والی فلم کا ٹریلر۔ پھر مزید ایک آنے والی فلم کا ٹریلر۔ میرے دل سے آہ نکلی "کب تک میرے مولا! آخر کب تک۔ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں" کے مصداق پبلک کو ان ٹریلروں سے بہلایا جائے گا۔ اصلی فلم کب شروع ہوگی۔ اتنے میں یکایک کچھ مکالموں کے ساتھ فلم شروع ہوئی۔ "شیلا! میں اس کمینے کو بچے سے ...... ہوں ...... جس نے تیری ماں ...... میری ماں ...... شادی ......

جلد ...... لوٹوں گا۔

پھر جدائی کا گانا شروع ہوا۔ ہیروئن گانے لگی۔

بچپن کی محبت کو ...... سے ..... کرنا

جب ..... میری آئے ..... کرنا

میں حیران کہ آخر یہ کون سی فلم ہے۔ یہ کرنا کیا ہے ــــ یہ کون کرتا ہے اور اس فلم کی کاسٹ کیا ہے؟ مجھے شبہ سا ہونے لگا کہ شاید جلدی میں میں کسی دوسرے سینما ہال میں گھس آیا ہوں۔ شبہ دور کرنے کی خاطر میں نے اپنے ایک بازو والے شخص کو جھنجوڑ کر پوچھا "جناب! یہ کون سی کون سی ٹاکیز ہے؟ اور یہ فلم کون سی ہے؟ کچھ اتا پتا بتلائیے؟" جواب میں ایک خاتون کی جھڑکی سنائی دی۔ "پتہ نہیں کدھر سے آجاتے ہیں شہدے! پولس کو بلاؤں کیا؟" یا اللہ ایک نہ شد دو شد۔ فوراً آگے کی جانب کھسک گیا اور پورے انہماک کے ساتھ پردے پر نظریں گاڑدیں اور دماغ پر زور ڈال کر سوچنا شروع کیا کہ کچھ تو فلم سمجھ میں آئے مگر اتنے میں دیکھتا کیا ہوں کہ پردے پر ایک بھونچال سا آگیا ہے اور تمام مناظر گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ یکایک پردے پر کالی گھٹا سی چھا گئی ــــ تارے چمکے ــــ بجلی سی چمکی اندھیرا چھا گیا۔ فلم جل گئی ــــ ٹن ٹن ٹن ــــ پردے پر سلائیڈس کی بھرمار شروع ہو گئی۔

"Smoking Prohibited" بادام چھاپ بیڑی پیجیے" ......

اب ہم ایک نئے مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں" انٹرول ــــ

پورا ہال روشنی میں نہا گیا "چائے گرم۔ سوڈا لیمن ــــ پان بیڑی سگریٹ" لیکن میرا دماغ ان تمام ہنگاموں سے دور، گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ مجھے اس سین کے کٹ جانے کا کافی افسوس تھا جب کہ ہیرو اور ہیروئن ایک ہی مدرسہ میں عشق و عاشقی کے تمام مراحل طے کرتے ہیں۔ پھر وہ سین بھی تو نہیں تھا۔ جب ماسٹر صاحب ہیرو کو مارتے ہیں تو ہیروئن کے ہاتھ پر مار کے نشانات ابھر آتے ہیں۔ جنھیں وہ محبت کی نشانی سمجھ کر بڑی جتن سے دیکھ بھال کرتی ہے۔ یہی وہ اہم سین تھا جس میں مجھے فلسفۂ محبت سکھایا تھا ابھی میں ان گتھیوں کو سلجھانے بھی نہ پایا تھا کہ گھنٹی کی ٹرن ٹرن نے میری توجہ پردے کی جانب مبذول کروادی۔

کھیل کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ وہی کٹی ہوئی فلم کے ٹکڑے، وہی ہنگامہ وہی بے ترتیبی۔ جب ہیرو پورے موڈ کے ساتھ گاتے بجاتے ہوئے ہیروئن کی طرف لپکا" تو ہیروئن کی ماں سامنے آگئی۔ ہیرو جب دلہن کو گالیاں دیتے ہوئے مارنے کے لیے آگے بڑھا تو ہیروئن کا باپ آگیا۔ پھر سین بالکل ہی غائب تھا۔ جس میں ایک لڑاکا صدر رقص کے دوران "یہ وہ جام ہے کہ جس کا نہ سیدھا الٹا" کی تعبیریں کر پیش ہوتا ہے۔ اب بھلا پبلک میں تاب کہاں؟ ارے مارو ارے توڑو کی صدائیں۔ اتنے میں فلم نے خود دم توڑ دیا۔ میں توڑ پھوڑ کی آوازوں سے گھبرا کر لوگوں سے بچتے بچاتے، دیواروں سے ٹکراتے ہوئے باہر نکلا لیکن افسوس کہ بش شرٹ کی ایک آستین اور چپل سے محروم ہو گیا ــــ تلخ تجربے کے بعد میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ کبھی بھول کر بھی پرانی فلم پرانی ٹاکیز میں نہیں دیکھوں گا اور اگر دیکھنا ہی ٹھیرا تو کوئی نئی فلم دیکھوں گا اور کسی ایرکنڈیشنڈ تھیٹر میں [illegible]

(چنانچہ)

مسیح انجم

اخبار بینی اور ہوٹل

اخبار بینی کی اہمیت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے لیکن جب سے پرانی اقدار کی جگہ نئی اقدار
ے لی ہے اخبار بینی کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اب تو اخبار بینی نے بالکل ہی
بادت کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام صبح سویرے جاگنے کے بعد خدا کی عبادت میں
ں مشغول ہونے کے بجائے اخبار بینی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یوں تو اخبار بینی کے دلچسپ مناظر لائبریریوں، بسوں اور ریلوں میں نظر آتے ہیں لیکن
ں تعلق سے جو مقام ہوٹل کو حاصل ہے وہ کسی اور جگہ کو نصیب نہیں۔ اگر آپ ہوٹل کی اخبار
بی کے مناظر سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں تو اس کے لیے صبح سویرے جاگنا اولین شرط ہے۔ پھر
ں کے بعد بیس پیسے جیب میں ڈال کر ہوٹل کا رخ کیجیے۔ بیس پیسے ہوٹل کی راہ میں خرچ کرنا گویا ایک
ہے تین شکار کرنا ہے۔ اس کا پہلا شکار چائے۔ دوسرا شکار مفت میں اخبار بینی۔ تیسرا شکار۔ اخبار
ی کا دلچسپ منظر۔ اب ہم آپ سے کیا چھپائیں چونکہ ہمارا فینانشیل پوزیشن ذرا کمزور ہے۔ اس
ہ ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو ایک تیر سے تین شکار کرتے ہیں۔ ہم اپنے ہی ایسے ایک صاحب
ے واقف ہیں جو ہوٹل کھلنے سے قبل ہی نصف درجن کیلے اور ایک درجن موز کے ساتھ ہوٹل کے
وازے کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جوں ہی دروازہ کھلتا ہے وہ شیر کی طرح ہوٹل میں داخل
ر سارے اخباروں پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں پھر اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے ناشتہ کی جانب متوجہ
تے ہیں۔ جب وہ اپنا ناشتہ ختم کرچکتے ہیں تو پھر ایک پیالی چائے کا آرڈر دے کر اخبارات میں گم
یں بلکہ فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ اس وقت تک اخبارات نہیں چھوڑتے جب تک کہ وہ انھیں چاٹ بھنڈار
ی طرح پوری طرح چاٹ نہیں لیتے چونکہ وہ ذرا پہلوان قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے کوئی دوسرا
شخص ان کے پاس سے اخبار لینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس وقت دوسرے منتظر حضرات کی

کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ ان کے چہروں پر یتیمی کے پورے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہ دور ہی سے لومڑیوں کی طرح انھیں گھورتے ہیں۔ لیکن ان صاحب کو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ جوں ہی وہ اپنی سیٹ چھوڑ دیتے ہیں یہ لوگ ان اخبارات پر جھپٹ پڑتے ہیں۔

اسی طرح کے ایک اور صاحب ہیں جنھیں ہوٹل کے دوسرے اخبار بین حضرات کو ستانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اخبار کو ہاتھ میں لیتے ہیں لیکن پڑھتے وڑھتے نہیں بلکہ کنکھیوں سے دوسرے اخبار کے منتظر حضرات کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اتفاق کہیے یا شامت اعمال کہ ایک دن ہم ہی ان کے شکار ہو گئے۔ ہوا یوں کہ انھوں نے ہمیں اخبار کا منتظر پاکر بڑے ہی اخلاق سے میز پر رکھ دیا۔ لیکن جوں ہی ہم اخبار لینے کے لیے آگے بڑھے، انھوں نے پھر وہ اخبار اٹھالیا ہم یہ سمجھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے کہ شاید کوئی اہم سرخی ان سے چھوٹ گئی ہے۔ ابھی ہم دوسری میزوں کی طرف تاک ہی رہے تھے کہ انھوں نے پھر اخبار میز پر رکھ دیا لیکن جوں ہی ہم اٹھے انھوں نے پھر وہ اخبار اٹھالیا۔ اس طرح انھوں نے تقریباً پندرہ مرتبہ یہ حرکت کی اور ہم پندرہ مرتبہ سزا کے طور پر "اٹھ بیٹھ" کرتے رہے۔ مگر ظالم کو ذرا بھی رحم نہ آیا۔ ناچار ہمیں اپنا خون آپ ہی پی کر اخبار ۔ ۔ ناامید ہو کر ہوٹل سے نکلنا پڑا۔ وہ ہمیں ناکام نکلتا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

آپ نے پارلیمنٹ نہیں دیکھی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی ٹرو کاپی (true copy) ہوٹل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ البتہ فرق صرف عمارت کا رہے گا۔ پارلیمنٹ کی طرح یہاں بھی ریزولیشن پاس ہوتے ہیں اور لوٹتے ہیں۔ میزوں کو اپنا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ گھونسے دکھائے جاتے ہیں۔ تحریک عدم اعتماد منظور کی جاتی ہے۔ بیرونی ممالک کی سیاست میں ٹانگ اڑائی جاتی ہے۔ مختلف ممالک کے صدور اور وزرا نااہل قرار دیئے جاتے ہیں۔ جنگ کا نقشہ مرتب کیا جاتا ہے۔ فوجیں لڑائی جاتی ہیں۔ لڑاتے لڑاتے ایک ایسا موقع بھی آجاتا ہے جب کہ وہ خود آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ آنکھ جب کھلتی ہے تو اپنے آپ کو سڑک پر اوندھا پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ہوش آتے ہی گنگنانے لگتے ہیں:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہوٹل کے اخبار بین حضرات میں بعض دل جلے بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ دن گزرے ایک جگ بیت گیا جب کہ عاشق صحرا نوردی کیا کرتے تھے۔ آج کے عاشق ہوٹل نوردی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ہوٹل میں اخبار کم پڑھتے ہیں اور آرٹ کا مظاہرہ زیادہ کرتے ہیں۔ وہ اخبار کے کسی نہ کسی گوشہ پر "دل" بنا کر اس میں تیر پیوست کرتے ہیں۔ یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہ آسکی کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ ہم نے کئی دفعہ ان کے معشوق کو اخبار میں ڈھونڈنے کی کوششیں کیں لیکن لاحاصل۔ کیا وہ اخبار کو پریم پتر تصور کرتے ہیں۔ اگر وہ پریم پتر ہے تو پھر نامہ بر کہاں ہے؟

ہوٹل میں چونکہ بھانت بھانت کے لوگ قدم رنجہ فرماتے ہیں، اس لیے اخبار پر طرح طرح کی تحریریں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ تحریریں دستور ہند کی موجودہ تسلیم شدہ زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان تحریروں

سے ہم نے حسبِ ذیل اندازے قائم کیے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ بھی اس سے متفق ہوں :-

۱۔ اگر اخبار پر دستخطیں پائی جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ کسی بے روزگار پر روزگار کا دروازہ کھلنے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور یہیں سے دفتر کی فائلوں پر دستخطیں ثبت کرنے کی مشق کر رہا ہے۔

۲۔ اگر اخبار پر مختلف مصرعے پائے جائیں تو کفِ افسوس ملنا چاہیے کہ اب ایک بھلا سا آدمی ہم میں نہ رہا۔ کسی دن شاعر کے روپ میں ظاہر ہو کر اسی ٹیبل پر آپ کو ایک درجن غزلیں دو درجن قطعات اور پندرہ بیس نظمیں سنا کر دردِ سر میں مبتلا کر دے گا۔ یہ گویا ایک طرح سے آپ کو قبل از وقت خطرہ سے آگاہ کرنا ہے۔

۳۔ اگر اخبار پر مختلف ہندسے پائے جائیں تو سمجھ لیجیے کہ کسی پر سٹّہ کا بھوت سوار ہے۔

۴۔ اگر اخبار کا کچھ حصہ کٹا پھٹا ہو تو جان لیجیے کہ کسی بے روزگار نے "wanted" کالم کو اخبار سے الگ کر کے دوسرے بے روزگاروں کو اس کالم سے محروم کر دیا۔

۵۔ اگر اخبار میں اغلاط کی تصحیح پائی جائے تو سمجھیے کہ کسی صاحب کو پروف ریڈنگ کا شوق ہے۔

کافی تجربات اور مشاہدات کے بعد ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اخبار کی سرخیوں میں گم ہونے کے بعد قاری پر ایک وجدانی کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت نہ تو چائے کے مزے کا کچھ پتا چلتا ہے اور نہ چائے نوش فرمانے کا ہوش رہتا ہے۔ اس کے ہوش و حواس اس وقت ٹھکانے لگتے ہیں جب وہ کاونٹر کے پاس سے گزرتا ہے۔ آرڈر دے کر اخبار کی سرخیوں میں گم ہو جانا گویا اپنی عزت و ناموس کو خطرے میں ڈالنا ہے (کیوں کہ بیرے آپ کے آرڈر سے زیادہ چیزیں سپلائی کرنے کے عادی ہوتے ہیں) ایک مرتبہ ایک صاحب اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے آرڈر دے کر اخبار کی سرخیوں میں ڈوب گئے.................................

...... جس کے نتیجہ میں وہ اپنے بجٹ سے زیادہ کھا گئے۔ انھوں نے آرڈر دیا تھا۔ صرف چند بسکٹوں اور چائے کا لیکن جب وہ کاونٹر کے پاس سے گزرے تو بیرا چلّایا "دو روپے پچاس پیسے!"

وہ غصّہ اور حیرت کی ملی جلی نظروں سے بیرے کو گھورنے لگے۔

بیرا بولا "کیا گھور رہے ہیں صاب! پانچ کیک، پانچ پیسٹریاں، پندرہ بسکٹ اور ایک پلم کیک کے ڈھائی روپے نہیں تو پھر اور کیا ہوں گے۔ ذرا حساب کر کے تو دیکھیے!"

قبل اس کے کہ ان پر غشی طاری ہو جاتی، لوگوں نے چندہ کر کے ان کا بل ادا کر دیا۔ ورنہ صاف ظاہر تھا کہ میزیں صاف کرنے پر متعین کیے جاتے۔ یہ ان کے لیے "فنا فی الاخبار" ہونے کی سزا تھی۔

ہوٹل میں اخباروں کی تعداد سے زیادہ اخبار بین حضرات پائے جاتے ہیں۔ اس وقت اخبار اپنی تنگ دامانی پر گلہ کرتے [illegible] ہیں۔ اکثر اوقات اس تنگ دامانی کی شکایت کو اخبار بین حضرات بڑی ہی خوش اسلوبی سے سلجھا لیتے ہیں۔ وہ اخبار کے چار صفحات کو کبھی آٹھ صفحات اور کبھی بارہ

صفحات میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ جیو اور جینے دو کی اس سے اچھی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ بعض اوقات تنگ دامانی کا حل بیرے اپنی ذہانت سے بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ اخبار کو میزوں پر اس ڈھنگ سے بچھاتے ہیں کہ آپ کو یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ پرانے اخبار نہیں کیونکہ ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد ایک قاری کا دھیان تاریخ کی طرف بہت ہی کم جاتا ہے۔ اس روز آپ کی میزوں پر ایک ادارہ کے دو، دو تین تین اخبار نظر آتے ہیں۔ اس وقت آپ کا جی چاہتا ہے کہ ہوٹل کے مالک کی خیر خواہی پر قربان ہو جائیں۔ لیکن یہ بھرم صرف اس وقت کھلتا ہے جب کوئی پچھلی خبر آپ کے ذہن کے کسی نرم گوشہ میں محفوظ ہو۔ ورنہ آپ یہی سمجھیں گے کہ میں نے آج کا اخبار پڑھ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ایڈیٹر صاحبان پر ایک اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اگر اخبارات کا پی سائز پر چھپوائیں تو اخبار کی تنگ دامانی کا گلہ جاتا رہے۔

آیئے اب ہم آپ کو ہوٹل کی اخبار بینی کے تعلق سے چند مفید مشورے دیں۔ مشورے دینے سے قبل ہم آپ سے یہی خواہش کریں گے کہ آپ اخبار خرید کر پڑھا کریں لیکن اگر آپ ایک تیر سے تین شکار کرنے پر ہی بضد ہیں تو حسب ذیل مشوروں پر ضرور عمل کریں۔

۱۔ آرڈر دے کر پہلے چائے پئیں۔ پھر اخبار کی جانب متوجہ ہوں ورنہ آپ کو یہی شکایت رہے گی کہ آپ نے چائے نہیں پی، اخبار پیا۔

۲۔ اخبار کے مطالعہ سے قبل اس بات کا ضرور اطمینان کر لیں کہ آیا چیزیں آپ کے آرڈر کے مطابق سپلائی کی گئی ہیں یا نہیں ورنہ بجٹ سے زیادہ کھا جانے کا شدید خطرہ ہے۔

۳۔ چائے سے پہلے اگر بیرا آپ کے ہاتھ میں اخبار تھما دے تو آپ اسے ہرگز ہرگز قبول نہ کریں کیوں کہ اخبار میں گم ہونے کے بعد "TASTE" کا پتہ نہیں چلتا۔

۴۔ مطالعہ سے قبل اس روز کی تاریخ ضرور دیکھ لیا کریں ورنہ پرانا اخبار دوبارہ پڑھ لیے جانے کا خطرہ ہے۔

۵۔ سیاسی اور مذہبی بحث ہرگز ہرگز نہ کریں کیونکہ حلیہ بگڑ جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ ●●

(سائیڈ سے چلیے)

کہاں ہو تم ...
(مسیح انجم کی یادیں)

رشید عبدالسمیع جلیل
حیدرآباد

مسیح انجم کہاں ہو تم دکھائی کیوں نہیں دیتے
چھپے بیٹھے ہو کس گوشے میں لب بستہ کئی دن سے
نہ وہ دیہی شگوفے ہیں نہ وہ قلقاریاں پیہم
مہک اٹھتی تھی بزم دلبراں شام و سحر جن سے

عدم آباد میں شاید کبڈی چل رہی ہوگی
فرشتے روز دسترخوان عمدہ چن رہے ہوں گے
مگر تم لکھ رہے ہوگے کوئی مضمون چپکے سے
بتاؤ ختم کب ہوگا تمہارا یہ نیا مضمون
سناؤ گے ہمیں کب یہ نزی اسٹائیل میں اپنے
تمہارے بعد تو یہ شہر اب شہر خموشاں ہے
سبھی احباب ہر پل منتظر ہیں راہ تکتے ہیں
کہ تم آؤ گے اور سب کو کسی صورت ہنساؤ گے

مگر دیکھو ذرا تم اپنی آمد راز میں رکھنا
کسی کو بھی کسی نکڑ سے ٹیلیفون مت کرنا

•••

مسیح انجم

محبوب مانجھومی
بلاسپور

مرد اک ذی شعار تھا انجم
وہ ہنساتا بھی تھا، رلاتا بھی
طنز اس کا تھا منفرد سب سے
رکھتا تھا اسپ قلم قابو میں
یوں تو سب کو ہنساتا رہتا تھا
دیکھ کر حالِ بد زمانے کا
قدر کرتے تھے جوہرانِ ادب
شیفتہ تھا، زبانِ اردو پر
فخر، زندہ دلان کیوں نہ کریں

کیسا باغ و بہار تھا انجم
گاہے گل، گاہے خار تھا انجم
جو نہ چوکے وہ وار تھا انجم
ایسا اک شہسوار تھا انجم
خود مگر بے قرار تھا انجم
کتنا سینہ فگار تھا انجم
جوہر آب دار تھا انجم
دل و جاں سے نثار تھا انجم
خنجرِ آب دار تھا انجم

سب سے برتاؤ اس کا تھا یکساں
سب کا محبوب یار تھا انجم

اقبال ہاشمی

مسیح مضطرب

مزاح و طنز کا اک اور باب ختم ہوا
مسیح کیا گئے اک اور خواب ختم ہوا

لگی جو آنکھ تو ساری حقیقتیں بھی کھلیں
کہ زندگی کا سفر تھا سراب ختم ہوا

شگفتگی جسے کہتے ہیں ختم تھی ان پر
شگفتگی ترا سارا شباب ختم ہوا

بہت سوال اٹھائے تھے زندگانی نے
بہت طویل تھا لیکن جواب ختم ہوا

ہر ایک بات پہ ہوتا تھا اضطراب تمہیں
کہو مسیح کیا اب اضطراب ختم ہوا

جو بات بات پہ کھاتے تھے پیچ و تاب ان پر
ان حاسدین کا اب پیچ و تاب ختم ہوا

مسیح ان کو چبائے بغیر رہ نہ سکے
کہیں پہ مرغ کہیں پر کباب ختم ہوا

نچوڑ ڈالا صحافت کے سخت پنجوں نے
بچا کھچا تھا جو ان کا شباب ختم ہوا

تمام عمر تلنگی کی نان کھاتے رہے
مگر جو اس پہ تھا اردو کباب ختم ہوا

بہت عذاب سہے ہاشمی زمانے کے
رکی جو سانس تو سارا عذاب ختم ہوا

○

رؤف رحیم

آہ مسیح انجم

مزاح و طنز کے سالار تھے مسیح انجم
غموں سے برسرِ پیکار تھے مسیح انجم

خلوص، پیار کے پیکر تھے اس لیے سب سے
محبتوں کے طلب گار تھے مسیح انجم

کمال و مضطر و طالب کے یارِ خاص رہے
کہ یار باشوں میں اک یار تھے مسیح انجم

ہنسانا روتے کو بے شک ثواب ہے اے دوست
یہ سچ ہے واقفِ اسرار تھے مسیح انجم

تھا ان کا چہرہ شگفتہ، کوئی سمجھ نہ سکا
کئی دنوں سے گو بیمار تھے مسیح انجم

قضا کے ہاتھ بڑے پُرجفا ہیں کیا کیجے
نکل نہ پائے گرفتار تھے مسیح انجم

تھا ان کا قہقہہ ان کے مزاج کا غماز
رحیم سچ ہے کہ دلدار تھے مسیح انجم

اداریہ

● شگوفہ کا یہ شمارہ ہمدم دیرینہ مسیح انجم کے نام وقف ہے ۔ شگوفہ نے پچھلے تقریباً تیس سال
ں جن طنز و مزاح نگاروں کو روشناس کیا ، ان میں مسیح انجم کو نمایاں مقام حاصل ہے ۔ حیدرآباد
ں طنز و مزاح کے ارتقا کی وہ اہم کڑی ہیں ۔ ان کا تخلیقی سفر شگوفہ کے دوش بہ دوش چلتا رہا ۔ وہ
پنا ہر مضمون اور ہر تحریر شگوفہ میں اشاعت کے لیے دیا کرتے تھے ۔ دفتر شگوفہ ان کی سرگرمیوں
ا مرکز تھا ۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاسوں اور وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے ادبی اجلاسوں میں
ہ اکثر مضامین سنایا کرتے تھے اور خوب داد پاتے تھے ۔ ادبی حلقوں کی وہ پسندیدہ شخصیت تھے ۔ طنز
مزاح کی سرگرمیوں کے فروغ میں بھی انھوں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔

زیر نظر شمارہ دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ ایک حصہ میں مسیح انجم کے رفیقوں نے نثری و منظوم
خراج عقیدت پیش کیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں مسیح انجم کی تمام کتابوں سے انتخاب شامل کیا گیا
ہے ۔ کوئی خاکہ اس انتخاب میں شریک نہیں کیا گیا ۔ خاکوں پر مشتمل کتاب کی اشاعت کے لیے مسیح انجم
آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی سے مالی امداد کے خواہاں تھے ۔ اردو اکیڈیمی نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ
خاکوں کا مجموعہ اکیڈیمی کی جانب سے شائع کیا جائے گا ۔

● زندہ دلانِ حیدرآباد کے نامور شعرا خواہ مخواہ ، حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی بیگ ان دنوں امریکہ
کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مزاحیہ مشاعروں میں شریک ہو رہے ہیں اور اب تک ملی
اطلاعات کے بموجب ان مشاعروں میں سامعین کی کثیر تعداد شریک ہو رہی ہے ۔ مشاعروں کی محفلوں
میں بعض مقامی شعرا بھی حصہ لے رہے ہیں اور یہ محفلیں صبح کی اولین ساعتوں تک جاری رہتی ہیں ۔
مہمان شعرا کو بار بار سنا جاتا ہے ۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خواہ مخواہ ، حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی
بیگ اس سے قبل بھی امریکہ کے مشاعروں میں شریک ہو چکے ہیں ۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

به یادِ مسیح انجم

جلد ۳۱ ——— اکتوبر ۱۹۹۸ء ——— شمارہ ۱۰

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اڈوائزر : ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اڈوائزر کمیٹی :
حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدہ)
مسعود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمٰن سلیم (ریاض)

سرورق :
سعادت علی خاں

طباعت :
دائرہ پریس چھتہ بازار

مجلس مشاورت :
نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
محمد علی رفعت آئی اے ایس
حمایت اللہ

مجلس ادارت :
مصطفیٰ مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

قیمت فی پرچہ : ۱۲ روپے
زرِ سالانہ : ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱ فون (آفس) 595716 (رہائش) - 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ڑیں گے پرزے (خاکے)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

حیوان اور ظرافت

غالبیات (قسط وار مضامین)

چورن (منظومات)

کی طرح مستحکم

کی طرح منفرد

نظر اٹھائیے ، دیکھئے الفلاح کی جانب
رواں دواں ہیں بلا سودی کاروبار یہاں

سکون قلب کا یہ بھی تو اک سہارا ہے
ہمارے شہر کا یہ منفرد ادارہ ہے

تاج محل کی طرح منفرد اور چار مینار کی طرح مستحکم

بلا سودی کاروبار کے ذریعہ اطمینان بخش کمیشن فراہم کرنے والا منفرد ادارہ

اپنی رقم مشغول کرکے ہر ماہ گھر بیٹھے کمیشن حاصل کرتے رہیئے !!

آپ کے روپے کی حفاظت کا یقین دلاتی ہے

اس میں سرمایہ مشغول کرکے اپنے خاندان کے بہتر مستقبل کی طمانیت حاصل کیجئے ۔

الفلاح کمپنی

رجسٹرڈ

صبح ۱۰ بجے سے شام ۷ بجے تک مستعد، باخلاق اسٹاف آپ کی رہنمائی کے لیے دفتر میں موجود رہتا ہے۔

AL FALAH COMPANY

POLICE COMMISSIONER OFFICE ROAD
PURANI HAVELI, HYD, PHONE 4565848
PIN 500 002 FAX -040-4565848

ایس زیڈ حسن شکاگو

اور حسن چشتی

شکاگو میں حسن چشتی کا نام سماجی حلقوں میں اس قدر اہمیت کا حامل ہوگیا ہے کہ سماج اور حسن چشتی ایک دوسرے کے لیئے جزولاینفک ہوکر رہ گئے ہیں مشاعروں، ادبی بیٹھکوں، عرسوں، قوالیوں، جلسوں جلوسوں، میلوں ٹھیلوں، اجتماعوں، اور گھریلو جمگھٹوں غرض کوئی اجتماع ہو اس سے حسن چشتی کا نام منسلک ہوگا۔ جہاں حسن چشتی سماج کی ضرورت بن گئے ہیں وہاں ان کی تصویریں اخباروں رسالوں کی کمزوری بن کر رہ گئے ہیں۔ عوام الناس کو حسن چشتی کی تصویریں دیکھنے کی اسقدر عادت ہوگئی ہے کہ اگر کبھی غلطی سے اخبار میں حسن چشتی کی تصویر چھپنے سے رہ جائے تو لوگ اخبار کو جعلی اخبار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ اب تو نوبت یہ ہے کہ اخبار والے اپنے اخبار کو جعلی ہونے کے الزام سے بچانے کے لئے کسی نہ کسی ذیل میں حسن چشتی کی تصویر چھاپ کر اطمینان کا سانس لینے لگتے ہیں کہ چلو اس ہفتہ بھی اخبار جعلی ہونے کی علت سے بچ گیا۔ کسی کا انٹرویو چھپ رہا ہے تصویر کے نیچے لکھا ہوتا ہے فلاں صاحب فلاں کا انٹرویو لیتے ہوئے اور حسن چشتی۔ "کسی ٹراول ایجنسی کی افتتاح کی خبر آرہی ہے تصویر کے نیچے لکھا ہوتا ہے " فلاں ٹراول ایجنسی کے پروپرائٹر فلاں اور حسن چشتی " کسی انجمن یا ادارہ کا قیام عمل میں آرہا ہے، رپورٹ چھپتی ہے تصویر کے نیچے لکھا نظر آتا ہے " فلاں انجمن کے فلاں اور حسن چشتی " کسی کے انتقال کی خبر چھپتی ہے ساتھ کی تصویر پر لکھا ہوتا ہے " مرحوم کے صاحبزادے فلاں اور حسن چشتی " اقبال ڈے، غالب ڈے میر ڈے چاہے کوئی ڈے منایا جائے رپورٹ کے ساتھ والی تصویر کے نیچے درج ہے " فلاں تقریر کرتے ہوئے، فلاں مقالہ پڑھتے ہوئے اور حسن چشتی " کسی عرس کی تفصیل چھپتی ہے تو ساتھ والی تصویر ہوتی ہے " عرس کے کنوینر فلاں قادر الکلام قوال فلاں کی گل پوشی کرتے ہوئے اور حسن چشتی "اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پریس والے حسن چشتی کی تصویر کو تبرک سمجھ کر اپنے اخباروں میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ بعض وقت کوئی رپورٹ یا خبر نہ بھی ہو تو اخبار کے کسی کونے میں حسن چشتی کی کسی کے ساتھ تصویر چھاپ دی جاتی ہے اور قاری حیرانی سے سارا اخبار اس تصویر کی اشاعت کی

وجہ تلاش کرنے کی علت میں پڑھ ڈالتا ہے معاملہ اب تواس قدر آگے بڑھ گیا ہے کے اگر کہیں کوئی تقریب ہوتو چاہے تقریب نیشنل ہویا انٹرنیشنل سب سے پہلے اس بات کی فکر کی جاتی ہے کہ کسی طرح حسن چشتی کی تصویر دستیاب ہوجائے ورنہ یاتو اخبار والے رپورٹ شائع کرنے سے انکار کردیں گے یا پھر وہ رپورٹ ان تک پہنچے گی ہی نہیں ۔ شکاگو کی کوئی خبر اگر حسن چشتی کی تصویر کے بغیر اخبار کے دفتر پہنچ بھی جاتی ہے تو ایڈیٹر اس کو یہ لکھ کر حسن چشتی کے پاس روانہ کردیتا ہے کہ صاحب یہ بے پر کی خبر کسی نے چھاپنے کےلئے روانہ کردی ہے اس میں نہ توآپ کی تصویر ہے اور نہ ہی آپ کا ذکر خیر، ذرا چھان بین کرکے اس ناہنجار کی خبر لیں جس نے یہ حرکت کی ہے ۔ " اور پھر لوگ باگ اس ناہنجار کا حشر دیکھ کر خود کو سدھار لیتے ہیں ! ہر کوئی اپنی پوزیشن کو بحال کرنے کے لیے دھڑا دھڑ کسی نہ کسی عنوان سے مضامین لکھ کر اس میں حسن چشتی کی تابڑ توڑ تصویریں " بھر کر " شائع کروانے لگتا ہے بہرحال وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں "۔۔۔۔۔ " اور حسن چشتی " کا ورد روز افزوں بڑھتا ہی جاتا ہے اور پھر نہ صرف اخباروں رسالوں میں حسن چشتی کی تصویروں بھری کہانیاں چھپنے لگتی ہیں بلکہ حسن چشتی کے عنوان سے تقاریب بھی منعقد ہونے لگتی ہیں، مشاعرہ کی صدارت حسن چشتی کریں گے ، دکان کا افتتاح حسن چشتی کریں گے ، محفل سماع میں حسن چشتی کسی درگاہ کی نمائندگی کریں گے ۔ احتجاجی جلوس میں حسن چشتی کے ہاتھ میں جھنڈا ہوگا وغیرہ پھر حسن چشتی کی تصویریں اخبار کے ہر صفحہ پر رونق افروز نظر آنے لگتی ہیں کبھی مسکراتے ہوئے ، کبھی سنجیدہ، اور کبھی نم دیدہ ۔ یوں تو اخبار والے کافی احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر کبھی کبھی غلطی بھی سرزد ہوجاتی ہے جیسے ایک دفعہ مضمون کسی کے انتقال پر ملال کا تھا اور تصویر چھپی تھی لکھا تھا " حسن چشتی مرحوم کے فرزند سے تعزیت کرتے ہوئے " مگر ستم یہ تھا کہ تصویر میں حسن چشتی قہقہے لگاتے ہوئے نظر آرہے تھے ، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اصل تصویر کھو جانے پر کسی مزاحیہ مشاعرہ کی تصویر چھاپ دی گئی تھی ۔ بہرحال تصویر تو چھاپنا ضروری تھا ، سووہ ضرورت پوری ہوگئی ۔ ایک دفعہ پرنس مکرم جاہ کے اعزاز میں تقریب منعقد ہوئی رپورٹ چھپی مگر تصویریں مل نہ سکیں ، بے حد غور و خوص کے بعد ایڈیٹر نے ایک مدبرانہ فیصلہ کرلیا کہ رپورٹ کے ساتھ حسن چشتی کی تصویر چھاپ دی جائے اور اس تصویر کے بائیں حصہ کو بلانک چھوڑ دیا بہرحال تصویر چھپ گئی جس کے نیچے لکھا تھا " شہزادہ مکرم جاہ اور حسن چشتی " اب جب میرا یہ مضمون شائع ہوا اور اس کے ساتھ صرف حسن چشتی کی تصویر چھپ جائے تو سمجھئے کہ میں بھی وہیں کہیں آس پاس منڈلا رہا ہوں !

(جشن حسن چشتی کے موقع پر)

میں محترم اسحاق ہاشمی صاحب صدر عالمی ادارۂ ادب اور ان کے رفقاء
کار کا بطور خاص شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آج کی محفل میں مجھے بھی کچھ
کہنے کا موقعہ دے کر میری عزت افزائی فرمائی ہے خاص طور پر اس لئے بھی
کہ جس ہستی کے بارے میں گفتگو کرنے کو کہا ہے ان کے متعلق یہی کہہ سکتا
ہوں۔۔ کہاں میں کہاں وہ یہ مقام اللہ اللہ۔

انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص میرا فرینڈ فلاسفر گائڈ ہے'
دوست کہہ نہیں سکتا کہ دوست میں پائی جانے والی خوبیاں اپنے میں قطعی
نہیں پاتا فلسفی یہ کسی طرف سے بھی نہیں لگتے ہیں۔ ہاں البتہ ان سے بہت
کچھ سیکھا ہے اور اب تک سیکھ رہا ہوں اس لئے گائڈ ضرور کہہ سکتا ہوں
پتہ نہیں محترم جعفری صاحب کو یاد ہے کہ نہیں میری ان سے پہلی ملاقات
اسلام آباد میں میرے ایک عزیز اجلال حسین صاحب کے گھر پر اب سے
تقریباً پچیس تیس سال پہلے ہوئی تھی اور ان کو سننے کا بھی بھرپور موقعہ پہلی
دفعہ ملا تھا۔ ایک نظم انہوں نے اپنے سرکاری کوارٹروں کے رہنے والوں کے
حالات کے متعلق سنائی تھی جو کچھ اس طرح تھی کہ کدو کی بیل تو ہمارے
ہاں لگی ہے مگر کدو پڑوسیوں کے ہاں اچھل رہے ہیں۔ غالباً" اس وقت تک
قاسمی صاحب نے کہ سنگ تجھ کو لگے چوٹ آئے مجھے والا شعر نہیں کہا تھا۔
دوسری میں علامہ اقبال کے کلام کا جو حشر قوالوں نے بنایا ہے اس کا بڑا ہی
دلچسپ انداز میں حال بیان کیا گیا تھا اور جو قوالیاں کے عنوان سے سنائی تھی
اس وقت سے ہمارا نیاز مندی کا رشتہ ہے۔ آتش تو اس وقت بھی جوان تھا
بلکہ اب تو نوجوان ہوتا جا رہا ہے البتہ نیاز مند بوڑھے ہو گئے شاید انہیں
آب بقائے دوام نہ مل سکا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ خوش و خرم
تندرست و توانا رکھے آمین!

محترم ضمیر جعفری صاحب اپنے دور کے نہایت ہی اہم اور ممتاز مزاح
نگار شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کے لئے میں وہ الفاظ اور القاب و آداب نہیں
استعمال کروں گا جو ہر کس و ناکس کے لئے اتنے استعمال ہوئے ہیں اور جن کا
اس قدر استحصال ہو رہا ہے کہ اب وہ اپنے معنی ہی کھو چکے ہیں بلکہ اب تو یہ
حال ہو گیا ہے کہ جب کوئی دوسرا لکھنے کو تیار نہیں ہوتا ہے تو ہم خود ہی ا۔
سے عظیم طنز و مزاح نگار یا عظیم دانشور لکھ لیتے ہیں اور دوسروں کو زحمت
نہیں دیتے ہیں۔ نظم میں تو قیامت ڈھاتے ہی ہیں نثر بھی کچھ کم نہیں۔
ملاحظہ ہو۔ نوازش نامہ کا ایک ٹکڑا۔
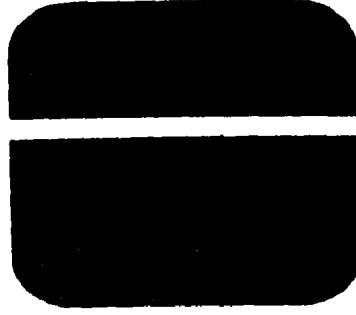
"محترم اسحاق ہاشمی صاحب نے مجھے آپ کے حوالے کر کے مجھے سو
بڑے شفیق ہاتھوں میں ہے مگر مجھے آپ سے ہمدردی بھی ہے کہ آپ کو ایک
مشقت میں جھونک دیا۔ خوش بھی ہوں کہ مجھے ہاشمی صاحب کے وسیلے
اپنے بارے میں اپنے عہد کے ایک اہم مزاح نگار کی تحریر میسر آجائے
میری طرف سے آپ کو پوری اجازت ہے کہ آپ مجھ پر بھی وہی ہاتھ رکھیں
انکم ٹیکس کمشنر لوگوں پر رکھتے ہیں یوں مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے مار کر بھی سا
میں ڈالیں گے" ہم بھی اسحاق ہاشمی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ہمیں ان
وجہ سے بابائے ظرافت کی طرف سے "اپنے عہد کے ایک اہم مزاح نگار ہو۔
کا سرٹیفکیٹ ان کی اپنی تحریر میں مل گیا ہے۔ محترم جعفری صاحب سلوک تو
آپ کے ساتھ وہی کریں گے جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں البتہ سا
میں ڈالنے والی بات صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم تو خود آپ کے زیر سایہ رہنے
آرزومند ہیں۔ شاعر ادیب ایڈیٹر سیاست دان' سیاح مصنف فوجی غرض اب
صرف یہ پوچھنے کو طبیعت چاہتی ہے کہ جناب کیا نہیں ہیں ہندوستان پاکستان
اردو کا کونسا رسالہ یا اخبار ایسا ہے جس میں ان کی نگارشات نہیں چھپی ہیں ا
تک ان کے اپنے بیان کے مطابق چالیس کتابوں کے مصنف تو ہو چکے ہیں ہم
تو چالیس کا ہندسہ پسند نہیں آیا تھا اچھا ہوا کہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے بتا دیا
موصوف اب تک پچاس کتابیں لکھ چکے ہیں دس تو لکھ کر بھول بھی چکے ہیں
ہمیں اب پتہ چلا کہ یہ میٹرک میں حساب میں کیوں فیل ہوئے تھے۔ ویسے یہ ف
ہونے والی بات بھی جعفری صاحب نے خود ہی ہمیں بتائی ہے۔ آج تک ک
بڑے آدمی کو ہم نے اس قدر سچ بولتے نہیں دیکھا کیوں فیل ہوئے تھے ان
لکھی ہوئی کتابیں چاروں صوبوں کے تعلیمی نصاب میں شامل ہیں ایک بات
ضرور جاننا چاہتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے نہیں بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ چارو
صوبوں میں ان کا کلام بلاغت نظام پڑھ کر اب تک کتنے طالب علم شاعر بن
ہیں مگر ہمیں یقین کامل ہے کہ ایک بڑی تعداد ضرور ہو گی ہم خود شاعر بنتے
رہ گئے اب تک ضمیر جعفری صاحب نے جتنے کام کئے ہیں یا جو بتائیں ہیں صرف
ایک شوق ہی ان کی طبیعت سے لگا نہیں کھاتا اور وہ ہے سیاست اور انتخاب
میں حصہ لینا جو انہوں نے پنجاب اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لے کر پورا
چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا شریف سیدھے سچے آدمی کو ہمارے ہاں کون ووٹ
ہے ہار کے بعد کا حال صرف ایک فقرے میں خوب بیان کیا ہے "الیکشن کے

ہماری شہرت نصف النہار پر اور مالی حالت پاتال تک جا پہنچی"
ناموں کے ساتھ لاحقے لگانے کا دستور ہم تو سمجھے تھے کہ ہمارے ہی زمانے میں جاری ہوا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ اس کا رواج بہت پہلے سے تھا چنانچہ ضمیر حسین شاہ تجاوزات کے ذریعہ سید ضمیر جعفری بن گئے ان کا کہنا تو یہ ہے "میرا نام صرف ضمیر ہے" ویسے بھی ضمیر ہی سب سے اہم ہے۔ تجاوزات کا استعمال ہم دونوں میں قدر مشترک ہے مگر یہ ہم سے آگے نکل گئے کیونکہ ہم صرف صدیقی بن سکے نام سے پہلے اضافہ کرنے کی نہ سوجھی ویسے سچی بات یہ ہے کہ یہ اضافہ سرکاری نوکری کے زمانے میں بہت مہنگا پڑا جب روزانہ سینکڑوں دستخط کرنے پڑتے تھے! اچھا بھلا چھوٹا سا نام تھا اظہر حسن آج بھی وقت ہوتی ہے جب کوئی کہتا ہے کہ آپ کے بھائی صدیقی صاحب تھے اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تو پورے خاندان میں اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ آج کل کے سرکاری بڑے آدمیوں کی طرح جعفری صاحب کی تاریخ پیدائش بھی غلط لکھی ہے اور اپنے بڑے بھائی سے صرف ڈھائی سال بڑے ہیں مگر پھر بھی ریٹائر مینٹ کے وقت آج کل کے بڑے آدمیوں کا وطیرہ نہیں اختیار کیا کہ تاریخ پیدائش درخواست دے کر یا مقدمہ کر کے صحیح کرا لیتے ویسے یہ مجھ سے صرف ایک دن بڑے ہیں۔ ان کی پیدائش پہلی جنوری کی ہے اور میری دو جنوری کی ہے۔ گذرے ہوئے سالوں کا ذکر جانے دیجئے انھیں کیا شمار کرنا۔ انسان شاعر ہو اور تخلص نہ رکھے ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے چنانچہ ہمارے ممدوح نے بھی تخلص اختیار کیا مگر نہ جانے کیا سوچ کر درد چن لیا مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور ان سے لوگوں کو ہنسنے ہنسانے اور ان کو خوش کرنے کا کام لینا تھا اس لئے درد پہلو سے جلد ہی جدا ہو گیا ایک سوال جو بڑے ادیبوں اور شاعروں سے اکثر ہی کیا جاتا ہے مگر ہمارے سوال کرنے سے پہلے ہی موصوف نے اس کا جواب خود ہی دے دیا "اپنے اس احساس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ جیسے ہر کتاب کے بعد ایک اور کتاب ابھی باقی ہے اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ میری بہترین تخلیق ابھی تک معرض وجود میں نہیں آسکی" ہماری بھی یہی دعا ہے کہ خدا کرے ابھی کافی عرصہ تک ان کی بہترین تخلیق ان کے خیال اور معیار کے مطابق نہ آئے اور یہ یونہی علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں ورنہ پھر جمود طاری ہونے کا اندیشہ ہے۔
محترم سید ضمیر جعفری صاحب ان چند خوش قسمتوں میں سے ہیں جنہیں ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی جلسہ قرارداد پاکستان میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔

۲۹ مئی ۱۹۹۸ء کو عالمی ادارہ ادب کراچی کی طرف سے سید ضمیر جعفری کے اعزا میں دیئے گئے استقبالیہ میں پڑھا گیا۔

یوسف ناظم
(بمبئی)

محلّے کی کہانی
محلّے والوں کی زبانی

ہمارا محلہ یہاں اس وقت وجود میں آیا جب یہاں کوئی شہر وہر نہیں تھا۔ شہر بعد میں قائم ہوا اور امر بیل کی طرح پھیلتا رہا۔ اب بھی پھیل رہا ہے۔ شروع شروع میں یہ اندھیرے میں تھا۔ اب بھی اندھیرے میں ہے۔ ویسے تو شہر کے باشندوں کی کوشش ہے کہ یہ دن میں بھی اندھیرے میں رہے لیکن سورج کی روشنی ابھی ان کے حسن انتظام کی گرفت میں نہیں آئی ہے۔ ہمارے محلے کا اصلی اور قدیم نام منصور پورہ تھا۔ کہتے ہیں منصور علی شاہ کے نام سے آنے والے صاحب سمرقند سے اونٹ پر بیٹھ کر یہاں آئے تھے۔ اس مرحوم اونٹ کی قبر اب بھی محلے میں ہے اور تکیہ کہلاتی ہے۔ رات کے وقت اکثر لوگ اپنا اپنا بستر لے کر اسی تکیے میں آرام کرتے ہیں۔ آرام کرنے سے پہلے تاش ضرور کھیلتے ہیں اور کھیل کے دوران لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی لڑائی نہ ہو تو لوگوں کو پسند نہیں آتی۔ منصور پورہ کا نام گھٹتے گھٹتے اب صرف من پرا رہ گیا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے اس نام میں یعنی من پرا میں اب گھٹنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اس محلے کے اطراف جو شہر قائم ہوا اُسے ہر دوسرے یا زیادہ سے زیادہ تیسرے سال نظر ضرور لگتی ہے اور جب اسے نظر لگتی ہے تو بیویوں کی آنکھ لگ جاتی ہے اور قیامت بھی سرہانے آ جائے تو کھلتی نہیں ہے نظر کس کی اور کیسے لگتی ہے۔ اس کی رپورٹ تو تیار کی جاتی ہے لیکن صرف ضائع کیے جانے کے لیے شائع کیے جانے کے لیے نہیں (گویا شائع کرنے کا کوئی فائدہ ہونے والا تھا) نظر ٹھیک سے لگی یا نہیں اس پر پولیس کی خاص نظر رہتی ہے۔ راتوں میں ۱۲ بجے کے بعد دروازوں پر دستک دے کر معلوم کیا جاتا ہے کہ کتنے لوگوں کو نظر لگی تھی۔ (کوئی باقی رہ گیا تو وہ نظروں میں آ جاتا ہے لیکن یہ الگ مسئلہ ہے اور ہمارا موضوع نہیں ہے (امن پسند شہری اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے)

ہمارے محلے میں سڑک نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پہلے کسی زمانے میں پائی جاتی تھی بلکہ کئی سڑکیں جگہ جگہ پڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی سڑکیں تھیں کہ کئی جگہ چوراہے اور سہ راہے بن گئے تھے اور ہر راہے پر کسی نہ کسی ظالم کا مجسمہ کھڑا کر دیا گیا تھا (یہ سارے کے سارے مجسمے انگریز نژاد تھے۔ اب ان

مجسموں کی جگہ نئے مجسمے لگا دیئے گئے ہیں بات وہی ہے) جب محلے کے لڑکوں نے سڑکوں پر کرکٹ کھیلنا شروع کردیا (اور ختم نہیں کیا) تو اہل محلہ نے سڑکوں کی خواہش میں مبتلا ہونا ترک کردیا۔ اکثر تو زخمی ہوکر اسپتالوں میں شریک تھے) یہ بے وقت گھر سے نکلے تھے۔ دیکھ رہے ہیں کرکٹ ہو رہی ہے لیکن منہ اٹھائے چلے آرہے تھے۔ آخر خود کو ہی بھگتنا پڑا۔ اب ہمارے محلے میں سڑکیں نہیں ہیں صرف گڑھے ہیں جن پر نئے گڑھے کافی مشہور ہیں۔ ان کی خانہ پرسی ہوتی رہتی ہے۔ آج کسی کی بچی کو ڈھونڈ کر ایک گڑھے سے برآمد کیا گیا تو کل کسی کے بلکہ شاید اسی بچی کے دادا جان کو اوپر منگوانے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ یہ یہاں کا معمول ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے محلے کا کوئی بھی فرد اپنے کام پر مقررہ وقت پر نہیں پہنچ پاتا۔ ان گڑھوں سے عہدہ برآ ہونے میں اس کے کم سے کم بیس منٹ تو یہیں صرف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کرکٹ کے کھیل کا تعلق ہے مشہور یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور و معروف کھلاڑی جن میں عباس علی بیگ بھی شامل ہیں ان پڑے کی سڑکوں پر کرکٹ کھیل چکے ہیں۔ عباس علی بیگ کو آپ شاید بھول گئے ہیں۔ یہ وہی کھلاڑی ہیں جنھوں نے بمبئی کے برابورن اسٹیڈیم میں کرکٹ کھیلتے وقت ایک سنچری بنائی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اسٹیڈیم میں سے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی کھلاڑی کے قریب پہنچی (یہ گیند کی طرح تیز بھاگی تھی) اور کھلاڑی کی گردن سے لپٹ گئی۔ اگر امپائر انگلی اٹھا کر اس کے آؤٹ ہونے کا اشارہ نہ کرتا تو شاید ایک اوور (مخصوص) تک گردن ہی رہتی۔ اس واقعہ کا ذکر ہم نے اس لیے کیا کہ اس سے ہمارے محلے کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی عباس علی بیگ نے کئی سنچریاں بنائیں لیکن انھیں اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی مذکورہ سنچری بنانے پر ہوئی تھی۔

سڑکوں کی بات، جانے دیجیے، ہمارے محلے پر کیا موقوف ہے۔ پورے شہر کی سڑکیں اسی نمونے پر بنائی گئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تعمیر پر پیسہ بہت خرچ ہوا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے یہ پیسہ کیسے خرچ ہوا ہے۔ ہمارے محلے کے بیشتر نوجوان میونسپل کارپوریشن میں ملازمت کے لیے ہمیشہ درخواستیں اور انٹرویو دیتے رہتے ہیں۔ پانی کا انتظام تو سب سے بہتر ہے اور ہر دوسرے ورنہ تیسرے دن تو محلے میں پانی رواں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لوگ تھکتے ہیں۔ عورتیں بھی ان کو دیکھا دیکھی یہی عمل کرتی ہیں۔ اس نازک وقت میں گھر کے سارے مرد محفل آرائی کے لیے چلے جاتے ہمارے محلے میں گھڑے بہت بکتے ہیں۔ مٹی کے گھڑے بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ مرد پلاسٹک کی بالٹیاں پسند کرتے ہیں اور آدھے سے زیادہ پانی گرا دیتے ہیں۔ ان کا کمال دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی اور ہنستے ہیں اس طرح بچوں کے پھسلنے کا گھر ہی میں انتظام ہو جاتا ہے یہ پیتے ہیں اور دوبارہ نہلائے جاتے ہیں۔ پینے کے پانی میں کافی سے زیادہ مفردات اور مرکبات ملے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے یہ مرکبات بکٹیریا کے ذرات ہوتے ہیں۔ ہوتے ہوں گے۔ ان سے ڈائریا پھیلتا ہے اور ڈاکٹروں کے کلنک آباد ہوتے ہیں۔ (اس لفظ کو یوں پڑھیے کلی نک ورنہ ڈاکٹر صاحبان ناراض ہو جائیں گے)

پہلے یونین پرا اتنا آباد نہیں تھا۔ اب تو بازار دوکانیں ہوٹل سنیما ہال اور کارخانے تک کھل گئے ہیں۔ فٹ پاتھ محلے میں ہیں نہیں۔ سڑکیں ہی نہیں ہیں تو فٹ پاتھ کہاں سے ہوں گے۔ اس لیے محلے میں بھیڑ

والے دن بھر گھومتے رہتے ہیں۔ شام کے اوقات میں ہیرا پھیری والے بھی آجاتے ہیں۔ نہ ان پر کوئی پابندی ہے نہ آنکھ پہ۔ پھیری والوں پر تو خیر کبھی کبھی کوئی معترض ہو جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری کے سلسلے میں جو لوگ عمر آتے ہیں ان کے چہرے دیکھ کر ان سے کوئی ایک جملہ معترضہ تک نہیں کہتا۔ یوں تو محلے کی عام پان کی دکانیں شام کے اوقات میں دیر تک جگمگاتی رہتی اور چراغاں کا سماں پیش کرتی ہیں لیکن ایک خانگی کوچنگ کلاس سے متصل جو ہیرا پیتا پان شاپ ہے اس کی رونق ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔ حمل و توسع ہی اس کا ایسا کشش انگیز ہے کہ دور دور کے محلوں کے "سیاح" یہاں آنے اور وقت گزارنے لگے ہیں۔ کارخانوں میں بچہ مزدور کی بہتات ہے۔ ان کارخانوں میں ہر نوعیت کی صنعت جاری ہے۔ کہیں مصالحہ کتری جا رہی ہے تو کہیں بیڑیاں بن رہی ہیں۔ جن بچوں کو پیاس زیادہ ۔۔۔۔ لگتی ہے وہ پیچھے کی گلی میں جا کر بیڑی پی لیتے ہیں۔ کارخانے کا مالک سب جانتا ہے لیکن دل ہی دل میں یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے کہ بچے ہیں جانے دو۔ دس بیس بیڑیوں میں کیا رکھا ہے۔ اس شخص نے یہ بھی کہیں سنا تھا کہ چھوٹے بچوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہنا چاہیے۔ انھیں ٹوکنا نہیں چاہیے۔ سمجھدار آدمی ہے ورنہ بہت سے لوگ تو بچوں کو نہ صرف ٹوکتے ہیں بلکہ جھڑکتے بھی ہیں۔ بھول جاتے ہیں کہ یہی بچے آگے چل کر قوم و ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے (اور ملک کی تباہی میں خاطر خواہ حصہ لیں گے) بچے کہاں نہیں ہوتے۔ شہر کے دوسرے محلوں میں بھی ہوں گے لیکن اتنے نہیں ہوں گے جتنے ہمارے یہاں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے محلے میں اسکول نہیں ہیں) - جو ہیں ان میں مدرسین نہیں ہیں۔ فرنیچر بھی ان اسکولوں میں کم کم پایا جاتا ہے۔ نیا فرنیچر اسکولوں کے لیے بھیجا ضرور جاتا ہے لیکن وہ اسکولوں میں پہنچتا نہیں۔ یہ طریقہ کار پورے ملک میں رائج ہے۔ راج دھانی میں ہمارے معزز وزرا صاحبان کو شکایت ہے کہ انھیں تو پرانے اور شکستہ فرنیچر پر گزارا کرنا پڑتا ہے جبکہ ان کی وزارت کے عہدہ دار اور ان کے بیوی بچے اعلیٰ درجے کے صوفوں پر مزے کی نیند سوتے ہیں۔ (اس شکایت میں صداقت تو نظر آتی ہے لیکن اس میں مبالغہ بھی کافی ہے) ہم کہنا یہ چاہ رہے تھے کہ بچے جب اسکول نہیں جاتے تو ظاہر ہے گھر بیٹھے ہی کے گلی کوچوں میں گھومتے پھریں گے۔ شام کے وقت والدین انھیں اور گھر کی مرغیوں کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ (بعض صورتوں میں بچوں کو بھیجا جاتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو تلاش کر کے گھر لے آئیں۔ یہ بھیگی بلی کی طرح سر جھکائے گھر میں داخل ہوتے ہیں)۔

ہمارے محلے کی تعمیراتی اور تعلیماتی پس ماندگی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ محلہ بہت حقیر ہے مندرجہ بالا کوتاہیوں کے باوجود ہمارے یہاں ثقافت بہت ہے۔ خاص طور پر دو گھر تو اس ضمن میں بہت مشہور ہیں۔ ایک تو ہے شمشاد علی خاں کا وسیع اور فراخ احاطے والا گھر۔ گھر کیا ہے کہیے اچھا خاصا بنگلہ ہے۔ ہرا بھرا ہونے کی وجہ سے نئے نمونے کا فارم ہاؤز دکھائی دیتا ہے۔ شمشاد علی خاں فوج میں لفٹننٹ تھے۔ یہ فوج میں اس لیے گئے تھے کہ کہیں اور جا نہیں سکتے تھے لیکن تھے بنیادی طور پر سمجھدار۔ 60 سال کی ملازمت میں رہے۔ جب تک برسر خدمت تھے ٹریننگ پاتے رہے۔ پشتینی رئیس تھے۔ جب انھیں

معلوم ہوا کہ انھیں کسی محاذ پر بھیجا جانے والا ہے یہ ٹریننگ کی خاطر ایک اونچے درخت پر چڑھ گئے اور وہاں سے زمین پر گر پڑے۔ گرنے سے پہلے دیکھ لیا تھا کہ زمین پر پتھر وتھر تو نہیں ہیں اور آرام کے ساتھ ہڈی تڑوائی۔ انکے والد کا پڑ ہار کا کاروبار تھا۔ ہول سیل کا ۔ اسی کاروبار میں پھلنے پھولنے لگے۔ انھیں شاعری سے غضب کا لگاؤ تھا۔

ہر دوسرے مہینے اپنے گھر پر ایک طرحی مشاعرہ کرتے تھے۔ طرح بھی خود ہی دیتے تھے۔ سب سے اچھی غزل انہی کی ہوتی تھی کیونکہ یہ ان کے داداجان مرحوم کے غیر مطبوعہ دیوان سے حاصل کی جاتی تھی۔ ان کے داداجان کو شاعری کے علاوہ عروض پر بھی بڑا قابو تھا۔ مشاعرے میں یہ اعلان کردیتے تھے کہ ان کا مصرع نہ اٹھایا جائے علاوہ ازیں یہ بتاتے تھے کہ ان کا مصرع گرتا کہاں ہے۔ مصرعہ دہرانے کی ترکیب انہی کے گھر سے برآمد ہوئی۔ مشاعرے میں ثقافت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ شامیانہ تک لگوالیا جاتا تھا۔ اور قناتیں بھی۔ مشاعرے میں ...... ۔ کرسیاں کبھی نہیں لگی تھیں۔ کہتے تھے مشاعرے میں کرسیاں بہت لغو معلوم ہوتی ہیں۔ سفید چاندنی کا فرش۔ جگہ جگہ گاؤ تکیے۔ اگالدان۔ گرمیوں کے دنوں میں برف آلودہ پانی۔ چائے شربت پانی بکثرت۔ (سگریٹ نہیں پلاتے تھے اور نہ مشاعرے کے دوران کسی کو پینے دیتے تھے۔ اس لیے پنڈال میں چہل پہل بہت رہتی تھی کوئی نہ کوئی شخص سگریٹ کی طلب کے زیر اثر باہر جاتا کسی دو کو بھی ساتھ لے لیتا۔ مشاعرے کی صدارت بھی خود ہی کرتے تھے۔ یہ مشاعرے بہت کامیاب ہوئے۔ گزشتہ سال ان کے گھر میں کوئی واقعہ ہو گیا۔ بس مشاعروں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

کہتے ہیں مرغ کی نہاری بھی انہی کی ایجاد ہے۔ ہمارے شہر کے اکثر ہوٹلوں میں نہاری رات کے وقت بھی تیار ملنے لگی ہے۔ لوگ اسے پتہ نہیں نہاری کیوں کہتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے عشا کے وقت فجر کی نماز پڑھ لی جائے۔ یہ بھی ایک قسم کی ثقافت ہے۔

محلے میں دوسرا گھر جہاں ثقافت کا دور دورہ ہے نواب زادہ سلطان ارشد خاں کا ہے۔ یہاں موسیقی کی محفلیں سجتی ہیں۔ خود نواب زادہ بھی اچھا خاصا گالیتے ہیں لیکن ہر شخص تو مہدی حسن یا غلام علی خاں نہیں ہو سکتا۔ یہ سر تال سے واقف ہیں۔ دادرا اور ٹھمری کا فرق جانتے ہیں۔ بس آواز میں لحن نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آواز البتہ پاٹ دار ہے۔ الاپ لیتے ہیں تو ان کے گھر کے قریب جتنے مکان ہیں بلنے لگتے ہیں۔ بلکی فرمائش پر اسمال نے اپنے گھر میں ایک ساؤنڈ پروف ہال کا بندوبست کرلیا ہے اور مزے سے شب و روز الاپ لیتے رہتے ہیں۔ دو بیویاں انھیں چھوڑ کر جا چکی ہیں اور مشہور یہ ہے کہ بہت خوش ہیں۔ ہونا ہی چاہیے کب تک الاپ سنتی رہتیں۔ ابھی حال میں یہ تیسری جلد لے آئے ہیں جو خستہ حالت میں تو نہیں ہے لیکن باہر چلی جانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ ان کی ثقافت بہر حال جاری ہے۔

محلے میں اب بھی اتنی زمین خالی پڑی ہے کہ دو چار اچھے سنیما ہال (بغیر اجازت کے) کھڑے کیے جا سکتے ہیں لیکن جب سے ٹیلی وژن ہر گھر میں آگئے ہیں سنیما ہال کا کاروبار مندا ہو گیا ہے۔ سنیما ہال کی خرابی یہ تھی کہ خاندان کے سارے افراد ایک ساتھ فلم دیکھنے نہیں جا سکتے تھے جب کہ ٹیلی ورن پر خرب اخلاق گانے سننے اور فلمیں دیکھنے کی سب کو سہولت ہے۔ پندرہ بیس سال پہلے تک ہم لوگ کتنے پسماندہ تھے۔

محلے کی کہانی کے اور بھی ابواب (بلکہ اسباق) باقی ہیں۔ اپنے وقت کا سب سے قدیم محلہ یہی ہے باقی محلے سب اسکے سامنے کے بچے ہیں۔

●●

دوہے

جس دن مل جائیں گلے غوری[1] اور ترشول[2]　　اپنے سارے پینترے یورپ جائے بھول

آیا جب میں شہر سے بن کر اپٹو ڈیٹ　　بیوی دیکھے گٹھری اماں دیکھیں پیٹ

آہ لگی معصوم کی جھیل رہے ہو روگ　　پرکھوں کا یہ قول ہے جس کی کرنی تس بھوگ

بچو! اُردو بھی پڑھو انگریزی کے ساتھ　　"پی ایس سی" کی نوکری تب آئے گی ہاتھ

پاپا یہ بتلائیے کیوں جلتا ہے بول　　کیا جگنو کے پیٹ میں رہتا ہے پٹرول

---

[1] پاکستانی میزائیل　[2] انڈین میزائیل ۔

ہادی بہاری (کلکتہ)

قطعہ

اٹھتے ہوئے طوفان کا رُخ بھانپ رہا ہے
خطرے کی مہک سونگھ کے وہ ہانپ رہا ہے
ہم نے تو کیا ایک پٹاخہ ہی ٹرائیل
سمراٹ کلنٹن کا بدن کانپ رہا ہے

پُرکھوں کا آدرش

اک دوشیزہ، نیم برہنہ چنچل سی
میں نے اک دن اس سے پوچھا لے جھلی
تم جو اپنے تن کی نمائش کرتی ہو
یہ بے شرمی، یہ عُریانی، شرم کرو
دُخترِ قوم و حرمتِ ہندستان ہو تم
پُرکھوں کی تہذیب کو رسوا کرتی ہو
ہنس کر بولی، آپ بھی کیسے انکل ہیں
پُرکھوں کے سانچے ہی میں تو ڈھلتی ہوں

ساکت پانی میں ہو جیسے ہلچل سی
بے بی اسٹوڈنٹ ہو تم تو کالج کی
انگریزی فیشن کی نمائش کرتی ہو
تم ہو لڑکی ہندستانی شرم کرو
شیواجی اور ٹیپو کی سنتان ہو تم
بے بی کچھ تو سوچو یہ کیا کرتی ہو
چھپن سال کے ہوگئے پھر بھی بوتل ہیں
گاندھی جی کے آدرشوں پر چلتی ہوں

ہم سب کو جو راہ دکھایا کرتے تھے
وہ بھی تو کپڑے کم پہنا کرتے تھے

پروفیسر حفیظ بنارسی

ملاوٹ، ایک اخلاقی گراوٹ

ہر چیز میں یہاں جو ملاوٹ ہے دوستو
اخلاق کی یہ اپنی گراوٹ ہے دوستو

اہلِ وطن کے ساتھ بڑی دشمنی ہے یہ
غداری ہے، گناہ ہے جرمِ جلی ہے یہ

اب دودھ میں مزا ہے نہ کچھ گھی میں لطف ہے
کچھ ساگ میں ہے لطف نہ بھاجی میں لطف ہے

یاں زہر بک رہا ہے دواؤں کے نام پر
'لاحول' کیوں نہ بھیجیں ہم ایسے نظام پر

سرسوں کا تیل کھا کے ہزاروں ہوئے علیل
اہلِ جہاں کی نظروں میں ہم ہوگئے ذلیل

مت پوچھئے کہ لوگوں پہ کیا کیا ستم ہوئے
کتنے غریب راہیٔ ملکِ عدم ہوئے

ماحول خوف کا ہے، پریشاں ہیں مرد و زن
چرچا اسی دیا کا ہے گھر ہو کہ انجمن

تحقیق ہو رہی ہے کہ یہ ماجرا ہے کیا
بیوپار کرنے والوں کو آخر ہوا ہے کیا!

یہ حادثہ تو پیش نہ آیا کبھی یہاں
کردار کی یہ پستی نہ دیکھی گئی یہاں

کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ بات ہے ضرور
اس میں بدیشی طاقتوں کا ہات ہے ضرور

دشمن ہمارا چال چلے ہے نئی نئی
ہم کو مٹانے کے لئے سازش رچی گئی

تحقیق کی رپورٹ جب آئے گی دوستو!
کیا اصل واقعہ ہے چھپائے گی دوستو

رشوت کی دیوی اپنا کرشمہ دکھائے گی
سب داغ پیسے والوں کے ہم سے چھپائے گی

کچھ گول مول بات کہی جائے گی میاں
سچائی سر جھکائے چلی جائے گی میاں

مجرم ہے کون کچھ نہ چلے گا کہیں پتا
بس چند روز بعد بدل جائے گی فضا

ہوں گے وطن میں روز گھٹالے نئے نئے
دکھلائیں گے مداری تماشے نئے نئے

سب لوگ بھول جائیں گے سرسوں کی بات کو
کل کون یاد رکھے گا پرسوں کی بات کو

○

ڈاکٹر سید عباس متقی
(حیدرآباد)

سیکل

احباب جب سیکل پر کوئی مزاحیہ مضمون لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں تو ہم چوکنے ہو جاتے ہیں کہ کہیں یہ لوگ ہمارا امتحان تو نہیں لے رہے ہیں یا پھر ہمیں بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں کیوں کہ پطرس بخاری نے سیکل پر کچھ ایسا دلچسپ، پرلطف اور مکمل مضمون لکھ چھوڑا ہے کہ اب اس عنوان پر قلم اٹھانا گویا خود پطرس کی سیکل چلانا ہے جو شاید ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پطرس نے سیکل کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے ان میں اب اضافے کی شریف قلم کاروں کے پاس کوئی گنجائش نہیں لیکن ایسا [illegible] پایا گیا ہے کہ پامال زمین بھی "طرح" میں پیش کردی جاتی ہے تو خواہی نخواہی شعر کہنے ہی پڑتے ہیں خواہ غزل پھیکی ہی کیوں نہ رہ جائے۔ اصرار احباب ناطق ہو تو ناچار اس راہ پر چلنا ہی پڑتا ہے۔ [illegible]

سیکل ہماری پسندیدہ سواری ہے کیوں کہ یہ پٹرول کے بغیر چلتی ہے۔ دو ہاتھ، دو آنکھیں [illegible] تو دماغ کا استعمال کرنا پڑتا ہے، نیز "اتار" ہو تو توانائی بھی درکار نہیں بس "بیلنس" [illegible] اور میلوں کا سفر مفت میں طے کیجیے سیکل خود بہ خود چلتی رہے گی۔ البتہ چڑھاؤ پر سیکل اڑیل گھوڑے کی طرح رک جاتی ہے۔ جیسے سیکل سوار بیل کی طرح پورا زور لگا کر کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض [illegible] ایسے وقت زیادہ شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے سیکل سے اتر جاتے ہیں۔ جب کوئی سیکل سوار "ڈنڈا" مارتا ہے تو عجیب مضحکہ خیز منظر ہوتا ہے۔ یہ مضحکہ خیز منظر سامنے سے کچھ پیچھے ــــــ کچھ دکھائی دیتا ہے۔ سامنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا نومشق پیراک ہوا میں تیرنے کی مشق کر رہا ہو اور قسمت سے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں۔ پیچھے سے ایسا لگتا ہے جیسے سیکل سوار اپنے پیچھے والے کو منہ چڑا رہا ہو اور دانت بھی پیس رہا ہو۔

بچے جب قینچی چلاتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے کہ یہ ابھی سے ہندوستان میں رہنے کی مشق بہم پہنچا رہے ہیں۔ شاید ان غریب بچوں کو تا دم حیات یوں ہی غیر فطری، غیر موزوں اور غیر آئینی انداز

سے زندگی گزارتی ہے۔ سیٹ کو بغل میں دباکر بائیں ہاتھ سے ہینڈل تھام کر جب ٹانگ سیکل کے
فریم میں داخل کردیتے ہیں مانو کوئی بروڈی شتر سیاست میں داخل ہونے کی کوشش کررہا ہو۔
جب سیکل چلاتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ سیکل چلا رہے ہیں کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ ر
کوئی آدمی آرہا ہو یا بیل، کھمبا، گڑھا ہو یا غنڈہ۔ پولیس والا ہو یا لیڈر انھیں کسی کی پروا نہیں
ہاں سب ان کی پرواہ کرتے ہیں۔ بیل اور گدھے تک راستہ دے دیتے ہیں اور جو بچوں کو راستہ
دیتا اس کے لیے اوپر کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگوں نے بچوں کو راستہ نہ
دیا تو ان کے لیے اوپر ہی اوپر، اوپر کا راستہ کھل گیا۔ بچوں کو راستہ دینا چاہیے خواہ راستے میں معا
کے روڑے ہوں، بدمعاشی کے۔ یاد رہے بچوں کو بریک لگانے کی عادت نہیں ہوتی وہ عموماً لگ
سکتے ہیں خواہ ٹکر ماریں یا کھائیں۔ ایک دن ہم ایک مصرع پر گرہ لگا رہے تھے اور گرہ میں الجھ کر قدرے
درمیان میں آگئے۔ پیچھے سے ایک لونڈے نے جو سیکل سے ٹکر دی سامنے سے کامل پہیہ برآمد ہوگیا
حیرت بھی ہوئی کہ یہ آگے کیا نکل آیا کہیں کرتوت کا پھل تو نہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کرتوت کا پھل
پیچھے ٹپکا ہوا ہے۔ ہم بچوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔ خواہ وہ ہمارے ہی بچے کیوں نہ ہوں۔ نصیحت کی
میاں یہ سیکل ہے کوئی ہندوستان کی حکومت نہیں جو جس کے جی میں آئے چلالے۔

خوش نصیب ذاتی سیکل چلاتے ہیں اور بدنصیب کرائے کی۔ جب کوئی کرائے کی سیکل
ہے تو اس کے مزاج میں بلا کا تحمل پیدا ہوجاتا ہے۔ کرائے کی سیکل چلانے والا دنیا کا ہر کام بحسن
خوبی انجام دے سکتا ہے۔ اگر کوئی کرائے کی سیکل پہ جائے اور ہوٹل میں چائے پی کر ہمہ اقسام کی
ہم شکل ہم رنگ سیکلوں میں سے اپنی سیکل نکال لائے اور دوسری سیکلوں کو نہ گرائے تو وہ کسی
صوبے کی وزارت عظمیٰ کی اہلیت کا حامل سمجھا جائے گا۔ کیونکہ وہ فرلیس، معاملہ فہم اور جفاکش
جو کرائے کی سیکل کو پہچان لے وہ ہندوستانیوں کے مزاج کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرے گا۔

دو طرح کے لوگ سیکل چلاتے ہیں۔ ایک شریف دوسرے ذاتِ شریف۔ شریف وہ جو
کا نان نفقہ ادا کرتے ہیں۔ شریف شوہروں کی طرح اس کی آبروئے عصمت کی حفاظت کرتے ہیں
اغیار کی دست درازیوں اور نظر بازیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ذاتِ شریف وہ جو اپنی سیکل
نان نفقہ ادا نہیں کرتے۔ بارش کی مصیبت اور دھوپ کی تمازت سے نہیں بچاتے۔ جب جی چاہا تو
سواری کرلیتے ہیں۔ بیمار اگر پڑ جائے تو دوا دارو نہیں کرتے۔ لیکن سیکل میں ایک خوبی "وفا" بھی ہے۔ جب
تک کہ گٹھیا سے اکڑ نہ جائے یا فالج سے بیکار نہ ہوجائے۔ ایک سگھڑ ہندوستانی بیوی کی طرح
ساتھ نبھاتی ہی رہتی ہے۔ جب تک کہ خود اس کے کل پرزے اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔

سیکل فل گیر ہوتی ہے یا ہاف گیر لیکن کچھ سیکلیں "نو گیر کیس" کی بھی ہوتی ہیں۔ فل گیر
کیس سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی۔ شرم و حیا سے لدی ہوئی۔ ہاف گیر کیس گاڑی فلمی اداکارہ
ہوتی ہے۔ نیم دروں، نیم بروں۔ گیر تو خیر اس میں بھی نظر نہیں آتا لیکن فیر وہیل کی باتیں اور ہے کی

ڈھکا کچھ کھلا ہو تو اس کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور پھر اس کے دندانے جو نظر آ آ کر چھپتے ہیں عجیب رومانی منظر ہوتا ہے۔ دیکھنے والے کی سانس، نبض اور خون تینوں میں روانی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ شرط بس اتنی سی ہے کہ سیکل پر شباب ہو۔ اور نوگر کبھی سیکل سرکس میں کرتب دکھلانے والی دوشیزہ ہوتی ہے۔ ہر سمت و ہر جہت سے عریانی دادِ شجاعت دیتی ہوئی۔ دیکھنے والی ہر نظر بہ آسانی معلوم کر لیتی ہے کہ گیر کا سائز کیا ہے اور فیر وھیل کی کیفیت کیا ہے۔ دندانوں کا کیا حال ہے اور چین کی مستی کس درجے پر ہے۔ ہینڈل ہے تو کہاں ہے ہینڈل ہے تو کدھر ہے۔

سیکلوں میں ایک سیکل وہ ہوتی ہے جو اپنی جگہ سے ہلتی نہیں مگر چلائی جاتی ہے۔ اس سیکل پر موٹے اور فربہ حضرات بیٹھ کر دبلے ہونے کی مشق کرتے ہیں۔ اور چند ہی دنوں میں اتنے دبلے ہو جاتے ہیں کہ انھیں دیکھنے کے لیے محدب عدسہ کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ دبلے، موٹے ہونے کے لیے کونسی سیکل چلائیں گے۔ زندگی کی سیکل آدمی کو موٹا ہونے نہیں دیتی۔

ویسے ہندوستان میں موٹاپے کی کوئی کمی نہیں۔ ہر روز اخبار میں موٹاپے کے دور کرنے کی دوائیں ایجاد ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ موٹے تو ان دواؤں کے استعمال سے دبلے نہیں ہوتے لیکن ان دونوں کے بنانے والے موٹے ضرور ہو جاتے ہیں یا ابتو موٹاپے کے لیے ایک ہی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ "دولت" بس آدمی دنوں میں سالوں کی فربہی پا لیتا ہے مگر جو موٹاپا بعض صوفیوں، مرشدوں، عالموں اور سجادہ نشینوں میں پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چونکہ یہ حضرات مرثر چلاتے ہیں۔ اس لیے سیکل کی ورزش سے محروم رہتے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا پتہ کہ سیکل کیا چیز ہوتی ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ بعض لوگوں کو زبردستی سیکل پر بٹھا کر چھوڑ دیں اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنی مرضی سے اس کے بعض نٹوں کو اتنی تک ڈھیلا کر دیں۔ ایک متصوفانہ خاندان میں ہمارا گزر ہوا وہ اس لیے کہ بعض لوگ ہماری ظاہری غربت کو اختیار کردہ غربت سمجھ کر ہمیں صوفی سمجھ لیتے ہیں اور اپنے خاندان کا ایک فرد خیال کرتے ہیں۔ دیکھا کہ ایک پرانی "رالے" سیکل کھڑی بلکہ دھنسی ہے۔ ہم نے کہا حضور آپ کی ہے؟۔ بھنّا اٹھے۔ اندھے ہو اوپر کیا لکھا ہے "عطیہ ملا دوپیازہ"

ہم نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وقت وہ آن پڑا ہے کہ اب ہم اپنا ہی سر پیٹ رہے ہیں۔ دوسرا اپنا سر کیوں پیٹنے دے گا۔ بھلا اکبر کے زمانے میں سیکل ایجاد ہی کہاں ہوئی تھی۔ لوگ گدھوں، گھوڑوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ اس سے تو بحث ہی لایعنی تھی کہ خود ملا دوپیازہ کا کردار فرضی ہے۔ مریدوں کی طرح سر ہلا کر خاموش ہو رہے۔

سیکل میں جو چیز ہمیں بہت بھاتی ہے وہ اس کی غیر معمولی سامان لادنے کی صلاحیت ہے۔ ہم اپنے دادا کی پرانی سیکل پر اپنی بیوی اور بچوں کے علاوہ مع ساز و سامان کے سسرال پہنچتے ہیں۔ سیکل کے تین حصے ہر وقت کام آتے رہتے (۱) کیریر (۲) ڈنڈا اور (۳) ہینڈل۔ سامنے کے طویل ڈنڈے پر اگر صحت مند ہوں تو دو بچے اور غیر صحت مند ہوں تو تین بچے بٹھائے جا سکتے ہیں۔ کیریر پر بیوی کو بآسانی بٹھا کر اس کے ہاتھ میں سیٹ کا چھتا دیا جا سکتا ہے۔ ہینڈل سیکل کو ایک ہینڈل بخشتا ہے جس کے

جانبین کو پوری بے ساختگی سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ایک جانب اپنا بیگ اور دوسری جانب اپنے بال بچوں کا بیگ بہ آسانی لٹکایا جا سکتا ہے اور یقین جانیے یہ سہولت تو ہیرو ہونڈا میں بھی نہیں پائی جاتی۔ ہم اپنے گھر کا سارا غلہ سیکل پر لاتے ہیں۔ اس کے باوجود جگہ بچ جاتی ہے۔

ہمارا دھوبی تو سیکل پر سارے محلے کے کپڑے لیے پھرتا ہے اب اسے اپنا گدھا یاد نہیں آتا۔ دھوبیوں کی دیکھا دیکھی دودھ والوں نے بھی سیکل کو کام میں لانے کی ٹھان لی ہے اور یہ لوگ سیکل کے دونوں ہینڈلوں میں دو کیریر پہ دودھ کی بالٹیاں اٹکائے گھوم رہے ہیں۔

ہم جب بھی کرائے کی سیکل لیتے ہیں تو پوچھ لیتے ہیں کہ کہیں اسے کسی دودھ فروش نے تو استعمال نہیں کیا ہے۔ ایک دفعہ سیکل والا ہمیں دھوکہ دینا چاہا لیکن ہماری قوت شامہ نے ہمیں خبردار کیا کہ ہینڈل معطر ہے اور قوت بصارت نے آگاہ کیا کہ پینڈل اور چین میں آئیل کی جگہ دودھ چھوڑا گیا ہے۔ سیکل کی یہ اہانت ہم سے دیکھی نہیں جاتی مگر کیا کریں جو غریب کی بیوی ہے وہ تو سبھی کی بھابھی ہوگی بلکہ آج کل تو یہ کہا جا رہا ہے کہ غریب کی "وائف" سب کی "لائف" ہے۔

سیکل میں کئی بیماریاں پائی جاتی ہیں مثلاً پنکچر ہونا۔ کبھی کبھی "برسٹ" ہونا، ہینڈل کا پھر جانا، پینڈل کا ڈھیلا ہو جانا، چھرّوں کا مار کھانا گھنٹی کا نہ بجنا، مڈگاڈ کا نیچے اتر جانا وغیرہ۔ ان کم بخت چین کے اترنے کی جو بیماری ہے اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ اس تکلیف کا وہی اندازہ کر سکتے ہیں جو عجلت میں ہوں اور چین گر گر ستانے لگے۔ جب چین بار بار گرتی ہے تو سیکل سوار اپنی آنکھوں سے گر جاتا ہے بلکہ لوگوں کی آنکھوں سے بھی کیونکہ جب وہ چین چڑھانے کے لیے اکڑوں بیٹھتا ہے تو اس کی حالت اس بھکاری کی طرح ہوتی ہے جو انگریزوں کے شہر میں اردو میں بھیک مانگ رہا ہو۔ آنے جانے والوں کے علاوہ چین چڑھائی کا شغل بچوں کے لیے بہت پرکشش ہوتا ہے جب کہ چین چڑھانے والا کوئی چرخ بوڑھا ہو۔ جب آدمی سیکل کی چین دندانے پر لگا کر بڑی امید سے سیکل پیچھے لیتا ہے تو اس کے تذبذب کی کوئی مثال نہیں، اسے گمان غالب ہوتا ہے کہ ممکن ہے چڑھ جائے مگر فری وھیل پر چین چڑھتی ہے تو گیر سے اتر جاتی ہے اور اس کے چہرے پر ایک کرب کے آثار نمودار ہوتے ہیں جیسے ابھی ابھی اس کی محبوبہ اسے دغا دے کر اپنے بوائے فرنڈ کے ساتھ فرار ہو گئی ہو۔ بعض عقل مند لوگ ایسے موقع پر اپنی سیکل کے علاوہ اپنی قسمت کو بھی کوستے ہیں۔ اور ان کی بڑبڑاہٹ ہندوستانی غربت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ہم اپنی سیکل کی چین چڑھاتے چڑھاتے جہاں سے نکلے تھے وہیں مقام پر پہنچ گئے۔ جب سیکل کی چین بار بار گرنے لگے تو سیکل سواروں کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ پینڈل کا استعمال ترک کر دیں جیسے آزادی کے بعد آزادی ترک ہو گئی ہے۔ وہ ہمت و استقلال سے ہینڈل پر جھک جائے اور اپنے

لیے ہاتھوں سے سامنے کے پہیے کو آگے کی طرف گھماتا جائے۔ سیکل شریف سواری ہے۔ وہ اس ہیئت پر بھی چلنے لگے گی۔ اب اگر وہ چاہے تو لوگوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے عمل کو تیز کر سکتا ہے۔ بریک لگانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آنے جانے والے فطری طور پر خبردار ہیں۔ بس بیلنس کو کام میں لاتے ہوئے منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ جب ساری دنیا کا پٹرول ختم ہو جائے گا اور لوگ گدھوں، گھوڑوں پر سوار ہو جائیں گے تو یقیناً اس وقت سیکل کے سر پر "تاج" رکھا جائے گا۔

●●

O

غزل

پھر ہے انسان بنا حیوان خدا خیر کرے
خندہ زن پھر ہوا شیطان خدا خیر کرے

بڑھ گیا جنگ کا امکان خدا خیر کرے
شہر بن جائیں گے شمشان خدا خیر کرے

گولیاں چلتی ہیں ہر آن خدا خیر کرے
خون میں ڈوبا ہے کرپان، خدا خیر کرے

شہر گجرات پہ لایا تھا تباہی کیسی
یہ فسادات کا طوفان خدا خیر کرے

چاند پر جانے کی نت روز نئی اسکیمیں
اُف یہ فٹ پاتھ کا انسان خدا خیر کرے

اردو مٹ جائے تو ساتھ اس کے بھی مٹ جائیں گے
غالب و میر کے دیوان، خدا خیر کرے

شان سے اس کا منایا گیا چہلم یارو
بھوک سے جس کی گئی جان خدا خیر کرے!

کبھی پڑھنے کی بھی نوبت نہیں آئی محبوب
طاق پر رکھ دیا قرآن خدا خیر کرے!

محبوب مانبھومی
(بلاسپور)

O

اقبال ہاشمی

آوارہ دھماکے

اِدھر بھی دھماکے اُدھر بھی دھماکے
سبھی خوش زمیں کے پرخچے اُڑا کے
مزائیل کے جلوے جہاں کو دکھا کے
مسائل سبھی ہم نے رکھے چھپا کے
اِدھر رتجگے ہیں، ادھر رتجگے ہیں
مگر کس کی پونجی ٹھکانے لگا کے
اِدھر کے مداری، اُدھر کے مداری
مگن ہیں ہمیں خوب اُلو بنا کے
اِدھر بھی وہی ہیں، اُدھر بھی وہی ہیں
ذرا دیکھئے رُخ سے پردہ اُٹھا کے
بڑے مفلسوں کے تماشے عجب ہیں
یہ کھاتے ہیں بھوکوں کو بھوکا سُلا کے
خدایا مجھے عقل دے دے ذرا سی
مگر مفلسوں سے نگاہیں بچا کے
اگر یہ دھماکے رہے یوں ہی جاری
پہنچ جائیں گے ہم بھی در پر خدا کے

سبھی سے چلو ہاشمی مل ملا لیں
دھماکوں نے دل رکھ دیا ہے ہلا کے

قطعہ

نظر پڑتی ہے روٹی پر تو میرا دل اُچھلتا ہے
اگر روٹی نہیں ملتی تو معدہ بم اُگلتا ہے
ضرورت کے سوا ملتی ہے جن کو ہاشمی روٹی
بدن کے کارخانے میں لہو اُن کا اُبلتا ہے

اقبال شانہ

انگوٹھی

سونے کی یا چاندی کی انگوٹھی
ملے جو مُفت، وہ اچھی انگوٹھی
تری اُنگلی پہ ہیرے کی انگوٹھی
مجھے لگتی ہے چوری کی انگوٹھی
پھنسی کمبخت وہ اُنگلی میں میری
مصیبت بن گئی چھوٹی انگوٹھی
سپولے کی طرح لپٹی ہوئی ہے
تری انگلی سے منگنی کی انگوٹھی
ہیں ان کی انگلیاں بھی موٹی موٹی
بڑی مشکل سے پہنائی انگوٹھی
مسلسل میں نے کوشش کی ہے لیکن
انگوٹھے میں نہیں آئی انگوٹھی
تری نتھ اس طرح لگتی ہے جاناں
کہ جیسے ناک سے لٹکی انگوٹھی
جو رشتہ جوڑتی ہے دو دلوں کا
وہ اک بے جان چھوٹی سی انگوٹھی

خوشی سے پاؤں کی انگلی میں شانہ
پہن لی میں نے منگنی کی انگوٹھی

مجتبیٰ حسین
(دہلی)

ہم نے بل کلنٹن سے معافی چاہی

ایک طرف تو صدر امریکہ بل کلنٹن مونیکا لیونسکی کے معاملہ میں ساری دنیا سے معافی مانگتے پھر رہے ہیں لیکن آج ہم بہ رضا و رغبت اور بہ قائم ہوش و حواس خود بل کلنٹن سے دست بستہ معافی کے خواستگار ہیں۔ معافی اس بات کی کہ پچھلے دنوں ہم نے ان کے اور مونیکا لیونسکی کے معاملہ میں یوں ہی کچھ اظہار خیال کر دیا تھا اور جوش تحریر میں کچھ ایسی باتیں کہہ گئے تھے جو بھلے ہی ہمیں زیب دیتی ہوں تو ہوں لیکن خود بل کلنٹن کے حق میں زیب نہیں دیتیں۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہا تھا کہ "آپ کی تحریر کے تیور سے یوں لگتا ہے کہ جیسے آپ بہ حیثیت ادیب نہیں بلکہ بہ حیثیت رقیب اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ معاملہ بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا ہے۔ آپ کیوں..... پیچ و تاب کھائے جا رہے ہیں۔ کیا رشتہ ہے آپ کا مونیکا لیونسکی سے؟" ہم نے کہا "وہ ایک مظلوم عورت ہے لیکن آپ کو بظاہر اس بات کا دکھ ہے کہ اسے مظلوم کا درجہ دلانے میں آپ کا کوئی ظلم شامل نہیں ہے۔" ظاہر ہے کہ اس بات پر ہمیں طیش آ گیا اور ہم نے ان سے بحث کرنے سے انکار کر دیا۔ دنیا سچ مچ بڑی بری جگہ ہے۔ یہاں لوگ آدمی کی نیک نیتی کو بھی بدنیتی پر محمول کرتے ہیں۔ ویسے ان صاحب کی کڑوی کسیلی بات کے بعد سے ہم نے دو ایک لمحوں کے لیے سوچا بھی کہ واقعی مونیکا لیونسکی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر سوچا کہ ہم بل کلنٹن سے عمر میں دس برس بڑے ہیں اور مونیکا لیونسکی سے تو پورے ۳۷ برس بڑے ہیں گویا اس اعتبار سے ان دونوں کے بزرگ قرار پاتے ہیں۔ اب بزرگ اپنے سے چھوٹوں کو صحیح راستہ نہیں دکھائیں گے تو اور کون دکھائے گا۔ یہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات ہے۔ خواہ مخواہ کسی کی نیت پر اور وہ بھی ہم جیسے آدمی کی نیک نیتی پر شبہ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ پھر بھی ہم نے سوچا تھا کہ اب عزیزی بل کلنٹن اور عزیزہ

مونیکا لیونسکی کے معاملہ میں کوئی دل چسپی نہیں لیں گے مگر کیا کریں پرسوں ہمارے ایک نہایت ثقہ، بردبار، سنجیدہ اور متین دوست جو عمر میں ہم سے بھی دو برس بڑے ہیں، آنکھوں میں ایک عجیب و غریب چمک اور ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ سجائے ہمارے پاس آگئے۔ بولے "میاں! آپ کو تو شاید پتہ ہو کہ میں نے اپنے گھر میں انٹرنیٹ لگا لیا ہے اور تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کینتھ اسٹار نے بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کے معاملے میں جو تحقیقی رپورٹ پیش کی ہے اس کے کچھ حصے انٹرنیٹ پر آرہے ہیں۔ تم خود چل کر دیکھ لو۔ ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔ تم تو سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کے افسانے پڑھ پڑھ کر ہی اپنے جذباتی ہیجان اور اشتعال کو تسکین پہنچاتے رہے ہو۔ اس رپورٹ کو پڑھوگے تو پتہ چلے گا کہ ایسے ادب کی معراج کیا ہے۔"

ہم نے کہا "بھیا! تم تخلیقی ادب اور ایک تحقیقی رپورٹ کے فرق کو بھی نہیں جانتے۔ منٹو اور عصمت تخلیقی فن کار تھے۔ پھر ان کے کردار متوسط طبقے سے یا پھر غریب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کرداروں میں جتنا جنسی ہیجان پایا جاتا تھا اس کا اتنا ہی اظہار ان کے افسانوں میں ہوتا تھا۔ ان کا کوئی کردار صدر امریکہ تو ہوتا نہیں تھا کہ اس معراج کو پہنچے جس کا تم مزے لے لے کر ذکر کر رہے ہو۔"

بولے "تم ذرا میرے ساتھ چل کر دیکھو تو سہی کہ تحقیق کس طرح تخلیق سے آگے نکل جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "بھیا! ہم ایسی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں، گاندھی جی ان تین بندروں کو بہت پسند کرتے تھے جن میں سے ایک بندر برا نہیں دیکھتا تھا۔ دوسرا برا نہیں سنتا تھا اور تیسرا برا نہیں کہتا تھا۔ ہم بھی ان بندروں کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں۔"

بولے "ایسی بات ہے تو میں تیسرے بندر کے طور پر تمھارے دوست شرافت کو بھی بلا لیتا ہوں۔ دو تو ہم ہیں ہی پھر ہم تینوں مل کر نہ تو برا دیکھیں گے نہ برا سنیں گے اور نہ ہی برا بولیں گے۔"

"ہم نے کہا! بھیا! یہ عیش تم کو ہی مبارک ہو۔ ہمیں معاف رکھو۔"

بولے "ویسے تو میں خود بھی اس تحقیقی رپورٹ سے بلا شرکت غیرے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا بلکہ ہو بھی رہا تھا لیکن چوں کہ میں اپنے اسٹڈی روم کو اندر سے بند کرکے انٹرنیٹ پر اس تحقیقی رپورٹ کے حصے دیکھ رہا ہوں، اس لیے گھر والے بلاوجہ مشکوک ہوتے جا رہے ہیں۔ تم آجاؤ تو مزہ آجائے گا۔ گھر والوں کی مداخلت بھی نہیں ہوگی۔

چونکہ ہم دوستوں کی آزمائش کی گھڑی میں ہمیشہ ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس لیے بادل ناخواستہ ان کے ساتھ چلے گئے۔ یقین مانیے پورے دو دنوں تک ہم نے سنکٹ کی اس گھڑی میں اپنے دوست کا ہاتھ بٹایا ہے۔ نہ ہمیں کھانے کا ہوش رہا اور نہ نیند کی پرواہ۔ کھانا بھی اپنے دوست کے گھر ہی کھاتے رہے۔ دوست کی مصیبت کے وقت ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ اب جب کہ ہم اس رپورٹ کے بہت سے لذیذ حصے پڑھ چکے ہیں، ہمارا دل ہمیں اس بات پر اکسا رہا ہے کہ ہم واقعی بل کلنٹن سے معافی مانگ لیں کیونکہ اس کی

رپورٹ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بل کلنٹن اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں، وہ بے چارے تو سیدھے سادے آدمی ہیں۔ پھر ان پر ساری دنیا کی فکروں کا بوجھ بھی لدا ہوا ہے۔ آخر کس کس کی فکر کریں۔ ایسے میں مونیکا لیونسکی نے جب پہلے پہل ان سے کہا "مسٹر پریسیڈنٹ! آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں" تو تب بھی وہ صدر امریکہ کی حیثیت سے دنیا کی فکروں میں ہی غرق رہے اور مونیکا لیونسکی کے دعویٰ کی تصدیق نہیں کی۔ انھیں یہ احساس ہی نہ ہوا کہ مونیکا کی اس بات کا کیا مطلب ہے۔ لہٰذا وہ صرف ہنس کر خاموش ہو گئے۔ ایک شریف آدمی اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ لیکن جب دوسری مرتبہ پریسیڈنٹ کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا اتفاق سے تنہائی میں پھر آمنا سامنا ہوا تو مونیکا نے کہا "حضور! میں اس سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں لیکن آپ پھر بھی خاموش ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی بھی غیور مرد کے لیے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ یوں بھی صدر امریکہ کی حیثیت سے بل کلنٹن کو بلا وجہ بمباری کرنے کی عادت پڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی شان میں ہونے والی اس گستاخی کو بھلا کیسے برداشت کرتے۔ نتیجہ میں انھوں نے وہی کیا جو ایک امریکی مرد کو کرنا چاہیے تھا۔ اس میں امریکی مرد کی کیا تخصیص ہے، اگر ان کی جگہ کوئی ہندوستانی مرد بھی ہوتا تو یہی کرتا اور اگر بل کلنٹن الیا کرتے تو ذرا سوچیے خود مونیکا لیونسکی ان کے تعلق سے کیسی کیسی غلط فہمیوں کا شکار نہ ہو جاتی اور کوئی بھی مرد یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی خاتون اس کے تعلق سے ایسی بدگمانیوں میں مبتلا ہو۔ ان حالات میں بل کلنٹن نے جو بھی کیا وہ ٹھیک ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سچے دل کے ساتھ اس معاملہ میں بل کلنٹن سے اپنے پچھلے تاثرات اور خیالات کے لیے معافی مانگنا چاہتے ہیں مانا کہ بل کلنٹن خود ساری دنیا سے معافی مانگتے پھر رہے ہیں لیکن ہمارا بھی تو ایک ظرف ہے ایک ضمیر ہے۔ ہمیں بھی تو ان سے معافی مانگنے کا موقع ملنا چاہیے پھر جس طرح وہ معافی مانگتے پھر رہے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ معافی مانگنا بہت اچھی بات ہے۔ کینتھ اسٹار کی رپورٹ کے کچھ حصوں کو پڑھنے کے بعد جب ہم نے اپنے ایک دوست سے بل کلنٹن سے معافی مانگنے کی بات کہی تو بولے "میاں" تمھیں تو مونیکا لیونسکی سے بھی معافی مانگنی چاہیے۔ دیکھا جائے تو تمھیں اس معاملہ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی"۔ بے شک ہم تو مونیکا لیونسکی سے بھی بہ دل و جان معافی مانگنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ وہ سچ مچ ہمیں معاف کر دیں۔ انھوں نے تو خود بل کلنٹن کو بھی اب تک معاف نہیں کیا ہے یاد آتس بخیر، معافی مانگنے پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک عدالت میں میاں بیوی کے درمیان طلاق کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ خاتون نے اپنے شوہر کے خلاف بیان دیتے ہوئے جج سے کہا "حضور! ہم دونوں ایک ساتھ بالکل نہیں رہ سکتے کیونکہ ہم دونوں کے خیالات بالکل مختلف ہیں۔ یوں بھی میں پچھلے دس برسوں سے اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ رہی ہوں، ایسے رشتہ کو باقی رکھنے کا کیا فائدہ"۔

جج نے اپنی معلومات میں اضافہ کی خاطر خاتون سے پوچھا "آپ کی کتنی اولادیں ہیں؟" خاتون نے کہا "دو بچے ہیں" جج نے پوچھا "دونوں کی عمریں کیا ہیں؟ خاتون نے کہا "ایک لڑکا بارہ برس کا ہے اور دوسرا سات

برس کا ہے۔" اس پیو جج نے کہا۔" ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ پچھلے دس برس سے اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہتیں۔ پھر آپ کا یہ سات برس کا بچہ کہاں سے آ گیا؟" محترمہ نے شرما کر کہا" حضور وہ کیا ہے کہ ایک بار معافی مانگنے کے لیے آ گئے تھے۔"

یہی وجہ ہے کہ ہم معافی مانگنے کے سوا، ہمیں بہت محتاط رہتے ہیں۔ ہر کس و ناکس سے معافی مانگنا یوں بھی اچھی بات نہیں ہوتی۔ یوں بھی ہم عمر کی اس منزل میں ہیں، جہاں آدمی کے اخلاق خود بخود اچھے ہو جاتے ہیں۔

تاہم آخر میں ایک بات اور عرض کرتے چلیں کہ دنیا کے ایسے کئی معاملات ہیں، جن میں صدر امریکہ کو سچے دل سے معافی مانگنا چاہیے۔ چاہے وہ عراق کا معاملہ ہو یا سوڈان کا، افغانستان کا معاملہ ہو یا کیوبا کا۔ بل کلنٹن کو جب مونیکا لیونسکی کے معاملے میں معافی مانگنے سے فرصت ملے تو وہ ذرا ان معاملات کی طرف بھی توجہ دیں۔ ●●

پرویز یداللہ مہدی

خامہ بگوش غالب

مرزا غالب کی شخصیت نوخیز و پہلو دار تھی ہی ان کے ادبی مشاغل بھی رنگا رنگ تھے شاعری کے علاوہ انھیں خط لکھنے کا بھی شوق بلکہ خبط تھا، چار دانگ عالم میں ان کی خطوط نویسی کی دھوم تھی۔ محض ان کی خطوط نویسی کی وجہ سے سنا ہے دلی کے محکمۂ ڈاک و تار کو اس زمانے میں اس قدر فائدہ ہوا کہ ارباب مجاز نے انھیں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے کی پیشکش کی تھی جسے مرزا غالب نے صرف اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس طرح انھیں خط لکھنے کے بجائے خط بانٹنے پڑیں گے۔ انھیں تو بس خط لکھنے کا جنون تھا چنانچہ فرماتے ہیں :

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

کان پر قلم رکھ کر گھر سے نکلنے میں جو شان اس زمانے میں تھی وہ بھلا پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے میں کہاں سے آتی۔ آخری عمر میں تو سنا ہے مرزا کا یہ خبط اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ بے مطلب خط لکھنے لگے تھے جس کا اعتراف کچھ اس طرح کیا ہے :

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ایک جز وقتی ریسرچ اسکالر نے جو فل ٹائم عرضی نولیس کے عہدے پر فائز ہیں۔ مرزا غالب کے اس خط کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ مرزا کا بے مطلب خط لکھنے کا یہ سلسلہ دراصل بڑا با مطلب" تھا یعنی کہ بے مطلب خطوط نویسی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس بہانے مرزا غالب جدید رنگ میں "بلینک ورس" قسم کی نظمیں کہنا چاہتے تھے مثال کے طور پر ان کا یہ خط والا شعر ہی لیجیے :

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

مذکورہ شعر کو وہ 'بلینک ورس' شاعری کے رنگ میں یوں کہنا چاہتے تھے۔

خط لکھیں گے
گرچہ مطلب
کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں
تمھارے نام کے
ہاں ہاں تمھارے نام کے
بس تمھارے نام کے
اک تمھارے نام کے

آپ کہیں گے۔ یہ تو قوالی کا اسٹائل ہے بلینک ورس کہاں ہے! تو عرض ہے بلینک ورس شاعری کی یہی تو خوبی ہے کہ یہ ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ گیت، نظم، کویتا، دوہا، قوالی اور مرزا غالب کی دور رس نظر نے مستقبل کی اس ہمہ مقصدی بلینک ورس شاعری کی خوبی کو بھانپ لیا تھا لیکن وہ اپنی شاعری کو خود بلینک ورس میں اس لیے تبدیل نہیں کر سکے کہ اس دور کی روایات اور شاعرانہ پابندیوں نے انھیں جکڑ رکھا تھا تاہم ان وقتی پابندیوں اور بندشوں کے باوجود فطری طور پر وہ چونکہ آزاد منش آدمی تھے جس کا اظہار اپنے اس شعر میں یوں کیا ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

چنانچہ بلینک ورس میں خامہ فرسائی کرنے کے اپنے اس جذبے کی تکمیل کی خاطر ایک الگ راہ نکالی، یعنی بے مطلب خط لکھنے لگے۔ گویا ظرفِ تنگنائے غزل کو بقدرِ شوق، نہ پا کر دل کی بھڑاس، شاعری کے بجائے خطوط میں نکالنے لگے نتیجتاً ایسے معرکۃ الآرا خطوط معرضِ وجود میں آئے کہ خطوط نویسی کی تاریخ کے وقار و اعتبار کا گراف "اسٹیفی گراف" کی کامیابیوں کے گراف کی طرح بلند سے بلند تر ہو گیا۔ مرزا غالب کے خطوط بظاہر اردو نثر کے اعلیٰ ترین شہ پارے ہیں لیکن اگر ان کا جائزہ گہرائی سے لیا جائے تو ہر خط 'جدید شاعری' کی بہترین مثال قرار پائے گا۔ مرزا غالب کے سخن فہم اور طرف دار دونوں اگر برا نہ مانیں تو عرض ہے کہ مرزا غالب کی اس بے مطلب خط لکھنے کی تحریک نے آگے چل کر ترقی پسند تحریک کی شکل اختیار کی۔ پھر اس نے چولا بدل کر جدیدیت کا روپ دھار لیا یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب اگر ترقی پسندوں کے دلارے ہیں تو جدیدیوں کی آنکھ کے تارے بھی ہیں، البتہ ان دو کٹر مخالف گروہوں کی اس کرم فرمائی پر خود مرزا غالب کی روح لرزکر ان سے یہی التجا کرتی ہوگی کہ:

ہم پر نہ کرم کرتے تو یہ بھی کرم ہوتا —

آدمی چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، خیر و شر کا مرکب ہوتا ہے اور مرزا غالب بشریت کا ایک ایسا ہی مکمل نمونہ بلکہ مرقع تھے۔ ایک طرف ان کی انا کا یہ عالم تھا کہ اچانک اس بلندی پر پہنچ جاتی کہ جہاں بقول اقبال خدا بندے سے خود اس کی رضا پوچھتا ہے۔ اس مقام بلند و بالا! اس عالم سرشاری میں بے نیازی کی یہ کیفیت ہوتی کہ اس کے سامنے دونوں جہان بھی ہیچ معلوم ہوتے چنانچہ مرزا فرماتے ہیں:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا
یاں شرم آ پڑی ہے کہ تکرار کیا کریں

مگر دوسری طرف یہی انا کبھی کبھی ٹھٹھر سکڑ کر مارے شرم کے رضائی میں چھپ جایا کرتی تھی۔ مرزا غالب کی ''انا'' کے یہ دونوں پہلو ان کی زندگی کے حوالے سے پیش ہیں:

پہلا واقعہ تو وہی ہے، شدید بے روزگاری کے زمانے میں دلی کالج کی فارسی کی مدرسی کی پیشکش کو ٹھکرا نے والا محض اس بنا پر کہ جو انگریز کلکٹر بہادر مرزا غالب شاعرانہ قد و قامت سے اس قدر متاثر و مرعوب تھا کہ ان کے دفتر پہنچنے پر ہمیشہ اجلاس سے باہر آ کر بہ نفس نفیس مرزا کا استقبال کیا کرتا تھا، وہی کلکٹر بہادر نوکر شاہی کے اصول کے تحت مرزا کو بہ حیثیت فارسی مدرس کے اپنا ماتحت جان کر باہر آ کر مرزا کا ہمیشہ کی طرح استقبال کرنے کے بجائے اس بار اپنے اجلاس میں ان کی حاضری کا منتظر تھا۔ کلکٹر بہادر کا یہ بدلا ہوا سلوک مرزا غالب کی حساس انا کو اس قدر ناگوار گزرا کہ انھوں نے اس جگہ ڈولی سے اترنا بھی گوارا نہ کیا اور واپس لے چلنے کا حکم دے ڈالا۔ لیکن غالب کی یہی انا کبھی کبھی اس حد تک فنا ہو جاتی تھی کہ شہنشاہ وقت کے ہاں سے بطور تحفہ آئی ہوئی دال کی شان میں مرزا نے یوں قصیدہ لکھا:

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایت شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دیں و دانش و داد کی دال

سچ ہے مصلحت اور وقت کی نزاکت کبھی کبھی دال کے درجات کو متنجن پلاؤ بلکہ بریانی سے زیادہ بلند کر دیتی ہے:

مرزا غالب کے آدمی بشر ہونے کا ثبوت صرف ان کی مصلحت کوشی ہی نہیں، ان کی ''بلانوشی'' بھی ہے جس کے اعترافات سے دیوان غالب بھرا پڑا ہے یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند شعر پیش ہیں:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　٭　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
کیوں رد قدح کرے ہے زاہد　٭　مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب　٭　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی ؛ پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں
مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو ؛ یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ؛ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مرزا غالب نے اپنی بشریت کے ثبوت میں صرف بلا نوشی و مصلحت کوشی پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس سلسلے کو مضبوط و دراز کرنے کے لیے چوسر اور جوے سے بھی خوب شوق فرمایا یہاں تک کہ اپنے دولت خانہ پر جوا خانہ تک قائم کیا جس کے نتیجے میں دو مرتبہ گرفتار کر کے عدالت عالیہ کے روبرو پیش کیے گئے پہلی مرتبہ جرمانہ بھر کے گلو خلاصی حاصل کی البتہ دوسری مرتبہ تین مہینے کے لیے حوالات کی سیر کی اس سے مقصود محض بدنامی مول لینا ہرگز نہیں تھا بلکہ خود کے ایک عام آدمی ہونے پر مہر تصدیق ثبت کرنا تھا۔ علاوہ ازیں دنیا و اہل دنیا پر یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ ایک عام آدمی کو اس کار جہاں دراز میں انسان ہونا بھی میسر نہیں :

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ایسا نہیں ہے کہ چچا غالب ہمہ تن شعر گوئی، مے نوشی مصلحت کوشی اور چوسر کی بازی میں غرق رہتے تھے، ان مشاغل کے علاوہ انھیں اچھے اچھے کھانوں، صحت بخش غذاؤں سے بھی خاص رغبت تھی بالخصوص میووں میں، انھیں آم بے حد مرغوب تھے۔ ظاہر ہے اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ میووں میں صرف آم ہی ایک ایسا پھل ہے جسے کھایا بھی جا سکتا ہے چوسا بھی جا سکتا ہے اور آموں کے تعلق سے چچا کسی تخصیص کے پھیر میں نہیں پڑتے تھے یعنی یہ نہیں دیکھتے تھے کہ آم ڈال سے ٹپکے ہوئے ہیں، گھاس میں پکے ہوئے ہیں، دسہری، لنگڑا، چوسا، آپوس، کس قسم کس ذات کے ہیں وہ تو بس آموں کے بارے میں صرف اس بات کے قائل تھے کہ بہت ہوں اور میٹھے ہوں اس کے علاوہ آموں کے تعلق سے چچا غالب کا ہو سکتا ہے۔ یہ خیال ہو کہ آم کھانے کے بعد آدمی عام نہیں رہتا خاص ہو جاتا ہے ہو سکتا ہے چچا کے زمانے کے آموں میں ایسی تاثیر ہوا کرتی ہو کہ جسے آم مرغوب ہو وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا ہو الٹا دوسروں پر رعب جماتا ہو جبکہ عہد حاضر میں آم والے کو کوئی نہیں پوچھتا صرف دام والے کا سکہ چلتا ہے اور جس کے پاس دام ہے اس کے قبضے میں آم بھی ہے جام بھی اور نام بھی۔ اس کے برعکس چچا غالب زندگی بھر بے دام رہے، پھر بھی آم کھاتے . . . ، جام لنڈھاتے اور نام کماتے رہے قربان جائیے چچا کے پاس کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا! خود ہی فرماتے ہیں :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جبکہ چچا غالب نے خود پوچھا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو کیا ہوتا تو عرض ہے نہ دلیوانِ غالب چھپتا نہ زبان زد خاص و عام ہوتا نہ آپ انتقال فرماتے اور نہ پورے سو برس بعد آپ کے گڑے مردے کو اکھاڑا جاتا ...

.... ورنہ یار لوگ آپ کو بانس پر چڑھا کر اپنے الو، فاختے چیل کوے وغیرہ سیدھے کرتے۔ ——— ویسے اگر چچا غالب کو آم کے بجائے سیتا پھل مرغوب ہوتے تو کیا وہ آج اس طرح شہرت کی بلندی پر ہوتے، اس سلسلے میں کسی محقق کو چاہیے کہ تحقیق کرے۔

مشہور و معتبر طنز و مزاح نویس رشید احمد صدیقی نے ایک مرتبہ مرزا غالب کے حوالے سے فرمایا تھا کہ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا؟ تو میں بلا تکلف یہ تین نام لوں گا۔ غالب، تاج محل اور سلطنت آصفیہ ——— بات عالی جناب رشید احمد صدیقی نے برسوں پہلے کہی تھی اب مغلیہ سلطنت قصۂ پارینہ بن چکی، تاج محل کے حسن کو فضائی آلودگی دھندلا چکی اور مرزا غالب کی اہم اردو زبان کا دائرہ کار اس قدر سکڑ گیا ہے کہ اب ان کا نام بھی صحیح طریقے سے لینے والے بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر مرزا غالب اب "مرحا گالب" ہو چکے ہیں۔ اب رہی ان کی شاعری تو اس پر یونیورسٹیوں نے کرم کیا ہے لیکن ڈگری یافتہ طبقے نے ایسا کرم کیا ہے کہ خود ان کی روح بھی تڑپ اٹھی ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ خاصا مشہور رہا ہے، البتہ اس کے متعلق کچھ احباب کا خیال ہے کہ حقیقت ہے لیکن ہمارے لیے چونکہ سنی سنائی ہے اس لیے دروغ برگردن راوی (سچ ہو، جب بھی دروغ گوئی کی نوبت آتی ہے۔ ہم اردو داں اپنی گردن بچانے کے لیے غریب راوی کی گردن میں دروغ گوئی ...... کا پھندا ڈال دیتے ہیں) لطیفہ یوں ہے کہ کسی کالج میں اردو کے لیکچرر [illegible] کے لیے انٹرویو چل رہا تھا جب ایک امیدوار سے غالب کا کوئی شعر سنانے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے یہ مصرع

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

کچھ اس طرح پڑھا:

کاؤ کاؤ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

آپ کو غالباً ہنسی آ رہی ہوگی۔ لیکن یہ جان کر آپ کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے گا کہ انہی فاضل و عاقل امیدوار کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ ان کی خوش بختی کہیے یا ہونہار طالب علموں کی بدبختی ہو سکتا ہے۔ خود انٹرویو لینے والے صاحب کے ذہن میں یہ مصرع کچھ یوں محفوظ ہو:

کائیں کائیں سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

چلتے چلتے اتنا اور سن لیجیے کہ مرزا غالب کا پورا نام نجم الدولہ دبیر الملک، مرزا اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ غالب دہلوی تھا اور وہ ان تمام القابات و خطابات کے باوجود عمر بھر قرض کی مے پیتے اور اس طرح اس کا اعتراف کرتے رہے:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

جس شاعر کی زندگی جب اس شکل سے گزری ہو تو ظاہر ہے وہ عمر بھر مقروض ہی رہے گا

چنانچہ چچا غالب کی فاقہ مست زندگی نے ارباب اقتدار کی آنکھیں اس قدر کھولیں کہ جن القابات و خطابات سے مرزا غالب کو نوازا گیا تھا وہ آئندہ کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کو مسدود کر دیے گئے تاکہ لوگ نہ قرض کی مے پییں اور نہ مقروض ہوں۔ آخر میں ختم کرتا ہوں یہ "غالب نامہ" اس اعتراف کے ساتھ کہ:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ـــــــ!!

شگوفہ

اکتوبر ۱۹۹۸ء

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

(دوسری قسط)

غالب خستہ جاں محبوبِ دلستاں اور رقیبِ روسیاہ

ذرا اس اندوہناک کیفیت ملاحظہ کیجیے:

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

ہے ہے! لگتا ہے آپ کا محبوب انسان نہیں "ڈراکیولا" کا بھوت تھا جو اپنے بھیانک لمبے دانتوں کو شکار کی گردن میں گڑو کر خون چوستا تھا۔ یا پھر وہ مردے خور بجو صفت تھا جو آپ کا بدن کھرچ کھرچ کر اپنے ناخنوں کو حنائی کرلیتا تھا...... اچھا محبوب تھا آفت کا پرکالہ اور اس سے بھی اچھے اس کے یہ عاشق زار......

ایک مرتبہ ترس کھا کر حکم ہوا کہ اچھا! آجاؤ اور ایک طرف بیٹھ جاؤ، آپ کے پو بارہ ہوگئے جیسے عید ہوگئی۔ اپنی سادہ لوحی سے سمجھے میدان ہاتھ آگیا۔ محفل میں آپ کے رقیبوں کا سرغنہ راسپوتن بھی موجود تھا اور دوسرے ہوس پیشہ بھی جمع تھے جو راسپوتن کے آگے بھیگی بلی بنے مودب ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس عنایت کریمانہ سے آپ کا حوصلہ بڑھا۔ اپنی اوقات بھول گئے۔ انگلی پکڑواتے ہی پہنچے پر ہاتھ ڈال کر لگے مشورہ دینے:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

فوراً بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا گیا کہ وہ رہا دروازہ۔ بڑی ہیٹی ہوئی اپنی بے اعتدالی سے

مے سب میں سبک ہوئے۔ قدم من من بھر کے اٹھائے نہ اٹھ رہے تھے۔ ادھر راسپوتن نے قہقہہ مار کر بھیدا اڑائی قہ۔قہ۔قہ۔ سارے طفیلی "رقیب" جو راسپوتن کے رعب سے سانس روکے بیٹھے تھے کھل کھلا اٹھے.........

اتنی خفت اٹھانے پر بھی آپ نے آس نہ چھوڑی۔ اللہ آپ کی موٹی کھال کو اور دبیز کرے، پلٹے کو عرض پرداز ہوئے!

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ایک مرتبہ آپ کا محبوب تھکا ہوا تھا حکم ہوا: "میرے پانوں دباؤ" اس حکم پر فدا ہوگئے دل باغ باغ ہوگیا:

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانوں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پانوں داب تو دے

حکم کے بندے فوراً دبانے بیٹھ گئے مگر دباتے دباتے ایک شبہ نے سر ابھارا آخر آج اس کے پانوں کیوں دکھ رہے ہیں گے شرلک ہولمز بن کر جاسوسی کرنے اور سراغ پا گئے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

شرلک ہولمز نے اپنے عزیز دوست واٹسن سے پوچھا "پیارے واٹسن! اس کیس میں جو سراغ میں نے پایا ہے اور دور کی کوڑی جو ہاتھ آئی ہے وہ صدفی صد بلکہ یہ حقیقت ہے نا؟ واٹسن بولا! سو تو ہے مگر ایک حد تک تمہارا آرسین لوپن ایسا چور نہیں کہ ایک ہی شکار کے گھر نقب لگانے پر اکتفا کرے کہ اس کے شکار بقول تمہارے بے حساب ہیں اور تمہیں یہ سراغ بھی پانا ہے کہ ان کی تعداد کیا ہے اور آج رات کس کس کے گھر اس نے شب خون مارا ہے۔ واٹسن کا کہنا سچ ہی تو ہے ایک ہو تو بھگت بھی لیا جائے مگر.........

جمع کرتے ہو کیوں "رقیبوں" کو
اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا!

عالی جناب کہ ہم جیسے سیدھے سادھے لوگوں کو گھمرانے اور چکر میں ڈالنے سے مزے بھی خوب آتے ہیں یہ شعر پڑھا مگر سر پیر سمجھ میں نہ آئے اور الفاظ کی بھول بھلیوں میں آدمی گم ہو کے رہ جاتے۔ لف و نشر کی ایک مثال:

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ایک طرف تو فرمایا جا رہا ہے۔ رات کے وقت مدہوشی کے عالم میں رقیب کو ساتھ لے کر آئیں؟ مگر دوسری ہی سانس میں فرماتے ہیں "خدا کرے کہ یوں نہ آئیں"۔ اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے، بات پلے نہیں پڑی۔ شاید اولڈ ٹائم کی لہریں نا رہے ہیں) برد باندھنا بھول گئے اور صبح کچھ یاد نہ رہا۔ جب تک اس شعر کو بیچ سے کاٹ کر نہ پڑھا جائے۔ مفہوم آپ کا پلے نہیں پڑے گا دراصل یہاں بھی وہی راسپوتن بیزارگی کا اظہار فرمایا جا رہا ہے۔ شعر کو اس طرح پڑھیے، پہیلی بوجھی جائے گی اور فطق زبان کے بوسے لے گا:

"رات کے وقت مے پیے۔ آئے وہ یاں خدا کرے"۔ "ساتھ رقیب کو لیے، یہ نہ کرے خدا کرے" فرماتے ہیں کہ نشہ میں دھت ہو کر وہ یہاں آئیں تاکہ میں کھل کر دل کے حوصلے نکالوں مگر خدا نہ کرے کہیں سہارے کے لیے "راسپوتن" کا بازو تھامے ہوئے اس کو بھی ساتھ نہ لے آئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی قبیل کا ایک اور شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

لگتا ہے الفاظ صف بستہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ اور آپ ان میں سے منتخب کر کے جس کو جن معنوں میں چاہے ڈھال لیتے ہیں اور شعر ذو معنی ہو کر لطف دوبالا کر دیتا ہے۔ اور یہ شاعر کا کمال ہے۔ شاعری کی معراج ہے۔

ایک مفہوم تو یہ ہے:

"ہمارے پکارنے پر دروازہ اگر کھلے تو کیا بات ہوئی۔ اس زحمت میں ڈالے بغیر ہماری سہولت کی خاطر دروازہ اگر کھلا ہی رکھا جاتا تو پکار کر کھلوانے کی مصیبت سے واسطہ نہ پڑتا اور ہم سمجھتے کہ ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔

لیکن آپ کہنا یہ چاہتے ہیں اور دیکھیے کیسی پتے کی کہتے ہیں۔" اپنے دروازے کو بند ہی رکھا کیجیے۔ ہماری آواز سن کر ہی کھولیے۔ برعکس اس کے اگر آپ نے دروازہ کھلا ہی رکھا تو ہم آنے والے نہیں۔ کیوں؟ یہ تو ایک اذنِ عام ہوا۔ جس کا جی چاہے آئے اور جائے۔ اس بات کو ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رقیب نے ایک دن اس غیرتِ ناہید کو اپنی گود میں بٹھا کر تصویر بنوانی چاہی آپ نے یہ دل سوز منظر دیکھا سینے پر چھریاں چل گئیں کچھ کرنے کی ہمت اور طاقت تو تھی نہیں بس شعر ہی کہہ کر دل کے پھپھولے پھوڑ لیے:

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

"ایسی کریہہ المنظری کی تصویر کشی کے لیے مانی جیسے نامور مصور کے ہاتھ میں بجائے قلم کے مور کا پیر

٥ ایک مشہور و معروف (رد) نقاش جو نبوت کا دعویٰ کرتا تھا اور نقاشی کو اعجاز معجزہ

ہونا چاہیے جو اس کے سارے خوب صورت جسم میں بھدّا، بے ڈھب صرف یہی ہوتا ہے تاکہ تصویر بھی ایسی ہی بدنما بنے تاکہ میرا جی خوش ہو"........

بندر آپ خراب سو خراب سارا طویلہ!

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے اور ظاہر بین حضرات تصویر کا دوسرا رخ دیکھے بغیر ہی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں حالانکہ دنیا ایکشن اور ری ایکشن (عمل ردِّ عمل) کے فلسفہ سے بابیل و قابیل ہی کے وقتوں سے واقف ہے۔ ادھر کا احوال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم نے اب تک جو سادہ بے مزا نوشتہ ہی تے سنا اسے اپنی سادہ لوحی سے اسی پر بھروسہ کر کے آپ کی غم گساری کرنے لگے اور ہماری ساری ہمدردیاں ان ہی کے ساتھ ہوگئیں۔ ذرا ادھر کی خبر بھی تو لیں تاکہ معلوم ہو اس الم ناک تغافل اور دل سوز بے اعتنائی کا باعث کیا ہے۔ ۹ سو' معلوم ہوا یہ سب کچھ آپ ہی کی تلون مزاجی اور "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کے جواب میں تھا اور کلیہ بھی یہی ہے کہ ری ایکشن کی شدت ایکشن سے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے یعنی؟ "ہم وفا دار نہیں تو بھی تو دل دار نہیں" والا معاملہ آپ کے ساتھ بھی پیش آیا اس کیس کی جب ہم نے ژرف نگہی سے تحقیق کی تو یہ ثبوت ہاتھ آیا! مرزا حاتم علی نام مہر تخلص اور آپ کے ایک عزیز دوست اور شاگرد تھے۔ بے چارے سیدھے سادھے آدمی اونچ نیچ اور ہیر پھیر سے ناواقف وفا کے پتلے۔ ان کا ایک محبوب تھا جو دنیا سے گزر گیا۔ مہر صاحب پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ زندگی سے بیزار ہو گئے۔ دائمی جدائی کے صدمے نے نڈھال کر دیا' کھانا پینا' ملنا ملانا سارے معمولات ایک دم موقوف ...... جب ان کے احوال کی خبر ان کے پیرِ خرابات اسد اللہ خان غالب کو ہوئی تو آپ نے دوست کا صبر و قرار واپس لانے کے واسطے ایک تعزیتی خط لکھا' تعزیت کیا ادا فرمائی بلکہ غریب کے خرمنِ ہستی میں وہ آگ لگائی "اپنی سی" ہی پڑھائی۔

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں' پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں' ہم مانع فسق و فجور نہیں پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یاد رہے مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ' غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی مُنّا جان سہی۔

میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے، وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور

طوبیٰ کی شاخ چشم بد دور دہی ایک حور بھائی ہوش میں آئے کہیں اور دل لگا دشعر:

زنِ نو کن اے دوست در نو بہار
کہ تقویم پارینہ نیاید بکار"

یکھ لیا نا آپ نے کیسی پٹی پڑھائی ہے اور کیسی آگ لگائی ہے اس قماش اور رنگ ڈھنگ کے عاشق سے اگر محبوب بے رخی برتتے اور تابڑ توڑ گن گن کر بدلے ہر دم جلانے ستانے کی سوچے، رقیب کی دو میں بیٹھ کر تصویر بنوائے اور عاشق کی کھلی اڑائے تو قارئین خدا لگتی کہیے۔ اس نے کیا بُرا کیا۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ جتنا کرنا چاہیے تھا۔ اور اس سے بہت کم کیا۔ . .

جس اردو ... آپ نو سرا نکھوں پر بٹھایا سینے سے لگایا اور جس کے باعث چار دانگ عالم ں آپ کے نام کا غلغلہ بلند ہوا اسی کے ساتھ آپ کیا سلوک فرماتے ہیں اور کیسے اس کو اس کی اوقا تاتے ہیں۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من ست

(میرا کمال اگر دیکھنا چاہو میری فارسی میں دیکھو اردو میں جو کچھ ہے وہ اس قابل نہیں کہ اسے پڑھا جائے)

بے شک آپ فارسی سے مناسبت ازلی لے کر آئے تھے، زبان دانی فارسی آپ کی ازلی دست گاہ ور علیہ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ آپ کو خدا نے دیا ہے صرف ذائقہ بدلنے کے لیے بھی کبھی "ریختہ" کو بھی منہ لگا لیا کرتے تھے اور اس "کبھی کبھی" ہی نے "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" کو وہ مقام طا فرمایا اور ایسی توقیر بخشی کہ آپ کے مقام اور مرتبے اور خود شناسی کے اظہار کے لیے یہی کم اوقات پ کے کام آئی!

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے ✲ جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

ہے کو تو اس بات کا اردو میں اظہار کر گئے مگر جھکرائے اور الٹا اس کی سات پشتوں پر احسان جتانے لگے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اری محترم: یہاں سے اب صوفی صافی فقیر "طالب علی شاہ" عرض پرداز ہے! مقصود اس تمام تر راز نفسی کا حاشا! یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہمارے سر میں (پیر غالب علی شاہ دامت برکاتہم) کی شان یں ہرزہ سرائی کی سمائی ہے، یوں ہی بیٹھے بٹھائے کیا ہماری شامت آئی ہے؟ بلکہ اپنی زندگی میں وہ ود ہی "آ بیل مار مجھے" کے قائل تھے اور بیلوں کے سینگ کھا کر مزے لیا کرتے تھے سو ان کی اسی خواہش کے احترام میں ہم بھی ان ہی سے وجدانی حاصل کر کے قبر میں ان کو مزے لینے کا اور ادھر آپ کے ذوقِ سلیم کی تفریح کا تھوڑا سامان لاتے ہیں۔ ورنہ ہمیں اپنی اوقات معلوم، کبھی اپنی چادر دیکھے بغیر پاؤں پھیلانا ہمارا شعار نہیں۔ ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا کان پکڑ کر فرمائیں گے!

"اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند" یما را مختصر سا دماغ "غالب کی عظمتوں کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا اور نہ وہ الفاظ ہمیں آتے ہیں جن سے انکے بارے میں کچھ بیان کیا جا سکے، غالب غالب ہے اور ہم بقول کرخنداران دہلی! "اماں، چہ کیا پدی چہ کیا پدی کا شوربا"۔ مختلف دانشوروں نے اپنے اپنے نقاطِ نظر سے غالب کی عظمت بیان کی ہے۔ اقبال نے بھی خوب فرمایا!

خندہ زن ہے، غنچۂ دہلی گلِ شیراز پہ

مگر! عزیز محترم پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالباری ماہر سیاسیات و تعلیم نہایت منکسر المزاج و سنجیدہ دانشور کا نقطۂ نظر اوروں سے مختلف ہے۔ ہمارے نام اپنے ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں!

"غالب کا کیا کہنا، علم و آگہی کا ایک مواج دریا تھا، اپنے دور میں یہ اگر سپہ گری اختیار کر لیتا تو دنیا کی کسی عظیم فوج کا کمانڈر ہوتا؛ ورنپولین بونا پارٹ بھی اس کا منہ تکتا رہ جاتا۔ اگر شاہ راہِ سیاست پر گامزن ہو جاتا تو کسی ملک کا تاج دار یا صدرِ مملکت نظر آتا مگر اس کی طبع رسا کی بوقلمونی ادھر مائل نہ ہوئی اور فنِ شعر و کلام کی پُرخار رہ گزر کا انتخاب فرمایا اور ہم دیکھتے ہیں ذہن کے پردے پہ اس رہ گزر کے مسافروں کے جتنے بھی نام ابھرتے ہیں وہ ان سب کا میرِ کارواں ہی نظر آتا ہے"۔ .... منزل پر پہنچ کر جب یہ اپنی کمر کھول رہا تھا تو دوسرے وہاں پہنچنے کی آرزو نے کمر باندھ رہے تھے "تعلی نہیں خود شناسی" کی اس مثال کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا!

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے ؛ دیوان مرا شہرت پروین بودے

غالب اگر ایں فنِ سخن دین بودے ؛ آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

(اگر شعر و سخن دنیا کا قانون ہوتا تو میرے دیوان کو عقدِ ثریا کی سی شہرت حاصل ہوتی اور اے غالب اس فن کی حیثیت اگر دین کی ہوتی تو میرا دیوان اس دین کے لیے آسمانی کتاب ہوتا")

اور غدا یا!

"غالب نے اگر فارسی کے عشق میں بے سہارا اردو کے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو آہ! گلشنِ اردو کتنا بے رنگ ہوتا اور یہ زبان کتنی غریب ہوتی!"........

پسِ نوشت :

شرلک ہومز نے پھر اپنے عزیز دوست واٹسن سے کہا! پیارے واٹسن! یہاں بھی مجھے اسی میدِ موازل چناجان نہ سہی مادام متا جان سہی" کی بو آ رہی ہے ساری عمر فارسی سے زورِ عشق لڑایا مگر جب کچھ دینے کا وقت آیا تو اسے ٹھینگا دکھا کر اردو کا دامن بھر گئے........)

پروفیسر آفاق احمد
(بھوپال)

معشوقِ جفا پیشہ
یعنی
اسکوٹر ہمارا

ایک تو شہر اونچی نیچی سطح کا ہے، دوسرے سڑکوں کا یہ عالم کہ کہیں گٹیاں پھیلی ہوئی ہیں کہیں گڈھے اپنا آغوش وا کیے ہیں اور کہیں پھسلن ایسی کہ ذرا چوکے اور تصویر اتری۔

لیکن ہم آپ جو اتفاق سے انسان کہلاتے ہیں اور انسان کہلانے کا حق قائم رکھنے بلکہ بھرم بنائے رکھنے کے لیے وہ سارا کام کرنے پر مجبور ہیں جس کی کسی انسان سے توقع کی جاتی ہے۔ اس لیے وہ راہ فرار کوئی نہیں۔ انھیں سڑکوں پر چلنا ہے اور اگر اللہ نے تھوڑی بہت توفیق عطا کی ہے تو کسی سواری کا بھی سہارا لینا ہے۔ سواری اپنی ذاتی ہو تو کیا کہنا ورنہ بے بسی کا دوسرا نام بس ہے!

اس زمانے کے دھندلے دھندلے نقوش اب بھی جب یاد آتے ہیں تو تڑپا جاتے ہیں۔ جب ہم بھی 'باکار' تھے لیکن بہت مگر کر بھی اتنے ضرور تھے "رہے کر کار کی گدی نشینی سے معزول ہوئے تو خود کو سائیکل کا ہینڈل تھامے پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا لڑکپن کا' جب سائیکل بھی ہوائی جہاز کی ہم سری کرتی تھی لیکن جوں جوں عناصر کا اعتدال ساتھ چھوڑتا گیا، سائیکل وبالِ جان بنتی گئی۔ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہے اور اگر ایسی حالت کچھ دیر اور برقرار رہی تو خود کے چل بسنے کا خطرہ ہے۔

بس ذرا حالات کا سازگار ہونا تھا کہ موٹر اور سائیکل کے بیچ کی چیز یعنی اسکوٹر پر سمجھوتہ کر لیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ ایک شے بظاہر موٹر سے ذرا نیچی اور سائیکل سے ذرا اوپر ہے اور جس کے انتظار میں ہم ڈیڑھ سال تک شاعروں کی مثالی شبِ ہجر کے علاوہ اپنے دن کو بھی مسلسل انتظار کی شکل دیتے ہوئے

تھے، جب ملے گی تو تھوڑے سے عرصہ بعد ہی ہمیں" ہم تو اس چھینے کے ہاتھوں مر چلے" کی تفسیر بنا دے گی اور یہ واقعہ تب کا ہے جب آتش جوان تھا!

اسکوٹر لانے کے بعد پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ "ہدایت نامہ اسکوٹر" اتنے غور سے پڑھا جتنا کبھی طالب علمی کے زمانے میں "بے خدا ہم" سوال کا جواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ مثلاً گیر کہاں بدلنا ہے؟ کلچ کیسے دبانا ہے؟ اور جب تک ایک ہزار کلومیٹر نہ ہو جائیں زیادہ اسپیڈ میں گاڑی نہیں چلانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے دن ہی ہمارے ایک کرم فرمانے کہا کہ ذرا اسکوٹر دینا۔ ۵ منٹ میں آیا۔ ہم نے کہا ۔شوق سے لے جاؤ مگر ۳۵ - ۴۰ سے زیادہ اسپیڈ میں نہ چلانا۔ اور ڈرانے کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ کچھ خرابی ہے۔"

ہمارے ان کرم فرما کے ۵ منٹ پون گھنٹے کے برابر نکلے ۔ اُدھر اس درمیانی عرصہ میں ہماری جان سوکھتی رہی کہ پتہ نہیں کیا حادثہ پیش آیا۔ ہم اپنے اسکوٹر کی سلامتی کی دعا مانگتے رہے۔ بہت بعد میں خیال آیا کہ بے جان چیز کے لیے اتنی فکر اگر خدانخواستہ ہمارے دوست کو کچھ ہو گیا تو؟ مگر یہ سوچ کر پھر اسکوٹر کی سلامتی کی ہی دعا مانگی کہ اس کی سلامتی میں ہی ہمارے دوست کی بھی سلامتی تھی۔

آتے ہی ہمارے دوست بولے: "خواہ مخواہ ڈرا دیا۔ کوئی خرابی وربابی نہیں۔ میں نے ۷۰ - ۷۵ کی اسپیڈ میں بھگایا کچھ بھی نہیں ہوا۔"

سوچا کہ اگر اپنی روایتی مروّت کا یوں ہی مظاہرہ کرتے رہے تو اسکوٹر سے ہاتھ دھوئے۔ فوراً ایک پارٹی کا اہتمام کیا اور سارے شناسا جن کے بارے میں یہ خدشہ تھا کہ مستقبل قریب یا بعید میں اسکوٹر مانگ سکتے ہیں۔ انھیں لذتِ کام ودہن کے سامان فراہم کرنے کے بعد اس قسم کا اعلان کیا کہ ہم اپنا اسکوٹر کسی کو نہ دیں گے۔ اس مطلب کی ایک قسم بھی کھائی۔

اس اعلان اور قسم کے نتیجہ میں کچھ نے زیرِ لب، کچھ نے برلب اور جو ڈپلومیٹ قسم کے تھے انھوں نے دل ہی دل میں ہماری بے رخی کو "ایک ذرا سا اسکوٹر آ جانے پر دماغ بہک جانے" کا طعنہ دیا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ ہم اس مشین کے چکر میں اپنے بہت سے دوستوں کی صحبت سے محروم ہو گئے ہیں۔ سچ ہے "احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں۔ آلات"

یہ پہلا تلخ تجربہ تھا جو اس اسکوٹر کے توسط سے ہمیں ملا۔ ہمیں کیا معلوم تھا اس "معشوق جفا پیشہ" کے روپ میں ایسے بہت تجربوں سے ہمیں دوچار ہونا ہے۔

چند دن تو گاڑی ٹھیک چلی کیونکہ اسکوٹر ٹھیک چلا۔

لیکن دھیرے دھیرے ہمیں احساس ہوا کہ اسکوٹر کے طفیل جانے انجانے ہم میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ پہلے ہم اس بات کے لیے مشہور تھے کہ سویرے ۶ بجے اٹھتے ہی گل گشت کو جاتے تھے اور دوستوں کو ہوا خوری کے لیے پیدل چلنے کے فوائد پر اکثر لیکچر دیا کرتے تھے خود پیدل چلتے تھے اور اپنی تندرستی

اور جوانی کا راز اسی سرگشتی کو سمجھتے تھے۔ مگر ہمیں اب یہ محسوس ہوا کہ پیدل چلنے کے نام سے ہمیں بخار آنے لگا ہے اگر سویرے گلی گشت کو جائیں گے یا باسکٹ بال کورٹ یا ہاکی گراؤنڈ تک جائیں گے تو کیا مجال جو ایک قدم بھی چلیں۔ اسی اسکوٹر کا سہارا لیں گے۔ حالانکہ گراؤنڈ کا فاصلہ مشکل سے لفف فرلانگ ہوگا۔

دھیرے دھیرے اسکوٹر نے ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کئے۔ آج ٹیوب میں پنکچر ہو گیا۔ کل ٹائر پھٹ گیا ہے۔ پرسوں کلچ وائر ٹوٹ گیا ہے۔ گیر وائر کا ٹوٹنا، پلگ کا خراب ہو جانا، جیٹ میں کچرا آنا، روز کا معمول ہو گئے۔ ہمارے حلقہ احباب میں اس اسکوٹر کی آمد سے جو کمی ہوئی تھی وہ میکینک صاحبان کی دوستی سے پوری ہونے لگی پہلے جو وقت اپنی دانست میں علمی و ادبی محفلوں میں گزارا کرتے تھے اس میں سے ایک چوتھائی کے حصے دار اب اسکوٹر کو درست کرنے والے کارخانے ہو گئے۔

اسکوٹر کی ٹوٹ پھوٹ تک ہی بات محدود رہتی تو صبر کر لیتے آخر خود ہماری ٹوٹ پھوٹ بھی ہونے لگی۔ ہمیں اپنی اسکوٹر کی صلاحیت اور کارکردگی پر بڑا ناز تھا۔ اکثر حیران رہے کہ پھر بھی حادثات میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ اور اسی نسبت سے ہمارے بے داغ جسم پر عجیب و غریب قسم کے نشانات کیوں جگہ پا رہے ہیں۔

ہمارے ایک دوست نے اس عقدہ کو یوں حل کیا کہ تم اچھی ڈرائیونگ کرتے ہو۔ ٹھیک ہے لیکن اس کی کیا گیارنٹی کہ سامنے سے آنے والی کار یا پیچھے سے آنے والے ٹرک کا ڈرائیور بھی اتنے ہی محتاط ہونگے اور پھر وہ بچے جنھیں ماں باپ نے پیدا کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد سڑکوں کے سایہ میں پل کر جواں ہونے کے لیے چھوڑ دیا ہے کب سامنے آجائیں۔ انھیں بچاؤ تو خود مرد اور ان پر گاڑی چڑھا دو۔ تو بھی خود مرو۔ پہلی شکل میں گرنے سے چوٹیں آئیں گی۔ دوسری شکل میں بیٹھنے سے منزل دونوں کی ہاسپٹل ہوگی۔

بات دل کو لگی اور اب ہم نے اپنی اسکوٹر کی رفتار اتنی دھیمی کر دی کہ بعض اوقات یہ دیکھ کر ہمیں بڑی شرم آتی کہ کوئی بھی سائیکل والا سیٹی بجاتا ہوا ہم سے آگے نکل جاتا۔

ایک بار تو ہماری شرمندگی انتہا کو پہنچ گئی۔ راستہ میں پیدل چلتے اپنے ایک ساتھی کی حالت پر ترس کھا کر ہم نے اپنی گاڑی روکی اور اس سے کہا "آؤ ہم تمھیں چھوڑ دیں"

وہ بڑی بے نیازی سے یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"مجھے ذرا جلدی پہنچنا ہے"

پتہ نہیں اس کا اشارہ ہماری سست رفتاری پر تھا یا ہمارے اسکوٹر کے بار بار بگڑ جانے پر "ہوٹنگ" کر رہا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ بارہا سنا یہ لطیفہ خود ہم پر بھی صادق آئے گا۔؟

آخر ان روز روز کے بکھیڑوں سے تنگ آکر ہم نے یہ طے کیا کہ اسکوٹر کی سواری وقت وقت پر۔ اب ہم پیدل چلیں گے یا بس میں۔

پتہ نہیں کس منحوس گھڑی میں ہم نے یہ سوچا تھا کہ عین اسی وقت ایک لمبی چوڑی تنہا سڑک

ہماایک ہاتھ ٹھیلے کو بچاتے ہوئے ہم اپنا ہاتھ اتروا بیٹھے۔

ڈاکٹر نے ایک ہفتہ کے لیے ہاتھ پر پلاسٹر چڑھایا اور اب ہم واقعی پیدل تھے۔ ہمیں احساس ہوا کہ اس تیزی کے ساتھ چلتی مصروف دنیا میں پیدل چلنے میں کتنا وقت نکل جاتا ہے۔ ایک دو دن آٹو اور ٹیکسی سے کام چلایا۔ پتہ چلا کہ اتنے رئیس نہیں ہیں! بس میں بیٹھ گئے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس بس نشینی کا انجام سارے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا کی شکل میں ہوگا۔ اسٹینڈ سے چل کر بس کوئی نصف فرلانگ چلی ہوگی کہ رک گئی۔ پتہ چلا ٹکٹوں کا حساب ہونا ہے۔ دس منٹ بعد پھر بڑھی تو کچھ نئی سواریاں بھرنے کے لیے رک گئی۔ ۵ منٹ اس میں بھی لگے۔ پھر بیٹھنے کے مسئلہ پر دو سواریوں میں جھگڑا ہو گیا۔ بس پھر رک گئی۔ دس منٹ اور خراب ہوئے۔ مشکل سے تھوڑا راستہ طے کیا ہوگا کہ پھر بس رک گئی۔ اب کیا ماجرا ہے؟ پتہ چلا کہ چالان ہو رہا ہے۔ ہم بڑے حیران کہ یہ ہر قدم پر چالان کیوں؟ سواریاں گنی گئیں۔ یقیناً زیادہ تھیں۔ نصف گھنٹہ کی مختصر کارروائی کے بعد چالان مکمل ہوا اور بس پھر آگے بڑھی۔

لیکن بس آگے بڑھنے سے قبل ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔

ہم سے پہلے بس میں بیٹھا ایک من چلا مسافر اٹھا اور بولا "ممکن ہو، آگے بھی پولیس کھڑی ہو۔ اس لیے رسید دے دیجیے کہ یہ بس پہلے سے چالان شدہ ہے۔ مزید تکلیف کی ضرورت نہیں۔"

ایک دوسرے بس میں بیٹھے بے بس نے جل کر کہا:

"کیوں غریبوں کے پیٹ پر لات مارتے ہو؟"

(ہم نہیں سمجھ سکے کہ جس غریب کے پیٹ پر لات مارنے کا تذکرہ تھا اس سے مراد بس والا تھا یا چالان کرنے والا یا دونوں؟)

ہم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ بس سے نیچے اتر جائیں۔ بدقت تمام اس مہم کو سر کیا اور سوچنے لگے کہ ہر زمانے میں سزا دینے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ البتہ جرائم کی نوعیت کے ساتھ سزا کی نوعیت بدلتی رہتی ہے سزا دینے والوں کے ہاتھ بدلتے رہتے ہیں۔ سزا کی قسموں میں ہیرا پھیری ہوتی رہتی ہے۔ شاید بس میں سفر بھی ایک سزا ہے؟

ہمیں بے اختیار اپنا اسکوٹر یاد آیا۔ کتنا ہی خراب ہو۔ اپنے دامن میں کتنی ہی الجھنیں رکھتا ہو کتنے ہی خطرات کا نام اس سے جڑا ہوا ہو۔ یہ سب کچھ ہو مگر،

"اُس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے۔"

عذرا اصغر
(پاکستان)

جو نہ ہوتا گدھا تو...

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ گدھے کی آفرینش کب ہوئی - وجود عالم کے کتنی مدت بعد تخلیق انسان سے پہلے یا بعد میں - پہلے ہوئی تو کتنے پہلے اور بعد میں ہوئی تو کتنے بعد میں - تاریخ عالم اس ضمن میں خاموش ہے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عالمی تاریخ دانوں نے گدھے کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی - اس امر کو گدھے کی بدقسمتی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کیوں کہ تاریخ عالم نے جانوروں اور حشرات الارض کے سلسلے میں جن جان داروں کو اہم جانا ہے ان میں سانپ اور ڈائناسار قابل ذکر ہیں جبکہ ہر دو جان دار انسانی زندگی کے لیے خطرہ ہیں مگر انسان ازل سے ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے اور اپنے سے کہیں کمتر مخلوق کے بہکائے میں آجانا اس کی وراثت میں داخل ہو چکا ہے انسان کے جد اعلیٰ حضرت آدم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ گدھا جیسا مسکین جانور شاید اپنی مسکین خصلت کے سبب توجہ کا مستحق قرار نہ پایا گیا ہو ورنہ دیکھا جائے تو گدھے کو انسانی معاشرے میں بہت اہمیت حاصل ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست و مناسب ہوگا کہ انسان اور گدھے کا چولی دامن کا ساتھ ہے - گدھا وہ باوفا و بامروت مخلوق ہے جس نے انسان سے اس کو اشرف المخلوقات کا شرف ملنے کے بعد بھی ناتہ نہیں توڑا اور ساتھ نہیں چھوڑا۔

بنیادی طور پر انسان بہت بھولی مخلوق ہے - اتنی بھولی کہ اسے حماقت قرار دینا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا - اس نے ہمیشہ اپنے دشمنوں سے دوستی کرنا چاہی اور حسن سلوک برتا - دودھ پلا پلا کے اور آستینوں میں چھپا چھپا کے رکھا مگر وہی احسان فراموش ثابت ہوئے اور مار آستین کہلائے اور ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اس حقیقت کو پا لینا چنداں مشکل نہیں کہ انسان کو گدھے کی وجہ سے ہی اشرف المخلوقات کا شرف ملا۔ گدھا نہ ہوتا تو انسان بھی اشرف المخلوقات نہ ہوتا۔

منطق کا اصولِ ضدین اس کا ثبوت ہے کہ نیکی بدی سے پہچانی جاتی ہے۔ خوب صورتی بد صورتی سے اندھیرا اجالے سے، گدھے کے وجود نے انسان کی پہچان میں آسانی پیدا کی ہے یعنی گدھے کی عدم موجودگی انسان کی پہچان کو ناممکن نہیں تو مشکل ضرور بنا سکتی تھی۔

اصولِ تناسب کے تحت چیزوں کا ایک دوسرے سے مشابہ ہونا ضروری ہے۔ شکل وصورت میں اگرچہ گدھے کو کوئی مناسبت نہیں ہے لیکن خصائل میں بے پناہ مشابہت موجود ہے۔ اسی لیے علما وفضلا نے ضرب الامثال تشکیل دیں۔ مثلاً:

ارے بھائی کیا گدھوں جیسی باتیں کرتے ہو!

میاں گدھے ہو یا انسان؟

کیا گھاس چر گئے ہو؟

فلاں شخص تو بالکل گدھا ہے!

پڑھ لکھ کر گدھے پر لادنا والا محاورہ بھی اس ضمن میں ایجاد ہوا۔

گدھا ایسے محاورے اور تمثیلیں سن کے رنجیدہ ہوتا ہے اور سوچتا ہے بلکہ کڑھتا ہے کہ انسان کتنا ناشکرا ہے۔ سچ یہ ہے کہ گدھا نہ ہوتا تو انسان کو انسانیت کی فضیلت کیونکر حاصل ہوتی؟

واقعتاً انسان کی زندگی میں گدھے کو بہت دخل حاصل ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں ابھی اپنے موقف میں چند معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گی

دیکھیے! شیخ سعدی جیسے عالم، مفکر اور دانشور کی علمیت میں گدھے کا کردار کتنا واضح ہے گزرے زمانے میں علما کے پاس اپنے اپنے گدھے ہوتے تھے جو ان کی کتابوں کے بوجھ کو اپنی کمر پر لادے پھرتے تھے۔ طالب کو جب جس کتاب کی طلب ہوتی مطلوب اپنی پشت اس کی جانب موڑ دیتا اور طالب اپنی مطلوبہ کتاب اٹھا لیتا

جب سے انسان نے گدھے کو درخورِ اعتنا کیا اور اسے صرف دھوبی کے گھاٹ کے کھونٹے سے جا باندھا اور کتابوں کا بوجھ خود اپنی کمر پر اٹھا لیا تو وہ علم سے بے بہرہ ہو گیا۔ وہ کتابوں کے بوجھ تلے دب گیا اور علم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گیا۔ آپ دیکھ لیجیے کہ صدیوں سے اس کرۂ ارض پر شیخ سعدی، مولانا روم، ابو علی سینا جیسے علما وفقہا پیدا نہیں ہو سکے۔ حتیٰ کہ علامہ اقبال تک پیدا نہیں ہوئے وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں گدھے ناپید ہو گئے ہیں یا ان کی نسل ختم ہو گئی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ انسان نے گدھے کو حقیر جان کر درخورِ اعتنا کر دیا ہے اور اس کا بوجھ خود اپنی کمر پر اٹھا لیا ہے۔ گدھا انسان کو اپنے منصب پر دیکھتا ہے تو دل میں ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے رہ جاتا ہے۔ انسان اس کی بات سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ سوچتا ہے میں اشرف ہوں حیوانِ ناطق سہی پر ہوں تو اشرف مخلوقات گدھا خود کو کیا سمجھتا ہے؟ میں!

زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہوں۔

اس مقصد کے لیے اس نے خوب صورت بستے بنائے۔ مگر کتابوں کا بوجھ بڑھتا گیا اور خوب صورت بستے چھوٹے پڑ گئے۔ اس نے بستوں کا حجم بڑھا دیا اور اپنے بچوں کی کمر پر ان بوجھل بستوں کو لٹکا دیا۔ مثل گدھوں کا اپنے کمر جھکائے اور گردن ڈھلکا کر چلنے لگے۔

اس صورت حال سے گدھوں کو چنداں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اسے پُرامید رہنا چاہیے۔ اسے جان لینا چاہیے کہ انسان اس ارتقائی دور میں داخل ہو چکا ہے جہاں اسے باقاعدہ اور باضابطہ گدھا بننے میں زیادہ دیر نہیں۔ ڈارون کی تھیوری کے مطابق انسان بندر سے انسان بنا تھا اب انسان گدھا بننے چلا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا کون سا دور ہوگا۔ ابھی یہ فیصلہ مشکل ہے

تاہم ابھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا۔ انسان کو سوچ لینا چاہیے اور گدھے کو اس کا منصب لوٹا دینا چاہیے۔ تعلیمی اداروں کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ طلبا کے لیے ایک ایک گدھا ان کی ذاتی ملکیت میں رکھنے کی منظوری دیں تاکہ طالب علم اسکول آتے ہوئے اپنا گدھا ساتھ لائیں۔ تعلیمی ادارے ان طالب علم گدھوں کے لیے تعلیمی اداروں میں گنجائش پیدا کریں اور ان کے لیے عمارت کے اندر تھان بنوائیں جہاں ان کے آب و دانہ کا معقول بندوبست ہو۔ یوں حکومت وقت پر بھی لازم ہے کہ اعلیٰ درجے کی چراگاہیں گدھوں کے قیام و طعام کے لیے مہیا کی جائیں تاکہ گدھوں کا گرتا ہوا معیار زندگی بلند ہو اور انسان کی ترقی میں مددگار بن سکیں۔ ایسا نہ کیا گیا تو خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ دور حاضر یا مستقبل قریب و بعید میں ارسطو اور افلاطون تو کجا کوئی گدھے جیسا گدھا بھی پیدا نہیں ہو سکے گا۔

المختصر یہ کہ نسل آدمیت پر گدھے کے احسانات بے مثل ہیں۔ جن سے مفر ممکن نہیں۔ ●●

قطعات —— نظر برنی

'جھوٹے وعدے'

'سیاست' ہی میں اپنے غم کا درماں کر کے دیکھیں گے
اسی ویرانے کو ہم بھی گلستاں کر کے دیکھیں گے
کریں گے سب سے وعدے کام دھیلے کا نہیں ہوگا
بزرگوں کی روایت کو درخشاں کر کے دیکھیں گے

'یادش بخیر'

چپکے چپکے رات دن دولت بڑھانا یاد ہے
یاد ہے ہم کو "کرپشن" کا زمانا یاد ہے
یاد ہیں وہ کالے دھندے اور "حرام پیشگی"
دے کے رشوت قتل میں بھی چھوٹ جانا یاد ہے

'ہوشیار ہو جاؤ'

الیکشن کا زمانہ آگیا ہشیار ہو جاؤ
جنھیں کل آزمایا تھا انھیں پھر آزمانا ہے
جو کہنا ہو کہو جی کھول کر امیدواروں سے
وگرنہ ڈھونڈتے پھریئے کہاں ان کا ٹھکانا ہے

افتخار وصی
(بیتیا)

غزل

مثلِ کپاس ہوگئے داڑھی کے سارے بال
زورِ شباب جیسے ہی منہ موڑ کر اٹھا
آدم کی نسل میں ہے کہاں آدمی کوئی
پوچھا جو ڈارون نے تو اک جانور اٹھا
میں نے صدا اٹھائی جو مہنگائی کے خلاف
کوئی بشر بھی میری نہ آواز پر اٹھا
ہلکا ہوا ہمیشہ میں پاکٹ کے بوجھ سے
میری بغل سے جب کوئی پاکٹ کتر اٹھا
جا تیرے ہاتھ سونپ دی کرسیٔ اقتدار
سجدہ تیرا قبول ہوا، اپنا سر اٹھا
اک میں تھا افتخار کہ آنکھیں کھلی رہیں
"دنیا سے آنکھ بند کئے ہر بشر اٹھا"

سراج نرملی

○

گن ٹھگوں اور یوگیستاؤں میں
ہم گھرے ہیں حسیں بلاؤں میں
ہم ستم ڈھا رہے ہیں، تم لیکن
"یاد رکھنا ہمیں دعاؤں میں"
ہے نتیجہ اڈلٹریشن کا
کچھ اثر ہی نہیں دواؤں میں
کل ہی پٹوایا، آج ہمدردی
کیوں لگاتے نمک ہو گھاؤں میں
یار تو کرگئی مری پاکٹ
کھو گیا جب تری اداؤں میں
تجھ کو ہم تو کچل کے رکھ دیں گے
آ رہا کیوں ہمارے پاؤں میں
ان سبھوں میں سراج اپنا ہے
راکھشس جیسے دیوتاؤں میں

فاطمہ تاج
(حیدرآباد)

پانی، پٹرول

پانی کو پٹرول بنا دینے کے کامیاب تجربے کے بارے میں جب ہم نے کچھ عرصہ پہلے اخبار میں پڑھا تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ سائنس کی ترقی ہے یا حیاتِ انسانی کے زوال کا نقطۂ آغاز.....؟ بہت غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ بات بات پر آگ بگولہ ہو جانے کی عادت ہمیں فی الفور ترک کرنی پڑے گی ورنہ دل کی آگ کے باہر آتے ہی پٹرول زدہ ماحول بھڑک اٹھے گا۔

ہم نے آئندہ ہونے والے واقعات کا اندازہ یوں لگایا کہ شاید کچھ ہی دنوں میں خون میں پروٹین کے بجائے پٹرول شامل ہو جانے سے "قیامتِ آدم" پہ "نزولِ آفات" شروع ہو جائے۔ یعنی کھانے کی میز پر پانی کی بوتل کے بجائے پٹرول کے چھوٹے چھوٹے بیرل رکھے ہوں گے۔ ہم بھی پٹرول پی کر شاہراہوں پر گاڑیوں کی طرح دوڑنے لگیں گے۔ کبھی ہوائی جہاز کی طرح اڑنے لگیں بھی تو عجب نہیں۔ زندگی تیز رفتار ہو جائے گی اور ہم اونچا بہت ہی .... اونچا اڑنے لگیں۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ پانی کے بجائے پٹرول پی کر جب ہم "اسٹارٹ" ہو جائیں گے تو ہمیں آنکھیں کھلنے والی سرخ بتی جو کسی چوراہے پر لگے سگنل کی ہوگی ہمیں نہ روک سکے گی۔ بلدی امور کی مصروف "قیم" کے درمیان لگی "لال جھنڈی" کی بھی ہم پرواہ نہیں کریں گے۔ ٹریفک پولس کی سیٹیوں پر ہم ہرگز توجہ نہ دیں گے۔ اسپیڈ بریکر بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ اسپیڈ بریکر کا ہم ہی ستیاناس کریں گے یہی نہیں پکوان کے لیے بھی پانی کے بجائے پٹرول استعمال ہوگا۔ کسی بھی دعوت یا اعلیٰ ہوٹلوں میں ویٹر نہ ہمارے ہاتھ دھلانے کے لیے گرم پانی اور لیمو کے بجائے ٹین کے کھلے منہ کے کنستر میں پٹرول لاکر ہمارے ہاتھ (شاید منہ بھی) دھلا کر "ٹپ" وصول کریں گے۔ پانی کے بدلے پٹرول کا چلن عام ہو جائے گا تو پٹرول پمپ پر بجائے پٹرول کے شاید پانی ملے گا۔ خدا معلوم فی لیٹر کتنے روپے دینے ہوں گے۔ رگوں میں دوڑنے والا لہو جب ہماری چشمِ نم سے ٹپکتا ہوا پٹرول بن کر فضا میں چنگاریاں بکھیرنے لگے گا تو فائر انجن

طلب کیے جائیں گے جو شاید بڑی مشکل سے ملیں گے۔ پٹرول ہی سے کپڑوں کی دھلائی ہوگی۔ بے داغ لباس زیب تن کیے غریب، امیروں کے ہم نشین ہوسکیں گے (یہ بہت اچھی بات ہوگی) کسی گھر میں اندھیرا نہ ہوگا، گھر، گھر نہیں بلکہ جھونپڑی جھونپڑی اجالا ہوگا لیکن پھر...... بشہر کے نظارے " جنگل کی آگ " بنے نگاہوں کو خیرہ کردیں گے ہم اسی وقت پانی کو پٹرول بنانے کا فارمولہ نذرِ آتش کردیں گے۔ ہم اس خوب صورت دنیا کو جہنم بنتا نہیں دیکھ سکتے۔

"تالاب، تالوں، ندیوں اور کنوؤں کا پانی پیٹرول بن جائے تو اس "شاعرانہ تشنگی" کا کیا ہوگا جو سمندر کو پی کر بھی کم نہیں ہوتی۔ لق و دق صحرا میں بھٹکنے والے اہلِ جنوں کے قافلے کسی کنویں سے پانی نکالنے والی دوشیزہ کے آگے دونا تو بیٹھ کر "قطرہ قطرہ آبِ حیات" کیسے پی سکیں گے...... ؟

ہم پانی کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں "ہوا، پانی، غذا انسانی حیات کے لیے ضروری ہے"۔ یہ بات بزرگوں نے "حیاتِ چندروزہ" کے بارے میں ہمیں سمجھائی تھی اور ہم اپنے بزرگوں کی بات کو اپنے ذہن میں نہ صرف محفوظ رکھتے ہیں بلکہ تائید بھی کرتے ہیں۔ (کبھی کبھی نہیں بھی کرتے ہیں)

پانی اور پیٹرول کی خبر سن کر ہماری ایک ملاقاتی بزرگ رئیس خاتون نے خوش ہوکر کہا کہ اچھا ہے پیٹرول کی قلت کی وجہ سے بڑی مشکلیں تھیں۔ اب ہوائی جہاز کے کرایہ میں کمی ہوجائے گی اور میں امریکہ اپنی بیٹی داماد سے ملنے ہر مہینہ آتی جاتی رہوں گی۔ جہاز کا کرایہ آٹو رکشا کے کرایے کے مماثل ہوگا اور آٹو کا کرایہ بس کے کرایہ کی طرح، ہم نے پوچھا پھر بس کا کرایہ کتنا ہوگا؟

انھوں نے کہا، کیا مجھے اپنی توہین کروانی ہے بس میں سفر کرکے...... ؟

رئیسانہ تکبر کا شعلہ دلِ غریب کے خرمن پر گرا........ ہم نے محسوس کیا کہ ہماری جل تھل آنکھوں میں بہت پانی ہے، بہت پانی ہے، اتنا کہ دو عالم ڈوب سکتے ہیں۔ اللہ سلامت رکھے اس پانی پہ ہماری کشتیِ حیات سکون سے چل رہی ہے۔

نہ جانے کتنے لوگوں نے اس خبر کو سن کر "آگ کا دریا" پار کرنے کی مشق شروع کردی ہوگی؟

بہرحال آسمان سے برسنے والا پانی اور زمین سے نکلنے والا پیٹرول ہمارے لیے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے...... اس طرح ؟ ؟

AV

دلشاد رضوی

(حیدرآباد)

فنِ گداگری

صاحبان ہم نے بہت سارے علوم و فنون کے بارے میں سنا ہے اور اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ نہ صرف یہ کہ سیکھا ہے بلکہ انھیں آزمایا بھی ہے۔ لیکن آج جس فن کا ہم آپ سے تذکرہ کرنے جا رہے ہیں اس کے انداز ہی کچھ نرالے ہیں جو ہمیں بہت دل چسپ لگے اس لیے اس کی گہرائی تک پہنچنے کا تجسس بڑھتا ہی گیا۔ نتیجتاً خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم اس فن یعنی فن گداگری کے بارے میں بہت کچھ جان ہی گئے۔ یہ اور بات ہے کہ اب تک اسے آزمایا نہیں ہے۔ ہمارے ذاتی مشاہدات کی بنا پر اب ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ دراصل یہی وہ کامیاب فن ہے جس کے سیکھنے میں ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری۔ بس ذرا سی چہل قدمی یا کبھی تو کسی مناسب یا غیر مناسب جگہ پر نشست ہی کافی ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ہمارے ایک نواب ماموں مرحوم تھے۔ ان کے ہاں روز صبح سویرے ایک ہٹا کٹا مسٹنڈا فقیر، ایک ہاتھ میں مور کے پروں کی جھاڑو اور دوسرے ہاتھ میں جلتے ہوئے لوبان کی چمنی لیے "اللہ خیر کرے" کا نعرہ لگاتا آ دھمکتا تھا اور نواب ماموں کے سر سے پاؤں تک ان پروں سے جھاڑو پھیرتا ہوا دعائے خیر کہتا جاتا تھا۔ تب ماموں اُسے آنہ دو آنے دے دیا کرتے تھے جو اس زمانے میں خاصی بڑی رقم ہوا کرتی تھی کیونکہ روپیہ پیسہ بسیر ملا کرتی تھی۔ ایک دن ماموں مرحوم کو اسکی جوان شخصیت پر ترس آ ہی گیا۔ چنانچہ انھوں نے کچھ کارِ خیر کرنے کی خاطر اس فقیر کی اصلاح کرنے کی ٹھان لی۔ انھوں نے فقیر صاحب سے دریافت کیا کہ "میاں تم ماشاء اللہ ہٹے کٹے ہو کچھ بھلا سا کام کیوں نہیں کرتے" اس نے فوراً جواباً کہا "حضور یہی بھلا سا کام تو ہمارے آبا و اجداد کرتے آئے ہیں۔ اب آپ دوسرا کون سا کام ہم سے لینا چاہتے ہیں۔"

ماموں نے لاحول پڑھتے ہوئے کہا "اماں یہ بھی کوئی کام ہے۔ ہمارا مطلب ہے کہ محنت کرو۔ کچھ مشقت کرو اور پھر کمائی کھاؤ۔"

اس نے کہا " صاحب آپ سب بھولے لیکن ہمیں اپنے خاندانی پیشے سے خدارا دور کرنے کی کوشش مت کیجیے۔ اگر میں نے آپ جیسے ایرے غیروں کے کہنے سے اپنا آبائی کام ترک کر دیا تو خاندان والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ لوگ مجھے ذات برادری سے باہر نہیں نکال دیں گے؟"

ماموں .... نے دوبارہ لاحول پڑھی اور مشفقانہ انداز میں فرمایا:

"دیکھو تم اچھے بھلے آدمی ہو اگر چاہو تو میرے ہاں ہی نوکری کر لو، میں تمھیں معقول تنخواہ دوں گا۔"

چناں چہ ان دونوں میں بہت دیر تک بحث و تکرار جاری رہی اور بالآخر بڑی تگ و دو کے بعد وہ نوکری کرنے پر راضی ہو گیا۔ ماموں دل ہی دل میں پھولے نہیں سمائے کہ ان کی ذات نے وہ سماجی کام انجام دیا جو بڑی سے بڑی حکومتیں نہ کر پائیں لیکن ابھی ماموں پوری طرح پھولے سما بھی نہیں پائے تھے کہ اس نے پوچھا "اچھا تو نواب صاحب آپ ہمیں کتنی تنخواہ دیں گے؟" ماموں نے اس سستے زمانے میں بھی جوش میں آکر کہا "میں تمھیں ایکدم چالیس روپے ماہوار دوں گا اور رہائش کے لیے اپنی کوٹھی میں ایک کمرہ بھی دوں گا۔" اتنا سنتے ہی اس نے ماموں کو قہر بھری نظروں سے یوں دیکھا گویا ان پر لگاتا ہوں سے ملامت پھینک رہا ہو۔ بولا: "جاؤ صاحب جاؤ، اتنی تنخواہ تو میں اپنی بھینسیں چرانے والے کو دیتا ہوں۔" اور ماموں اس کا منہ اس وقت تک تکتے رہے جب تک کہ وہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

ہمارے ہاں روزانہ تین اور سوا تین بجے کے درمیان ایک جوان، تندرست عورت بازوؤں میں بچہ سنبھالے نہایت پابندی سے آکر گیٹ پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی وہ کھڑی ہوتی ہے اس کا بچہ پھوں پھوں کر کے رونے لگتا ہے اور بیوی ترس کھا کر اسے چار آٹھ آنے دے دیتی ہیں۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ہماری تجسس کی رگ پھڑکی اور ہم نے سوچا کہ یہ بچہ گیٹ پر آتے ہی کیوں روتا ہے۔ چنانچہ ایک دن ٹھیک تین بجے ہم دروازہ کی آڑ میں یوں کھڑے ہو گئے کہ گیٹ عین ہماری نظر کے سامنے تھی لیکن وہ مانگنے والی لاکھ کوششوں کے باوجود ہمیں دیکھ نہ سکتی تھی۔ چنانچہ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ جیسے ہی وہ کم بخت عورت گیٹ پر آئی اس نے ننھے بچے کو دبا کر ایک چٹکی توڑی اور ساتھ ہی وہ معصوم شیر خوار تلملا اٹھا۔ اور بیوی نے حسب معمول ترس کھا کر اسے خیرات دے دی ــــــ ایک صاحب کے ہاں ایک بار کھوٹا سکہ آ گیا انھوں نے اسے کارگر بنانے سڑک پر بیٹھے اندھے فقیر کے حوالے کر دیا۔ ابھی وہ پلٹے بھی نہ تھے کہ فقیر نے صدا لگائی "بابو جی یہ سکہ کھوٹا ہے۔ دوسرا دے دو۔" صاحب خیر نے کہا کہ "میاں تم تو اندھے ہو پھر تم نے کیسے جانا کہ یہ سکہ کھوٹا ہے" اس نے جواباً کہا کہ "حضور میں تو یہاں قائم مقام اندھا ہوں یہاں بیٹھنے والا دراصل وہ دوسرا اندھا ہے جو فی الوقت پکچر دیکھنے گیا ہے۔"....

جب ہم چہل قدمی کو جاتے تو دیکھتے کہ ایک جوان عورت بظاہر تندرست و توانا لیکن دوہری کمر ایسی کہ جیسے انگریزی ہندسہ 7 ہوتا ہے۔ ہاتھ میں لانبی سی لکڑی تھامے بھیک مانگتی رہتی تھی۔ اب جب کہ فقیروں نے پیسہ دو پیسے نہ لینے کی قسم کھالی ہے تو حکومت نے بھی ایسے سکے مجبوراً ڈھالنے

بند کر دیے۔ چناں چہ یہ عورت بھی عام بھک منگوں کی طرح اللہ کے نام پر روپیہ ہی مانگا کرتی تھی۔ ایک بار ہم کیا دیکھتے ہیں کہ چیف منسٹر صاحب کی سواری بس آنے کو تھی کہ وہی کبڑی عورت بیچوں بیچ سڑک پر آدھمکی۔ پولس جوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس ایک ڈنڈا اس کی دوہری کمر پر رسید کر دیا۔ اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ وہی چند ثانیوں پہلے والی کبڑی عورت ایک دم سے خطِ استوا کی طرح سیدھی کھڑی ہو گئی۔

تو یہ ہے صاحبان فن گداگری کے چند نمونے!

●●

غالب ثانی

(حیدرآباد)

غزل

پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب
جو کھیلوگے کودوگے ہوگے نواب

کھلاڑی ہیں دنیا میں چھائے ہوئے
پلیروں کا عالم پہ ہے رعب داب

جہاں جائیے اُن کی آؤ بھگت
ادارڈ اور شال اور دوشالے خطاب

ملے مرغ و ماہی اور عمدہ طعام
تُرنت اُن کو مل جائے اصلی شراب

ہوں گرویدہ فلموں کی ہیروئنیں بھی
اسی طرح رشتوں کے کھل جائیں باب

ملیں کاریں، اسکوٹریں بھینٹ میں
تو مال غنیمت ملے بے حساب

کھلاڑی وظیفہ بھی پاتے ہیں جلد
کریں جتنے دھندے وہ ہوں کامیاب

سیاست میں بھی وہ اڑائیں گے ٹانگ
جبیں اُن کی چمکے گی جوں آفتاب

کرادیں گے مفتوں میں فتنہ فساد
یہی کام ان کو ہے کار ثواب

پڑھے لکھے لوگوں کی مٹی پلید
جہاں میں تو اُن کا ہے خانہ خراب

ہجوم مصائب ہے اُن کا نصیب
رہے کیچوے کی طرح پیچ و تاب

وہ گھل گھل کے تحلیل ہوتے ہیں جلد
سدا سوکھ جاتے ہیں مثل کباب

جو اچھے ہیں رشتے نکل جائیں دور
کھلیں گے نہ سہرے کے اُن کے گلاب

نہ آئے گا نزدیک کوئی حسیں
کبھی اُن کے آگے نہ اُلٹے نقاب

عجب قہر اُن پر خدا کا یہ ہے
دعائیں بھی ان کی نہیں مستجاب

اِسے گورے پڑھتے ہیں اب شوق سے
رکھی طاق پر ہم نے اُم الکتاب

کئی انجمن ہیں خواتین کی
نہیں مردوں کی انجمن یک جناب

ہے عربی کا ایم اے یہ غالب حقیر
بہت علم کی اس نے پی ہے شراب

فرید سحر
(نرسا پور)
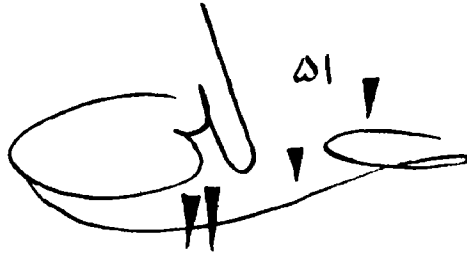
غم کو دل سے بھلا نہیں دیتے
اپنی ہسٹری بھلا نہیں دیتے

کام ہم سے وہ گھس کے لیتے ہیں
پھر بھی کوئی صلہ نہیں دیتے

اُٹھ کے جائیں گے ہم نہ محفل سے
شعر جب تک سُنا نہیں دیتے

نفع ہوتا ہے کیسے دھندے میں
ایسا دھندہ بتا نہیں دیتے

جھوٹ کہنے میں ہم تو ماہر ہیں
ہم کو لیڈر بنا نہیں دیتے

بات کرتے ہیں وہ کلوننگ کی
دل کو گردہ بنا نہیں دیتے

نیند تم کو سحرؔ نہ آئے گی
جام جب تک لنڈھا نہیں دیتے

ڈاکٹر ہادی منزّہ
(نرمل)

سر سے پاؤں تلک وہ چبھتی ہے
صاف ترشول کے مطابق ہے

شادی جو ہوگئی ہے چمرق سے
وہ میری بھول کے مطابق ہے

اپنی بیوی یا غیر کی بیگم
خار یا پھول کے مطابق ہے

اس کی باتیں پسند آتی نہیں
کرتا جو رول کے مطابق ہے

حکمرانوں کے سامنے جنتا
جوتوں کی دھول کے مطابق ہے

آنکھ میں ڈوبتا منزہ کی
سوئمنگ پول کے مطابق ہے

●

تپتا رہا جو پیار میں ہر دم بخار سے
آلو بخارہ مانگ رہا ہے وہ یار سے

لیلیٰ ہماری چین سے سوتی رہی اُدھر
بے چین ہم تڑپتے ہیں پتھر کی مار سے

یہ پوچھتی زمانے سے ہے ہیر آج کی
رانجھا لگا ہے یا کہ نہیں روزگار سے

ان کو جو ہچکی آخری آئی تو یوں لگا
پیچھا ہمارا چھوٹ گیا خونخوار سے

دے بیویاں کئی یہاں، حوریں کئی وہاں
مانگیں دعائیں شیخ جی پروردگار سے

اک بات باپ کی تو منزّہ سُنا نہیں
خوش ہو رہا ہے سُسرے کے جوتوں کی مار سے

★

ڈاکٹر میر گوہر علی خاں
(حیدرآباد)

نبیرہ اور نبیری

انسان تنوع پسند واقع ہوا ہے۔ ایک ہی جگہ رہنے سے اکتا جاتا ہے۔ ایک ہی نوعیت کا کام کرتے کرتے اسے بوریت ہوتی ہے۔ ایک ہی قسم کا کھانا کھانے پر اس کی بھوک مر جاتی ہے۔ لڑکپن میں کولھو کے بیل کی طرح روز مدرسہ جانا اور اسی راستے سے پھر گھر واپس آنا۔ اگر والدین نے سر پر پرائیوٹ ٹیوٹر کا بھوت چڑھا دیا ہے تو ان کی مغز پاشی سننا۔ بڑے ہونے پر ایک ہی قسم کی نوکری میں جٹ جانا اور تو اور یہ کیا غضب ہے کہ دل میں گدگدی ہونے پر والدین نے ایک عدد لڑکی سر منڈھ دی۔ من چاہے یا نہ چاہے اس کے ساتھ ساری زندگی گزار دینا . . . . یہ سب اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور ان سے فرار ممکن نہیں۔

ہر پرانی چیز کو اتار پھینکنا بڑے دل گردے کی بات ہے مگر اچھی تبدیلی پر ناک بھوں چڑھانا بھی کہاں کا انصاف ہے! اگر آدمی حوصلہ مند ہے تو تبدیلِ مقام کر سکتا ہے۔ ایک ملازمت چھوڑ کر دوسری کی تلاش میں نکل سکتا ہے۔ معاشی خوش حالی پر روز نئے نئے پکوان سے اپنا دسترخوان سجا سکتا ہے مگر ہمتِ مرداں رکھنے کے باوجود بھی بیوی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر ایک کے ہوتے ہوئے دوسری کو شریکِ حیات بنائے تو یہ "شریکۂ حیات" اس کا جینا دوبھر کر دیتی ہیں! . . . . بدقسمتی سے میں بھی تنوع پسند واقع ہوا ہوں مگر ادلا بدلی کی ہمت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر نصف بہتر نے چاہا تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں مشاق ہوں۔ میں نے جب ان سے ذکر کیا کہ شہر حیدرآباد میں نیا چڑیا گھر وجود میں آیا ہے اور یہاں کے جانوروں کے علاج کے لیے ایک ویٹرنری ڈاکٹر کی ضرورت ہے سرکار نے اس بارے میں ہماری رضامندی مانگی ہے تو ان کی رال کی جگہ پانی کی پیک ٹپکنے لگی۔ بولیں "یہ ملازمت آپ بدل ڈالیے اور اپنی رضامندی فوراً دے دیجیے۔ تعلقہ جات اور اضلاع کے دواخانوں کے چکر

لگاتے لگاتے اب ہم تھک گئے ہیں اور اب بچوں کی تعلیم بھی اچھی ہوسکے گی"۔ میں نے ان کے ہاں میں ہاں ملادی اور ایک عدد" راجی نامہ" محکمہ علاج حیوانات کے دفتر کے حوالے کردیا۔ناظم صاحب نے ڈھیر سی عرضیوں میں سے تین عرضیاں چن لیں اور ہمیں انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ جب ان کے اجلاس پر حاضر ہوا تو صرف اکیلا میں ہی تھا۔ باقی دو غائب، بعد میں پتہ چلا کہ ایک صاحب نے تو اپنی مرضی بدل ڈالی تھی اور دوسرے عثمانیہ دواخانہ میں آپریشن ٹیبل پر لیٹے اپنا ہرنیا کا آپریشن کروا رہے تھے۔

ہاں۔ تو میرے سامنے جمال عبدالناصر کے بھیس میں ناظم محکمہ علاج حیوانات تشریف فرما تھے اور ان کے سیدھے جانب نائب ناظم براجمان تھے۔ جب ناظم صاحب نے دریافت کیا کہ میرے چولا بدلنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ تو میں ان سے یہ تو نہیں کہہ سکا کہ:

"حضور والا" میں ہرن جیسی کالی کجلوٹی آنکھوں کا لڑکپن ہی سے دیوانہ ہوں۔ دوجہاں کہیں بی خاتون نظر آتی ہیں یا خواتین کے جمگھٹے سے میرا گزر ہوتا ہے تو میں ان کے حسین چہروں پر ہرنی جیسی بڑی بڑی کٹورہ جیسی آنکھوں کی تلاش میں ڈوب جاتا ہوں۔ جب کبھی ایک بھرے بھرے جسم کی حسینہ ہلکے بادامی رنگ کی سلک ساڑی میں، اپنے جسم کو لپیٹے ٹھمک ٹھمک کر چلتی نظر آتی ہے تو میری نظروں کے سامنے ایک صحت مند چمکتی رنگت لیے ہوئے "چیتل" گھوم جاتی ہے۔مغلائی پوشاک میں ملبوس چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک سرو قد دوشیزہ جب کسی باغ میں لہرا لہرا کر چلتی ہے تو اس پر مجھے زرراف کی مستانی چال کا شبہ ہوتا ہے۔ چوکڑیاں بھرتی ہوئی ہرن جب میری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہے تو کسی اولمپک ہیرو کا LONG JUMP یا POLL WALT کا ریکارڈ توڑنا بھی مجھے پھسپھسا لگتا ہے پپیہے کی کوک علی الصبح جب میرے کانوں میں رس گھولتی ہے تو اس کی رسیلی آواز کے سامنے دلودھ بھارتی سے نکلی ہوئی "لتاجی" کی تان بھی بے سری لگتی ہے۔ برسات کے بھیگے موسم اور ہرے بھرے مرغزاروں میں مور کا اپنے پر پھیلائے محو رقص ہوجانا۔ سرمئی رنگت، لیے سارس نر و مادہ کا اپنی لمبی سرخ گردنوں کو جھکاتے مستی میں چند ایک دوسرے کے اطراف والہانہ گھومنا مجھے ایسے نشے میں ڈبو دیتا ہے کہ اگر اس سمے وحیدہ رحمٰن سج دھج کر ٹھمک ناچتے ہوئے میرے سامنے سے گزر بھی جائے تب بھی لمحہ بھر کے لیے میری نظریں ان پرندوں کی جانب سے نہ ہٹیں۔ سفید کورے کا غذی رنگت لیے بگلوں کا جھنڈ۔ ہری دھن مرلیوں سے جب آسمان کی طرف اڑان لگاتا ہے تو میں ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔ جہاں کے نیلگوں آسمانوں کی معنی خیز خاموشی سکون و فرحت مجھے تھپک تھپک کر کچھ دیر کے لیے سلا دیتی ہے........"

یہ سب کچھ تو میں آپ سے کہہ نہ سکا۔ بس صرف اس پر اکتفا کی" صاحب مجھے بچپن ہی سے جنگلی جانوروں اور پرندوں سے عشق ہے"۔ یہ جادو ان کے سر چڑھ کر بولا" جاؤ۔ تمہارا انتخاب ہوگیا ہے۔ پر ہاں کبھی کبھار مجھ سے ملتے رہنا۔ شروع شروع میں تمہیں کافی مشکلات پیش آئیں گی"۔ اپنے محکمہ کے افسر اعلیٰ کے ان جملوں نے ہمت بندھائی اور میں نے ان جنگلی جانوروں کی صحت و عافیت کے لیے اپنی کمر کس لی۔

جس آسانی اور بھروسہ کے ساتھ میں پالتو جانوروں کا علاج کیا کرتا تھا اس کے برخلاف زو کے جانوروں کے علاج معالجہ میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک سینگ والے گینڈے کا پھولنا ہوکہ "لاما" کے مردہ بچے کو اس کی ماں کے رحم سے باہر کھینچ لانا۔ یہ سب کام کافی وقت طلب تھے۔ بے حساب توانائی اور بے حساب وقت صرف ہوتا تھا۔ آپ ذرا سوچئے کہ میرا — Emer-GENCY KIT بہتر سے بہتر دواؤں سے بھرا پڑا ہے۔ مگر جب تک کہ شیر صاحب شکنجے والے پنجرے SQUEEZE CAGE میں، آ نہیں جاتے مجھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا پڑتا ہے۔ ایک سالہ زیبرا اپنا پیر توڑ لیتا ہے۔ اس کے علاج کے لیے اس کو قابو میں لانا ناگزیر ہو جاتا ہے مگر دل نہیں مانتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پکڑ دھکڑ میں وہ اپنا دوسرا صحت مند پیر بھی نہ توڑ لے۔ "ہرن" کی بیماری کی تشخیص کے لیے اس کو پکڑ کر اس کی وریدسے چند خون کے قطرے لینے بھی نہیں پاتا ہوں کہ وہ ڈر اور خوف کے مارے میرے ہی ہاتھ میں دم توڑ دیتا ہے۔ صبح کے Rounds میں ایک قیمتی بندریا چھت سے لگے شہتیر پر بیٹھی کھوں کھوں کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کھانسی ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس کو "عرش" سے "فرش" پر لانے کے کئی جتن کیے مگر بے سود۔ آخر کار ایک لمبی لکڑی لے کر اس کے ایک ہلکی سی چپت لگائی۔ بس کیا تھا۔ دھم سے فرش پر گر پڑی اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ پوسٹ مارٹم کرنے پر پتہ چلا کہ کہنہ ٹی بی کی وجہ سے اس کے دونوں شش بے حد متاثر ہو چکے تھے۔ بھلا آدمی ہو کہ کتا بلی۔ کہیں ایک ہی دن کی کھانسی میں اپنے پھیپھڑے ایسے تباہ کر لیتا ہے کہ اس کی نجات کے لیے حضرت عزرائیل علیہ السلام کو دعوت دینا پڑے۔ ایک ببر کے بچے کو لنگڑا کر چلنے کی اطلاع ملتی ہے مگر جب اس کے تفصیلی معائنہ کی خاطر اس کو قابو میں لا کر اس کا معائنہ کرتا ہوں تو اس کے دل کی دھڑکن غائب ہو جاتی ہے۔ یہ گوشت کا لوتھڑا جو ہر دم لب۔ ڈب۔ لب۔ ڈب کرتے سینے میں پڑا رہتا ہے۔ اچانک ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔ کسی جانور کو اس کے علاج کے لیے قابو میں لانا کیا جرم ہے؟

اس سال بارش کے موسم نے کچھ ایسی تباہی مچائی کہ مختلف بیماریاں چڑیا گھر میں عود کر آئیں۔ سب سے بڑا مسئلہ کینگرو نے کھڑا کر دیا۔ براعظم آسٹریلیا کا قومی جانور ہونے کے ناطے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ زو کے شائقین اس کی اچھل کود سے بہت محظوظ ہوتے ہیں ایک دن اچانک کینگرو کے مزاج ناساز ہو گئے۔ نہ کھانا اور نہ پانی۔ اچھل کود تقریباً مفقود تھی۔ اکثر لیٹے لیٹے ہی سانس لیتے رہتے۔ چڑیا گھر کا افتتاح ہوئے چند ہی ہفتے گزرے تھے ہم اس حادثہ سے دوچار ہوئے۔ چڑیا گھر کے ناظم سے لے کر زو کیپر تک سب کے چہرے لٹک گئے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا میں کرتا رہا مگر اوپر سے حکم آیا کہ وٹرنری ریسرچ آفیسر سے مدد لی جائے۔ وہ بلائے گئے۔ انھوں نے کینگرو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ خون۔ اجابت وغیرہ کے معائنے کیے گئے۔ کینگرو کی چھاتی پر اسٹیتھسکوپ رکھتے رکھتے گول گول حلقے ابھر آئے۔ بڑھیا قسم کے ANTIBIOTICS اور دوسری جان بچانے والی دوائیں

دی گئی مگر باوجود ہماری محنت شاقہ کے ہم انھیں بچا نہ سکے۔ اس اہم جانور کے گزر جانے سے ناظم زو بڑے برافروختہ ہوئے۔ ناظم علاج حیوانات کو اس منحوس خبر سے باخبر کرنے جب انھوں نے فون ملایا تو ادھر سے جواب ملا: "صاحب بیرونِ ہند کے دورے پر تشریف لے گئے ہیں۔ کل صبح واپس ہو رہے ہیں۔"

مجھے اور کیوریٹر کو لیے، چڑیا گھر کے ناظم صبح صبح دوسرے دن ایرپورٹ پہنچے۔ ہوائی جہاز سے اتر کر جب ناظم علاج حیوانات ہمارے قریب آئے تو ہم سے علیک سلیک ہوئی۔ بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے ان کی اچھی پذیرائی کی ہے لیکن راستہ میں جب ناظم زو نے ساری روئیداد ان کے گوش گذار کی تو مجھ پر برہم ہو گئے۔

"اس کی موت کی وجہ؟"

"وائرل نمونیا VIRAL PNEUMONIA"

غصہ سے لال پیلے ہو گئے۔ "تمھیں کیسے معلوم؟"

"ریسرچ آفیسر نے کہا ہے اور انھوں ہی نے اس کا پوسٹ مارٹم بھی کیا ہے۔"

مجھے اس وقت میرے "عبدالجمال ناصر" یاد آ گئے۔ کس پیار سے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں وقتاً فوقتاً ان سے ملتا رہوں۔ نہ وہ ہوائی جہاز سے سنگاپور جاتے اور نہ حادثہ میں جاں بحق ہوتے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ پورٹیکو میں گاڑی رک گئی۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر وہ تینوں تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلے گئے۔

دوسرے دن چیف کنزرویٹر آف فاریسٹ کے چیمبر میں ایک میٹنگ ہوئی۔ محکمۂ جنگلات کے بڑے افسران محکمۂ علاج حیوانات کے ناظم ریسرچ آفیسر اور ہم سب جمع ہوئے۔ بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی بحث ہوئی۔ جنگلی جانوروں کی بیماریوں پر کم اور پالتو جانوروں کے بارے میں زیادہ۔ کینگرو کے علاج میں جو ریسرچ آفیسر زو آیا کرتے تھے وہ پیش پیش تھے اور سب سے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ آخر میں گیند انھوں نے محکمہ جنگلات کے کورٹ میں بڑی دانشمندی سے پھینکی۔ کہنے لگے۔

"آدمی ہو کہ جانور جب نقل مقام کرتا ہے تو تبدیلیٔ آب و ہوا۔ رہن سہن غذا وغیرہ کی وجہ سے اس کی صحت پر مضر اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ زو کے عہدہ داروں کو ان سب باتوں کا بے حد خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کے آسٹریلین کینگرو اس زبردست بارش میں بھیگتے ہی رہے۔ ان کے رہنے کو محفوظ گھر NIGHT HOUSES نہیں ہیں۔ بس ایک کھلا میدان ہے اور کونے میں اسبسطاس کا ایک شیڈ۔ ایسے ماحول میں اسے وائرل نمونیا ہونا ہی تھا۔ اب دوسرے کینگرو کو بچانے کی فکر کیجیے۔"

دو قسم کے بسکٹ اور ایک کپ چائے کے بعد میٹنگ ختم ہوئی۔

اتفاقاً ریسرچ آفیسر اور میں ایک ہی جیپ میں واپس ہوئے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کیوں

میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

"مگر نذر یہ کینگرو کا جوڑا راست آسٹریلیا سے نہیں بلکہ علی پور چڑیا گھر۔ کلکتہ سے منگوایا گیا ہے۔ وہاں زمانۂ دراز سے کینگرو کے کئی اقسام ہندوستانی آب و ہوا، رہن سہن، غذا وغیرہ کے عادی اور مانوس ہو چکے ہیں اور لگا تار اپنی آبادی میں اضافہ کرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ نہرو چڑیا گھر حیدرآباد میں جو کینگرو ہیں وہ ان ہی کے نبیرہ اور نبیری ہیں۔"

پتہ نہیں میری یہ بات ان کے کانوں تک پہنچی یا نہیں۔ کیونکہ جیپ گاڑی بڑی تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۳۱ ——— نومبر ۱۹۹۸ء ——— شمارہ ۱۱

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار

قیمت فی پرچہ: ۱۲ روپے
زرِ سالانہ: ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

۱۳۱ء بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱ فون (آفس) 595711 (رہائش) - 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

سارے جہاں سے اچھا
ہندوستاں ہمارا

یوم آزادی مُبارک

ظریف لکھنوی (مرحوم)

شعر گوئی سے کبھی تم نہ ہراساں ہونا
ساتھ مشکل کے اگر آئے نہ آساں ہونا

قہر ہے جا کے پلٹنا نہ مرے نالوں کا
دونوں کانوں کا ترے بھول بھلیاں ہونا

خانساماں کئی صاحب کے گئے لینے مول
سن کے ان کے لب خنداں کا نمکداں ہونا

وہ منڈائے ہوئے سر وصل میں آنا ان کا
مختصر قصہ طول شب ہجراں ہونا

جا کے چپکے سے رقیبوں کی پکڑ لینا ٹانگ
کبھی دیوانہ جو تو اے سگ جاناں ہونا

وہ مجھے خواہش وصل ان سے یہ تخئیل جدید
وہ یہ تخئیل قدیم ان کا گریزاں ہونا

آئینہ خانے میں اب ایک نیا عالم ہے
آپ ہی آپ ہیں اور آپ کا عریاں ہونا

در و دیوار یہ کیوں کانپ رہے ہیں تھر تھر
کیا مرے گھر میں گھس آیا ہے بیاباں ہونا

غالب و میر کے پیرو جو ہیں اردو میں ظریف
ان کو اس عرس میں لازم ہے غزلخواں ہونا

سوچنے کی بات

(مستزاد)

شادؔ عارفی

رخنہ کارِ امنِ عالم جو بھی ہو بدذات ہے
لیکن اتنی بات ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے
سوچنے کی بات ہے

اُس طرف گلگوں شرابِ ناب کی برسات ہے
محوِ احسانات ہے
اِس طرف توپوں کے امریکن خدا کا ہات ہے
سوچنے کی بات ہے

اپنی من مانی پہ طاقت سے لیا جاتا ہے کام
فیصلے سب ناتمام
صاف یو۔این۔او کا دھندا اک سیاسی گھات ہے
سوچنے کی بات ہے

سیکڑوں من گندم بے دام پاکستان کو
مصر کو ایران کو
وہ عطیہ کہہ کے خوش ہولیں مگر خیرات ہے
سوچنے کی بات ہے

اب سمجھ میں آ رہی ہے دشمنوں کی واہیات
کوئی فقرہ کوئی بات
کوبکو مشہور احمق جانور کی لات ہے
سوچنے کی بات ہے

اب نہ چمکا پاؤ گے ذہنوں میں جھوٹے آفتاب
ہے یہ سیدھا سا حساب
دن بتاؤ گے جسے تم ہم کہیں گے رات ہے
سوچنے کی بات ہے

مدرسوں میں پیٹتے پھرتے ہو شخصیت کے ڈھول
کیوں بنا رکھی ہے بول
شیخ صاحب آپ کی کیا ذات کیا اوقات ہے
سوچنے کی بات ہے

شادؔ ہجر و وصل تک محدود تھی فکر و نظر
اک زمانہ تھا مگر
آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے
سوچنے کی بات ہے

اودھ پنچ کی ایک غزل

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

اک مہینے سے چپکے بیٹھے ہیں
واہ کیا واقعہ نگاری ہے

بیٹھے کوئی نہ آ کے دفتر میں
نادری حکم اب یہ جاری ہے

کیا کریں اب بے چارے اپرنٹس
رات دن شغل آہ و زاری ہے

مارے تخفیف اور ٹیکس کے نیچ
رو چکے سب ہماری باری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے

مفت کا مال کرتی ہے تحصیل
بس یہی اک وفا شعاری ہے

تھوڑے تھوڑے یہ اذنٹ کی چوری
واہ کیا خوب پردہ داری ہے

(اودھ پنچ ۱۹۱۶ء)

نمک پارے

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنیڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا — اکبر

مریض ہے کہ خمیرا اُٹھ چکا ہے چائے کا
طبیب ہیں کہ خمیرے چٹائے جاتے ہیں
ادب نوازی اہل ادب کو کیا کہیے
شاعروں میں اب احمق بلائے جاتے ہیں — احمق

جاگنے والے واہ کیا کہنا
سونے والے کو کچھ خبر نہ ہوئی — نامعلوم

خوش ہو رہا ہوں مسجد ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے — ״

میرے جینے کا طور کچھ بھی نہیں
سانس چڑھتی ہے اور کچھ بھی نہیں — نوح ناروی

آپ ہیں آپ، آپ سب کچھ ہیں
اور میں اور، اور کچھ بھی نہیں — پیروڈی

ان حسینوں نے اجاڑیں بستیاں
بوم تم سالا مفت میں بدنام ہے — بوم میرٹھی

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا — اقبال
کچھ بھی نہیں ہمارا، وہم و گماں ہمارا — پیروڈی

میخانے میں کیوں یاد خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکر مے و مینا نہیں ہوتا — ریاض

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ میں ملا ہو غازی — اقبال

شنکر پُن تامبیکر
ہندی سے ترجمہ: ف م سلیم

میرے شہر کی گنیز بک

میری بڑی آرزو ہے کہ گنیز بک میں میرا نام آئے۔ لیکن اس کے لیے مجھے اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پسند نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسا کوئی معجزانہ کام کروں جو اوروں نے نہ کیا ہو۔ میں ناخن بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مجھے کچھ نہیں کرنا تھا۔ ناخن تراش کو کوڑے دان میں پھینکنا باقی تھا۔ دماغ پاشی میں ہزار دقتیں ہیں۔ ناخن بڑھانے میں کوئی دقت نہیں۔ آدمی چاہے کتنا ہی دماغ پاشی کر لے اس کا نام گنیز بک میں نہیں آسکتا ہے لیکن ناخن بڑھانے والے کا نام آسکتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے ناخن بڑھانے شروع کیے لیکن کسی نے مجھے بتلایا کہ

بڑے ناخنوں کا گنیز بک میں ذکر ہو چکا ہے۔ اب وہ ریکارڈ توڑنے کی کوشش بیکار ہے اس لیے میں اس پاگل پن سے باز آیا۔

دن رات میرے ذہن پر یہی بھوت سوار رہتا کہ کون سا ریکارڈ قائم کروں کہ میرے لیے گنیز بک کا دروازہ کھل جائے۔ سوچا کچھ ایسی چیز کھاؤں جو کسی نے نہ کھائی ہو۔ بلیڈ اور طشتری تو لوگ پہلے ہی کھا چکے تھے۔ میں روٹی کے علاوہ اب تک غم اور گالی ہی کھاتا رہا ہوں۔ پیسے کھانے کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں پیسے کھانے کو بہت بُرا کام سمجھتا ہوں۔ ایک اور طرح کا کھانا میں جانتا تھا۔ سر کھانا، سر کھانے کے نتیجے میں مجھے ایسی منہ کی کھانی پڑی کہ میں اب تک بھگت رہا ہوں۔ اس لیے میں نے کچھ ایسا ویسا کھانے کی بات چھوڑ دی۔

اب سوچا مونچھ بڑھاؤں۔ میں مکھی جیسی مونچھ رکھتا تھا۔ طے کیا کہ مونچھ کو سانپ کی طرح دونوں طرف بڑھنے دوں۔ مکھی مہذب ہوتی ہے اور سانپ جنگلی۔ چنانچہ مونچھ کاٹنے لگے تو مہذب پھنے گئے۔ بنا کاٹے جنگلی رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بات بننے دینے سے پہلے کاٹنے والا بہت آگے نکل جاتا

ہے۔ جو کاٹ سکتا ہے وہ زندگی ہنستے ہوئے کاٹتا ہے جو نہیں کاٹ سکتا وہ زندگی روتے ہوئے کاٹتا ہے اسی لیے بونے والا صرف کسان کہلاتا ہے اور کاٹنے والا مہاجن۔ میں نے مونچھ بڑھائے تو ان کا حشر بھی وہی ہوا، جو ناخنوں کا ہوا۔ پتہ چلا کہ مونچھ بھی گنیز بک میں پہنچ چکی ہے۔

آخر سوچتے سوچتے میں نے سوچا کہ نہ نہانے کا ریکارڈ "بریک" کروں۔ سو دن لگاتار نہ نہاؤں۔ ویسے بھی روز نہانا مجھے غیر ضروری کام لگتا ہے۔ سردی میں نہانے کا تو کوئی "تک" ہی نہیں۔ لیکن میرے نہ نہانے کی بات پر گھر کے لوگوں نے ہو ہلہ شروع کیا۔ خاص کر بیوی اپنی ناک دبا کر بولی، باپ رے باپ! سو دن نہیں نہاؤ گے! چھی!"

میں بڑے پس و پیش میں ہوں۔ اگر گنیز بک میں بیٹھتا ہوں تو بیوی کے دل سے اتر جاتا ہوں۔ اسی پس و پیش میں ایک دن کسی نے مجھے بتایا کہ گنیز بک تو ہمارے شہر کی بھی لکھی جاتی ہے سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ دیکھوں تو میرے شہر کے لوگوں نے کیا کیا پاگل پن کر دکھائے ہیں تاکہ مجھے بھی کوئی راستہ ملے۔ یہ گنیز بک میونسپل کارپوریشن میں تھی۔ میں وہاں پہنچا۔ اس کی ایک کاپی "عوام" کے لیے رکھی گئی تھی جو دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک "ہٹ بھری" اور ایک "چٹ بھری"۔

مجھے ہٹ بھری" یعنی خطروں والی، گنیز بک سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ جب خودکشی کی سوچوں گا تو اس طرف خیال کروں گا۔ میں چٹ بھری، یعنی بے وقوف بنا کر گنیز میں گھسنے والوں کی ایک میں "انڈرسٹیڈ" تھا۔ اسی لیے اسی کو اٹھایا۔ جب میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا تو مجھے تعجب ہوا کہ میرے شہر میں کیسے کیسے عجیب و غریب لوگ رہتے ہیں کچھ نمونے یہاں پیش ہیں۔ ایک شخص ایسا ہے جس نے نیچے سے لے کر اوپر تک کوئی امتحان نہیں دیا جو بغیر نقل کامیاب کیا ہو۔ اب ایک اعلیٰ درجہ کا ایجوکیشنل سنٹر چلا رہا تھا۔

شہر کا ایک دودھ فیڈریشن۔ اس میں بھینس سے دودھ دوہنے والے ایسے مزدور ہیں جو دودھ کا مزہ برسوں سے نہیں جانتے۔ ساہتیہ اکادمی سے اعزاز حاصل کرنے والا ایک ادیب جس نے کبھی اپنی ذاتی تخلیق نہیں پیش کی۔ ہمیشہ غیر ملکی کتابوں سے چرا کر ہی لکھا۔

ایک شخص جو "اٹلس" دیکھنا نہیں جانتا لیکن اس نے دنیا کی تین بار سیر کی۔

ایک اونچا گھرانا جس کا کرتا دھرتا "ابجد" سے ناواقف لیکن کئی فلاحی اور تعلیمی اداروں کا صدر رہے۔

شہر کی جانی مانی ہاکی ٹیم جس نے پچھلے دس سالوں میں کمزور سے کمزور ٹیم سے ہار کر ایک الگ قسم کا رکارڈ قائم کیا ہے۔

ایک سرکاری ملازم جس نے دھیمی رفتار سے کام کرنے کے لیے "۱۹۸۹ء" کا "بسٹ ایوارڈ" حاصل کیا ہے۔ ایک آشرم کے مہاتما اتنے مہان کہ جن کے پیروں کے دھول پاکر لوگ اپنا جیون کامیاب سمجھتے ہیں جبکہ خود مہاتما کو "دھول" سے "الرجی" ہے، وہ موزے پہنے رہتے ہیں ایک اونچا خاندان جس نے

سب سے زیادہ بہوئیں جلانے اور اتنی ہی تعداد میں زیادہ سے زیادہ جہیز کے ساتھ بہوئیں بیاہ لانے کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

ایک لیڈر جس نے اپنے دورِ وزارت میں سب سے زیادہ کتابوں کی رسمِ اجرا انجام دینے کا ریکارڈ قائم کیا۔ لیکن کسی کتاب سے ایک ورق بھی نہ پڑھنے کی اپنی قسم نہیں توڑی۔ شہر کے طالبِ علم جو فلمی ہیرو اور ہیروئنوں کو ان کی تاریخِ پیدائش کے ساتھ جانتے ہیں جبکہ اشوک، اکبر، رانا پرتاپ، شیواجی، جھانسی کی رانی وغیرہ کے نام سے واقف ہیں۔ ان کے کوائف سے ناواقف ہیں۔ ایک شخص دو بار بیمار رہا۔ ہر بار سرکاری دواخانہ میں بھرتی رہا۔ اور ہر بار وہ زندہ گھر لوٹا۔

بجلی گھر کا چیف انجینئر جس کے تین سالہ دورِ ملازمت میں ریکارڈ بجلی فیل۔ ایک ٹیچر جس کو حکومت نے "۱۹۸۹ء" کا بسٹ ٹیچر ایوارڈ دیا جبکہ وہ اس سال ریکارڈ چھٹی پر تھا۔ خواتین کو مردوں سے آزادی دلانے میں جدوجہد کرنے والی ایک خاتون، جس نے ۱۹۸۹ء میں سال کے پورے ۳۶۵ دن اپنے شوہر سے کھانا بنوایا۔ ایک خاتون جس نے ساڑیوں پر سب سے زیادہ رقم خرچ کی اور باتھ روم میں بہت کم وقت برباد کیا۔

شہر کی گنیز بک میں ابھی پڑھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ یہ مجھے کسی پاگل خانہ کا راستہ ضرور دکھائے گی۔

●●

گیان چند

[لاس اینجلس (امریکہ) میں ۳۱ جولائی ۱۹۹۸ء کو مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا جسے زندہ دلان حیدرآباد نے لوٹ لیا۔ میں نے صدارت کی اور اس کا جواز فراہم کرنے کیلئے ذیل کی دو نظمیں سنائیں جو اسی ہفتے اس مشاعرے کے لئے لکھی تھیں]

خوش اخلاقی

لکھنؤ، شہر تکلف واہ وا
وہ نفاست اور نزاکت کا نگر
سرسری بھی دیکھیے اس کو اگر
دل کو مانگے اس کی ہر شیریں ادا
ایک بیگم نوبہارِ حسن رہتی تھیں وہاں
کھیل کے شوقین تھے ان کے میاں
کیوں نہ ہو، دونوں تھے آخر نوجواں
پاؤں بھاری ہوگیا بیگم کا، سو ہونا ہی تھا
کھیل میں ہوتا ہے سب کے ساتھ ایسا حادثہ
حادثہ! حضرت یہ موقع ہے مبارک باد کا شہنائی کا
دیکھتے ہی دیکھتے نو ماہ پورے ہوگئے
پھر بھی سب کے خواب ادھورے رہ گئے
ہوچکا تھا امتحاں لیکن نتیجہ لاپتا
آگے کو پھولا ہوا ان کا شکم
دل میں ان کے دم بہ دم کچھ خوف و غم
وقت تیزی سے گزرتا ہی رہا
ایک دو سات آٹھ دس بارہ برس
سب کو بچے کی ہوس
تھی بہت تشویش لیکن کیا کریں
مرضیِ مولا کے آگے آدمی مجبور ہے
دلی اب بھی دور ہے
کشمکش میں ہوگئے پچپن برس
صبر کا پیمانہ بس
ہوگئی اب سب کو تشویش شدید
نام آنے کا نہیں لیتا ہے کیوں روزِ سعید
ایسے جناتی حمل کو کیا ہوا
پیٹ میں ڈیرہ کئے ہے کون سی کالی بلا؟
آخرش لے کر دوا خانے گئے
دل کی بے چینی کو بہلانے گئے
ڈاکٹر اور نرس سب حیراں ہوئے
سب نے باہم مشورے سے طے کیا
آپریشن کرکے دیکھیں پیٹ کے اندر ہے کیا
بھید کھلنے کا مہورت آگیا
چاک کرکے رحم کو دیکھا انوکھا ماجرا
لکھنؤ شہرِ نفاست مرحبا
مونچھ داڑھی والے دو بیٹھے ہوئے ہیں روبرو
ہاتھ آگے کو بڑھا کر یوں ہیں گرم گفتگو
"میر صاحب! پہلے آپ"
"جی نہیں نواب صاحب! پہلے آپ"
"عرض کرتا ہوں برادر پہلے آپ"
"بھائی جان! ایسا نہ کہیے، پہلے آپ"
"کیجئے بسم اللہ، چلئے پہلے آپ"
"پہلے آپ"
لکھنؤ، آداب اور اخلاق کا شہر حسیں
ہے نزاکت اور نفاست کا امیں
یاد آتی ہے مجھے وہ سرزمیں

۱۵

کمالِ فن

قدرت کا حسن دیکھنا منظور ہو اگر: ہے دل فریب چادرِ آبِ نیاگرا
گر ڈھونڈتے ہیں صنعتِ انساں کا شاہکار: تو دیکھئے گا تاج محل جاکے آگرہ
گر حسنِ فن کا شوق ہو امریکہ گھومیے: لیکن حضور جیب میں لے کر ویاگرا[1]

[1] قوت باہ بڑھانے کی طلسماتی گولیاں جو پورے امریکہ پر طوفان کی طرح چھا گئی ہیں، جن کے پیچھے ہر جوان اور بوڑھا دوڑ رہا ہے۔

پرویز یداللہ مہدی
(شارجہ)

رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

ایک زمانہ تھا جب دکن کی خواتین میں یہ بددعا بڑی مقبول تھی کہ خدا کرے فلاں کی آل اولاد بڑی ہوکر چور، ڈاکو اور خونی نکلے ___ لیکن پچھلے کچھ عرصہ سے یہ بددعا زیادہ سننے میں آرہی ہے کہ خدا کرے فلاں کی آل اولاد بڑی ہوکر اردو کی ادیب یا شاعر نکلے۔ پتہ نہیں کس غلطی کی پاداش میں ہمارے والدین کو کسی دل جلے نے اس بددعا سے نواز دیا جس کے اثار سے کی خاطر بے چارے والدین نے تعویذ فلیتے، ٹونے ٹوٹکے سارے جتن کر ڈالے کہ ہم اس بددعا سے محفوظ رہیں اور کم از کم اردو کے ادیب یا شاعر ہرگز نہ بنیں، لیکن یہ حادثہ تو روزِ ازل ہی ہماری تقدیر میں لکھا جا چکا تھا اور تقدیر کے لکھے کو مٹانے کا کوئی ربر آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ لہذا ہماری تقدیر کے لکھے کو پہلے تو والدین پڑھتے رہے اور اب ہم پڑھ رہے ہیں!

کہتے ہیں پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ بس دیکھنے والی نظر چاہیے جبکہ ہم تو پالنے میں پڑے پڑے پاؤں کے علاوہ ذہانت کے دو چار نمونے بھی اپنی مختلف حرکات و سکنات کے توسط سے دکھلا چکے تھے۔ یہاں صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ بقول چند مستند راویانِ خاندان کے، نوعمری میں ہم ہمیشہ نرم گرم گود وں میں ہمکتے مچلتے، اچھلتے رہتے تھے گویا:

میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

کے مصداق ہماری ذہنیت لڑکپن ہی سے حریمانہ اور مزاج عاشقانہ تھا۔ آگے کا حال یہ ہے کہ سن شعور کو پہنچتے پہنچتے ہم نے نہایت باقاعدگی کے ساتھ مشتبہ اور مشکوک قسم کے اصحاب میں بیٹھنا اٹھنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ کسی کی بددعا کا اثر پوری طرح رنگ لاکر رہا اور اہالیانِ محلہ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف بلکہ نقطہ بہ نقطہ درست ثابت ہوئی کہ ہم زندگی

کے کسی نہ کسی حصے میں شاعری ضرور کریں گے چاہے بے بحر ادبے وزن ہی کیوں نہ ہو اور وقت سے پہلے علامہ کہلائیں گے ۔ لہٰذا میں بھیگتے ہی ہم نے اپنی زندگی کا پہلا ناموزوں شعر موزوں فرما دیا اور آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ آیا اس وقت ہماری مسیں زیادہ بھیگی ہوئی تھیں یا وہ شعر ——— بہر حال وہ چونکہ ہماری پہلی کوشش تھی اس لیے ہم، گل سے بلبل کے پر تو نہیں باندھ سکے ہاں چھوٹی موٹی ڈوروں سے پتھر یعنی "لنڈور" باندھ دیا اور بڑی شان سے لنڈورے یعنی معہ لنڈور کے پھرنے لگے اور اپنی جگہ یہ سوچ کر مطمئن اور خوش بھی تھے کہ بہر مبتدی شعرا تو لنڈور بھی نہیں باندھ سکتے بلکہ مصرعوں کے اوزان کے سلسلے میں اس حد تک گڑ بڑ کر جاتے ہیں کہ مصرعۂ اولیٰ میں بنیے کی طرح ڈنڈی مارتے ہیں تو مصرعہ ثانی میں حاتم کی قبر پر لات مار کر پلڑے کو سجدہ ریز کر دیتے ہیں ۔ نتیجتاً جو شعر جنم لیتا ہے وہ کچھ ایسا ہوتا ہے:

حیدر آباد سے بمبئی تلک

لمبی سڑک

ہم چونکہ ایسے شاعروں کے زمرے میں آتے ہیں جو کسی کی بددعا اور آہ کے نتیجے میں شاعر بن جاتے ہیں ۔ لہٰذا اس قماش کے شاعران شاعروں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں جن کی قسمت میں صرف شاعر بننا لکھا ہوتا ہے جو شاعری کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے ۔ سوائے ماموں کی بکریاں چرانے کے ——— نتیجتاً لوگ باگ ہمیں دور ہی سے دیکھ کر خدا کو حاضر و ناظر جان کر سمجھ جاتے ہیں کہ ہم شاعر ہیں سرتاپا شاعر، شاعر کے علاوہ کچھ بھی نہیں ۔ اس کے علاوہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی جیسے ہماری سرشت میں شامل تھی چنانچہ پاک صاف رہنے نہانے دھونے سے حتی الممکنہ احتراز کیا کرتے تھے تا آنکہ بالجبر، نہلائے دھلائے نہ جائیں غالباً اسی بنا پر بیشتر اہلیانِ بستی نے ہمارے شاعر ہونے کی قبل از وقت پیش گوئی کر دی تھی ۔

اس سے پہلے کہ ہم ناموزوں اشعار کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دیتے ، ایک کرم فرما نے مشورہ دیا کہ اپنے آپ کو شاعر تو کوئی بھی کہلوا سکتا ہے بلکہ وہ بھی کہلوا سکتا ہے جسے ناموزوں شعر بھی موزوں کرنا نہ آتا ہو لیکن جہاں تک اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے منوانے کا تعلق ہے تو اس کے لیے کسی نہ کسی "جغادری شاعر" کے آگے دو زانو ہونا لازمی ہے بالفاظ دیگر زانوئے ادب تہہ کرنا ضروری ہے کیونکہ بغیر استاد کا شعر ایسا ہی ہے جیسے بغیر ڈور کی پتنگ، بغیر نشے کی بھنگ اور بغیر کمانڈر کی جنگ ——— ظاہر ہے بغیر ڈور کی پتنگ اڑ نہیں سکتی، جس میں نشہ نہ ہو وہ بھنگ چڑھ نہیں سکتی اور جس جنگ کا کوئی کمانڈر نہ ہو وہ جیتی نہیں جا سکتی لہٰذا کسی نہ کسی کو استاد مان کر گنڈا، بندھوانا ضروری تھا ۔ چنانچہ مرتا کیا نہ کرتا، بحالتِ مجبوری ہم نے استاد کی تلاش شروع کر دی ۔

[illegible]

جس کی ہمیں تلاش ہے وہ تو بغل ہی میں موجود ہے گویا بچہ بلکہ بچہ ثقہ، بغل میں تھا اور ہم خواہ مخواہ شہر بھر میں ڈھنڈورا پیٹ آتے ۔ اس سے پہلے کہ شہر بھر کے پیشہ ور قسم کے استادان شعر وسخن اپنے اپنے ہتھیاروں عرف دواوین سمیت ہم پر دھاوا بول دیتے، ہم نے اپنے قریب ترین پڑوسی اور طوطیٔ شعر وسخن بلکہ طوطائے شعر وسخن، حضرت علامہ جھٹ پٹ، جھٹ خفا نگری کا دامن جھٹ پٹ تھام لیا۔ علامہ کو اس شرف سے محروم رکھنے کا مطلب تھا پڑوسی کا دل دکھانا اور قہر خداوندی کو دعوت دینا۔ لہٰذا فوراً گنڈا بندھوا کر علامہ کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

علامہ جھٹ پٹ خفا نگری کی جیتی شخصیت، کسی زمانے میں واقعی بڑی قدآور اور شاندار رہی ہوگی لیکن شاعری کی دیمک کا خدا بھلا کرے، اس نے علامہ کی اچھی بھلی تندرست و توانا شخصیت کو اس حال کو پہنچا دیا کہ اب اسے شخصیت کے بجائے شخصیت کا "پس خوردہ" ہی کہا جا سکتا ہے اور ہم نے ان کی اس پس خوردہ شخصیت ہی کو غنیمت جانا۔ ویسے علامہ کی یہ بچی کچی شخصیت کم از کم گلی محلے کے لوگوں کے لیے قطعی محتاج تعارف نہیں ہے۔ اب بھی علامہ کی صدارت میں دولھے خاں کی ڈیوڑھی اور نانا میاں کی چاوڑی میں آئے دن کل ہند قسم کے خالص مقامی مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں اطراف واکناف کی گلیوں کوچوں میں سکونت پذیر تقریباً تمام غیر معروف شعرائے کرام پابندی کے ساتھ شریک ہو کر اپنے کلام بے لگام کے نمونے پیش کرتے رہتے ہیں۔ علامہ کی شاعری کی عمر بھی خاصی طویل ہے اور اس کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا پہلا شعر پالنے میں پڑے پڑے پوتڑے گیلے کرتے کرتے غوں غاں کی زبان میں موزوں فرمایا تھا اور تب سے لے کر اب تک مسلسل شعر کہتے چلے آ رہے ہیں اور اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں انجام دوبارہ آغاز سے گلے ملتا ہے یعنی آج کل علامہ پھر سے غوں غاں کی زبان میں شاعری کرنے لگے ہیں نمونہ ملاحظہ فرمائیے :

پہلے اس نے غوں کہا پھر غوں کہا پھر غاں کہا
اس طرح ظالم نے غوں اور غاں کے ٹکڑے کر دیے

علامہ نے یوں تو کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں بلکہ کچھ کارہائے نمایاں تو مستند نمایاں ہیں کہ اگر انہیں کارہائے نمایاں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا تاہم دنیائے شعر وسخن ان کا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ علامہ نے ایسے ایسے لوگوں کو شاعر بنایا ہے جو اگر شاعر نہ بھی بنتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن علامہ چونکہ اس بات کا دل ہی دل میں عہد کر چکے تھے کہ کسی اردو داں کو خوش حال اور غیر شاعر نہیں رہنے دوں گا۔ لہٰذا ہر شخص کو پکڑ پکڑ کر فی سبیل اللہ شاعر بنایا کرتے تھے چنانچہ ان کے شاگردوں میں ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔ مثلاً علامہ کے شاگردوں میں کسی زمانے میں سما سے ایک [illegible] شامل تھے جن کے ہاں علامہ کا ادھار کھاتہ چلتا تھا۔ کہتے ہیں اس کی دائمی

علامہ کی لسباطسے باہر تھی لیکن بنیا ہونے کے ناطے ادھار معاف کردیا، بنیاؤں کے اصول کے سراسر منافی تھا، لہٰذا وصولی پیسوں کی صورت، نہ ہوسکی تو بنیا مہاشے علامہ کے شاگرد بن گئے انھی بنیا شاگرد کی شعری تخلیقات کے بارے میں علامہ کا دعویٰ تھا کہ وزن کے معاملے میں کوئی اس بنیا شاعر سے بازی نہیں لے جاسکتا، اس سلسلہ میں استدلال یہ پیش کرتے تھے کہ شاعر مذکور کے ہاں بنیا ہونے کے ناطے چھوٹے بڑے ہمہ اقسام کے ترازو نسل درنسل سے چلے آرہے تھے اس لیے اس سے وزن کی غلطی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ علامہ اپنے نئے شاگردوں کو سب سے پہلے ایک عدد ترازو خریدنے کا مشورہ دیا کرتے لہٰذا ہم ان کے مشورے کے مطابق ترازو لے کر ان کے آگے زانوئے شعروادب، تہہ کرنے پہنچے تو وہ بے حد خوش ہوئے اور ہمارا ترازو قبول کرتے ہوئے تخلص رکھائی کی باضابطہ رسم انجام دی اور ہمیں اپنے تلامذہ میں شامل کرلیا۔ اس طرح علامہ کے شاگردوں کی تعداد جو ویسے بھی بہت تھی ہمارے اضافے کے بعد اتنی زیادہ ہوگئی کہ آسانی سے انگلیوں پر گنی جانے لگی ———!!

شاعری شروع کرنے سے پہلے شاعر کا کسی ایک گروپ سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ یہ خیال ہمارا نہیں، استادِ محترم علامہ چھٹ پٹ جٹ خفانگری کا ہے۔ چنانچہ بقول علامہ اردو کے شاعر تین مختلف گروپ میں بٹے ہوئے ہیں۔ پہلا گروپ عرفِ عام میں چالو گروپ کہلاتا ہے اور ان شاعروں پر مشتمل ہوتا ہے جو عموماً ایسے مشاعرے پڑھتے ہیں جو کسی محسنِ اردو قسم کی شخصیت کے زیرِ صدارت منعقد کیے گئے ہوں، یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی اکثر یہ محسنِ اردو شخصیت اردو سے نابلد ہوتی ہے لیکن چوں کہ مشاعرے کے اخراجات یا کم سے کم چائے پانی کے اخراجات، یہ شخصیت اپنی جیب سے ادا کرتی ہے لہٰذا بدلے میں مسندِ صدارت، ان کے نام الاٹ کردی جاتی ہے۔

دوسرا گروپ پہلے گروپ سے ایک گریڈ اونچا ہوتا ہے، دفتری زبان میں یوں سمجھیے کہ پہلے گروپ کے شاعر کلاس تھری کا رکن یعنی اہلکار درجۂ سوم ہیں تو دوسرے گروپ کے شاعر منتظمین عرف سپرنٹنڈنٹ، چنانچہ یہ گروپ صرف ایسے مشاعرے پڑھتا ہے جو کسی آئی۔اے۔ ایس آفیسر یا ڈپٹی منسٹر وغیرہ کی صدارت میں منعقد کیے جاتے ہوں، اب رہا تیسرا گروپ تو اس گروپ کے شعرا گزیٹیڈ عہدیداروں کے برابر ہوتے ہیں اور صرف ایسے مشاعرے پڑھتے ہیں جن کی صدارت وزیرِاعظم صدرِ مملکت یا کم از کم کسی مرکزی وزیر نے کی ہو، اس سے کم رتبہ شخصیت کے زیرِ صدارت مشاعرے پڑھنا یہ گروپ اپنے لیے باعثِ توہین سمجھتا ہے۔ استادِ محترم کی زبان سے اس اجمال کی تفصیل سننے کے بعد ہم نے کہا، ”استاد عالی مقام میں نہ پہلے گروپ سے وابستہ ہونا چاہتا ہوں نہ دوسرے اور تیسرے سے بلکہ آپ کے گروپ سے وابستہ ہونا پسند کروں گا۔!“

اس درخواست پر علامہ پہلے تو چونکے پھر بڑی ہی بے نیازی سے بولے ”برخوردار میں کسی گروپ سے وابستہ نہیں ہوں بلکہ اپنی ذات میں خود ایک گروپ ہوں، انجمن ہوں۔ اس لیے سہی مشاعرے پڑھتا ہوں جس کی صدارت بھی خود مجھے ہی سونپی گئی ہو۔“ جواب میں ہم نے بھی اسی بے نیاز

کا مظاہرہ کرتے ہوئے عرض کیا — استادِ محترم میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔ مجھے آپ اپنے نقشِ قدم پر چلنے دیجیے —" یہ سن کر علامہ نے کسی طفلِ شیر خوار کی طرح قلقاریاں ماریں اور ہمیں اپنا شاگردِ عزیز و رشید بلکہ عبدالعزیز و عبدالرشید بنا لیا —!!

ہمارا خیال تھا کہ استاد موصوف دیگر استادانِ شعر و سخن کی طرح اپنے شاگردوں کو شاعری کے رموز و نکات کھول کر سمجھاتے ہوں گے۔ بحور و اوزان پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوں گے۔ شعر کی تقطیع کس طرح کی جاتی ہے مع مثالوں اور حوالوں کے ذہن نشین کرواتے ہوں گے، لیکن یہاں تو استادِ محترم کے مکتبِ شعر کا دستور ہی الٹا تھا۔ جب ہم نے وزن اور بحر کے تعلق سے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تو جواباً ارشاد فرمایا —

بحروں کو توڑ تاڑ کے نالی میں پھینک دو

اسی طرح جب شعر کی تقطیع کے بارے میں دریافت کیا — تو بولے جو شاعر، شعر کی تقطیع کے چکر میں الجھ جاتے ہیں، وہ الف، ب کی تختی تک بھول جاتے ہیں، اس لیے تم بھی آم کھاتے سے مطلب رکھو پیڑ گننے کا کام عروضیوں پر چھوڑ دو، کیونکہ اچھی شاعری میں اہمیت عروض کی نہیں ہوتی بلکہ شاعر نے کیا عرض کیا ہے اس کی ہوتی ہے —"

شاعری کے تعلق سے ہماری تڑپ اور لگن کو دیکھتے ہوئے علامہ موصوف نے ہمیں چند نادر الوجود قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا مثلاً

- چوبیس گھنٹے میں شاعری سیکھنے کے تیر بہدف گر۔
- شاعری مینوفیکچرنگ اینڈ ریپرنگ گائیڈ۔
- سرقے کے سائنٹیفک طریقے۔
- مصرعے اٹھانے اور اڑانے کے آسان نسخے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

عنوانات ہی سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کتابوں کو بھی انہی خطوط پر مرتب کیا گیا ہے جن خطوط پر موٹر میکنگ گائیڈ یا صابن سازی کے آسان طریقوں والی کتابوں کو مرتب کیا جاتا ہے بہر حال استادِ محترم کا مشورہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ ہم مذکورہ کتابوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ●●

[جاری، سلسلہ آئندہ شمارہ میں]

پروفیسر حفیظ بنارسی

پیاز کے چھلکے

(۱)

صنم بے نیاز نے مارا
نگہِ فتنہ ساز نے مارا
ایک گیسو دراز نے مارا
غزنوی کو ایاز نے مارا
ہم کو تو یارو پیاز نے مارا

(۲)

اس کی قیمت ہے آسمانوں پر
ذائقہ کیا ملے زبانوں پر
کم ہی ملتی ہے اب دکانوں پر
اس کے انداز و ناز نے مارا
ہم کو تو یارو پیاز نے مارا

(۳)

بے مزا ہوگئی ہے بریانی
آنکھ میں بھر رہے ہیں سب پانی
نہیں ملتی کہیں یہ آسانی
شاہدِ حیلہ ساز نے مارا
ہم کو تو یارو پیاز نے مارا

(۴)

دعوتوں میں کہیں سلاد نہیں
کیا یہ بیداد مستزاد نہیں
اب کچومر کسی کو یاد نہیں
رتبۂ ہر دلنواز نے مارا
ہم کو تو یارو پیاز نے مارا

(۵)

حکم بیگم ہے پیاز کو چھوڑو
ہے جو عادت تمہاری وہ مت ڈالو
اب پیازی پکوڑے مت مانگو
ان کے فرمانِ ناز نے مارا
ہم کو تو یارو پیاز نے مارا

(۶)

جشنِ غم کیا منائیں گے یارو
کیسے آنسو بہائیں گے یارو
آنکھ میں کیا لگائیں گے یارو
اس غمِ جاں گداز نے مارا
ہم کو تو یارو پیاز نے مارا

(۷)

"زلفِ مہنگائی" کیا سنواریں ہم
اس کو کس نام سے پکاریں ہم
پیاز کے چھلکے کیا اتاریں ہم
اس کے تہہ دار راز نے مارا
ہم کو تو یارو پیاز نے مارا

رضوان اللہ

(نئی دہلی)

علم بڑی دولت ہے

آج کل تعلیم پر بڑا زور ہے جو اس بزنس میں ہے اس کا بھی اور جس کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں اس کا بھی۔ ایک دن میں بھی اس باب میں سنجیدگی سے سوچنے لگا اور آنے جانے ملنے ملانے والوں کی حیثیت کو ان کی لیاقت کی کسوٹی پر پرکھنے لگا۔ پھر خیال ہوا کہ کیوں نہ کوئی فیصلہ سر دے کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے اپنی گلی میں پھیری لگانے والے سبزی فروش کو تاکا۔ وہ کسی وقت لکڑ پر ٹھیلا کھڑا کر کے جان پہچان والوں سے خیر و عافیت پوچھنے لگتا ہے جیسے الکشن کے قریب امیدوار۔ کچھ اور پھیری والے بھی دم لینے کو ٹھہرتے ہیں اور کرکٹ میچ پر جو سال بھر جاری رہتے ہیں تبصروں میں الجھ جاتے ہیں۔

بس ایک دن میں وہیں ٹھہر گیا اور پہلے سے وہاں ٹھہرے ہوئے ایک بڑے میاں سے سلام کلام کے بعد بال بچوں کی خیریت بھی پوچھ لی۔ خوش حالی اور بے فکری ان کے سادے سودے کپڑوں کے پیچھے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ کچھ اس طرح گویا ہوئے۔

"میاں بچے تو اللہ میاں نے چار دیئے پر کوئی میری مرضی کے مطابق چلا نہیں۔ بڑا آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔ جب اس نے کسی سے سن لیا کہ میاں پڑھ لکھ کر کیا کرو گے۔ پردھان منتری بننے کی کیوں نہیں سوچتے۔ بس اس کے لیے اتنا ہی کرنا ہے کہ کوئی توپ خریدو یا نہ خریدو اس کا سودا ضرور کر ڈالو اور اس کی خبر اخباروں میں چھپوا دو۔ بس یہ سودا اس کے دماغ میں سماتے ہی وہ پارٹیوں کے دفتر کے چکر لگانے لگا کہ توپ نہیں تو طمنچے ہی کا سودا طے پا جائے گا۔ آخر ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے کے گر بھی تو سیکھنے ہوتے ہیں اور اس کے گرد گھنٹال پارٹی آفسوں میں ہی ملتے ہیں۔ وہ اب تک پارٹی نیتاؤں کی جوتیاں سیدھی کر رہا ہے مگر گھر کا رخ کرتا ہے نہ پارٹی آفس میں کسی کو اپنی اصل نسل بتاتا ہے۔ پچھلی عید میں ذرا دیر کو گھر آیا تھا تو کہنے لگا ابا [illegible] دلی میں دیر ضرور ہوتی ہے مگر اندھیر نہیں ہے دیکھو نا صوبوں میں جنتا

پارٹی کا ہر تیسرا آدمی اسمبلی ممبر ہے اور ہر تیسرا اسمبلی ممبر منتری ہے اور ہر تیسرا منتری کبھی نہ کبھی مہا منتری ضرور ہوتا ہے اور کسی کسی کو تو دلی میں بھی چانس مل جاتا ہے چاہے تین مہینے یا تیرہ دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو تو پھر دل چھوٹا کرنے کی کیا وجہ ہے۔ تین میں ایک کا یقینی چانس ہے اور ذات برادری جتنی پچھڑی ہو چانس اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔

پھر ذرا دم لے کر بڑے میاں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میرے دوسرے بیٹے نے جو اسکول میں اپنے بھائی سے ایک کلاس پیچھے تھا ریڈیو ٹی وی پر جو گانا سنا اسی کا ریہرسل اور ٹوئسٹ ڈانس شروع کر دیا۔ پھر ایک دن اس نے سرے سے اسکول جانے ہی سے انکار کر دیا۔ جب اس کو بہت سمجھایا بجھایا گیا تو اس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا " پاپا تم مجھے بمبئی کا کرایہ دے دو اور مجھے بھول جاؤ۔ تمھیں یاد ہے پچھلی عید میں بھیا نے کیا کہا تھا۔ اگر مہا منتری ہی بننا ہے تو اس کے لیے کسی پارٹی آفس کے چکر لگانے کی کیا ضرورت ہے اس کا راستہ فلمی بمبئی ہو کر بھی جاتا ہے۔ کیا اُدھر سے آئے ہوئے مہا منتری اور منترانی نہیں دیکھے ہیں۔ پارٹی تو بنتی بگڑتی رہتی ہے ہم جب جاہیں گے ہر پارٹی سے دو دو چار چار ممبر لے کر اپنی پارٹی بنالیں گے۔" ہم نے اس کو بمبئی کا کرایہ تو نہیں دیا لیکن ایک دن وہ لاپتہ ہوگیا اور یہ نوٹ چھوڑ گیا" اب میں مہا منتری بن کر ہی آؤں گا۔ پھول مالائیں لے کر میری راہ دیکھو۔"

بڑے میاں ایک دو ٹھنڈی سانس لے کر مزید گویا ہوئے" قسمت کے کھیل دیکھو۔ تیسرا لونڈا جو ساتویں آٹھویں تک آپہنچا تھا اسکول جانے کے بہانے بستہ لے کر نہ معلوم کہاں غائب ہو جاتا۔ جب اسکول سے شکایتیں آنے لگیں تب میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کی تلاش میں نکلا تو ایک جگہ جھگی جھونپڑی کے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اس کو پکڑ کر گھر لایا، بہت کچھ پچکارا سمجھایا۔ پھر خود ہی اس کو اسکول تک پہنچانے لگا۔ چند دنوں بعد دیکھا کہ کچھ لونڈے اس کی تلاش میں منڈلا رہے ہیں۔" ٹنو کہاں ہے ٹنو؟" "کیوں کیا بات ہے؟" وہ کئی دن سے کلب نہیں آرہا ہے" "کیسا کلب؟" ہمارا جے جے گلی ڈنڈا کلب ہے نا۔ ٹنو کہتا ہے جب تک پیسے نہیں ہوتے گلی ڈنڈا کھیلتے رہیں گے پھر جب پیسے ہو جائیں گے تو جے جے گیند بلا کلب بنالیں گے۔ بس میں سمجھ گیا کہ اس ٹنو کے بچے کا نشانہ کدھر ہے۔ آخر کار وہ تھوڑے دنوں تک تو اسکول گیا پھر اس نے کتابوں سے بالکل ہی توبہ کر لی اور دن دن بھر غائب رہنے لگا لیکن کبھی شام کو اور کبھی رات کو نہایت ہشاش بشاش واپس آتا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس سے کبھی نہ پوچھوں گا لیکن اس کی ماں نے ایک دن رازداری کے انداز میں پوچھ ہی لیا" بیٹا تو کیا کرتا ہے کہاں رہتا ہے" "کچھ نہیں اماں میں تو بس کلب میں رہتا ہوں۔ وہ جو حیدرآبادی بابا ہیں نا انھوں نے تین چار کلب بنائے ہیں ' جے جے گیند بلا کلب'، 'حیدرآباد فرینڈز' 'اظہر فینس کلب'۔ پہلے ہم لوگ کلب کے لیے چندہ اکٹھا کرتے تھے اب اس کے لیے ڈونیشن لیتے ہیں۔ حیدرآبادی بابا بڑے پیسے والے ہیں اور دل کے عام

طاقی نہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں بیٹا ... محنت سے کلب کا کام کرتے رہو پھر ایک دن ہوائی جہاز پر اڑو گے، دنیا کی سیر کرو گے، ہیروئنیں تمھاری راہ دیکھیں گی، تم شادیاں کرو گے اور طلاق دیا کرو گے۔ پھر اور کیا چاہیے ماں!" اس لڑکے کے بعد سے وہ اب تک نہیں لوٹا اور اس کی ماں بہو کے آنے کے سپنے سجائے بیٹھی ہے۔

اس کے بعد بڑے میاں کی آنکھوں میں کچھ چمک بڑھ گئی اور فرمانے لگے میرا چوتھا بیٹا چھوٹو سب سے تیز نکلا۔ اب جو کچھ اللہ کا دیا ہے اسی کے طفیل ہے۔ اس نے تو مدرسے ہی میں بستہ چھوڑ دیا تھا۔ کہنے لگا "پارک والا بابا کہتا ہے بیٹا کہاں کتابوں کے چکر میں پڑا ہے۔ یہ سب تو تجھ کو نوکر بنانے والی ہیں، آ میں نوکر نوکرانیاں رکھنے کی ترکیب بتاؤں۔" بس نہ معلوم کس پارک میں کہیں کوئی بابا تھا۔ اسی کے پاس آنے جانے لگا۔ بابا نے اس کو جوتے کی پالش کی دو ڈبیاں اور دو برشیں دے دیئے اور پارک کے سامنے فٹ پاتھ پر جوتے پالش کرنے کے لیے بٹھا دیا۔ بابا خود چلم کا دم لگا کر الٹا پڑا رہتا لیکن آنے جانے والوں کو کنکھیوں سے دیکھا کرتا۔ اس نے بچے کو سمجھا دیا تھا کہ میں تجھے ایک دن دنیا کی سب سے قیمتی چیز دوں گا پھر اس نے ایک دن ایک مہین سی پڑیا بچے کو دی اور کہا کہ میں جس گاہک کی طرف اشارہ کروں اس کے جوتے میں پڑیا ڈال دینا پھر اس کے دوسرے جوتے میں جو کچھ ہو اس کو نکال لینا۔ چھوٹو ایسا ہی کرتا رہا اور جوں جوں دن گزرتے گئے ان گاہکوں کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ شام تک ہزاروں ہزار روپے اکٹھا ہونے لگے۔ پھر بابا نے شہر میں پارک سدھار کمیٹی بنا لی اور چھوٹو اس کا سکریٹری ہو گیا اور "جوتا پالش" کے لیے دس بارہ بچے بھرتی کر لیے۔ اللہ جانے اس پڑیے میں کیا برکت تھی لیکن ہمیں تو اللہ میاں نے اسی کے طفیل سب کچھ عطا کیا ہے۔ اتنی تقریر کے بعد بڑے میاں نے ایک طرف کو راہ پکڑی۔

ان کے چلے جانے کے بعد سبزی والے نے بتایا کہ یہ بڑے میاں رابع خاں صاحب کے باپ ہیں۔ پہلے اسکول میں ماسٹری کرتے تھے اب خاں صاحب ایک کوٹھی کی نگرانی کرتے ہیں۔ خاں صاحب کی دو تین کوٹھیاں اور کاریں ہیں۔ یہ سن کر سر چکرا سا گیا کیوں کہ مجھے نوعمر رابع خاں صاحب کا آراستہ و پیراستہ ماڈرن اسٹائل کا دفتر دیکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ ان کے دفتر کے باہر "ایلائنٹمنٹ ڈونیشنز" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ وہ دفتر بڑے عظیم الشان مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا جسے بڑے میاں نے دوران گفتگو یوں بیان کیا تھا "ہمارے سید صاحب نے بہت بڑی یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے، کالج بنانے کالج کھلنے کی ہوا چل گئی۔ جب کالجوں کی ڈیمانڈ بڑھتی گئی تو اس پر ڈونیشن کی رٹ لگائی گئی کہ اتنے بچے پڑھ لکھ کر آخر کہاں کھپائے جائیں گے لیکن چھوٹو کو غریبوں کی بڑی فکر تھی کہ آخر وہ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں تو ڈونیشن کی رقم کہاں سے لائیں گے۔ بس اس نے ایک ڈونیشن آفس کھول دیا کہ جو آپ آئیں غریبوں کی تعلیم کے لیے ڈونیشن دینا چاہیں اسی آفس میں جمع کر دیں۔ اب چھوٹو غریبوں کی تعلیم اور اس کے بعد نہیں نوکری دلانے کے لیے بھی ڈونیشن مانگتا ہے۔ "علم بڑی دولت ہے!"

غزل

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

اگر دستر پہ بریانی نہیں ہے / ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے
وہاں پر کام مرغوں سے چلے گا / جہاں بکروں کی ارزانی نہیں ہے
گلے سے کس طرح میٹھا اتاریں / کہ اس میٹھے میں خوبانی نہیں ہے
وہاں انگور کھا کے جھوم لینا / جہاں انگور کا پانی نہیں ہے
ہمارے شوق شیطانی ہیں لیکن / ہمارا ذوق شیطانی نہیں ہے
ہمیں شاعر یہ دنیا کیسے مانے / ہمارے پاس عریانی نہیں ہے
جہاں خود ہی بھڑک اٹھتے ہیں شعلے / وہاں پر آگ بھڑکانی نہیں ہے
گھروں میں جو پہنچتا ہے نلوں سے / وہ سب کچھ ہے مگر پانی نہیں ہے
بہت آباد کر ڈالا جہاں کو / ہمارے بعد ویرانی نہیں ہے
سڑک پر آ گئے راتوں کے راجہ / مکاں میں رات کی رانی نہیں ہے
کسی کے خواب ہم دیکھیں تو کیسے / ہماری روح سیلانی نہیں ہے
کسی کا گھر ٹھکانے سے لگا کر / ہمیں کوئی پشیمانی نہیں ہے
ہمیں دنیا کے دیوانے ہیں لیکن / یہ ظالم اپنی دیوانی نہیں ہے
خبر ہے کس قدر چھلنی ہے دنیا / یہ دنیا آپ نے چھانی نہیں ہے
پریشاں قیمتوں سے آپ ہم ہیں / حکومت کو پریشانی نہیں ہے
جو اپنے آپ کو دیتا ہے چندہ / کوئی اس سے بڑا دانی نہیں ہے
گرانی بڑھ رہی ہے، بڑھ رہی ہے / ہمیں یہ بات دہرانی نہیں ہے
ہمیں نعرے لگانے کی ہے عادت / کسی سے بات منوانی نہیں ہے
ہمیں آنکھیں دکھاتا ہے پڑوسی / مروّت ہم کو دکھلانی نہیں ہے
ہمارے مال سے ہے اس کو مطلب / وہ دشمن ہے مگر جانی نہیں ہے
سبھی اک دوسرے کو کھا رہے ہیں / جہاں میں کوئی لاثانی نہیں ہے
بنا کر چھوڑ دیتے ہیں معمہ / ہمیں جو بات سمجھانی نہیں ہے
ہمارے سامنے ہرگز نہ کہیے / اگر یہ بات پھیلانی نہیں ہے
یہ جنگل ہے کہ آبادی پرندو / کہیں دانہ کہیں پانی نہیں ہے
کرپشن کے اگر ماہر ہیں نیتا / تو اس میں کوئی حیرانی نہیں ہے
ترقی کے لئے ہندوستاں میں / کرپشن کا کوئی ثانی نہیں ہے
وہاں پر ہاشمی جینا ہے مشکل / جہاں رشوت کی آسانی نہیں ہے

●●

انیس سلطانہ
(بھوپال)

ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

کس کس اپنی کل کو روئیں ۔؟ آج کی فکر کریں ، سو وہ بھی کہاں تک اور کیسے ؟ اور آج کی فکر نہ بھی کریں تو کیا کریں . . . . . . مگر فکرِ فردا ـــــ ؟؟ فردا جو کبھی نہیں آتی . . . . . کہ نہیں آتا . . . . . . نہیں آتی پر ایک شعر یاد آیا :

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

یہ شعر بھی خوب یاد آتے ہیں ، جب انھیں یاد کرو ، ایک شعر یاد نہیں آتا . . . . .
اور یوں ہے کہ ہم فکرِ امروز میں گھلے جا رہے ہیں اور وہ ہیں کہ یاد آئے جا رہے ہیں ۔
ہائے کہاں گئے وہ دن . . . . . . کہ جب گرہستنوں کے آنسو کھانے کا مزہ بڑھاتے تھے . . . . . . اب آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں . . . . مگر وہ مزہ کہاں جو چار روں ظرف پیاز کے چھلکوں کے درمیان رونے میں تھا ـــــ نہ ہوئے ملّا دو پیازے . . . . .
اس عہدِ پر آشوب میں غریب کو یا تو اپنا نام بدلنا پڑتا اور یا انھیں حضرت کو بہ نفسِ نفیس ایکسپورٹ کر دیا جاتا ۔

آج ہم نے سبزی کے ٹھیلے پر نظر ڈالی . . . . . . روز کا کام جو ٹھہرا ، سوکھی سہمی سبزیوں کے درمیان اس پیاز کے درشن بھی ہوئے جسے بزعم خود ہم کبھی نہ خریدتے کہ چھالیہ کے برابر یہ پیاز جو کبھی اس پیازی شہر میں نہایت حقیر سمجھی جاتی تھی ، اب وہی نہیں کچھ ایسی دل کش اور اتنی اچھی تھی نہ ہم بے قرار ہو گئے ۔ تھیلا ، جھولا ، کچھ نہ ہونے کے باوجود بنارسی ساڑی کے پلّو میں کم سے کم دو کلو پیاز لیے ہوئے پلٹ کر گھر میں خوشی خوشی داخل ہوئے مبادا کہ ہم اندر آتے . . . . . تھیلا لیتے اور وہ اتنی دیر میں اپنا ارادہ بدل دیتا . . . . . مبادا کہ اس کا

رخ کہیں اور کا ہو جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مبادا کہ ہمارے پاس پھر کبھی مطلوبہ رقم ہو کر نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ نوعروس کی سلامی میں دینے کے لیے جو رقم ہم لے کر چلے تھے وہ نہایت عالم سرخوشی میں نذر پیاز کر کے داخلِ خانہ ہوئے ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج تک دیکھا نہ سنا، آج ہماری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں ۔ جو پیاز ہم نے اتنے ارمانوں سے خریدی تھی غائب ہو چکی تھی ——— آدمی جذبات کا بندہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلا گمان، غریب برتن والی پر ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوسرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے کی نوبت ہی نہ آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ آج ہم گھر کی اور خاص کر باورچی خانہ کی صفائی کے درپے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈبوں کے پیچھے سے کاغذی سفوف برآمد ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور زیادہ صفائی کی کوشش کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک گوشے سے پیاز کے چھلکے برآمد ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی ہاں اسی پیاز کے جو ساڑھی کے پلو کا مرہونِ منت ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ جو ایک عدد نازک سی پلاسٹک کی تھیلی میں ملفوف تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اسی تھیلی کی باقیات سے ہم نے پہچانا کہ :

اب جس جگہ کہ داغ ہے واں آگے درد تھا

ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہوگا ۔ ۔ ۔ لیکن کبھی حساب سے پیاز کی ڈلیاں نہ رکھی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا شاید دالوں اور گیہوں کی ضرورت سے زیادہ حفاظتی تدابیر دوسرے الفاظ میں سکیوریٹی حاصل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے عرصہ بعد ۔ ۔ ۔ نظر آنے والی پیاز جو غریب چوہوں کو بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کچھ ایسی بھائی کہ بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو یہ حال ہے کہ روز کھانا پک چکنے کے بعد پیاز کی ڈلیاں گن گن کر رکھی جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے کبھی کبھار شاعر تو کہہ دیا کرتے تھے کہ :

خدا مجھ کو کر دیتا منسٹر اگر

شب و روز کھاتا پیاز و ٹماٹر

اب تو عید بقرعید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیاز کی ڈلی نکال کر دسترخوان پر رکھ لیتے ہیں اور طعام سے فارغ ہونے کے بعد پھر رومال میں لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کو بتا سکیں کہ دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ایسی چیزیں کھاتے تھے ۔ وگرنہ جیسے ڈائنا سور غائب ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے روئے زمین سے غریب مینڈک غائب ہوتے جا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بے چاری پیاز بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے اللہ نہ کرے ——— !!

آج ایک ایک کر کے ہمیں پیاز کے فوائد یاد آ رہے ہیں ۔ ہم بھول ہی گئے کہ پیاز کاٹنے کے بعد گھنٹوں اس کی بو گھر میں بسی رہتی تھی ۔ نہ صابن اسے مٹا سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ عطر کی مہک ——— اب ہاتھوں کو ملتے ہیں کہ ہیہات ——— نہ وہ ہوش رہا بوئے پیاز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ سہاگنوں کی آنکھوں میں آنسو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ کنواریوں کی ہاتھوں میں مہکتی ہوئی بو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ کھانے میں مزہ ہے نہ مزے کی آس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے پیاز ۔ ۔ ۔ ۔ وائے پیاز ——— !!

اور کہ اب دنیا سمٹ کر چھوٹی ہوگئی ہے۔ اتنی چھوٹی کہ امریکہ سے گیہوں، عرب سے سونا جاپان سے موٹر کار اور ایران سے پیاز لائے بغیر انٹرنیشنل تعلقات استوار ہو ہی نہیں سکتے ــــــ یہاں تک کہ اہل زبان نے محاورے اور استعارے بدلنا شروع کر دیئے ہیں۔ پہلے کہتے تھے کہ رادھا کو ناچنے کے لیے نو من تیل چاہیے اور اب "نہ نو من پیاز ہوگی نہ رادھا ناچے گی ــــــ"

۱۸۵۷ء کی بات ہے مرزا غالب ... پھیکے سیٹھے کباب سامنے دھرے، بدمزہ سے بیٹھے تھے کہ امراؤ بیگم کی ہتھیلی پر کچھ چمکتی سی نظر آئی اور مرزا سرشار ہو اٹھے ــــــ اور عالم بے خودی میں فرمانے لگے:

"یہ جو حضرت کے کفِ دست پہ ہے چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

اور ہم صرف یہ کہہ کر خاموش ہوا چاہتے ہیں کہ:

پیاز کو پیاز ہی رہنے دو کوئی نام نہ دو

کیونکہ اس دور میں ...

جب نام ترا لیجیے، تب اشک بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

●●

غزلیں

مرزا کھونچ
(بہار)

یہاں سے جو نکلتا ہے وہاں تک جا پہنچتا ہے
غضب ہے آدمی اللہ میاں تک جا پہنچتا ہے

پتہ معلوم ہونا چاہئے پھر دیکھئے شامت
یہ چندہ خور تو کون و مکاں تک جا پہنچتا ہے

اُسے جلتی ہوئی شمعوں پہ مرجانے سے مطلب ہے
پتنگا اس دکاں سے اُس دکاں تک جا پہنچتا ہے

ہمارے گھر کا ہنگامہ نہیں بیگم کے دم قدم سے
ابھی یہ سلسلہ تو ان کی ماں تک جا پہنچتا ہے

یہ راکٹ اور میزائیل کا موجد کوئی شاعر تھا
کہ اس کا ہی تخیل آسماں تک جا پہنچتا ہے

نہیں پڑتا ہے دعوت نامے کے بے جا تکلف میں
کہ میرا یار اپنے میزباں تک جا پہنچتا ہے

کہیں کیچڑ، کہیں پانی، کہیں انبار کوڑے کا
مگر یہ راستہ میرے مکاں تک جا پہنچتا ہے

خدا محفوظ رکھے کھونچ کو جن کے توسط سے
ظرافت کا مزہ ہر اک زباں تک جا پہنچتا ہے

●

سراج نرملی

اک علاج ایسا بھی اسٹیل کرسکتا ہوں میں
سالٹ زخموں پہ چھڑک کر ہیل کرسکتا ہوں میں

اپنے جادو سے مرل کو وھیل کرسکتا ہوں میں
"ہام پھٹ" کہہ کر گدھی کو چیل کرسکتا ہوں میں

دوستوں کی دل سے میں تعریف کرسکتا نہیں
دشمنوں کی ڈھیر سی تذلیل کرسکتا ہوں میں

آپ کی ہے چڑ چڑی بیوی تو میری سرپھری
آپ کا ہے پرابلم کیا فیل کرسکتا ہوں میں

میں نے جو مانگی رقم چپ چاپ دیدیجئے مجھے
ورنہ گوداموں کو سارے سیل کرسکتا ہوں میں

خود کو ثابت میں کروں گا ، ایک اچھا ساتھی
آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرسکتا ہوں میں

آج ناممکن کو کرسکتا ہوں ممکن میں سراج
فضلِ رب سے ٹاسک پھر اک ڈیل کرسکتا ہوں میں

●

ماہر کریم نگری

کیا کریں اب وظیفہ خوار ہیں ہم
آج اولاد پر بھی بار ہیں ہم

اس زمیں کے بھی پٹے دار ہیں ہم
اُس زمیں کے بھی کاشتکار ہیں ہم

صرف پڑ کا ہے ساگوان نہیں
ایسے جنگل کے چوکیدار ہیں ہم

آج ہی آ گئے ہیں میکے سے
کیا کہیں کتنے سوگوار ہیں ہم

بھیگی بلی کا حال ہے گھر میں
دیکھنے میں تو کوہسار ہیں ہم

بات چپراسی تک نہیں سنتا
کیسے آفس میں اہلکار ہیں ہم

موسم ہجر ہے مگر ماہر
دیکھئے کتنے خوشگوار ہیں ہم

مشتاق مدنی
(پونا)

یہ سابقے
یہ لاحقے

خدا جانے کہ ان سابقوں اور لاحقوں کا مرض اردو زبان کو کب سے لاحق ہے؟ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم جیسے کتنے ہی طلبا محض ان سابقوں اور لاحقوں کی بدولت آج تک اردو قواعد سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور سابقے اور لاحقے ہی کیوں؟ مصدر، ضمیر شخصی، فعل، فاعل مفعول، مرکب توصیفی، ماضی واحد غائب، صفتِ ذاتی، صفت عددی، علامت کسرئی، واو عطف اور نہ جانے ایسی کتنی ہی پیچیدہ اور ثقیل اصطلاحیں ہیں جو ہم جیسے غبی تو کجا مستند شاعروں اور ادیبوں سے بھی بغیر چورن ہضم نہ ہوئی ہوں گی۔ اس پر طرہ یہ کہ سابقوں اور لاحقوں کو جاننا ہی اصول زبان داتی ٹھہرا پھر ان کی بھی قسمیں ہیں۔ جیسے اشتقاقی اور تصریفی لاحقے وغیرہ ہوا یسے ایسے غبی لڑکے جو جوش ملیح آبادی کو دینی اور فیض کو جدید شاعر متوطن بمبئی بتاتے ہیں محض اس وجہ سے نصابی کرسیوں کے عہدیدار بن گئے کہ وہ کچھ اور جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، سابقے اور لاحقے ضرور جانتے تھے۔ ضمیر شخصی سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے، چاہے ان کا اپنا ضمیر شخصی مطمئن نیند سو رہا ہو اور چاہے بحر ادب کے وہ کبھی غواص نہ رہے ہوں مگر چونکہ بحر رمل، در بحر ہزج بمع ارکانِ مثمن سالم اور غیر سالم جانتے تھے اس لیے پیشۂ تدریس میں انھیں ترجیحی داخلہ ملا تاکہ وہ بھول جیسے بچوں کے نازک ذہنوں پر سابقوں اور لاحقوں کی دھونس جما سکیں۔

وجوہات چاہے جو رہی ہوں، یہ مگر حقیقت ہے کہ اردو زبان پر میر و غالب سے زیادہ حکمرانی انھیں سابقوں اور لاحقوں کی رہی ہے اور اس پر کوئی احتجاج بھی نہیں کرتا ایک مرتبہ ہم نے اپنے ایک دوست سے جو کہ پیشۂ تدریس سے وابستہ رہنے کے باوجود خوش مزاج واقع ہوئے ہیں، عرض کیا کہ ـــ

" "ضمیر شخصی کسے کہتے ہیں"۔

اتراکر بولے۔" دراصل زمانوں کو مدنظر رکھے بغیر آپ نے یہ سوال داغا ہے، آپ کو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ ضمیر شخصی کسے کہتے تھے ؟"

ہم نے پوچھا، آج کل کی درسیات صرف زمانہ ماضی ہی میں سانس لیتی ہے ؟ اور اسے حال سے کوئی علاقہ نہیں ؟" دوبارہ اتراکر بولے " میاں ! ایک زمانہ تھا کہ ضمیر شخصی واقعی ہوا کرتا تھا بلکہ ضمیر قومی بھی ہوا کرتا تھا مگر افتاد زمانہ کہیے کہ جب سے ضمیر فروشی کا فن مستقل پیشہ میں تبدیل ہوا ہے، ضمیر شخصی بھی دفن ہو کر رہ گیا ہے "۔ ہم نے پھر تصیح کی کہ ہم دراصل از روئے قواعد ضمیر شخصی جاننا چاہ رہے تھے مگر آپ ہیں کہ اسے اخلاقیات کی صلیب پر لٹکا رہے ہیں"۔

سرد آہ بھر کر بولے کہ صاحب ! ضمیر شخصی ہی جب نہ رہا تو کیا درسیات اور کیا اخلاقیات ۔

اب اسے سوئے اتفاق ہی کہیے کہ سماج میں ہمارا تعارف ایک ایسے شاعر و ادیب کا ہے جو زباندانی کے جملہ رموز سے کما حقہ واقفیت رکھتا ہے۔ اگرچہ ہم نے متعدد مرتبہ اپنے احباب اور رحم فرماؤں کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی کہ ہم شاعر نہیں ہیں۔ ہمیں صرف ادیب تسلیم کیا جائے۔ اور وہ بھی قواعد کو درمیان میں لائے بغیر! یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص ہم سے پوچھتا ہے کہ صاحب! اس شعر کی بحر کیا ہے ؟ اور اس میں ارکان کتنے ہیں؟ تو ہم محض اسے مرعوب کرنے کی خاطر یہ کہتے ہیں کہ آپ پہلے سابقوں اور لاحقوں کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے پھر مصدر اور ضمیر شخصی سے واقفیت بہم پہنچائیے ۔ کچھ دن علامت کسرئی اور واو عطف کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلیے ۔ اس کے بعد شعروں کے ارکان اور بحروں کی تقطیع کا فارمولا ہم تمھیں بتادیں گے ۔

ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اردو کو جتنا نقصان سابقوں اور لاحقوں نے پہنچایا ہے ، جدید ادیب و شاعر اور اردو اکیڈمیوں نے بھی نہیں پہنچایا ۔ اب اسے ستم ظریفی نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ اپنی اپنی ذات و انا کے محبوس و مقید غاروں میں بصد اپنی شناخت و پہچان کی تلاش میں سرگرداں پھرنے بلکہ بھٹکنے والے جدید ادیب و شاعر کسی میلی کچیلی ہوٹل کی مکھیوں سے بھنبھناتی میز پر سگریٹ و بیڑی کے مرغولے سے جھانکتے ہوئے اگر ادب میں "جمود" کے مسئلہ پر کمال سنجیدگی سے انتہائی غیر سنجیدہ بحث کریں تو کون خوش مذاق ہوگا جو ادب کو فعال اور متحرک کہنے کی حماقت کرے گا ؟ مزید براں وہ شاعر و ادیب جن کی نصابی تعلیم ساتویں سے اوپر نہیں اور جو ستر کتابوں کے مصنف ہونے کا دعوئی کرتے ہیں آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ غزلوں کا محض ایک دیوان اور مضامین کی محض ایک کتاب تصنیف کرنے والے غالب و پطرس کی عظمت کا راز کیا ہے؟ رہا سوال اکیڈمیوں کا، تو نہ ہمیں اکیڈمیوں کے قیام پر اعتراض ہے اور نہ ہی ان کے بلا جواز تغلقی اخراجات پر! بلکہ ہمیں اعتراض ممبران اکیڈمی کے اس جمہوری طریقہ انتخاب پر ہے جس کی نسبت علامہ اقبال فرما گئے ہیں کہ :

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بلکہ اب تو یہ نوبت آن پڑی ہے کہ اکیڈمی کا سکریٹری یا چیرمین بننے کے لیے اردو جاننا بھی ضروری نہیں!

اس بحران کو دور کرنے کے لیے ہمارے قابل مدرس دوست نے ایک مرتبہ یہ "نقطہ" کہا یا کہ "کیوں نہ اکیڈمی کی ممبرشپ کے لیے سیاسی رسوخ کے بجائے سابقوں اور لاحقوں کا جاننا ضروری قرار دیا جائے؟"

ہم ان کی چال سمجھتے ہوئے بولے، "آپ چاہتے ہیں کہ اکیڈمیوں کی کرسیوں پر سیاسی شخصیتوں کے نمائندوں کی بجائے مدرسین بیٹھے ہوئے نظر آئیں؟
جھک کر بولے اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آپ رہے قنوطی کے قنوطی! دیکھا جائے تو آپ کی ناکامی کے اسباب بھی آپ کی سمجھ سے باہر ہیں!
ہم نے دست بستہ عرض کیا کہ "حضور! آپ کی دانست میں ہماری ناکامی کا ذمہ دار کون ہے؟"

اکڑ کر بولے "میں اردو کے تمام شعرا و ادبا کو آپ کی ناکامی کا ذمہ دار گردانتا ہوں۔ اگر حالی و شبلی کی کتابیں آپ میں قناعت اور قنوطیت نہ بھرتیں یا اگر فیض و ساحر کی نظمیں آپ کو گمراہ نہ کرتیں .... گر منٹو کے افسانے پڑھ پڑھ کر آپ وقت سے پہلے بالغ نہ ہوگئے ہوتے تو آپ بھی کام کے آدمی ہوتے! میں ایک کامیاب مدرس اسی لیے ہوا، کہ میں نے آج تک قرآن شریف کے علاوہ کسی دوسری کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

ہمیں اس عاقلانہ و عاجلانہ تجزیہ سے کیونکر انکار ہو سکتا تھا بلکہ ہم نے اپنی پرتقصیر زندگی میں ایسے افراد بکثرت دیکھے جو تذکرہ، تبصرہ یا تجزیہ کرنے میں ہر قسم کی لائین آف کنٹرول (LOC) کو بخیر و خوبی پار کر جاتے ہیں اور ذرا شرمندہ نہیں ہوتے۔ مگر بہترین تبصرہ وہی مانا گیا ہے کہ:

آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

عرض کرنے کا مدعا بس اتنا ہے کہ اگر ہماری زندگی میں سابقے اور لاحقے کسی ڈھیٹ اور بن بلائے مہمان کی طرح داخل نہ ہوتے تو بقول شخصے ہم بھی معمار قوم کے فرائض انجام دینے کی کوشش میں قوم کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ خدا بخشے اسداللہ خاں غالب، جو بات بات میں خود کو خستہ جاں کہتے اور لکھتے تھے۔ اخیر عمر تک اس بات سے رنجیدہ رہے کہ اگر وہ بادہ خوار نہ ہوتے تو درجہ ولایت پہ فائز ہو سکتے تھے مگر جس طرح ہماری لٹیا سابقوں اور لاحقوں نے ڈبوئی اسی طرح آم اور شراب بھی غالب اور ولایت کے درمیان دیوار بن کر کھڑے رہے۔ غالب شب کے [illegible]

مرشدی ابنِ انشا مرحوم، جن کی کتابوں سے ہم نے اردو اور برموقع ہنسنا سیکھا، اپنے اساتذۂ کرام کا ذکرِ خیر اپنے مزاحیہ سفرناموں تک میں بصد احترام کرتے ہیں مگر صرف انہیں اساتذہ کا جو تاریخ، جغرافیہ، سائنس یا ہندی وغیرہ پڑھاتے رہے ہوں۔ اپنے اردو اساتذہ کا ذکر ضمناً بھی انھوں نے کبھی نہیں کیا اور ابنِ انشا ہی پر کیا بس ہے۔ ہم نے بعض مشاہیر کی کتابیں پڑھی نہیں بلکہ حفظ کی ہیں مگر کبھی کسی مردِ خدا کو خود میں کو اپنے اردو اساتذہ کا ذکر کرتے نہ دیکھا نہ پڑھا اور اگر مشاہیر اور اکابر اساتذہ کا کہیں ذکر ہے بھی تو صرف ان کا جن کو مرحوم ہوئے کم از کم ایک صدی گزر گئی ہو۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم آخر اسی نتیجہ پر پہنچے کہ ہماری طرح یہ حضرات بھی اردو اساتذہ کے نہیں بلکہ سابقوں اور لاحقوں کے مارے ہوئے ہیں۔ ●●

فضل حسنین
(الہ آباد)

شعری اکھاڑے

ایک زمانہ تھا جب مشاعروں میں باذوق سامعین ہی شریک ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ زمانہ اس حد تک ترقی کرتا گیا کہ اب باذوق اور بدذوق میں تمیز مشکل ہوگئی ہے۔ آج کل سامعین میں اکثریت ان افراد کی ہوتی ہے جنھیں گانے بجانے سے زیادہ شغف ہوتا ہے اور گلوسازی کے ساتھ ساتھ وہ اداکاری سے لطف اندوز ہونے کے بھی متمنی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں معیاری شعرا کا بازار گر گیا اور وہ صرف مختصر شعری نشستوں سے ہی اپنا دل ٹھنڈا کرنے لگے اور یہ حقیقت ہے کہ شعری نشستیں صد فی صد کامیاب ہوتی ہیں کیونکہ یہ محفلیں عموماً صرف شعرائے کرام پر ہی مشتمل ہوتی ہیں۔ جہاں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے تحت ایک شاعر دوسرے شاعر کا کلام سنجیدگی سے سنتا ہے اور حسب توفیق زیادہ سے زیادہ داد دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اپنی باری آنے پر خود بھی اچھی فصل کاٹ سکے لیکن شاعری کے میدان میں کچھ خواتین کے کود پڑنے سے گلوکار حضرات مات کھا گئے اور ان کی اداکاری بھی ان مہ جبینوں کی اداؤں تلے دبنے لگی یہاں تک کہ ان کا ڈرامائی انداز بھی بے اثر ثابت ہونے لگا۔ لہٰذا سامعین کے ساتھ ساتھ انھیں ناظرین سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ چنانچہ ایسے شکست خوردہ شعرا نے شعری نشستوں پر بھی دھاوا بول کر ان شائستہ محفلوں کو منی مشاعرہ میں تبدیل کر دیا۔

ان شعری نشستوں میں بھی اب شعرا غول در غول اترنے لگے ہیں۔ دوران نشست اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کون شاعر کس اکھاڑے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ کسی شاعر کو صرف اس کے گروہ کے شاعر ہی داد دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دیگر گروہ خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ سے کس حد تک پرخاش رکھتا ہے، اس کا اندازہ بھی ان محفلوں میں بخوبی لگایا جاسکتا ہے [illegible] کون سا شاعر جس حد تک مدنظر ہوگا اپنے حریف شاعر کے کلام

بڑا تنا ہی برا منہ بنائے گا۔ البتہ کچھ باظرف قسم کے رقیب داد کی جگہ ایسی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں
گویا انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ حضرات احتیاطاً دانت پر دانت جما لیتے ہیں کہ کہیں بے خیالی
میں کسی اچھے شعر پر بے ساختہ 'واہ' نہ نکل جائے اور انھیں اپنے اکھاڑے سے خواہ مخواہ برخواست
ہونا پڑے۔

مشاعروں کی طرح یہ شعری نشستیں بھی اب کافی تاخیر سے شروع ہونے لگی ہیں جس کی
وجہ غالباً یہ ہے کہ ہر شاعر اس مغالطے میں رہتا ہے کہ جسے جتنی دیر میں دعوتِ سخن دی جائے گی
وہ اتنا ہی بڑا شاعر تصور کیا جائے گا اور چونکہ چھوٹا شاعر کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا اس لیے تقریباً تمام
شعرائے کرام خود کو استاد تصور کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا
ہے کہ بعض خود ساختہ استاد نشست کے اختتام پر پہنچتے ہیں اور ان کے کلام سے صرف صاحب
خانہ ہی محظوظ ہو پاتا ہے دیگر شرکاء قطعی محفوظ رہ جاتے ہیں۔

یہ بات بھی اب بہت عام ہو چکی ہے کہ شاعر مشاعرے میں شرکت کے وقت عموماً علیل
ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مشاعرہ گاہ پہنچنے سے قبل اپنے کلام کے ریاض نیز اس کی
ریہرسل میں وہ اپنی تمام تر توانائی صرف کر چکا ہوتا ہے۔ اس لیے مائک تک بڑی مشکل سے پہنچ پاتا
ہے لیکن پہنچتا ضرور ہے۔ اگر کوئی شاعر ابتداءً ہی اپنی ناسازیِ طبع کا ذکر نہ کرے تو اسے کم تر درجے کا
شاعر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لیے شاعر اپنی علالت اور حد درجہ نقاہت کا اعلان اسی مستعدی سے
کرتا ہے گویا یہ بھی اس کے کلام کا حصہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ شعر سناتے وقت جب اس پر وجد کا عالم
طاری ہوتا ہے تو وہ اپنی اس مصلحت آمیز کمزوری کو یکسر فراموش کرتے ہوئے اپنی اصلی آواز میں
دھاڑنے لگتا ہے۔ اسی خدشے کے تحت بعض شعرا ایک دو شعر کے بعد ہی لٹا دیئے جاتے ہیں۔

بہت سے شعرا ایسے بھی ہوتے ہیں جو سامعین کی بے اعتنائی کے باعث ہمیشہ اپنے قدر
دانوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور کوئی موقع ہاتھ آجانے پر شعر سنا سنا کر خود تو صحت یاب ہو جاتے ہیں
لیکن سامع کو بیزار کرتے جاتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصہ سے شاعری کے میدان میں استاد کہلانے کا مرض جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔ جس کے
نتیجے میں شاگردوں کا قحط سا پڑ گیا ہے۔ اس لیے خوش قسمتی سے اگر کوئی شاگرد کسی خود ساختہ استاد
کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ اسے بہت سنبھال کر رکھتا ہے اور ہر طرح سے اس کی ناز برداری کرنے
کی کوشش کرتا ہے کیونکہ ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ جس کے پاس جتنے زیادہ شاگرد ہوں گے وہ
اتنا ہی بڑا شاعر سمجھا جائے گا۔

کبھی کبھی استاد اور شاگرد میں بڑی دل چسپ قسم کی چشمک بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ مثلاً
کوئی استاد شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے اور اس کا نام نہاد شاگرد بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد

اس راز سے پردہ اٹھتا ہے کہ استاد اپنے شاگرد کی وہی غزل پڑھ رہا ہے جو شاگرد نے بغرض اصلاح استاد کو دے رکھی ہے جبکہ استاد جوابی کارروائی کے طور پر بے لاگ الزام لگا بیٹھتا ہے کہ اس کے شاگرد میں تخلیقی صلاحیت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی۔ اس نے تو اپنے شاگرد کو بطور باڈی گارڈ پال رکھا ہے کہ ضرورت پڑنے پر اپنے کسرتی جسم کا مناسب استعمال کر سکے۔

چونکہ اب بعض سماج بیزار عناصر بھی ان شعری اکھاڑوں میں کود پڑے ہیں۔ اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ جلد ہی وہ وقت بھی آجائے گا جب یہ محفلیں میدان کارزار میں تبدیل ہو جائیں گی۔

تشویش اس بات کی ہے کہ اگر خدانخواستہ ایسا وقت آ ہی گیا تو وہ لوگ کہاں جائیں گے جو بد قسمتی سے واقعی شاعر ہیں۔ ●●

کلیم اللہ
(حیدرآباد)

گدھے کو ووٹ دو

پچھلے الیکشن کے اعلان کے بعد ہمارے اسمبلی حلقوں میں بادشاہ گروں کو ایک عدد امیدوار
کی تلاش شروع ہوئی کیونکہ پارٹی کا متوقع امیدوار بغاوت کرکے دل بدل کر گیا تھا۔ اس
علاوہ پارٹی کا اپنا امیدوار اوپر سے لایا گیا ہے جس کو نیچا دکھانے کی خاطر کسی محلے کے ہی قابل آدمی
الیکشن میں کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ بہت تلاش کے بعد ان کی نظر انتخاب ہم پر پڑی اور وہ ہمار
گرویدہ ہو گئے۔ ان کے خیال میں ہم جیسا شریف آدمی سارے حلقۂ اسمبلی میں کوئی نہ
حالانکہ ہم نے لاکھ سمجھایا کہ الیکشن میں شرافت کو کیوں شامل کرتے ہیں لیکن انھوں نے ہماری ا
نہ سنی۔ ہمارے سامنے لالچ کے ڈھیر لگا دیے کہ الیکشن جیتنے کے بعد ہم کو وزارت میں شامل کر
جائے گا۔ ہم نے کہا بھلا آزاد امیدوار کیسے وزارت میں آسکتے ہیں"۔ تو ارشاد ہوا کہ "پھر دہلی میں
ہو رہا ہے۔ بیس پچیس پارٹیاں مل کر حکومت چلا رہی ہیں۔ یقیناً یہاں بھی ویسا ہی ہوگا۔ آپ بے فکر رہیے
الیکشن جیتنے کے بعد ہم ایک نئی وزارت کا عہدہ قائم کریں گے،" وزیر برائے برسی، عرس، زیا
سالگرہ، جاترا، پرسہ و دیگر تقاریب۔ کلیم بھائی! ہم کو معلوم ہے کہ آپ کو سالگرہ، برسی، زیار
چہلم، فاتحہ، عرس، برسی وغیرہ کا کافی تجربہ ہے۔" ہم نے کہا الکشن میں تو وعدے کرنے پڑتے ہیں
جواب ملا کہ "کیا آپ اپنی بیوی بچوں، دوست احباب سے وعدہ نہیں کرتے ہیں ـــــ؟ ہم نے کہا ایف
کرتے ہیں اور پورا بھی کرتے ہیں۔" بادشاہ گروں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "کلیم بھائی! عام ز
میں اور الیکشن میں فرق ہوتا ہے۔ سیاست میں صرف وعدے ہی کافی ہیں۔ پانچ سال بعد دیکھ

پھر سے دہرائے جاتے ہیں۔ نہرو جی سے آج تک یہی تو ہوتا آرہا ہے۔ اگر سارے وعدے پورے ہوجاتے ہیں تو ہندوستان جنت نشان بن جاتا۔" دلائل واجبی تھیں ویسے بھی وزارت کا لالچ ہی ہمارے لیے کافی تھا۔ ہم نے فوراً حامی بھرلی ــــ بادشاہ گر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا ــ

دوسرے ہی دن بادشاہ گروں نے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ حاضرین محفل کی خاموشی سے یوں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شاید کسی کی برسی ہو۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ ہماری ہی سال گرہ تقریب ہے اور کیک کے بجائے کسی بکرے کو کاٹنے کا پلان بنایا گیا ہے۔ اس سال کے دوران یہ ہماری دوسری سال گرہ بھی یعنی دوسرا جنم جو کہ سیاست میں داخلہ کی شکل میں ہوا ہے جنم لیتے ہی ہاتھ پاؤں مارنا پڑا اور روزانہ کسی نہ کسی تقریب یا جلسہ میں شرکت ایک معمول بن گیا تھا۔

ہفتہ عشرہ کے بعد جلوس کی شکل میں حلقۂ انتخاب کی گشت، دو تین درگاہوں اور دیگر عبادت گاہوں پر حاضری کے بعد کلکٹریٹ آفس پہنچ کر پرچہ نامزدگی داخل کیا گیا اور ہم باقاعدہ الیکشن میں کود پڑے۔ شہر میں الیکشن کی وبا پھیل چکی تھی۔ یہ وبا پلیگ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس وبا کے ذریعہ عوام کی نیندیں حرام کی جاتی ہیں۔ ووٹرس کو نیند سے جگایا جاتا ہے۔ اور وعدوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ہر تقریر وعدہ سے شروع ہوکر وعدوں پر ختم ہوتی ہے۔ شہر کے ہر گلی کوچہ میں تقریریں ہوتی ہیں۔ ہر تقریر میں نئے نئے وعدے کیے جاتے ہیں ــ تقریر پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ کسی جلسہ گاہ میں الیکشن کی تقریر کے دوران ایک صاحب مسلسل تقریر کیے جارہے تھے اور حاضرین جلسہ خاموشی وصبر وتحمل سے تقریر برداشت کر رہے تھے کہ دو کتے کہیں سے بھٹکتے بھٹکتے وہاں آگئے اور جلسہ گاہ کے کنارے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک کتے نے دوسرے کتے سے دریافت کیا "کیوں بھائی تم بڑے غور سے سن رہے ہو ــــ؟" تو کتے نے جواب دیا :

"نہیں بھائی میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کیسی مخلوق ہے کہ ایک بھونکتا ہے اور سب سنتے ہیں ــــ"

واقعی ووٹروں جیسی مخلوق کا جواب نہیں۔ وعدوں سے اپنا دامن بھر لینے ہر جلسہ گاہ میں موجود رہتے ہیں۔ بعض جگہ کرائے کے سامعین بھی مل جاتے ہیں ــــ کرائے کے ہنسنے والے اور رونے والے بھی بآسانی دستیاب ہوتے ہیں۔ دنیا میں پیسے کے ذریعہ ہر کام ہوجاتا ہے۔ بعض لوگوں کے ہاں میت پر رشتہ دار نہیں روتے۔ صرف کرائے کے رونے والے دور بیٹھ کر روتے ہیں۔

پرچۂ نامزدگی داخل کرنے سے پہلے ہمارا چولا بدلا گیا تھا۔ یہ سیاسی چولے ہوتے ہی ایسے ہیں کہ

اچھا خاصا آدمی انہیں زیب تن کرنے کے بعد نیتا بن جاتا ہے۔ چولا بدلتے ہی ہم کو ایک برسی کی صدارت کروائی گئی۔ وہ بھی بغیر پیشگی اطلاع کے اور زبردستی ہم کو تقریر کرنے کے لیے ڈائس پر کھڑا کر دیا گیا۔ ہم قطعی لاعلم کہ موصوف کون تھے۔ خیر صاحب! مرتا کیا نہ کرتا۔ ہم نے مائیک سنبھالا اور یوں گویا ہوئے "بھائیو اور بہنو! مرحوم بہت ہی اچھے آدمی تھے۔ مرنا تو برحق ہے مرنا تو سب کو ہے، آج ان کی تو کل آپ کی باری ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہماری پارٹی آپ سب کی برسی کا اہتمام اسی طرح کرے گی ——" —— ہماری پارٹی اور شاید کرانے کے لوگوں نے زور دار تالیاں بجائیں اور کلیم بھائی زندہ باد کے نعرے گونج اٹھے۔ ایک بادشاہ گر نے مائیک پر اعلان کیا کہ "کلیم بھائی بہت بڑے لیڈر ہیں یہ عنقریب منسٹر بننے والے ہیں۔ آپ لوگ ان کے آٹوگراف لے لیں" یہ سنتے ہی لوگ ہم سے مصافحہ کرنے اور ہماری آٹوگراف لینے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ ایک منچلے نے آٹوگراف بک ہمارے چہرے کے قریب کر دی۔ کسی نے ہم کو دھکا مار دیا جس کی وجہ سے آٹوگراف بک میں ایک جانور کی شکل بن گئی جو کہ گدھے سے مشابہ تھا۔ اس نوجوان نے برجستہ کہا "جناب آپ کا آٹوگراف چاہیے تھا فوٹوگراف نہیں —" ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور وہاں سے بڑی مشکل سے چھٹکارا ملا۔

دوسرے دن پھر ایک جلسہ میں شرکت کی جہاں پر محلہ کی بزرگ ہستی کو صدر جلسہ بنایا گیا تھا۔ انھوں نے محلہ کے کسی صاحب کو تقریر کی دعوت دی۔ انھوں نے مائیک پر قبضہ کر لیا اور موقع غنیمت جان کر پچھلے پانچ سال کی کسر پوری کر لی وقت گزرتا گیا لیکن موصوف پر کسی کے رکنے اور ٹوکنے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دریں اثنا موصوف نے گھڑی پر نظر ڈالی تو ہمارے منہ سے بے خیالی نکل گیا، جناب گھڑی نہیں کیلنڈر دیکھیے، دوسرا دن شروع ہو چکا ہے پھر بھی بے سود، نہ کوما نہ فل اسٹاپ۔ کچھ دیر بعد ہم نے ان کے کان میں کچھ کہا اور وہ مائیک چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جلسہ کے اختتام پر بادشاہ گروں نے ہم سے دریافت کیا کہ کلیم بھائی ان صاحب کے کان میں آپ نے کیا کہا جس کی وجہ سے تقریر یک دم ختم ہوگئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے؟ ہم نے بتایا کہ ہم نے ان صاحب کے گوش گزار کیا کہ ان کی پتلون پھٹ گئی۔ بس تقریر ختم اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

الیکشن کے دوران تقاریر کے ساتھ ساتھ پد یاترا کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی گداگری ہے۔ پد یاترا میں گندگی صاف کرنی پڑتی ہے اور گندگی میں بیٹھنا بھی پڑتا ہے بعض جگہ دھتکار بھی سننی پڑتی ہے۔ ہر ووٹر کے گھر جاکر ہاتھ جوڑنے پڑتے ہیں۔ بعض مرتبہ تو ہم نے فقرا کو ہم پر ترس کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یونہی ووٹ مانگتے مانگتے، اپنے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹانا چاہتے تھے کہ اندر سے بیگم کی زوردار آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ادھر ادھر دیکھا تو بیگم کے غصے کی وجہ ہماری

دیوار پر موجود تھی یعنی ہمارے گھر کی دیوار پر جلی حرفوں میں لکھا تھا "گدھے کو ووٹ دو" جسے پڑھ کر ہمارا خون کھول اٹھا اور ہم نے بادشاہ گروں سے سوال کیا "یہ کیا ہے۔؟" تو جواب ملا "گدھے کو ووٹ دو" ہم نے کہا کہ آخر یہ گدھا کون ہے؟ تو ارشاد ہوا۔ جی آپ ہی وہ گدھا ہیں۔ ہمارا مطلب ہے کہ آپ کا امتیازی نشان گدھا ہے ۔۔۔" ہم نے کہا واہ کیا خوب 'امتیازی نشان ہے گدھے کے علاوہ کوئی اور امتیازی نشان نہیں مل سکا آپ لوگوں کو ۔۔۔؟ تو جواب ملا:

"جناب! آپ ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہے ہیں اور اس حلقہ انتخاب میں دو سو چالیس امیدوار میدان میں ہیں، ہر امیدوار کو ان کے پسندیدہ اور اچھے امتیازی نشان الاٹ ہونا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ویسے بھی شاید آپ کو علم نہیں کہ امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی (DEMO-CRATIC PARTY) کا امتیازی نشان بھی گدھا ہی ہے۔ بل کلنٹن نے اسی گدھے کے ذریعہ سب کو گدھا بنایا۔ ہم ہر چیز میں مغربی ممالک کی تقلید کرتے ہیں۔ لہٰذا امتیازی نشان کے معاملے میں کیوں ان سے پیچھے رہیں۔ آپ کو یہ لازم نہیں ہے کہ بل کلنٹن کی طرح عشق فرمائیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ "گدھا" بہت ہی محنتی خاموش طبع، بھولا بھالا، معصوم اور بے وقوف قسم کا جانور ہوتا ہے۔ بالکل آپ ہی کی طرح کبھی ادھر کی بات اُدھر نہیں کرتا، کبھی کسی کا قتل نہیں کرتا، کبھی کسی کا گھر نہیں لوٹتا، کبھی کسی عبادت گاہ میں گھس کر گندگی نہیں کرتا، وہ بھلا اس کا کام بھلا' کا عقیدہ اور گھاس کھا کر گزارا کر لیتا ہے، کبھی کسی پر بری نظر نہیں ڈالتا۔ کبھی کسی گدھی کا اغوا نہیں کرتا۔ انتہائی ایمرجنسی میں ہی دولتی کا استعمال کرتا ہے، جس کھونٹے سے چاہو باندھ دو تاحیات وہیں پڑا رہے گا۔"

گدھا کبھی زباں و مکاں کے جھگڑوں میں ملوث نہیں ہوتا۔ اس قوم میں زبان کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں:

سو بولیاں ہیں آپ کی ہندوستان میں
ڈھینچوں ہماری ایک ہے سارے جہان میں

دلائل واجب تھیں۔ ان دلائل کا زیرِ بکثرت پہنچ کر ہم جوں ہی اپنے مکان میں داخل ہوئے تو بیگم نے کرکٹ کے فاسٹ گیند باز کی طرح ہم پر بمپر ڈالا "اجی یہ باہر دیوار پر جلی حرفوں میں لکھے سو گدھا کون ہے؟" ہم نے بالکل خاکسارانہ انداز میں جواب دیا۔ "جی وہ گدھا" "آپ کا یہ ناچیز خاوند" ہے۔ آتش فشاں پھوٹ پڑا۔ "آپ کو یہ کیا ہو گیا۔ کہیں دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ یہ اشرف المخلوقات سے گدھا کب بن گئے؟ ۔۔۔ ہم نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ یقین جانیے وہ جو دیوار پر لکھا ہے وہ گدھا ہم ہی ہیں۔" آپ اور گدھا!!!" ٹھیک ہے، ہوں گے لیکن اس طرح اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" بیگم نے طنز کا تیر چھوڑا۔ ہم نے کہا "بیگم دوسروں کو بھی معلوم ہونا چاہیے نا۔" "اس طرح لوگوں کو اطلاع کروانے کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے؟ بیگم نے پھر سوال کیا۔ ہم نے کہا بیگم! بات دراصل یہ ہے کہ ہم اسمبلی

انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں اور اتفاق سے یہ خاموش طبع، شریف الخاندان، حنفی گدھ
ہمارا نشانِ امتیازی ہے۔ ہماری بات کاٹتے ہوئے بیگم نے کہا "روزانہ ایسے ویسے آدمیوں
کی آمدورفت دیکھ کر میں سمجھی چلو اپنا آدمی چوری چھپے اسمگلنگ کر رہا ہے۔ اس لیے خاموش رہی۔
لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ آج ابا جان، بھائی جان سب
کو بلوا کر آپ کا کچھ نہ کچھ تصفیہ کرنا پڑے گا ——— ابھی آپ بھول گئے۔ شادی کے بعد ہمارے
ابا جان سے وعدہ کیے تھے کہ کبھی زندگی میں کوئی ایسا ویسا کام نہیں کریں گے۔ پھر اب یہ لکا یک
آپ کو کیا ہو گیا ہے ——— یا اللہ میں اپنے خاندان والوں کو کیا صورت دکھاؤں گی۔ لوگ میری
طرف انگلیاں اٹھائیں گے ——— سب کے مکانوں پر پھیری لگا کر بھیک کی جھولی پھیلائیں گے
ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔

ہم نے کہا "یہ کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے۔ یہ تو بہت ہی عزت کا کام ہے۔ شاید
آپ کو معلوم نہیں ووٹ کے لیے گھر گھر پھرنا صرف الکشن تک ہے۔ آپ بے فکر رہیں ان شاء اللہ
ہم ضرور الیکشن جیت کر ان شاء اللہ وزیر بن جائیں گے۔ ہم جن کے کہنے پر الیکشن لڑ رہے
ہیں انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ الیکشن کے نتیجہ کے بعد ہم وزیر بنا دیئے جائیں گے۔ اس لیے تو ہم
الیکشن لڑ رہے ہیں۔ ورنہ ہم کو ان چیزوں سے کیا لینا دینا ——— وزارت کے ملنے پر رہنے کو
کوٹھی ہوگی۔ ساتھ میں بہت سارے نوکر چاکر۔ کام کچھ نہیں ہوگا۔ آئندہ پانچ سال تک صرف
تقاریب میں شرکت کرنا، تقریر کرنا، کھانا کھانا اور واپس آجانا۔ آنے جانے کے لیے سرکار
موٹر کار، روزانہ تقاریب ہوں گی۔ صبح دوپہر شام کبھی سالگرہ، کبھی برسی، چہلم، زیارت
جاترا، عرس وغیرہ۔ ذرا غور کیجیے۔ آپ کے خاندان کے سارے مرحومین کی فاتحہ، زیارت
چہلم، برسی سب حکومت کے خرچ سے ہوگی۔ اس کے علاوہ سالگرہ، عقیقہ، تسمیہ خوا
شادی بیاہ بھی سرکاری طور پر ہوگی۔ آپ کے دادا پردادا، نانا پرنانا چاہے ہوں یا نہ ہوں بڑ
دھوم سے کی جائے گی تو آپ کے دوست احباب میں کتنی عزت ہوگی۔ وہ آپ کی ترقی پر
رشک کریں گے۔ برسی کے دن ان مرحومین کی تصاویر اخباروں میں شائع ہوں گی اور مزاروں
پر سرکاری پھول چڑھائے جائیں گے اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی دعائے مغفرت بھی
ہوگی۔ جس سے فائدہ یہ ہوگا کہ اگر ان کی مغفرت نہیں بھی ہوئی تو اب یقیناً ہو جائے گی۔ اس
طرح ان مرحومین کی روح کو کتنا سکون نصیب ہوگا۔ ماسوائے اس کے سرکاری مسلمانوں
میں ہمارا بھی شمار ہوگا! بیگم! وزیر کی بیوی کی شان کا آپ اندازہ نہیں کر سکتیں ——— " اتنا
سننا تھا کہ بیگم کی باچھیں کھل گئیں اور انھوں نے مسرت بھرے لہجے میں سوال کیا کہ "آپ کے
وزیر بنتے ہی سب سے پہلا کام کیا کریں گے ——— ؟ سوال بہت مناسب تھا۔
. . . . ہم نے بھی ایک بہت ہی معقول سا جواب دیا کہ "وزیر بننے کے ہم سب سے

پہلے امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس، چین اور جاپان کے دورے پر جائیں گے۔ ان ترقی یافتہ ممالک میں یہ مشاہدہ کرنے کے لیے کہ وہاں برسی، چہلم، زیارت، عرس، ساتواں، دسواں، جاترا، رتھ یاترا وغیرہ کے علاوہ سالگرہ، شادی، تسمیہ خوانی وغیرہ تقاریب کس طرح منعقد کی جاتی ہیں۔ بیرونی ممالک کے دورے پر ہم سب جائیں گے۔ دیوی گوڑے جی کی طرح۔ یہ لالچ کام آگیا اور بیگم نرم پڑ گئیں۔ بیگم کی رضامندی الیکشن کمیشن کی رضامندی کے مماثل تھی۔ بیگم کا خاندان کافی پھیلا ہوا تھا۔ بیگم کی رضامندی سے ہمارے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اور ہم کھل کر دل و جان سے الیکشن میں کود پڑے۔ الیکشن کے دن بھی دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔ الیکشن سے چار دن قبل بادشاہ گروں نے ایک شاندار جلوس کا اہتمام کیا۔ جس میں چار سو کے قریب گدھوں کو پکڑ پکڑ کر لایا گیا۔ کچھ گدھے دھوبیوں اور کمہاروں کے ہاں سے حاصل کیے گئے تھے۔ صبح سویرے جبکہ ہم ناشتہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ بادشاہ گر ہمارے مکان پر نازل ہوئے اور ہمیں زبردستی اٹھا کر ہمارے امتیازی نشان پر بٹھا دیا گیا۔ ہم نے لاکھ سمجھایا کہ ہم نے ناشتہ نہیں کیا۔ کچھ دیر ٹھہر جائیں تو ناشتہ کر لیں گے لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ ہم بھی گدھے پر سوار تھے۔ وہ گدھوں کے بالکل بیچ میں چل رہا تھا۔ اس پر سے اتر کر جانا بھی ناممکن تھا لہٰذا ہم گدھے پر سوار آگے بڑھنے لگے۔ گدھوں کی طرح ہم کو بھی زبردستی جلوس میں شامل کیا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی منزل سے لاعلم تھے۔ اور ہم کو معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے لیکن کن راستوں سے گزرنا تھا ہم اور گدھے دونوں نہیں جانتے تھے ——— وہ بے چارے خاموش گردن نیچی کیے چلے جا رہے تھے۔ چاروں طرف گدھے ہی گدھے کیا ڈسپلن ہے اس قوم میں چار سو گدھے ایک جگہ جمع ہیں اور ایک دوسرے سے بات چیت نہیں۔ کسی کی غیبت نہیں۔ اس کے برعکس چار سو آدمی ایک جگہ جمع ہو کر خاموش نہیں رہ سکتے چاہے وہ غمگین ماحول ہی کیوں نہ ہو۔ گدھوں کے سامنے جو لیڈر قسم کے لوگ چل رہے تھے وہ نعرہ بازی میں مصروف تھے۔ مخالفین پر دل کھول کر کیچڑ اچھالا جا رہا تھا۔ شکر ہے کہ گدھوں کے مالکین ساتھ چل رہے تھے۔ جن کا کام گدھوں کی نگرانی کرنا تھا تاکہ گدھے گدھے پن پر قائم رہیں۔ انسان کی طرح نعرے بازی شروع نہ کر دیں ——— جلوس سارے حلقۂ انتخاب کا گشت لگانے والا تھا۔ ایک منچلے نے فقرہ کسا۔ "دیکھو گدھے پر گدھا سوار ہے۔" اس بے عزتی کو گدھوں نے برداشت کر لیا کیونکہ وہ اس کے عادی تھے، بادشاہ گر راستہ تمام یہی ایک جملہ دہراتے تھے اور ہماری طرف اشارہ کر کے کہتے جاتے، گدھوں کو ووٹ دو "جیتے گا بھائی جیتے گا ہمارا گدھا جیتے گا۔" حلقہ کی گشت لگاتے ہوئے جلوس ہر چوراہے پر ٹھہر جاتا اور بادشاہ گر ہماری طرف اشارہ کر کے کہتے ——— بھائیو! یہ گدھا آپ کا اپنا گدھا ہے۔ یہ آپ کا سارا بوجھ اٹھا لے گا۔ آپ اپنا قیمتی ووٹ گدھے کو دیں اور گدھے کو کامیاب بنائیں۔ اسی طرح حلقہ کی گشت کرتے ہوئے صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہوئی اور ہم جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ ہزارہا لوگوں نے ہمارا استقبال کیا اور بڑی مشکل سے ہم کو

ہمارے امتیازی نشان پر سے اتار گیا گدھے کی پیٹھ پر سواری کرنے سے ہمارا برا حال تھا۔ ہم میں کھڑے رہنے کی سکت بھی نہیں تھی اوپر سے بھوک کی شدت، نقاہت طاری تھی۔ اسی حالت میں دو آدمیوں نے ہمیں سہارا دے کر ڈائس تک پہنچا دیا۔ اوپر چڑھتے ہی چکر محسوس ہونے لگی۔ کسی کو احساس نہیں تھا کہ ہم صبح سے بھوکے ہیں۔ ایسے میں تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر مقرر ہماری تعریف کے پل باندھ رہا تھا، ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ ہم میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ بعض لوگوں کی جنرل نالج پر تعجب ہوا کہ وہ ہمارے متعلق، ہم سے بھی زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ اسی دوران ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ مرنے کے ساتھ ساتھ الیکشن میں کھڑے رہنے پر اچھائیوں میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ مخالف پارٹی منہ نہ کھولے۔ تقاریر کا یہ سلسلہ یونہی رات دیر گئے تک چلتا رہا۔ آخر کار ہماری باری آئی۔ بادشاہ گروں نے ہم کو سہارا دے کر مائیک کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ہم میں کھڑے رہنے کی قوت نہیں تھی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ہم نے میز پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر غٹا غٹ پی لیا۔ پانی پینے سے کچھ راحت نصیب ہوئی اور ہم یوں گویا ہوئے ——— "بھائیو اور بہنو!! پچھلے کئی برسوں سے دوسری پارٹیاں آپ کو دھوکہ دیتی چلی آ رہی ہیں۔ ایک موقع ہمیں بھی دیجیے، آپ کو یقیناً مایوسی نہیں ہوگی۔ بھائیو! ہم کوئی غیر نہیں آپ ہی کے ساتھی ہیں ——" کسی منچلے نے نعرہ کسا "موصوف گدھوں سے مخاطب ہیں ———" جس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اسی دوران ہم پر نقاہت طاری ہو گئی۔ جس کے باعث ہم چکرا کر دھڑام سے گر پڑے ——— اسی لمحہ مائیک پر آواز آئی:

"بھائیو! اب ہمارے امتحان کا وقت ہے۔ مخالف پارٹیوں کے غیر سماجی عناصر نے ہمارے ہر دل عزیز امیدوار کلیم بھائی پر سنگ باری کر کے شدید زخمی کر دیا ہے اور وہ خون میں لت پت آپ کے سامنے ڈائس پر پڑے آخری سانس لے رہے ہیں۔ اب ہم خاموش تماشائی بنے نہیں رہ سکتے۔ ہم کو اس ظلم کے خلاف متحد ہو کر آواز بلند کرنی چاہیے۔ ورنہ یہ غنڈہ گردی اسی طرح ہوتی رہے گی۔ اس ظلم کے خلاف لڑنے والے بے باک لیڈر کو ووٹ دے کر ایوان میں پہنچائیے اور اپنا ووٹ صرف گدھے کو دیں۔ "VOTE FOR DONKEY" "گدھے کو ووٹ دو" "گدھا زندہ باد"۔ نعرے فضا میں گونج اٹھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ انھوں نے بھی اپنے ڈھینچوں، ڈھینچوں کے ذریعہ انسانی نعروں کا جواب دینا شروع کیا۔ نعرہ "گدھے کو ووٹ دو" جواباً "ڈھینچوں" "جیتے گا بھائی جیتے گا" جواباً "ڈھینچوں"۔ اسی طرح دیر تک اشرف المخلوقات اور جانوروں کے درمیان سوال جواب چلتا رہا۔ بعض منچلوں کو گدھوں کا جواب پسند نہیں آیا اور انھوں نے گدھوں پر پتھر برسائے جس کے باعث گدھے [illegible] جلسہ گاہ میدان حشر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ مائیک پر اعلان [illegible] گدھوں کے پیچھے بھاگیں۔ "گدھوں کے چلے جانے کے [illegible]

میں ڈال دیا۔ تب ہم کو محسوس ہوا کہ اندھیرے میں ان بادشاہ گروں نے ہماری مرہم پٹی بھی کر دی تھی تاکہ محلہ کے عوام کی ہمدردی حاصل ہو سکے، خیر صاحب جلسہ گاہ سے ایک جلوس کی شکل میں یہ قافلہ روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک بادشاہ گر نے پان کی دکان سے پان لیا چبایا اور تھوک ہاتھ میں لے کر ہمارے سر کی پٹی پر لگا دیا۔ یہ جلوس رات کے اندھیرے میں مخالف پارٹیوں کے خلاف نعرے لگاتا ہوا ایک گھر کی گیٹ کے پاس جا کر رک گیا اور ہم کو چند لوگوں نے گاڑی سے اتار کر ایک کمرے میں بستر پر لٹا دیا۔ ہم نے خفیف و ناتوان آواز میں بادشاہ گروں سے التجا کی کہ ہم کو کچھ کھانے کو دیں۔ ہم کچھ کھائیں گے تو انشاءاللہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ ہم پر کسی نے سنگ باری نہیں کی ہے۔" اس کے جواب میں ایک بادشاہ گر نے کہا" جناب یا الیکشن جیتنا ہے تو خاموش پڑے رہیے۔ آپ پر حملہ ہوا ہے۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں۔"

خیر صاحب! صبح ہوتے ہوتے ہم پر حملے کی اطلاع آناً فاناً سارے محلہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا دی گئی۔ لوگ ہمارا شاید آخری دیدار کرنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔ ان میں بیگم اور بچے بھی شامل تھے۔ ہاتھ کے اشارے سے ہم کو الوداع کہہ رہے تھے۔ دریں اثنا اخبار، پولیس بھی کمرے میں نمودار ہو گئے لیکن بادشاہ گروں نے کسی کو ہمارے قریب نہیں آنے دیا۔ انھوں نے خود ہماری طرف سے بیان دیا اور حملہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔ اسی طرح دن گزرنے لگے۔ ہم تو مقید تھے بادشاہ گروں کے ہاں۔ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ الیکشن کا دن آ گیا۔ چونکہ پچھلے چار پانچ دنوں کے دوران فاقہ کشی سے ہم نڈھال ہو چکے تھے، بھوک کی شدت سے ہم پر غشی طاری ہو گئی اور ہم بے ہوش ہو گئے۔

دوبارہ ہوش آیا تو اپنے آپ کو کسی دواخانہ کے بستر پر پایا۔ گلوکوز کی نلکی لگی ہوئی تھی۔ بیگم اور بچے ہمارے بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی لمحہ بادشاہ گر دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں پھول کے ہار تھے اور مٹھائی کے ڈبے۔ ان کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔ انھوں نے بیک آواز کہا" مبارک ہو گدھا جیت گیا" اور انھوں نے ہم پر پھول چڑھائے۔ اس کے ساتھ ہی مبارک باد کا شور بلند ہوا۔ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ بچے ہم پر چڑھائے گئے پھول ٹھیک کرنے لگے۔ بیگم کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا ـــــ!

فرطِ مسرت سے ہم بھی چلا اٹھے۔ "گدھا جیت گیا۔" اب ہم وزیر بن جائیں گے۔ بیگم ہمارا عہدہ ہوگا۔ وزیر منائے سالگرہ، بوسی ـــــ مبارک ہو ـــــ مبارک ہو......"

"ابھی یہ کیا ہو گیا آپ کو۔ یہ وزارت کا کیا چکر ہے اور یہ گدھا کون ہے؟" بیگم نے دریافت کیا۔ ہم کو جھنجھوڑ کر نیند سے جگایا۔ ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ کافی دن نکل آیا تھا اور ہم ابھی تک گھر میں بستر پر دراز تھے۔

علیم خان فلکی
(جدّہ)

خبریں
صرف بالغوں کے لیے

بیشتر لوگوں نے ٹی وی خرید چکنے کے بعد یہ سوال اٹھایا تھا کہ ٹی۔ وی جائز ہے کہ نہیں لیکن مولویوں کے لیے یہ سوال ٹی وی خریدنے سے پہلے درپیش تھا۔ کسی پہلو سے جائز ہونے کا کوئی جواز نہ نکلا۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ خبریں ہی وہ واحد ذریعہ ہیں جس کے توسط سے آدمی نہ صرف حالاتِ حاضرہ سے مکمل آگاہ رہتا ہے بلکہ دشمنوں کی چالوں سے بھی باخبر رہتا ہے۔ بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیوی بچے دوسرے گھروں میں جاکر ٹی وی کی دوسری لعنتوں سے مستفید ہونے سے بچ جاتے ہیں اس لیے بحالتِ مجبوری ٹی وی جائز قرار پایا ہے۔ ویسے ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کسی مولوی صاحب کو شکار کا شوق تھا۔ ایک دن ان کی جال میں ایک تیتر اور ایک کوا پھنس گئے۔ کوا بے تحاشہ رونے لگا۔ تیتر نے اسکو بہت سمجھایا کہ بھائی یہ مسلمان ہے اس کے ہاں میں تو جائز ہوں لیکن کوا ناجائز ہے وہ تجھے حلال نہیں کرے گا۔ کوے نے کہا " نہیں بھائی کوئی بھروسہ نہیں یہ مولوی ہے کوئی نہ کوئی فتویٰ ڈھونڈ نکالے گا"

خیر تو صاحب خبروں کی خاطر ٹی وی کو گھر لانا ہی پڑا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب اشتہارات کی اس قدر تکلیف دہ بہتات نہ تھی۔ پھر ..... اشتہارات ہر پروگرام میں اس طرح شامل ہوگئے جس طرح گھر کے ہر سامان کے ڈبے سے جھینگر نکل آتے ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ خبروں کا اہم آئٹم بھی اشتہارات کا شکار ہوا۔ آپ کسی اہم خبر کے انتظار میں ہیں۔ درمیان میں کم بخت اشتہار ایسے آدھمکتا ہے جیسے آپ بہت اچھے موڈ میں حجلہ عروسی میں داخل ہوں اور تکیے کے نیچے سے جھینگر نکل آئے۔ یہی کیفیت ہماری ان اشتہارات کے شروع ہونے پر ہوتی ہے۔ پھر پتہ نہیں چلتا کہ ہم اشتہارات کے درمیان خبریں دیکھ رہے ہیں یا خبروں کے درمیان اشتہارات۔ پہلے

ایک ضابطۂ اخلاق تو تھا کہ کھیل کے دوران کھیل کود کے سامان کے اشتہارات ہوا کرتے ۔ بچوں کے پروگرام کے دوران بچوں کی تعلیم کھیل کود کھانے پینے کی چیزوں کے اشتہارات ہوا کرتے تھے اس لیے خبروں کے علاوہ بھی ٹی وی کھلا رہ جائے تو ہم موقع و پروگرام دیکھ کر بچوں کو ٹی وی دیکھنے کی اجازت دے دیتے لیکن اشتہارات کی کثرت نے کسی پروگرام کو اس لائق نہیں رکھا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عین خبروں کے درمیان انڈر ویر اور چڈی کا اشتہار اچانک شروع ہو جاتا ہے وہ بھی اس طرح کہ ایک محترمہ شب خوابی کے لباس میں ملبوس بے خبر سو رہی ہیں ۔ دروازہ توڑ کر کوئی اندر داخل ہوتا ہے ۔ محترمہ مدد کے لیے چلاتی ہیں ۔ اتنے میں کھڑکی کا شیشہ ٹوٹتا ہے اور ایک نوجوان صرف ایک عدد انڈر ویر پہنا ہوا کھڑکی توڑ کر داخل ہوتا ہے اور دروازہ توڑ کر داخل ہونے والے کی پٹائی شروع کر دیتا ہے ۔ یہاں تک تو ہم جو کچھ دیکھ رہے تھے اسے بھی نیوز کا ہی حصہ سمجھ رہے تھے ۔ بیوی بھی پوچھنے لگی کہ یہ کہاں ہوا؟ پھر اگلے ہی لمحے نوجوان خوب پٹائی کر چکنے کے بعد محترمہ کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے جو اس دوران اپنے کپڑے درست کر رہی ہوتی ہیں ۔ نوجوان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھتی ہیں اس پھرتی کا راز کیا ہے ۔ نوجوان انڈر ویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فخر سے اعلان کرتا ہے کہ "نیشنل پرائیڈ انڈر گارمنٹس" ایسے اشتہار اگر کلنٹن اور مونیکا کی خبروں کے درمیان آ جائیں تو لطف دوبالا ہو جائے لیکن واجپائی جی کی تقریر سے پہلے یا درمیان میں ایسے اشتہار پیش کرنا ایک مجرد آدمی کی توہین ہے ۔

ان بیہودہ اشتہارات کی وجہ سے ہم کو ریموٹ ہاتھ میں لیے چوکنا بیٹھنا پڑا ۔ جہاں سے اشتہار شروع ہوا ہم نے چینل بدل ڈالی ۔ وہاں بھی یہی حشر دیکھ کر پھر ایک چینل پھر ایک چینل ۔ اس طرح خبروں پر جب واپس آتے تو پتہ چلتا کہ دو تین خبریں نکل چکی ہیں ۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ہم خود خبروں کے درمیان اشتہار میں کھو گئے اور بچوں نے غیرت پسرانہ کے ساتھ آواز دی ابا چینل بدلیے ۔ خیر صاحب اس طرح ہم خبروں کو بھی سنسر کر کے بچوں کو دکھلانے لگے صرف خبریں ہی تو ایسی رہ گئی تھیں کہ جو فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی و سنی جا سکتی تھیں ۔ پھر ہوا یوں کہ مونیکا لیونسکی اور کلنٹن کے بارے میں خبریں آنے لگیں ۔ ایک آدھ تصویر بھی آ جاتی پھر اس اسکنڈل کی تحقیقات جیسے جیسے آگے بڑھنے لگیں ہمارا ٹی وی کو جائز کرنے کا جواز خطرے میں پڑنے لگا ۔ پھر ایک وقت آیا جب CNN نے خود اعلان کر دیا کہ آگے کی خبریں صرف بالغوں کے لیے ہیں ۔ بچے نہ دیکھیں ۔ ہم نے تو بچوں کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنے ٹی وی خریدا تھا اب حالاتِ حاضرہ سے بے خبر رکھنے پر مجبور ہیں ۔ اب بچے پوچھتے ہیں کیا دیکھیں؟ ہم کہتے ہیں خبروں کے علاوہ جو چاہو دیکھ لو ۔ بچوں نے خوشی سے پوچھا اشتہارات بھی؟ ہم نے کہا وہ بھی بشرطیکہ اس میں کلنٹن یا مونیکا لیونسکی کا اشتہار نہ ہو ۔ اس طرح اب ہمارا نظریہ بدل گیا اب ہمارے نزدیک خبروں سے زیادہ مخرب اخلاق کوئی اور پروگرام نہیں ۔ اسے دیکھ دیکھ کر بچے عجیب عجیب سوال کرنے لگے ہیں جیسے :

ڈیانا کہاں جا رہی تھی ؟
فرگوسن کو طلاق کیوں ہوئی ؟
نیلسن منڈیلا کے ساتھ عورت کون ہے ؟

پہلے تک ہندوستانی خبریں دیکھ کر ہم سمجھا را دتا ور لالو پرساد کے اسکینڈلس کے بارے میں سوالات کرتے تو ہم جوابات دے دیتے لیکن اب یہ پوچھنے لگے ہیں :-

چندرا بابو کی ساس ... پاروتی جی سے دشمنی کیوں ہوئی -
اظہر الدین نے کیوں طلاق دی -
سیتا وائٹ عمران خاں سے کیا چاہتی ہے ؟
صدر ارشاد عورتوں میں بدنام کیوں ہے ؟

ایسی بے شمار معلومات تو بچے دوردرشن TV سے پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں پھر بھی لوگ کبھی کلنٹن کو اور کبھی CNN کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں حالانکہ اس بے چارے نے جو کچھ کیا اس سے کہیں زیادہ ہمارے برصغیر کے لیڈروں نے کر دکھایا ہے - اس کا قصور یہ تھا کہ وہ قانون کی زد میں آ گیا - لوگ سمجھتے تھے کہ صدر ہونے کے لیے انتہائی اعلیٰ کارکردگی کی ضرورت ہے لیکن موصوف کی کارکردگی بکھر جانے کے بعد نہ صرف وہائٹ ہاوز کے اندر کا ہر آفیسر بلکہ بے شمار سرکاری افسران اس سے بہتر کارکردگی کی بنیاد پر صدارت کا دعویٰ کر سکتے ہیں - کم بخت نے ایک ایسے واہیات مسئلہ کو آفاقی مسئلہ بنا دیا ہے کہ لوگ فلسطین و کشمیر کے مسئلے کو ہی نہیں غربت، بے روزگاری فرقہ پرستی فساد وغیرہ جیسے گمبھیر مسائل کو بھی اتنی دل چسپی سے نہیں دیکھتے نہ اس پر گفتگو کرتے ہیں جتنا کہ موصوف کے مسئلے کو اہمیت دیتے ہیں - ہمارے ٹی وی کے ذمہ داروں سے گزارش ہے کہ جس طرح سگریٹ کی پیاکٹ پر لکھا جاتا ہے کہ تمباکو نوشی صحت کے لیے نقصان دہ ہے اسی طرح خبروں سے پہلے بھی یہ نشر کر دیں کہ خبریں آپ کے اور آپ کے بچوں کی اخلاقی صحت کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہیں -

---

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

سب کچھ واہمہ ہے

آخر وہی ہوا جس کا ہم برس ہا برس سے ڈھنڈورہ پیٹتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن فی زمانہ ادیب کی بات بھلا سنتا کون ہے چنانچہ ہمارے ادبی واہمہ کو بھی یار دوستوں نے خداداد صلاحیت ہی سمجھ لیا۔ چلیے ہماری بات چھوڑیئے۔ ہم ہیں ہی کس شمار و قطار میں لیکن انگریز ماہر نفسیات کی بات تو پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ وہ جب بات کرتا ہے تو عوام و خواص کی نفسیات کو مدّنظر رکھ ہی کرتا ہے۔ چنانچہ لندن کے جناب میکائیل لاول جیسے عظیم ماہر نفسیات نے یہ کہہ کر ہمارے سوا دیگر بڑے بڑے دانشوروں کو حیرت میں ڈال دیا کہ دنیا میں خداداد صلاحیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی جو کچھ ہوتا ہے واہمہ ہوتا ہے یعنی خداداد صلاحیت کا عوام الناس کو وہم ہو گیا ہے اور یہ واہمہ ہی دراصل وہ چیز ہے جسے بھولے بھالے لوگوں نے خواہ مخواہ خداداد صلاحیت کا نام دے رکھا ہے۔ اس دل لگتی بات کو سن کر جب ہمارا تجسس بڑھا تو ہم پر نئے نئے انکشافات کے دروازے وا ہونے لگے۔ زیادہ کھوج کرنے پر ایک راز کی بات معلوم ہوئی ہے کہ مذکورہ ماہر نفسیات نے گہرائی میں جا کر یہ پتہ لگایا ہے کہ ہر شخص دنیا کا ہر کام کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ محنت و مشقت سے کام لے چنانچہ اسی فارمولے کو اپناتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن نے صبح و شام گھنٹہ گھنٹہ بھر مشقت کرنے کی خاطر ڈنڈ پیلنے شروع کر دیئے۔ اس عمل کا ایسا جادوئی اثر ہوا کہ ایک دن اچانک ہی اس کا واہمہ جاگ اٹھا لہٰذا اس نے یہ معلومات دنیا کو دے کر سنسنی پھیلا دی کہ تابکار کمیت توانائی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

اسی طرح رائٹ برادران [illegible] عام لوگوں کی غلط فہمی شامل حال رہی ہے حالانکہ ان میں خداداد صلاحیت نام کو نہیں تھی وہ تو صرف محنت و مشقت کی خاطر پہاڑوں پر اچھل کود کرتے تھے۔

جب ان کی یہ طفلانہ حرکت اپنے عروج پر پہنچی تو ایک دن واہمہ آدھمکا۔ اس نے للکار کر کہا "اے کم بختو! یوں کیوں بھاگتے ہو۔ ہوا میں کیوں نہیں اڑتے"۔ رائٹ برادران نے عاجزی سے منت کی "محترم واہمہ صاحب ہم میں خداداد صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ہم بھلا کیسے ہوا میں اڑ سکتے ہیں"۔ واہمہ نے خفگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "بچو! بھول جاؤ کہ خداداد صلاحیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ تم نے کس الّو کا نام لے لیا اصل چیز تو میں ہوں"۔ رائٹ برادران نے اتنا سنتے ہی فوراً اس کے قدم پکڑ لیے اور بولے " واہمہ صاحب اب ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے تاوقتیکہ ہمیں ہوا میں اڑنے کا گر نہ سکھا دیں"۔ واہمہ نے شفقت سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور ہوائی جہاز بنانے کی ترکیب سکھا دی۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ خدا معلوم کتنے ہی قسم کے ہوائی جہاز آج ہمارے سروں پر چیل، کوؤں کی طرح منڈلاتے پھر رہے ہیں۔

ایسے ہی ایک شخص مارکونی نامی گزرا ہے۔ مارکونی کو بچپن ہی سے مرغا بیٹھنے کی عادت تھی اور وہ گھٹنوں، پیروں کے درمیان ہاتھ نکالے کان پکڑے بیٹھا رہتا تھا۔ ایک دن حسب معمول بیٹھا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا تب کیا دیکھتا ہے کہ سامنے لمبا تڑنگا کوئی کھڑا ہے۔ مارکونی غریب ڈر کر کانپنے لگا۔ لمبے تڑنگے نے پیار بھرے لہجے میں کہا: "بیٹا مجھے تمھاری یہ ریاضت بہت پسند آئی۔ میں تمھیں ڈرانے نہیں آیا ہوں میرا نام واہمہ ہے۔ میں تمھیں ایسی چیز بتلاؤں گا کہ جس کی بدولت تم اپنی بھونڈی آواز کو دور دور تک پہنچا سکو گے۔ اتنا سنتے ہی مارکونی اٹھ بیٹھا اور بولا لیکن واہمہ صاحب مجھ میں خداداد صلاحیت" وہ ہکلایا۔ واہمہ نے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ "چپ۔ دیکھو۔ مجھے بھول کر خداداد صلاحیت ہی کا نام جپتا ہے۔ ارے نادان اصل چیز تو میں ہوں دیکھ میں کیا کرتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر اس نے مارکونی کا ہاتھ پکڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ریڈیو سیٹ تیار کر ڈالا۔ مارکونی خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ اس کے ہاں باسی لڈو رکھے تھے انہی سے واہمہ کی تواضع کر ڈالی۔

اب ایک سچا واقعہ اور سن لیجیے کہ اب سے کوئی پون صدی پہلے ایک شخص نے دنیا کو آواز دی" کہ اے دنیا کے مزدورو۔ جاگو کب تک سوتے رہو گے۔ میں تمھیں خواب غفلت سے جگانے آیا ہوں۔ میرا نام کارل مارکس ہے"۔ لوگوں نے کہا تم کیا خاک ہمیں جگاؤ گے تم میں وہ خداداد صلاحیت ہی نہیں ہے کہ تم ہمیں اپنی پیاری نیند سے بیدار کر سکو۔ کارل مارکس نے مسکرا کر کہا۔ "اے بے وقوفو! خدا ہو گا تب خداداد صلاحیت بھی ہو گی۔ یہاں تو خدا کے دنجی کے لالے پڑے ہیں اور تم خداداد صلاحیت کی بات کرتے ہو خدا اور اس خداداد صلاحیت کا چکر چھوڑو۔ یہ جو بول رہا ہے یہ میرے اندر کا واہمہ ہے"۔ اور اس واہمہ نے اپنے وجود کو کچھ ایسا ثابت کیا کہ لوگ اس کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک مارکس کے واہمہ کی حکمرانی نے روسیوں جیسے چھوٹے شاہ پرست لوگوں کو سوپر پاور بنا دیا۔

آخر میں ایڈمنڈ ہلاری EDMUD HILLARY کی بات بھی سن لیجیے۔ یہ شخص بلا کسی نام نہاد خدا داد صلاحیت کے ۱۹۱۹ء میں آکلینڈ میں دنیا میں وارد ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں اسے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی سوجھی۔ رات کو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی سر سراتا ہوا آیا اور سرہانے کھڑا ہو گیا۔ بولا بیٹا اگر تم ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنا چاہتے ہو تو بھول کر خدا داد صلاحیت کا نام مت لینا کیونکہ جو چیز تمھیں پہاڑ پر چڑھنے کو اکسا رہی ہے وہ دراصل میں ہوں۔ میرا ہی نام واہمہ ہے۔" ہلاری نے کہا "تب تو واہمہ میاں آپ ہی میری مدد کریں۔ بتلائیں کہ میں کیونکر ہمالیہ سر کر سکتا ہوں" واہمہ بولا "میرے نام کا ورد کرتے رہو۔ ایک نیپالی تنزنگ نارگے نامی شخص تمھیں ملے گا۔ اسے ساتھ لوگے تو ضرور ایورسٹ سر کر سکوگے۔" اتنے میں ہلاری کی آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہے کہ نیپالی سامنے کھڑا ہے۔ فرطِ مسرت سے اس کی باچھیں کھل گئیں بولا واہمہ زندہ باد اور ۲۹ رمئی ۱۹۵۳ء کو ان دونوں نے ایورسٹ کی چوٹی پر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ بعد میں ہلاری نے HIGH ADVENTURE نامی کتاب لکھی جس میں تحریر کیا کہ ہم پہاڑ کو فتح نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو فتح کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ عام انسانوں کی طرح ہلاری بھی اتنا احسان فراموش نکلا کہ اس نے اپنی ضخیم کتاب میں کہیں بھی اپنے محسن واہمہ کا تذکرہ نہیں کیا۔

واہمہ کے ان تمام مذکورہ کرتبوں کو دیکھ سن کر ہم حیران و ششدر ہیں واہمہ کے اقسام پر غور کرتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ آئین اسٹائن کا واہمہ انھیں ایورسٹ کی چوٹی پر کیوں نہ لے گیا۔ کارل مارکس نے ریڈیو سیٹس کی ریپیرنگ کرنے کے بجائے اشتراکیت کا نظریہ کیوں اپنا لیا اور کیوں لاسلکی کا کام مارکونی نے اپنے سر لے لیا۔ اب تو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ تمام واہمہ ہی کی کارستانی ہے کہ جسے چاہا بنا دیا۔ افسوس ہے ان نام نہاد دانشوروں پر جو واہمہ کی اتنی بڑی بڑی صداقتوں کو دیکھ کر بھی خدا داد صلاحیتوں کی بات کرتے نہیں تھکتے۔ تف ہے ان پر —!

●●

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

محترمہ یونیورسٹی صاحبہ

[ڈاکٹر محمد یونس بٹ، پاکستان کے ممتاز کالم نگار ہیں۔ جن کے کالم بڑی پابندی کے ساتھ پچھلے چند سال سے مسلسل پاکستان کے علاوہ سعودی عرب میں شائع ہو رہے ہیں۔ .... ڈاکٹر محمد یونس بٹ کے (جن کی ڈاکٹری کا ادب سے نہیں طب سے تعلق ہے) کالموں سے تین مختصر مضامین شگوفہ کے قارئین کے لیے پیش ہیں۔]

لیجیے صاحب! اوساکا یونیورسٹی جاپان کے استاد اور پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم سویاما نے صاحب نے فرمایا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی اور اوساکا یونیورسٹی میں وہی فرق ہے جو مرد اور عورت میں ہے۔ ہم نے دونوں یونیورسٹیوں کی تصویریں بڑے غور سے دیکھیں مگر ہمیں وہ فرق نظر نہ آیا جس پر سویاما نے ان کی جنس کا تعین کیا ہے۔ یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ یہ بات انھوں نے اوساکا یونیورسٹی کی تعریف میں کہی ہے یا پنجاب یونیورسٹی کو عورت کہہ کر اس کے "حسن سلوک" بلکہ حسن اور سلوک کا ذکر کیا ہے چونکہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے طالب علم ہیں اور ہماری اردو شاعری میں جس کی بھی تعریف کرنا ہو اسے محبوبہ ہی کہتے ہیں بلکہ عاشق کو تو ہر طرف اپنی محبوبہ ہی نظر آتی ہے اگر وہ اتنی موٹی نہ بھی ہو پھر بھی ہر طرف وہی ہوتی ہے۔ سو ہو سکتا ہے اردو شاعری کے زیر اثر انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کو نازک اندام اور حسین کہنے کے لیے خاتون کا لفظ استعمال کیا ہو۔ لیکن یہ بات بھی یقین سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ جاپانی تو اپنی محبوبہ کی بھی تعریف کر رہے ہوں تو لگتا ہے کسی مشین کے پرزوں کی افادیت بتا رہے ہیں۔ سو اگر تعریف ہی کرنا مقصود ہوتی تو اسے مشین کہتے۔

جاپان سے ہمارا پہلا تعارف اس وقت ہوا جب ہمارا استاد ہمیں روزانہ آٹھ آنے دے کر کہتا "جاپان لا" ہم سمجھتے وہ جا، جہاں سب سے زیادہ پان ہوتے ہیں وہ

جاپان ہے لیکن کئی سال تک مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے وہاں کا چکر نہ لگایا تو ہمیں پلوں والی بات جھوٹ لگنے لگی۔ پھر ایک جاپانی نے بتایا کہ یہ تو مجمع الجزائر ہے جہاں پانی سے گھرے جزیرے ہیں۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ وہ جزیرے جاپانی کیوں کہلاتے ہیں۔

جنگ عظیم دوم میں ہیروشیما پر گرائے گئے بموں نے شیا کو تباہ کر دیا اور ہیرو بچ گیا دوسرے دن رات ایک کرنے کے لیے دن کو رات کرتے رہے اور یہ رات کو دن بنانے میں لگا رہا۔ یہی جاپان جب دنیا بلٹ بنانے میں لگی تھی یہ بلٹ ٹرین بنا رہا تھا۔ اب تو جاپان کی چیزیں اس قدر دیرپا ہوتی ہیں کہ وہاں کے تو بادشاہ بھی پچاس پچاس سال چلتے ہیں۔ ہر وہ شخص کار رکھ سکتا ہے جس کے پاس کار پارکنگ کی جگہ ہو۔ جاپان میں زلزلے اس قدر آتے ہیں کہ سست لوگ تو وہاں چائے میں چینی ڈال کر چمچ سے ہلانے کی بجائے زلزلہ آنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ وہاں کے پہلوان اس قدر موٹے ہوتے ہیں کہ وہ آرہے ہوں تو لگتا ہے فیوجی پہاڑ چل رہا ہے۔ ایک ایسا پہلوان زلزلے کی وجہ سے گھر سے نکل کر گلی میں آیا تو ہمسائے نے پوچھا آپ زلزلے کی وجہ سے باہر آئے ہیں یا زلزلہ آپکے باہر آنے کی وجہ سے آیا ہے۔ وہ بدھ کو پسند کرتے ہیں۔ ہمیں بھی بدھ پسند ہے۔ بشرطیکہ اس دن چھٹی ہو۔ تازہ ترین اور حیرت انگیز سروے رپورٹ کے مطابق جنگ عظیم دوم کے بعد سے جاپانیوں کا اوسط قد بڑھ رہا ہے اور پاکستانیوں کا اوسط قد کم ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے پچاس سال بعد ہم بھی جاپانی لگنے لگیں۔ وہ اس قدر پڑھتے ہیں کہ ہر وقت دو کتابیں ان کی بغل میں ہوں گی۔ پوچھا دو "کیوں" کہا "ایک اس لیے کہ جب پڑھنے کو دل چاہا کھول کر پڑھنے لگے اور دوسری کتاب اس لیے کہ کبھی پڑھنے کو دل نہیں بھی چاہتا۔" بک تو ہم بھی ساتھ رکھتے ہیں بشرطیکہ اس سے مراد چیک بک ہو۔ سویا مانے نے بتایا کہ اس کے ہاں تو محبوبہ کو بھی محبوبہ نہیں کہتے "پوچھا" کیا اس کے لیے کوئی لفظ نہیں "کہا" اس کے لیے کوئی وقت نہیں۔ اس سے تو لگتا ہے انھوں نے یونیورسٹی کو خاتون اس لیے کہا ہے کہ یہ بھی وقت ضائع کرتی ہے۔ کسی نے کہا تھا جو کچھ بندہ بیس سالوں میں سیکھتا ہے عورت اسے بیس دنوں میں بھلا سکتی ہے۔ یہ بات بھی شاید مسز لارڈ میکالے یعنی محترمہ یونیورسٹی صاحبہ کے لیے کہی گئی ہو کیونکہ یہاں سے جو بھی طالب علم فارغ العلم ہو کر نکلتا ہے، وہ بقراط سے کم نہیں ہوتا اور بقراط وہ دانشور ہے جسے اس کے دور کے لوگوں نے کہا کہ آپ کا علم اس دور کے سب عالموں سے زیادہ ہے تو بقراط نے کئی عالموں اور دانشوروں سے ملاقاتوں کے بعد کہا "واقعی میرا علم ان سب سے زیادہ ہے کیونکہ مجھے یہ تو علم ہے کہ مجھے کچھ علم نہیں جبکہ انھیں تو اس کا بھی علم نہیں۔" سو یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد بندے کو یہی علم ہوتا ہے۔ ایک ایسے طالب علم کو استاد نے کہا "تمھیں یہ

[illegible]

ہے"۔ تو اس نے کہا" سر! میں تو سمجھ رہا تھا یہ ان کا فون نمبر ہے۔ ایک طالب علم جو یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے دن رات پڑھ رہا تھا، وہ یونیورسٹی کے ایک استاد کے گھر گیا کہ میری راہنمائی کریں، میں یونیورسٹی جانا چاہتا ہوں۔ تو استاد نے کہا "یہاں سے ۳۴ نمبر ویگن میں بیٹھ جاؤ سیدھی وہیں جاتی ہے۔ ویسے بے روزگاری کم کرنے میں یونیورسٹی بڑا اہم رول ادا کر سکتی ہے اسے بند کر دیں تو سالانہ ہزاروں بے روزگاروں کی تعداد میں کمی آ جائے گی۔ ویسے بھی اب اس محترمہ کو گھر کا خرچہ ملنا بند ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے عنقریب نان نفقے کا دعویٰ دائر کرنا پڑے۔ ہسبنڈ اور وائس ہسبنڈ اس کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں جو ہمارے ہاں خواتین کے ساتھ ہوتا ہے۔ بہر حال سویا مانے کے اس بیان کے بعد الگ زنانہ یونیورسٹی کے مطالبے میں وزن نہیں رہا۔ ہاں البتہ الگ مردانہ یونیورسٹی کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ جب یہ دن میاں بیوی عقل استعمال کرتے ہیں جہاں ہم ہاتھ استعمال کرتے ہیں سو ہو سکتا ہے اس سال گرتے میرٹ کو دیکھ کر سویا مانے نے نوجوانوں کی یونیورسٹی میں عدم دلچسپی محسوس کی ہو اور انھوں نے لوگوں کو یونیورسٹی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے خاتون قرار دے دیا ہو۔ ویسے اگر یہی حال رہا تو ہو سکتا ہے محترمہ خود اپنے بارے میں اشتہار دیں :

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یاد رہے یہاں گلشن سے مراد کوئی خاتون نہیں ہے۔

مبارک ہو

یہاں مبارک سے مراد نثری شاعر مبارک احمد نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ایسے ہیں کہ بندہ ان کے سامنے کسی اور کو کہہ دے مبارک ہو! تو فوراً کہیں گے " نہیں! مبارک یہ نہیں میں ہوں" وہ تو عید کارڈ پر مبارک لکھا دیکھ کر سمجھتے ہیں" میں مشہور ہو رہا ہوں"۔ ہم نے یہ مبارک اس لیے دی کہ ایبٹ آباد بورڈ کے ایک طالب علم نے سو میں سے ۱۲۰ نمبر لے کر نہ صرف بورڈ بلکہ پورے برصغیر میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ یہ تو برا ہوا کہ لڑکے نے جس پرچے میں اتنے اچھے نمبر حاصل کیے وہ دیا ہی نہیں تھا۔ ورنہ اگر دیا ہوتا تو ممکن ہے وہ سو میں سے دو سو نمبر حاصل کر لیتا۔ اس سے قبل سندھ کے ایک وڈیرے کے بھائی نے انٹرویو میں، سو میں سے ۱۰۵ نمبر حاصل کیے تھے جس کی وجہ انٹرویو لینے والوں نے یہ بتائی تھی کہ موصوف نے ہر سوال کا صحیح جواب دیا۔ اور سو میں سے سو نمبر حاصل کیے لیکن کچھ اس نے ایسے جواب بھی دیئے جن کا انٹرویو کرنے والوں کے پاس کوئی سوال نہ تھا۔ یوں اضافی پانچ نمبر حاصل کر کے ۱۰۵ نمبر حاصل کیے۔

لوگوں نے اتنے اچھے نمبر حاصل کرنے پر محکمہ تعلیم کا شکریہ اور لڑکے کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے الٹا اعتراض کیا ہے۔ بہر حال اخبار نے اسے بڑے کمال کا لڑکا بتایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ

لوگ اس پر بھی اعتراض کریں۔ جیسے ایک اخبار نے لکھ دیا" فلاں فلم کا ہیرو کمال کا لڑکا ہے تو اداکار سید کمال صاحب نے کہا یہ غلط ہے وہ میرا لڑکا نہیں ہے۔ ویسے ہمارے خیال میں تو اتنے نمبر لینے والا ان کا لڑکا ہے وہ کمال کے ہیں۔ ہو سکتا ہے لوگ اس پر بھی اعتراض کریں کہ ہم نے اسے جن کا لڑکا لکھا ہے ایسے ہی ایک صاحب نے دوسرے سے پوچھا" آپ جنوں پر یقین رکھتے ہیں" تو اس نے کہا" پہلے تو نہیں رکھتا تھا مگر کل مسجد میں اعلان سن کر یقین آگیا" تو دوسرے نے پوچھا" کیا اعلان تھا؟ کہنے لگا" مولوی صاحب کہہ رہے تھے۔" مسجد میں جن کا بچہ ہے، آئیں اور پہچان کرلے جائیں۔" بہر حال اس کی وجہ سے ہمارے محکمہ تعلیم کا ذکر گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ہو سکتا ہے۔ پھر یہ ایسا ریکارڈ ہے جسے دنیا کا کوئی بھی طالب علم اس وقت تک نہ توڑ سکے گا، جب تک وہ پاکستان میں آکر امتحان نہ دے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس لڑکے نے یہ نمبر نقل کی وجہ سے حاصل کیے ہیں۔ ویسے تو ایبٹ آباد بورڈ کے کنٹرولر نقل کے بہت خلاف ہیں، جسکی ایک وجہ تو یہ ہوگی کہ نقل کے لیے عقل چاہیے۔ یوں ہو سکتا ہے انھوں نے یہ نمبر اس طالب علم کو نقل کی وجہ سے دیئے ہوں کہ وہ واحد لڑکا تھا جس نے اس پرچے میں نقل نہیں لگائی کیونکہ اس نے یہ پرچہ دیا ہی نہیں تھا۔ ویسے پرچہ اور طالب علم لازم و ملزم ہیں۔ کسی نے ایک طالب علم سے پوچھا" تم پر کتنے پرچے ہوئے ہیں؟ اس نے کہا کوئی نہیں"۔ تو پہلے نے کہا" مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم روز کالج نہیں جاتے۔ طلبہ کی تعلیم میں دلچسپی تو اتنی ہے کہ ایک اسکول میں محکمہ شہری دفاع والے ٹریننگ دے رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ بلڈنگ کو آگ لگ جائے تو فوراً اسے کیسے خالی کرنا ہے۔ ایک ماہ کی ٹریننگ کے بعد وہ صرف چار منٹ کی نوٹس پر ساری بلڈنگ خالی کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی خوشی میں سکول انتظامیہ نے پہلی ہی کلاس کے بعد ساری چھٹی کی گھنٹی بجا دی اور پوری عمارت دو منٹ میں طلبہ سے خالی ہوگئی۔

اتنے نمبر حاصل کرنے کا راز تو محکمہ تعلیم ہی بتا سکتا ہے کیونکہ وہ ہم سے زیادہ جانتا ہے۔ جیسے ایک آنکھ والے نے دو آنکھوں والے سے شرط لگائی کہ مجھے زیادہ نظر آتا ہے۔ دو آنکھوں والے نے پوچھا" کیسے؟" تو بولا" تمھیں اس وقت میری ایک آنکھ نظر آرہی ہے جب کہ مجھے تمھاری دو آنکھیں نظر آرہی ہیں سو مجھے زیادہ نظر آتا ہے۔" محکمہ تعلیم کے لوگوں کی ڈیوٹیاں اکثر الیکشنوں پر لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ راز انھوں نے وہاں سے سیکھا ہو کہ دس ہزار ووٹ والوں میں سے گیارہ ہزار حاصل کرکے کس طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر وزیر تعلیم بڑے کھلے دل کے ہیں۔ کوئی دس روپے مانگے تو پچاس دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے سارا محکمہ کھلے دل کا ہو گیا ہو جو پچاس نمبر مانگتا ہو اسے ایک سو بیس دے دیتے ہوں۔ ان سے پوچھو الف

کے بعد کون سا حروف تہجی آتا ہے تو کہیں گے "الف کے بعد سارے ہی حروف تہجی آتے ہیں۔"
ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب میں عورتوں کے ۴۰۴ چلتر لکھے ہیں۔ اس پر کسی نے مشتاق احمد یوسفی سے پوچھا کہ اس قدیم کتاب میں یہ کیوں لکھا ہے کہ عورتوں کے ۴۰۴ چلتر ہوتے ہیں تو یوسفی صاحب نے کہا "۴۰۴ اس لیے لکھا ہے کہ اس وقت تک صرف یہیں تک گنتی آتی تھی۔" ہو سکتا ہے محکمہ تعلیم ابھی تک ۱۲۰ پر ہی ہو جوں جوں ان کی گنتی بڑھے گی، نمبروں میں اضافہ ہوگا۔ ہم نے محکمہ تعلیم کے ایک بندے سے پوچھا "آخر سو میں سے ۱۲۰ نمبر کس پرچے پر ملے؟ تو انھوں نے کہا، آپ کا سوال ہی غلط ہے، آپ پوچھیں "سو میں سے ۱۲۰ نمبر کس پرچے پر ملے۔

●●

فلوانڈسٹری

اداکارہ شاہدہ منی کو بارش میں گیت فلماتے ہوئے فلو کیا ہوگیا، پوری فلم ٹیم یوں پریشان ہے جیسے یہ کسی کی اس فلم ٹیم کے خلاف سازش ہو۔ اگرچہ فلم کے لوگ رائی کو پہاڑ بنا دیتے ہیں جنہوں نے انجمن کو فلموں سے پہلے اور اب بھی دیکھا ہے۔ میری اس بات سے اتفاق کریں گے لیکن اس بار ان کا اندیشہ کچھ اتنا غلط بھی نہیں لگتا کیونکہ فلو یوں پھیلتا ہے جیسے ہماری ہیروئنیں پھیلتی ہیں۔ یوں یہ فلو اس فلم ٹیم کو لگ سکتا ہے۔ فلم ٹیم کو لگ گیا تو سمجھ لیں پورے سٹوڈیو کو لگ گیا۔ یہی نہیں، اس کے اثرات ہم تک بھی آ سکتے ہیں۔

برسات کا موسم دراصل برساتی کا موسم ہوتا ہے اور ہماری فلموں میں بارش کے گیت یوں فلمائے جاتے ہیں تاکہ فلمیں بھی بارش ہوں یعنی رش والی ہوں۔ پہلے ہیروئنیں بارش میں بھگونے کا رواج کم تھا جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہیروئنیں اتنی بڑی بلکہ بڑھی ہوتی تھیں کہ مصنوعی بارش میں انہیں مکمل بھگونے پر بڑا خرچا آتا۔ ان دنوں "وہ بھیگے بدن" کہتا تو لگتا "دو بیگھے بدن" کہہ رہا ہے۔ انجمن اور مسرت شاہین وغیرہ کے بعد اب لو بجٹ فلموں کا دور ہے۔ ہم نے ایک فلم ساز سے پوچھا "کیا دوسری ہیروئنیں کم پیسے لیتی ہیں؟" بولا "نہیں"۔ پوچھا "پھر نئی اداکاراؤں سے لو بجٹ فلمیں کیسے بن سکتی ہیں؟" کہا "اس طرح کہ ان کو فلمانے میں کئی میٹر کم فلم لگتا ہے۔" نئی اداکاراؤں کے آنے سے یہ ہوا کہ اب پرانی اداکاراؤں کو لوگ بھولنے لگے ہیں۔ اگرچہ انھیں بھولنے کے لیے بھی بڑی یادداشت چاہیے۔ ہمارا ایک دوست جو مسرت شاہین کی ہر فلم مسرت سے دیکھتا۔ پچھلے دنوں بازار میں مسرت شاہین کو دیکھ کر پہچان نہ سکا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا "دراصل ان کا فلموں میں چہرہ بہت کم دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے پہچان نہ سکا۔" بہرحال نئی اداکاراؤں کے

لے آنے سے فلم انڈسٹری بھی سے، دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی ہے۔ محاورے میں رات چوگنی ترقی کیوں کہا جاتا ہے، اس کا تو ہمیں پتہ نہیں۔ بہرحال فلو نے یہ ترقی روک دی ہے۔ اگرچہ فلو اس قابل تو نہیں کہ اس کی تعریف کی جائے لیکن ڈکشنری میں اس کی تعریف "جنگی بخار" لکھی ہوئی ہے اور جتنی جنگ ہماری فلموں میں ہوتی ہے اتنی تو میدان جنگ میں بھی نہ ہوتی ہوگی سو اس لحاظ سے یہ فلمی بخار ہی ہے۔ ہمارے ہاں فلم بنانے کے لیے ایک ہیرو، ڈیڑھ من بالعدد اور اتنی ہی فلمی ہیروئن چاہیئے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں فلم ڈائریکٹر کے بغیر تو بن سکتی ہے، یقین نہ آئے تو ہماری کوئی بھی فلم دیکھ لیں مگر قتل و خون کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اس لیے ہمارے خورد بُرد ہیرو سلطان راہی یہ نہیں پوچھتے کہ آج کتنے سین شوٹ کرنے ہیں یہ پوچھتے ہیں کہ "آج کتنے بندے شوٹ کرنے ہیں"۔ ہیرو کو جو ملتا ہے اسے قتل کر دیتا ہے، لگتا ہے فلم ختم ہوتے تک وہ رائٹر اور ڈائریکٹر کو قتل کر دے گا۔ پوری فلم میں خون کی بارش جاری رہتی ہے۔ ہم تو خوش تھے، چلو فلم میں پانی کی بارش بھی شروع ہوئی مگر فلو رستے میں آگیا۔ ایک بار یہ انجمن کو ہوا تو انھوں نے سیٹ پر ہدایتکار سے کہا "سر کچھ بھاری بھاری ہو رہا ہے تو ہدایت کار نے کہا "میڈم یہ آپ نے سر مجھے کہا۔ ایک نئی اداکارہ کا فلو سے گلا بھی خراب ہوگیا۔ نئی فلم کی مہورت پر اعلان ہوا کہ نئی ہیروئن بھی اڈریس کریں گی تو اس کی والدہ نے اڈریس کا لفظ سنا تو کھڑی ہو کر بولی بے بی کو فلو ہوگیا ہے آپ کو اڈریس ہی چاہیے تو میں بتا دیتی ہوں۔ اسی اداکارہ نے ڈاکٹر کو فون کیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "گھر آکے دیکھنے کے پانچ سو روپے ہوں گے۔ تو اداکارہ نے کہا "ٹھیک ہے! پانچ سو ہی دے دینا۔" ملکہ ترنم نورجہاں نے فلو کی حالت میں جتنے گیت گائے ہیں، ان میں اس قدر سوز ہے کہ سننے والے کی بھی وہی حالت ہو جاتی ہے، جس میں ملکہ نے یہ گائے ہیں۔ سو ٹریجڈی فلموں کے لیے تو فلو ضروری ہے مگر یہاں پھر مسئلہ ہے۔ کسی نے ہدایت کار رحید رچودھری صاحب سے پوچھا "آپ کی یہ فلم ٹریجڈی ہے یا کامیڈی؟" تو انھوں نے کہا "میرے بادشاہ فلم لگے گی تو پتہ چلے گا۔" پوچھا "وہ کیسے؟ بولے "میرے بادشاہ اگر فلم چل گئی تو کامیڈی، نہ چلی تو ٹریجڈی"۔ لیکن یہ فلو ہدایت کار کو بھی تو ہو سکتا ہے۔ ایک بار ہدایت کار یونس ملک نے کہا "مجھے لگتا ہے مجھے فلو ہو گیا ہے یا پھر سر میں کچھ ہے تو پاس کھڑے اسسٹنٹ نے کہا "استاد سر میں کچھ نہیں ہے، یہ فلو ہی ہے۔

فلم اور فلو میں ایک فرق تو یہ ہے کہ فلم سکرین پر ہوتی ہے اور فلو سینے میں لیں بھی فلو کا ذکر ہے! اس لیے ہیروئنوں کو لگنے کا خطرہ اور بھی زیادہ ہے۔ پھر یہ وہ مرض ہے کہ آپ دوائی لیں گے تو ایک ہفتے میں ٹھیک ہوگا اگر دوائی نہ لیں گے تو ٹھیک ہوتے ہوتے پورے

بسات دن لگیں گے۔ ہمارے بزرگ تو اس سے بچنے کے لیے اس قدر احتیاط کرتے ہیں کہ بارش والی فلمیں منہ پر صافہ یا کوئی اور کپڑا لپیٹ کر دیکھنے جاتے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ فلم میں بارش نہیں چاہیے لیکن چونکہ بارش سے پانی میں کپڑے گیلے ہو کر فلو کر دیتے ہیں۔ سو یا تو ایسا پانی استعمال کرنا چاہیے جو گیلا نہ ہو یا پھر بارش بغیر پانی کے برسائی جائے ورنہ فلم انڈسٹری فلو انڈسٹری بن جائے گی۔

(عکس در عکس)

●

دے کے خط

(مراسلے)

محبی ڈاکٹر سید مصطفٰے کمال صاحب تسلیم
لاس اینجلس کے مزاحیہ مشاعرے میں دو
نظمیں پڑھیں۔ میں خود سوچتا تھا کہ انھیں شگوفہ
کے لیے بھیجوں گا۔ حمایت اللہ صاحب نے مجھ سے
فرمائش کی۔ براہ کرم انھیں شائع کرکے ممنون کیجیے۔
آپ نے شگوفہ کا جو شمارہ بھیجا ہے اس
کے لیے مشکور ہوں۔
مصطفٰی بیگ صاحب کا پڑھنے کا انداز
بڑا دل آویز ہے۔ وہ شاعر سے زیادہ
Comedian ہیں۔ میں حیدرآباد اور
وہاں کے زندہ دلان کو یاد کرتا ہوں۔
امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مخلص
گیان چند

پتہ: 3262 OAKLEAF
CHINO HILLS-CA-91709
U.S.A

●

ڈیر ڈاکٹر مصطفٰے کمال صاحب۔ السلام علیکم۔
ایک دوست کے ذریعے "شگوفہ" کا
سالنامہ (جنوری ۱۹۹۸ء) موصول ہوا۔ اس میں
اپنا مضمون "میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا" دیکھ کر
خوشی ہوئی۔ اتفاق سے ٹھیک دس سال پہلے
۱۹۸۸ء میں بھی اسی طرح کسی صاحب نے مجھے
"شگوفہ" دیا تھا جس میں میرا مضمون "موصوف اور
موصوفہ" تھا۔

پاکستان نے ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۶ء کے لیے اردو کے
بہترین کالم نویس کا ایوارڈ لاہور میں دیا ہے۔
ایوارڈ کے ساتھ 30 ہزار روپے نقد بھی ملے
(چیریٹی اور ردو دو) میں آج کل "نوائے وقت" کراچی
میں ایک مستقل کالم "...... پیرجان درویش" کے
عنوان سے لکھ رہا ہوں۔ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
"ہر شاخ پر......" عنقریب شائع ہو جائے گا۔
ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، کراچی

●

ڈیر مصطفٰی کمال صاحب۔ السلام علیکم۔
سعودی عربیہ سے صفدر حسین صاحب کے ذریعے
مسیح انجم صاحب کی رحلت کی اطلاع ملی تو دل
بیٹھ سا گیا۔ ایک اور اچھا قلم کار، بہترین،
نیک، شریف، ملنسار اور مخلص دوست کم ہو گیا۔
اور دنیا کے دکھ و غم اٹھانے کو ہم رہ گئے۔ اللہ
مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔
آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
میں "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور انجمن یادگار
ٹیپو سلطان" کا آل پاکستان جنرل سکریٹری
منتخب ہوا ہوں اور چونکہ ۱۹۹۹ء مئی میں شہید
سلطان کی دو سو سالہ برسی منائی جائے گی۔
اس لیے ہم ایک عظیم الشان نمائش، کتابوں کی
اشاعت اور جلسوں، ریڈیو، ٹی وی پروگرامز کا
اہتمام و انتظام کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے علم میں ٹیپو
سلطان پر کوئی مضمون / تصویر، رسالہ / اخبار
کتاب / نظم یا دیگر مواد ہے تو اس کی نشان دہی
اور فراہمی کو ممکن بنا کر ممنون فرمائیں۔
تمام احباب خصوصاً بیگ احساس، پرویز

ہاشمی وغیرہ سے سلام کہیے گا۔

ZEE TV پر "ادھیکار" ڈرامہ ہم نہایت پابندی سے دیکھتے اور حمایت بھائی کی کارکردگی اور "بصری و سماعتی ملاقات" سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ "شگوفہ" کیسا جا رہا ہے۔ آپ کا
محمود خاور، کراچی

●

مصطفیٰ کمال صاحب، آداب۔
شگوفہ، ہمیشہ ہنستے ہنسانے کا سرمایہ لے کر آتا ہے لیکن ابھی ابھی جو شمارہ ملا اس نے اداس اور غمگین بنا دیا۔ مسیح انجم کے انتقال کی خبر زندہ دلانِ حیدرآباد کے پہلے جلسے سے لے کر اگست ۱۹۹۷ء تک ہر وقت تو ان کا ساتھ رہا وہ مزاح اور زندہ دلوں کی دنیا کا اٹوٹ حصہ تھے۔ خاموشی سے ساتھ کام کرنے والے۔ بغیر ہاؤ بھاؤ تاؤ بتائے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اسٹیج پر آ کر پڑھنے والے اور داد سمیٹ کر لے جانے والے۔۔۔ قد و قامت کے اعتبار سے مختصر ہونے کی بنا پر کم عمر بھی لگتے تھے۔ پچھلے اگست میں جب ان سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اطلاع دی کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں تو مجھے بڑی حیرت ہوئی حسبِ عادت قہقہہ لگا کر پوچھا۔۔۔ کیا ریٹائرمنٹ لے لیا یا۔۔۔؟ انھوں نے اپنی روایتی متانت سے جواب دیا۔ جی نہیں وقت پورا کر لیا۔۔۔ بخیر و عافیت۔۔۔ تب کیا پتہ تھا ان کا وقت اتنی جلدی پورا ہو جائے گا۔"
شفیقہ فرحت بھوپال

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

شگوفہ نے اس مہینے اپنی زندگی کے تیس سال مکمل کر لیے۔ ان تین دہوں میں شگوفہ نے اردو رسائل و جرائد کی دنیا میں ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔ نامور ادیبوں اور شاعروں کا تعاون، نو آموز اور نوخیز قلم کاروں کی ہمت افزائی اور تلاش، ادب کی اعلیٰ اقدار کی پاسداری، پابندیٔ اشاعت، قاری اور قلم کار کے درمیان ربط کے لیے محفلوں کا انعقاد ۔۔۔ شگوفہ کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ شگوفہ اب ایک عالمی رسالہ ہی نہیں طنز و مزاح کی ایک تحریک ہے۔ اس رسالہ نے برصغیر ہی نہیں ساری دنیا کے مزاح نگاروں کو یکجا کیا۔ لکھنے کی طرف انھیں مائل کیا اور طنز و مزاح کے صحت مند اور توانا ادب کے فروغ کا باعث بنا ۔۔۔ شگوفہ کو بیرونِ ملک روشناس کرانے میں ڈاکٹر عابد معز کی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں۔
تیس سال کی تکمیل پر اس مرتبہ شگوفہ کا سالنامہ جنوری ۱۹۹۹ء میں اہتمام کے ساتھ شائع ہوگا۔

● حیدرآباد کے نامور شاعر وقار خلیل کا ۲ نومبر کو انتقال ہوگیا۔ جناب وقار خلیل منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ہر شاعر تنگنائے غزل میں محبوس نظر آتا ہے وقار خلیل نے بڑی عمدہ اور خوب صورت نظمیں کہیں۔ بچوں کے لیے بھی خوب لکھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے ادارۂ ادبیات اردو میں ملازمت اختیار کی تو آخر عمر تک اسی خدمت سے وابستہ رہے۔ شگوفہ اور مدیر شگوفہ سے ان کا خاص تعلق تھا۔ ان کا انتقال ایک باوقار شاعر کا انتقال ہے جس نے حیدرآباد کی ادبی و شعری روایت کو پروان چڑھانے میں اہم حصہ ادا کیا۔۔۔ خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۳۱ ——— دسمبر ۱۹۹۸ء ——— شمارہ ۱۲

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال •

ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی:

حسن چشتی (امریکہ)
غوثیہ سلطانہ (امریکہ)
محمد باقر (جدہ)
مسعود حسینی (آسٹریلیا)
عبدالرحمن سلیم (ریاض)

سرورق:
شعیب کارٹونسٹ

طباعت:
دائرہ پریس چھتہ بازار

مجلس مشاورت:
نریندر لوتھر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ایم اے باسط، آئی پی ایس
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
محمد علی رفعت آئی اے ایس
حمایت اللہ

مجلس ادارت:
مصطفیٰ مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

قیمت فی پرچہ: ۱۲ روپے
زرِ سالانہ: ۱۳۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۲۱- بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱ فون (آفس) 595716 (رہائش) - 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

نظر اٹھائیے ، دیکھئے الفلاح کی جانب
رواں دواں ہیں بلا سودی کاروبار یہاں

سکون قلب کا یہ بھی تو اک سہارا ہے
ہمارے شہر کا یہ منفرد ادارہ ہے

تاج محل کی طرح منفرد اور چار مینار کی طرح مستحکم

بلا سودی کاروبار کے ذریعہ اطمینان بخش کمیشن فراہم کرنے والا منفرد ادارہ
اپنی رقم مشغول کر کے ہر ماہ گھر بیٹھے کمیشن حاصل کرتے رہیئے !!
آپ کے روپے کی حفاظت کا یقین دلاتی ہے
اس میں سرمایہ مشغول کر کے اپنے خاندان کے بہتر مستقبل
کی طمانیت حاصل کیجئے۔

صبح ۱۰ بجے سے شام ۶ بجے تک مستعد و باخلاق اسٹاف آپ کی رہنمائی کے لئے دفتر میں موجود رہے گا۔

AL FALAH COMPANY
POLICE COMMISSIONER .OFFICE ROAD
PURANI HAVELI, HYD. PHONE . 4565848
PIN : 500 002 FAX -040-4565848

مثال ہے جو اس ادبی اصطلاح کے متعلق
ان کے واضح ادراک کی شہادت ہے۔

(۲)

عبداللطیف اعظمی نے اس موضوع پر زیادہ توجہ سے کام لیا۔ "انگریزی اصطلاحوں کے ترجمے" کے زیر عنوان **ھماری زبان** شمارہ ۸ر جنوری ۱۹۶۱ء میں ان کے خیالات ساڑھے تین کالم میں مبسوط تھے۔ موصوف نے اولاً "اردو میں مختلف اصطلاحوں کی جامع اور مستند لغت" نہ ہونے کا ذکر کیا جس کی وجہ سے "اکثر اصطلاحوں کے ترجمے اور استعمال میں فرق پڑ جاتا ہے"۔ ان الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے اس موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں، اردو کی تنگی دامنی کا ذکر کرتے ہوئے زیر بحث مسئلہ پر اپنا خیال ان الفاظ میں بیان کیا:

"... اردو زبان کا دامن انگریزی زبان کے مقابلے میں بہت محدود اور تنگ ہے۔ انگریزی زبان میں مختلف مطالب ادا کرنے کی جو صلاحیت اور اس کے لیے الفاظ کی جو کثرت ہے وہ اردو کو کہاں نصیب ہے؟ اس لیے انگریزی کے ہر لفظ یا ہر اصطلاح کا اردو ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ ہر زبان کا اپنا مخصوص مزاج اور اپنی مخصوص روایت ہوتی ہے"۔

اس موضوع پر عبداللطیف اعظمی نے نہ صرف مدلل گفتگو کی ہے، بلکہ انگریزی کی ان تین اصطلاحوں Parody/ Wit/ Humour کے معانی میں جو باریک فرق ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے لیے الگ الگ الفاظ وضع کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔

(۳)

عبدالمغنی (وائس چانسلر ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی دربھنگا) جواب استفسار میں تیسرے تھے۔ ان دنوں وہ آرہ (بہار) کے ایک کالج میں شعبۂ ادبیات انگریزی میں لکچرر تھے۔ "انگریزی اصطلاحات کے ترجمے" کے زیر عنوان موصوف کے خیالات **ھماری زبان** شمارہ یکم جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئے۔

کلیم الدین احمد نے Humour کا اردو مترادف "ظرافت" قرار دیا تھا۔ عبدالمغنی نے ان سے اختلاف کیا۔ ان کے خیال میں "ظرافت" کا ہم معنی انگریزی لفظ Wit ہے، جو ان کے الفاظ میں "ایسی ذہنی جملہ بازی ہے جس میں کچھ پیچیدگی اور پتے کی باتیں کی جاتی ہیں"۔ انھوں نے "طنز" کو ایک "باضابطہ صنف ادب" قرار دیا۔ یہ مناسب نہیں کیوں کہ طنز، ہجو، بذلہ سنجی، جملہ بازی وغیرہ محض اسالیب و صفت قلم کاری (Quality of Pen-manship) ہیں، یہ صنف (Genre) ہرگز نہیں۔ انھیں ایک باکمال مزاح نگار کا وصف نگارش کہہ سکتے ہیں جو اس کے قلم کا ایک رنگ یا ادا ہے۔

عبدالمغنی "مزاح" اور "ظرافت" کو ایک بات تصور کرتے ہیں۔ کچھ حد تک یہ درست ہے، مگر یہ عامیانہ خیال ہے۔ "مزاح" لفظ حیوان، باجا، غذا، لباس، فرنیچر، بیماری کی طرح ایک چلتا پھرتا گول سا لفظ ہے اور مبہم تلفظ۔ "ظرافت" اس کے برعکس اپنی معنویت تہ دار معنویت کا حامل ایک واضح لفظ ہے اور شعری اور نثری ادب کی ایک دل پسند صنعت۔ مزاح بے تنظیم و بد تنظیم اظہار ہے، بے ساختہ اور برجستہ۔ ظرافت ایک شعوری عمل ہے اور مزاح لاشعوری حرکت و فعل۔ مزاح، عوامی ہنسی ہے اور ظرافت ادبی مظاہرہ ہے۔ ظرافت، طنز، ہجو مزاحیہ ادب کی تین نہایت اعلا اقسام ہیں۔ دو آخرالذکر بزرگ تر ہیں۔ زیادہ لطیف، زیادہ اثر خیز اور مزاح سے زیادہ دیرپا۔

(۴)

عالمان ادب اردو کے لیے مزاحیہ ادب کی یہ مقبول شعری/نثری اصطلاحیں یا ادب کی یہ مزاح اصل اصناف غیر معروف نہ تھیں۔ میں نے اس زمانہ کے تقریباً ہر ممتاز ادب نوازوں سے رجوع کیا، بالذات اور بوسیلۂ خط۔ میرا یہ سوال، یاد آتا ہے غالباً ایک سال تک لاجواب رہا۔ کسی اہل نظر کی علمی حیثیت نے کروٹ نہ لی۔ قاضی عبدالودود صاحب، پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی، مقامی بلند قامت شخصیتیں تھیں۔ یہ خوش ہوئے کہ ایک اچھا علمی مسئلہ اٹھایا گیا۔ قاضی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: "دیکھیے آپ کے English based ادیب کیا کہتے ہیں۔ ان کے روئے سخن دو تھے: پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر اختر اورینوی۔ سرور صاحب کی مرتبہ **"علی گڑھ تاریخ ادب اردو"** اور اختر صاحب کی تصنیف **"بہار میں اردو زبان**

"ادب کا ارتقا" پر دو تحقیقی اعتبار سے قاضی صاحب کی خفگی و آزردگی کا شکار تھیں۔ دونوں صدر شعبہ تھے اور ادبیات انگریزی کی سیر کرتے ہوئے شعبۂ اردو میں رونق افروز تھے۔

موصولہ شدہ جوابات (مطبوعہ / غیر مطبوعہ) کو ترتیب دے کر میں نے ہماری زبان میں شائع کر دیا (غالباً وسط ۱۹۶۱ء)۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۶۰ء کا پیش کردہ یہ مسئلہ کثرت رائے کے ساتھ یوں حل ہو گیا:

H u m o u r = ظرافت، Satire = ہجو، Irony = طنز۔

قاضی عبدالودود جیسی قاموسی شخصیت، پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے ہفت زباں معلم ادبیات انگریزی اور نیاز فتح پوری و مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے علامۂ علم و زباں کی لب کشائی کے بعد بھلا کس صاحبِ فکر و نظر کی زبان کھل سکتی؟ اور تو اور، مزاحیہ ادب کے سورما طنز کار اور ہونہار ہجو نگار بھی ان انبساط منسب جگر ٹکڑوں کو مرغ دست نہ بنا سکے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ کثرتِ رائے کے باوجود انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے رسالہ کے اسی شمارہ میں اپنا یہ فتویٰ بھی شائع کر دیا:

"ہماری رائے میں Satire کے لیے طنز، Irony کے لیے رمز اور Humour کے لیے مزاح زیادہ موزوں ہے۔" (ہماری زبان)

لیکن واقعے پر بحث طلب دو: طنز اور ہجو دو منفرد اصطلاح ہو کر بھی "سیتا رام" کی طرح ایک قالب میں دو افراد کا نمونہ رہے۔ Humour = ظرافت، Satire = ہجو، Irony = طنز کی سند و ثنا کے باوجود یہ مزاح النسل اصطلاحات عام اہل قلم اور ادب پسند قاری کے لیے آرسی نہ بن سکے۔

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

(۵)

اب مزاحیہ ادب کی من پسند سیر و تفریح میں ایک کہانی سامنے آ گئی۔ اسے پارنہ کرنا پست ہمتی تھی یا کیڑوں کو تہ کر دینے والی حماقت۔ لازماً تجسس بے قرار اور فکر ناآسودہ رہے۔

نثر اور تخلیقی نثر میں از **خطوط غالب** تا **مضامین رشید** نسلِ مزاح کے ان پارۂ جگر (ظرافت + طنز + ہجو) کے نمونے ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ انھیں پڑھنے اور پڑھانے میں بے قرار دل و دیدہ درخشاں ہو جاتے۔ نہ صرف ہماری ظرافت کی شفق پھوٹ جاتی بلکہ معطر یہ تعریض و طعن اور ہجو یہ نیش و نشتر کے چٹکیلے فقرے اور جملے گلاب جامن اور مرغ بیضہ کی مطبق قتلیاں کا لطف و لذت دیتے۔

یہی، تھی کہ شعری ادب میں ان صنائع کی شناخت پر توجہ بے ساختہ گئی اور اشعار مفرد کی جانب نظریں فوراً اٹھیں۔ ہمارا اکلوتا تنہا، محض ایک دو پایہ شعر بھی بڑا تگڑا ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایک پیرا، پیسری پر پوا! انگریزی کی طویل اور مربوط بندوں والی کلاسیکی نظموں سے بھی زیادہ جوشیلا اور کٹیلا۔ محسوس ہوا کہ ظرافت + طنز + ہجو میں غالب اور جوش، بلحاظ تہ دار معنویت، کئی پہلو سے ماہر کامل ہیں اور اکبر، بلحاظ عصری حسیت اور بوقلموں ظرافت، مرزا رفیع سودا سے کئی قدم آگے۔ دوسرے حیوان ظریف خوش گو، عام طور پر گھر اور گھاٹ سے بھی ناآشنا ہیں، الا ایک سید رضا نقوی واہی۔ اس کم قامت مگر گراں قیمت کے یہاں نسل مزاح کا معیاری نمونہ، سکۂ رائج الوقت ہے۔ نیا اور چمکدار، ہر مول تول میں کھانٹ براج بدل جائے مگر اس کی رائج بدلے۔

پر یہ تلاش و شناخت اور تمیز و محاسبہ میرا ذاتی معاملہ تھا۔ سوچتا تو افسوس ہوتا کہ عام اور اوسط قاری کیا، ادب کے اکثر اساتذہ کے لیے بھی ان صنائع کی تہ داریاں، بوقلمونی اور تیزکاریاں چراغ تلے اندھیرا ہیں۔ یونیورسٹی کاموں کے سلسلے میں دہلی، گورکھپور، علی گڑھ، کلکتہ، لکھنؤ کی آمد و رفت رہتی۔ نجی صحبت میں یہ موضوع زیر گفتگو آ جاتا۔ حسین نواز اظہار مسرت کرتے کہ علمی حلقے میں ایک اہم ادبی مسئلہ مرکز توجہ ہے۔ میں شکر گزار اور غم گسار کہ یہ موضوع ہنوز وضاحت طلب۔ ان میں دو چار مخلصین بھی تھے، ماہرین شعریات میں شمار، محاسن شعر کے اچھے ادا شناس۔ میری درخواست پر یہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تلمیح، مجاز مرسل جیسے صنائع و بدائع کے نمائندہ اشعار ایسا برجستہ سنا دیتے کہ ہر کا امتیازی رنگ روپ، جیسے دوکان میں منقا، آلو بخارا، خوبانی، پستہ، چل غوزا کی طرح سامنے آ جاتا۔ مگر ان ماہرین شعریات کا دروشن اور اک۔ تھی اور پیوندی مزاح کی جان پہچان میں ایک کلاک تھا، بغیر ڈائل اور سوئی۔

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفرنامہ	۵۰ روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۳۰ روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۴۰ روپے
آئی ایم ساری	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰ روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	-	۱۰۰ روپے
بہ فرضِ محال	خواہ مخواہ	-	۷۵ روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	-	۵۰ روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	-	۶۵ روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسن	سفرنامہ	۴۵ روپے
درگت	ٹی ین راز	کلام	۷۰ روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	کلام	۵۰ روپے
الف تماشہ	نریندر لوتھر	مضامین	۳۰ روپے

شگوفہ کے دو یادگار   شگوفہ کی فائلوں سے

۲۵ سالہ نثری انتخاب

ربع صدی کے نثری طنز و مزاح کا آئینہ

حصۂ اوّل قیمت ۳۰ روپے

حصۂ دوم قیمت ۲۰ روپے

مجتبیٰ حسین
(دہلی)

راج نارائن رازؔ کی یاد میں

اب تو یہ ایک معمول سا بن گیا ہے کہ ادھر حیدرآباد میں ہمارا کوئی دوست دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو جواباً ادھر دہلی میں بھی ہمارا کوئی دوست اس دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے ان دونوں شہروں میں ہمارے دوستوں کی تعداد کو کم کرنے اور یوں خود ہمارے عرصۂ حیات کو تنگ کرنے کا کوئی مقابلہ شروع کر رکھا ہے۔ وقار خلیل کے انتقال کی خبر "سیاست" کے جس شمارے میں چھپی تھی وہ ہمیں ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے پورے آٹھ دنوں بعد ملا۔ اخبار میں وقار خلیل کی تصویر نظر آئی تو دل دھک سا رہ گیا۔ جو لوگ لمبے عرصے سے ادب میں سرگرم عمل ہیں ان کی تصویریں ان کی تخلیقات کے ساتھ ذرا کم ہی چھپتی ہیں البتہ ان کی تصویر اسی وقت چھپتی ہے جب وہ ہمیشہ کے لیے ادب اور دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ خبر پڑھی تو پتہ چلا کہ وقار خلیل بھی اپنا دامن جھاڑ کر دنیا سے نکل گئے۔ وقار خلیل کو برسوں پہلے جس حالت میں دیکھا تھا اسی حالت میں انھیں پانچ چھ مہینے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مخلص، بے لوث، محنتی، منکسرالمزاج، سنجیدہ، بردبار اور خوددار۔ ہمیں ان کی باتیں یاد آ رہی تھیں کہ ہمارے دوست امیر قزلباش کا فون آیا کہ ہمارے دوست راج نارائن رازؔ کا ۶ نومبر کو امریکہ میں انتقال ہو گیا جہاں وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے دو دن پہلے ہی دہلی سے گئے تھے۔ کیسے بتائیں کہ ان دونوں دوستوں کے گزر جانے کی اطلاع نے دل کو کتنا ملول کیا۔ اب ہم عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ایک طرف تو نئے دوستوں کی گنجائش کم سے کم نکلنے لگی ہے اور دوسری طرف پرانے دوست ہیں کہ ہاتھ سے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے دوست حیات لکھنوی کا ایک سیدھا سادا سا شعر ہے:

وہ بُرے ہوں کہ بھلے جو بھی ہمیں پیارے ہیں
اب نیا دوست کوئی ہم تو بنانے سے رہے

راج نارائن رازؔ سینیارٹی کے اعتبار سے ہمارے دہلی کے اولین دوستوں میں سے تھے۔ کمار پاشی

ہمارا پہلا دوست تھا اور راج نارائن دوسرے نمبر کے دوست تھے۔ دہلی آنے کے دو تین دن بعد ہی
ہماری ملاقات راج نارائن راز سے شاستری بھون میں ہوگئی تھی جہاں ہم دونوں کام کرتے تھے۔
وہ وزارتِ اطلاعات میں علی جواد زیدی سے منسلک تھے اور اگرچہ ہم تھے تو وزارتِ تعلیم میں لیکن
ہمارا سرکاری سروکار بھی علی جواد زیدی سے تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ علی جواد زیدی کے کمرہ میں ہی ان
سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نئے نئے دہلی آئے تھے۔ لہذا ہماری اس غریب الوطنی اور مفلوک الحالی کے
پیشِ نظر راج نارائن نے ہم سے کہا "میاں، کل سے تم دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھا لیا کرنا۔
جہاں میں اپنے لیے دو چپاتیاں لاتا ہوں، وہیں تمھارے لیے بھی دو چپاتیاں آجائیں گی۔" ہم نے
کہا "مگر میں تو تین چپاتیاں کھاتا ہوں۔" بولے "اوہو! تو تین چپاتیاں آجائیں گی۔ اس میں پریشانی
کی کیا بات ہے"۔ ہم نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن راج نارائن سنجیدہ ہوگئے اور ہمارے لیے کھانا
لانے لگے۔ ہم نے انھیں لاکھ منع کیا کہ وہ یہ تکلیف نہ کریں لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ چنانچہ
ہم اکثر دیر سے ان کے کمرہ میں پہنچتے تھے تو وہ ہمارے انتظار میں اپنے ہاتھ روکے بیٹھا کرتے تھے۔ ہمیں
یہ اچھا نہیں لگتا تھا اور ہم کسی نہ کسی بہانے کھانے کی اس پابندی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے
اور ایک دن ہمیں یہ بہانہ ہاتھ آ گیا۔ دو مہینوں تک ان کے ساتھ کھانا کھا چکے تو ایک دن راج
نارائن راز نے کہا "میاں بھتیجے، آج ہم تمھیں اپنی تازہ غزل سناتے ہیں جو کل رات ہی ہوئی ہے۔"
انھوں نے غزل سنائی۔ بہت اچھی تھی اور ہم نے داد بھی بہت دی۔ اس کے بعد ہم اچانک
سنجیدہ ہوگئے تو راج نارائن نے پوچھا "کیا بات ہے۔ تم اچانک سنجیدہ کیوں ہوگئے ہو؟" ہم نے کہا۔
"راز صاحب! میں کل سے آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گا۔" پوچھا "وہ کیوں؟" ہم نے کہا بات دراصل
یہ ہے کہ دو مہینوں سے آپ کا نمک کھا رہا ہوں اور آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ نمک کتنی بری چیز ہے۔ یہ اتنی بری چیز
ہے کہ مجھے آپ کے شعر بھی اچھے لگنے لگے ہیں۔ میں اپنی ادبی دیانت داری کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔
اس پر وہ ہنسنے لگے حالانکہ وہ ہنستے بہت کم تھے۔

راج نارائن راز پستہ قد تھے۔ اوپر سے شخصیت بھی چھوٹی موٹی سی تھی۔ آواز بھی اتنی باریک اور مہین
سی تھی کہ اگر وہ برابر والے کمرے میں بول رہے ہوں تو لگتا تھا کوئی خاتون باتیں کر رہی ہے۔ لیکن
اس کے باوجود جس دفتر سے بھی وابستہ رہے وہاں ان کے ماتحتین ان کے رعب اور دبدبہ سے خوف زدہ
ہی رہے۔ ہم اکثر کہا کرتے تھے کہ ایسی چھوٹی موٹی سی شخصیت کی مدد سے ایسا گھنا رعب اور دبدبہ پیدا
کرنا آدمی کے بس کی بات نہیں۔ سائنس کا کمال تو ہو سکتا ہے۔ ان کے بیشتر دوست بھی ان سے بہت
محتاط اور خائف رہتے تھے۔ جب خفا تو تھے ہی۔ اپنے مزاج کے خلاف کسی بات کو گوارا نہیں کرتے تھے۔
سنجیدگی، بردباری اور متانت کے معاملے میں وہ فرشتوں کو بھی شرماتے تھے۔ ہم غالباً ان کے
اکیلے دوست تھے جسے انھوں نے اپنے ساتھ مذاق کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ (پتہ نہیں کیوں) ایک
بار ہم نے ان کے گھر فون کیا۔ راج نارائن نے جیسے ہی فون کا ریسیور اٹھا کر اپنی نسوانی آواز میں "ہیلو"

کہا ہم نے کہا۔ بھائی! ذرا راز صاحب سے بات کرا دیجئے۔ ہماری آواز کو پہچان کر بولے۔ میاں مجتبیٰ! کیا میں نہیں پہچانتا کہ ایسی بیہودہ شرارت کون کر سکتا ہے۔ دوسرے دن خود ہی دوستوں کو شکایت کے لہجے میں یہ واقعہ سنایا۔ جب ایک دوست اسے سُن کر ہنسنے لگا تو اس سے ناراض ہو گئے۔ دیکھا جائے تو انھیں ہم سے ناراض ہونا چاہیے تھا مگر وہ خواہ مخواہ ایک معصوم دوست سے ناراض ہو گئے۔ یہ بھی ان کا ایک اسٹائل تھا۔ یہ سچ بھی ہے کہ لوگوں نے ان کے ہونٹوں پر ہنسی کم ہی دیکھی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھتے تھے۔ چنانچہ کبھی وہ غلطی سے کسی بات پر مسکرا دیتے تو ہنسی ان کے ہونٹوں پر نہیں بلکہ ان کی مونچھوں پر صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہ ہمارا مشاہدہ تھا اور ایک بار ہم نے اس مشاہدے کا ذکر ان سے کیا تو بولے "مجھے حیرت ہے کہ کبھی کبھی تم کیسی نان سنس (Non sense) باتیں کرتے ہو"۔ (حالانکہ ہماری صحبت میں وہ ایسی نان سنس باتوں کو پسند کرنے لگے تھے) جب وہ ماہنامہ "آج کل" کے ایڈیٹر بنے تو ان میں اور بھی سنجیدگی آ گئی۔ یوں بھی وہ جوش ملیح آبادی کے جانشین بن گئے تھے۔ اسی کرسی پر بیٹھے تھے جس پر کبھی جوش ملیح آبادی بیٹھا کرتے تھے۔ جوش صاحب کی یہ کرسی ان کے تن و توش اور جسامت کے اعتبار سے بنائی گئی تھی۔ منحنی سے راج نارائن جب اس کرسی پر بیٹھتے تو کرسی کا بیشتر حصہ خالی ہی رہ جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کرسی پر نہیں بلکہ چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ (آج کل کے موجودہ مدیر محبوب الرحمان فاروقی نے اس کرسی کو اب ہٹا کر ایک کونے میں رکھ دیا ہے۔ یوں بھی ہر کس و ناکس اس کرسی پر تھوڑا ہی بیٹھ سکتا ہے۔) راج نارائن بے حد محنتی آدمی تھے۔ کام کرنے کی لگن اور جذبے سے بھرپور۔ انھوں نے "آج کل" کے کئی ایسے یادگار نمبر نکالے جو شائد جوش ملیح آبادی بھی مرتب نہیں کر سکتے تھے۔ مضامین کے انتخاب کے معاملہ میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ (غالباً یہی وجہ ہے ہماری کوئی تحریر ان کے دورِ ادارت میں آج کل میں شائع نہ ہو سکی) اردو کے کلاسیکی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ اچھے شاعر تو تھے ہی۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ان کے ماتحتین ان سے بے حد گھبراتے تھے۔ البتہ ان کی منہ بولی بیٹی مدیرہ عثمانی کے کام سے جو ان کی اسسٹنٹ بھی تھی بہت خوش رہا کرتے تھے۔ بات بات پر بیٹی منہ بولی بیٹی مدیرہ کی رٹ لگا رہتے تھے۔ (مدیرہ کے ذریعہ ہی اردو والوں کو امریکہ میں ان کے انتقال کی خبر ملی) ایک دن ہم نے کہا "راز صاحب، آپ ہمیں اور تو کچھ نہیں بنا سکتے ہمیں کم از کم اپنا منہ بولا مداح ہی بنا لیجیے۔ منہ بنا کر بولے یہ منہ بولا مداح کیا ہوتا ہے۔ ہم نے کہا "جیسے آپ ہمارے منہ بولے شاعر ہیں"۔ منہ پھیر کر بولے "نان سنس" راز صاحب بہت اچھے شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ مشاعروں میں کم ہی جاتے تھے۔ کیوں کہ وہ تعلقات عامہ کا گر نہیں جانتے تھے اور اپنی ہی انا میں مگن رہنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے "چاندنی راتوں کی" "لذت لمس" اور "دھنک احساس کی" شائع ہو چکے ہیں۔ شعر فہمی کے معاملے میں ہماری بے بضاعتی سے واقف ہونے کے باوجود وہ ہمیں اپنے شعری مجموعوں سے ضرور نوازتے تھے۔ جب انھوں نے اپنا تیسرا مجموعہ "دھنک احساس کی" ہمیں دیا تو ہم نے کہا "راز صاحب: ہر شاعر کی شاعری میں ایک کلیدی لفظ (KEY WORD) ہوتا ہے۔ اتفاق سے آپ کی شاعری کا "کی ورڈ" "کی" ہے"۔

پوچھا " وہ کیسے ؟"
ہم نے کہا " آپ خود دیکھ لیجیے ۔ آپ کے یہ شعری مجموعہ کا نام "کی" پر ختم ہوتا ہے جیسے : چاندنی اسا ڑھ کی "۔ لذت لفظوں کی" اور "دھنک احساس کی"۔ بلکہ اس کے آگے ڈیش (Dash) لگا دیں تو کوئی گالی بھی بن سکتی ہے "۔

ہمیں ان کا ماں سنس کہنا بہت اچھا لگتا تھا ۔ ہمارے ایسے دوست تو بہت سے ہیں جن سے ہم بے تکا مذاق بھی لیتے ہیں لیکن اب ایسا کوئی دوست اس دنیا میں باقی نہیں رہا جس سے مذاق کرنے کی کوئی دوسرا شخص ہمت نہیں کر سکتا تھا مگر ہم کر لیتے تھے ۔ یہ ایک ایسا ناقابل تلافی نقصان ہے جس کی کمی ہمیں ہمیشہ شدت سے محسوس ہوتی رہے گی ۔ راج نارائن ہم سے عمر میں پانچ چھ برس بڑے تھے مگر لیکن ملتے تو برابری کا درجہ دیتے تھے ۔ بے حد مخلص ، شریف ، وضع دار اور محبت والے آدمی تھے ۔ جس سے محبت کرتے تھے اس کے لیے سات خون بھی معاف کر دیتے تھے ۔ ان کی پیدائش بلوچستان میں ہوئی تھی اسی لیے اپنی پسند ناپسند کے معاملہ میں بلوچیوں کا سا رویہ رکھتے تھے ۔ بعض اشخاص سے ناراض رہے تو زندگی بھر ناراض ہی رہے ۔ کبھی مصالحت نہیں کی ۔ وہ سانچے اب ٹوٹ گئے ہیں جن سے راج نارائن راز جیسے لوگ بن کر نکلا کرتے تھے ۔ ●●

(ایک مشاعرہ میں بحیثیت مہمان اعزازی پڑھا گیا مضمون)

مشاعرہ کا دعوت نامہ ملنے کی خوشی اور مسرت کسی شاعر سے پوچھیے۔ انھیں اتنی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے جیسے ان کی شادی کے کارڈ چھپ کر آنے پر ہوتی تھی۔ بعض شاعروں کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ میرے ایک شاعر دوست حسرت سے کہتے ہیں کہ شادی کا کارڈ صرف ایک مرتبہ وقتی خوشیاں لایا تھا جبکہ مشاعرہ کا کارڈ بار بار پیامِ مسرت لے آتا ہے۔

شاعر حضرات مشاعرہ کا کارڈ ہاتھ میں لیے پھولے نہیں سماتے۔ مختلف بہانوں سے احباب کو دکھاتے اور سناتے پھرتے ہیں۔ میں ایک شاعر کو جانتا ہوں جو کارڈ کو دوستوں کے گھر حادثاً بھول جاتے ہیں اور پھر چند منٹوں بعد واپس آکر کارڈ کے تعلق سے دریافت کرتے ہیں۔ اگر احباب انھیں مشاعرہ کی دعوت کی مبارک باد دیتے ہیں تو خوشی اور اطمینان سے بڑائی ہانکنے لگتے ہیں: "میں مشاعرہ میں جانے والا نہیں تھا لیکن منتظمین کا اصرار ہے کہ میرے بغیر مشاعرہ نہیں ہوگا۔ اسی لیے سوچتا ہوں کہ چلا جاؤں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟" اگر بند کارڈ جوں کا توں لوٹا دیا جائے تو مایوس ہو کر زمانے کی ناقدری کا رونا رونے لگتے ہیں۔

بعض شاعر ایک ہاتھ میں دعوت نامہ اور دوسرے ہاتھ میں جوانی کی تصویر لیے اخبار کے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ اگلے دن پہلے صفحہ پر "مشاعرہ پڑھنے کے لیے روانگی" کی سرخی کے ساتھ تصویر اور خبر چھپتی ہے۔

مشاعرہ میں شرکت کی تیاری قابلِ دید ہوتی ہے۔ تازہ کلام کہنے سے زیادہ اپنے آپ کو

تروتازہ بناکر پیش کرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ بال ترشوائے جاتے ہیں۔ سفید بالوں میں خضاب لگایا جاتا ہے۔ خط بنایا جاتا ہے۔ نئے کپڑے سلوائے جاتے ہیں۔ مشاعرہ پڑھنے کی مشق ہوتی ہے۔ منفرد انداز اپنانے کی سعی ہوتی ہے اور اپنے کلام کو ترنم میں ڈھالنے کے لیے باضابطہ ریاضت کی جاتی ہے۔ آخر مشاعرہ کے دن سج دھج کر سامعین کا سامنا کرتے ہیں۔

یوں بھی آج مشاعرہ میں صرف شاعری سے کام نہیں چلتا۔ شاعری کے ساتھ اپنے آپ کو بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ اچھی شاعری کو خراب چہرہ اور بھونڈی آواز ہوٹ کروا دیتی ہے جبکہ خوب صورت چہرہ، سریلی آواز اور گیت نما ترنم خراب شاعری کے باوجود شاعر کو ہٹ کروا دیتا ہے۔ شاید اسی لیے مشاعرہ پڑھنا فن کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ مشاعرے میں کامیاب ہونے کے لیے شاعری کے فن سے زیادہ دوسرے قسم کی فن کاری کی ضرورت ہے۔

مشاعرہ کا دعوت نامہ سامعین میں بھی تقسیم ہوتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو وہی اس کے اصلی حق دار ہوتے ہیں۔ کارڈ ملتے ہی سامعین کی اہمیت میں . . . . اضافہ اور مشاعرہ ان کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ آخر تک پتہ نہیں چلتا کہ سامعین کی مرضی کیا ہے۔ مشاعرہ میں شریک بھی ہوں گے یا کسی نیک اور بہتر کام میں مشغول ہو جائیں گے یقینی طور پر وقت کی پابندی نہیں کریں گے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ داد دے رہے ہیں یا بے داد' جیبوں میں انڈے ہیں یا ٹماٹر اور یہ بھی کہ اختتام تک بیٹھے رہیں گے یا درمیان سے اٹھ کر چلے جائیں گے۔

شاعروں کے برخلاف مشاعرہ میں شرکت کے لیے سامعین کو کوئی تیاری نہیں کرنی پڑتی۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے کافی دیر سے مشاعرہ گاہ میں اٹھے چلے آتے ہیں۔ مختلف مقاصد پیشِ نظر رہتے ہیں۔ کوئی تفریحِ طبع کے لیے چلا آ رہا ہے تو کوئی اپنے ذوق کی تسکین کا طلب گار ہے۔ کسی کو گانا سننے کا شوق ہے تو کسی کو رات دیر گئے تک نیند نہیں آتی۔ کوئی ہنسنا چاہتا ہے تو کوئی اپنی تنہائی کا علاج چاہتا ہے۔

قصہ مختصر مشاعرے کی رنگینی اور دم خم شعرا اور سامعین سے ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے صف آرا بھی ہوتے ہیں۔ اسٹیج اور مشاعرہ گاہ میں عددی طاقت تقریباً برابر ہی ہوتی ہے بلکہ بعض مشاعروں میں دو ایک شاعر ہی زیادہ دیکھے گئے۔ مشاعروں میں شعرا اور سامعین کے درمیان قسمت کے مارے چند لوگ آجاتے ہیں جو نہ شاعر ہوتے ہیں اور نہ ہی بہتر سامع۔ اسی لیے مشاعرہ گاہ میں انھیں خصوصی اور اعزازی نشستیں فراہم کی جاتی ہیں منتظمین ان کی آؤ بھگت و خاطر داری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ان سے تقریر بھی کرواتے ہیں۔

صاحبو! اس بندۂ ناچیز حقیر و فقیر کا شمار اسی زمرے میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی قسمت کا لکھا پورا

کرنے کے لیے آپ کی سمع خراشی کر رہا ہے۔ جس کے لیے وہ معافی کا خواستگار ہے۔

مشاعرہ میں تقریر کا موضوع ظاہر ہے کہ شاعری، شاعر اور مشاعرہ ہونا چاہیے۔ اس موقع پر اپنی نااہلیت کا برملا اظہار کرتا ہوں کہ میں شاعری پر رائے زنی نہیں کر سکتا۔ وزن کے تعلق سے سنتا ہوں تو اپنا بڑھتا ہوا وزن یاد آتا ہے جسے قابو میں رکھنے کی کوشش میں، میں رات دن سرگرداں رہتا ہوں۔ بحر کا نام سن کر میرا ذہن "بحر منجمد" کی طرف چلا جاتا ہے جسے بچپن میں "بحر اعظم" کہنے پر میری گوشمالی ہوئی تھی۔ خریف اور ربیع فصل کی طرح مجھے ردیف اور قافیہ بھی فصلوں کے نام سجھائی دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے زمین کے بارے میں خیال آتا ہے کہ وہ کاشت کردہ زمین ہے جس کی پیداوار میں چار فصلیں خریف، ردیف، ربیع اور قافیہ شامل ہیں۔

ایسی ناقص معلومات رکھنے والے شخص کو شاعری پر ہرگز بات نہیں کرنی چاہیے لیکن میرے ایک دوست کے مطابق ایسا شخص شعر کہہ سکتا ہے خاص طور سے جدید شعر۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری کے لیے شاعرانہ مزاج چاہیے۔ شاعری کی تکنیک اور دیگر باریکیاں نقادوں کے لیے ہوتی ہیں موصوف کے ورغلانے کے باوجود میں نے کبھی شعر نہیں کہا۔ آج کے دور میں اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والے کا شاعری نہ کرنا عجیب بات لگتی ہے۔ میں نے ایسے بھی اردو بولنے والے دیکھے ہیں جو دیوناگری اور رومن رسم الخط میں لکھ کر شعر پڑھتے ہیں۔

اپنا بھرم برقرار رکھنے کے لیے میں شاعری کے تعلق سے کچھ بھی نہ کہوں گا۔ صرف شاعر اور مشاعرہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا اور وہ بھی شعرا سے معذرت کے ساتھ۔ معذرت کے بعد بھی شاعروں کے بارے میں کچھ کہنے سے گھبراتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اردو والوں میں اکثریت میں ہیں اور ان کی تعداد میں دن بہ دن بلکہ لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ متناسب نمائندگی کا سادہ سا اصول ہے کہ شعرا پڑھیں گے اور سبھی شعرا کلام سنائیں گے تو مشاعروں کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہوگا۔ شاید اسی لیے میرے ایک دوست نے شاعر کی جمع مشاعرہ بتایا۔ میں نے ان کی تصحیح کی کہ شاعر کی جمع شعرا ہے تو کہنے لگے کہ جمع الجمع کی رو سے شعرا کی جمع مشاعرہ ہے۔

مشاعرے مختلف عنوانات اور موضوعات کے تحت منعقد کیے جاتے ہیں۔
استقبالیہ مشاعرہ، وداعی مشاعرہ، سالانہ مشاعرہ، عید ملاپ مشاعرہ، افتتاحی مشاعرہ، اختتامی مشاعرہ، تہنیتی مشاعرہ، یادگار مشاعرہ، مشاعرہ سال نو، مشاعرہ جشن آزادی، امدادی مشاعرہ، مقصدی مشاعرہ، وغیرہ وغیرہ۔ اصل مقصد مشاعرہ کرنا ہوتا ہے۔ محفل تو بس شاعروں کو اکٹھا کرنے کا بہانہ ہے۔ ان محافل اور جلسے نما مشاعروں کے علاوہ مشق سخن کے لیے طرحی، غیر طرحی، آزاد، ماہانہ اور تنقیدی جیسے نام کے کئی مشاعرے الگ منعقد ہوتے ہیں۔ جہاں بھی چند اردو والے جمع ہوں وہاں مشاعرہ ہونا اردو کلچر کے لیے ضروری ہے۔ ۲۰۰۱

زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے بھی مقامی، بین صوبہ جاتی، بین الاقوامی اور عالمی مشاعرے سجائے جاتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ شعرا حضرات موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کسی بہانے مشاعرہ منعقد کیا کیا جائے۔ میں ایک شاعر سے واقف ہوں جو اپنی بیوی اور بچوں کو چھٹی پر صرف اس لیے روانہ کرتے ہیں کہ مشاعرہ پہ مشاعرہ برپا کیا جائے۔ موصوف سلسلہ وار مشاعروں کو جشن دفتی آزادی کا عنوان دیتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی موقع ہاتھ نہ آیا تو مشاعرہ برائے مشاعرہ" بھی منعقد کیا جاتا ہے۔

یوں تو مشاعرے سامعین کے لیے ہوتے ہیں لیکن مشاعروں میں سامعین کی گھٹتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مشاعرے شعرا کے ذوق سخن طرازی کی تسکین کے لیے مختص ہو جاتے ہیں۔ میں ایک ایسے مشاعرے میں شریک رہا ہوں جس میں میرے علاوہ کوئی دوسرا سامع نہ تھا لیکن شعرا کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سامعین کی کمی اس طرح پوری کی گئی کہ شاعروں کو دو جماعتوں اور مشاعرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں ایک جماعت اسٹیج پر براجمان ہوئی اور کلام پیش کیا جبکہ دوسری جماعت سامعین بن کر مشاعرہ سنتی رہی۔ مشاعرے کے دوسرے دور میں سامعین اسٹیج پر تشریف فرما ہو کر شاعر بن گئے اور شعرا سامعین چونکہ میں واحد سامع تھا۔ مجھے مشاعرے کے دونوں حصوں میں مہمان اعزازی برقرار رکھا گیا۔

میں اور آپ وطن سے دور دیارِ غیر میں اردو کی نئی بستیاں بسائے ہوئے ہیں۔ شاید ہی کوئی جمعرات اور جمعہ سعودی عرب میں ایسا گزرتا ہے جب کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا ہوگا۔ بغیر مشاعرے کے ویک اینڈ ہو نہیں سکتا۔ واہ واہ اور عرض کیا ہے سے ویک اینڈ کا آغاز ہوتا ہے اور مشاعرے کی برخاستگی سے ویک اینڈ کا اختتام بعض مرتبہ ایک ہی دن کئی مشاعروں کی خبریں اور اطلاعات ملتی ہیں۔

مشاعروں کی بہتات کی وجہ صرف اور صرف شعرا ہیں اور شعرا کی کثرت کے اسباب سمجھ سے باہر ہیں۔ کیا شاعری اتنی سہل ہے کہ ہر کس و ناکس عرض کرنے لگتا ہے۔ ایک شاعر فرماتے ہیں کہ شاعری انسان کی پہلی زبان ہے۔ انسان پیدا ہو کر وزن میں روتا ہے۔ اس بنا پر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی شاعر ہے اور ہر کوئی شاعری کر سکتا ہے اور مشاعرے یہ موقع فراہم کرتے ہیں۔ موصوف کی بات میں وزن ہے میں نے مشاعروں میں کئی شاعروں کو بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ اچھے خاصے باذوق سامع کو معلوم نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ ہاتھ میں کاغذ کا ٹکڑا لیے مائیک پر کھڑا ہو جاتا ہے اور گلا صاف کر کے کہتا ہے" میں اپنی پہلی کاوش پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر آپ حضرات نے ہمت افزائی کی تو مشقِ سخن جاری رکھوں گا۔

نہ یہ بالکلیہ زمی جملہ ہوتا ہے۔ نومولود شاعر سامعین کی پسند اور نا پسند کی پرواہ کیے بغیر مسلسل "ستم سخن" جاری رکھتے ہیں اور بہت جلد مستند شاعر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ چند مہینوں میں مجموعۂ کلام بھی چھاپ لیتے ہیں اور پھر چند برسوں میں استاد شاعر بن جاتے ہیں۔

شعرا کی بڑھتی ہوئی تعداد اور تعلیمی اداروں اور دفتروں سے غائب ہوتی اردو کو دیکھ کر خوف سا طاری ہونے لگتا ہے کہ کہیں اردو صرف شاعری کی زبان نہ بن جائے۔ اس خیال کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ بعض لوگ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے اردو سیکھتے ہیں اور جب اردو سیکھ جاتے ہیں تو ... شاعری کرنے لگتے ہیں۔

کوئی بھی شاعر بن سکتا ہے۔ شاعر بننے کے لیے کوئی بنیادی لیاقت درکار نہیں ہے صرف شاعر بننے کی جستجو اور حوصلہ چاہیے۔ اس لحاظ سے شاعر، لیڈر کے مماثل ہے۔ لیڈر بننے کے لیے بھی کوئی قابلیت نہیں چاہیے۔ کوئی بھی شخص لیڈر بن سکتا ہے۔ میدان مارنے کے لیے۔ دونوں کو عوام کے سامنے جانا پڑتا ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ لیڈر بن کر بے تحاشہ کما سکتے ہیں جبکہ شاعر بننا گھاٹے کا سودا ہے۔

نقادوں کا خیال ہے کہ شاعروں کی بہتات شاعری کے معیار پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ کئی شاعر ایک ہی خیال اور موضوع کو باندھ رہے ہیں یا ایک ہی زمین میں طبع آزمائی کر رہے ہیں اور بسا اوقات شاعروں کے مصرعے اور اشعار تک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مشاعروں اور شاعری کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے نہ صرف شعرا کی بڑھتی ہوئی تعداد پر پابندی ضروری ہے بلکہ موجودہ شعرا میں کمی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ کمی کیسے ہوگی اور شاعری کے لیے کیا پابندیاں عائد کی جانی چاہئیں۔ اس کے لیے ایک کمیشن بٹھانا پڑے گا۔ تب تک ادب میں شاعری ہی شاعری ہوگی اور چہار طرف شعرا ہی شعرا ہوں گے۔

غزل

نسیم سحر
(جدہ)

غیر سے تھوڑی سی اک دن بے وفائی کر کے دیکھ
کتنا سچا پیار ہے میرا، لڑائی کر کے دیکھ

یونہی استعمال ٹوٹی چار پائی کر کے دیکھ
میز اگر بنتی نہیں، اس کو تپائی کر کے دیکھ

رام خوشامد سے وہ دستِ حنائی کر کے دیکھ
اس بڑھاپے میں بھی قسمت آزمائی کر کے دیکھ

تیرے بارے میں ہیں معلومات کتنی اُس کے پاس
جاننا ہے تو پڑوسی سے لڑائی کر کے دیکھ

فائدہ درکار ہے تو باس کو مکھن لگا
اس طرح کڑوے کریلے کو مٹھائی کر کے دیکھ

خط نہیں لکھتا ہوں میں، مجھ کو نہ یہ الزام دے
اپنی الماری کی بھی اک دن صفائی کر کے دیکھ

دل مرا کیسے بھُنا جاتا ہے تیرے ہجر میں
یہ تماشا، جانِ من، مُرغا فرائی کر کے دیکھ

سوئی دھاگا ہاتھ میں ہے اور کوئی کپڑا نہیں
کھال حاضر ہے مری، اس پر کڑھائی کر کے دیکھ

بینڈ باجا ساتھ ہو، سہرا ہو ماتھے پر بندھا
کوچۂ جاناں پہ اک دن یوں چڑھائی کر کے دیکھ

اب ذرا حیرت نہ ہوگی گر کوئی بچہ کہے
میرے ابا — اب ذرا میری پٹائی کر کے دیکھ

وہ حسینہ اب ضعیفہ ہو چکی تو کیا ہوا
مرثیہ ہے تو بھی تو اس کو رباعی کر کے دیکھ

دیکھ پھر کیسے یہ دُنیا نوچ ہی لے گی تجھے
تو کبھی اک شخص کی حاجت روائی کر کے دیکھ

روبرو ہو یار تو رُخ اپنا اس سے پھیر لے
اپنی قربت میں کبھی شامل جدائی کر کے دیکھ

دیکھ پھر کرتا ہے وہ تجھ سے بغاوت کس طرح
اپنی مرضی سے تو، بیٹے کی سگائی کر کے دیکھ

کیسے کرتے ہیں غزل تیار اُستادانِ فن
قافیہ چُن کوئی اور اس کی گھسائی کر کے دیکھ

سنگدل ہے وہ بہت تو پیش کر تحفے اُسے
یوں اُسے تو، دودھ مکھن اور ملائی کر کے دیکھ

عمر بھر کیا کیا کرے گا وہ برائی تیرے ساتھ
یہ کسی کم ظرف سے اک دن بھلائی کر کے دیکھ

باپ کی دولت پہ گلچھرّے اُڑائے جا چکے
اپنی محنت سے اب اے بیٹے کمائی کر کے دیکھ

پھر جنونِ عشق میں بخیے اُدھڑ جائیں گے سب
تو ذرا چاکِ گریباں کی سِلائی کر کے دیکھ

عشق اک کمسن سے، وہ بھی اس بڑھاپے میں نسیم
باز آجا، یوں نہ اپنی جگ ہنسائی کر کے دیکھ

دوسروں پر اس قدر تنقید بھی مت کر نسیم
تو کبھی اپنے بھی دامن کی دھلائی کر کے دیکھ

کس قدر چھوٹی نظر آتی ہے یہ دُنیا نسیم
یہ سپرسانک جہازوں پر فلائی کر کے دیکھ

★

ڈاکٹر پرویز ید اللہ مہدی
(شارجہ)

(دوسری قسط)

سوالنامۂ شعر و شاعری

استاد محترم علامہ جھٹ پٹ جھٹ خفانگری نے شاعری کے اسرار و رموز کو آشکار کرنے والی جن کتابوں کے مطالعہ کا ہمیں مشورہ دیا تھا ان کتابوں کی تلاش نے ہمارا بھی وہی حشر کیا جو لیلیٰ کی چاہ نے مجنوں کا کیا تھا۔ ان کتابوں کی تلاش نے ہم سے شہر کی سرکاری، امدادی لائبریری ہر قسم کی لائبریریوں کی خاک چھنوائی اور جب یہ چھنی ہوئی خاک دماغ کے دریچوں سے ذہن کے نہاں خانوں میں منتقل ہوگئی تو ہم پھرا۔ ہمارے محترم علامہ موصوف کے درِ دولت پر پہنچے علامہ نے ہمارا امتحان لینے کی غرض سے پہلے ہی سے مرتب شدہ سوال نامہ ہمارے حوالے کیا جو معلوماتِ عامہ کی خاطر ہمارے جوابات کے ساتھ پیش ہے:

سوال: شاعر کسے کہتے ہیں؟

جواب: اس شخص کو جو ہوتا تو آدمی ہے لیکن آدمی کے علاوہ سب کچھ نظر آتا ہے۔ یہ زمین پر تو جھاڑو کی کاڑی نہیں توڑ سکتا لیکن آسمان سے تارے توڑ لانے کے منہ زبانی دعوے بڑے ہی دھڑلے سے کرتا ہے۔ ویسے یہ زندگی بھر کوڑی کوڑی کو محتاج رہتا ہے لیکن دور کی کوڑی لانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ البتہ ایامِ پیری میں محرم کے میلے میں کوڑی والا عود بیچتا نظر آتا ہے۔!

سوال: شعر کی تعریف

جواب: شعر دراصل اس کلام کو کہتے ہیں جو ہرگز سچ نہیں ہوتا لیکن اس پر جھوٹ کا گمان نہیں ہوتا کبھی بحر میں ہوتا ہے تو کبھی بے بحر۔ نئے میٹرک پیمانوں کے حساب سے شعر کا وزن کیلو گرام میں ہوتا ہے لیکن بیشتر شاعر اب بھی پرانے پیمانے استعمال کرتے ہیں اور یہ کہہ کر خوش ہوتے ہیں کہ:

مئے جامِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

نوٹ: شاعر کی زندگی ہی میں اس کے کلام کی قدر کرنا گناہ کبیرہ ہے کسی شعر کی تعریف کرنے سے پہلے یہ دریافت کرلینا چاہیے کہ شاعر زندہ تو نہیں ہے اور اگر زندہ ہو تو اس کے مرنے کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ اردو شاعری میں مردہ پرستی کی روایت بڑی پرانی اور مضبوط ہے ---!

سوال: ایسے شاعر کی تعریف کرو جو دوسروں کے کلام کو اپنا کہہ کر سناتا ہو ---؟

جواب: ایک ایسا باپ جس نے بیوہ سے شادی کی اور اسے چند بچے جہیز میں حاصل ہوئے۔

سوال: ذیل کی شاعرانہ اصطلاحات کی تشریح کرو!

(۱) عاشق و معشوق ---!

جواب: عاشق اس شبِ دیجور کی اولاد کو کہتے ہیں جسے دن میں تارے اور رات میں سورج دکھائی دیتا ہے۔ یہ جس پہ جان چھڑکتا ہے وہ اس کا نام سن کر ہی بھڑکتا ہے۔ یہ بڑا بے غیرت ہوتا ہے اور اپنی طبعی موت سے پہلے کئی بار مرتا ہے۔ معشوق اس فتنے کو کہتے ہیں جو عاشق کی رگ رگ سے واقف ہوتا ہے۔ خصوصاً شہ رگ سے جسے عرف عام میں دکھتی رگ بھی کہتے ہیں۔ معشوق کی جنس کا تعین کرنا خود اپنی جنس کو خطرہ میں ڈالنے کے برابر ہے۔ یہ جب عاشق پر بہت مہربان ہوتا ہے تو اس پر اپنے کتے چھوڑ دیتا ہے یا سرِ راہ اپنے کزنس سے پٹوا دیتا ہے۔

نوٹ: کوئی عاشق اپنی معشوق کے کزنس کی صحیح تعداد نہیں بتا سکتا کیونکہ اسے ہر نوجوان اپنی معشوق کا کزن نظر آتا ہے۔

استادِ محترم نے ہمارے جوابات پھر جیسے ہی ملاحظہ فرمائے بے ساختہ اچھل پڑے بلکہ ایک نعرہ دار چیخ کے ساتھ ہمارے گلے سے لگ گئے پھر خوشی سے کانپتے اور فرطِ مسرت سے ہانپتے ہوئے بولے۔ برخوردار شاعری کے میدان میں میرے بعد یقیناً تم ہی میری جگہ لوگے، میں اپنے آپ کو بڑا قادر الکلام سمجھتا تھا لیکن تم تو عبدالقادر الکلام نکلے ---! پھر کچھ توقف کے بعد رازدارانہ لہجے میں فرمایا --- "ایک گزارش ہے برخوردار زندگی بھر ہی میں میری جگہ لینے کی کوشش مت کرنا ---!"

ہم نے جواب میں یہ کہہ کر انھیں مطمئن کر دیا کہ آپ زندگی کی بات کہتے ہیں۔ استادِ محترم میں تو آپ کی موت کے بعد بھی آپ کی جگہ نہ خود لوں گا نہ کسی اور کو لینے دوں گا بلکہ آپ کی جگہ آپ کی ٹوپی یا جوتیاں رکھ کر آپ کی چھوڑی ہوئی جگہ کو پُر کرنے کی کوشش کروں گا ---! اتنا سننا تھا کہ علامہ پھر اُچک کر ہمارے گلے سے لٹک گئے اور بہت دیر تک لٹکے لٹکے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتے رہے اور اگلے ہی دن ایک عدد ٹوپی اور جوتیوں کا جوڑا حفظ ما تقدم کے طور پر ایڈوانس میں ہمارے حوالے کر دیا اور حلفیہ وعدہ لیا کہ ہم اپنے قول سے ہرگز نہیں پھریں گے ---!!

قوارد کے نام پر سرقہ اور ٹیکنیک کی آڑ میں دوسرے شعراء کے کلام کو گلا نہ

کے اسرار و رموز سے ہم چونکہ واقف ہو چکے تھے لہٰذا استادِ محترم نے اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھ کر گلے بازی کی ٹریننگ حاصل کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ بقول علامہ وہی شاعر مشاعرہ لوٹتے ہیں جن کا کلام بے جان اور ترنم جاندار ہوتا ہے گویا شاعری ایک ایسا بے جان بُت ہے جس میں بقول استاد صرف ترنم کے زور سے جان ڈالی جا سکتی ہے۔ علامہ نے اپنے ایک سفارشی خط کے ہمراہ ہمیں شہر کے مشہور گلے باز استاد گلے باز خاں گونج کے ہاں پارسل کر دیا، اس حکم کے ساتھ کہا بیٹا استاد گلے باز خاں گونج کے آگے اپنے زانوئے ترنم تہہ کرنا!

استاد گلے باز خاں گونج پورے ایک مہینے تک ہم سے اپنے گھر کا بلکہ اپنی ایک عدد داشتہ کے گھر بھی پانی بھرواتے رہتے۔ وہ بھی صبح شام دونوں اوقات۔ ایک دن تنگ آکر ہم نے پوچھا۔ "استاد یہ ستم کب تک؟ آخر آپ کب تک مجھ سے یوں پانی بھرواتے رہیں گے۔!

استاد نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "اس وقت تک جب تک کہ پانی بھرتے بھرتے..... تمھارا گلا پانی کی طرح رواں نہ ہو جائے!" ہمارا گلا تو خیر پانی کی طرح رواں نہ ہوا، ہم خود البتہ وہاں سے رواں ہو گئے۔ اس دوران میں تاہم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ پانی بھرنے کی مشقت سہتے سہتے ہمارے گلے میں خود بخود ایک درد سا پیدا ہو گیا اور علامہ جھٹ پٹ نے اسی درد کو غنیمت جانا اور ٹریننگ کے اگلے مرحلے کی طرف ہمیں دھکیل دیا۔!

اگلا مرحلہ نرت کلا، عرف فنِ رقص سے متعلق تھا یعنی جب ارشادِ استادِ گرامی نرت کلا کے کچھ مخصوص پینترے سیکھنے کی غرض سے پنڈت تاتا تھیا عرف ناچ نچیا" کے ڈانسنگ اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ ویسے شاعری اور رقص میں بظاہر کوئی جوڑ، کوئی تال میل نظر نہیں آتا لیکن علامہ کا استدلال سننے کے بعد آجائے گا۔ استادِ محترم کا استدلال تھا کہ مشاعروں میں وہی شاعر کامیاب ہوتے ہیں جو ترنم کے ساتھ رقص کے مختلف بھاؤ بھی بتاتے ہیں۔ مثلاً اگر شعر میں گریباں چاک کرنے کا مضمون بیان ہوا ہے تو سناتے ہوئے اگر شاعر ایک خاص ادا کے ساتھ بل کھا کے لہرا کے عملی طور پر گریباں چاک کر ڈالے تو بقول علامہ شعر کا دوآتشہ ہونا یقینی ہے اس کے علاوہ سامعین ایسے شاعروں کے ترنم اور بھاؤ میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ شاعری کی فنی خامیوں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا یہی وجہ ہے کہ جو بدنصیب شاعر ترنم اور رقص کی تربیت سے کورے ہوتے ہیں یعنی جو حسبِ حال بھاؤ نہیں بتا سکتے انھیں بے بھاؤ کی ہوٹنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلعموم علامہ اپنے تمام شاگردوں کو ہر طرح کے کیل کانٹوں سے سوائے شاعری کے حسن کے لیس کر کے، عرف مشاعرہ گاہ میں اتارنے کے قائل نہیں تھے۔!!

علامہ جھٹ پٹ جھٹ خانگری نے ڈگری کورس کی طرح شاعری کا کورس عرف نصاب بھی برمبنی عرق ریزی و جانفسانی کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہم پہلے تین مرحلے یعنی مرغے، گلے بازی اور رقص میں مہارت تامہ حاصل کر کے تینوں مراحل کامیابی کے ساتھ طے کر چکے تھے۔ اب اگلا جو مرحلہ تھا وہ فائنل اور سب سے خطرناک مرحلہ تھا کیونکہ یہ مرحلہ تھا عاشقی کا بالفاظ دیگر محبوبہ پالنے کا جو یقیناً شیر پالنے بلکہ کسی اژدھے کو پالنے سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا تھا۔ ہم نے اس مرحلے سے جان چھڑانے کے لیے طرح طرح کے معقول و نامعقول بہانے تراشے، شرعی و غیر شرعی عذر پیش کیے لیکن استاد کے آگے ایک بہانہ ایک عذر نہ چلا، اس سلسلے میں علامہ کا پُر زور استدلال تھا کہ شاعری کے ساتھ عاشقی کا تصور اتنا اٹوٹ ہے جتنا کہ عدالت کے ساتھ جج کا یا تانگے کے ساتھ ٹٹو کا نہ ٹٹو کے بغیر تانگہ چل سکتا ہے نہ جج 'مہودے کے بغیر عدالت' ہو بہو ایسے ہی جس شاعری میں حسن و عشق کی چاشنی نہ ہو وہ ایسی ہے جیسے بغیر گوشت کی بریانی یا بغیر استر کی شیروانی اور بغیر استر کی شیروانی، اوپر سے تو شیروانی ہوتی ہے لیکن اندر سے سرتاپا پریشانی ہوتی ہے۔ لہذا ہر شاعر کو چاہیے کہ کم از کم ایک عدد عشق ضرور کرے، فرضی محبوبہ ہی سہی لیکن پال لے ضرور ——— استاد عالی مقام کا استدلال سن کر ہم نے ٹھنڈی آہوں اور گرم سانسوں کے بھپکارے چھوڑتے ہوئے عرض کیا۔ "کاش استاد آپ کے کوئی لڑکی ہوتی۔!

کیا مطلب ——؟ استاد کی بھویں تن گئیں۔

عرض کیا ——— مطلب صاف ہے۔ شاعری کے لیے جس عاشقی کو اور جس عاشقی کے لیے محبوبہ کے وجود کو آپ اس قدر لازم و ملزوم بتلا رہے ہیں اس محبوبہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنا نہیں پڑتا ——" ہماری بات پیاس سے پہلے کہ علامہ ہتھے سے اکھڑتے ہم نے انھیں یہ کہہ کر ہتھے پر مضبوطی سے جما دیا کہ جس طرح آپ نے اپنے استاد محترم کی دختر نیک اختر سے عشق فرما کر دیوان کالے کیے ہیں۔ اسی طرح خاکسار بھی شاعری کی زمین میں اپنا ہل چلا کر غزلوں کی فصلیں، نظموں کے کھیت اگاتا ———!!"

کہتے ہیں سچ کہ جھوٹ کی عادت . . . . . ہے کم ہیں، محبوبہ کا مسئلہ ہمارے لیے واقعی ٹیڑھی کھیر تھا ——— ہمارے ساتھ المیہ یہ تھا کہ جیسے ہی ہم نے شاعری شروع کی پڑوسیوں نے اپنی کھڑکیاں اور رشتہ داروں نے اپنے دروازے ہم پر بند کر دیے۔ کبھی کسی شدید ضرورت کے تحت ہم کسی رشتے دار کے ہاں جاتے بھی تو ہم پر دو چار عقابی نگاہوں کا کڑا پہرا اس طرح لگا رہتا . . . کہ کسی کنواری لڑکی سے بات کرنا تو کجا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے، گویا صرف ہمارے حق میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی تھی، ایسے نامساعد سنگین حالات میں ہم نے محبوبہ پالنے کے لیے کیا کیا چکر چلائے اور کس قدر چکر

کھلتے ہیں یہ ایک طویل داستانِ خوں چکاں ہے، بہرحال اس عاشقی کے چکر میں تھوڑی
بہت جو عزتِ سادات رہ گئی تھی جب وہ بھی گنوا چکے تب استادِ محترم نے ہمیں قلم اٹھانے کا
مشورہ دیا۔ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ہم سب سے پہلے غزل کی طرف رجوع ہوئے لیکن دو چار
ہی غزلیں موزوں کر پائے تھے کہ علامہ نے فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے برخوردار تمہاری محبوبہ یا
محبوبائیں تم پر جان چھڑکتی ہیں ——!" ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو موصوف ناصحانہ
لہجے میں بولے —— "برخوردار غزل کی آبرو تو اس میں ہے کہ شاعر بھرے بازار میں
بے آبرو ہو جائے، شاعری میں حزن و ملال کا رنگ بھرنے کے لیے دل پر چوٹ کھانا بیحد
ضروری ہے، جب تک غمِ جاناں، غمِ دوراں اور اسی قبیل کے تمام غم اپنی ذات میں
مدغم تر ہو جائیں، بات نہیں بنتی، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم موجودہ محبوباؤں سے فوراً
کنارہ کش ہو جاؤ اور کوئی ایسا معشوق تلاش کرو جو طوطا چشم ہو۔ کسی اور سے محبت
کرتا ہو یا عنقریب جس کی شادی ہونے والی ہو بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ تم کسی شادی شدہ
نازنین سے یک طرفہ عشق شروع کر دو ——!" علامہ کے اس خطرناک مشورہ پر ہم نے
فوراً اس اندیشے کا اظہار کیا۔ اس طرح تو استادِ عالی مقام سرِعام پٹ جانے کا خطرہ ہے!
مسکرا کر بولے — "یہی تو میں چاہتا ہوں بقول شاعر:

سرخرو ہوتا ہے شاعر خوب پٹ جانے کے بعد
اور رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد

مذکورہ شعر نے کہ جو اپنے مضمون ہی کی طرح خوب گھسا ہوا تھا ہمارا منہ بند کر دیا
چنانچہ اپنی شاعری میں حنا کا رنگ بھرنے کے لیے ہم۔ اس قدر پٹے اور گھسے کہ ڈھول دھپہ
پروف ہو گئے ——!!!

ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر پورے وثوق بلکہ دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ شاعری
کے فیوض و برکات بے حد و بے حساب ہیں لیکن وائے بد نصیبی کہ ہر شاعر ان سے
فیض یاب نہیں ہوتا چاہے اس کا تخلص فیض ہی کیوں نہ ہو۔ ویسے بھی تخلص فیض ہونے سے
ہر کوئی فیض احمد فیض نہیں ہو جاتا، جس طرح اقبال جلدی جلدی نہیں آتا بلکہ اقبال ہمیشہ دیر
سے آتا ہے اسی طرح فیض بھی بار بار پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال بات ہو رہی تھی شاعری
کے فیوض و برکات کی جن سے ہر شاعر کما حقہ فیض یاب نہیں ہوتا تاہم ہمارا شمار ان
بے فیض بد نصیبوں میں نہیں ہوتا جنھیں شاعری کا انعام صرف بربادی و رسوائی کی صورت
میں ملتا ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ شاعری ہمارے لیے روزی کا ایک انوکھا ذریعہ بن گئی
انوکھا اس لیے کہ ہم شاعری کے مروجہ طریقۂ روزگار سے مستفیض نہیں ہوتے یعنی مشاعرے
پڑھ کر روزی نہیں کماتے بلکہ ہم نے تو یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ شاعری کے ذریعہ داداگیری کا بھی

مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ شاعری کے ذریعہ روزگار کا یہ نادر روزگار وسیلہ حسن اتفاق ہی سے ہمارے ہاتھ آیا، ہوا یوں کہ ایک مرتبہ ہم حسب معمول اپنے گھر کی کھڑکی میں لیٹے بظاہر مشق سخن میں مصروف تھے لیکن حقیقتاً پڑوسی کی کھڑکی جو عین ہماری کھڑکی کے روبرو کھلتی تھی اس میں لٹکی ایک حسین قیامت کا نصف شب سے پو پھٹنے تک جائزہ لیتے رہے۔ نتیجتاً اگلی صبح صاحب خانہ نے ہمارے چال چلن پر زبانی کیچڑ اچھالا۔ اس کے باوجود ان کی کھڑکی سے ہماری دل چسپی کم نہ ہوئی۔ چنانچہ ان کی طرف سے دھمکیاں وصول ہوئیں لیکن ایک تو ہم عام شاعروں کی طرح دھان پان نہیں ہیں۔ دوسرے اسکول کے زمانے سے ہر قسم کی خارج از نصاب سرگرمیوں میں بالخصوص تخریبی کارروائیوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے آئے ہیں۔ اس لیے یہ دھمکیاں ہمارے حق میں گیدڑ بھبکیاں ثابت ہوئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد وہ لوگ خود مکان خالی کر گئے۔ جیسے ہی مالک مکان کو اس بات کا علم ہوا، وہ دوڑے دوڑے آئے اور انتہائی عاجزی اور منت کے ساتھ سو سو کے چند نوٹ ہماری نذر کرتے ہوئے فرمایا۔ پچھلے نو مہینے سے میں یہ مکان خالی کروانے کی کوشش میں تھا۔ بہتیرے حربے آزمائے۔ ڈھیروں روپیہ برباد کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور تم نے کمال کر دیا ــــ!! ہماری تعریفوں کے پل باندھنے کے بعد موصوف نے ہم سے یہ خفیہ معاہدہ کیا کہ جب بھی انھیں اپنا کوئی مکان خالی کروانا ہوگا ہماری شاعرانہ خدمات حاصل کریں گے۔ شہر میں موصوف کے چونکہ کئی مکان تھے لہذا مہینے میں دو ایک بار ہمیں اپنی شاعرانہ داداگری کا مظاہرہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ یوں تو اس معاملے میں ہم اکثر کامیاب رہے ہیں لیکن ایک مرتبہ مقابلہ کانٹے کا رہا بلکہ ہمیں پیچھے ہٹ آنا پڑا۔ ہوا یوں کہ ہم نے حسب معاہدہ مقام مطلوبہ پر پہنچ کر ایک کھڑکی کا انتخاب کر کے باضابطہ شاعرانہ کارروائی کا آغاز کیا ہی تھا کہ اُدھر سے بھی دو کاجل بھری دنبالہ دار آنکھیں مقابلے پر اُتر آئیں، بلکہ یہ مقابلہ تو بعد ازاں کوارٹر فائنل سے سیمی فائنل اور پھر فائنل میں بھی پہنچ گیا لیکن ہار جیت کا فیصلہ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا، چنانچہ ہم نے باوثوق ذرائع سے ان مسماۃ کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو پتہ چلا کہ مسماۃ ایک سیاہ رو مگر خوش گلو شاعرہ ہیں ــــ ہم فوراً اس مقابلے سے دستبردار ہو گئے اور مالک مکان سے کہہ دیا کہ صبر کیجیے۔ کہ اب سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں، کوئی طرم خاں بھی یہ مکان خالی نہیں کروا سکتا اب جس میں ایک شاعرہ سکونت پذیر ہے ــــ" اس ناکامی نے ہمیں کسی قدر چوکنا کر دیا۔ اسی لیے اب ہم ایسے مکان خالی کروانے کی ذمہ داری نہیں لیتے جن میں شاعر یا بھوت رہتے ہوں ــــ!

اب ہمارے اندر شاعری اس قدر حلول کر چکی ہے کہ ہم کسی زاویہ سے آدمی نظر نہیں آتے۔ کسی کی ذرا سی بھی بد ذوقی ہم سے برداشت نہیں ہوتی، چنانچہ ہم نے صرف اتنی سی بات پر اپنے سالے کے خسر کے سمدھی سے قطع تعلق کر لیا کہ ایک مرتبہ موصوف نے دیوان غالب کے تذکرے پر یہ پوچھ لیا تھا کیا غالب دیوانے بھی تھے جو اکثر شاعر بات بات میں "دیوانے غالب، دیوانے غالب" کا حوالہ دیتے ہیں ــــ " شاعرانہ اصطلاحات

ہماری زبان پہ اس قدر چڑھ گئی ہیں کہ ابھی حال ہی کی بات ہے جب ہمارے پڑوسی نے اپنی ساس صاحبہ کے انتقالِ پر ملال کی خبر سنائی تو ہم نے بے ساختہ کہا واہ واہ سبحان اللہ مکرر ارشاد۔

قصہ مختصر یہ کہ شاعری اب ہمارا اوڑھنا بچھونا تکیہ، چادر، بلانکٹ وغیرہ وغیرہ بن چکی ہے بلکہ اب تو اہلِ خانہ بھی ہمیں آدمی نہیں صرف شاعر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی کی بات ہے والد صاحب سے کسی نئے شناسا نے جب ان سے بچوں کی تعداد پوچھی تو والد صاحب نے جواب دیا ـــــ تین لڑکیاں، دو لڑکے اور ایک شاعر ـــــ ●●

بازغ بہاری
کلکتہ

نیکی کر دریا میں ڈال

میں نے بیگم سے کہا، اے میری پیاری اہلیہ
اے میری جانِ تمنا، اے مری زہرہ جبیں
سن کے بولی اہلیہ، ہو کام سے فرصت اگر
تم جو کرتی ہو اکیلی گھر کے سارے کام کاج
دیکھ کر صحت تمہاری مجھ کو ہوتا ہے ملال
پھول سا کھلتا ہوا چہرہ خزاں کی زد میں ہے
دیکھ کر چہرہ تمہارا، اے مری زہرہ جمال
گھر میں لاؤں کچھ پرِ لیورتن تمہارے واسطے
تاکہ چھٹکارا ملے تم کو گھریلو کام سے
ضبط کی قوت جو حد سے ایکسپائر ہوگئی
میرے گھر میں آگیا پھر تو اچانک زلزلہ
جی میں آئے جو تمہارے وہ کرو ٹوکے گا کون
خوب گلچھرے اڑاؤ ٹھاٹ سے شام و سحر
میں نے بیگم کو دکھایا راستہ تعمیر کا
کس قدر ہوتا ہے ناقص صنفِ نازک کا دماغ
اب کوئی شوہر نہ دے گا اہلیہ کو مشورے
کس طرح میکے نکل بھاگی وہ ہرجائی نہ پوچھ

تم سے اک ٹاپک پہ کرنا ہے ضروری مشورہ
چند لمحوں کے لئے بیٹھو ذرا میرے قریں
عرض کی میں نے، اے میری ہمنشیں و ہمسفر
بائی دی وے، ہو نہ جاؤ مبتلائے اختلاج
آگیا ہے وقت سے پہلے جوانی پر زوال
حسن کے بارود کا فقدان خال و خد میں ہے
اب تو شدت سے مجھے ہونے لگا ہے یہ خیال
عقدِ ثانی کر کے اک سوکن تمہارے واسطے
رات دن بیٹھی رہو کھٹیے پہ بس آرام سے
سنتے ہی یہ اہلیہ ناگاہ فائر ہوگئی
کھا کے پیچ و تاب پھر بولی یہ مجھ سے اہلیہ
عقدِ ثانی شوق سے کرلو تمہیں روکے گا کون
ہو مبارک گھر تمہیں یہ، میں چلی ابّو کے گھر
"سینۂ شمشیر سے باہر تھا دمِ شمشیر کا"
تیرگیٔ شب میں تو میں نے جلایا تھا چراغ
قول ہے پرکھوں کا "نیکی کے زمانے لد گئے"
"کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ"

حال بیگم کے بنا ہے بازغِ دلگیر کا
"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"

مجید عارف نظام آبادی

بمبیا فلموں پر 4 حروف

عروس البلاد بمبئی کو شہرت "دو جہاں" کی حاصل ہے۔ ایک تو فلم ورلڈ سے دوسرا انڈرورلڈ سے یہ "دونوں جہان" اپنے اندر ایک نئی دنیا سموئے ہوئے ہیں۔ دونوں کا وطن ایک ہونے کے ناطے ان میں گہری مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ فلم ورلڈ کے ہیرو کا پسندیدہ کھلونا ہتھیار ہے تو انڈر ورلڈ کے ہیرو کو بھی یہی کھلونا بھاتا ہے۔ فلموں میں گروہی تصادم ہوتا ہے اور انڈرورلڈ میں بھی جہاں فلموں میں تشدد پیش کیا جاتا ہے تو وہیں انڈر ورلڈ کے لوگ بھی کھلے عام تشدد کا بازار گرم کرتے ہیں۔ اغوا، غارت گری اور لوٹ مار میں دونوں ہی بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک افسانوی ہے تو دوسرا حقیقی۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون کس سے متاثر ہے؟؟

"بمبیا" دراصل بمبئی سے منسوب ہے لیکن کیا کیا جائے ...... ہماری فلموں کے ڈائرکٹرز اسے "بم" سے منسوب کرتے ہیں۔ جس فلم میں جتنے زیادہ بم دھماکے ہوں گے وہ فلم اتنی ہی کامیاب تصور کی جاتی ہے۔ ہمارے فلم بینوں کو حقیقی زندگی میں سنسنی خیز مناظر دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اس لیے سینما ہال میں سیٹیوں کے ذریعہ بموں کا استقبال کرتے ہیں۔ ان فلمی بم دھماکوں سے کسی کا نقصان ہو یا نہ ہو مگر ان فلم بینوں کو فائدہ ضرور پہنچتا ہے جو ایسی غیر معیاری فلمیں دیکھنے کے دوران باقاعدہ خراٹے لینے لگتے ہیں۔ فلم کے اختتام پر کوئی انھیں جگائے یا نہ جگائے۔ یہ بم دھماکے انھیں جگانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ فلم ڈائرکٹرز سے ہماری ادباً گزارش ہے کہ وہ بموں کا استعمال کریں لیکن فلم کے اختتام پر تاکہ معزز فلم بینوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ ویسے آج کل کی فلموں کا اختتام بھی کسی دھماکے سے کم نہیں ہوتا کیونکہ فلم بینوں کے وہم و گمان کے خلاف اچانک و غیر متوقع طور پر THE END کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور فلم بین کبھی اپنے آپ پر اور کبھی فلم بنانے والوں کی عقل پر ماتم کرنے لگتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے تحت ہم بمبیا فلموں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہماری ہر فلم کا ہیرو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے اور بے چاری ہیروئن کا تو کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہوتا سوائے فلم بیتوں کے۔ نہ جانے کیوں بمبیا فلموں کا ہیرو "عجیب الخلقت" ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ وہ چار سو تا چالیس ہزار غنڈوں کا تنہا مقابلہ کر سکتا ہے۔ معمولی پستول ہو کہ AK-47 کوئی بھی "گولی" اس "گولا بدن" کو کیا معمولی نیند بھی نہیں سلا سکتی۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ اس طرح مسکراتا ہوا نکل جاتا ہے جیسے اس پر پھول نچھاور کیے جا رہے ہوں۔ وہ کبھی غنڈوں کے ہاتھوں قتل ہونے والی اپنی ماں کی چتا کو آگ لگاتا ہے تو دوسرے ہی پل ہیروئن کے ساتھ کچھ اس انداز میں ڈانس کرتا نظر آتا ہے کہ گمان ہوتا ہے مرنے والی کی آتما کو شانتی پہنچانے کا بس یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔

کبھی وہ مجرمین کی لاشوں کے ڈھیر لگاتا ہے تو کبھی پولیس اسٹیشن میں ڈیوٹی پر متعین عملہ کو حیرت انگیز کمالات دکھاتا ہے۔ بھری عدالت میں وکیل کی پٹائی کر کے اسے ختم کرنے کے لیے پستول نہیں بلکہ قانون اپنے ہاتھ میں لیتا ہے

آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ "بمبیا ہیرو" کی زندگی کا مقصد صرف ہیروئن سے ایک عدد شادی ہوتا ہے۔ بس ایک اسی شادی کے لیے ہمارے پروڈیوسر کروڑوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔

"محو حیرت ہوں کہ یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی"

پروڈیوسر کفایت شعاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو صرف ہیروئن کے لباس پر۔ جس کی وجہ سے اتنی بچت ہو جاتی ہے کہ وہ کم بجٹ اور کم سے کم کپڑوں کی فلم بنانے کی سوچتا ہے۔ پوری فلم میں ہیروئن بہت کم بولتی ہے۔ جہاں جہاں ڈائیلاگ کی ضرورت ہوتی ہے وہ وہاں زبان سے کم لباس، میک اپ اور ڈانس سے کام لیتی ہے۔

ویلن سفاکی اور خونریزی کا مظاہرہ ہیروئن کی ذات پر کرتا ہے۔ وہ ہیروئن کو اغوا کر کے ایسی جگہ پر رکھتا ہے کہ بے پناہ مصروفیت کے باعث بعض اوقات وہ خود بھی بھول جاتا ہے لیکن ایسی جگہ پر بھی ہمارا عجیب الخلقت بمبیا ہیرو پہنچ جاتا ہے؟؟ پتہ نہیں کیسے؟؟

ایسی فلموں کے بجائے ان ناظرین کو ایوارڈ دینا چاہیے جو پورے تین گھنٹے صبر و تحمل کے ساتھ فلم دیکھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی دیکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

مرزا تحمل بیگ آنسو کے مطابق بمبیا فلمیں تکنیکی و معیاری اعتبار سے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہیں۔ مقصد سے عاری یہ فلمیں سماج میں اپنا کیا مقام رکھتی ہیں اس بحث سے قطع نظر ہم صرف اتنا کہیں گے کہ ان فلموں کو دیکھ کر کوئی متاثر ہو یا نہ ہو لیکن ڈاکو فلمی انداز میں ڈاکہ زنی کرنے کے فن سے واقف ہو گئے ہیں۔ کم سن بچوں نے "شکتی مان" بننے کی دھن میں کئی منزلہ عمارت

سے کود کسا ہی آرٹ کو پیدا کیا، تو سپر ہٹ چھاپ فرہادوں نے ذو معنی گیتوں کو مقبول و عام کیا ہے اور سچ پوچھیے تو ہمیا فلمیں زندہ ہیں تو صرف "عشق" پر۔ محبت کو لافانی۔ لاقیمت اور لازوال بیسنا تو ہمارے ڈائرکٹرز کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہمیا فلمیں محبت کو لافانی کم "لامعنی" زیادہ بتانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

بعض فلموں میں تو کہانی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ مستقل تبدیلی کہانی کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح سوکھی لکڑی کو آگ۔ نامور ادیب قاضی مشتاق احمد کے مطابق فلم ایک بنی بنائی قبر ہوتی ہے اس کے سائز کے مردے کو کہانی کی شکل میں تیار کرکے دفن کیا جاتا ہے۔

دوستو! پردے پر دکھائی جانے والی ڈرامائی فلموں کے جیتے جاگتے کرداروں کی حقیقی زندگی بھی کچھ کم ڈرامائی نہیں ہوتی ہے۔ "چٹ منگنی پٹ بیاہ جھٹ طلاق" ان کا "STATUS SYMBOL" سمجھا جاتا ہے۔

پتہ نہیں وہ کب کس سے عشق کرلیں۔ کس سے شادی اور کب اپنی "معصوم بیوی" کو تحفہ کے طور پر طلاق دے دیں۔ فلم اسٹاروں کی کمزوریاں اب کرکٹروں میں بھی آنے لگی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل جو "بجلی" کرکٹروں پر گری تھی وہ "اظہر من الشمس" ہے۔

ہیروئن بھی اپنے کپڑوں کی طرح شوہروں کو بدلتی ہیں۔ نئے نئے اسکینڈل بنا کر کسی مشہور رسالے کی COVER STORY بننا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔

بہرکیف ظاہری چمک دمک سے متاثر افراد کے لیے یہ جگمگاتی اور روشنیوں کی سانس پر زندہ رہنے والی یہ دنیا کسی دیوانے کے خواب سے کم نہیں۔!

●●

غزلیں

رؤف رحیم

بل کلنٹن کی طرح شہرہ ہو میرے پیار کا
میں بھی اک حصہ بنوں ٹی وی کا اور اخبار کا

میں نہ دفتر کا رہا یارو نہ اب گھر دار کا
راستہ جب سے ملا ہے مجھ کو کوٹھے یار کا

ہے خوشامد کا ہنر جو ہر مرے کردار کا
اب کوئی مشکل نہیں چھپنا مرے اشعار کا

آپ کی دیوار پہ چسپاں ہیں تصویریں کئی
کیا پڑھوں گا میں نوشتہ آپ کی دیوار کا

وہ عدو کے ساتھ میرے گھر اچانک آگئے
جب قصیدہ لکھ رہا تھا میں وفا کا پیار کا

کس قدر ڈرپوک ہوں میں آپ کو معلوم ہے
کیسے باندھوں گا بھلا میں قافیہ تلوار کا

سارے شہری ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوں گے جناب
ماننا سب کو پڑے گا، حکم ہے سرکار کا

کیا سناؤں آج کی محفل میں میں اپنی غزل
ہو چکا ہے دوستو سرقہ مرے اشعار کا

اُتنا ہی مشکل ہے مجھ سے شاعری کا چھوڑنا
چھوڑنا مشکل ہے مے کو جس طرح مے خوار کا

دیکھ کر لاحول مجھ کو پڑھ رہا ہے جب عدو
وِرد کرتا پھر رہا ہوں میں بھی استغفار کا

سیب کی قیمت میں ہم کو پیاز ملتی ہے رحیم
تاؤ تم کھانا نہیں یہ بھاؤ ہے بازار کا

ظفر کمالی

سیوان (بہار)

○

ہم یہ تماشا روز دکھاتے پھرتے ہیں
بھینس کے آگے بین بجاتے پھرتے ہیں

جن میں نہیں ہے رنگ کوئی بے رنگ وہی
ہر محفل میں رنگ جماتے پھرتے ہیں

حال ہے ان کا بالکل امریکا جیسا
چور ہیں لیکن شور مچاتے پھرتے ہیں

ق

پھٹا کسی کا بھی ہو لیکن اس میں سدا
صاحب اپنی ٹانگ پھنساتے پھرتے ہیں

اب کے استادوں کی حالت کیا کہیے
شاگردوں کو تیل لگاتے پھرتے ہیں

صاحب زادے جواں ہوئے ہیں لوگوں سے
والد صاحب آنکھ بچاتے پھرتے ہیں

ناک بہت اونچی ہے پھر کیوں اپنی دم
پابندی سے آپ ہلاتے پھرتے ہیں

اردو میں پی ایچ ڈی کر کے کتنے جناب
عرب میں جا کے اونٹ چراتے پھرتے ہیں

کہیں عقیقہ ہو، شادی ہو، ختنہ ہو
ہم شاعر ہیں شعر سناتے پھرتے ہیں

ساختیات کے ماہر کہلاتے ہیں آپ
بن پٹری کے ریل چلاتے پھرتے ہیں

ق

رولاں، لاکاں، فوکو، ژاک دریدا کی
اک مبہم گردان سناتے پھرتے ہیں

جتنے ہیں نقاد ظفر وہ ہانڈی میں
غیروں کی ہی دال گلاتے پھرتے ہیں

ڈاکٹر سید حسین احمد زاہدی
(کلکتہ)

غزل کا تجربہ

غزل اور ہم دو متضاد چیز ہیں۔ ہمارا غزل سے تعلق محض دیکھنے کی حد تک ہے یعنی جہاں کوئی غزل سرِ راہ نظر آئی تو اس وقت تک . . . . اس کے غزالی چہرے کو تکتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی یا قریب و دور کے "زاہدِ خشک" نے مجھے "خوں خوار" نظروں سے گھورنا شروع کر دیا۔ جہاں تک غزل کہنے کا تعلق ہے تو میرے آبا و اجداد میں کوئی آج تک شاعر نہیں گزرا بلکہ ان میں سے اکثر فوجی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی طرح مجھے بھی ہمیشہ یہ فخر رہا ہے کہ:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

بہرحال غالب نے تو اپنا پیشہ بدل کر شعر و شاعری کو ذریعہ عزت بنا لیا تھا لیکن میں بھول کر بھی شاعری کی طرف نہیں گیا۔ غزل سے میرا رشتہ محض اتنا ہی رہا کہ کسی نے زبردستی اپنی غزل سنا دی یا میں ہی غلطی سے کسی غزل کو گنگنانے لگا۔ لہذا مجھے اس وقت سخت حیرت ہوئی جب فدا حسین فدا صاحب نے ایک مشاعرے کا دعوت نامہ پکڑا دیا اور ساتھ ہی تاکید بھی کی کہ میں اس دن ضرور آؤں اور ساتھ میں اپنی کوئی غزل بھی لیتا آؤں۔ میں نے کہا بھی کہ بھئی میں غزل وزل تو کہتا نہیں اب ایسی ہی ضد ہے تو غالب یا کسی اور شاعر کی غزل سنا دوں گا۔ یہ سن کر ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ بھئی آج کل کے شاعروں کے ساتھ یہی خرابی ہے۔ بجائے اپنی دوسرے شاعر کی غزل پڑھ دیتے ہیں۔ گزشتہ اتوار کا ہی واقعہ ہے کہ ایک مشاعرے میں پانچ شاعروں نے ایک ہی غزل یکے بعد دیگرے پڑھ دی۔ کافی بدمزگی رہی۔ سبھی کا دعویٰ تھا کہ یہ ان کی کہی ہوئی غزل ہے۔ بعد میں ایک

اور شاعر صاحب نے جو اسی غزل کو پڑھنے والے تھے انکشاف کیا کہ یہ غالب کی غزل ہے۔ بھئی
یہی حالت رہی تو پھر مشاعرہ قصۂ پارینہ بن کر رہ جائے گا۔ لوگ مشاعرے کا نام سن کر کانوں کو
ہاتھ لگانے لگیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دلی کا ایک آخری یادگار مشاعرہ کی طرح کلکتہ کا بھی زندہ آخری یادگار مشاعرہ کر کے مشاعرہ کا
خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلے اساتذہ غزلیں کہہ کہہ کر اپنے شاگردوں کو دیا کرتے تھے جنہیں وہ مشاعروں
میں پڑھ دیا کرتے تھے۔ اب اساتذہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کے دیوان ہی ہر ایک کے ہاتھ
لگ گئے ہیں۔ پہلے کے شاعروں کو یونہی شہرت نہیں مل جاتی تھی بلکہ پوری زندگی "دشت کی سیاحی"
میں گزر جاتی تب جا کر ان کی شناخت بنتی تھی۔ غالب نے پوری زندگی شعر و شاعری میں گزار
دی لیکن کسی نے انھیں اہمیت نہ دی۔ آج تو قطعات لکھنے والے بھی عظیم شعرا کی صف میں شامل
ہونے لگے ہیں۔ کل تک جو مہمل بکتے تھے آج ان کا کلام درسی کتابوں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ قوم میں بگاڑ
تو اسی طرح آتی ہے۔

غاضب صاحب کی باتیں سن کر مجھے بے حد شرمندگی محسوس ہوئی لہذا وعدہ کر لیا کہ اپنی ہی کوئی غزل
لے کر آؤں گا۔ اُدھر تو وہ رخصت ہوئے ادھر یہ فکر لاحق ہوئی کہ آخر غزل کہاں سے حاصل کی جائے کہ
پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا جائے۔ اچانک میرا خیال اپنے پڑوسی اور ڈوبتے ابھرتے شاعر "دشمنِ دیں" کی طرف گیا
جو شہر کے ایک بے تول شاعر تھے اور تخلص کو "غالب دوراں" مشہور کر رکھا تھا۔ ان کا خیال آتے ہی میرا
فکر بڑی حد تک دور ہو گیا۔ اب میں یہ سوچنے لگا کہ تصویر کس زاویہ سے کھنچوائی جائے کہ مشاعرہ کا
صدر میں ہی نظر آؤں۔

دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اپنے پڑوسی کے دولت کدے پر جا حاضر ہوا۔
معلوم ہوا کہ باورچی خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد موصوف اپنے ہاتھ میں ایک
کالا کاغذ تھامے برآمد ہوئے۔ انتظار کی زحمت پر معذرت چاہی اور بتایا کہ دراصل وہ "چولھے"
پر ایک نظم لکھ رہے تھے۔ پھر میرے آنے کا سبب دریافت کیا اور جب میں نے مشاعرے کی دعوت
کے متعلق بتایا تو لاپرواہی سے بولے اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ ذرا داڑھی وغیرہ بنا لینا اچھے
کپڑے پہن لینا اور وقتِ مقررہ کے ایک گھنٹے بعد جانا۔ . . . . ہاتھوں ہاتھ لیے
جاؤ گے۔

میں نے جل کر کہا "آپ کو داڑھی اور کپڑے کی پڑی ہے۔ یہاں فکر ہے کہ مشاعرے میں جاکر
کس طرح غزل سناؤں جبکہ میں نے آج تک شعر و شاعری کی ہی نہیں"
کہنے لگے اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ تمھارے گھر میں کسی شاعر کا دیوان یا کلام نہیں ہے۔ میں
نے ندامت سے سر جھکا کر کہا "نہیں" دیوان وغیرہ رکھنے کی حماقت میں نے کبھی کی ہی نہیں۔ بہت
ناراض ہو کر فرمایا "اسے حماقت کہتے ہو؟ اب خود دیکھو کس مشکل میں پھنس گئے ہو۔ اگر کوئی دیوان ہوتا تو
ذرا سی محنت سے ایک بہترین غزل تیار کی جا سکتی تھی۔ خیر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

کوئی غزل وغیرہ یاد ہے تو سنا دو۔ ذرا سی رد و بدل کے بعد تمہارے نام کیے دیتا ہوں۔
میں نے "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" جو مجھے اچھی طرح یاد تھی سنانی شروع کر دی۔ کہنے لگے
نہیں نہیں یہ غزل مت پڑھنا، سبھی کو معلوم ہے کہ غالب کی ہے۔ مفت میں بدنام ہو جاؤ گے۔ بہرحال
بدنامی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اس سے شہرت میں اضافہ ہوتا ہے اور ادبی رسائل و
اخبارات ایسے لوگوں پر خصوصی نمبر نکالتے ہیں یا گوشہ چھاپتے ہیں۔ غالب کو ہی دیکھ لو، کون سی بدنامی
ہے جو اس نے اپنے ساتھ نہیں لگائی تھی لیکن آج سینکڑوں ادبی جریدوں کے "غالب نمبر" تم کو
ملیں گے۔ یہاں تک کہ ادبی ادارے غالب صدی اور دو سو سالہ جشن بھی منانے لگے ہیں جن میں لوگ
غالب سے زیادہ اپنی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔
میں نے کہا یہ شعر کیسا رہے گا:

مرغیوں پر بھی کر سکتا ہوں اظہار خیال

حقارت سے فرمایا "کیا اظہار خیال کر سکتے ہو، اگر اظہار خیال کرنا آتا تو میرے پاس کیوں آتے۔
ان کے اس تبصرے پر گھبرا کر میں نے یہ شعر پڑھا:

دھمکا کے بوسے لوں کا رخِ رشکِ ماہ کا
کہ چندہ وصول ہو رہا ہے صاحب دباؤ سے

کہنے لگے نہیں یہ شعر میں نے اپنے لیے رکھا ہے۔ مناسب تبدیلی کے بعد ایک نئی غزل تیار
کروں گا۔ پھر دیکھنا کس طرح مشاعرہ لوٹتا ہوں۔
میں نے اکتا کر کہا تو پھر آپ ہی کچھ رہنمائی فرمائیں۔ دماغ پر زور ڈال ڈال کر تو اب پورا دماغ
پھوڑے کی طرح دکھنے لگا ہے۔
"اس برتے پر شاعر بننے چلے ہو، اماں، شاعری اتنی آسان چیز نہیں ہے پتہ پانی ہو جاتا
ہے قلیچی والی شاعری نہیں ہے کہ کسی دیوان سے صفحہ کاٹا اور مشاعرہ میں جا کر پڑھ دیا۔ واہ واہ ہوئی
تو خوش خوش گھر واپس آئے، نہیں تو وہیں غزل پھاڑ کر پھینک دی۔"
میں نے دریافت کیا کہ اکثر شاعروں کو دیکھا ہے کہ تیس تیس سال سے ایک ہی غزل سنا رہے ہیں۔
اس کی وجہ کیا ہے؟
فرمایا "کبھی غلطی سے کسی نے کسی غزل کے کسی شعر پر واہ واہ کر دیا تو غزل کو کامیاب سمجھ کر ہر
مشاعرہ کے لیے اس کو مخصوص کر لیا۔ پچیس تیس سال تک وہی غزل پیش کرتے رہتے ہیں۔ سامعین
بور ہو کر ہوٹنگ کرتے ہیں تو اسے تعریف سمجھ کر جھک جھک کر سلام کرتے اور شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ایسے
شاعروں کے لیے بس ایک ہی دعا کی جا سکتی ہے کہ خدا انھیں عقل سلیم دے۔"
آخر آج کل کے سامعین اتنی ہوٹنگ کیوں کرتے ہیں؟" میں نے کریدا۔
میاں کلام فرسودہ، آواز گریہ وزاری والی اور انداز فقیرانہ ہو تو ہوٹنگ تو ہو گی ہی۔ آج کل تو

جس شاعر کو دیکھو وہ شاعر کم اور شاعر کا مذاق زیادہ لگتا ہے۔ ایسے شاعر پر تو ہوٹنگ لازمی ہے۔ خود کلکتہ
ہی میں دیکھیے دو شاعروں کو لوگوں نے پکڑ رکھا ہے جہاں مشاعرہ ہوتا ہے انھیں ہی صدر بنا دیتے
ہیں۔ یہ دونوں شاعر بھی بیس سال پرانی غزل جو ان کے استاد مرحوم کی تھی اور اتفاق سے ان کے
ہاتھ لگ گئی وہی ہر مشاعرے میں سنا دیتے ہیں۔ یوں مشاعرے کے نام پر انہیں بیزاری پھیلا رہے ہیں۔
ایسے لوگوں کو شاعری چھوڑ دینے کا مشورہ کیوں نہیں دیا جاتا۔ میں نے دریافت کیا۔ کہنے لگے
"میں نے خود ان میں سے ایک شاعر کو اس بات کا مشورہ دیا تھا جس پر اس نے کہا کہ ہاں بھئی مجھے خود
معلوم ہے کہ واہیات کہتا ہوں لیکن بدقسمتی سے اتنا مشہور ہو گیا ہوں کہ شاعری چھوڑ نہیں سکتا۔ دراصل
ایسے شاعروں کو صدارت کی چاٹ لگ جاتی ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ "پرویز شاہدی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"۔

جواب میں فرمایا "بے مثال شاعر تھا۔ اس کے غیر مطبوعہ کلام نے بہت سوں کو صاحب دیوان
بنا دیا ہے۔ اب ایسے شاعر کا اس سنگلاخ زمین پر جنم لینا مشکل ہے"۔

"اور علامہ وحشت کے متعلق آپ کی ناقص رائے کیا ہے"۔

"بہترین شاعر تھا لیکن "غالب دوراں" کہلانے کے چکر میں مارا گیا۔ دراصل ایک دور ایسا بھی
تھا جب لوگ یا تو "غالب دوراں" کہلانا یا "غالب شکن" قرار پانا فخر کی بات سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کی
اوریجنیلیٹی متاثر ہوتی تھی۔ وحشت نے بھی یہی غلطی کی۔

"لیکن وحشت کو تو مغربی بنگال میں بحیثیت شاعر بڑی مقبولیت حاصل ہے"۔

ہاں بھئی، یہ بات تو ہے کہ مغربی بنگال والوں نے علامہ وحشت، پرویز شاہدی اور فیض احمد
فیض کو اتنا جکڑ رکھا ہے کہ ہر ادبی رسالہ نے ان تینوں پر خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ کئی رسائل نے تو
کئی کئی بار ان پر نمبر نکالے ہیں اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان سے آگے ہمارے اندر سوچنے سمجھنے
کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

میں نے کہا یہ لایعنی بحث ختم کیجیے اور میرے مسئلے پر خاص توجہ دیجیے۔ دشمن دین صاحب نے بڑی
کاوش کے بعد مختلف شاعروں کی غزلوں سے دو دو شعر لے کر ایک غزل بنا دی اور کہا کہ بس جاؤ اور
آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھنے کی مشق کرتے رہو۔

میں نے دبی زبان میں کہا "لیکن اس غزل کا ہر شعر تو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے"۔ "یہی
تو غزل کا کمال ہے" وہ ہنستے ہوئے بولے"۔ اور عقلمند شاعر اسی کا فائدہ اٹھاتا ہے۔

بہرحال اتنی محنت سے تیار کی ہوئی غزل لے کر جب میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ غاصب صاحب
مشاعرے کا دعوت نامہ واپس لے گئے تھے) اور ساتھ ہی معذرت چاہ گئے ہیں کہ غلطی سے یہ دعوت نامہ
مجھے دے دیا تھا۔ میں نے یہ سن کر غزل ایک طرف پھینکی اور ٹی وی کا ناب گھمانے لگا۔ ●●

جہاں قدر چغتائی
(بھوپال)

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے

اے میرے مہربان، اے میرے محسن، اے میرے ملک کو ہر کام کے لیے قرض دینے والے آقا سمراٹ سری کلنٹن جی مہاراج۔ آپ کی جے ہو۔ جب سے آپ نے آتنک وادیوں پر اسکڈ میزائل سے حملہ کیا ہے میں بہت خوش ہوا ہوں۔ سچ مچ دنیا میں تشدد بہت پھیل گیا تھا۔ آپ نے تشدد کی جڑ کاٹ دی ہے۔ سب سچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ آپ کے مخالف ہیں وہ آپ کو پہچانتے نہیں ہیں۔ حضور یہ بات صرف مجھے معلوم ہے کہ آپ دنیا میں امن کے کتنے بڑے پجاری ہیں۔ آپ کے ملک نے ویٹ نام پر برسوں بم گرائے اور آپ نے اتنے ہوائی جہاز وہاں گنوائے کہ آج تک اس ملک کو باہر سے کوئی بھی دھات منگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ آپ نے جہاں جیسا چاہا وہاں ویسا ہی کیا۔ لاؤس جیسے بڑے ملک کو روٹی پر روٹی رکھ کر کھانے نہیں دیا۔ آج وہ کشکول لیے سفید گھر کے دروازے پر کھڑا ہے۔ دور کیوں جائیں گلف میں چھوٹے سے کویت کو بچانے کے لیے صدام کو چپ کرانا صرف آپ ہی کے بس کی بات تھی اور چھوٹے سے اسرائیل کو زندہ اور بے قابو رکھنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔ سر، کیا میں جانتا نہیں ہوں کہ حضور نے بوسنیا میں امن کے قیام کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ آپ نے نیٹو تک کو حکم دیا کہ بمباری کر کے سربیا کو مجبور کیا جائے مگر حضور میں جانتا ہوں کہ آپ مگ یا اور کسی جہاز میں پائلٹ بن کر سربیا پر بم گرانے سے تو رہے۔ حضور ہوائی جہاز چلانا بھی لگے ہاتھوں آپ سیکھ ہی لیں — ہو سکتا ہے کل پائلٹ ہڑتال کر بیٹھیں پھر آپ کے غصہ کا کیا ہوگا۔ کم سے کم آپ دس بیس بم لے کر اڑ تو سکیں گے۔ مجرم پر اپنا غصہ اتار کر تو تسکین میسر ہوتی ہے۔ یہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ آپ جیسے نیک نام آدمی پر ایک پرانی بات وہ چھوکری کہیں سے نکال لائی اور تو اور اس کم بخت نے ثبوت کے طور پر وہ داغ دار کپڑے بھی سینت کر

رکھ چھوڑے تھے۔ چھوٹی لکھیں کی۔ آپ کیوں ڈریں۔ آپ نے تو اپنے بال کٹوانے پر باربر کو چنتیس ہزار ڈالر دیے تھے بھلا چھوکری کے ذرا لفٹ کا معاملہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ملک میں سیکس کوکاکولا کی بوتل ہے۔ جو چاہے پی لے۔ اس ماحول میں آپ جیسے معصوم آدمی کو عدالت کی سیڑھیاں چڑھوا دیں۔

حضور میں ایک راز کی بات آپ کو بتا دوں۔ ہمارے ملک میں آپ کا کوکاکولا بہت استعمال ہوتا ہے۔ یہاں عورتیں دیویاں کہلاتی ہیں اور بہت حفاظت سے رہتی ہیں۔ پھر بھی چھوٹی چھوٹی قرمیں کے پاس کبھی کبھی رہا کرتے ہیں جو آپ نے اس چھوکری کے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔ آپ ذرا میڈیا ... سے ڈرنا چھوڑ دیں تو آپ کی ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔

سر میں سوڈان اور افغانستان پر حملے کی تعریف کر رہا تھا مگر آپ کے کیریکٹر اسا سی نیشن کا خیال آگیا تو چند باتیں کہہ دیں۔ معاف کرنا۔ میں یہ سب تعریف کرتے وقت بھی ڈر رہا ہوں۔ جب بابر و اکبر کا زمانہ تھا تو بات کرنے سے پہلے فریادی بادشاہ سے کہتا تھا جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ بس اس وقت وہی حال میرا ابھی ہے۔

دنیا کے پہلے ہمارا شٹر پتی جی! خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ یہ بندہ ناچیز آپ کے بھیجے ہوئے لال لال گیہوں کھا چکا ہے۔ جو کا رنگ۔ اس بڑھاپے میں بھی میرے گالوں جھلکتا ہے تو میں آپ کی شان میں گستاخی تو نہیں کر سکتا۔ دل کو آپ کی بات بھلی لگی۔ بات بھائی ہے تو قلم اٹھایا ہے۔ سر یہ بات تو آپ کی سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج اتنی بڑی دنیا آپ کے زیر نگیں ہے۔ صرف یہ دنیا ہی نہیں۔ یہ چاند آپ کا۔ یہ سورج آپ کا۔ آپ چندر ونشی ہیں۔ آپ سوریہ ونشی ہیں اور آپ ہی منگل منگل۔ آپ نے خرطوم کی گیس فیکٹری کو برباد کیا، بہت اچھا کیا۔ اگر آپ خفا نہ ہوں تو پوچھوں کہ بھوپال میں جو کارخانہ بنایا گیا تھا وہ کس کا تھا جس نے صرف پچیس ہزار روپے کے لیے ہزاروں کی جانیں لے لیں۔ مانتا ہوں وہ کاربائیڈ فیکٹری بھی ایک گھپلا تھی۔ اس ملک میں آزادی کے بعد سے جس پارٹی کی جو سرکار آئی ہے اسی نے عوام کی کھلی اڑائی ہے۔ آزادی کے بعد ہم کو تو ہر پارٹی کی ہر سرکار مقبول فدا حسین کی بنائی تصویر ہی نظر آتی۔ ہم برا تو کسی کو کہہ نہیں سکتے۔

مہاراشٹر پتی جی آپ کو معلوم تھا کہ خرطوم میں زہریلی گیس کا کارخانہ تھا مگر M.I.C گیس کے کتنے سلنڈر یہاں بھوپال سے کہاں گئے کسی کو خبر نہیں۔ اس نئے زمانے کے بادشاہ جمشید آپ ہیں پاس وہ پیالہ موجود ہے جس میں آپ دنیا میں کون کہاں کیا کر رہا ہے اس کا حال دیکھ لیتے ہیں۔ اس کھیت میں گھاسی رام گھاس کاٹ رہا ہے آپ کو نظر آ جاتا ہے مگر ساری دنیا میں کسی کو پتہ نہیں کہ آپ کے ایٹمی پٹارے میں کیا کیا چھپا ہے۔ اے میرے مہاراشٹر پتی جی میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں مگر آپ سے بہت بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ مجھ کو بھی اپنا دشمن یا ٹیررسٹ نہ سمجھ لیں۔ میرے پاس آپ کے وفادار ہونے کا ایک سرٹیفکیٹ ہے۔ آپ کی طرف سے ایک ویکسین آئی تھی۔

میرا خاندان چیچک سے مرگیا تھا مگر میں نہیں مرا۔ ویکسین کے استعمال کے بعد میرے بازو پر دو مہر
لگ گئیں اور اب وہ بہت بڑی بڑی ہو گئی ہیں۔ آپ کہیں تو میں ان کی فوٹو کاپی آپ کو پہنچا سکتا ہوں
مگر خدارا میری وفاداری پر شک نہ کرنا۔ آپ نے میرا اور میرے بیٹے امریخان کا ہمیشہ خیال رکھا
ہے تو مجھے بھی حق نمک ادا کرنے کے لیے آپ کے قیمتی مزائل ضائع ہونے کا خیال تو رکھنا ہی پڑے گا
آپ نے امریخان کو جو اپنی لیب سے واپس کیا ہے تو تب ہی سے اس کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔ وہ اکثر
خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ ایمپائر بلڈنگ سے نیچے گر رہا ہے اور بستر سے نیچے گر پڑتا ہے۔ اس کو واپس
بلالو نا سرکار۔ اس کے بچے بھی امریکہ کی ترقی کی دعا کرتے رہیں گے۔

سر! ایک بار پھر میں ہیروشیما سے لے کر خرطوم کی فیکٹری تک کے ہر حملے کو بروقت اٹھایا گیا
قدم تسلیم کرتا ہوں مگر اسامہ پر کیا گیا حملہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ میرے حضور آپ نے اسامہ پر
حملہ کیا وہ تو بچ گیا مگر آپ کی عظیم الشان شخصیت میرے چھوٹے سے ذہن میں بھی بکھر گئی اور اس
بات کا مجھ کو صدمہ بھی ہے کہ ایک طرف تو حضور آپ جیسی بڑی شخصیت اور دوسری طرف ملک عرب
سے فرار شدہ ایک معمولی شہری اسامہ۔ کیا آپ نے بہت بہت غصے میں اس حملے کی بات سوچی
تھی۔ سر سچ کہوں تو مجھے اسامہ کا بھوت آپ سے بہت بڑا لگنے لگا ہے۔ یہ بات سن کر کہ اسامہ
کا بھوت آپ سے بڑا ہے آپ کو غصہ ضرور آئے گا۔ میں آپ کا مزاج جانتا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ میں ڈر رہا ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ آپ ہرگز نہ کسی سے ڈرے ہیں اور نہ ڈریں گے۔
آپ نے ٹھیک ہی کیا جو منع کر دیا کہ کوئی دوسرا ملک آپ کی طرح دوسرے ملک کے دہشت گردوں کے
اڈوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اگر آپ بروقت نہیں ٹوکتے تو دنیا میں ایسے اڈوں پر
چاندماری شروع ہو گئی ہوتی۔ ویسے ہم گوتم اور نانک کے دیش کے رہنے والے بہادری کی تعریف
کچھ اس طرح کرتے ہیں:

ویر نہیں جو تیر چلائے، ویر ہے وہ جو تیر سہے
آنسو وہ جو من سے نکلے اور پلک پر آن رہے

لیکن پھر بھی جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ جب تک آپ سلامت ہیں بس امن ہی امن ہے۔
خدا آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ آمین

مہنگائی

محبوب مانجھومی
بلاسپور

آسماں چھونے لگی آج میاں مہنگائی　　کل دکھائے گی قیامت کا سماں مہنگائی
خالی جھولا لیے ہاتھوں میں ہیں پھرتے غربا　　تیز آندھی کی طرح ہے جو رواں مہنگائی
بوجھ سے اس کے ہوئے جاتے ہیں بوڑھے یہ عوام　　ہوتی جاتی ہے مگر — اور جواں مہنگائی
جس کو دیکھو وہی مہنگائی کا شاکی نکلا　　خون رُلانے ہے لگی سب کو یہاں مہنگائی
پیاز بازار میں ملتی ہے بڑی مشکل سے　　اس کے کھانے کو ترستی ہے زباں مہنگائی
پیاز اب صرف ہے اُمرا کے گھروں کی زینت　　اس کو پہنچا دیا تو نے ہے کہاں مہنگائی
کیا حکومت یہ بھلا پائے گی قابو تجھ پر!　　کب مٹائے گی ترا نام و نشاں مہنگائی

آہ بھر بھر کے سبھی کہنے لگے ہیں محبوب!
چین سے جینے نہیں دے گی میاں مہنگائی

غزلیں

(چھیڑ غالب سے)

ٹی۔ین۔راز
(ہریانہ)

ہم وفا کا اُن سے اب اپنی صلہ پائیں گے کیا　　کر کے شادی عمر بھر کو جوتیاں کھائیں گے کیا
کچھ تو کہیئے شیخ صاحب بن کے صدرِ محترم　　جاہلوں کی بزم میں کل وعظ فرمائیں گے کیا
ایک سامع پوچھ بیٹھا دو بجے کل رات کو　　اب میاں ٹوڈی کے پیچھے بھیروں گائیں گے کیا
فکر ہے سرکار کو کہ ختم ہو آلودگی　　ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا

ایک نیتا سے مذاقاً پوچھ بیٹھا راز یہ
ناشتے میں آپ چارا شوق فرمائیں گے کیا

شاہد عدیلی
(حیدرآباد)

○

حسبِ معمول پھٹیچر ہے مقدر اپنا　　نسبتی بھائی نہیں کوئی جو باہر اپنا
آپ اکڑیں گے اگر چیل سمجھ کر خود کو　　مرتعش آپ کو کر ڈالے گا کنکر اپنا
جھاڑو دیتا ہوں میں گھر میں تو برائی کیا ہے　　جھاڑو دے سکتا ہے جب چیف منسٹر اپنا
ٹھاٹ میں گزریں گے دن اپنے بہت جلد میاں　　لکھ پتی بیوہ سے چلنے لگا چکر اپنا
اب تو انسان کو انسان نچاتا ہے یہاں　　اب کہاں جا کے نچاؤں گا میں بندر اپنا
پیٹ پر لات میں کس طرح سے ماروں اس کے　　رزق پاتا ہے مرے جسم سے مچھر اپنا

شہر میں دال گلاؤں گا میں کیسے شاہد
اب یہاں کوئی مؤنث نہ مذکر اپنا

صفیہ شاہین
(حیدرآباد)

ہماری ملازمہ

کسی دیرینہ خواب کی تعبیر کی طرح جس دن ہماری ملازمہ ہمیں سامنے کھڑی نظر آئی ہم نے کسی کامیابی حاصل کرنے والے کھلاڑی کی طرح وہیں کا وہیں سجدۂ شکر ادا کیا پھر نگاہ انتخاب اور دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ ہم اس مظلوم مخلوق سے پورا پورا انصاف کریں گے۔ لہذا اپنی سلطنت یعنی اپنے گھر میں کام کرنے کے چند رہنمایانہ اصول اسے سمجھائے۔

ہمارا پہلا رہنمایانہ اصول یہ تھا کہ وہ وقت اور ڈسپلن کی سختی سے پابندی کرے دوسرا یہ کہ ہمیشہ اچھی باتیں سیکھنے کی کوشش کرے اور تیسرا یہ کہ لڑائی جھگڑے سے دور رہ کر مصلحت و مصالحت سے کام لے۔ ہماری ملازمہ نے بھی بسر و چشم ان ہدایات پر عمل کرنے سے اتفاق بھی کر لیا وقت اور ڈسپلن کی پابندی کرنے اسنے ہم سے تعاون بھی مانگا۔ اس نے اپنے اوقات کار اس طرح بتلائے کہ بی بی جی صبح ۹ سے ۷ بجے تک جھاڑو ہو گی پھر برتن دھلیں گے۔ بھر بازار سے کچھ لانا ہو تو فہرست سامان اور پیسے تیار ملنے چاہئیں۔ ہماری خواہش کے جواب میں یہ شرائط تو کچھ ایسی سخت نہ تھیں۔ سو ہم نے ہاں کر دی۔ مگر بہت جلد ہماری اس خواہش نے وہ کرشمہ کر دکھایا کہ ہم پریشان ہو اٹھے۔

ملازمہ ہم سے کہنے لگی کہ بی بی جی۔ صبح صبح ٹی۔ وی پر ورزشیں دکھائی جاتی ہیں۔ اگر آپ ٹی۔ وی کو آن کر دیں تو جھاڑو لگانے میں آسانی رہے گی۔ یہ کس طرح ممکن ہوگا۔ ہم نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور ٹی وی حسب خواہش آن کر دیا اور دم بخود جھاڑو لگاتی ملازمہ کو میوزک کے جھٹکوں کے ساتھ ساتھ بیئرتے بدلتے دیکھتے رہے۔ خیر ہمیں اپنے گھر کی صفائی سے مطلب تھا وہ جیسے بھی کرے یعنی آم کھانے سے مطلب تھا اور پیڑ گننے سے نہیں۔ لہذا اب دوسرے کام یعنی برتن دھونے کی باری تھی۔ وہ کہنے لگی بی بی جی ہم برتن صاف کرتے کرتے ٹی وی نہیں دیکھ سکتے۔ اگر آپ دیکھتی ہیں

ہمارا دل بھی چاہتا ہے کہ دیکھیں لہٰذا آپ ٹی وی بند کردیں اور ہمارے لیے گانے لگا دیں ہم نے
ن کے لیے ہم نے ریڈیو کا انتظام کردیا۔ ریڈیو سے گانے سنتے سنتے وہ جیسے بیزار ہو گئی۔ کہنے لگی نہیں بی بی جی
ریڈیو سے صبح صبح جانے کیسے کیسے گانے لگاتے ہیں:

"یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے"

ایسے گانے سن کر تو دل بھاری ہو جاتا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ٹیپ ریکارڈ لگا دیں۔ ہم تو اس کو
خوش رکھنا چاہتے تھے ہم نے پوچھا کون سے کیسٹ لگائیں۔ وہ کہنے لگی بی بی جی کوئی انگریزی
میوزک لگا دیجیے۔ Pop ہو تو بہتر۔ Rock ہو تو اچھا RAP ہو تو کیا کہنے۔ ہم نے نہایت سعادت
مندانہ انداز میں پوچھا دلیر مہندی بھی چل جائے گا۔ وہ کہنے لگی ہاں بی بی جی چلے گا۔ وہ جب چکنا چکنا چکنا
کہتا ہے تو لگتا ہے ہمارے برتنوں میں چکنائی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ہم نے یہ دلیل بھی مانی
اور صبح صبح ٹیپ ریکارڈر پر تیز بیٹ Beat والی میوزک لگا دی اور اس کیسٹ کی
دھن پر برتن دھلنے لگے۔ اس جھنکار کے دوران نہ جانے ہمارے کتنے پیارے پیارے گلاس
خوب صورت پلیٹیں اور چائے کی پیالیاں آخری سسکیاں لے کر خاموش ہو گئیں۔ ہمارا بار بار
ٹوکنا بے کار ہو گیا۔ جب ایک ایک برتن کی کرچیاں ہمارے جذبۂ احساس پر چبھنے لگیں تو ہم نے
باقی ماندہ سامان سمیٹا اور لے آئے چمکتے اسٹین لیس اسٹیل کے . . . . برتنوں کا بھنڈار۔

ہم نے اپنی ملازمہ سے اچھی باتیں سیکھنے کی بھی خواہش کی تھی اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی
ہوتی تھی کہ خالی وقت میں وہ نہ صرف اردو اور عربی پڑھنے کی کوشش کرتی بلکہ تلگو، ہندی اور انگریزی
بھی پڑھ رہی تھی۔ ہمارے پوچھنے پر کہ وہ کیوں ہر زبان پڑھنا سیکھنا چاہتی ہے۔ کہنے لگی کہ کہاں جاتے
اب تلگو لکھنا پڑھنا پڑے یہ تو ریاست کی زبان ہے اور خبریں تو زیادہ ہندی میں ہی آتی ہیں۔
اور انگریزی میں گٹ پٹ کرنا کتنا ماڈرن لگتا ہے۔ ہاں ہاں!! ہم اپنی ملازمہ کی معلومات پر عش عش
کر اٹھے اور اس طرح ہم سے کچھ اپنی کچھ جگ کی باتیں ہونے لگیں۔ ایک دن وہ ہم سے ہمارا دھوپ کا
چشمہ، پرس اور جوتے کا نمبر مانگنے لگی۔ ہمارے جز بز ہونے پہ کہنے لگی کہ بی بی جی کسی گھر کی
حیثیت کا اندازہ اس کے گھر کے بچوں اور نوکروں کو دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ ہے نا۔ ہاں ہاں!! ہم نے اثبات
میں سر ہلایا تو پھر میں بھی کوئی معمولی ملازم نہیں۔ ہم تو آپ کی ملازمہ ہیں۔ یقیناً یقیناً ہم سمجھ گئے۔ اب
پہلی ہدایت کے بعد دوسری ہدایت سے نپٹنے کا وقت آ گیا . . ۔ اور اچھی باتوں کو سیکھنے کی ہماری
ہدایت ہمارا منہ چڑھانے لگی ہے۔

اب ہمارا دل کسی انجانے خوف سے ڈرنے لگا تھا۔ ہماری دو خواہشوں نے یہ درگت بنا دی۔
نہ جانے اب کیا ہو اور ہوا وہی۔ ایک دن وہ بڑے مخمور اور مسرور لہجے میں کہنے لگی۔ بی بی۔
کیا آپ مجھے چھٹی دیں گی "کیوں؟" ہم سراپا سوال بن گئے۔ وہ بی بی جی۔ آپ ہی کہتی تھیں نا کہ اچھائی

جھگڑے سے دور رہو مصلحت سے کام لو۔ ہاں تو پھر —— ہمارے سوال کے جواب میں وہ کہنے لگی۔ دراصل بی بی جی۔میں اپنے شوہر کی بے روزگاری سے تنگ آکر، لڑکر آگئی تھی " تو کیا وہ مسلسل بیروزگار ہے؟ نہیں بی بی جی۔ وہ تو اردو میڈیم سے میٹرک کامیاب ہے۔ مگر ہم تلنگانہ کے۔ اور اسند میڈیم کے۔ مطلب کریلا اور نیم چڑھا۔ کوئی سرکاری نوکری کہاں ملتی ہے جو خانگی ملتی ہے۔ اس میں تنخواہ برائے نام کب تک اور کیسے چلے —— ؟ نتیجہ گھر میں سر پھٹول ہوتی ہے۔ تو پھر اب کیا ہوا۔ ہم نے پوچھا۔ وہ کہنے لگی۔ وہ بی بی جی میں نے آپ کی بات پر غور کیا اور اب لڑائی جھگڑا ترک کر کے سسرال جانا چاہتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں۔

ہم —— ہم اور بھلا "ظالم زمانہ" بن کر ملازمت کا روڑا اٹکائیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم نے خوشی خوشی اپنی ملازمہ کو جانے کی اجازت تو دے دی مگر اب ایک طرف کام ہی کام، دوسری طرف نہ انگریزی دھنوں کا شور، نہ برتنوں کی آوازیں، نہ نئی نئی فرمائشیں۔ یا اللہ! ہمارا دل گھبرانے لگا۔ ہم نے اپنی ملازمہ کی یادیں جگانے ٹیپ ریکارڈر پر ہاتھ رکھ دیا کہ انگریزی میوزک سے ہمارا گھر جھنجھنا اٹھے مگر شاید کسی نے کیسٹ بدل دیا تھا اور سوئچ دباتے ہی گانا آ رہا تھا۔

اونچی اونچی دنیا کی دیواریں سیاں توڑ کے میں آئی رے
تیرے لیے سارا جگ چھوڑ کے ....
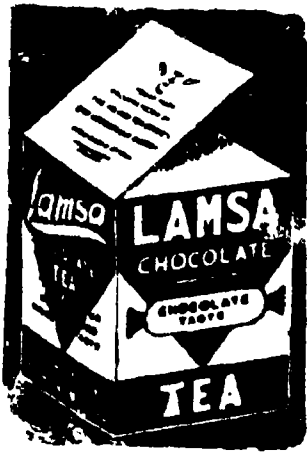
محمد یوسف الدین یوسف
(حیدرآباد)

غزل

کتنا حسین آج یہ حیلہ ہے پیاز کا
ان تک رسائی کا بھی وسیلہ ہے پیاز کا

ساری حکومتیں بھی ٹکی ہیں تو پیاز پر
سب سے اہم بنا ہوا مدّا ہے پیاز کا

سستی تھی پیاز جب تو کوئی پوچھتا نہ تھا
مہنگی ہوئی تو ہر کوئی شیدا ہے پیاز کا

پہلے تو اتنی شہرتیں حاصل نہ تھیں اُسے
اب ہر گلی میں کوچہ میں چرچا ہے پیاز کا

ایک اُن کے پیاز کاٹنے کی بات یہ نہیں
سب کو رُلا ہی دینا وطیرہ ہے پیاز کا

لاکر میں لوگ رکھنے لگے پیاز آج کل
سونے سے مہنگا اب ہوا سودا ہے پیاز کا

اچھی دلہن بھی مل گئی بدلے میں پیاز کے
اُس نے کہا تھا بس مرا ٹھیکہ ہے پیاز کا

یوسف نہ کیوں ہو رشک مجھے آج پیاز پر
شہرہ ہو میرا جس طرح چرچا ہے پیاز کا

کوثر صدیقی
(بھوپال)

پیاز

پیاز بھی اک خدا کی نعمت ہے
پیاز کیا ہے، خدا کی رحمت ہے

پیاز گنجینہ ہے فوائد کا
خوب صورت ہے خوب سیرت ہے

اس کو چھونا بھی اب نہیں آساں
آسماں سے بلند قامت ہے

کوئی مہنگائی سی ہے مہنگائی
ساٹھ روپے کلو کی قیمت ہے

پیاز مظہر ہے قد و قامت کا
پیاز والا اب اہلِ عزت ہے

سیب سے بھی زیادہ ہے مہنگی
پیاز کھانے کی کس میں ہمت ہے

اس کے غمزوں سے اس کے عشووں سے
لیڈروں کا سکون غارت ہے

ق

بھاجپائی یہ کہتے پھرتے ہیں
ملک بھر میں جو اِس کی قلت ہے

دشمنوں کی ہے اس میں کچھ سازش
کانگریس کی کوئی شرارت ہے

کانگریسی یہ طنز کرتے ہیں
یہ حکومت بھی کیا حکومت ہے

پیاز بھی دے سکے نہ جو سرکار
اُس کے اوپر خدا کی لعنت ہے

اِس گرانی کے دَور میں لیکن
پیاز بھی ایک جنسِ عشرت ہے

پیاز کے ایک ایک چھلکے میں
ایک ایک دفترِ سیاست ہے

پیاز کو عشق ہے رئیسوں سے
ہم غریبوں سے کب محبت ہے

پیاز کے "گفٹ پیک" میں کوثر
ووٹ کی اب نئی سیاست ہے

شیر جنگ جنگلی

ہندی سے ترجمہ: ف م سلیم

بدکاری ختم کرو

یہ ۲۴ر نومبر کی بات ہے۔ میری شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ پیار کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑا تھا۔ میری بیوی بڑے ہی پیار سے کہنے لگی۔

"آپ کو پتہ ہے جی! آج ہماری شادی کو پورا ایک سال ہو گیا ہے۔"

"ہاں پتہ ہے لیکن سال تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر آپ مجھے تھوڑے سے روپے دے دیں تو میں آپ کے لیے کوئی تحفہ لے آؤں!" وہ بولی۔

"جانے دیجیے تحفوں میں کیا رکھا ہے۔ آج ہم شام کو پہلے کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ پھر کسی باغ کی سیر کریں گے اور رات میں ۹ بجے کا "نائٹ شو" دیکھیں گے۔ بڑی خوب صورت انگریزی فلم لگی ہے۔"

ہم رات کے تقریباً دو بجے فلم دیکھ کر گھر لوٹ رہے تھے۔ انگریزی فلموں کے ہیرو کی طرح میں اپنی بیوی کو اپنے کندھے سے لگائے چلا جا رہا تھا۔

ہم اپنی ہی دھن میں چلے جا رہے تھے کہ ایک دم پیچھے سے آواز آئی۔ "رک جائیے! کون ہے تو؟" پولس کے دو سپاہیوں میں سے ایک سامنے آتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"جی .... ہم .... میرا مطلب ہے، میں ٹیچر ہوں۔ اسکول میں پڑھاتا ہوں۔"

"اسکول میں بھی یہی پڑھاتے ہوں گے۔"

جواب اس

لڑکی کو پڑھا رہے تھے" دوسرا بولا۔

"جی دراصل ہم پکچر دیکھ کر آ رہے ہیں۔"

"پکچر دیکھ کر آ رہے ہو کہ سڑک پر شوٹنگ کرنے لگے ہو؟"

"جی! مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ مجھے تھوڑا غلط سمجھ رہے ہیں۔"

ایک پولس سپاہی دوسرے سے کہنے لگا۔
" جنتا سنگھ! اسے بتادے کہ مجھے پچیس
سال ہوگئے ہیں پولس کی نوکری کرتے ہوئے ! اسے
سمجھا دے کہ پولس والے آنکھیں دیکھ کر ہی آدمی
پہچان لیتے ہیں اور اب اس سے پوچھ کہ اس کے ساتھ
لڑکی کون ہے ؟"
اگرچہ کہ میں سب کچھ سن چکا تھا لیکن
دوسرا سپاہی ذرا رعب دار آواز میں بولا۔ "کون ہے
یہ لڑکی ؟"
"جی میری بیوی ہے۔"
" اچھا تیری بیوی ہے۔ تبھی تو اس کو سڑک
پر چلاتے جا رہا تھا۔ سچ سچ بتا کس کی لڑکی بھگا لایا
ہے ؟"
بیوی بولی، "جی میں ان کی بیوی ہی ہوں ۔"
سپاہی کڑک کر بولا، "تم چپ رہو بی بی،
نہیں تو سرکاری کاموں میں دخل دینے کے کارن
تمھارا بھی چالان کردوں گا۔
ہاں بھائی! کون ہے یہ لڑکی؟"
جی میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ میری بیوی
ہے۔"
ایک سپاہی نے میری بیوی سے پوچھا۔
" تم کہاں کی رہنے والی ہو ؟"
" جی میرے ماں باپ بلند شہر میں
رہتے ہیں !" میری بیوی نے جواب دیا۔
" بلند شہر جو یوپی میں ہے ؟"
"جی ہاں !" میری بیوی نے جواب دیا۔
سوال کرنے والا سپاہی دوسرے کو مخاطب
ہوتے ہوئے کہنے لگا۔
"مجھے تو یہ بھگائی ہوئی لڑکی لگتی ہے۔ تجھے
تو پتہ ہے ہی، ایسے مسٹنڈے یوپی سے لڑکیاں لاکر
ادھر پنجاب میں بیچتے ہیں ۔"
دوسرا کہنے لگا، "میرا بھی یہی خیال ہے۔
پھر وہ مجھ سے بولا۔ "کیوں بیٹا! سیدھی
طرح بتاتا ہے کہ تھانے لے جا کر مور بنائیں ۔
یہ سن کر میری بیوی رونے لگی۔ ایک سپاہی بولا
بہت رو لڑکی۔ تجھ کو کل ہی ناری نکیتن بھیجا
جائے گا۔
دوسرا بولا، "سچ سچ بتادے لڑکی اس
نے تجھے کیا لالچ دیا تھا؟"
میری بیوی روتے روتے بولی۔
"جی کچھ ...."
وہی سپاہی بات کاٹ کر بولا، اچھا
تمھیں کچھ پیسے ہیروئن بنانے کا جھانسا دے کر
لے آیا ہے۔ ان سالوں کا کام یہی ہے۔" پھر اس
نے ڈنڈا گھماتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا۔
"بتا سالے یہ لڑکی کون ہے ؟"
میں نے اپنے حواس ٹھیک رکھنے کی کوشش
کرتے ہوئے کہا۔ "جی میں بتا تو چکا ہوں اس
سے زیادہ کیا بتاؤں ؟"
"تو مت بتا! ہم پوچھ لیں گے۔ ایک ایک
بھید نکالیں گے تیری ہڈیوں سے۔"
دوسرا سپاہی بولا۔ "تو کہتا ہے یہ لڑکی
تیری بیوی ہے ۔" "جی"
" تیرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔"
"جی۔ میرج سرٹیفکٹ ہے ۔"
"لا دکھا!"
"جی میرے جیب میں تو نہیں ہے۔ آپ
ہمارے ساتھ چلیں۔ گھر جا کر دکھائیں گے۔"

دوسرا سپاہی بولا: "اب تیرا سرٹیفکیٹ دیکھنے کے لیے تیرے گھر چلیں۔ چوروں کی نگرانی تیرا باپ کرے گا۔"

"اور کوئی ثبوت ہے؟"

"جی آپ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب سے پوچھ سکتے ہیں وہ میری شادی میں شریک ہوئے تھے؟"

"کہاں ہے تیرا ہیڈ ماسٹر؟"

"جی، وہ چھاؤنی میں رہتے ہیں۔"

"اب ہم اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر چھاؤنی کو چل پڑیں۔"

"جی۔ میں نے یہ کب کہا؟"

"بنتا سنگھ، کس لیے وقت برباد کرتا ہے۔ اسے تھانے لے چل۔ بدکاری قانون کے اندر اس کا چالان کردے۔ سچا ہوا تو خود ہی چھوٹ جائے گا۔"

"جی میں آپ کو اپنے گھر اور اسکول کا پتہ دیتا ہوں۔ کل آپ جانچ پڑتال کریں۔ میں جھوٹ بول رہا تھا یا سچ۔"

"ہمیں کیا پتہ ہے بھائی تو ٹھیک ہی بتائے گا۔"

"جی اتنا تو اعتبار کرنا ہی چاہیے۔ آخر میں ماسٹر ہوں۔"

"اعتبار تو کرلیتے پر تو نے اعتبار والی بات نہیں کی۔ ہمیں کوئی ایسا ثبوت چاہیے جس پر ہم اعتبار کرسکیں۔"

"جی انھوں نے مجھے شادی کے وقت جو انگوٹھی دی تھی۔ اس پر ان کا نام کھدا ہوا ہے۔"

"یہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے لڑکی ہمیں کوئی ٹھوس ثبوت چاہیے جو منہ سے بولے، تمہارے بیچ ہونے کی گواہی دے۔"

میں نے اپنی جیب سے پرس نکالتے ہوئے کہا: "جی یہ ہم دونوں کا فوٹو ہے۔"

"فوٹو تو اس لڑکی کے ساتھ بھی کھنچوائی جاسکتی ہے جسے بھگا کر لایا گیا ہو۔"

"کوئی اور ٹھوس ثبوت۔"

"جی میرے گلے میں منگل سوتر ہے۔ مانگ میں سیندور ہے۔ ماتھے پر بندیا ہے" میری بیوی بولی۔

ایک سپاہی تلخ ہنسی ہنس کر بولا "یہ کوئی ثبوت نہیں ہے لڑکی۔" پھر وہ میری طرف مخاطب ہوا۔

"ماسٹر اپنا بٹوا دکھا شاید کوئی ٹھوس ثبوت نکل آئے۔"

میں نے بٹوا آگے کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں تو پندرہ روپے چالیس پیسے ہیں۔"

اس نے پندرہ روپے لے کر کہا۔ "بس اتنے ہی؟"

"جی۔"

"اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہیں؟"

اس کے اس چھوٹے سے جملے سے میرا دماغ روشن ہوگیا۔ میں نے اطمینان سے کہا: "فی الحال تو اور کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔"

دوسرا سپاہی بولا۔

"دیکھیے ماسٹر جی۔ اس بار تو معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔ پھر بھی آپ عزت دار آدمی ہیں۔ آئندہ خیال رکھیں۔ بدکاری ختم کرو ہفتہ منایا جارہا ہے اور پولیس کو کسی وقت بھی شک ہوسکتا ہے۔ آخر بدکاری تو ختم کرنی ہے نہ!"

●

غزلیں

روشن علی کرتل
کریم نگر (اے پی)

لفافہ پر لفافہ لکھ رہے ہیں
بنالو ہم کو اپنا لکھ رہے ہیں

بنا شادی کے بوڑھے ہو رہے ہیں
جہیز کارن ہے اس کا لکھ رہے ہیں

لگا کر پاؤں میں مہندی کو اپنے
نہ آنے کا بہانہ لکھ رہے ہیں

میری تعلیم اردو ، ان کی انگلش
میں سیدھا اور وہ الٹا لکھ رہے ہیں

انھیں بھی شوق ہندی کا ہوا ہے
زنانہ کو جناتا لکھ رہے ہیں

انھیں پکوان پر لکھنے کی سوجھی
مسالوں پر مقالہ لکھ رہے ہیں

نہیں ان کی نظر ڈھانچہ پہ اپنی
مجھے بمبو ہے تڑخا لکھ رہے ہیں

جو لکھ سکتے تھے شعر اچھے سے اچھے
ہنسانے کو وہ کچرا لکھ رہے ہیں

محاذِ جنگ پر کرتل کھڑا ہے
یہاں منڈن ہے آنا لکھ رہے ہیں

ڈاکٹر ہادی متنزہ
نرمل (اے پی)

○

بھوک افلاس ہے آدھی صدی کے بعد بھی
بدنصیبی پاس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

روٹی کپڑا پھر مکاں دلوائے گا کب دیکھئے
جبکہ باقی پیاس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

جسم کو بوسیدہ کپڑا بھی میسر اب نہیں
مفلسی ہی راس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

ملک سے غربت مٹا دی جائے گی سُنتا ہوں جب
لگتی اک بکواس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

دن بہ دن پستی کی جانب گر رہی ہے قوم یہ
صرف اچھی آس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

ملک کے دستور کو سمجھا ہے ایسا رہنما
خالی اک قرطاس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

بول کر بھارت کی جے بھارت کو بیچا جا رہا
مُردہ جو احساس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

رام تو چودہ برس کے بعد واپس ہو گئے
ہم کو تو بن باس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

کتنی خواہش سے یہاں پر کھا رہا ہے رہنما
جانور کی گھاس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

ایک دن ہوگی متنزہ کالی راتوں کی سحر
سب کا یہ وشواس ہے آدھی صدی کے بعد بھی

★

اے - سارکر
انگریزی سے ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علی خاں

انوکھا چور

پیشۂ طب میں کسی ایک مسئلے پر سب فن دانوں کا متفق ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر ایک نکتہ ایسا ہے جس پر ڈاکٹروں کی ساری برادری کا اجماع ہے ـــــ کہ لبالب ساغروں کا دور سردی کے موسم میں بھی نہایت ہی غیر مناسب ہے مگر فوج ایک ایسا شعبہ ہے جس کے کرتا دھرتا ڈاکٹروں کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے ۔ ان کا کہنا ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کرنے والے فوجی جوانوں کے لیے وہاں کی سردی سے بچنے اور صحت مند رہنے کا ایک آسان اور مفید گر یہ ہے کہ روزانہ ایک خاص مقدار میں شراب پی جائے ۔ اسی لیے ان سارے فوجیوں کے لیے ہر دن شراب کا ایک کوٹہ مقرر ہوتا ہے مگر ان میں جو منچلے ہیں وہ شراب کی اس تقسیم سے ہمیشہ ناخوش رہتے ہیں ۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ سردی جیسے جیسے بڑھے گی، ویسے ویسے ان کے شراب کے کوٹے میں اضافہ ہونا چاہیے مگر فوجی ڈسپلن انھیں اس بات کا پابند بنا دیتا ہے کہ ان کی مقرر کردہ مقدار ہی روزانہ انھیں ملا کرے گی اور اس طریقہ کار کو باقاعدہ بنانے کے لیے ہر شام شراب کی ساری بوتلوں کی گنتی ہوتی ہے اور اسٹور روم راتوں میں مضبوطی سے مقفل کر دیے جاتے ہیں۔

رجمنٹ میں میری جب نئی نئی تعیناتی ہوئی تھی تو مجھے اس خم خانہ کا انچارج بنا دیا گیا تھا اور سخت ہدایت دی گئی تھی کہ بوتلوں کا حساب کتاب برابر رکھا جائے۔ دوسری سنسنی خیز خبر یہ سنائی گئی تھی کہ راتوں میں بوتلوں سے شراب کی چوری ہو رہی ہے مگر ابھی تک کوئی پکڑا نہیں گیا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہر صبح جب اسٹور کھولا جاتا تو ریاک کے اوپری حصہ پر رکھی ہوئی بوتلوں میں صرف ۶ یا ۸ بوتلیں ایسی ملتیں جن کے المونیم ڈھکنوں میں سوراخ پائے جاتے تھے اور ہر بوتل میں سے چھ انچ کی حد تک شراب غائب رہتی تھی ․․․․․․ ایک انچ

زیادہ اور نہ ایک انچ کم۔ اس عجیب و غریب قسم کے چور اور طریقۂ چوری پہ مجھے بڑا تعجب ہوا تھا۔ آخر شراب کا یہ رسیا کس قماش کا آدمی ہے جو بوتلیں اٹھا کر نہیں لے جاتا اور اس انوکھی اور سنسنی خیز وارداتوں سے اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنے کمانڈر سے وعدہ کیا کہ اس چور کو پکڑنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جائے گی۔

ہر روز شام سے ہی میں اسٹور کے اندر جاتا۔ ساری بوتلوں کی گنتی کرتا۔ باہر کا دروازہ مضبوطی سے بند کر کے کنڈی میں وزن دار تالا ڈالتا اور اس پر اپنا مہر تورا بھی کر دیتا اور صبح تڑکے ہی اپنی موجودگی میں اسٹور کھلواتا مگر وہی پرانا منظر سامنے رہتا۔ یعنی چھ آٹھ بوتلوں سے چھ انچ کی حد تک شراب غائب۔ چند دنوں بعد میری اس ناکامی پر کمپنی کے کمانڈر نے مجھے آڑے ہاتھ لیا۔ اور سخت سست الفاظ سے مجھے نوازا گیا۔ اس خفت کو مٹانے کی خاطر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب میں خود ہی شراب کے اسٹور روم کے اندر ساری رات جاگتا رہوں گا اور دیکھوں گا کہ کون مائی کا لال ہے جو ایسی نامعقول حرکت کر رہا ہے۔ ایک بڑی سی ٹارچ اپنے بازو رکھے اپنے بستر پر دراز ہو کر اپنی آنکھیں میچ لیں۔ آدھی رات کے قریب چوہوں کے ادھر ادھر بھاگنے کی آوازوں پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے بازو رکھی ہوئی پتھروں کی کنکریاں ان پر دے ماریں اور پھر آنکھ بند کر کے سونے کی کوشش میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر بھی نہیں گزری تھی کہ پھر شور کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اپنی مشان دار ٹارچ روشن کی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لحیم شحیم چوہا شراب کی ایک بوتل پر براجمان ہے اور اپنے نوکیلے دانتوں سے بوتل کے ڈھکن کو کتر رہا ہے۔ جب اس میں اچھا خاصا سوراخ کر چکا تو اس نے اپنی لمبی دم اس سوراخ کے ذریعے بوتل کے اندر ڈالی اور شراب سے لبالب بھیگی ہوئی دم باہر نکال کر لگا اپنی پونچھ کو چاٹنے۔ ●●

مرزا کھونچ
(بیتیا)

مچھروں سے فائدے

جی ہاں جناب ، دنیا کچھ بھی کہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مچھروں سے نقصانات کم اور فائدے زیادہ ہیں۔ دنیا کا کیا ع

اچھوں کو بُرا ثابت کرنا دنیا کی پُرانی عادت ہے

انسان ایک دوسرے کو کاٹ رہا ہے تو کچھ نہیں اور مچھر نے ایک ذرا سا ڈنک کیا گڑ دیا کہ کہرام مچ گیا۔ لوگ اس کی نسل کشی کے لیے تیار ہو گئے۔ اخباروں میں اس کے خلاف طرح طرح کے مضمون آنے لگے۔ اس سے حفاظت کے نئے نئے طریقے ایجاد ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مائیں اپنے بچے کو اس سے ڈرانے لگیں "جلدی سو جاؤ ورنہ ڈینگو آ جائے گا"۔ بچہ ڈر سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور فوراً سو جاتا ہے۔ مائیں اطمینان کا سانس لیتی ہیں۔ بچے کو لگتا ہے کہ ڈینگو کسی راکشش نام ہے۔ اس کے ڈر سے وہ ٹافی مانگنا بھی بند کر دیتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ٹافی کا پیسہ بچا۔ یہ انسان چلا ہے مچھروں سے الجھنے۔ مچھروں نے جب فرعون کا غرور توڑ دیا تو ہم اور آپ کیا ہیں لیکن ہم ہیں کہ لٹھ لیے مچھروں کے پیچھے پڑے ہیں۔ مچھروں نے دیکھا کہ یہ انسان کی ذات باز نہیں آتی ہے ، فرعون سے بھی آگے بڑھ گئی ہے ، طرح طرح کے حربے استعمال کر رہی ہے تاکہ ان کا خاتمہ ہو جائے تو ان مچھروں نے انسان کی اوقات بتانے کے لیے اپنا پینترا بدلنا شروع کیا اور قہر ڈھانا شروع کر دیا۔ پہلے تو صرف جاڑہ بخار ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس مرض کا علاج اب چونکہ بالکل آسان ہو گیا ہے۔ تو حضرت انسان نے سمجھا کہ اب تو ہم نے اس مرض پر قابو پا لیا ہے۔ انھوں نے مچھروں سے ڈرنا ختم کر دیا

کتنا احسان فراموش ہے یہ انسان مچھروں نے کیا کیا نہ فائدے پہنچائے۔ انھوں نے اتنی جانیں گنوائیں، اپنے بال بچوں کو بھوکا رکھا۔ اپنا گھر دروازہ چھوڑا۔ ایک نالی سے دوسری نالی اور دوسری سے تیسری نالی میں گھوم گھوم کر خانہ بدوشی کی زندگی گزاری۔ کبھی کسی گھر کے اندھیرے کونے میں پڑے رہے کہ اس گھر کے کسی فرد کو دن میں تکلیف نہ ہو۔ رات میں جب سب اپنے اپنے بستروں میں گھس گئے اور مچھر دانی اوڑھ لی تب یہ حضرت نکلے اپنی روزی روٹی کی تلاش میں۔ اس طرح رات بھر جاگ کر اپنا رزق حاصل کرتے رہے اور صبح ہوتے ہی اپنا کام دھام چھوڑ کر کسی نالی میں یا کسی گھر کے اندھیرے کونے میں پناہ لے لی۔ اب بتائیے مچھروں نے اپنے ڈھنگ سے حتی الامکان کوشش کی کہ انسانوں سے ان کی ملاقات نہ ہو لیکن نہیں چاہتے ہوئے بھی ملاقات ہو جائے تو اس میں مچھروں کا کیا قصور ہے۔

مچھروں سے سب سے بڑا فائدہ معاشی فائدہ ہے۔ اس بے کاری کے زمانے میں کام ملنا کتنا مشکل ہے۔ دعائیں دیجیے مچھروں کو جن کی بدولت کتنوں کی دال روٹی چل رہی ہے۔ سرکاری سطح پر بھی مچھروں کو مارنے کے لیے محکمہ کھلا ہے۔ اس محکمہ میں کلرک سے لے کر افسر تک کتنے لوگ کام کر رہے ہیں۔ کوئی پاوڈر چھڑک کر مچھر مارنے کا کام کر رہا ہے تو کوئی پاوڈر چھڑکنے والے کی نگرانی کر رہا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مچھروں کی وجہ سے نوکری پاؤ اور ان ہی کی زندگانی ختم کرو۔ یعنی جس تھالی میں کھاؤ اسی تھالی میں چھید کر دو لیکن ان محکمہ والوں کو بھی آخرت کا ڈر ہے۔ اسی لیے وہ احسان فراموشی سے کام نہیں لیتے۔ مچھر مارنے کے لیے پاوڈر ضرور چھڑکتے ہیں مگر صرف کاغذ پر تھوڑا بہت ادھر ادھر اُدھر چھڑک دیتے ہیں۔ اب اِدھر اُدھر چھڑکنے سے اگر مچھر نہیں مرتے ہیں تو اس میں محکمے والوں کا کیا قصور۔ زندگی اور موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ مچھر کے کاٹنے سے ملیریا ہوتا ہے اور ملیریا دور کرنے کے لیے دوا بنتی ہے۔ دوا بنانے کے لیے کارخانے کھلتے ہیں اور ان کارخانوں میں لوگ نوکری پاتے ہیں۔ بیمار ہو کر لوگ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ ان کی بھی آمدنی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مچھر پالنے کے لیے ایک مہم چلائی جائے تو ہمارے ملک کی بے کاری بہت حد تک دور ہو جائے گی۔

آئیے، اب دیکھیں کہ مچھروں سے غیر سرکاری فائدے کیا کیا ہیں۔ جتنے مچھر بڑھتے ہیں اتنی ہی مچھر دانی کی مانگ بڑھتی ہے۔ مچھر دانی کی گھریلو صنعت کو فروغ ملتا ہے۔ مچھر بھگانے کے لیے طرح طرح کی اگربتیاں بنائی جا رہی ہیں اسی بہانے کچھ لوگ کام پر لگ تو گئے ہیں۔ سامان بنانے والوں کی تجارت میں فائدہ ہوا۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبار حاضر ہیں۔ ان اشیا کا اشتہار دینے کے لیے یعنی کسی کو بالواسطہ اور کسی کو بلا واسطہ مچھروں سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

طالب علموں کو بھی مچھروں سے کافی راحت ملتی ہے۔ مچھر انھیں کاٹ کاٹ کر جگائے رکھتا ہے تاکہ وہ سونے میں وقت نہ گنوائیں۔ مچھر سے دینی فائدہ یہ ہے کہ یہ لوگوں کو ہر دم یاد

دلاتا رہتا ہے کہ ہم نے خدا کے ایک نافرمان بندے فرعون کا کام تمام کیا پھر تم کس کھیت کی مولی ہو۔ تم بھی نافرمانی پر اتر آئے تو تمھارے ساتھ بھی وہی سلوک ہو گا جو فرعون کے ساتھ ہوا تھا۔ اچھا ہے کہ سنبھل جاؤ ورنہ جس دن ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اس دن یہ مت کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی۔ لاکھ مچھر دانی لگاؤ یا اگربتی جلاؤ فائدہ نہیں ہو گا۔ مچھروں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ کے گھر چوری نہیں ہوتی۔ چوری انھیں لوگوں کے یہاں زیادہ ہوتی ہے جو سکون سے سوتے ہیں اور جنھیں مچھر سکون سے سونے نہیں دیتے ان کے یہاں چوری کیا ہو گی۔ مچھروں کی وجہ سے آپ ہمیشہ حرکت میں رہتے۔ آپ کا ہاتھ ہمیشہ چلتا رہتا ہے اور حرکت میں برکت ہوتی ہے۔

مچھر ہم کو مساوات کا درس دیتے ہیں۔ راجہ ہو یا رنک، فارورڈ ہو یا بیک ورڈ، لیڈر ہو یا عوام وہ سب پر ایک ہی ڈنک چلاتے ہیں۔ انھیں یہ ڈر رہتا ہے کہ آخرت میں ان کو طرف داری کا الزام نہ لگ جائے۔

پہلے عموماً رات ہی میں ملاقات ہوتی تھی۔ آج کل دن میں بھی مچھر بڑی تعداد میں نظر آنے لگے ہیں۔ اب جب کہ رات کے سارے کام دن میں ہوا کرتے ہیں تو مچھروں نے بھی دن میں اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ یوں بھی زمانہ مہنگائی کا ہے بغیر اوور ٹائم کے کام نہیں چلتا۔ رات میں تو وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ادھر کاٹتے اور ادھر بھاگ نکلتے ہیں مگر دن میں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر نکل پڑتے ہیں۔ چاروں طرف سیلاب زدہ نالیاں آخر کس دن کام آئیں گی۔ اس نالی سے نکل کر غوطہ حاصل کیا اور اس نالی میں گھس گئے۔ آپ کی ہے ہمت جو نالی میں گھس کر ان کا مقابلہ کریں۔ وہ بھی گوریلا جنگ کی افادیت جان گئے ہیں۔ انہوں نے آپ کی ساری چالاکیاں سیکھ لی ہیں۔ اب تو وہ اپنے ڈنک کی مدد سے مچھر دانی میں نقب زنی کر کے گھس جاتے ہیں۔ انھوں نے آپ کے پینترے سیکھ لیے ہیں۔ اب آپ ان کے پینترے سیکھ لیں تب ہی فائدے میں رہیں گے۔ ●●

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

پیکرانِ بے سخن

پڑھنے کی قیمت :

قیامی رفعت نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ
ڈاکٹر قمر رئیس کے یہاں دہلی میں رتن سنگھ سے
قیامی رفعت کی ملاقات ہوئی۔ رتن سنگھ نے ملاقات
کے بعد قیامی رفعت سے کہا "یہ لیجیے میرے
افسانوں کا مجموعہ لیکن میں اس کی قیمت لوں گا۔"
"قیمت کیا ہے؟" قیامی رفعت نے پوچھا۔
"پندرہ روپیے"
"پھر میں آپ سے تیس روپیے لوں گا۔"
"جی؟"
"جی ہاں، کیونکہ مجھے پڑھنا پڑے گا اور
میں پڑھنے کی قیمت لوں گا۔"

گلشن کا کاروبار :

اسی محفل میں قیامی رفعت نے بتایا۔ فیض
احمد فیض اپنی دو غزلیں سنا چکے تو ان سے
"گلوں میں رنگ بھرے" کی فرمائش کی گئی۔ فیض
نے غزل شروع کی :

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

سامعین نے ہانک لگائی "یہ گلشن کہاں
کاروبار کرتی ہے؟ بتلا دیجیے"

چھاتی بینگ گیلو :

فرحت قادری، پروفیسر تاج انور، پروفیسر
احمد حسین آزاد، سرور عثمانی، سید احمد قادری
اور مناظر عاشق ہرگانوی کافی کی چسکیاں لے
رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ فرحت قادری
اپنے کلکتہ کے واقعات سناتے ہوئے بولے "بنگلہ
زبان نہ جاننے کی وجہ سے کلکتہ میں ابھی پچھلی
بار میرے ساتھ ایک حادثہ ہوتے ہوتے رہ
گیا۔ میں ٹرام میں سفر کر رہا تھا۔ بھیڑ بہت
تھی۔ میرے پیچھے کوئی بنگالی خاتون کھڑی
تھیں۔ یکایک میرا کندھا پکڑ کر چیخنے لگیں۔
چھاتی بینگ گیلو، چھاتی بینگ گیلو!"
میں گھبرا گیا اور خوف زدہ ہو کر سوچنے لگا۔
کہ اب دو چار لمحے میں میری درگت بننے ہی والی
ہے۔ شاید بھیڑ میں، غلطی سے میرا ہاتھ اس
کے سینے سے ٹکرا گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ عورت
چیخ رہی ہے لیکن تبھی ایک صاحب نے ڈپٹ کر
مجھ سے کہا "چھاتے پر سے پاؤں ہٹایئے۔ دیکھتے نہیں
ان کا چھاتا ٹوٹ گیا ہے۔"

سیڑھی لگاکر:

اسی محفل میں شاعرہ اور ہوٹنگ کی بات نکلی تو فرحت قادری نے بتایا کلکتہ میں ایک شاعر گھائل اعظم ہیں۔ بے حد پستہ قد ہیں۔ ایک مشاعرے میں پڑھنے لگے تو پچھلی صف سے سامعین نے آواز لگائی "کھڑے ہوکر پڑھیے"۔
گھائل اعظم بولے "میں کھڑا ہوکر ہی پڑھ رہا ہوں۔"
سامعین میں سے دوسری آواز ابھری
"پھر سیڑھی لگاکر پڑھیے"۔

صحیح شعر:

اسی محفل میں مولی کاظم نے سنایا
"ایک مشاعرے میں ایک شاعر نے پڑھنا شروع کیا تو مکرر مکرر کی آواز گونجنے لگی۔ یہ فرمائش اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک استاد شاعر کر رہے تھے۔ جب شاعر صاحب پہلے ہی شعر کو چھ سات بار دہرا چکے تو بولے "اب دوسرا شعر سنیے، لیکن یار بار مت پڑھوائیے"۔
استاد نے کہا "اس وقت تک پڑھواؤں گا جب تک کہ آپ درست شعر نہیں پڑھیں گے"۔

جواب:

سری نگر میں مظہر امام کے یہاں خلیل الرحمٰن اعظمی، فیاض رفعت مجید مضمر بیٹھے ہوئے تھے۔ باتیں فحش نگاری پر ہو رہی تھیں خلیل الرحمٰن اعظمی نے دوران گفتگو کہا "جب فحش نگاری کے سلسلے میں لاہور کی عدالت میں عصمت اور منٹو پر مقدمہ چلا تو ان کو اس سلسلے میں دو مرتبہ جانا پڑا۔ یہ حضرات دونوں مرتبہ وہاں سے سینڈلیں خرید لائے۔ ایک صاحب نے بمبئی میں عصمت سے پوچھا "کیا آپ لوگ، لاہور مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے؟"
"جی نہیں۔ جوتے خریدنے گئے تھے"۔
عصمت کا جواب تھا۔

نوکر کی عمر:

اسی محفل میں رحمٰن نیر نے بتایا "میں ایک بار کلکتہ جا رہا تھا۔ میرے ایک دوست نے فرمائش کی کہ ان کے لیے کلکتہ سے ایک نوکر لیتا آؤں، عمر لگ بھگ بارہ سال کی ہو۔"
"اگر بارہ سال کی عمر کا نوکر نہ ملے تو چھ چھ سال کی عمر کے دو نوکروں کو لیتا آؤں"۔ رحمٰن نیر نے بے حد سادگی سے پوچھا۔

مشاعرہ، نماز اور شیطان:

بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ رضوان احمد، بشارت نیازی اور نثار احمد نثار، مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرے لوگ سامعین کی نشستوں پر تھے۔ اناؤنسر کے فرائض ملک زادہ منظور احمد انجام دے رہے تھے۔ تقریباً پچاس شاعر مدعو تھے۔ شاعروں کی تعداد دیکھتے ہوئے ملک زادہ نے شعرا سے کہا کہ اپنے بہترین اشعار ہی سنائیں تاکہ سامعین بور نہ ہوں۔ ساتھ ہی بشیر بدر کا نام پکارا۔ بشیر بدر مائک پر آ کر بولے "شاید ملک زادہ ہم شاعروں کو ادبی نماز پڑھانا چاہتے ہیں"۔ ملک زادہ نے برجستہ کہا "نماز کی جہاں بات ہوتی شیطان کا آجانا لازمی ہے"۔

مستان
(سمستی پور)

مجرم کون؟

اک روز اک عزیز کا مہمان ہو گیا — بستر کے کھٹملوں سے پریشان ہو گیا
اِن کھٹملوں کی فوج نے سونے نہیں دیا — رونا جو چاہتا تھا تو رونے نہیں دیا
غصے میں پاگل ایسا ہوا جا رہا تھا میں — وہ چھپ گئے تھے کاٹ کے بل کھا رہا تھا میں
بیٹھا میں اُٹھ کے کھاٹ پہ تدبیر سوچ کر — کھٹمل جو ایک آیا تو پکڑا دبوچ کر
میں نے کہا کہ اب نہ چھپو چارپائی میں — قیدی ہو میرے بولو کچھ اپنی صفائی میں
اس نے سکوت، رات کا یوں توڑ کر کہا — جتنے بھی ہاتھ پاؤں تھے سب جوڑ کر کہا
اس نے کہا کہ کچھ نہیں اس میں میرا قصور — فطرت کے اک تقاضے کو پورا کیا حضور
میں نے کہا، بتاؤ تمہیں کیا سزا ملے — بولا، کچھ اور خون، بطورِ غذا ملے
میں نے کہا، کہ لائقِ جرمانہ فعل ہے — اپنے یہاں تو اس کی سزا سیدھے جیل ہے
اس نے کہا، کہ کر دو رہا لین دین سے — گر چھوڑ دو گے مجھ کو تو سوؤ گے چین سے
میں نے کہا، رہائی کی اب جستجو نہ کر — کھٹمل ہے، آدمی کی طرح، گفتگو نہ کر
اس نے کہا، میں آدمی سے ہوں بہت بڑا — کھٹمل سے آدمی کا بھلا کیا مقابلہ
دعویٰ ہے اس لئے بھی مجھے پارسائی کا — پیتا نہیں ہوں، خون کبھی اپنے بھائی کا

شوہر ناگپوری

غزل

اپنا گھر دیکھ لے، ہوا کیا ہے — غیر کے گھر میں جھانکتا کیا ہے
امی! لڑکی پسند ہے کانی — آپ کا اس میں فیصلہ کیا ہے
کان کاٹے ہیں اُس نے مردوں کے — اُس کے بارے میں سوچتا کیا ہے
دیکھنا کل تجھے نچائے گی — آج خوشیوں سے ناچتا کیا ہے
میں تو اُن سے لگا رہا ہوں دل — "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"
تیرے چہرے کے سامنے جاناں — شہر کا میرے سنترہ کیا ہے
بس! ملاقات ہم سے کروا دو — گر پسند آئیں تو بُرا کیا ہے
پکے استاد کا میں چیلا ہوں — میرے شعروں کو ناپتا کیا ہے

بیوی، شوہر کی دیکھ لو چھپ کر
جان جاؤ گے تم، بلا کیا ہے

دسے کے خط

(مراسلے)

محترمی و مشفقی ڈاکٹر صاحب، السلام علیکم۔

دس نومبر کو کراچی پہنچا اور دوسرے ہی دن سے یوسفی صاحب، مشفق خواجہ صاحب کا پتہ اور فون نمبر معلوم کرنے میں لگ گیا۔ ان دونوں نے پہرے بٹھا رکھے ہیں نہ ٹیلی فون ڈائرکٹری سے معلوم ہو سکتا ہے اور نہ کسی اخبار سے۔ اتفاق سے ایک صاحب بیابانی صاحب (جو نعت گو شاعر ہیں) سے ملاقات ہوئی۔ ان سے جب ذکر آیا تو انھوں نے تسلی دی کہ یوسفی صاحب کے ایک دوست سے معلوم کر کے فون نمبر اور پتہ مجھے دے دیں گے۔ اور دوسرے ہی دن یعنی ۱۹ نومبر کو صبح انھوں نے فون پر یوسفی صاحب کا پتہ دے دیا مگر خواجہ صاحب کے تعلق سے معذرت خواہ ہوئے۔ میری تو عید ہو گئی۔ فوراً یوسفی صاحب سے رابطہ قائم کیا ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ نہایت خوش دلی سے قبول فرمائی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ دو دن سے بے سمیت غذا کے باعث علالت کا سلسلہ چل رہا ہے۔ آج ملنے کے قابل نہیں ہوں، میں نے عرض کیا کل صبح فون سے معلوم کر لوں گا انشاء اللہ آپ چاق و چوبند ہو جائیں گے۔ وقت دے دیجیے۔ حاضر ہو جاؤں گا۔ درخواست قبول ہوئی۔ اور دوسرے دن جب فون کیا تو خود ہی فرمانے لگے کہ میں آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں۔ آج ہی شام میں آ جائیں۔ میں شام ۵ بجے وہاں پہنچا نہایت تواضع سے ملے۔ بے حد منکسر المزاج اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل ہیں اللہ شگوفہ کی عمر دراز کرے۔ اسی کے حوالے سے احقر سے واقف تھے۔

تقریباً دو گھنٹے تک گفتگو رہی۔ میں نے دوران گفتگو زندہ دلان حیدرآباد کے پروگرام میں عدم شرکت کی وجہ پوچھی۔ فرمایا میری بے حد خواہش تھی کہ میں وہاں جاؤں مگر اچانک کسی ضروری کام کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔" ان کے دو لڑکے امریکہ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہیں۔ سال دو سال میں ان کا وہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں نے زندہ دلان کی طرف سے دعوت دے دی کہ اپریل میں پھر سالانہ پروگرام ہے۔ آپ تشریف لائیں۔ فرمائیے حیدرآباد کبھی آنا نہیں ہوا۔ اور اسے دیکھنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کی بڑی آرزو ہے۔ عرض کیا میں پہلی دعوت کی تجدید کر رہا ہوں۔ اور امید قوی ہے کہ میری درخواست رد نہ ہوگی تاکہ میں حیدرآباد ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب کو آپ کے ارادے کی اطلاع دے دوں فرمایئے کیا ارادہ ہے اور کیا فرمائیں گے۔ بولے ارادہ نیک ہے اور نیت بھی یہی ہے تو میں نے کہا پھر فقیر کامیابی کے لیے دعا کے ساتھ یہ اطلاع حیدرآباد بھیج رہا ہے اجازت دے دی۔ ہاں دوران گفتگو مشفق خواجہ صاحب کا ذکر آیا تو یوسفی صاحب نے ان کا پتہ اور فون نمبر بھی دے دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ میں خود فون سے آپ کے متعلق انھیں اطلاع دے دوں گا چنانچہ آج صبح میں نے خواجہ صاحب سے بات کی اور آپ کا پیام پہنچا دیا۔ خود اس لیے نہ جا سکا کیوں کہ یہاں سے کوچ کی تیاری کر رہا ہوں۔ پرسوں

لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ خواجہ صاحب نے
بڑی اپنائیت سے آنے کے لیے کہا مگر میں نے مجبوری
کے باعث معذرت چاہی۔ انھوں نے حیدرآبادی
احباب کی خدمت میں سلام پہنچانے کی تاکید کی
شگوفہ کے تعلق سے جب میں نے کہا تو فرمائے وہ
ڈیڑھ سال پہلے تک مجھے پابندی سے ملتا رہا اور میں اسے
شوق سے پڑھتا بھی رہا ہوں مگر اب خود حیرت زدہ ہوں
کہ یہ بند کیوں کر دیا گیا اور ساتھ ہی آپ سے کہا
کہ پچھلے سارے رسالے بھیج دیں تاکہ تسلسل قائم
ہو جائے۔ نہایت محبت سے آپ کا ذکر کرتے
رہے۔ تقریباً بیس منٹ تک ہماری گفتگو رہی۔

جی چاہ رہا تھا شام میں یوسفی صاحب سے
دوسری ملاقات کرلوں اور رخصت بھی لے لوں۔
چنانچہ فون کیا۔ خواجہ صاحب سے گفتگو کی روئیداد
سنائی اور اپنی آمد کے تعلق سے کہا۔ فراخدلی سے راضی
ہو گئے۔ چنانچہ آج چھ بجے وہاں گیا اور ساڑھے سات تک
بڑے خوشگوار ماحول میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وقت گزارا
میں نے پھر حیدرآباد آنے کی دعوت دے دی۔ اور
اجازت لے کر برادرم مبین زیدی کے ہمراہ واپس
چلا آیا۔

ریل کا سفر بھی اللہ نے نہایت آرام اور اطمینان
سے گزار دیا۔ نہ ادھر کے کسٹم والوں نے نہ ادھر کے
مجھ کو کسی قسم کی مشکل میں پھنسایا۔ ہنستا بولتا پہنچ
گیا۔ اب "حضنت" سے اپنے پھر یہ دعا ہے کہ اسی
طرح واپسی کا مرحلہ بھی آسان فرما دے (آمین)

محترم خواجہ حمید الدین شاہد صاحب سے بھی
ملاقات ہوئی۔ بہت محبت سے سب کو نام بہ نام
سلام کہا۔

یوسفی صاحب نے آپ کو اور مغنی تبسم صاحب
کو بھی بہت بہت سلام کہا۔ مرزا یوسف ناظم صاحب کو
بھی۔ اسی طرح مشفق خواجہ صاحب نے بھی بہ اصرار سب
کو سلام پہنچاتے ہیں۔

طالب حسین زیدی۔ کراچی

●

نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ
شگوفہ کے تیس سال مکمل ہو جانے پر دلی
مبارکباد قبول فرمائیں۔ اردو ادب خصوصاً
طنز و مزاح کے لیے آپ کی خدمات تاریخ کا حصہ بن
چکی ہیں۔ جس مستقل مزاجی اور عزم کے ساتھ
آپ یہ کام کر رہے ہیں موجودہ دور میں اس کی مثالیں
کم ملتی ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ زیادہ سے
زیادہ دنوں تک اسی طرح مزاحیہ ادب کے خزانے
کو مالا مال کرتے رہیں۔ (آمین)

فضل حسنین، الہ آباد

●

تازہ شمارہ خوب ہے محترم مجتبیٰ حسین بہت اچھے
لگے اور حصۂ نظم میں جناب بازغ بہاری نے متاثر
کیا۔

محبوب مانجھوی

●

مسیح بھائی یار دوست قسم کے آدمی تھے۔
انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اللہ انھیں
غریق رحمت کرے۔

سلیم مقصود۔ حیدرآباد

●

مکرمی، شگوفہ کی اشاعت کے تیس سال مکمل ہونے
پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ظفر کمالی۔ سیوان

R.NNO. 15822/68 SHUGOOFA Postal Regd. No. H/H
HYDERABAD
VOL.31 COPY:12 Ph : 595716 Deq1998